JANUARY 1985

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جنوری ۱۹۸۵ء

جلد ۱۸ شمارہ ۱

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

تصویرِ ٹائٹل: راجندر سنگھ بیدی

قیمت: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چار کمان، حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ:

شگوفہ ۳۳ ـ [illegible] معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون: آفس: 557716
رہائش: 521024

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

- مالِ مفت (انشائیے):

وہ آئیں گھر میں ہمارے ـــــ رشید قریشی ـــــ ۹
بھوپال میں گیس کے بادل ـــــ شفیقہ فرحت ـــــ ۱۴
ستاروں کے پیچھے ـــــ یوسف ناظم ـــــ ۱۷
پھر میرے ساتھی ـــــ یوسف رحیم ـــــ ۲۱
تلاش گمشدہ ـــــ سنہرلال بھارتی ـــــ ۲۵

- گوشۂ راجندر سنگھ بیدی:

راجندر سنگھ بیدی۔ عاتق شاہ ۳۱
بیدی کی طنز نگاری۔ مناظر عاشق ہرگانوی ۳۸
بیوی یا بیماری۔ راجندر سنگھ بیدی ۴۵
چلتے پھرتے چہرے۔ راجندر سنگھ بیدی ۵۱

- ایک خط بنام جوہر سیوانی مرحوم ـــــ تمنا مظفر پوری ۵۷

- چھوڑ دے (منظومات):

رضا نقوی واہی ۱۳ — اسمٰعیل ظریف ۱۳
ظفر کمالی ۱۴ — چھاپنبڑ ناگپوری ۱۳
صابر بہاری ۲۰ — کرشن پرویز ۲۰

- پھر ملیں گے اگر خدا لایا ـــــ اداریہ ـــــ ۵۸

زندہ دلانِ حیدرآباد کے

عالمی جشنِ مزاح

کے موقع پر

ماہنامہ **شگوفہ** کا خصوصی شمارہ

شائع ہوگا

▪ خوبصورت سہ رنگی ٹائٹل ▪ ضخامت ۸۸ صفحے ▪ قیمت -/۵ روپے

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام

عالمی جشنِ مزاح

۸ / تا ۱۲ / فروری ۱۹۸۵ء

پروگرام کی جھلکیاں :-

جمعہ، ۸ / فروری ۸۵ء - ½ ۹ بجے صبح - افتتاح اور سوونیر کا اجراء
یادگار پوسٹل کور کی مہر اندازی - مقام : رویندرا بھارتی تھیٹر
- ۱۲ بجے دن - افتتاح نمائش کارٹون، مقام : رویندرا بھارتی تھیٹر
- ۶ بجے شام - مائم شو اور کٹھ پتلیوں کا ناچ - مقام : انڈور اسٹیڈیم

ہفتہ، ۹ / فروری ۸۵ء - ۹ بجے صبح - مزاحیہ فلموں کی نمائش کا افتتاح - مقام : رائل ٹاکیز
- ½ ۲ بجے دن - اردو مزاحیہ ادب پر سمینار - مقام : اردو ہال

متوازی اجلاس

- ۶ بجے شام - بنگالی - مقام : بنگالی سمیتی
- ۹ بجے شام - گجراتی - مقام : گجراتی ودیا مندر، سلطان بازار
- ½ ۵ بجے شام - کنڑی - مقام : کرناٹک ساہتیہ مندر
- ½ ۵ بجے شام - ملیالم - مقام : این ایس کے کے اسکول (ڈی ایچ ای ایل)
- ۵ بجے شام - مرہٹی - مقام : وی ویک وردھنی اسٹیج
- ۸ بجے شب - پنجابی -
- ۶ بجے شام - تلگو - مقام : ساہتیہ اکیڈیمی
- ½ ۶ بجے شام - ٹامل - مقام : کیتھر ہائی اسکول، سکندرآباد
- ½ ۶ بجے شام - اردو (نثر)، مقام : رویندرا بھارتی

اتوار، ۱۰ / فروری ۸۵ء

- ½ ۱۰ بجے صبح - عالمی اجلاس تجدید
مقام : رویندرا بھارتی تھیٹر

متوازی اجلاس

- ۹ بجے شب - گجراتی - مقام : گجراتی ودیا[illegible]
- ۵ بجے شام - ہندی (نثر)، مقام : رویندرا بھارتی
- ½ ۵ " " - کنڑی - کرناٹکا ساہتیہ مندر
- ½ ۵ " " - ملیالم - این ایس کے کے اسکول
- ½ ۵ " " - مرہٹی - ویویک وردھنی اسٹیج
- ۶ " " - تلگو - ساہتیہ اکیڈیمی
- ½ ۶ " " - ٹامل - کیتھر ہائی اسکول

پیر، ۱۱ / فروری ۸۵ء

- ۱۰ بجے صبح - مزاحیہ ادب پر سمپوزیم
مقام جوبلی ہال
- ۸ بجے شب - مشاعرہ (اردو + ہندی)
مقام - فٹ بال میدان (فتح میدان)

منگل، ۱۲ / فروری ۸۵ء - ۱۰ بجے صبح - انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کا اجلاس مقام - جوبلی ہال
- ½ ۲ بجے دن - مستقبل کے منصوبے پر مباحثہ اور اختتامیہ اجلاس - مقام - رویندرا بھارتی

آنند کمچتی راجو
صدر

نریندر لوتھر
کارگزار صدر

طالب خوندمیری
معتمد عمومی

رشید قریشی

وہ آئیں گھر میں ہمارے...

چندہ مانگنے والے

گھر میرا دو دروازوں کا گھر ہے۔ اس لئے چندہ مانگنے والوں کے دو رخی حملوں کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ ایک دروازہ پر ان پٹ بازوں کو بھگت کر دوڑتے ہوئے دوسرے دروازہ پر جا کھڑا ہونا پڑتا ہے اس اعلان کے لئے کہ بابا یہ دروازہ بھی اسی گھر کا ہے جس پر آپ ابھی ابھی یلغار کر چکے ہیں آگے بڑھئے اور کسی اور دروازہ کو اپنا تختۂ مشق بنائیے۔ بعض چندہ مانگنے والے اس اصول کے پابند ہوتے ہیں۔ ایک دروازہ پر رکو۔ اور وہیں ثابت قدمی سے ڈٹ کے رہو۔ ان اہل چندہ گیروں سے چھٹکارا پانا ایسا ہی مشکل ہوتا ہے، جیسے روح قبض کرنے والے فرشتہ سے جان چھڑانا۔

تلاشی کے عاجزانہ اظہار کے بعد معذرت خواہ ہو کر صاحب خانہ گھر کے اندر چلا جاتا ہے وقفہ وقفہ سے ٹوہ لیتا رہتا ہے کہ چندہ لینے والے دفع ہوئے یا نہیں۔ اور ہر بار یہی خبر ملتی ہے کہ۔ نہیں گئے۔ کھڑے کے کھڑے ہیں۔ تنگ آکر وہ کسی بہانے گھر سے نکل جاتا ہے۔ کافی دیر اِدھر اُدھر گھوم کر وہ واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ دھرنا بدستور جاری ہے۔

میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ ایسی ہی ایک صورتِ حال میں اس نے اپنا بش شرٹ دیکر محاصرہ سے رہائی پائی۔ اس سخاوت کی جرأت میں نہیں کر سکتا کیوں کہ میرے پاس صرف دو بش شرٹ ہیں۔ ایک میں پہنتا ہوں تو دوسرا میرا دھوبی۔ میرا طریقہ کار یہ ہے کہ گلو خلاصی کیلئے معقول اور قائل کرنے والے عذرات پیش کرتا ہوں۔۔ وہ قبول نہ ہوں تو تحقیق و تفتیش پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں باہر نکلا۔ ایک پریشان حال شخص نے روتے ہوئے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ "بیوی مرگئی ہے حضور... اس کی تجہیز و تکفین کے لئے چندہ عنایت کیجئے۔" میں نے اُسے سمجھایا "بھائی سمجھ سے کام لو۔ پہلے بیوی کی تجہیز و تکفین کرو۔ بعد میں چندہ مانگو... تم اگر چندہ مانگتے رہے اور وہ اٹھ بیٹھی تو... وہ گڑگڑانے لگا۔ "حضور میں سچ کہہ رہا ہوں..." میں نے سخت لہجہ میں ٹوکا "تم جھوٹ کہہ رہے ہو" کیونکہ بیویاں بیوہ ہونے کے بعد مرتی ہیں۔ پہلے نہیں۔" اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے اس نے التجا کی "حضور آپ خود چل کر

اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ میں نے کچھ رقم لے لی اور اس شخص کے ساتھ ہولیا۔

وہ ایک گلی کے اندر چھوٹے سے کمرہ کے سامنے رک گیا۔ دروازہ کو ڈھکیل کر اس نے گلوگیر آواز میں پکارنا کریا زندگی میں تو تو کبھی چپ نہیں رہی۔ اب کیوں ترا منہ بند ہے۔" دیکھ حضور تجھے دفنانے کا انتظام کرتے آئے ہیں" جھک کر میں نے کمرہ کے اندر نظر دوڑائی۔ بوریہ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ چہرہ کے حصہ کی چادر میں کوئی جنبش تو نہیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ چادر، مٹی کی پرت کی طرح جامد تھی۔ البتہ ایک تبدیلی نے مجھے چونکا دیا۔ جب دروازہ کھلا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں چادر سے باہر نکلی ہوئی تھیں ... وہ چاروں انگلیاں اب چادر کے اندر چلی گئی تھیں۔ میں نے اس شخص کے آنسو پونچھے۔ اور ایک روپیہ دے کر اُسے اگربتیاں لانے کے لئے بھیج دیا۔ وہ چلا گیا تو میں کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ اطراف کا جائزہ لیا تو مجھے طاق میں ناس کی ڈبیہ نظر آئی۔ میں نے ناس کی ڈبیہ اٹھالی اور لاش کے چہرہ پر سے چادر ہٹا کر آدھی سے زاید ڈبیہ اس کے نتھنوں میں جھونک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ... چادر کے اندر ... کچھ ایسی ہیجانی ہلچل مچ گئی۔ جیسے کسی اژدھے کو تھیلے کے اندر بند کر دیا گیا اور وہ آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہا ہو۔ اتنے میں وہ شخص اگربتیاں لے آیا اور چادر کے تلاطم کو دیکھ کر سکتہ میں آگیا۔ میں نے اگربتیاں سلگائیں ... اور کمرہ میں ایک دھماکہ ہوا۔ کمرہ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اس شخص کو دلاسہ دیا۔" رد مت بھائی ہو سکتا ہے۔ چھینک کے ساتھ تمہاری بیوی کا دم بھی نکل گیا ہو،" حضور۔ حضور" وہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔" ایک چاء ہی کے پیسے حضور"۔ لیکن میں فریب خوردگی کی کوفت میں کھولتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ عورت بھی شاید چندہ مانگنے آئی ہے۔

"آپ کون ہیں؟"

"صاب۔ میں غریب عورت ہوں۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ لیکن اب شادی بھی میں کردں۔ تو یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" کیوں کیا تمہارے شوہر نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا" اجی صاحب آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں اپنی شادی کی بات نہیں کر رہی ہوں۔۔ میں تو اپنی بیٹی کے لئے بھیک مانگنے نکلی ہوں۔ آپ سے جو بھی ہو سکے حضور ... اس کا باپ تو دس سال سے لاپتہ ہے۔۔ ایک غریب بچی کی شادی ہے صاب"۔

"غریب بچی کی شادی پر کتنا خرچ ہوگا؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"غریب بچی۔ غریب دلہن" لیکن ایک ایکس وائی زیڈ موٹر سیکل چاہیئے دولہے کو"۔

میں نے پوچھا" دلہن نہیں چاہیئے دولہے کو؟"

عورت ہنس پڑی۔" دلہن کو کون چھوڑتا ہے صاحب"۔

"دلہن کیسی ہے؟"

"بس دلہن کے جیسی ہے"۔

مجھے گریجویٹی کی رقم ملی تھی۔ ۔ اور میں چاہتا تھا کہ اس میں سے کچھ رقم کارِ خیر میں صرف ہو۔ ایسا کارِ خیر، جو سرپرستی سے محروم کسی نوخیز زندگی کو سہارا دے کر دنیا میں آباد کر دے۔

میں نے کہا "میں دلہن کو دیکھوں گا اور جس قدر بھی مجھ سے ممکن ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ مدد کروں گا"

عورت خوش خوش مجھے اپنے گھر لے گئی۔ باہر ایک نوجوان گنے کی چھڑی چھیلتا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "یہ انگوٹھی خریدیں گے آپ؟ خالص سونے کی ہے۔ میں نے سنی ان سنی کر دی تو اس نے کہا "چوری کا مال نہیں" سسرال سے ملی ہے" میں نے گردن کو لفی کا جھٹکا دیا۔ سوچنے لگا۔ سسرال سے ملی گئی ہے تو چوری ہی تو کی گئی ہے۔ وہ عورت ساڑی بدل کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ پھولدار ساڑی۔ اور چہرہ پر اچٹتا، پاؤڈر کا چھڑکاؤ۔ میں نے پوچھا "بہت دیر لگا دی تم نے" اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اور دیکھتے دیکھتے سپنا نے کن سوچوں میں کھو گئی۔ اسی وقت مری آنکھوں میں موتیا کے پھولوں کا وہ باسی ہار پھر گیا جسے کچرے کی کنڈی میں پھینک دیا گیا تھا۔

اس عورت کے اشارہ پر میں اس کے پیچھے گھر کے اندر گیا۔ ایک نیم تاریک کمرہ کے بیچوں بیچ ایک لڑکی سُرخ اوڑھنی سر پہ ڈالے، جھکی جھکی بیٹھی تھی۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ میری طرف کر دیا۔ ہونٹوں پر مسی کی سیاہی۔ پیشانی پر آپاش کی روشنی۔ آنکھوں میں بادل۔ بادل میں بجلیاں! میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹوں کی گنتی کرنے لگا۔ میں فی الوقت پانچسو روپے اور شادی کے دن، پانچسو روپے دینا چاہتا تھا۔ یکایک۔ دلہن کی گود سے شیر خوار بچے کی چیخ بلند ہوئی۔ میں مبہوت کھڑا رہ گیا۔ دلہن کی گود میں بچہ۔ سنبھل کر، میں نے اپنی جیب سے ۱۰ روپیہ کا ایک نوٹ نکالا اور دلہن کی گود میں پھینک دیا۔

"یہ اس معصوم بچہ کے بچے کے لئے ہے۔ تمہارے لئے اس دن جب تمہاری شادی ہوگی" پلٹا تو۔ ۔ ۔ اس قدر کا پتہ نہ تھا۔

یہ شاید کوئی برات ہے۔ جو میرے دروازہ پر رکی ہے۔

باہر نکل کر دیکھتا ہوں۔ تو۔ ایک مکمل بیانڈ کے خوش پوش فن کار نغمہ نواز تھے۔

"ارے بھائی کون ہیں آپ؟ اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

ایک نوجوان جس کے ہاتھ میں رسید بک تھی۔ آگے بڑھا۔

"ہم لوگ ماڈرن یتیم خانہ کے بالکل فرش Fresh یتیم ہیں۔ نئی نسل کے مستقبل کو روشن کرنے کے لئے آپ سے چندہ مانگنے آئے ہیں۔ میں نے کہا "بھائیو۔ میں خود بھی یتیم ہوں۔ ایک یتیم دوسرے یتیم کو یتیمی کے سوا کیا دے سکتا ہے!"

ڈرم بجانے والے نوجوان نے کہا "اگر آپ بھی یتیم ہیں تو اس گھر میں کیوں ہیں! یتیم خانہ چلئے" میں نے گردن جھکا دی اچھا بھائی مجھے لے چلو لیکن یتیم خانہ ہے کہاں؟۔ بتایا گیا "یتیم خانہ ہمارے مینجر کے گھر میں ہے۔ ہمارا مینجر یتیم ہے اس کے بچے یتیم ہیں۔ اس لئے اس کا گھر یتیم خانہ ہے"

"میرا کام کیا ہوگا؟" میں نے پریشان لہجہ میں پوچھا۔

رسید بک والے نوجوان نے جواب دیا "مینجر کے ہاتھ مضبوط کرنا۔ اور یہ کس طرح کرنا ہوگا ؟"
سمجھایا گیا۔ "مالش" مینجر کے ہاتوں پر تین ٹائم زیتون کے تیل کی مالش" میں لپک کر گھر کے اندر آگیا۔۔۔ اور دوسرے دروازہ سے باہر نکل گیا۔ ادھر اُدھر کیوں جاؤں میں۔ یہ دنیا بھی تو ایک بڑا یتیم خانہ ہے۔
اور یہ تو خدا کی قدرت ہی تھی کہ عین عید کے دن چندہ مانگنے والے میرے گھر آئے۔ دروازہ پر شور ہورہا تھا۔
آپ کی کھال لینے آئے ہیں۔ باہر تشریف لیئے باہر۔
میں چیخا۔
"میری ایک ہی کھال ہے وہ بھی آپ اتارلیں تو پھر میں رہوں کس میں ؟"
جواب ملا۔ "اجی حضرت آپ کی کھال نہیں۔ جس بکرے کی آپ نے قربانی دی ہے۔ اس بکرے کی کھال ہمیں درکار ہے"
میں پھر چیخا۔ "بھائیو۔ اس سال قربانی دینے کی استطاعت مجھ میں نہیں تھی۔ میں نے قربانی نہیں دی۔ مجھے معاف کرو"
ایک للکار بلند ہوئی۔ "بکرا نہیں خرید سکے۔ لیکن بکرے کی کھال تو خرید سکتے تھے۔ ہمارے لئے لیکن خیر۔ آئندہ بقرعید میں دو کھالیں دینا ہوگا ؟"

یہ چند نمونے تھے، چندہ مانگنے والوں کے۔ ان کے انداز قد کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیئے۔ اور وہ چاہے جس بھیس میں آئیں۔ انہیں پہچان لیجئے۔ ورنہ چندہ دیجئے!

کرفیو

رضا نقوی واہی

دہشت سے شہریوں کا بُرا حال ہے گھر میں
کرفیو میں ہوا شہر لُٹیروں کے حوالے

قانون کے رکھوالے بھی ہمراہ ہیں ان کے
آسانی سے توڑے گئے دوکانوں کے تالے

بازار کی جب ہو چکی جی بھر کے صفائی
مصروف ہوئے جشنِ چراغاں میں جیالے

مخصوص علاقوں میں جو کھیلی گئی ہولی
رنگوں کے عوض آئے نظر خون کے تھالے

تحلیل دھماکوں سے عمارات ہوئیں یوں
جس طرح سے آندھی میں اُڑیں روئی کے گالے

جُھلسی ہوئی لاشوں کی جو تصویر چھپی ہے
اُن میں کئی اطفال بھی ہیں گھنگھر والے

ہے بے گُنہی زد میں تشدد کی کچھ ایسے
مُنہ اپنا انصاف ہے گریبان میں ڈالے

جب کھیل ہوا ختم، بنی امن کمیٹی
رکھے گئے چُن چُن کے سبھی لوٹنے والے

اسبابِ فسادات پہ اب خوب چھپیں گے
اخبار و رسائل میں مضامین و مقالے

○

"سالِ نو"

اسمٰعیل ظریف

سالِ نو پھر ہمیں پیغامِ وفا دیتا ہے
پھر دسمبر میں ہمیں ہاتھ بتا دیتا ہے

راس آجائے تو کرسی بھی دِلا دیتا ہے
ورنہ آپس ہی میں چمچوں کو لڑا دیتا ہے

ہر نیا سال نئے گُل بھی کِھلا دیتا ہے
اچھے اچھوں کو یہ چلّے بھی لگا دیتا ہے

ملاوٹ حد سے گزر جاتی ہے جب میکش کی
ایسے میکش کو زنجیر میں بھی ملا دیتا ہے

پیٹ کے واسطے جو شخص گیا ہے باہر
سالِ نو سالوں سے اسکو بھی ملا دیتا ہے

آخری وقت میں بیمار کو اک نیم حکیم
نیند کی گولیاں دو چار کھلا دیتا ہے

چھت اُڑا دیتا ہے محفل میں وہ شاعر آ کر
جو چلے بیاک غزل لا کے سُنا دیتا ہے

ایک دن ٹانگ سے محروم نہ ہو جائے کہیں
سماج میں لوگوں کے جو ٹانگ اڑا دیتا ہے

جب بھی ہم جاتے ہیں اک دوست سے ملنے کو ظریفؔ
آدھی پیالی ہی سہی چائے پلا دیتا ہے

شفیقہ فرحت
(بھوپال)

بھوپال میں گیس کے بادل

وسط ہندوستان کا یہ جھیلوں اور تالابوں والا چھوٹا سا شہر جہاں کی زندگی تالاب کے پانی کی طرح سوئی سوئی، ٹھہری ٹھہری، رکی رکی ہے۔ جو تاریخ، جغرافیہ، ادب، سیاست کسی بھی اعتبار سے (ماسوا ڈاکیات) کیا ماضی قریب کیا ماضی بعید کبھی کوئی خاص اہم نہیں رہا۔ آج اسے افسران عالی کی ادائے دلبرانہ و شاعرانہ کی بناء پر ملک گیر، عالم گیر، جہانگیر شہرت حاصل ہو گئی ہے۔
یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ All Road Leads to Rome کہ راستے سب بند ہیں کوچۂ قاتل کے سوا۔
مگر دنیا کا ہر اخبار اور ہر ریڈیو اور ہر ٹیلی ویژن شروع کرتا ہے اپنی خبریں نام سے بھوپال کے اور ختم کرتا ہے کام تا مول پہ بھوپال کے
ٹیلیفون کی ہر لائن بک ہے بھوپال کے لئے اور ہر تار منسوب بھوپال کے نام سے۔
ہر وقت ٹیلی پرنٹر کھڑکھڑا رہے ہیں ہر لمحہ قلم رواں دواں ہے۔ ہر آنکھ نم اور ہر گھر ماتم کدہ ہے۔ کہ دو دسمبر ۸۴ء کی انتہائی مسموم رات کے پچھلے پہر دنیا کا سب سے المناک واقعہ رونما ہوا۔ شہر گیس چیمبر بنا اور موت نے شب خوں مارا۔ زندگی پناہ اور اماں کی خاطر سر برہنہ گریباں دریدہ بھاگتی پھری۔ ہر طرف بھاگ دوڑ، شور، قیامت، نفسا نفسی مگر اس سفاکی کربناک المناکی کے درمیان چلتے چلاتے، بھاگتے دوڑتے، ہانپتے، کانپتے زندگی کے کچھ نرم، لطیف، عجیب و غریب پہلو بھی ہاتھ آتے رہیں۔

ایک طرف تو یہ نفسا نفسی کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ انسانیت، رواداری محبت دوستی سب زخمی، سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سب بھاگ رہے ہیں دوڑ رہے ہیں۔ کوئی کسی کے لئے رکتا نہیں، کوئی کسی کے لئے ٹھہرتا نہیں، پیچھے پلٹ کر دیکھتا نہیں کہ کہیں پتھر کا نہ ہو جائے اور خود بھی جان سے جائے۔
نحیف، کمزور، بوڑھے، بے کس، بے بس، بیمار سب سے بچ رہے ہیں کہ یہ خاہیدہ اماں ہیں۔
ایسے میں دیکھا کہ کالے برقعوں کا ایک قافلہ کہ جس میں ستر پچھتر سال کی پرنانی، پردادی بھی ہیں اور چھ مہینے

بلی بھی گرتا پڑتا، کھانستا، جھینکتا، آنسو پونچھتا تین بکریوں کی رسی تھامے چلا جا رہا ہے۔ بکریاں انھیں پیچھے کھینچ رہی تھیں۔ وہ بیٹا کو آگے بڑھا رہی ہیں باشعور، عقلمند، ہوشمند جان بچا کر سرپٹ بھاگ رہے ہیں اور وہ بکریوں کی خاطر جان عزیز کو خطرے میں ڈالے دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں۔

پوچھا "یہ کیا حماقت ہے؟" ڈری سہمی کمزور سی آواز میں جواب ملا:-

" بکریاں ہم لوگوں کے بغیر رہتی نہیں ہیں؟"

جس وقت خطرے کا سائرن بجا اور بھاگو دوڑو کا شور مچا کچھ منچلے ویڈیو پہ پکچر دیکھ رہے تھے، جب ان سے ویڈیو بند کرنے کے لئے کہا گیا تو جواب دیا:- واہ کیسے بند کریں۔ ساٹھ روپے خرچ کئے ہیں؟"

ارے بھئی صبح دیکھ لینا۔ صبح آپ دیکھئے ہم تو فلم دیکھیں گے۔ دوسرے نے ٹھینگ کے فرمایا۔ "سڑک پر اجنبیوں کے درمیان مرنے سے اپنے ہیرو ہیروئن کے ساتھ مرنا بہتر ہے؟" اور وہ فلم دیکھتے رہے۔ لوگ بھاگتے رہے۔

خواتین اس نفسا نفسی اور بھگدڑ میں بھی اپنے لباس اور میک اپ سے بے پرواہ نہیں رہیں۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ اپنے خوش رنگ ساڑیاں لپیٹ رہی تھیں اور لپ اسٹک کریم پوڈر پرس میں ٹھونس لیا کہ زندہ رہیں تو لائیٹ میک اپ ہو اور مر جائیں تو اتنے بھیانک تو نظر نہ آئیں کہ اعزہ لاش کو ہاتھ نہ لگائیں اور مردہ پڑا سڑتا رہے۔

جیپ، موٹر، اسکوٹر، ٹرک، سائیکل جسے جو میسر آیا وہ اس پہ بھاگا۔ ایک تانگے والے نے اپنا تانگہ جوتا اور اس پہ اپنی بکریاں بٹھائیں، مرغیوں کا ڈربہ اور طوطے کا پنجرہ رکھا، بغل میں بلی دبائی تب کہیں نہایت اطمینان سے ٹخ ٹخ کرتے روانہ ہوئے۔

ایک بوڑھی کبڑی بیوی جن کے لئے دو چار قدم چلنا بھی مشکل تھے۔ کڑے کمان کے تیر کی طرح تنتناتی سب سے آگے بھاگی چلی جاتی تھیں۔

اور خود ہم — گھر میں گیس کے آزادانہ داخلے اور مٹرگشتی کے باوجود پناہ گزینوں کی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

یہ تو عالم بے خبری کی وارداتیں تھیں۔ اب ۱۶ر دسمبر کے روز حشر سے پہلے کی احتیاطی تدابیر کی بھی کچھ جھلکیاں حاضر ہیں — عوام نے حسب معمول حکومت کے جملہ اقدامات کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا اور کسی وعدے پہ اعتبار نہ کرتے ہوئے خود اپنی احتیاطی تدابیر کی مہم تیز سے تیز تر کر دی کہ کہیں پھر نہ تاریک راہوں میں مارے جائیں؟

حکام جس عاجزی اور تندہی سے شہر میں رہنے کی درخواست کرتے تھے عوام اتنی ہی تیزی سے شہر سے ہجرت کر رہے تھے۔ لہٰذا دو دن کے اندر اندر دو لاکھ تالے فروخت ہو گئے۔ [illegible] کے کاریگروں نے قائم اور قفل بازوں کے جیسے کئی دبستان بھی تھانہ کچہری کے آس پاس کے علاقوں میں کھل گئے۔ کہ جو تالے بچے اور کھلتے ہیں کھلتے بھی تھا!

دوسری کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی خبر یہ ہے کہ تنگ دامنی، تنگ دستی تک پہنچ گئی۔ سیل رواں اشک کو روکنے اور لہو پونچھنے کی دامن میں نہ گنجائش، نہ ربط نہ عادت۔ لہٰذا شہر کا ہر درزی دستی سینے میں مصروف تھا (اگر کفن سینے سے مہلت ملی ہوتو!)

افواہ گرم تھی کہ گیس سے بچنے کے لئے ہوا کا رُخ دیکھنا ضروری ہے۔ اب لوگ بیچ شہر میں چورا ہوں پہ کھڑے ہوا کا رُخ پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا ہوا کا رُخ وہ بھی الکشن کے موسم میں کوئی سمجھ پایا ہے کہ اس سیدھے سادے شہر کے بھولے بھالے شہری جان لیتے۔ سو ہاتھ میں توشہ لئے ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ جائیں کدھر کو ہم۔ ایک انتشار ایک کنفیوژن پھیلا تھا۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ مگر پھر بھی بھاگ سب رہے تھے۔ کیا خواص کیا عوام شہر۔ محلے سنسان، گلیاں خاموش، سینما گھر بے آواز، بازار جڑے ہوئے، ہر طرف سناٹا، ہر سمت اندھیرا، ہر تنّے بند، گھروں کی کھڑکیاں، دلوں کے کواڑ، ہونٹوں ہنسی، چڑیوں کی چہکار، پھولوں کی مسکان ــــ!!

■■

رؤف خوشتر . . . .

ستاروں کے پیچھے

اب سیاسی اور فلمی اُفق کے ذمہ دار و نامدار ستارے ہی مستقبل کا حال جاننے کے لئے بے تاب نہیں ہیں، بلکہ عام آدمی بھی خاص مجبوریوں کو دور کرنے کے لئے نجومی کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے۔ چنانچہ نیتا اور ابھینیتا کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہم ہی نہیں بلکہ ستاروں کے پیچھے جہاں اور بھی ہیں۔

اپنے کلچر اور ایگری کلچر پر نازاں آج کا انسان کل کے خوف سے لرزاں ہے۔ یہی خوف اُسے نجومی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور یہ قسمت کا حال اور کل کا حال بتلانے والے اپنے آج کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔

نجومی عمومی طور پر وہ شخص ہوتا ہے جو سوائے اپنے سب کی قسمت کا حال بتلا سکتا ہے۔ اپنے چہرے بشرے پریشان حالی اور جیب خالی کی وجہ سے وہ "تقدیر بناتا ہوں تقدیر نہیں بنتی" کا چلتا پھرتا اشتہار لگتا ہے۔ ہم اُس کے چہرے پر پڑی لکیریں دیکھ کر اُس کی قسمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

جیسے ہی کوئی بھولا بھٹکا ان کے قریب آتا ہے تو یہ آواز لگاتے ہیں "قسمت آزمالو، نصیب چمکالو" جب کوئی ان کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو یہ ہاتھ بڑھانے کے لئے کہتے ہیں۔ یعنی اُن کا ہاتھ پکڑ کر کچھ بڑبڑا کر اُس پر رعب ڈالتے ہیں۔ اصل میں ان کی نگاہیں ہاتھ کی لکیروں کے پیچ و خم سے زیادہ پرس کے اُبھار پر مرکوز ہوتی ہیں۔ گویا کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ والا معاملہ ہوتا ہے۔ پرس کے بھرپور جائزے سے زائچے تیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن در پردہ اپنے مسائل حل کئے جاتے ہیں۔ اور وہ بے چارہ ستاروں اور شاطروں کے چکر میں پھنس کر خالی جیب اور بھرپور اُمیدیں لئے گھر لوٹتا ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں سے وابستہ افراد کی طرح ان میں بھی طبقاتی فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سرراہ کسی پیڑ کے سائے تلے بیٹھے ہوئے نجومی سے لے کر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لوٹنے والے نجومیوں کے مختلف اقسام و دام ہیں۔ اپنے نصیب کی طرح یہ خود بھی اُونگھتے ہوئے کسی پیڑ کے سائے تلے بیٹھے ہوئے نجومی کے پاس دو تین طوطے

ہوتے ہیں۔ طوطے جن کی [illegible] سے یہ اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور یہ طائرِ نجومی جن کی پرواز میں کوتاہی ان کے رزق کا سبب بنتی ہے، موقعہ ملنے پر بھی اڑنے سے رہ جاتے ہیں اور نجومی کی بخالت کو رزاقی بلکہ فیاضی سمجھ کر محض چند دانوں پر قناعت کر جاتے ہیں۔ طوطوں کی تو بات کیا۔ اب جنگل کا راجہ (سابق) شیر بھی سرکس اور چڑیا گھر میں مُرتے کو غنیمت جاننے لگے ہیں۔

طوطوں کے علاوہ نجومی کے پاس چند شکستہ و بوسیدہ لفافوں میں ناقابلِ فہم تحریریں ہوتی ہیں جو بقول اُن کے آریہ بھٹ اور راما نجم کے زمانہ سے نسل در نسل اُن کے ہاتھوں پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر حضرات مفت میں بدنام ہیں کہ صرف ان ہی کی تحریریں ناقابلِ فہم ہوتی ہیں۔

ہم نے ایک نجومی کو خلافِ معمول ایک خوشنما و معطر لفافہ پڑھتے ہوئے اور اُس کے روبرو بہت خوبصورت اور حسین نہ سہی لیکن واجب الفدا لڑکی کو فرطِ شوق سے سنتے دیکھا تو نجومی کی قسمت پر رشک اور لڑکی کی صحت دماغی پر شک کرتے رہے۔ لڑکی کی رخصتی کے بعد ہم نے نجومی کو پکڑا اور پوچھا۔

"یا نجومی یہ ماجرا کیا ہے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا

"بھائی صاحب اس کا محبوب ایک ڈاکٹر ہے۔ چوں کہ دوائیوں کی دوکان بند ہے۔ اس لئے ڈاکٹر کا خط مجھ سے پڑھواتی ہے" "کیمسٹ نہ ہو تو اس پامسٹ سے کام لیا جاتا ہے"

اس لئے ماہرِ صحت و ماہرِ قسمت اپنی شکستہ و گنجلک تحریر کے وصف کی وجہ سے ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔

القصہ جب کوئی پشیمان عیال اور پریشان حال شخص ان کے پاس پہنچتا ہے تو یہ طوطے کو پنجرہ سے باہر نکال کر گاہک کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ طوطا شانِ بے نیازی سے اپنی سرخ چونچ میں سیاہ لفافہ لے کر جلدی سے مالک کے آگے ڈال دیتا ہے اور یوں بدبودار لفافہ سے نجات پاتا ہے۔

اب گاہک کی قسمت لفافہ کے ساتھ کھلتی ہے۔ نجومی قسمت شناس سے زیادہ قیافہ شناس ہوتا ہے اور سامنے والے کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے ماہرِ موسمیات کی طرح مبہم اور غیر واضح پیشینگوئیاں کرتا ہے۔ یعنی زندگی آرام سے تو کٹے گی اگرچہ مشکلات درپیش ہوں گی اولاد تو ہوگی لیکن اس کے پہلے شادی ہونا بھی ضروری ہے۔

مرد زیادہ تر ملازمت، ترقی، تبادلہ اور کاروبار کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو خواتین ساس، بہو اور دیگر گھریلو مسائل کی یکسوئی کے لئے بے چین [illegible]۔ بہو کو ساس سے دور کرانے اور ساس کو بہو سے لڑانے میں یہی فرد مشترک ہوتے ہیں۔ دونوں کے جھگڑوں سے جن کا خانہ برباد ہوتا ہے۔ اُس سے یہ اپنا خانہ آباد کر لیتے ہیں۔ فریقین میں کبھی بہو کو گھر سے باہر نکالتے ہیں اور کبھی ساس کو دربدر کرتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی خارج از مکان کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں!

اب آیئے ہوٹلوں والے مہنگے نجومیوں کی طرف۔ ہوٹلوں کے صدر دروازوں پہ ہاتھ کی لکیروں والی ایک نمایاں تصویر لٹکی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے تمام مسائل کے حل کئے جانے کا دعویٰ تحریر ہوتا ہے۔ ہر سوال کی الگ الگ فیس ہوتی ہے۔ ایسے ہوٹلوں اور نجومیوں کی طرف وہ لوگ آتے ہیں جن کے پاس فالتو دولت اور فالتو وقت ہے۔

ہمارے ایک دوست جن کے پاس فی الوقت فالتو وقت تو ہے فالتو دولت نہیں۔ اور فالتو دولت حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک جانے کا جنون ہے وہ ایک دن ہمیں لے کر ہوٹل پہنچے۔ وہاں فیس ادا کر کے جب نجومی کے کمرے میں پہنچے تو محسوس ہوا جیسے اہرام مصر پہنچے ہیں۔ گلدان کی جگہ کھوپڑیاں تھیں۔ سگریٹ کی بجائے لوبان کا دھواں تھا۔ نجومی کھوپڑی ہاتھ میں لئے بڑبڑا رہا تھا۔ بعد میں دوست کا ہاتھ لئے خوردبین سے لکیریں دیکھنے لگا۔

دوست نے پوچھا کب تک باہر جا سکوں گا؟

اور وہ ایک پیر پر یوں بیٹھے تھے کہ نجومی ابھی وقت بتائے گا اور یہ پرواز کر جائیں گے۔

نجومی کچھ کہنے والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

نجومی نے غصّہ سے پوچھا کون ہے؟"

یہ سُن کر ہمارے دوست ہاتھ چھڑا کر باہر آ گئے۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا۔

"یار وہ نجومی اپنے علم سے کیا یہ نہیں جان سکتا تھا کہ باہر کون دستک دے رہا ہے۔ جب وہ یہ نہیں جانتا کہ کون اندر آنا چاہتا ہے تو پھر وہ یہ کیسے بتائے گا کہ میں کب باہر جاؤں گا۔"

ہم نے کہا۔

"جب تک تم جیسے ضعیف الاعتقاد لوگ ہیں نجومی کے ستارے عروج پہ ہوں گے۔

ستیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

OO

رہبر مُوا کہیں کا ——— صابر بہاری (کراچی)

ایسا ملا ہے ہمکو لیڈر موا کہیں کا
آیا نہ پھر دوبارہ گھر پہ موا کہیں کا

آیا تھا ووٹ لینے بن کر شریف صورت
کیا کیا نہ کہہ گیا تھا آکر موا کہیں کا

باتیں وہ لمبی لمبی وہ چکنے چکنے وعدے
منہ میں زباں رکھے ہے گز بھر موا کہیں کا

دو چار سال پہلے نکڑ پہ گاؤں کے وہ
تقریر کر رہا تھا فر فر موا کہیں کا

خادم ہوں قوم کا میں کس منہ سے کہہ رہا تھا
کرتا تھا مثلِ مینڈک ٹر ٹر موا کہیں کا

مجھکو ہی ووٹ دیجئے میں آپکا ہوں سیوک
جا جا کے کہہ رہا تھا گھر گھر موا کہیں کا

کرتا تھا وہ نسیدھے جو کل ہمارے جوتے
ٹھکرا رہا ہے ہمکو در در موا کہیں کا

اے گردشِ زمانہ یہ دن بھی دیکھنا تھا
رہزن بنا ہوا ہے رہبر موا کہیں کا

تضمین

دے گیا داغ دغا ہمکو وہ سیوک بنکر
جیت کر آیا نہیں ہائے یہ کیسا ہے مذاق

میرے ووٹوں کا ہی نیتا نے سہارا لیکر
"تم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق"

کرشن پرویز (کھرلی پٹیالہ)

○

سُنا ہے جو تم نے حقیقت نہیں ہے
ابھی غیر اتنی بھی حالت نہیں ہے

خُدا کے کرم سے میاں بیوی ہیں بس
میرے گھر میں بچوں کی کثرت نہیں ہے

اگر ہم ہیں بدنام دنیا میں یارو
کچھ اچھی تو ان کی بھی شہرت نہیں ہے

ترقی کا یہ دور کیسا ہے آیا
کسی شے میں رنگِ حقیقت نہیں ہے

کہا ہے جو پرویز نے ٹھیک ہوگا
اُسے جھوٹ کہنے کی عادت نہیں ہے

(۲)

حسپا پلوسی اگر نہیں آتی
لکشمی اُس کے گھر نہیں آتی

ہائے تو یہ تمہارے خراٹے
نیند آتی نظر نہیں آتی

چاند پر کس جگہ کوئی بیٹھے
کوئی کرسی نظر نہیں آتی

کیا کروں میں کہ میری گھر والی
اب تو میرے بھی گھر نہیں آتی

تم کو پرویز کچھ نہیں آتا
ہیرا پھیری اگر نہیں آتی

رؤف رحیم (حیدرآباد)

مچھر میرے ساتھی

انسان کا مچھر سے اتنا ہی پرانا تعلق ہے جتنا کہ انسان کا خود اپنے آپ سے۔ یعنی جب انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ مچھر کی مہربانی سے رو کر یہ ثبوت دیتا ہے کہ

؎ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

اس کے بعد سے زندگی بھر رونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اب مچھر ہماری زندگی کا ایک جُز بن گئے ہیں۔ حکومت نے جنگلی جانوروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ مچھروں کی افزائش نسل کا خیال رکھا ہے محکمہ ٹیلیفون ہو کہ محکمہ آبرسانی جگہ جگہ سڑکوں کو توڑ کر اپنا کام کر لیتے ہیں اور جو خلا رہ جاتا ہے اُسے گندہ پانی پُر کر دیتا ہے۔ مچھر بھی انسانوں کی طرح فیملی پلاننگ سے ناواقف ہوتے ہیں اور اُن کی تعداد دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھتی جاتی ہے جب ایک انسان اپنے بچے کو کچھ بنانے کے لئے مشن اسکول میں داخلہ دلواتا ہے تو اس کے گھر کی ساری پونجی ختم ہو جاتی ہے یہ سب اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر ہوتا ہے۔ چوں کہ مچھر انسان کے خون سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اُنھیں سارے جھنجھٹوں کی پرواہ نہیں۔

ہم بچپن سے ان مچھروں کے لئے اچھی غذا فراہم کرتے رہے ہیں بس ایک ہی خواب تھا کہ "جب ہم جواں ہوں گے" تو ہماری شادی خانہ بربادی ضرور ہوگی لیکن مچھر دان بھی ضرور ملے گا ہم لین دین کے قائل نہیں لیکن یقین جانیئے ہم نے شادی سے قبل صرف مچھر دان کی فرمائش کی تو سسرال والوں نے شک کیا۔ ہم انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمیں مچھر کٹوا لینے کی عادت ہے لیکن آپ کی نازک لڑکی کے لئے مچھر دان ضروری ہے اس بات پر اُنہوں نے اتنا خوبصورت مچھر دان دیا کہ مچھر صرف مچھر دان کی خاطر اندر رہا کرتے ہیں اور ہم مچھر دان کے باہر۔

مچھروں کی زندگی سے ہمیں یک جہتی کا سبق ملتا ہے وہ کاٹتے وقت کسی کا مذہب نہیں دیکھتے، کسی کا نام دریافت نہیں کرتے لیکن مریض غذا کھانا پسند کرتے ہیں یعنی کہ وہ کبھی ناتوان حملہ نہیں کرتے۔ ہم چونکہ زیادہ صحت مند واقع ہوئے ہیں صرف مچھروں سے بچنے کے لئے ڈائیٹنگ کرنے لگے ہیں۔

ہم نے مچھر کش دواؤں کا استعمال کیا لیکن مچھروں کو نہیں بھگا سکے شاید ان دواؤں میں بھی ملاوٹ تھی ٹی وی سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ ایسے اشتہارات ہم تک پہنچاتا ہے جس کی خرید سمجھدار عوام نہیں کرتے۔ ہم نے ایک خوبصورت ADVERTISEMENT سے متاثر ہو کر "مچھر مار اگربتی" خریدی اور اپنے قریب ایسے رکھا جیسے اپنے لختِ جگر کو رکھتے ہیں۔ اگربتی کے دھوئیں کی خوشبو کمرے میں پھیل گئی اور کمرے کے باہر جو مچھر تھے کھنچے کمرے میں چلے آئے اب ہم یہ فارمولہ استعمال کر رہے ہیں کہ جہاں آرام کرنا ہوتا ہے اس سے دور اگربتی سلگا دیتے ہیں بعض مرتبہ منفی اثرات بھی مثبت ثابت ہوتے ہیں ہم نے کئی مرتبہ تیس مچھروں کو مار کر تیس مار خاں کا خطاب بھی پایا ہے ہمیں اس کی اتنی اچھی عادت ہو گئی ہے کہ اولمپک میں اس مقابلہ کو رکھا جائے تو ہمیں گولڈ میڈل ضرور مل سکتا ہے۔

سُنا تھا کہ کھیت باڑی کی جگہ مچھروں کی بہتات ہوتی ہے لیکن ہمارے گھر مچھروں کی کثرت دیکھ کر ایک صاحب نے اندازہ لگایا کہ ٹی وی پر ہر روز کھیت باڑی کے متعلق پروگرام ہوتے ہیں جس کے باعث مچھر منڈلاتے ہیں تب سے ہم ان اوقات میں ٹی وی بند رکھنے کی ٹھان لی ہے۔

مچھروں کی افزائش کے ذمہ دار حکومت کے ساتھ ساتھ عوام بھی ہے ہم اپنے مکان کے قریب کوڑا کرکٹ ڈال کر انھیں دعوتِ عام دیتے ہیں۔ محکمہ بلدیہ کی کنڈیوں میں کچرا پھینکنے کی توفیق نہیں ہوتی اور ممکن ہو تو ان کنڈیوں کے سرقہ کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ مچھر کش ادویات سڑکوں پر چھوڑی جاتی ہیں جب کہ مچھروں کی بہتات تنگ گلی کوچوں میں ہوتی ہے ہم نے کئی بار منت سماجت کی کہ ہمارے گھر کے قریب سے مچھر کش دوا چھوڑیں تاکہ ہم اپنے گھر کے علاوہ تھیلیوں وغیرہ میں محفوظ کرلیں ہوسکے تو اپنی غذا میں بھی ملالیں تاکہ وہ ہمارے خون میں دوا کی ملاوٹ پاکر ہمارا خون پینا چھوڑ دیں۔

ملاوٹ کے بغیر ہماری زندگی جیسے ادھوری رہ جاتی ہے کچھ دنوں سے جب ہم نے ملاوٹ کی اشیاء کھانا شروع کردی ہیں تو مچھر ہمارے خلاف محاذ بنا کر ہمیں تنگ کر رہے ہیں وہ کاٹنے کی بجائے بھنبھنا کر ہمیں پریشان کر رہے ہیں ہم سمجھے تھے جس طرح بھونکنے والا کتا کاٹتا نہیں' بھاشن دینے والا لیڈر منتخب ہونے کے بعد وعدہ پورا نہیں کرتا اُسی طرح بھنبھنانے والے مچھر کاٹتے نہیں ہیں لیکن معلوم ہوا کہ وہ ہمیں اس لئے نہیں کاٹ رہے ہیں کہ ہم ملاوٹ کی غذا کھا رہے ہیں وہ خالص لیڈروں کی جانب متوجہ ہوگئے ہیں کہ اُن کے خون کی مٹھاس اور ہی ہوتی ہے۔

ہم نے صرف مچھروں کے ظلم سے بچنے کی خاطر ملاوٹ کی غذا کھانا شروع کردیا ہے۔

خون پی پی کر ملاوٹ کی غذا کا اے رحیم
اب رفو چکر ہمارے گھر کے مچھر ہوگئے

اور سوچنا ہے کہ یا تو مچھر رہیں گے یا ہم۔ دیکھنا ہے جیت کس کی ہوتی ہے؟ ہم کو تو ملاوٹ کھانے کی عادت سی ہوگئی ہے لیکن افسوس کہ مچھر اس نعمت سے دور ہیں۔

جس طرح کبھی کبوتر "نامہ بر" کا کام دیتا تھا اُسی طرح مچھر "جراثیم بر" کا کام دیتے ہیں۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مرض کے ایک جسم سے دوسرے جسم تک پہنچانے میں مچھر جو رول ادا کرتے ہیں وہ کسی فلم کا ہیرو بھی نہیں کر پاتا۔ اتنی صفائی سے وہ اپنا کام کر جاتے ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ ان کے اس وسیلے سے ملیریا کا تبادلہ عمل میں آتا ہے۔

ہمیں یہ جان کر تعجب نہیں ہوا کہ صرف مادہ مچھر ہی کاٹتے ہیں کیوں کہ ہر مادہ کا یہی شیوہ ہے ویسے انسانوں اور جانوروں میں ہم نے مادہ کو ہی ظالم پایا ہے نر تو بے چارہ مظلوم ہوتا ہے۔ جس طرح نر مچھر کی زندگی آٹھ دن کی ہوتی ہے اُسی طرح نر انسان کی عملی زندگی شادی کے آٹھ دنوں تک رہتی ہے اس کے بعد سے وہ بے چارہ مرگ مسلسل میں رہتا ہے۔

مچھر کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن اُن میں کیونزم، سوشلزم کے جراثیم پائے جاتے ہیں وہ بوڑھے بچے امیر غریب میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن ڈنک مارنے کے عادی ہوتے ہیں شاید اسی ڈنک سے انجکشن بنانے کا خیال آیا ہو۔

سنا ہے کہ مچھر خون پینے کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں یعنی کہ بعض مچھر صرف انسانوں کا خون پیتے ہیں اور جو خالص خون کے متمنی ہوتے ہیں وہ جانوروں کا خون پیتے ہیں اور ہمارے خیال سے وہی صحت مند ہوتے ہیں بعض کیڑے مکوڑوں کے خون پر اکتفا کرتے ہیں یہ غالباً مچھروں کی سب سے غریب قسم ہے جس طرح انسان نما غریب لوگ کنڈیوں میں اپنی غذا کی تلاش کرتے ہیں جو مچھروں سے بچ جاتی ہے۔

ہماری آبادی کے اضافہ کا سبب بھی غالباً مچھر ہی ہیں جب ہم بستر پر سونے کے لئے دراز ہو جاتے ہیں مچھر سونے نہیں دیتے اور ہم اپنے خیالات کو بدلنے کے لئے کسی اور شغلے میں لگ جاتے ہیں بے چاروں کا تو کچھ نہیں جاتا لیکن غریب انسان افلاس کی کھائیوں میں گر جاتا ہے ہم نے رات بھر مچھر کے مشاعرے بھی سنے ہیں جو مچھر شاعر کا خون چوستا ہے وہ یا تو مر جاتا ہے یا شاعر بن جاتا ہے۔

ملک کے تقریباً ہر علاقے میں مچھروں کی بہتات کے باعث تشویش ہے۔ باہری طاقتوں کے خطرات کے ساتھ ساتھ اندرونی مچھروں کے خلاف محاذ جنگ تیار کرنے کے باوجود ہمیں اُن سے مقابلہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مچھر کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیئے وہ ہاتھی جیسے دیو قامت جانور کی سونڈ میں چلا جائے تو ہاتھی اپنے آپ کو بے بس تصور کرے خدائی کا دعویٰ کرنے والے نمرود کو بھی اسی مچھر نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

اب ہم مضمون کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ہم نے جتنے جملے اُن کے خلاف لکھے ہیں اگر انہیں پتہ چل جائے تو ہمارا اُٹھنا بیٹھنا سونا مشکل ہو جائے گا۔ ہم ان مچھروں سے معذرت چاہتے ہوئے اُن کے سامنے ہتھیار یعنی قلم ڈال دیتے ہیں!!

وعدے اور ان کی تکمیل کے

دو شاندار سال

شری این. ٹی. راما راؤ کی قابل حرکیاتی اور ترقی پسند قیادت میں آندھراپردیش نے عوام کی سرگرم خدمات کے سلسلے میں ۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو دو شاندار سال کی تکمیل کی ہے اور اب وہ مزید ترقی اور پیش رفت کے لئے امید اور توقعات کے لئے نئے باب کا آغاز کر رہا ہے
زائد از ۲۱،۰۰۰ افراد کو گرامہ دیا اور دیگر فلاحی اسکیمات کے تحت فائدہ پہنچایا گیا۔

○ چاول بشرح ۲ روپے فی کیلو

۹۶،۵۴ لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

○ کمزور طبقات کے لئے مستقل امکنہ

۱،۸۵ لاکھ مستقل امکنہ تعمیر کئے گئے ہیں
۷،۱۸ لاکھ مکانات کی جگہ الاٹ کی گئی ہے۔

○ کمزور طبقات کی فلاح و بہبود

۱۳،۵۴ لاکھ درج فہرست اقوام / درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات کے خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔
۳،۴ لاکھ اسکالرشپس منظور کئے گئے ہیں۔

○ پینے کا پانی

۲۸،۱۸۰ پینے کے پانی کے ذرائع پیدا کئے گئے ہیں اور زائد از ۴،۰۰۰ دشوار دیہاتوں کو شامل کیا گیا ہے۔

○ کسانوں کی امداد

۸،۵۰۰ ٹن اعلیٰ اقسام کے تخم تقسیم کئے گئے۔
۵،۴۱ لاکھ ٹن فرٹیلائزرس سربراہ کئے گئے۔

○ دیہی مصنوعات

زائد از ۲۴،۰۰۰ دیہی اور چھوٹے پیمانہ کے صنعتی یونٹس قائم کئے گئے۔

○ مڈ ڈے میلس (دوپہر کا کھانا)

۳۲،۳۴ لاکھ اسکول کے بچوں کو شامل کیا گیا۔

○ رکشا کو ذاتی بنانے کی اسکیم

۲۰ فیصد امداد رکشا رانوں کو دی گئی۔
ایک کروڑ روپے الاٹ ہوئے۔

○ ساڑیاں بطور امداد

۵۰ فیصد امداد ساڑیوں اور دھوتیوں پر گرین راشن کارڈ رکھنے والوں کے لئے۔

○ خواتین کی بھلائی۔

مہیلا یونیورسٹی بمقام تروپتی
موروثی جائیداد میں مساوی حصہ۔ قانون بنایا جا رہا ہے۔

○ بیواؤں کے لئے وظائف

۳،۸۰،۰۰۰ بیواؤں کو ماہانہ ۵۰ روپے فی کس کی شرح پر فائدہ پہنچایا گیا۔

○ بے زمین زرعی مزدوروں کیلئے وظائف پیرانہ سالی۔

۵ لاکھ مزدوروں کو ماہانہ ۳۰ روپے فی کس کی شرح پر فائدہ پہنچانے کیلئے ۶ کروڑ روپے الاٹ کئے گئے۔

(جاری کردہ ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ)

NO. 1/ADVT. IV CA/85 DATE 8.1.85
DIPR, ANDHRA PRADESH.

سنجے لال بھارتی (کلکتہ)

تلاشِ گمشدہ

آئے دن بیگم کی قیل و قال سے تنگ آکر میں نے کچھ کر دکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی شریف انسان آخر کب تک جھاڑو کھانے کے وار برداشت کرے بھئی، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے نا! لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو انسان کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ خواہ دشت و صحرا سے ہی گزرنا پڑے اور پھر میں ایسا ویسا اور گھٹیا قسم کا شوہر نہیں کہ بیوی کی جھاڑو کھاکر اور کڑاہی کی وار برداشت کرکے ہمہ تن گوش رہوں۔ وقتاً فوقتاً اگر جھاڑ کھانا پڑ جائے تو انسان برداشت بھی کرلے مگر یہاں تو نہ صبح کی قید اور نہ شام کی پابندی۔ خواہ مہمان آئے ہوئے ہوں، کوئی دوست یا عزیز موجود ہو وہ ایک دم . . . یا . . . ہو . . . کر ہی دیتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے! آخر یہ کہاں کی شرافت ہے؟ میرا کوئی وقار اور کیریر ہے کہ نہیں؟! میں کوئی زرخرید غلام تو نہیں کہ طعنے برداشت کروں؟؟ مجھے کیا پتہ کہ حضرت باذغ بہاری نے اپنے نجی تجربوں کی بناء پر یہ شعر کہا ہے۔

"ہر شریف انسان ڈرتا ہے پولیس اور وائف سے
کوئی ان دونوں کے آگے پارسا ہوتا نہیں"

خیر ابھی تک پولیس سے واسطہ نہیں پڑا ہے مجھے۔ دیکھئے کب باری آتی ہے۔ آج کچھ اسی قسم کا حادثہ میرے ساتھ پیش آگیا۔ صبح ہوتے ہی میرے منے کی اماں مجھ پہ ایک دم سر سے پاؤں تک گرم ہوگئیں۔ "کیا جی! ناشتے واشتے کی فکر کچھ ہے بھی تمہیں یا محلے والوں میں ہی مکھڑا ہی چھپائے رہوگے؟ میری تو قسمت ہی پھوٹی ہے جو تمہارے بندھن میں بندھ گئی۔ جب سے شادی ہوئی ہے کبھی بھی تم نے سکھ نہیں دیا مجھے صرف ہر نئے سال کی مبارکباد دیتے رہے۔ ہاں . . . ہاں . . . ہاں . . . ہاں . . ." وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "آخر تین ساڑھے تین سو روپیوں میں کیا ہو۔ گھر کیسے چلے؟ اور اب تو میرے گلشنِ حیات میں اللہ کے شکر سے ایک دو نہیں بلکہ چار چار پھول کھلے ہیں۔ گھر اور بچوں کی کفالت کیسے ہو؟!" . . . بیگم کی جھاڑ سے تو آج نانی ہی یاد آگئی۔ میں نے اکثر لوگوں سے سنا تھا کہ دن میں بھی تارے نکلتے ہیں اور یہ تارے صرف شریف انسان

ہی دیکھا کرتے ہیں۔ اللہ قسم آج میری برسوں کی آرزو پوری ہوئی تھی۔ وہ سب تارے آج مجھے بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ یہ تو خدا کا شکر تھا جناب کہ سب بچے مدرسے جا چکے تھے نہیں تو وہ سب تارے آج میں اُن کو ضرور دکھلا کر رہتا تاکہ آئندہ وہ ایسی خواہش نہ رکھ سکیں۔

بیگم کی لعن طعن نے مجھے ایک دم حساس بنا دیا میں نے خودکشی کی سوچی تو یہ جان کر رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ "یہ حرام موت ہے اور حرام موت مرنے والوں کی روحیں عالمِ بالا پہ سکون نہیں پاتیں بلکہ آسمان اور زمین کے گرد بھٹکتی پھرتی ہیں۔ جب گھر کو بائی بائی کرنا چاہا تو یہ خیال آڑے آگیا کہ یہ بزدلی کی نشانی ہے اور میں بزدل نہیں۔ میرے ابا شیر تھے اور میں ان کی اولادِ نرینہ ہوں یعنی شیر کا بیٹا شیر! میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔ ۔ ۔ ۔!" دل یہ کہتا ۔۔ "اے پیرِ نا بالغ! اُٹھ اور نیا جوش پیدا کر تاکہ نحوست کے یہ بادل چھٹ سکیں۔ آخر کب تک تو زن مرید بنا رہے گا؟" ضمیر بار بار ملامت کرتا ۔۔ "ایسے بھی مرد کیا جو بیوی کی جھاڑ کھا کر خاموش بیٹھا رہے اور چپکے چپکے سردِ آہ بھرے!" کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ آخر کون سی راہ اختیار کی جائے جس سے نجات ملے۔ "اے مالک اے بھاگیہ ودھاتا! میری تقدیر کی لکیروں کو مٹا کر کوئی اچھی لکیر کھینچ دے!!" سوچوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ منا لا کر نے اخبار پھینکا۔ لرزتے ہاتھوں سے اخبار کو اُٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ اور کچھ لمحوں کے لئے ان یادوں سے بے نیاز اخبار کی موٹی موٹی سُرخیوں پہ نگاہیں مرکوز کر دیں۔ دفعتاً میری نظر ایک سُرخی پر جم کر رہ گئی۔ "یہ تلاشِ گمشدہ" کا اعلان تھا۔ میں بڑے انہماک سے پڑھنے لگا: "نام شبیر عرف شبّو، عمر ۱۷ سال، قد ساڑھے چار اور پونے پانچ فٹ کے درمیان، رنگ صاف، چہرے پر ایک چھوٹا سا مگر نمایاں تل، تراشیدہ بال، جینس پینٹ اور شرٹ میں ملبوس، بہت ہی شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی یہ دوشیزہ گزشتہ پانچ دنوں سے غائب ہے لہٰذا جن صاحب کو یہ لڑکی ملے۔ براہِ کرم گھر تک پہنچانے کی زحمت کریں۔ آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ منہ مانگی رقم دی جائے گی۔"

پتہ: عبدالمتین عرف مٹھو

۱۰۵ مہاتما گاندھی روڈ، نزد پربھات سینما۔ دو منزلہ بلڈنگ۔ کلکتہ۔ ۷

اس سنہرے موقع کو میں نے ہاتھ سے جانے دینا کچھ مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ ایسے مواقع بہت کم ہی ہاتھ لگتے ہیں۔ یہ اعلان کیا تھا۔ ایک رہبر تھا، ایک دوست تھا اور ایک ضرورت تھا میرے لئے۔ ایک ایسی ضرورت جو پلک جھپکتے ہی لاکھوں اور کروڑوں کا پتی اور عالی شان بلڈنگوں کا مالک بنا سکتی ہے۔ ایک ایسا دوست جو میرے گہرے زخموں کو مندمل کر سکتا ہے اور ایک ایسا راہبر جو چشم زدن میں مجھے دھرتی سے آکاش کی سیر کروا سکتا ہے۔ میں ایک دم چپ کر کے رہ گیا اور حسین تاج محل سجانے لگا اپنے دل میں۔ چند ہی ساعتوں میں طرح طرح کے اور بے شمار منصوبے بنا لئے اور پھر کیا تھا۔ ہاتھ پاؤں جھاڑا اور مردِ آہن کی طرح ایک بھرپور انگڑائی لی۔ ڈریس چینج کیا اور بیگم کو کچھ بتائے بغیر ہی گھر سے نکل پڑا۔ اور پھر چلتے چلتے مجھے یاد آیا کہ ایسے موقعوں پہ خدا کا نام لے کر نکلنا اچھا شگون ہے۔ کیوں کہ میرے ڈیڈی برابر کہا کرتے تھے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے کچھ آیتیں (اگر یاد ہوں تو) ضرور پڑھ لینا چاہئے۔ اس سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور کامیابیاں قدم چومتی ہیں۔ میں نے ویسا ہی کیا دو چار آیتیں جیاد تھیں وہ ایک ہی

سانس میں بدبدالیں اور پھر کہیں جاکر بسم اللہ یاد آیا۔ اب میرے مکمل سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اخبار کا تراشا (جس میں پورا اعلان اور اس کی مکمل اور واضح تصویر تھی) ہاتھوں میں لئے چلتا رہا۔ دماغ میں اس کی مکمل شبیہ اُبھرتی اور پھر مٹ کر رہ جاتی۔ نگاہیں ہر عورت کو عجیب انداز سے دیکھتیں۔ کبھی تراشیدہ ٹکڑے پر جمتیں تو کبھی سامنے، کبھی آگے تو کبھی پیچھے۔ ہر آنے جانے والی دوشیزہ کو گھورتا اور سر سے پاؤں تک ناپتا رہا یعنی ایک کارٹون بن کر رہ گیا۔ سارے گلی، کوچے اور قریہ قریہ چھان مارے مگر کہیں بھی وہ نظر نہ آئی۔ پارک، رسٹورنٹ اور تفریح گاہوں میں تلاش کیا مگر وہ نہ ملی آخرا سڑک چھاپ مجنوں کی طرح چکر کاٹتا رہا۔ نگاہیں گھورتی رہیں اور قدم بڑھتے رہے۔ ایک شخص جو اپنے بیٹے کو لئے جا رہا تھا، میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا" وہ دیکھو بیٹے! پاگل ہے وہ۔ دماغ کا اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے۔ کیسے سبھوں کو گھور گھور کر تک رہا ہے؟" لیکن ڈیڈی، یہ تو بھلا مانس لگتا ہے۔" لڑکے نے حیرت کا اظہار کیا۔" ارے نہیں بیٹے! تم نہیں جانتے۔ بھلے مانس ہی تو زیادہ کریزی اور پاگل ہوا کرتے ہیں۔ کوئی عشق کے فیلڈ میں رن بنانے میں ناکام رہتا ہے تو کوئی محبت کے نشیمن پر بجلیاں گرانے سے قاصر۔ کوئی بیوی کی جھاڑ کھا کر مجنوں بنا پھرتا ہے تو کوئی . . . کوئی کچھ اور۔ کتنی مثالیں دوں تمہیں۔ تم نے کچھ دن پہلے یہ خبر پڑھی تھی نا اخبار میں کہ رانچی پاگل خانے سے بہت سے قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ ہو نہ ہو، یہ اسی گروپ کا آدمی ہو۔" کوئی کہتا" محبت نے یوں دغا دی کہ بے چارے مجنوں کو کہیں کا نہیں رکھا۔" کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ۔ لیکن میں بندہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی تمام باتوں کو ان سنی کرتا رہا اور تلاش میں سرگرداں رہا۔

اور اچانک سامنے سے آتی ہوئی ایک جینس میں ملبوس دوشیزہ پر نظر جم کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ تو وہی دوشیزہ تھی۔ میں نے اسے قریب سے جاتے دیکھ کر راز دارانہ انداز میں کہا" سنئے!" وہ فوراً پلٹی۔" جی . . . ہاں ہاں . . . آپ ہی کو کہہ رہا ہوں۔ پھر قریب سے بغور جائزہ لیا۔ آنکھیں صاف کیں اور پھر دیکھا اور اب کہا" آ . . . آ . . . آپ آپ . . . ہاں . . . ہاں . . . آپ!" بڑی مشکل سے یہ ادا کر پایا اور شرما کر رہ گیا۔ میرا مطلب . . . مطلب . . . مطلب . . . ہے میرا مطلب . . . گویا کہ . . . مطلب ہے! بس سمجھ تو گئیں آپ نا؟ اتنا کہہ کر میں نے شرم سے نظریں جھکالیں جواب کا منتظر رہا مگر ان باتوں کا اثر تو کچھ اور ہی ہوا۔ اس نے ایک دم برانگیختہ ہو کر زلفوں کو یوں جنبش دی، چھاتی چوڑی کی لمبی سانس لے کر کہا" لے بس کے بچے! میں مونث نظر آ رہا ہوں کیا؟ میں مذکر ہوں مذکر۔ ہاں . . . ہاں مرد، بی ایچ کپور ہے میرا نام۔ چل پیچھے ہٹ!" میں نے پھر دیکھا تو معاملہ کچھ اور ہی تھا لہٰذا جھٹ سے کہا" اوہ . . . ہو مسٹر کپور! آئی ایم سوری، ویری سوری فور اٹ!" مجھے کیا پتہ کہ ماڈرن دور کے لڑکے اس اسٹائل کے ہوتے ہیں، کیا خبر تھی کہ ایسے ایسے لڑکے ہمارے وشال بھارت کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ جو اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور نظر آتے ہیں — وہاں سے بھاگا بھاگا تمام سینما ہالوں کا چکر کاٹنے لگا۔ ایک دوپہر نظر پڑی مگر ان صفات سے پرے تھی وہ۔ آخر میں کلکتہ کے" لائٹ ہاؤس" سینما کے قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ لڑکیوں کے جھنڈ میں ایک دوشیزہ بالکل شرو کا پی اعلان کے مطابق ہے۔ قد بھی لگ بھگ پانچ فٹ تھا اور چہرے پر ایک تل جو صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب ایسے پوچھنے سے بات نہیں بنے گی۔ میاں سہرا اب ہوگیا محبوبہ کیسے اپنائے۔ دماغ پر زور دیا اور ایک معقول آئیڈیا ابھر آیا۔ دل نے گیتانجلی ایکسپریس کی رفتار اختیار کرلی۔

دل کو اپنی جگہ پر کیا۔ پھر اس کے قریب گیا اور ناپنے لگا۔ جب دل کو پوری طرح اطمینان ہوگیا تو کہا " ایک بات پوچھوں ؟ "
"ہاں ہاں . . . ضرور ضرور" اس نے برجستہ کہا۔ "بُرا تو نہیں مانیئے گا نا ؟" "نہیں۔ کبھی نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "تو پھر پلیز اپنا نام بتا دیجیے!" میں نے کلیجہ تھام کر کہا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ تھوڑے سے کا نجور جانے ملیا تو میں شرم کر پانی پانی ہوگیا۔ پھر اپنی سہیلیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا " لو۔ ان صاحب کو میرا نام بتا دو۔ ذرا پوچھو نام بتانا میرا۔ کوئی وقت نہ ہو بے چارے کو سمجھنے میں اور پھر ایسی مار پڑی کہ خدا یاد آگیا۔ ایسی توقع قطعی نہیں تھی۔ مجھے کیوں کہ میں نے بعد احترام اور اجازت لے کر پوچھا تھا۔ کوئی گالی نہیں دی تھی میں نے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تِل اصلی نہیں بلکہ نقلی تھا۔ (فیشن ایبل لڑکیوں نے آج کل اپنے چہرے پر تِل بھی بنانا شروع کر دیا ہے) دن بھر یونہی باتوں اور لاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہمت ایک دم جواب دے چکی تھی۔ مگر میں نے دل کو خوب دلاسہ دے دیا کہ کوشش ہی سے تو انسان کامیاب ہوتا ہے۔ انسان کوشش نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے تو ایسی حالت میں بھی کیا، وہ اُوپر والا "ایشور" بھی اپنے بھکتوں کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ اور پھر فلم "امراؤ جان" کے گانے کی ایک کڑی مجھے اچھی طرح یاد تھی۔

" کہیے تو آسماں کو زمیں پر اتار لائیں
مشکل نہیں ہے کچھ بھی اگر ٹھان لیجیے "

اس نے میری بھرپور رہنمائی کی۔ میں نے سوچا کہ ایک لڑکی جب آسمان کو زمین پر اتار سکتی ہے تو بھلا میں نر ہو کر ایک لڑکی کا بھی پتہ نہیں لگا سکتا! اور پھر تو ہوٹل، رسٹورنٹ ایک کر دیا۔ جب تھک کر چور چور ہوگیا تو خیال آیا کہ ذرا پارک میں بیٹھ کر موڈ بہتر کر لیا جائے۔ سورج مغرب کی سمت اپنا منہ چھپانے کو چل پڑا تھا۔ شام کا دھندلکا چہار سمت پھیلنے لگا تھا۔ طائر اپنے نشیمن کی طرف رواں دواں تھے۔ بڑا ہی خوشگوار موسم تھا آج! میں کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور مونگ پھلی کھانے لگا۔ تبھی میری اُچٹتی نگاہ ایک دوشیزہ پر پڑی جو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا تو تھرک اُٹھا۔ یہ میرے جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کا نتیجہ تھا۔ وہ میرے قریب آئی تو میں نے اپنا فرض ادا کیا " ارے . . . آپ . . . ؟ آئیے آئیے ! مونگ پھلی کھائیے !! " جیسے میری برسوں کی دوستی ہو اس سے "کیا تم مجھے جانتے ہو . . . ؟ دوشیزہ نے پوچھا۔ "بالکل! آپ وہی مس ہیں نا جسے میں تلاش کر رہا ہوں ؟ میں نے بتلایا۔ "او . . . ہو . . . اب مجھے یاد آیا۔ ہاں . . . ہاں . . . میں ہی وہ ہوں۔ میرے فادر نے ہی تو میرے لئے منہ مانگی رقم کا اعلان کیا ہے۔ وہ جیسے نیند سے چونکی اور اپنا تعارف از خود دے دیا۔ "تو پھر میرے ساتھ چلئے جی!" "ایسے نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم یہ اقرار کرو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے!" "نے بابا نے ۔ میں شادی شدہ ہوں۔" میں نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن میرے کہنے کے پہلے ہی اس کا دوست سکتے میں آگیا اور کہنے لگا "ارے نیلو! تم یہ سب کیا بک رہی ہو . . . ؟ تم پیار مجھ سے کروگی اور شادی کسی اور سے۔ یہ نہیں ہونے والا کبھی! تم میری جان ہو، جانِ من ہو . . . جانِ جگر ہو . . . جانِ ادا . . . جانِ وفا . . . جانِ . . . جانِ . . . نہ جانے کیا ہو تم . . . گویا کہ . . . جان ہو تم!" وہ روانی میں کہتا گیا۔ اسی دوران لڑکی نے آنکھوں سے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو وہ محبت کا مارا

کھڑا رہا۔ میں اس کے اشارے کو تاڑ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ لڑکی مجھے چانس کرنے دینا چاہتی ہے۔ اور انکار کر دیا۔ تبھی میں نے سُنا یہ لڑکی اپنی فرینڈ کو کہہ رہی تھی "ارے یار! تم ایسے بے صبر ہوئے جا رہے تھے کہ بس۔ . . . جان . . . جان . . . جان . . . تم نے کچھ دن پہلے یہ نیوز پڑھی تھی نا کہ ایک دوشیزہ لاپتہ ہے جس کے لئے منہ مانگی رقم کا اعلان کیا گیا ہے۔ تم سب جان کر بھی بیچ میں روڑا اٹکا دیتے۔ ارے میں تو اسے پرکھ رہی تھی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اور پھر اسی بہانے ہمارے ڈرامے کی پریکٹس بھی ہو جاتی۔" "خوب سمجھا رہی ہو ڈارلنگ! اگر اسی ڈرامے کی پریکٹس میں پیار کر لیتیں تم تو میں کیا کرتا۔ پھر اسی پریکٹس میں Love - marriage بھی کر لیتیں تو کیا ہوتا میرا؟ کبھی سوچا میرے بارے میں۔" "اوہ۔ مائی گاڈ! تم بھی کیسے ڈارلنگ ہو! تم جیسے شیر دل کے رہتے مجھے ہاتھ کون لگاتا؟" اس طرح بحث ختم ہوئی اور میں نے گھر کی راہ لی۔ پھر میری ہمت جواب دے گئی کہ مایوسیوں کے سوا کچھ نہ ملا مجھے۔ میں نے اب کی بار آخری چانس سمجھ کر یہ تہیہ کر لیا کہ چاہے جیسے ہو میں اسے ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔

"کبھی نہ کبھی تو پھنسے گی میری جال میں" یہ کہہ کر میں گھر سے نکلا مگر آج تو غضب ہی ہو گیا۔ جب گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ پر پہنچا تو دل ایک دم دھک سے ہو کر رہ گیا۔ یہ تو سچ مچ وہی لڑکی ہے جسے میں ہفتوں سے تلاش کر رہا تھا۔ عجیب الشعور کی لیلا ہے زہے نصیب!

جسے ڈھونڈا میں نے گلی گلی ٭ وہ میرے گھر کے پچھواڑے میں ملی

دل کو کنٹرول کر اسے اپنی جگہ پر کیا۔ کلیجہ تھامے اس کے قریب گیا اور پرکھتا رہا، تولتا رہا۔ سب کچھ تو اس لڑکی سے مل رہا تھا۔ وہ صراحی دار گردن، آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، بڑا ساتل اور . . . . سب کچھ۔ میں نے اسے دیکھا اور اس نے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے شرم سے نظریں جھکائیں تو پھر اس نے۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا تو اس نے آنکھ مٹکا دی۔ پھر بات بنتی دیکھی تو پوچھا۔ "کیا . . . آپ . . . وہی ہیں نا؟ بالکل وہی!" اس نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے مس شبو ہیں آپ؟" "اوں . . . ہوں . . .!" اس نے کمر کو بل دیتے ہوئے کہا۔ "ہائیں!" میں سٹپٹا کر رہ گیا اور پھر بغور جانچ لیا۔ یہ تو وہی تھی۔ پھر کہا۔ "معاف کیجیے۔ سمجھنے میں بھول ہو گئی؟" "اجی کیا ہے کو" اس نے ایک دم زاویئے بدل کر کہا۔ اب تو میرا استعجاب اور بھی بڑھ گیا۔ "دیکھیے میڈم! پہیلی نہ بجھوایئے۔ اپنی اصلیت بتایئے اور . . . اور میں چپا بولا۔" آئے . . . ہائے . . . ہائے . . . ہائے . . . یہ انداز آپ کا کر دل میں بسا لوں، یہ حسن آپ کا کر سینے سے لگا لوں۔ یہ جسم اور یہ کاکل پیچاں . . . کہ . . . اُف!" اس نے ہاتھوں کو لہرا کر کہا۔ "دیکھیے میڈم۔ ش . . . ش . . . شرمندہ مت کیجیے۔ دیر ہو رہی ہے۔" "بالکل دیر نہیں ہو گی۔ آئی لو یو ڈارلنگ!" وہ قریب سے قریب تر آتی گئی اور میں پیچھے ہٹتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے کومل شریر کو بالکل قریب کر دیا۔ "ارے . . . باپ رے" جیسے مجھ سے بجلی چھو گئی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کسی نامحرم مرد سے اس طرح بات کرنے میں شرم نہیں آتی آپ کو . . . ؟؟" میں ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اُو . . . ہو۔ تو یہ بات ہے ڈارلنگ؟ دیکھیے میں شریف انسان ہوں۔ کوئی دیکھ لیگا تو . . . تو!" "اری میں شادی شدہ ہوں۔" "ہاں . . . ہاں . . . چار بچے ہیں میرے!" میں نے کتراتے

ہوئے کہا۔ لگتا ہے آپ پہلی دفعہ اس شہر میں تشریف لائے ہیں حضور! میں کوئی مس وِس یا مسٹر وسٹر نہیں بلکہ
.... بلکہ کیا....؟ میں نے تحیرانہ انداز میں پوچھا۔ بلکہ....

"میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے"

ہاتھوں کو لہرا کر کمر کو بھرپور جنبش دی کہ بس خدا خیر کرے اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ جسے میں نے نازک اندام حسینہ سمجھا وہ مرد آہن نکلی۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے پاگل کتے۔ اس کا اثر میرے ذہن اور دل پر ہفتوں، مہینوں رہا۔ آج بھی میں جہاں کہیں بھی ہوتا ہوں، سفر کے دوران یا سیر و تفریح ہر مقام پر میری نگاہیں اسے ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اب دیکھئے۔ وہ کب ملتی ہے اور میں اسے کب تلاش کرتا ہوں!!

■■

عاتق شاہ (حیدرآباد)

راجندر سنگھ بیدی

ممتاز افسانہ نگار عاتق شاہ نے ایم اے (اردو) کے لئے ۱۹۶۵ء میں ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس غیر مطبوعہ مقالہ سے عاتق شاہ نے ہماری فرمائش پر چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اُمید کہ بیدی کے چاہنے والوں میں یہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا! (ادارہ)

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر کی صبح لاہور (چھاؤنی) میں پیدا ہوئے۔ بیدی کے الفاظ میں "تنخواہ ملنے کا دن تھا ظاہر ہے کہ گھر میں سب ہی لوگ خوش ہوں گے"۔

بیدی باپ کی طرف سے کھشتری اور ماں کی طرف سے برہمن تھے۔ اُس زمانے میں کھشتری اور برہمن کی شادی ایک ناممکن سی بات تھی۔ لیکن بیدی کے والد نے اسے ممکن بنادیا۔ اور وہ اس طرح کہ عام روش سے ہٹ کر دونوں نے آریہ سماج مندر میں جاکر اپنا بیاہ کرلیا۔

بیدی کے والد پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ بعد میں یہ پوسٹ ماسٹر بن گئے۔ اور آخری لمحے تک وہ اُسی محکمے سے متعلق رہے۔ وہ اردو اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ مثنوی مولانا روم، حافظ اور سعدی گویا انھیں ازبر تھے۔ تذکرۃ الانبیاء اور قرآن کو انھوں نے سمجھ کر پڑھا تھا۔

بیدی کی والدہ دائم المریض تھیں۔ ان کے والد ان کی تیمار داری بڑے صبر و سکون سے کرتے۔ جیسا کہ بیدی نے خود لکھا ہے۔ لیکن یہ بیماری بیدی خاندان میں کسی جھنجھلاہٹ کا باعث نہ بنی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری نے بیدی کے والد اور والدہ کو ایک دوسرے سے بہت قریب کردیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف چاہت کی سطح کو بلند کیا بلکہ ایک دوسرے کے احساسات، جذبات اور عقائد کا بھی احترام کیا۔ چنانچہ ایک چھت کے نیچے گیتا اور گرنتھ صاحب کے

جاتے تھے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیدی کی والدہ اپنے شوہر کی طرح عالم تھیں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے قطعی تامل نہیں کہ وہ عام نسوانی تعلیمی معیار سے کہیں زیادہ بلند تھیں۔ ہندی، اردو اور پنجابی میں لکھنے پڑھنے کی وہ اچھی استعداد رکھتی تھیں۔ اور انگریزی بھی جانتی تھیں۔

بیدی کی ذہنی تربیت میں ان کی ماں کا بڑا حصہ رہا۔ پیدائش کے ساتھ ہی ان کے کانوں میں گرنتھ صاحب اور گیتا کی آوازیں آئیں۔ غرض چار سال کی عمر تک اُنہوں نے اپنی ماں کی زبانی رامائن اور مہابھارت سن لی تھی لیکن چار سال کا یہ بچہ ظاہر ہے اُن رموز سے کیا واقف ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے آخر میں جو "مہا تم" ہوتا ہے اس نے نامعلوم طور پر اس بچے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح کی ایک دُیومالا تھی۔ جس نے بیدی کو متاثر کیا۔ اور ان کے کردار کی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔

بیدی کے والد اپنی بیمار بیوی کو ناول پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور بیدی اپنے بستر میں دبکے ہوئے اُسے سُنا کرتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ مختصر یہ کہ کچھ حالات نے اور کچھ ان کی والدہ نے اَدب کو اُن گھٹی میں ڈال دیا۔

بیدی اپنے گھر کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ دو بھائی اور ایک بہن۔ اس طرح شروع ہی سے اِنھیں وہ پیار حاصل رہا جو پہلی اولاد کو نصیب ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بیدی پیدائشی بیمار تھے۔ اور اس بیماری نے ماں باپ، دونوں کی توجہات کو ان کی طرف کر دیا۔ چنانچہ ایک سال کی عمر میں بیدی کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر جموں و کشمیر کی پہاڑیوں پر لیجایا گیا۔ اور یہ مقام کی تبدیلی ایک سال کے بچے کے حق میں صحت مند ہو تو ہو لیکن بیدی کے شفاف ذہن پر اپنا کوئی اثر مرتب کر سکی، ایک نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ بشرطیکہ بیدی کی حساس طبیعت میں اس کا جواب ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "مجھے پیدائش سے لیکر اب تک وہ باتیں یاد ہیں جن کا ذائقہ اور تاثر سے تعلق ہو۔ مجھے ان بھنے ہوئے نمکین چاولوں کا ذائقہ یاد ہے جو ایک سال کی عمر میں صحت پانے کے بعد مجھے کھانے کو دیئے گئے۔ مجھے وہ کالی بھینس یاد ہے جو جموں کے قریب ہمیں مارنے کے لئے دوڑی تھی۔ اور جس کی دہشت نے برسوں مجھے اپنے شکنجہ میں جکڑے رکھا تھا۔"

بیدی کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ ان کا پہلا اُستاد خود ان کی والدہ محترمہ تھیں۔ بعد میں بیدی کو مدرسے میں داخل کیا گیا۔ جس اسکول میں وہ پڑھتے تھے اس میں بڑے گھرانوں کے لڑکے آتے تھے۔ اور یہاں یہ حال تھا کہ انہیں پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہ تھے۔ چنانچہ بیدی اپنا پُرانا پھٹا ہوا کوٹ پہن کر اسکول جاتے۔ چنانچہ اس کا نامعلوم طور پر ایک ہی اثر ہوا اور وہ یہ کہ بیدی احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔ اس احساس پر دوسرے انداز میں ان کے ایک ہم جماعت نے تیل چھڑ کا وہ ایک ایسا لڑکا تھا جسے اپنے ہم جماعت ساتھی بیدی کی شکل ہی سے بغض للہی تھا۔ خود بیدی کو اچھی طرح احساس

تھا اس لئے وہ موقع محل دیکھ کر اس سے بات کرتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ انھیں ڈانٹتا۔ اور ڈانٹنا گویا اُس کی عادت تھی۔ بیدی اس کی ڈانٹ سے بچنے کی بہت کوشش کرتے۔ مگر ایک دن ایک محفل منعقد ہوئی جہاں بیدی کو بولنا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ اُنہوں نے اُٹھ کر تقریر شروع کی۔ موضوع چوں کہ بیدی کے احساسات سے قریبی تعلق رکھتا تھا اس لئے انھیں اظہار خیال میں کوئی دِقت نہیں ہوئی۔ لیکن دوران تقریر میں ایک مقام پر اُس لڑکے نے نہ صرف اُنھیں ٹوکا بلکہ اس انداز سے ٹوکا کہ سب ہنسنے لگے۔ بیدی اس قدر پریشان ہوگئے کہ آگے کچھ نہ بول سکے۔ اور اپنی جگہ چُپ بیٹھ گئے۔ ویسے انہوں نے اپنی اس کمزوری کو سدھارنے کی کوشش کی مگر ہر وقت انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"جیسے ہی کوئی مجھے تقریر کے لئے کہے میری زبان گنگ ہو جائے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ تجربے سے ہر چیز حاصل ہوسکتی ہے۔ میں نے بیسیوں بار اپنے آپ کو آزمایا ہے۔ لیکن ہمیشہ منہ کی کھا کر خاموش ہونا پڑا۔"

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی سے ہمیشہ کے لئے نطق چھن گیا۔ ایک فائدہ اس ناکام مقرر نے ادیب کو جو پہنچایا وہ صد درجہ احساسِ ذات تھا۔ اس احساس نے اِنھیں احتیاط اور ٹھہراؤ کا سبق دیا۔ اور ساتھ ہی فن پر کام کرنے کا ان تھک حوصلہ۔ آخر میں انہوں نے اپنے چچا کے "ایم پریس" میں پناہ لی جہاں پانچ چھ ہزار کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ اس میں سے ایک کتاب بھی انہوں نے نہیں چھوڑی۔ اپنے ایک مضمون "میں" میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "میں وہ سلورفش تھا جو ہر پرانی کتاب کے بیچ میں سے نکلتا ہے"۔

اس زمانے میں بیدی نے پہلا افسانہ لکھا۔ یہ افسانہ صد درجہ جذباتی اور انقلابی قسم کا تھا۔ اس میں عوام کو بیکیا دکانیں جلانے کی تلقین کی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا مرکزی کردار ایک بدیسی دکان کو جلا ڈالتا ہے۔ یہ افسانہ شائع ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کیوں کہ بیدی کے والد سرکاری ملازم تھے۔ اور وہ ایسا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھے جس سے ان کی ملازمت پہ حرف آئے۔ اس لئے بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے ایڈیٹر سے افسانے کو واپس لے لیا۔ لیکن چلتے چلتے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔ بیدی کے الفاظ میں ایڈیٹر نے کچھ اس طرح تعریف کی کہ "والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایڈیٹر کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ پندرہ سال کا بچہ اس قسم کا افسانہ اپنے لوے تانے بانے کے ساتھ اس قدر موثر لکھ سکتا ہے"۔

اس طرح ۱۹۳۰ء سے خاموش انداز میں بیدی کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور بیدی کے والد بیدی کے پہلے مداح اور ساتھ ساتھ پہلے ناقد بھی جنھوں نے اپنے آنسوؤں سے جہاں ایک فن کار کا حوصلہ بلند کیا۔ وہیں اُسے ضبط اور تحمل کا درس بھی دیا۔

بیدی نے ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ اس خصوص میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بیدی کالج میں قدم رکھتے ہی انگریزی

مشہور شاعر والیئر پر اتنی اچھی تقریر کی کہ ان کے صدر شعبہ انگریزی نے مزید تعلیم کے لئے انھیں انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے والد نہیں مانے۔ اور انھیں پوسٹ آفس میں چالیس روپے تنخواہ پر ملازم رکھوا دیا۔ بن نظمیں کہنے لگے۔ یہ نظمیں کالج میگزین میں چھپ کر خاصی مقبول ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے انگریزی زبان کے

اُن دنوں پوسٹ آفس کی ملازمت قریب قریب فوجی نوکری تھی۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بڑھ کر کیونکہ فوج میں ایک خاص ڈسپلن ہوتا ہے اور ایک قاعدہ۔ لیکن یہاں چوبیس گھنٹوں کی پابندی تھی۔ نوکری کی خاطر یہ صبح کے پانچ بجے گھر سے نکل جاتے تھے۔ بیدی کے بیان کے مطابق وہ کپکپاتے پہنچتے۔ اور ۸ بجے تک انھیں چائے کی ایک پیالی تک نصیب نہ ہوتی۔ لکھتے ہیں "چربی پگھل کر دانتوں میں آجاتی، اور ہم دانتوں کو اوپر کی پڑھ کو نیچے کی پیڑھ سے بڑی محنت کے ساتھ علیحدہ کیا کرتے تھے۔"

بیدی کا تعلق پوسٹ آفس کے "ڈلیوری برانچ" سے تھا جس میں کام کرنے والے اہلکاروں کو چٹھیوں پر مہریں لگانے سے لے کر خطوط چھانٹنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اور بڑے صاحب کی ڈاک علیحدہ کرنے میں بھوکے پیٹ بڑی دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ رات میں زیادہ دیر تک بیٹھ کر اپنے فرائض کی انجام دہی کے ضمن میں انھیں یا اُن کے ساتھی کو کوئی الونس نہیں ملتا تھا۔ غرض پوسٹ آفس کا محکمہ ایک جہنم سے کم نہیں تھا۔ لکھتے ہیں "آپ نے کالے پانی اور سائبیریا کی داستانیں سُنی ہوں گی۔ پوسٹ آفس کی اُس زمانے کی داستان بھی اس سے کم نہیں تھی۔"

ہر باپ کی طرح بیدی کے والد کی خواہش تھی کہ اُن کا لڑکا کلکرٹ بنے۔ اور شاید بیدی اپنے والد کی اس آرزو کو پورا بھی کر دیتے اگر وہ اپنے کالج کے صدر شعبہ انگریزی کے فیصلے کے مطابق انگلستان چلے جاتے۔ لیکن اُنھوں نے اس جہنم کی آگ میں کود کر اپنے والد کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اس سے بیدی کی وہ شدید جذباتی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ جو انھیں اپنے والد اور گھر سے تھی۔

ملازمت سے پہلے بیدی کی ماں وفات پا چکی تھیں۔ وہ بڑی نرم دل اور حساس تھیں۔ بیدی نے آخری وقت تک اپنی ماں کو موت کے منہ سے بچانے کی پوری کوشش کی۔ مرنے سے پہلے بیدی کو دُعائیں دیتے ہوئے کہا، "بیٹا تو زندگی میں بہت سکھ پائے گا۔"

ماں کا یہ فقرہ بیدی کے حافظے میں محفوظ تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں "زندگی میں سکھ آتا ہے اور دُکھ بھی۔ لیکن سکھ کا ایک لمحہ بھی میسّر ہو تو مجھے ماں کی دُعا یاد آتی ہے۔"

والدہ کی وفات کے ایک سال کے بعد بیدی کی شادی ہو گئی۔ فوراً بعد اِن کے والد کا تبادلہ لائلپور ہو گیا۔ اور وہ اپنی بہو اور بچوں سے بچھڑ گئے۔ پھر دل کے دورے پڑنے۔ اور ایسے پڑے کہ اپنے پہلے پوتے کی پیدائش پر بھی اسے دیکھنے کے لئے وہ نہ آسکے۔ غرض دو سال کے اندر اندر ان کے والد بھی چل بسے۔ ان کے والد کا انتقال کینسر کے عارضہ سے ہوا۔ لیکن ان کی موت کا قصّہ اتنا المناک ہے کہ بیدی اسے دہرانا نہیں چاہتے تھے اس کے بعد گھر میں ایک اور موت ہوئی۔ ان کا

پہلا بچہ دو سال کی عمر میں بعارضہ نمونیا اس جہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری موت نے بیدی کو یوں خوفزدہ کر دیا کہ اس کے اثرات مرتے تک ان کے چہرے پر باقی رہے۔ خود بیدی کا بیان ہے کہ اس وقت اگر گھر میں کسی کو زکام ہو جاتا تو وہ سمجھتے کہ "یہ مر جائے گا۔"

اس دوران کی افسانہ نگاری کا شوق برقرار رہا وہ ایک مشہور افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے پہچانے لگے۔

ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ کالے پانی یعنی پوسٹ آفس میں نو سال تک رہے۔ چنانچہ جب ریڈیو اسٹیشن میں تقرر ہوا تو انھیں اردو سکشن میں لے لیا گیا۔ پھر ملک میں اتنی تبدیلیاں آئیں کہ ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ بٹوارے کے ساتھ ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ سینکڑوں انسان اپنی اپنی جانیں بچائے یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آتے جاتے رہے۔ بیدی بھی ان میں سے ایک تھے جو ریل کی ننگی چھت پر سفر کرتے ہوئے دلی پہنچے۔

اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر بھی ان کی زندگی کی مختصر کہانی ان کی زبانی سنیئے۔ کہتے ہیں "اسٹیشن ڈائریکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن ـــ ریاست کے جمہوری نظام سے لڑائی ـــ کہیں کہیں بیچ میں افسانوں کی کوئی کتاب ـــ پھر ہاتھ قلم کرتے رہے ـــ بیوی کی اپنے ساتھ محبت کا خاتمہ ـــ ادھر عمر کا سٹری پن ـــ بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بے وقوف سمجھنا۔ اور میرا سے پیسے کا پجاری اور غیر ذمہ دار ـــ"

حالات کے اس ملبے سے بیدی کی شخصیت ابھری بھی اور بنی بھی۔

یوں بیدی کی شخصیت میں کوئی تضاد نہیں نظر آتا۔ بیدی وہی تھے جو نظر آتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کوئی ایسا "اوور کوٹ" استعمال نہیں کیا اور نہ چہرے پر نقاب ڈالا جو دیکھنے والوں کو الجھن میں ڈال دے البتہ ان کے قہقہے اور لطیفے سننے والوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ خصوصیت ان کے اس مزاج کی نفی کرتی ہے جس کو بنانے میں پیدائش سے لے کر زمانہ پوسٹ آفس کی ملازمت کے مخصوص حالات نے کام کیا۔ اس بیچ میں کہیں مسرتیں ہیں اور نہ وہ قہقہے ہیں جو بیدی کو جینے کا سلیقہ سکھاتے۔ ایسی صورت میں عمر کی ایک خاص منزل میں بیدی کے قہقہے سمجھ میں نہیں آتے۔ اور نہ ان کی صداقت پر یقین آتا ہے۔ پتہ نہیں یہ قہقہے بیدی نے کہاں سے مستعار لیئے۔ اور لطیفہ گوئی کا آرٹ کیسے اور کیوں کر حاصل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدی کی دو شخصیتیں تھیں۔ ایک وہ شخصیت جو حالات کے لیے ـــ اٹھ کر ریل کی ننگی چھت سے چمٹی ہوئی دہلی پہنچی۔ اور دوسری وہ شخصیت جو ہنسنا اور ہنسانا جانتی تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ دوسری شخصیت پر بات کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلی شخصیت کے تعلق سے ایک ضروری نکتہ نوٹ کیا جائے۔

اور وہ یہ کہ اگر کوئی بیدی کے ماضی کو اور ان کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کرے تو فوراً وہ رو پڑیں گے۔ ایک ذرا سی چھیڑ ان کی آنکھوں میں آنسو لانے کے لئے کافی ہے۔ نہ سری نگر میں انہیں ایک اجنبی امریکن خاتون کو اپنی آپ بیتی سنانے کے دوران میں آنسو بہا دینے میں کوئی جھجک ہوا۔ اور نہ ماسکو کے جشن میں انھیں حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر

کے سامنے رو پڑنے پر کوئی ملال ہوا. حالانکہ یہاں تو جھینپ کی کوئی ایسی بات نہیں تھی. وہ تو میرا کا ایک بھجن تھا جس کے ساتھ ہی بیدی کے آنسوؤں کا تار بندھ گیا. لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بھجن کا تعلق بھی ایک طرح سے ان کی پچھلی زندگی سے تھا. کون کہہ سکتا ہے کہ اس بھجن نے انہیں اپنی ماں کی یاد نہ دلائی ہو. اور ماں کے ساتھ ہی کیا رامائن، مہابھارت اور ایسے کئی قصے ان کے ذہن میں گھوم گئے ہوں گے جو انہوں نے بچپن میں اپنے گھر میں سُنے تھے. غرض بیدی کو اپنے آنسوؤں پر قطعی ندامت نہیں تھی. یہاں ان کی معصومیت برقرار ہی نہیں تھی. بلکہ اپنے بے باک قہقہوں سے بھی وہ اس معصومیت کا اظہار کرتے تھے یوں بظاہر ان قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جو سمجھ میں آ سکے. لیکن آنسو اور قہقہے ہی دل کی پاکیزگی کے دو خوبصورت مظہر ہیں. وہی شخص کھل کر ہنس سکتا ہے جو رونا جانتا ہے. اور جو کبھی زندگی میں رویا ہی نہیں وہ ہنسی کی صحیح لذت کو کیا جانے. بیدی کا مقدر ان دو نعمتوں کی منصفانہ تقسیم سے عبارت تھا.

جہاں تک بیدی کی لطیفہ گوئی کا آرٹ ہے اس کا تعلق بیدی کے مزاج سے ہے اور نہ کسی ایسی اندرونی تحریک سے جو انھیں اس عمل کے لئے اکساتی تھی. اگر ایسا ہوتا تو اس کا اظہار بچپن یا شباب میں ضرور ہوتا. کنھیا لال کپور کے الفاظ میں "جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب بیدی دہلی سے لاہور آیا تو ماضی اور حال کے بیدی میں زمین آسمان کا فرق تھا. اب وہ اپنے لطیفے بطلن کے کان کاٹتا تھا." (نقوش، پاکستان، شخصیات نمبر)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بیدی نے کہیں اس طرح زبان نہیں کھولی، البتہ ان کی طبیعت کبھی اس طرف آئی. اور جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ مزاح کا بیدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا. گو کہ بعد میں ان کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت بن گیا تھا.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدی نے باقاعدہ مشق کی ہے. اور خود کو مدافعت کے لئے تیار کیا. جانے پہچانے اور قریبی احباب کے اُن فقروں کا جواب دیا جائے جن کا حاصل تو کچھ بھی نہیں لیکن ایسا عمل اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اُن کے منہ میں چلتی ہوئی زبان کو چُپ کیا جائے جو ہر وقت اپنا سکّہ چلانے کی فکر میں رہتے ہیں.

لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو کسی حیثیت سے کم نہیں اور وہ یہ کہ اپنے بے رحم حالات کا مذاق اڑانے کے لئے بیدی نے مزاح کے اس عنصر کو اپنی نجی زندگی میں داخل کر لیا تھا. ان کا حال کچھ اس طرح کا تھا.

اب یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان کی بے بسی سے کتنے "انکے ٹوٹتے تھے لیکن یہ ضرور بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کس طرح اپنا اور اپنے حالات کا مذاق اڑاتے تھے. کوئی بیس سال پہلے ان پر لقوے کا حملہ ہوا. ان کے دوست ظ. انصاری اپنے ایک مضمون "پیارے بیدی صاحب" (۱۷ر ستمبر ۱۹۶۶ء) میں بیدی صاحب کے خط کا ذکر کرتے ہیں :-

> "ایک چیت میرے نام آئی کہ ستّہ لو اب تو خوش ہو. لقوے کا اثر بائیں طرف ہے. چہرے سے نفشٹ ہو گیا ہوں. آنکھ سُرخ ہو چکی ہے."

ان کی بجائے اگر کوئی دوسرا ہوتا تو لقوے کا نام زبان پر لاتے ہوئے کپکپانے لگتا. لیکن بیدی کے اس انداز کو کیا کہئے جس پر ہنسی کا ایک لبادہ پڑا ہوا ہے. اگر اس لبادے کو نکال دیا جائے تو بیدی کی ہنسی کو عُریاں دیکھا جا سکتا ہے.

اوراس چشمے کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جہاں سے ہنسی کے فوارے چھوٹے ہیں۔

"اپنے دکھ مجھے دے دو" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو بیدی کی زندگی سے قریبی تعلق رکھتی ہے اور اُن قہقہوں اور آنسوؤں کو پیش کرتی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا۔

اس کہانی کا ہیرو مدن دراصل خود بیدی ہیں۔ اور ایک مقام پر اپنے باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے مدن کو یعنی خود کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا ــــ میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟" اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی؟"

کیا یہ ہنسی، ہنسی کی تعریف میں آتی ہے ؟

کیا کوئی بیٹا اپنے باپ کی میت پر ہنس سکتا ہے۔ اگر اسے ہنسی مان لیا جائے تو بیدی کی وہ ہنسی بھی ہنسی ہے جس پر ہمیشہ موت کا سایہ منڈلاتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہنسی ہنسی، مذاق مذاق میں بیدی نے غم کا ایک اثباتی پہلو تلاش کر لیا، مختصر یہ کہ بیدی کے اس مزاح کو ہم "BLACK HUMOUR" کہہ سکتے ہیں ــــ اس بلیک ہیومر کا اثر ان کی شخصیت اور تحریروں میں کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بڑی بے رحم اور تلخ حقیقت ان کے آرٹ میں واضح ہے !!

مناظر عاشق ہرگانوی

بھاگلپور (بہار)

راجندر سنگھ بیدی کی طنز نگاری

راجندر سنگھ بیدی ساری زندگی قلم کے احترام اور احترام انسانیت کے لئے پوری دیانت سے کام کرتے رہے۔ وہ سچائیوں اور صداقتوں کے ساتھ دوسروں کی سچائیوں اور صداقتوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ زندگی کی تمام کرب انگیزیوں اور تلخ کامیوں کو جھیل کر اور مطالعہ و مشاہدہ کی رہ نوردی میں عصری آگہی سے ہم رشتہ ہونے کے بعد انہوں نے قلم کا بارِ امانت اُٹھایا تھا۔ فطرت، حقیقت، معاشرت اور ماحول کے تناظر میں شخصی ماہیت، جبلی خصائص اور نفسی محرکات کی کارفرمائی۔ تجربہ و ذہنی پرداخت کے مطابق، بیدی کے یہاں نمایاں ہوتی ہے وہ لاشعوری محرکات اور وسیع تر پھیلی ہوئی داخلی دنیا اور اس کے اندر رونما مختلف النوع جذباتی کشاکش کو کردار اور ماجرا نگاری کے پس منظر میں اس خوبصورتی اور چابکدستی سے پیش کرتے رہے کہ قاری کے محسوسات اور جذباتی عمل پر گرفت کی مضبوطی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ رموز و علائم میں اپنی باتیں کہتے رہے اور واقعات و سانحات میں سرگرداں رہے۔ اسی لئے ان کے اظہارِ فن میں رمزیت، تہہ داری اور اشاریت زیادہ ہے۔

اس تہہ داری اور اشاریت کے پس پردہ تہذیب، معاشرت، تعلیم اور انسانی خصائل پر بیدی نے بھرپور طنز بھی کیا ہے۔ طنز نگار عموماً معاشرہ کی کسی برائی پر نظر رکھتا ہے۔ اس برائی اور اس کے تمام اثرات کو وہ طنز کے ذریعہ اُجاگر کرتا ہے یہاں مقصد کی کارفرمائی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مقصد ہنگامی بھی ہو سکتا ہے اور دوامی بھی۔ بیدی اپنے طنزیہ جملوں سے زمانہ کی کج روی کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ وہ جن برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، قاری بخوبی ادراک کر لیتا ہے۔ دراصل یہی طنز نگاری ہے اور طنز نگاری کا کمال بھی ہے۔

شاہ چارلس دوم کا قول ہے:

GOOD JEST OUGHT TO BITE LIKE LAMBS NOT DOGS. THEY SHOULD CUT, NOT WOUND.

بیدی پر یہ جملہ اس لئے صادق آتا ہے کہ ان کے طنز میں مزاح، کبیدگی اور ترشی نہیں کے برابر ہے۔ اسٹیفن لیکاک کہتا ہے:

THE KINDLY CONTEMPLATION OF INCONGRUITIES OF LIFE.

یعنی بیدی کے طنز میں زندگی کی بوالعجبیوں کا مشفقانہ مطالعہ ہے اور تفکر انگیزی کی یقین آفرینی نمایاں ہے:

ایک سارجنٹ کہیں سے نمودار ہوا۔ اس نے لبوں پر زبان پھیری، ہیٹ کو اونچا کیا اور اپنا بٹن تان کر ہجوم میں یوں گھسنے لگا جیسے کوئی تیز سی چھری خربوزے میں اتر جائے۔ (ملس)

چوری جیسے پیشہ کے بارے میں یہ جملہ دیکھئے:

"چوری عجیب قسم کی عبادت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں غلطی سے رہ گئی ہے۔" (زین العابدین)

جب ملک تقسیم ہوا اور لوگ خون کی ہولی کھیلنے لگے تو اس منظر کو دیکھنے کے بعد بیدی نے ان لمحات کو طنزیہ انداز میں یوں تاریخی بنا دیا ہے:

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اُٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالے اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے۔" (لاجونتی)

ملک کی تقسیم کے بعد سے اب تک یہ تاریخی حقیقت دہرائی جا رہی ہے۔ گاہے گاہے سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جن کے بدن صحیح و سالم ہوتے ہیں۔ شاید اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیدی طنز کرتے ہیں:

"ہجوم اور الفاظ ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔" (ملس)

ہمارے ملک میں لوگوں کے پاس وقت ہی وقت ہے۔ وہ وقت کا جائز مصرف نہیں لے پاتے۔ لیکن بے صبری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

"وہ لوگ کتنے احمق ہوتے ہیں جو ہر مناسب اور نامناسب جگہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں کسی جگہ پہنچنا ہوتا ہے تو وقت کی ساری کسر سائیکل کے تیز چلانے یا بھاگ بھاگ کر جان ہلکان کرنے میں لگا دیتے ہیں۔" (دکھ جلی)

اور انسان کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک پہلو پر یہ طنز دیکھئے:

"اس دکان کا مالک پرلوک سدھار گیا تھا۔ جگر کے پھوڑے کی وجہ سے دو مہینے بیمار رہ کر آخر مر گیا۔ اب مراری دکان لے سکے گا۔ خرابی میں اس کی تعمیر کی صورت مضمر تھی۔" (بے کار خدا)

ماجندر سنگھ بیدی کی نظر حیاتی سے زیادہ مشاہداتی ہے۔ وہ طبعاً ANTHROPOMORPHIC یعنی خوگر پیکر محسوس تھے۔ انہوں نے زندگی کا سراغ اس کے حقیقی سوتوں سے لگایا ہے۔ ان کی دلچسپی عام انسانی زندگی سے تھی اسی

لئے ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے مرقعے برابر اور مسلسل نظر آتے ہیں جن سے واقفیت کا ایک شاندار نگار خانہ تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن بیدی طنز یہ انداز کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے:

"بارش کی رم جھم، سرس کی لمبی لمبی پھلیوں کی کھڑکھڑ، گرتے ہوئے پتے کے ٹوٹے ہوئے بادل کی گرج، بطخوں کی بطابط، مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ، پرنالوں کا شور، اس کتیا کی رونہہ..." (دس منٹ بارش میں)

"سوا آٹھ ہو گئے... زندگی بیتی جارہی ہے "دفتر بیتا جارہا ہے... یہاں سے گھر، گھر سے دفتر، دفتر سے شمشان... یج میں ازل ہی سے تھکی ہاری بیوی سے جھپٹ... مار کے بجائے کھانا کھانا... کھانا بھی جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کھا، نہ کھا، نہ... ؟" (جام الہ آباد کے)

"کون تھا وہ؟"
لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا "جماں"
"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"
"ہاں۔"
"مارتا تو نہیں تھا؟"
لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا
"نہیں۔" (لاجونتی)

بیدی کی دوربین نگاہوں اور دوررس ذہن کی یہ برق پاشیاں ہیں کہ انہوں نے سسکتی اور لولی لنگڑی زندگی کے خشک ہونٹوں کی طرف اشارے کئے ہیں:

شفاخانے کے سامنے ایک بساطی کی دکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا ہے۔ ان کی ساریوں کے پلّے بے باکانہ طور پر سر سے اُڑ رہے ہیں۔ کوئی ہیمانی کی خریدار ہے، کوئی زینت کی، کوئی گوٹی کی... دکان کے اوپر چھت پر پروفیسر کی بیوی چق کے پیچھے اپنے لبوں پر سے لپ اسٹک کی اڑی ہوئی سرخی کو درست کرتی ہوئی دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔ (دیوالہ؟)

"جب ننگا آدمی نظریں نیچی کرلیتا ہے تو لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ جب وہ سب کو دیکھتا ہے تو لوگ نظریں نیچی کرلیتے ہیں
(بےکار خدا)

ٹی ایس ایلیٹ کا مقولہ ہے:

THERE MUST BE A MAN BEHIND THE BOOK.

یعنی ادب پارے سے ادیب کی شخصیت اور فن کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ اسی مطلب کو ابوالفضل نے یوں بیان کیا ہے:

خویشتن را از نقش تا بہ نقاش باید رسانید۔

بیدی کے فن پارے سے ہم ان کے احساسات، جذبات، مطمح ہائے نظر اور معاییر کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں لیکن

طنز کی آمیزش کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمت شکن اور ناموافق ماحول میں انہوں نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ گزارا تھا۔ اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں ایک بیمار بچہ تھا۔ ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے میعادی بخار کے ہچکولے دیکھے ہیں جن کا مرکز خود مریض ہوتا ہے، اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے بار بار دور موت کے افق کے پار پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے تکئے میں آنکھیں دھنسائے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں جو کسی عکس کی گرفت میں نہیں آتے اور اندر دھنک کی جن کی حد بندی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ میں نے وہ آنسو بہائے ہیں جو نمکین تھے۔ نہ میٹھے، جو کسی ذائقے کی گرفت میں نہیں آتے اور پیار کرنے والے ماں باپ، بھائی بہن یا محبوبہ بھی جنھیں پونچھ نہیں سکتی۔ سینکڑوں بار کسی ڈراؤنے دیئے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور شدتِ خوف میں مجھے محسوس ہوا ہے کہ کروڑوں میل تک میرے قریب کوئی نہیں، خود میں بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قبل اس کے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسلوں کو بدکاری اور کاروباری ہتھکنڈوں میں برباد کر لیتا میرے جسم کے رگ پٹھے ختم ہو چکے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراضگی اور غصہ، خفیف سی بات پر ریں ریں، روں روں ـــ ماں جھلا کر مجھے دور پھینک دیا کرتی، کیوں کہ میں اس کی بیمار چھاتی تک چچوڑ ڈالتا ـــ ماں تم رہو یا نہ رہو، مجھے میرا دودھ دے دو اور ماں کہیں نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

ابتدائی غم انگیز حالات اور سخت کوش مرحلے بیدی کی زندگی کے ایک بڑے زمانے پر محیط ہیں اس لئے ان کی فطرت میں ایک ناگزیر غم ناکی پائی جاتی ہے اور وہ چوں کہ فطری شکست خوردگی کی وجہ سے بے لگام تیز روی اور شوریدہ بلند آہنگی کی ہمت نہیں جٹا پائے تھے اور خارجی مظاہر سے متصادم ہو کر اپنی صدائے بازگشت تیز نہیں کر سکتے تھے اس لئے طنز سے کام لیکر اپنے داخل کو ظاہر کرتے تھے:

"میں نے کہا جو لوگ حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیئے۔ تو کیا میں سچ مچ امیر ہوں؟" (گرم کوٹ)

"یہ تو ہوئی تارات کی بات۔ دن کو رتنی اپنی ہی دھن میں مگن ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ہولے ہولے گاتی ۔ ۔ ۔ بیٹھے لاگے وا کے بول" (چھوکری کی لوٹ)

بیدی نے عورت کو کئی روپ میں دیکھا ہے۔ ان کے ہاں تمام کائنات کے حسن کا نچوڑ اور رعنائیوں کا عطر عورت ہے۔ عورت نے بیدی کے ہر لفظ کو، ہر جملے کو، ہر افسانے کو رومانی، رومانی سے زیادہ کیف آور اور کیف آور سے زیادہ طنز آمیز بنا دیا ہے:

"مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ اَن پڑھ عورت، کوئی رٹا ہوا فقرہ ۔۔ عمہ"
(اپنے دکھ مجھے دے دو)

"خدا کسی بچے کے کپڑوں پر مٹی دیکھی، اُلٹا ماں کے پاس بھیج دیا جو پہلے ہی گربھ وتی ہے۔ عورتوں کی زبان میں ـــ

اس کی وہ تو پاجامے سے بھی چھو جائے تو پیٹ ہو جاتا ہے۔" (مجام الہ آباد گئے)
گھمنڈی کا باپ جب بھی دروازے پر دستک دیا کرتا، ماں فوراً جان لیتی کہ آج اس کے مرد نے پی رکھی ہے بلکہ دستک سے اسے پینے کی مقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔" (کوکھ جلی)
دنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں۔ اگر بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے اور بیٹی بھی ماں، تو دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عورت ماں ہے اور مرد بیٹا۔ ماں کھلاتی ہے اور بیٹا کھاتا ہے۔ ماں خالق ہے اور بیٹا تخلیق۔ اس وقت وہاں ماں تھی اور بیٹا۔ ۔ ۔" (کوکھ جلی)
بیدی نے اپنی ماں سے کتنے ہی تجربے حاصل کئے تھے۔ ایک مثال دیکھئے: وہ اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
ابتدائی کہانیاں بچپن میں جو سنیں وہ جن اور پری کی داستانیں نہ تھیں بلکہ مہاتم تھے جو گیتا کے ہر باب کے بعد ہوتے ہیں اور جب ہم ماں کے پاس بیٹھ کر بڑی عقیدت سے سُنا کرتے تو چند باتیں تو سمجھ میں آجایا کرتیں، جیسے راجہ، برہمن، شیطان۔ لیکن ایک بات:
"ماں یہ رنڈی کیا ہوتی ہے؟"
"ہوتی ہے، آرام سے بیٹھو۔"
"اوں ہوں بتاؤ نا — رنڈی۔ ۔ ۔"
"رنڈی بُری عورت کو کہتے ہیں۔"
"تم تو اچھی عورت ہو نا ماں؟"
"ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے، کسی کی بھی ہو۔"
"تو بُری کون ہوتی ہے؟"
"تُو ۔ ۔ ۔ تو تو سر کھا گیا راج۔ ۔ ۔ بُری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت مردوں کے ساتھ رہے۔"
"میں سمجھ گیا!"
لیکن اگلے دن مجھ پر وہ جوتے پڑے کہ بس۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں ساوتری کی ماں کو رنڈی کہہ دیا کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے اَنٹ شنٹ قسم کے بہت سے مرد رہتے تھے۔
چنانچہ میری بقیہ زندگی بس یہی ہے۔
اِدھر میں نے کوئی سوال کیا، اُدھر زندگی نے کہا "چُپ رہو"۔ (آئینہ خانے میں)
لیکن اس خاموشی میں بھی جو طنز ہے، زندگی کا کرب ہے اور پھلتی پھولتی ہوئی انسانیت ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے:

ڈاکٹر جی! مجھے لمبے سفر پہ جانا ہے، آپ دیکھتے نہیں میرا جوتا، جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے؟
ڈاکٹر جواباً مسکرایا اور بولا "ہاں بابا! تو نے بڑے لمبے سفر پہ جانا ہے؟" (رحمان کے جوتے)
بیدی کے برق وش ذہن میں اور مزاج میں بھی طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو یعنی تلخ گوئی کو سمجھنے کے لئے مندرجہ سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیے:

سوال: کسی میٹنگ یا گوشٹھی کا صدر بن کر آپ کو کیسا لگتا ہے؟
جواب: نہایت احمقانہ۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ دوسروں کی بتائی بات پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔
سوال: آج جب کہ ادب کو لوگ قریب بے معنی ماننے لگے ہیں، تب بھی آپ کیوں لکھتے ہیں؟
جواب: میں اس بات کو نہیں مانتا کہ ادب کو لوگ بے معنی ماننے لگے ہیں۔
سوال: جب آپ اکیلے ہوتے ہیں تو کیا سوچتے یا گنگناتے ہیں؟
جواب: مجروح صاحب کا یہ شعر ؎

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تیری آرزو بھی کھو دیتے

سوال: کوئی خواب، جو آپ کو بار بار یاد آتا ہو؟
جواب: وہی جو میں بار بار یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں . . . وہی خواب ہے۔
سوال: آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟
جواب: گندلا مائل خوب صورت رنگ — سفید! خوبصورت پھول کو آپ غور سے دیکھئے، وہ پھول آپ کو سفید نہیں دکھائی دے گا۔
سوال: ایسی کون سی چیز ہے جو آپ کو بھیانک لگتی اور ڈراتی ہے؟
جواب: ایسی چیز جو بار بار رٹی جاتی ہو جس میں تبدیلی نہ آتی ہو، اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔
سوال: آپ کس قلم سے لکھتے ہیں؟
جواب: میں اس قلم سے لکھتا ہوں جو موٹا ہوتا ہے۔ اس کی نب چوڑی ہوتی ہے وہی مجھے پسند ہے۔
سوال: کھانے میں آپ کو سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟
جواب: کھانے میں مجھے سب سے زیادہ کچھ بھی پسند نہیں۔
سوال: آپ نہاتے وقت کیا سوچتے ہیں؟
جواب: کہ کوئی خوب صورت عورت میرے ساتھ نہا رہی ہے۔
سوال: آپ کے خیال سے ملک کی سیاسی سمت کیا ہے؟

جواب: کچھ نہیں!

سوال: آپ ملک میں کہاں رہنا پسند کریں گے؟

جواب: ایک جگہ ہے جو میں نے آج تک دیکھی نہیں ہے۔ ستلج کا کنارا۔ جہاں دریا میدان میں گرتا ہے۔ وہاں ایک گرودوارہ ہے۔ جگہ کا نام یاد نہیں!!

خواہ انٹرویو ہو، خواہ افسانہ، بیدی کے یہاں طنز کا یہی انداز ابھرا پڑا ہے۔

حیات کی شوریدہ سری کو بیدی نے بہت قریب سے محسوس کیا تھا اسی لئے معاشرے کے ہر چہار طرف ان کی نگاہ جاتی ہے اور ہر خامی اور برائی پر طنزیہ انداز میں اشارہ کرتے ہیں۔ آج ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جہیز کی لعنت کی وجہ سے یا بعض مجبوریوں کے سبب لڑکیاں ـــ اچھی اور شریف لڑکیاں گھروں میں بیٹھی رہ جاتی ہیں یا کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہیں۔ ایسے ہی بوڑھے مرد اور جوان لڑکی پر طنز ملاحظہ فرمائیے:

"سڑک پر ایک سبز "ادپل کار" پورے زور سے ہارن بجاتی ہوئی گزرتی ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے دو بوڑھوں کی نگاہیں تاک میں جاتی ہوئی دلہن کی سرخ چوڑیوں میں پیوست ہیں اور دلہن کی نگاہیں سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جم رہی ہیں؟"

بیدی نے ملکی معیشت پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور طنز کی طنز میں ایسے اشارے کئے ہیں جن کی سچائی ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں:

"میں نے سُنا ہے گزشتہ چند سالوں میں کئی کئی من سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے سوٹ پہننا اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔" (گرم کوٹ)

تخلیق اور عمل میں اپنے معاشرے اور روایات کی ترجمانی ضروری ہوتی ہے۔ بیدی کا تخلیقی سرمایا ان کی خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ انہوں نے بے راہ روی اور انتشار پر بھرپور طنز کیا ہے اسی لئے ان کے فن کا پس منظر جامع اور پختہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

بیوی یا بیماری

جب سے دنیا بنی ہے بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصّہ میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ ہے!
بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنے شوہر کو بتاتی ہیں ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ، بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہوکر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی امید اور خوشی میں ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سسرال کی چوکھٹ پر پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ نوآموز (شوہر) دولہا دولہن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جو اس کے بھوپڑپنے پہ خوب ہنستی ہیں۔ چونکہ اُسے کسی دوسرے کا منہ تو ملتا نہیں اس لئے اپنا سا منہ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو پتا کرنے کے لئے بیوی تندرستی کے دن یعنی کنوارپنے اور میکے کو یاد کرکے رونے لگتی ہے۔ جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ۔ کبھی دولھا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبّی نقطۂ نظر سے CLINICALLY بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لاکر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہے۔ بُرے بُرے منہ بناتی ہے میاں پیار کا دھوکا دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھوتھو کرتی ہیں وہ فوفو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے آدھی باہر گرتی ہے اور کچھ دیر کے بعد جنابہ بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے۔ "اے تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں۔" اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا، یا ہرے رنگ کا جھوٹ

سمجھیں ورنہ پھانسی ہوجائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں، یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں کسی دوسرے کی نہ سنیں تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہوکر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لئے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہونا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دُکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام ہے اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں "مرد ہے!" اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی، لیکن اندر سے کہیں گی۔ "زنخا ہے موا!"

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو ستانے کے لئے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہوگی تو روز سویرے اُٹھ کر شکایت کرے گی۔ "آج میرا سر کچھ بھاری بھاری ہے"۔ پھر وہ ناک سکیڑے گی۔ ہاتھ کنپٹیوں پہ رکھ لے گی اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں آپ بڑی محبت، جو لفظ اردو میں لکھتے وقت حجت معلوم ہونے لگتا ہے، کے ساتھ کہیں گے۔ "ادھو ایسپرین ہے گھر میں؟" چنانچہ ایسپرین ہوگی۔ کوڈاپائرین بھی ہوگی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔ آپ سوچنے لگیں گے۔ ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصّہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مُصر ہوتی ہے۔ یاد رہے۔ یہ عورت کے بدن کا وہ حصہ ہے جس پر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور تعلّی کے مضمون میں اسے نازک پتلا ہونا تو کیا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہونا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصوّر کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصّے سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے۔ مگر کمر سے نہیں کیوں کہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے بہر حال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوانٹی فلاجسٹین اثر نہیں کرتا اور نہ درد شقیقہ دعصاآ (NERVOLGIA) دور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں ـــ بنو! آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو۔" پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر درد کے لئے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی!

میں جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پر ہنسنا اچھی بات نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جیوتشی ہے۔ رمّال ہے یا ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیگم

کی بیماری کے ایام میں میاں جنت اور دوزخ کے بیچ عالم برزخ میں کہیں اُلٹا لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہیں دل کو کریدو تو ایک ہنسی ہے جو اس کان سے اس کان تک پھیلتی جا رہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ، نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ ہے کہ مسکت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے: "ہائے میں مرگئی" لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ اگر اس نے کہا "میں مرگیا" تو وہ سچ مچ مرجائے گا! جلدی یا آسانی سے مرجانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لئے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پُرپیچ جنسی سلسلے کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لئے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہوجاتی ہیں۔ کیوں کہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہوتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مَرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر لونی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے وہ مرد کے رنڈوا ہوجانے کو اپنے بیوہ ہوجانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی، بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اُسی وقت ڈانٹ کھاکر سامنے سیڑھیاں پرجا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے مدخانہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے دلی میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا "اب کے مہینے رہ گئے؟" تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنادیئے۔ گویا عورتوں کی زبان میں اس ابجد کا کوئی دخل نہیں جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی تو اُسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خطِ تصویر (HIEROGLYPHICS) سے ملتی جلتی ہے جسے مصر کے لوگ تو کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کرچکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔ جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور ناقابل علاج ہوتی ہے مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامتِ اعمال عیادت کے لئے چلے بھی جائیں تو آپ صاحب خانہ سے پوچھتے ہیں "کیسی طبیعت ہے۔ گھر میں؟"

"اب تو اچھی ہے بھگوان کی دیا ہے۔"

"کیا تکلیف تھی؟"

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کی چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے۔ البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے "زنانہ تکلیف . . . ؟" مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجیئے۔ آپ کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اُٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے۔ مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیئے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو "بکواس بند کر" کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہوگی جو مہینے میں چند دن بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں۔ دنیا جہاں کی، جملہ بیوی جات کا قصہ ہے۔ ان ایام میں وہ کچھ یوں لیٹی ہوں گی جیسے انھیں ہیضہ ہوگیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آرہی ہیں۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پہ میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں گری گدھے پر سے ہیں اور غصہ کمہار پر اُتار رہی ہیں جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگتا ہے، اپنے بیوی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے۔ اگر کسی مہینے یہ چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹی ڈکاریں آئیں گی۔ سر چکرائے گا۔ اُبکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف اس بیماری پر غصہ آئے گا۔ دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا، مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہوگا اور حسب توفیق ملاقات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا جنھیں لے کر بیوی خوش تو ہوگی مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لئے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی جو کسی کا نہیں نسیان کا بنا ہوتا ہے۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ گول گپے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹی کھائے گی۔ مرد کو جب بُری بات کہنا ہوتی ہے تو وہ فالم بدہن سے شروع کرتا ہے۔ لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سُنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی۔ اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیماری میں پھر میاں کے لئے تھوڑی بہت تسکین کی گنجائش ہے لیکن دوسری میں یکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے

سیکریٹیریٹ پہ اُس کا سلطار ریمارک لکھ دیا یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ ہمیشہ کی طرح ... ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے نہ اٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں ۔ میاں کے لئے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے۔ حالاں کہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں؟ بیوی کا جو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے "IT'S A BOY" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے "CONGRATULATIONS" اس سے پہلے کہ میاں بیوی کی حالت پوچھے نرس جا چکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا سارا اندر اُبل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے؟ ہنسے یا روئے؟ وہ ہنس اس لئے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لئے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح ایک اور گدھا پیدا ہو گیا۔ جو بڑا ہو کر ضرور محبت میں مبتلا ہو گا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ جیسے اس وقت میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پر کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔ "اس دکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے"؟ لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے۔ اس لئے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے۔ جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساڑی نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبیہ جس میں سے طلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھوں میں محبت اور تاسف کے آنسو لئے ایک آئیڈیل رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پہ باندھ دیتا ہے اور ساڑی اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"بیٹا یہ رشوت ہے، مول نہیں"

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ جو ارگٹ اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے سے جسے بیوی کہتے ہیں، محبت کرتے چلے جاتے ہیں اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ جس میں ایک بیوی اپنے نکمّے، نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات اُلٹ جاتی ہے۔ بجنسہٖ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرِ شام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خان غالب کے ساتھ ہوا تھا۔

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ؎
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ہندی کے مزاح نگار رام رکھ منہر نے ہمیں ایک بار بیدی صاحب کا ایک لطیفہ سنایا تھا، آپ کو بھی سُنا دیتے ہیں۔ بیدی صاحب جب "دستک" بنا چکے تو ایک نوجوان اُن کے پاس یہ درخواست لے کر آیا کہ وہ اسے اپنی کسی فلم میں کام کرنے کا موقع دیں۔ بیدی صاحب بولے "بھئی! میں نے اپنی ساری اگلی فلموں کی دس سال تک کی پلاننگ کر لی ہے اور سارے اداکاروں کا انتخاب کر لیا ہے۔ اب تو میں تمہیں کوئی موقع نہیں دے سکتا۔ اگر تم چاہو تو دس سال بعد آ کر مجھ سے پتہ کر لینا۔ . . . . . نوجوان نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ "تب تو ٹھیک ہے۔ میں دس سال بعد پھر آؤں گا۔ مگر یہ بتائیے آپ سے ملنے کے لیے صبح کے وقت آؤں یا شام میں"۔ . . . . . ایک سال پہلے یوسف ناظم نے ہمیں بتایا کہ بیدی صاحب کسی بات پر ہم سے ناراض ہیں۔ ہم نے یوسف ناظم سے پوچھا "اگر آپ کہیں تو میں بیدی صاحب کو خط لکھ دوں اور اگر وہ کسی بات پر خفا ہوں تو معافی مانگ لوں"۔ . . . . یوسف ناظم بولے "خط لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے کمزور حافظے پر پورا بھروسہ رکھو، وہ یہ بات بہت جلد بھول جائیں گے"۔

کتاب "آدمی نامہ"
از: مجتبیٰ حسین سے

راجندر سنگھ بیدی

چلتے پھرتے چہرے

اس وقت میں صرف ایک ہی چہرے کی بات کر رہا ہوں جو بہت "چلتا پھرتا ہے"۔ ۔ ۔ اور وہ چہرہ آج کل کے عام نوجوانوں کا ہے۔ ۔ ۔ چنانچہ میرے بیٹے کا بھی۔

اپنے بیٹے کا چہرہ دکھانے کی کوشش میں، اگر کہیں بیچ میں آپ کو میرا چہرہ بھی دکھائی دینے لگے تو بُرا مت مانیئے گا۔ کیوں کہ میں آخر اسی کا باپ ہوں' اپنے بیٹے پر ہی گیا ہوں۔ چنانچہ جو کچھ بھی آپ کو میرے بیٹے کے خلاف لکھا ہوا معلوم ہوگا وہ دراصل میرے اپنے ہی خلاف ہوگا۔ کیوں کہ اسے اس دنیا میں لانے کے علاوہ اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا ذمہ دار میں ہوں۔ البتہ جو اس کے حق میں کہوں گا' وہ میرے بیٹے کی اپنی لیاقت ہوگی۔ جس میں میرا رتّی بھر بھی قصور نہیں۔

میرے بیٹے کا قد لمبا ہے اور رنگ کسی قدر کھلتا ہوا' حالانکہ میرا قد چھوٹا ہے اور رنگ بھی پکّا۔ اس کی وجہ غالباً میری بیوی ہے جس کے میکے میں سب لوگ لمبے قد کے ہیں اور رنگ کے گورے۔ میاں بیوی کے ملاپ سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس سے کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔ نہ معلوم کیا چیز نکل آئے؟ مثلاً ایکٹرس ہیلن ٹیری نے جارج برنارڈ شا کو لکھا تھا۔ "ہم دونوں کا ملاپ ہو جائے تو اولاد کتنی اچھی ہو"؟ جس پر برنارڈ شا نے جواب دیا تھا۔ "مادام بدقسمتی سے اگر بچہ کو شکل میری مل گئی اور عقل آپ کی تو ۔ ۔ ۔ ؟" شا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو ان کا یہ لطیفہ پھیکا معلوم ہو تو اندازہ کیجیے۔ اگر بچے کو شکل ہیلن کی اور عقل شا کی مل جاتی تو!

میرا بیٹا بہت دُبلا ہے۔ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی جیٹ ہوائی جہاز کے بہت ہی قریب نہ چلا جائے یا کوئی میرے بیٹے کے بہت ہی قریب منہ کر کے پھونک نہ مار دے۔ اس کے پچکے ہوئے چہرے پر موٹی سی ناک نکلی ہے جو اس بات کے انتظار میں رہتی ہے کہ چہرے کے باقی خد و خال بھی بھر جائیں تاکہ وہ خود معقول معلوم ہو اور بات بات پر اسے لال نہ ہونا پڑے۔ اس وقت میرے بیٹے کی ناک کے نتھنے کانوں سے پھڑکتے ہیں

تک بھاگ کر آئے ہوئے سکندر کے گھوڑے بوس تیلیس کے نتھنوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہیں۔ یا اس وقت کام میں آتے ہیں جب انھیں اپنے مالک کی انا یا وہم کو جتانا ہو، ورنہ وہ تو مہینے میں تین چار بار صرف زکام کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

اس کے زکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوانی میں مجھے بھی اکثر زکام ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ورزش کر کے وقت پر سو کر اور وقت پر جاگ کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اس زکام کو بالکل انقلابی طریقے سے ٹھیک کرتا ہے۔ وہ رات ایک ڈیڑھ بجے تک میکس، یا نیویارک کا ہفتہ وار انگریزی رسالہ "ٹائم" پڑھتا رہتا ہے۔ جس پر اس کا دنیا بھر کے علم کا مدار ہے اور پھر صبح سب سے آخر میں اٹھتا ہے جب کہ اس کے بہن بھائی اسکول وغیرہ جا چکے ہوتے ہیں۔ ماں گھر کا سب کام کر چکی ہوتی ہے اور میرا ایک پیر گھر کے اندر ہوتا ہے اور ایک باہر۔ تب وہ نیند کا ماتا میرے پاس آتا ہے اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اسے دیکھتے ہی پہلے میں سلام کرتا ہوں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بار میں نے اس کو سلام کے سلسلے میں آنا کانی کر دی تو وہ مجھے کبھی سلام نہیں کرے گا۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا۔ میرا سارا دن کڑھتے رہنے کی وجہ سے برباد ہو جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ دنوں کے تسلسل ہی کو زندگی کہتے ہیں۔

میرے بیٹے کے ہونٹ پتلے ہیں اور ٹھوڑی مضبوط جو ایک پکے ارادے کا ثبوت ہے اور جسے وہ اکثر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی ہیں جن سے پاس کا تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور دور کا اتنا بھی نہیں جتنا کوئی صحت مند آدمی، مٹی کا ڈھیلا پھینک سکے۔ اس لئے میرا بیٹا آج کل کے نئے علم کا چشمہ پہنتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر کی بھویں گھنی ہیں جو خلوص کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میرے بیٹے میں خلوص نہیں۔ اس میں خلوص ہے، بہت ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھاتا اور یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کا دل صاف ہو اور اس میں خلوص ہو، پھر بھی وہ دھوکا نہ کھائے!

میرے بیٹے کا ماتھا بہت چھوٹا ہے، کہتے ہیں ایسی تنگ پیشانی کے لوگ زیادہ بھاگیہ وان نہیں ہوتے۔ جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راک فیلر کے گھر میں پیدا ہونے کی بجائے ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کی ماں کام کر کر کے مری جا رہی ہے، میں مر مر کے کام کرتا جا رہا ہوں اور وہ مزے سے لیٹا ہوا ہے تو مجھے بزرگوں کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ وہ فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ اگر وہ کسی کی بات بیچ ہی میں نہ کاٹے تو اپنے چہرے پر کے رگ و ریشوں کی خفیف سی جنبش سے دوسرے کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ آپ کی بات تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس پر بھی آپ کہتے رہنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے۔ اور یہ اس کی اسی ناطق خاموشی کی وجہ ہے کہ اسے اپنے باپ کو کبھی بیوقوف کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غالباً یہ اس کی بے صبری نہیں ما آج کل کی دنیا تیز رفتار ہے جس سے میرا بیٹا مطابقت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا۔ وہ کار بھی چلائے گا تو چالیس پچاس میل کی اسپیڈ پر اور میں بیس پچیس پر ٹریفک ڈول رہوں گا۔ اس نے کئی ایک ایکسیڈنٹ بھی کیے۔ جن میں سے دو تو بہت قیمتی تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ روپے کا تھا اور دوسرا کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا۔ اور اس پر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے اس بات پر شرمندہ نہ

رہے کہ میں اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔

ایک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے ۔ میں حسبِ معمول سلو اسپیڈ میں تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی بچہ بھاگ کر آیا ۔ اسے کار کا دھکا لگا تو فٹ پاتھ پر جا گرا ۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کی جان بچ گئی اور ساتھ ہی ہماری بھی ۔ ہسپتال سے اسے مرہم پٹی کروانے کے بعد ہم گھر کے لئے روانہ ہوئے تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ دیکھا میں تمہاری اسپیڈ پر ہوتا تو بچہ مر گیا ہوتا ۔"

" آپ میری اسپیڈ پر ہوتے "میرے بیٹے نے کہا" تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے ۔"

یہ شاید خلیل جبران نے کہا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اپنا جسم اور ذہن دے سکتے ہیں ۔ اپنے خیالات نہیں دے سکتے ۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والوں نے بڑی گڑبڑ کی ہے ۔ وہ الفاظ میں حقیقت کا ایک ایک لمحہ جکڑ لیتے ہیں ۔ اس وقت آدمی یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کی ہر چیز ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی حقیقتِ مطلق نہیں ۔ حقیقت ایک مقامی حیثیت رکھتی ہے ۔ اور کاہل پسند، کند ذہن اس وقت پڑھنا اور سوچنا بند کر دیتا ہے اور اس محدود حقیقت کو دنیا بھر پر پھیلاتا رہتا ہے ۔

کوئی خلیل جبران سے پوچھے ۔ "کیوں بھئی ۔ ہم انھیں اپنے خیالات کیوں نہیں دے سکتے ؟"

پھر کیوں نہیں کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کو بچوں کے سامنے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیئے ۔ حالانکہ یہی فطری جھگڑا ہے جسے دیکھ کر بچے کو سمجھنا چاہیئے کہ زندگی صرف قلاقند ہی نہیں، کونین کی گولی بھی ہے ۔ اور اس آدمی کا آپ کیا کریں گے، جس نے کبھی کبھی بچے کو ماں باپ کا ننگا بدن دکھانے کی سفارش کی ہے ۔ یہ خارجی زندگی ہے جو بچے کے خیالات کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر اس کی "پرسنالٹی" کا حصہ ہو جاتی ہے ۔ آج کل کے بچے کانوں اور آنکھوں کے ذریعہ سے ہر ایسی آوازوں اور تصوّرات کو اپنے دل میں اُتار لیتے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ میں جان سکتا ہوں ۔ آج کا بچہ اِس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اسے کوئی معجزہ دے گیا تھا یا وہ برسات کے پہلے قطرے کے ساتھ اس دھرتی پر ٹپکا تھا ۔ وہ اپنے بڑوں سے اپنی اور ان کی پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے اور کبھی جواب حاصل کر کے چپکے سے قلم اُٹھاتا ہے اور اپنے جوابی مضمون میں لکھتا ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سارے خاندان میں چار پشت سے کوئی بھی قدرتی طریقے سے پیدا نہیں ہوا ۔

دراصل کرشن ویاس سے لے کر وشنو پربھاکر تک سب لکھنے والوں نے گڑبڑ کی ہے ۔ وہ اس زمانے سے اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا زمانہ ان سے آگے ہے ۔ چلیے وقت کے اعتبار سے ہی سہی، مانیئے ہم نے سب کچھ پایا ہی نہیں کھویا بھی بہت کچھ ہے ۔ لیکن اس کھونے میں ۔ جو کچھ ہم نے پایا ہے، اُسے کالی داس، بھو بھوتی اور شیکسپیر آج نہ پا سکیں گے ۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اتنا تاؤ نہ دیجئے کہ میں ان بڑے لوگوں کو آج کے نقطۂ نظر سے دیکھوں ۔ میں کس قدر بے بضاعت ہوں، ان مہان ہستیوں کے مقابلے میں ۔ لیکن آج کے نوجوان کو میرا ایسی

مشورہ ہے کہ مجھے پڑھیں اور پھینک دیں اور واقعی کسی نامحسوس دلیل کی بناء پر مکمل طور پر رد کر دیں اور میں یہ محسوس کروں۔ میرا بیٹا بھی ٹھیک ہے اور میں بھی غلط ہوں!

میرا بیٹا میری اتھارٹی کو نہیں مانتا کسی کی اتھارٹی کو بھی نہیں مانتا۔ میں روتا ہوں۔ میرے بڑوں اور پیشروؤں کی روحیں کسی آسمان میں کلبلاتی ہیں اور وہ میرے ساتھ مل کر اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے زمانے میں انقلابی تھے اور انہوں نے اتھارٹی کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے کڑی مصیبتیں اُٹھائی تھیں۔ کیوں کہ ان کے زمانے میں بھی ہماری ہی طرح کے ماں باپ تھے، حاکم تھے، مذہبی پیشوا تھے، انہوں نے بھی وقت کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور نئے اخلاق کو دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا۔ آپ اندازہ تو کیجئے کہ میرے بیٹے کو کن چیزوں سے نبٹنا پڑتا ہے، زندگی کی رفتار سے، قدم قدم پر ایک کڑے مقابلے سے، مادی اور روحانی قدروں کی کشاکش سے، پرانے اور نئے کے جھگڑوں سے۔ میں نے اگر بہت پڑھا بھی ہے تو میرا ذہن جاگیردارانہ ہے لیکن میرے بیٹے کا نہیں۔ میں ایک خاص قسم کا ادب اور متابعت اس سے مانگتا ہوں جو وہ مجھے نہیں دے سکتا اور دینا بھی نہیں چاہتا۔ میں جب اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھلا کر کہتا ہوں۔ تم آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے، تو میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہی فقرہ مجھے بھی میرے ماں باپ نے کہا تھا۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں سرطان (کینسر) صرف ایک پھوڑا تھا۔ جس پہ کوئی مرہم لگایا جاتا تھا اور مصفیٰ خون کی بوتل پینی پڑتی تھی۔ ان کے زمانے میں دباؤ اتنے نہ تھے کہ انسانی شخصیت ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح نظر آئے۔ جب "سکزوفرینا" کا لفظ ایجاد نہ ہوا تھا۔ خواب آور گولیاں استعمال نہ ہوتی تھیں اور نہ لوگوں کو ایل۔ ایس۔ ڈی چوسیں یا اُس کھمب کا پتا تھا جس کا رس پی کر . . . انسان کو اپنا ہی لطیف جسم گہرائیوں میں اُترتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن بے حد حسین سبزہ زاروں میں وہ جاتا ہے، وہ انسان کے اپنے دماغ اور اس کے شعور کی تہیں ہیں جن میں سیلاکانٹ مچھلی سے لے کر آئنسٹائن تک کے سب تجربات چھپے پڑے ہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لئے ہمارے رشی منیوں نے ہزاروں سال تپسیا کی۔

یہ کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ایک حقیقت ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ یونہی میں نے اپنے آپ کو صفر کرنے کی کوشش کی ہے تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ اگر میں جانتا بھی ہوں کہ سوئز کی نہر فرانسیسی انجینئر ڈی لیلپس نے بنائی تھی تو بھی میں اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب کچھ اس انداز سے دوں گا جس سے اس کی تسلی نہ ہوگی اور میں اس بات کو چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں بھی سب باپوں کی طرح جاہل ہوں۔ اور میرا زمانہ لد گیا ہے۔ میری حیثیت اس وقت اس "ڈیڈی" کی طرح ہوگی جس سے بیٹے نے پوچھا۔ "ڈیڈی! یہ مصر کے مینار کیوں بنائے گئے ہیں؟"

"خدا معلوم۔ بس بنا دیئے، اگلے وقتوں میں بہت زیادہ وقت تھا لوگوں کے پاس۔"

"زرافے کی گردن اتنی لمبی کیوں ہے ڈیڈی؟"

"بھائی کسی جانور کی لمبی ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی۔"

" ڈیڈی! بچہ صرف عورت ہی کو کیوں پیدا ہوتا ہے ؟"
کیسی باتیں کرتے ہو، اگر مرد کو بچہ پیدا ہونے لگے تو پھر وہ عورت نہ ہو جائے"۔
" ڈیڈی! اگر آپ میرے سوالوں سے خفا ہوتے ہیں تو میں نہ پوچھوں"۔
" نہیں نہیں پوچھو بیٹا، سوال نہیں پوچھوگے تو علم کیسے ہوگا ؟"

میرا بیٹا رات کو کیا سوچتا رہتا ہے ؟ کیوں رات دیر تک اُسے نیند نہیں آتی ؟ کیا صرف روغن بادام یا خواب آور گولیاں ہی اس کا علاج ہیں ؟ کیا اُسے سیکس ستاتا ہے ؟ کیوں کہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہو چکی ہے اور اس کے چند مطالبے جائز ہیں۔ پھر اس نے شادی سے کیوں انکار کر دیا۔ کیا صرف اس لئے کہ جب تک وہ اس دنیا کی تگ و دو میں اپنا مقام نہ بنائے گا کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہ کرے گا ؟ کیوں ہمارے زمانے میں لوگ اس عقیدے پر شادی کر لیا کرتے تھے کہ عورت لکشمی ہوتی ہے ! اس کے آنے سے قسمت کے دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں۔ اکثر وہ نہیں کھلتے تھے، صرف چند تاریک مستقبل والے بچے اس دنیا میں چلے آتے۔

میرے بیٹے کے خیالات کیا ہیں ؟ میں ان تک پہنچنے کی کوشش تو کروں۔ اس کی روح میں اُتر کر دیکھوں کہ وہ کیوں اتنا خود غرض ہو گیا ہے ؟ کیوں وہ دوسرے کسی کے باپ کے پیر بھی چھوتا ہے لیکن صبح اُٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ دوسرے کا باپ امیر کبیر ہے اور اس نے اپنے بیٹوں کو دولت اور شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بیٹے کے باپ نے چند کالے صفحوں کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا۔ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بیٹا بھی راتوں رات لکھ پتی ہو جانا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پیسہ کمانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک روتے پر دوسرا رَدّا رکھنا پڑتا ہے ؟ جیسے وہ مذہب اور دوسری رسوم و روایات کا قائل نہیں۔ وہ گرد و پیش کی دنیا کو دیکھ کر اس قسم کی محنت کا بھی قائل نہیں، ایسے نظام کا بھی قائل نہیں جس میں کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور کچھ عیش کرتے ہیں اور کھلے بندوں کہتے ہیں۔ بزنس میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں۔ میرا بیٹا میرا نام استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی شرم نہیں سمجھتا۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجبور اور شرم سار ہے۔ میری وجہ سے وہ کسی سے دس روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔

میں نے ہنسی کی آڑ میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے کہا۔ "بیٹا تو پھر تم سوما نگا کرو"۔

اور مجھے پتا چلا کہ وہ میری زندگی میں سے جذباتیت اور مثالیت کو یکسر نکال دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے باپ کی اتنی حیثیت تو ہو جائے کہ وہ کسی سے لاکھ دو لاکھ مانگ سکے جس سے وہ ایک فلم بنائے اور اس سے کئی لاکھ کمائے۔

اس قسم کی مادہ پرستی، خود غرضی، سگریٹ، شراب، عورت کی وجہ سے باپ اپنے بیٹوں کو اپنی زمین جائیداد سے بےطرف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مادی معنوں میں میرے پاس ہے ہی کیا، جس سے بیٹے کو بےطرف

کردوں؟ اگر وہ کسی بات سے ناراض ہو کر چلا جائے تو پھر میں ہی اُسے ڈھونڈتا پھروں گا اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو وہ مجھے نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لئے میں سخت وحشت کے لمحوں میں بھی چپکے سے گھر چلا آتا ہوں یہ سوچ کر کہ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کہیں چلا نہ جائے۔ میں اسے برطرف کرنے کی نہیں سوچتا۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے اِنسانی اصول کے کلبلاتے ہوئے درخشاں مستقبل سے برطرف نہ کر دے۔ □□

اچھا لکھنا اور لکھ کر چوٹی کا ادیب بن جانا، شاید مشکل بات نہ ہو، لیکن عملاً اور پیدائشی طور پر چوٹی کا ادیب ہونا صرف اسی وقت ممکن ہے جب قدرت اس کا منصوبہ بنائے۔ یہ تانہ بخشد، خدائے بخشندہ والی بات ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اس لحاظ سے عملاً بھی چوٹی کے ادیب ہیں اور اس پہ اپنا کافی وقت صرف کرتے ہیں وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے ...... وہ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ اردو ادب میں سردار صرف وہی ہیں۔ (عیاں را چہ بیاں) انہوں نے گفتگو کے لئے اپنی ایک کہانی دی تو احتیاطاً کہہ دیا کہ اِسے "گفت" کے حصّہ میں چھاپا جائے۔ اُن کی ساری لطیفہ بازی کا جواب انھیں اس وقت ملا جب انہوں نے فلم "دستک" بنائی۔ کسی فلم بین نے اُن سے پوچھا۔ بیدی صاحب! آپ نے صرف دس تک کیوں بنائی؟ بارہ تک بناتے.... ایک صاحب سے جب یہ خوب دل کھول کر مل چکے اور ان پر اپنی مہر و محبت کا سکّہ جما چکے تو انھوں نے مجھ سے پوچھا: یہ کون صاحب تھے؟ میرے جی میں تو آیا کہ اُن سے کہہ دوں کہ یہ اختر شیرانی تھے، لیکن میں نے یہ سوچ کر شاید وہ میری اس بات پر یقین کر لیں، اُن سے عرض کیا، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، یہ شاذ تمکنت ہیں۔ بیدی صاحب کو اپنا سر پیٹنے کی سہولت حاصل نہیں ہے (خوبصورت اور مسجع پگڑی کی وجہ سے) اور پگڑی اُتار کر سر پیٹنے کا طریقہ ہمارے ہاں نہیں ہے ورنہ وہ اپنا سر بھی پیٹ لیتے۔

(کتاب "سائے اور ہمسائے"
از: یوسف ناظم سے)

ایک خط بنام جوہر سیوانی مرحوم

(نائب صدر زندہ دلان، بہار)

جوہر بھائی خدا آپ کو غریق رحمت کرے۔

ابھی ابھی آپ کی موت کی خبر سننے میں آئی۔ سن کر یقین نہ آیا۔ یقین آنے کی بات بھی نہیں ہے۔ مگر جو حادثہ ہو چکا ہے اُسے کیوں کر چھپایا جا سکتا ہے لہٰذا یہ کہہ کر آنسو پینے کی کوشش کرتے ہیں ؎

جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا۔

آپ کا لفافہ مورخہ ۲۱ نومبر ۲۰۰۴ مجھے ۲۴ نومبر کو جبکہ میں ایک ماہ کی رخصت کے بعد واپس لوٹا تو موصول ہوا کئی خطوط تھے۔ سب سے پہلے آپ کا لفافہ چاک کیا۔ آپ نے زندہ دلان بہار کے اگلے پروگرام کے لئے جو وعدہ کیا تھا اسے پڑھ کر میں بہت خوش ہوا تھا۔ میں آپ کے جواب سے مطمئن تھا کہ آپ نے میرے پروگرام کو سراہا اور اپنا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ آپ کی اس ہمت افزائی پر میں دوسرے عہدہ داروں کو خط لکھنے کی سوچنے لگا مگر مجھے کیا پتا تھا کہ جب میں یہ خط پڑھوں گا اس وقت آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی اور عالم ارواح میں زعفران بکھیر رہی ہوگی۔ بھائی میرے یہ سراسر دھوکا ہی ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کے چپ چاپ نکل بھاگے۔ وعدہ پکا کرنے کا خیال ہی نہ رہا۔ ملک الموت سے یہ تو کہہ سکتے تھے کہ زندہ دلان بہار کے اگلے پروگرام کے لئے میں نے وعدہ کر رکھا ہے اسے نبھا لینے دو۔ اس کا کیا جاتا۔ اس کی تو عرش تک رسائی ہے چلا جاتا اور خدائے برتر سے مہلت مانگ لیتا کہ ایک مرد مومن کا وعدہ ہے ممکن ہے بلکہ یقین ہے حضرت عزرائیل علیہ وسلام کی بات اللہ تعالیٰ مان لیتے کہ اس کا بندہ اور ہو شرمندہ ہرگز ہرگز روح قبض کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن پتا نہیں آپ کو اتنی پاس خاطر کیوں لاحق تھی کہ پروانۂ موت دیکھ کر حق ادا کرنے کے لئے چپ سادھ لیا۔ کچھ تو ٹال مٹول کرتا تھا دنیا کا حق ادا کرنے میں اتنی جلدی بازی کیوں کی لگتا ہے آپ کو بہانا بازی کا فن نہیں آتا تھا ورنہ محبوبہ کے وعدے کی طرح خوب خوب ٹرخاتے اور اس درمیان عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کرتے پھر زندہ دلان بہار کے پروگرام کو سنوارتے پتہ نہیں حضرت عزرائیلؑ نے آپ کو کیا کہا کیا دکھلایا اور کیا سمجھایا کہ آپ یہ سب بھول کر جلوۂ خداوندی کے خواہش مند ہوگئے۔ واللہ ایسا بھی کوئی آدمی ہوتا ہے، اتنی جلدی داغ مفارقت دیتا ہے۔

بہرحال آپ کا دل اس خداوند کریم میں لگا ہوا تھا میں کیا کروں، رو پیٹ کر آپ کیلئے جنت الفردوس کی دعا کرتا ہوں خدا کرے آپ وہاں بھی اپنے جوہر دکھانے میں کامیابی حاصل کریں اور حور و ملائک تک کے دل میں گھر کر لیں۔

آمین۔ آمین۔ ثم آمین۔ آپ کا چھوٹا بھائی

تمنا مظفر پوری، جنرل سکریٹری، زندہ دلان بہار۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا —— (اداریہ)

۔ قارئین شگوفہ کی خدمت میں نئے سال کی مبارکباد —— یہ سال عالمی جشن مزاح کا سال ہے۔ جس کے پروگرام کو قطعیت دی جاچکی ہے۔ یہ جشن ۸/ تا ۱۲/ فروری ۱۹۸۵ء کو حیدرآباد میں منعقد ہو رہا ہے۔ گیارہ مختلف زبانوں کے طنز و مزاح نگار الگ الگ اجلاسوں میں مزاحیہ مضامین سنائیں گے۔ کارٹونوں اور مزاحیہ فلموں کی نمائش کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے۔ مائم و کٹھ پتلیوں کا ناچ، عالمی قہقہوں کی محفلِ لطیفہ اور اردو و ہندی کا عالمی مزاحیہ مشاعرہ بھی اس پروگرام میں شامل ہے۔ جناب نریندر لوتھر صدر زندہ دلانِ حیدرآباد کی سرکردگی میں جشن کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ اس موقع پر شگوفہ کے خصوصی شمارہ کے علاوہ 'ہندوستانی مزاح نمبر' بھی شائع ہوگا۔ انگریزی میں ایک خوبصورت تقریباً ۲۵۰ صفحات پر مشتمل سووینیر بھی شائع ہوگا۔

۔ یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ معاشیات کے ماہر ڈاکٹر وحید الدین احمد خان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ وحید صاحب معاشیات کے شعبہ میں تو اہمیت کے حامل تھے ہی، حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں بھی ان کو خاص مقام حاصل تھا۔ وہ بیحد خلیق، ملنسار اور زندہ دل انسان تھے۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود "شگوفہ" کیلئے وہ تین چار سال تک مستقلاً کارٹون بناتے رہے۔ ادارۂ شگوفہ ان کے اچانک اور کم عمری میں انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ۔۔
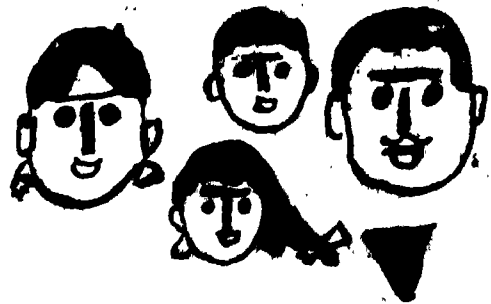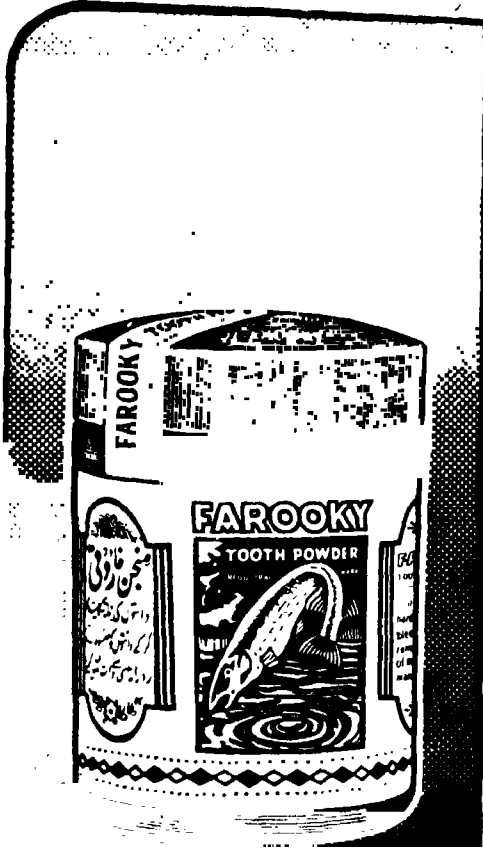
Vol. 18 Copy 1 **SHUGOOFA Hyderabad-1** Postal Regd. No. H/HI

January 1985 Phone : 5577

سوونیر

GOLCONDA
10 CIGARETTES
THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT. LTD.
1-7-140, MUSHEERABAD, HYDERABAD. INDIA.
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ
حیدرآباد

سوونیئر عالمی جشنِ مزاح

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد (۱۸)
شمارہ (۲)
فبروری ۱۹۸۵ء

فی پرچہ : =/RS. 5
زرِ سالانہ : تیس روپے
عرب ممالک سے : ایک سو روپے
امریکہ اور برطانیہ : ایک سو پچاس روپے

کتابت :
محمد عبدالرؤف خوشنویس ؛ مسعود انور

سرورق:
طالب خوندمیری

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان۔ حیدرآباد ۲

خط وکتابت کا پتہ :
شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس : 557716
فون مکان : 521064

عالمی جشن فراق
آرگنائزنگ کمیٹی

سرپرست :

جناب این ۔ ٹی راما راؤ ، چیف منسٹر آندھرا پردیش
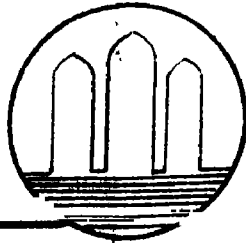
صدر :

جناب آنند گجپتی راجو ۔ ریاستی وزیر صحت

کارگزار صدر :

جناب نریندر لوتھر آئی ۔ اے ۔ ایس

معتمد :

جناب طالب خوندمیری

ارکان :

١ : ڈاکٹر سی ۔ نارائن ریڈی ، چیرمین سرکاری زبان کمیشن
٢ : جناب سید ہاشم علی اختر ، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی
٣ : پروفیسر جی ۔ رام ریڈی ، وائس چانسلر آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی
٤ : جناب پی ۔ کے ۔ دورائے سوامی ، آئی ۔ اے ۔ ایس
٥ : جناب ایس ۔ سنتھانم آئی ۔ اے ۔ ایس
٦ : جناب کے ۔ جے بھارت ریڈی ، آئی ۔ اے ۔ ایس
چیرمین و مینجنگ ڈائرکٹر آلوین
٧ : جناب کے ۔ وی ۔ دی سبرامنیم آئی ۔ پی ۔ ایس
٨ : جناب پی ۔ وی ۔ آر ۔ کے پرساد آئی ۔ اے ۔ ایس
٩ : جناب کے ۔ کے پلائی ، چیرمین وزیر سلطان ٹوباکو کمپنی
١٠ : جناب مہندر ریڈی آئی ۔ پی ۔ ایس
١١ : جناب سی ۔ ایم ملک ، جنرل منیجر ساؤتھ سنٹرل ریلوے
١٢ : جناب ایل ۔ ڈی سویندال ، ڈائرکٹر جنرل ایکریسات
١٣ : جناب پی ۔ آر دستھامد ، چیرمین و منیجنگ ڈائرکٹر
(E.C.I.L)
١٤ : جناب کے ۔ جی ۔ کے مورتی ، چیرمین آندھرا بنک
١٥ : جناب ایم ۔ کے ۔ آر ونائک آئی ۔ اے ۔ ایس
١٦ : جناب بیر سنگھ پرشیرا آئی ۔ اے ۔ ایس ، ایڈیشنل کمشنر پولیس
١٧ : جناب کے ۔ ایل ۔ چگ ، مینجنگ ڈائرکٹر
حیدرآباد پلم پیپر بورڈ لمیٹڈ
١٨ : جناب دامودر راؤ ۔ ایڈیٹر نیوز ٹائم
١٩ : جناب عابد علی خاں ۔ ایڈیٹر سیاست

٢٠ : جناب سید وقار الدین ، ایڈیٹر رہنمائے دکن
٢١ : جناب ڈی ۔ راما نجا راؤ ، چیرمین
آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی
٢٢ : محترمہ اندرا دھن راج گیر ، چیرمین ہندی اکیڈیمی
٢٣ : جناب شاہ عالم خاں ، چیرمین
حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری
٢٤ : جناب اے ۔ این ماتھر ، اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد
٢٥ : جناب این ۔ این مہاجن ، مینجنگ ڈائرکٹر
اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد
٢٦ : ڈاکٹر ڈبلیو ۔ میسنر ڈائرکٹر میکس ملرمبھون
٢٧ : جناب ایم ۔ وی ۔ سبرامنیم ، چیف جنرل منیجر
اسٹیٹ بنک آف انڈیا
٢٨ : جناب ایس ۔ سبرامنی ، ڈائرکٹر دور درشن کیندر حیدرآباد
٢٩ : مس لیلا باوڈیکر ، ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو
٣٠ : جناب وکرجے ۔ ایس ۔ پی ایریا نیاگم ، پوسٹ ماسٹر جنرل
٣١ : جناب بھارت چند کھنہ آئی ۔ اے ۔ ایس (ریٹائرڈ)
٣٢ : جناب رنگا راؤ ، نمائش سوسائٹی
٣٣ : محترمہ جلقیس علاؤالدین
٣٤ : پروفیسر رفیعہ سلطانہ ۔ سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس
(عثمانیہ یونیورسٹی
٣٥ : جناب ٹی ۔ وینکٹ ریڈی ، ڈائرکٹر تلگو اکیڈیمی
٣٦ : جناب وی ۔ ایس دتا ، جنرل منیجر ہوٹل بنجارا
٣٧ : جناب سریندر جی ، نمائش سوسائٹی
٣٨ : جناب حسن الدین احمد آئی ۔ اے ۔ ایس (ریٹائرڈ)
٣٩ : ڈاکٹر رام پرشاد
٤٠ : جناب اے ۔ زیڈ صدیقی
٤١ : جناب آئی ۔ بی نیمین
٤٢ : جناب آر پربھاکر راؤ آئی ۔ پی ۔ ایس ، کمشنر آف پولیس

عالمی جشنِ مزاح

زیرِ اہتمام : زندہ دلانِ حیدرآباد

۸ تا ۱۲ فروری ۱۹۸۵ء

پروگرام

جمعہ ۸ فروری ۱۹۸۵ء
½۹ تا ½۱۱ بجے دن
بمقام : رویندرا بھارتی تھیٹر

افتتاح :
بدست جناب بلرام جھاکر ۔ اسپیکر لوک سبھا
سوونیر کا رسم اجراء ، پوسٹل کور کی تنسیخ :
بدست جناب شراون کمار ، چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش

---

۴ تا ۶ بجے شام : کارٹون نمائش کا افتتاح ۔ بمقام : جواہر بال بھون ۔ پبلک گارڈن
۶ تا ۸ بجے شام : مائم شو ۔ بمقام : رویندرا بھارتی

ہفتہ ۹ فروری ۱۹۸۵ء
۹ تا ½۱۱ بجے دن
بمقام : رائل ٹاکیز ، سلطان بازار

مزاحیہ فلم فسٹیول کا افتتاح :
بدست : جناب وی ۔ این گاڈگل ۔ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات

½۲ بجے تا ۵ بجے شام
سمینار ۔ اردو میں مزاح
بمقام : اردو ہال ۔ حمایت نگر

متوازی اجلاس :

۶ تا ۹ بجے شام ؛ سمینار بنگالی : بمقام : بنگالی سمیتی ۔ لوور ٹینک بینڈ
۹ تا ۱۲ بجے رات ؛ " گجراتی : بمقام : گجراتی ودیا مندر ، سلطان بازار
½۵ تا ½۸ بجے شام ؛ " کنڑی : بمقام : کرناٹک ساہتیہ مندر ۔ لنگم پلی باغ
½۵ تا ½۸ بجے شام ؛ " ملیالم : بمقام : این ۔ ایس ۔ کے ۔ کے اسکول (ڈی ۔ ایچ ۔ ای ۔ ایل)
۵ تا ۸ بجے شام ؛ " مرہٹی : بمقام : ویویک وردھنی آڈیٹوریم ۔ قریب نیلم سنجیوا ریڈی بی ۔ ایڈ کالج جام باغ
۸ تا ۱۱ بجے شام ؛ " پنجابی : بمقام : اندرا پریہ درشنی آڈیٹوریم ۔ پبلک گارڈن
۶ تا ۹ بجے شام ؛ " تلگو : بمقام : آندھرا سرسوتھا پریشد ، تلک روڈ
½۶ تا ۹ بجے شام ؛ " تامل : بمقام : کینرائی اسکول ۔ سکندرآباد
½۶ تا ۹ بجے شام ؛ " ادبی اجلاس
(اردو ۔ مزاحیہ مضامین) بمقام : رویندرا بھارتی تھیٹر

اتوار ۱۰ر فروری ۱۹۸۵ء	
۱۰½ تا ۱½ بجے دن	عالمی محفلِ لطیفہ گوئی۔ بمقام: رویندرا بھارتی تھیٹر
۴ تا ۵ بجے شام	اجلاس، کارٹون سازی۔ بنی اسٹیڈیم۔ جواہر بال بھون

متوازی اجلاس

۹ تا ۱۲ بجے شب	ادبی اجلاس؛ گجراتی: بمقام: گجراتی سیوا منڈل۔ جیرا۔ سکندرآباد
۵ تا ۹ بجے شب	〃 ؛ ہندی (نثر) بمقام: رویندرا بھارتی
۵½ تا ۹½ بجے شب	〃 ؛ کنڑی: بمقام: کرناٹک ساہتیہ منڈل۔ باغ لنگم پلی
۵½ تا ۸½ بجے شب	〃 ؛ ملیالم: بمقام: این۔ ایس۔ کے۔ کے اسکول [بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل]
۵½ تا ۸½ بجے شب	〃 ؛ مرہٹی: بمقام: ویویک وردھنی آڈیٹوریم قریب نیلم سنجیوا ریڈی بی۔ ایڈ کالج۔ جام باغ
۶ تا ۹ بجے شب	〃 ؛ تلگو: آندھرا سرسوتھا پریشد، تلک روڈ
۶½ تا ۹ بجے شب	〃 ؛ تامل: کیسر ہائی اسکول۔ سکندرآباد

پیر ۱۱ر فروری ۱۹۸۵ء	
۱۰ تا ۱ بجے دن	سمپوزیم؛ جوبلی ہال۔ پبلک گارڈن
۴ تا ۶ بجے شام	مزاح پریڈ (بچوں کے لیے) اندرا پریہ درشنی آڈیٹوریم۔ پبلک گارڈن
۸ تا ۱۱ بجے رات	اُردو ہندی مشاعرہ؛ بمقام لال بہادر فٹبال اسٹیڈیم صدارت: نواب شاہ عالم خاں مہمانِ خصوصی: عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما۔ گورنر آندھرا پردیش

منگل ۱۲ر فروری ۱۹۸۵ء	
۱۰ تا ایک بجے دن	ادبی اجلاس؛ غیر ملکی زبانیں و انگریزی بمقام؛ جوبلی ہال۔ پبلک گارڈن
۲ تا ۴½ بجے شام	مباحثہ و اختتامیہ؛ جوبلی ہال۔ پبلک گارڈن

مجلسِ عاملہ
زندہ دلانِ حیدرآباد
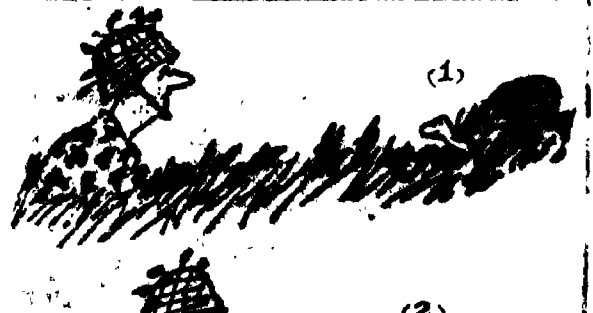
صدر :
جناب نریندر لوتھر آئی۔ اے۔ ایس
نائب صدور :
جناب رشید قریشی
جناب حمایت اللہ
معتمد عمومی :
جناب طالب خوندمیری
نائب معتمدین :
جناب مسیح انجم
جناب بوگس حیدرآبادی
خازن :
جناب محمد سلیمان

اراکین

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال
جناب مصطفےٰ علی بیگ
ڈاکٹر حبیب ضیاء
ڈاکٹر عابد معز
جناب اسلم فرشوری
جناب یوسف شریف

کنوینرس عالمی جشنِ مزاح :

مشاعرہ :	جناب محمد حمایت اللہ
ادبی اجلاس :	جناب مسیح انجم
اردو سمینار :	ڈاکٹر یوسف کمال
بین الاقوامی زبانیں اور انگریزی سمینار	ڈاکٹر آئزک سیکورا
ہندی :	جناب مرلی دھر شرما
مرہٹی :	جناب ڈی۔ پی۔ جوشی
بنگالی :	جناب ایس۔ کے دھار
تلگو :	جناب آئی۔ کرشنا مورتی
ٹامل :	جناب کے۔ وی۔ این سوامی
کنڑی :	جناب کرشن راؤ اور اروند سنگم
پنجابی :	جناب رگھوبیر سنگھ
ملیالم :	جناب سی۔ پی گوبندن
گجراتی :	جناب ٹی۔ ایل کپاڈیہ
مائم :	جناب لکشمی دیوی راج
کارٹون :	جناب شنکر کمار
عالمی لطیفہ گوئی :	جناب مصطفےٰ علی بیگ

اس شمارے کے چھوٹے بڑے (فہرست)

مالِ مفت:

منشور قہقہہ ؛ نریندر لوتھر ۹
پنچ سالانہ امتحانات ۸۵ء ؛ فکر تونسوی ۱۷
قطب مینار ؛ یوسف ناظم ۲۵
عطاء الحق قاسمی ؛ ایک نثری کالم نگار :
سید ضمیر جعفری ۲۹
نام میں کیا رکھا ہے ؛ عطاء الحق قاسمی ۳۳
ہم نے ڈھلتا ہے ستم ؛ رشید قریشی ۴۴
گشت ؛ پرویز یداللہ مہدی ۵۱
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ؛ مسیح انجم ۶۱
بالمشافہ ؛ مجیب صدیقی ۶۷
شہرت کی خاطر ؛ رشید الدین ۷۳

ورا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد

افواہوں کا شہر، حیدرآباد ؛ عابد معز ۷۷

چوریاں (منظومات)

ضمیر جعفری ۱۵، ۱۶
رضا نقوی واہی ۲۳
طالب خوند میری ۲۴
بھوش سیوانی ۲۸
پاگل عادل آبادی ۴۲
سرپٹ حیدرآبادی ۴۳
اسمٰعیل ظریف ۴۹
مختار یوسفی ۴۹
اسمٰعیل آذر ۵۰
مسیح جلیل ۵۹
رؤف رحیم ؛ سراج نرملی ۶۰
ظہیر قدسی ؛ ۶۳
حفیظ خان مشتاق ۶۵
الٹ پٹ جہانگیری ۶۵
صبغۃ اللہ بشاش ؛ ۷۱
مصطفیٰ علی بیگ ۷۲
معین امر بمبو ؛ ۷۲

جناب ین ٹی راما راؤ
چیف منسٹر آندھرا پردیش
سرپرست

جناب آنند گجپتی راجو ایم - پی
ریاستی وزیر صحت و طبابت
صدر

جناب محمد سلیمان
خازن زندہ دلان حیدرآباد

جناب مسیح انجم
نائب معتمد زندہ دلان حیدرآباد

جناب مصطفیٰ علی بیگ
رکن زندہ دلان حیدرآباد

جناب پوگس حیدرآبادی
نائب معتمد زندہ دلان حیدرآباد
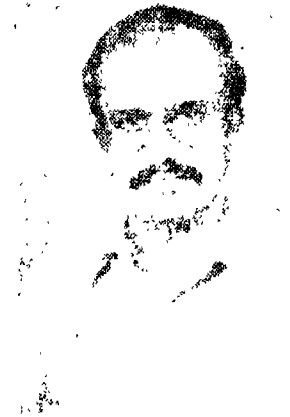
ڈاکٹر عابد معز
زندہ دلان حیدرآباد

جناب ضمیر جعفری

جناب عطاء الحق قاسمی

نریندر لوتھر

انگریزی سے ترجمہ: مظفر مجاز

منشورِ قہقہہ

بہت زمانہ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ جانوروں اور انسانوں میں بنیادی فرق قوتِ گفتار ہے۔ مجھے اس بارے میں تھوڑا سا شک ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس تعلق سے قطعی فیصلہ ہوچکا ہے کہ جانوروں میں گفتار کی صلاحیت نہیں۔ گفتگو ہی صرف ذریعۂ اظہار ہے۔ صوت و صدا کی نزاکتیں جنھیں ہم تقریر کہہ سکتے ہیں ایک طرح سے دوسروں سے ربط و تعلق کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ جانور ایک دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں رکھتے ہر جانور صوت و صدا کا کوئی نہ کوئی طرزِ اظہار رکھتا ہے جو اس کی ضرورت اور طبعی کیفیت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کتّے کو لیجئے اس کا غصّے میں غرّانا اس کے لاڈ کی آوازوں سے بہت مختلف ہوتا ہے اسی طرح بلیاں آپس میں لڑتے سمے جو آوازیں نکالتی ہیں وہ اُن آوازوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں جو وہ اپنے آقا سے کھیلتے وقت نکالتی ہیں۔ جن سے آپ اُن کی مزاجی کیفیت اور ان کے ارادوں کو بخوبی پہچان سکتے ہیں۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا بھی ہے جن کی آوازیں مختلف ناموں کی حامل ہیں جیسے ہاتھیوں کا چنگھاڑنا، شیروں کا دہاڑنا، بلیوں کا میاؤں میاؤں کرنا، کتّوں کا غرّانا، بکریوں کا ممنانا، گھوڑوں کا ہنہنانا، چڑیوں کا چہچہانا، کوّوں کا سامئیں سائیں کرنا وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک طرح کا بات کرنا ہی ہے جس طرح ہمارے ملک میں مختلف صوبوں کے لوگ صرف اپنی اپنی زبانوں میں ہی بات چیت کرتے ہیں۔ ویسے ہی ایک قسم کے جانور دوسری قسم کے جانوروں کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیر تامل زبان بولتے ہیں، بلیاں گجراتی، بکریاں پنجابی اور میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اُس زبان کا نام بتادینا چاہیئے جو لومڑیاں بولتی ہیں ورنہ وہ لوگ میرے خلاف سازش شروع کردیں گے! اس طرح ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جانور کوئی انسانی زبان نہیں بولتے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی زبان بولتے ہی نہیں۔

پس یہ ثابت ہوا کہ اس طرح بات کرنے کی صلاحیت انسانوں اور جانوروں میں کوئی بنیادی فرق کا باعث نہیں ہے۔

پہلا نظریہ تو یہ ہے کہ انسانوں اور جانوروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانوں میں حسِ مزاح ہوتی ہے جس سے جانور محروم ہوتے ہیں۔ آپ شیر کو بہتر سے بہتر لطیفہ سنائیے وہ بہرحال آپ کو کھانے ہی کو لپکے گا آپ کسی بکری کے سامنے کوئی عمدہ ترین طنز کا خیال پیش کیجئے، وہ مینگنیاں ڈالے بغیر دودھ نہیں دے گی آپ یہ پوچھیں گے کہ جب وہ ہماری زبان ہی نہیں سمجھ سکتے تو لطیفہ یا مزاح کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ میں نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی جانور کسی لطیفہ سے لطف اندوز ہوا ہو یا آپس ہی میں ہنسی مذاق میں شریک ہوا ہو۔ بارہا میں نے اپنے کتے کو کتوں والے کارٹون دکھائے لیکن اس نے رتی برابر بھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

دوسرا کلیہ: یہ حسِ مزاح ہی ہے جو انسانوں اور جانوروں کے درمیان

بنیادی اختلاف کی وجہ ہے!

ایسا کیوں ہے؟ نطشے نے کہا کہ "انسان ہی اس دنیا میں اتنا گرفتارِ مصائب ہوتا ہے کہ اُسے قہقہہ ایجاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا" مثل ارتقا کے دوران انسان نے ہنسنا بات کرنے سے بھی پہلے سیکھا تیسرا کلیہ مذکورہ دوسرے کلیے سے ہی جنم لیتا ہے۔

"اگر حسِ مزاح انسانوں کی جانوروں پر برتری کو ثابت کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ انسان جو حسِ مزاح رکھتے ہیں ان انسانوں سے بہرحال بہتر ہیں جن میں اس کی کمی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس کلیے سے اختلاف کرے گا۔ لوگ صرف یہی ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ بہت اچھی حسِ مزاح رکھتے ہیں۔ امریکی ماہر نفسیات ابراہیم ماسلو نے انسانی ضروریات اور محرکات کی درجہ بندی پانچ سطحوں پر کی ہے مسعودی نظام مراتب میں وہ کچھ اس طرح ہیں۔ جسمانی ضروریات تحفظی ضروریات، معاشرتی ضروریات، شکوہی ضروریات اور سب سے آخر میں خودگیری ضرورت جسے خودگیری اور خودنگری کی ضرورت بھی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ماسلو کے خیال میں

خودگیر اور خودنگر لوگ ایک نمایاں حسِ مزاح سے متصف ہوتے ہیں۔

ہر صورت حال کے دو پہلو ہوتے ہیں، دو زاویئے جن سے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک گلاس جو آدھا خالی ہے تو آدھا بھرا ہوا بھی ہے۔ موخرالذکر بیان رجائیت پر مبنی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری دنیا زندہ اور سلامت ہے تو محض رجائیت کی بنا پر۔

رجائیت مزاح کا سرچشمہ ہے

اب سوال اٹھتا ہے تناظر کا۔ ہم لمحۂ حال میں جیتے ہیں ہم اپنے 'فوری' کی سرگرم جستجو میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک ماضی بعید بھی تھا اور مستقبل بعید بھی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے' جیسا کہ اڈمنڈ برک کہتا ہے، کہ ہم ایسے سائے ہیں جو دوسرے سایوں کی جستجو میں سرگرداں ہیں'۔ اگر ہم اپنے آپ کو اس تناظر میں دیکھیں تو ہم اپنی ہر خود غلطی سے دوچار ہو جائیں گے اس اداکار کی طرح جو بقول شیکسپیر کچھ دیر کے لئے رنگ منچ پر اپنے کرتب دکھاتا ہے، اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا

مثال کے طور پر فیشن کو ہی لیجئے پانچویں دہائی کا چھیل چھبیلا ساتویں دہائی میں جوکر بن جاتا ہے۔ ہمارے بچے ہماری اُن تصویر
کو جو اُن کی پیدائش سے پہلے لی گئی ہوں، دیکھ کر اپنی ہنسی ضبط نہیں کر پاتے۔ بہت سے لوگ بیتے ہوئے ایام میں کھو کر شاید اچھا
خاصہ ہنس بھی لیتے ہیں لیکن ایسا کرنے کے قابل ہونا . . . ماضی سے استفادہ کئے بغیر ایسا ہی ہے جیسے یہ تصور کرنا کہ
آئندہ دس سال بعد ایک بالکل نارمل تصویر کیسی نظر آئے گی۔ یہ بات بالکلیہ ممکن العمل نہیں ہے۔ اپنے جسم سے باہر نکلنے کی صلاحیت
اور چیزوں کو مستقبل کی آنکھ سے دیکھنا ہی طنز و مزاح کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ ناوابستگی ہے جو بہت سے مشرقی
دانشوروں کے نزدیک مزاح کی بنیاد ہے پروفیسر رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ یونیورسٹی) نے میری دوسری کتاب کے مقدمہ میں کہا ہے کہ
نھیں ایک بیراگ (لاتعلقیت) کا احساس میری مزاحیہ تحریروں میں ہوا جو ابتدائی سنسکرت کے اشلوکوں کی خصوصیت
ہے۔ میں محترمہ کے تجزیئے کو بالکل درست سمجھتا ہوں نہ صرف اس لئے کہ اس میں میری تعریف و توصیف کا پہلو نکلتا ہے بلکہ
س لئے بھی کہ گہرے مزاح کے لئے ایک ایسے احساس کی جو بیراگ (لاتعلقیت) کی حدوں کو چھوتا ہو، سخت ضرورت ہے
ہی وہ خوبی ہے جو تقریباً تمام مذاہب اور فلسفوں کی تعلیم کا ایک جُز ہے افلاطون کا نظریۂ غار و کوہ، ہندوؤں کا تصور ملا
رحیاتِ مابعد میں جنت و دوزخ کا تصور جو بہت سے مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے، اسی لاتعلقیت پر
ر دیتا ہے (قوری سے دوری) "لوگوں سے" چیزوں سے اور حتیٰ کہ اپنے آپ سے لاتعلق"، جیسا کہ ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے
ہم سب نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔ عصرِ حاضر کے ماہرین نفسیات اسے اداکاری کا نام دیتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں
، وقفے میں ہم کو ان گنت رول انجام دینے ہوتے ہیں۔ ایک محبت کرنے والے بیٹے یا بیٹی کا، ایک تعلق خاطر رکھنے والے
، یا باپ کا ایک پُر جوش عاشق یا محبوب کا، ایک دفتری کا، ایک سرگرم میزبان کا، ایک دلنواز مہمان کا، ایک باعزت
ری کا یا جو بھی آپ ہیں ہماری اس مجمع پسند سوسائٹی میں اتنے سارے رول ہم ایک کے بعد ایک ادا کرتے جاتے ہیں۔ ایسے
ن اوقات ایک پر ایک مسلط کرتے ہوئے اتنے سارے نقابوں کے پیچھے بہرحال، شخصیت ایک ہی ہوتی ہے۔ پول کھولنا
صل اپنا ہی نقاب اتارنا ہے یا کسی دوسرے کا اور اس طرح اس اصلی شخص کو باہر لانا ہے کبھی اپنے لئے کبھی دوسروں کیلئے
ح اور طنز میں سمجھتا ہوں بہت زیادہ منحصر ہیں پول کھولنے یا قلعی کھولنے کے فن پر۔ یہ پول کھولنے والا ہی ہوتا ہے جو طنز
مد سے ہمارے توازن کو قائم رکھتا ہے اور ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم کیا ہیں (سائے) ہمیں کیا کرنا ہے کیا گذشتنی ہے۔ اور
ائمی۔ پول کھولنے والا میرے خیال میں دوامی خصوصیات رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی جذبے کا دو طریقوں سے
ر ـــ ایک اردو کے عظیم شاعر اقبال کا طرزِ اظہار ہے اور دوسرا انگریز طنز نگار ڈین سوئفٹ کا۔ مذہب کی عدم ہم آہنگی
سلسلے میں اقبال کہتے ہیں ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

صدی پہلے ڈین سوئفٹ نے اسی خیال کو اس چبھتے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے "ہم ایک دوسرے سے نفرت کرنے
لئے مذہب کو کافی استعمال کر چکے ہیں لیکن ایک دوسرے سے پیار کرنے کے لئے ہم نے اُسے استعمال کرنا ابھی نہیں
سیکھا ـــ یہی وہ بات ہے جس نے مسعود آنا ... [illegible]

مختصر یہ کہ طنز اور مزاح کے لئے ایک درجہ کی لاتعلقی اور بیراگ اشد ضروری ہے۔ آپ کو ایک ایسی دروں بیں نگاہ کی ضرورت ہے جو عام اشیائ میں بھی مضحک پہلو ڈھونڈ نکالے۔ آپ اپنا مذاق اڑانا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ ایک علامت ہے قوت برداشت کی اور نیاز مندی کی۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جیسا کہ افراد کے تعلق سے ہے اسی طرح اقوام اور تہذیبوں کے تعلق سے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بلوغ ذہنی کا تعلق اُن کے حسِ مزاح سے ہوتا ہے۔ مصریوں کو دیکھئے جو دنیا کے قدیم ترین تمدن کے حامل ہیں اور ان کے بے پناہ حسِ مزاح اور اپنا مذاق آپ اڑانے کی صلاحیت پر غور کیجئے۔ اگرچہ ناصر کی عمومی طور پر تمام عربوں میں نہایت قابلِ احترام شخصیت تھی اور بالخصوص مصریوں کے نزدیک لیکن اس کے تعلق سے ہر قسم کے لطیفے بیان کئے گئے بہ شمول فحش لطائف کے۔ انگریز بھی اپنے عمدہ حسِ مزاح کے لئے شہرت رکھتے ہیں چنانچہ ان کی سیاست اور سیاست کاروں کے بارے میں لطائف بڑے زور دار ہوتے ہیں یہاں تک کہ صاحبانِ اقتدار کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ اقتدار پرست حکومتیں اُن کے مذاق اڑائے جانے کو برداشت نہیں کرتیں۔ ایسے حالات میں لوگوں کا مزاح پردہ پوش ہو جاتا ہے اور پھر اس کا ایک زبانی سلسلہ چل پڑتا ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہتا ہے مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بغیر مزاح کے زندہ ہی نہیں رہ سکتے یا یوں کہنا چاہیئے کہ زندہ رہنے کے لئے مزاح کسی نہ کسی شکل میں از بس ضروری ہے۔

ہندوستانی تاریخ جمالیات میں مزاح کو آٹھویں رس میں شمار کیا گیا ہے ایک متعلقہ بھاؤ کے ساتھ۔ اس طرح ہندوستان میں اس کا ایک نمایاں مقام ہے۔

ہندوستان میں بے پناہ تنوع کی ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ مختلف مذاہب میں متنوع کلچر اور تابع کلچر ہیں۔ بڑی تعداد میں زبانیں ہیں اور بولیاں ہیں مختلف النوع لباس ہیں اور یہ سب مل کر ایک تہذیبی گلدستہ بناتے ہیں جس کا نام ہے ہندوستان۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک ملک سے زیادہ ایک برِ اعظم ہیں۔ ہر منطقہ مزاح کا ایک خزینہ رکھتا ہے۔ لوک گیت، لطیفے، کہاوتیں، قصے کہانیاں حقیقی یا تخیلی کرداروں کے اطراف گھومتے ہیں اور . . . . لوگوں کو فرحت بخشتے ہیں بیربل، شیخ چلی، وسوندا سنگھ، منڈوڈاری رام کرشنا بڑے سہل الحصول مقامی کردار ہیں جن کی بنیاد پر کسی کو بھی ہدفِ مزاح بنایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک بڑی روایت زبانی مزاح کی ہے اور پوری کی پوری جاتیاں جیسے مراثی یا بھاٹ اپنی روٹی روزگار لوگوں کو خوش کر کے ہی کماتے ہیں جس کا مدار فی البدیہہ فقرہ بازی اور لطائف پر ہوتا ہے مگر جس کے لئے انھیں کے اظہار بیان کی ضرورت ہے۔ یہ زبانی مزاح کی روایت جو نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہی ہے اب تیزی سے غائب ہوتی جاتی ہے اور ضروری ہے کہ ان کے رپورتاژوں کو جمع کیا جائے اور ان کی تدوین کی جائے اس سے پہلے کہ وہ سرے سے ناپید ہو جائیں۔ اسی طرح مقامی مزاح کا ترجمے کے ذریعہ پھیلنے کا ذریعہ بھی نہیں رہا ہے۔ ہندوستان جیسا متنوع اور پھیلاؤ رکھنے والا ملک متحد اگر رہ سکتا ہے تو وہ تراجم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ مختلف مقامات پر بولی جانے والی زبانوں اور عملی مزاح کے تبادلے کے ذریعہ قومی یکجہتی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مجھے یہ وعظ و نصیحت یہیں ختم کر دینی چاہیئے ورنہ . . . .

مشہور عالم رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ایک نیچ "مزاح — بہترین دوا" کے عنوان سے ہر شمارہ میں شائع ہوتا ہے

اس دعوے کے لئے دلائل طبی تحقیق سے بھی ملے ہیں اور تجربی شہادت بھی دستیاب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر آندریو ویل کہتا ہے کہ مزاح ایک ٹانک ہے جو صحت مندی کا ایک احساس فرد کو مہیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جیمس ولیش نے اپنے تجربے خانے میں پچاس سال پہلے کچھ تجربے کئے تھے جن سے یہ واضح ہوا کہ قہقہہ خون کے دباؤ کو دس درجے تک کم کرنے میں مدد دیتا ہے چاہے وہ کم دباؤ کا کیس ہو یا زیادہ کا۔ ڈاکٹر ولیم فرائی جونیر کا کہنا ہے کہ قہقہہ ایک طرح کا جسمانی معالجہ ہے ایک طرح کی کاواک روی (jogge) پھر نارمن کزن سابق ایڈیٹر "سیٹرڈے ریویو" کا وہ مشہور کیس بھی ہے۔ جس کو مرگی کا لاعلاج مریض قرار دیا گیا تھا وہ دوا خانے سے باہر آیا اور اپنے لئے ایک زوردار قہقہہ کا علاج تجویز کر لیا اور رفتہ رفتہ وہ بالکلیہ طور پر اچھا ہو گیا یہاں تک کہ ٹینس کھیلنے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ مسکراہٹ چہرے کے تین عضلات کو متاثر کرتی ہے معمولی سی ہنسی ۳۷ عضلات کو اور ایک بھرپور قہقہہ ۸۰ عضلات کو فزیالوجسٹ جن کی رہنمائی ہنس سیلے کرتا ہے یقین رکھتے ہیں کہ قہقہہ جسم میں کچھ ایسے مادے کے بہاؤ میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے جو جسم کی کارکردگی کو توانائی بخشتے ہیں۔

"اس لئے یہ کہنا بلا سبب نہیں ہے کہ جو ہنستا ہے وہ جیتا ہے"

میں یہاں تک ہی لکھ پایا تھا کہ پچھلے ستمبر میں ایک خبر میری نظر سے گزری جس کے مطابق انڈریو نامی ایک لڑکا ورجینیا (امریکہ) میں بغیر دماغ کے پیدا ہوا وہ رو تو سکتا تھا لیکن ہنس نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس سے کیا طبی نتیجہ نکلتا ہے؟ آپ کو دماغ کی ضرورت مسکرانے یا ہنسنے کے لئے ہے اسی لئے فراست و فطانت اور بذلہ سنجی مترادف سمجھے جاتے ہیں مزاح ذہانت ہی کا ایک اظہار ہے۔

تبسم اور قہقہہ لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں۔ ہم جان پہچان کی ہنسی اور دوستی کے قہقہے سے تو واقف ہیں ایک بذلہ سنجی کا تبصرہ یا کوئی لطیفہ کسی سنجیدہ نشست کی سرد فضا کو بے تکلفانہ ماحول میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ کتنی ہی سنجیدہ بحثیں جو دنیا کی مختلف کانفرنسوں یا مقننہ کی مجلسوں یا بین الاقوامی مذاکروں میں جاری ہوں ایک بذلہ سنج تبصرہ کے طفیل خراب شکل اختیار کرنے سے بچالی گئی ہیں۔ کوئی شخص بھی لطیفے کی دل خوش کیفیت سے دامن نہیں بچا سکتا کئی مقرر اور سیاستداں لطائف کا ایک خزینہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس سے اپنی تقریر کو ایسا موڑ دے سکیں جس کی مدد سے کسی اڑچن یا رکاوٹ کو دور کر لیا جا سکتا ہو۔ میں اس موقع پر ایک شخصیت آنجہانی رگھو رامیا کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو بہ حیثیت کانفرنسوں کے صدر کے اپنی حس مزاح کی وجہ سے بڑی کامیاب شخصیت تھے وہ شرکائے محفل کو ہنسا کر بعض بڑی پیچیدہ صورت حالات اور بھڑکے ہوئے جذبات سے نکال کر بچا لئے جاتے تھے۔

جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں چاہے وہ اندرونی طور پر ہمارے ملک میں ہوں یا بین الاقوامی ہوں مزاح ایک تعمیری کام انجام دے سکتا ہے یہ مختلف علاقوں اور طبقوں کو یکجا کر سکتا ہے اور اس طرح قومی یکجہتی کا باعث بن سکتا ہے اس طرح کی یکجہتی کہیں زیادہ آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے اگر لوگوں کو مسکرانے پر مجبور کیا جائے بہ مقابلہ کمیٹیوں کی سفارشات

کی مدد سے جن پر عمل کرنا اچھا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی میدان میں مزاح بین الاقوامی روابط کے حصول میں مدد دے سکتا ہے جب کہ بیزار کن نہ ختم ہونے والی بین الاقوامی کانفرنسیں کچھ بہتر نتائج پیدا نہیں کر پاتیں

یہ میرا مضبوط ایقان ہے کہ مزاح کو ایک بین قومی تحریک کے طور پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے!

میں واقف ہوں کہ میری یہ رائے خود ایک اچھا خاصہ مذاق سمجھی جائے گی اور ممکن ہے کہ اس مضمون کے قاری خود اس پر ایک خندۂ استہزاء لگانے لگیں گے پھر بھی میں اس کو کوئی بڑا نقصان نہیں سمجھتا: تاہم دنیا بھر کی ساری تحریکوں پر ایک نظر تو ڈالئے جن میں سے ایک اولمپک کھیلوں کی تحریک ہے۔ یہ تحریک جب شروع کی گئی تو مختلف گوشوں سے تمسخر اور تضحیک کا شکار رہوئی۔ کھیلوں کو ایک تضیع اوقات سمجھا گیا۔ جب یونانیوں کی شاندار روایات کالی قرنوں کی نذر ہوگئیں تو کھیلوں کو اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے کئی صدیاں لگ گئیں۔ ایک بین الاقوامی تحریک بننے کے لئے اس کو بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آج کوئی شخص بھی بین الاقوامی یکجہتی اور امن کے لئے کھیلوں کا حصہ اور اس کی اہمیت پر شک و شبہ کی گنجائش نہیں رکھتا چین امریکی تعلقات کی دوبارہ استواری جو ایک پوری چوتھائی صدی کے بعد دتوع پذیر ہوئی اس چینی پنگ پانگ ٹیم کی رہین منت ہے جو امریکہ بھیجی گئی۔ کھیلوں کو اُس تزکیہ کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے جس میں افراد اور قوموں کی تشدد انگیز جبلت کو معصومیت کی ایک قبا فراہم ہو جاتی ہے خود ہمارے ملک میں یہ دیر ہی سے سہی کھیلوں کی اہمیت کا احساس ایشیاڈ کھیلوں کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے جو پچھلے سال منعقد ہوئے تھے۔

اسی طرح میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسی تحریک جو مزاح کو ایک قابل احترام مقام و منزلت فراہم کرنا چاہتی ہے اور اس کو ایک بین الاقوامی شناخت دلوانا چاہتی ہے شاید کسی نہ کسی تمسخر و تضحیک کا شکار ہو جائے لیکن تھوڑے بہت وقفے کے بعد کامیاب ہونا اس کا مقدر بنے گا۔ اسی توقع کے ساتھ اس کانفرنس یا جشن کا اہتمام کیا گیا ہے اور وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ آیا ان لوگوں کے خواب محض خام خیالی تھے یا کوئی مثبت قدر بھی رکھتے تھے۔ وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ آیا یہ تحریک انسانیت کی فلاح اور ترقی میں ممد و معاون ہے یا محض ان لطائف کی طرح ہے جو کچھ وقت کے لئے یاد رکھے جاتے ہیں اور پھر بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مزاح دراصل ایک نہایت سنجیدہ کام ہے اور ہم اس تعلق سے بہت زیادہ سنجیدہ ہیں، مارک ٹوین جو مسکراہٹوں کے بکھیرنے والوں اور قہقہہ اندوزوں میں بڑا مقام رکھتا ہے کہتا ہے کہ "قہقہہ کی اصل خوشی نہیں غم ہے۔ عقبیٰ میں ہنسی کا کوئی تصور نہیں "عالم عقبیٰ میں ممکن ہے کہ قہقہہ اندوزی نہ ہو لیکن زمین پر اگر کوئی جنت ہے یا اس سیارہ پر اس کے حصول کی کوئی صورت ہے، تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قہقہہ اس کا مرکزی اور نمایاں کردار ہے اور وہ جو لوگوں کو ہنساتے ہیں یا کم سے کم مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں وہ اس کے قابل عزت شہری قرار پائیں گے۔ آمین!!

سید ضمیر جعفری

جناب سید ضمیر جعفری، پاکستان کے ممتاز مزاحیہ اور سنجیدہ شعراء کی صف میں نہ صرف ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ ان کے علمی، ادبی اور مزاحیہ مضامین بھی ادب میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ مضامین میں گہرائی، نظموں میں گیرائی کے علاوہ، ان کے فکاہیہ مضامین بھی ادب کا خاصہ ہیں۔ پاکستان کے مزاحیہ ماہنامہ "اُردو پنچ" کی مجلسِ ادارت سے بھی وابستہ ہیں۔ ان کی تصانیف کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے، چنانچہ اس سال جناب ضمیر جعفری کو ادب میں حسنِ کارکردگی کے لیے "صدارتی تمغہ" عطا کیا گیا جو پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ان کے ادبی ذوق کی تربیت کرنے اور نکھارنے میں جناب ضمیر جعفری کے عزیز اور مشفق استاد پروفیسر الیشس کار کی شخصیت کو بڑا دخل رہا ہے۔

آپ کی یوں تو کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۱: لہو ترنگ (منظومات) ۲: جزیروں کے گیت (ملایا کے لوک گیتوں کا منظوم ترجمہ) ۳: ولایتی زعفران (انگریزی کی ۱۰۰ منتخب مزاحیہ نظموں کا منظوم ترجمہ) ۴: اُڑتے خاکے (مزاحیہ مضامین) ۵: کتابی چہرے (خاکے) ۶: زیورِ وطن (قومی نظمیں) ۷: کھلیان (سنجیدہ غزلیں نظمیں) ۸: گورے کالے سپاہی (مزاحیہ مضامین) وغیرہ

پتھر لوگ

قوت والے اور زور والے
ڈالر، سالر، جھالر والے
جھنڈے، ڈنڈے، موٹر والے

اربابِ جاہ و حشمت
کہ باسی ہیں خوش کنکرے محلوں کے
جن کے اندر
(لوہو سندر)
پتھر کے تراشے ہاتھی ہیں!

کنگرو، گھونگرو، اور گھوڑے ہیں
کیا لمبے ہیں کیا چوڑے ہیں!
کترے ریشم کے جھنگلے بھی
شیشے کے منوّر بنگلے بھی
فانوس صدف

ہر چار طرف
ان لوگوں کے اپنے سر بھی
ہوتے ہیں عموماً پتھر کے
مرمر ہی سہی!

▲

سید ضمیر جعفری

دُنیا دِلچسپ ٹھکانہ ہے

جی چاہتا ہے
انساں سے محبت کرنے کو
بے مُزد مشقت کرنے کو
ہر چہرے کو
بے خال سہی
لندن اندر چکوال سہی

گُلنار کہوں، گُلزار کہوں
جس کو دم ذلت سے بات کروں
ہر جیتی بازی مات کروں

خوشیوں کا ساگر جاگ اُٹھے
بجھتا ہوا چُولھا روشن ہو
سوئی ہو گنگا گر جاگ اُٹھے
کالے بازار کی منڈی میں
گورا سوداگر جاگ اُٹھے
آواز آئے
دُنیا دلچسپ ٹھکانہ ہے
وہ سلمیٰ یہ مرجانہ ہے
اُس کی آنکھیں مستانی ہیں
اُس کی زُلفیں جانانہ ہیں
رونے کے بہانے لاکھ سہی
دُنیا دلچسپ ٹھکانہ ہے ▲

* ولایتی زعفران

[انگریزی سے ماخوذ]

فکر تونسوی

پرچہ سالانہ امتحانات 1985ء

(عوامی چندر بنسی خاندان کی تواریخ پر گائیڈ بک)

نوٹ نمبر ایک :- یہ گائیڈ بک عوامی چندر بنسی خاندان کی تواریخ پر سالانہ امتحانات کے سلسلے میں طلباء کی رہنمائی کے لئے شائع کی گئی۔

نوٹ نمبر دو :- چونکہ یہ امتحانات جمہوریت کی آدھی ہی پہلی کڑی ہے طوطا پن سے پڑھا رہے ہیں۔ اس لئے ہر سوال کے جواب میں اگر طلباء نے ایک فقرہ بھی صحیح لکھ دیا تو اُسے جواب کے پورے نمبر دیئے جائیں گے۔

نوٹ نمبر تین :- جو طلباء نقل کرنے اور نگران ٹیچر کو چاقو سے زخمی کرنے کے پرانے عادی ہیں، وہ براہ کرم پرچہ سوالات دیکھتے ہی بطور احتجاج واک آؤٹ کر جائیں۔ [illegible] اعزازیہ ہی پاس کر دیا جائے گا۔

پرچہ تواریخ عوامی چندر بنسی خاندان

۱۔ سوال : جب دورِ ماضی کے معروف چندر بنسی خاندان کی تواریخ موجود تھی، تو عوامی چندر بنسی خاندان کی تواریخ قلم بند کرنے کا اہم سبب کیا تھا؟

جواب : دنیا کی تواریخ میں چونکہ فقط شہنشاہوں کے جارحانہ حملوں اور جارحانہ قبضوں کا ہی تذکرہ ہوتا تھا اور ممالک کے عوام شدہ تواریخ میں یوں غائب رہتے تھے جیسے سینگ تو موجود ہوں، مگر گدھا غائب ہو گیا ہو ـــــ اس لئے عوام کی موجودگی کا اعتراف کرنے کے لئے مورخ نے عوامی چندر بنسی خاندان کی تواریخ لکھ ڈالی۔ مورخ نے اپنی کتاب کے پہلے صفحہ پر ہی مندرجہ ذیل شعر درج کیا ہے

اُس اہم سبب پر روشنی ڈالتا ہے کہ —

بادشاہوں کے تشدد کے نسانوں کے سوا

ان تواریخ کے اوراق میں رکھا کیا —

2. **سوال:** ۔ اس خاندان میں پہلا بادشاہ کون تھا اور آخری کون ؟ ہر بادشاہ کے متعلق بیان کرو کہ وہ کب گدی پر قابض ہوا اور کب اُترا یا اُتارا گیا ؟

جواب: ۔ یہ خاندان ماضی کی تواریخ کے برعکس تصویر تھا۔ کیونکہ اس کا نہ کوئی پہلا بادشاہ تھا نہ آخری۔ بیک وقت اس خاندان میں چھ بادشاہ تھے اور اُن سبھوں کی یہ عوامی خصوصیت تھی کہ ہر بادشاہ اپنے اُوپر ہی حکومت کرتا تھا۔ کوئی بادشاہ دوسرے بادشاہ پر جارحانہ حملہ نہیں کرتا تھا۔ اگر غلطی سے کوئی دوسرے پر حملہ کا اشارہ بھی کرتا تو اس کی اپنی گدی خطرے میں پڑ جاتی۔

3. **سوال:** ۔ چندر بنسی خاندان کے ہر بادشاہ کا یوں ذکر کرو ۔ کہ نام کیا تھا، کام کیا تھا اور مقام کیا — ذکر مختصر ہو، بے شک جامع نہ ہو۔

جواب: ۔ 1. چندربھان — والد — سیلز ٹیکس انسپکٹر — ماہانہ تنخواہ کو صرف مہنگائی الاؤنس سمجھ کر قبول کرتے تھے۔ رشوت بھی لیتے تھے مگر مانتے نہیں تھے۔ (ماننے کا رواج ہی نہیں تھا) — خاندان کے سبھی بادشاہ انہیں محترم کرتے تھے۔ چندر بنسی خاندان کی یہ روایت تھی کہ انتقال سے پہلے والد کو محترم ضرور کہا جائے۔ انتقال کے بعد لفظ محترم کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔

2. چندر راوتی — چندر بھان کی بیوی، پہلی بھی، آخری بھی — کام، شاہی خزانے پر مسلسل پہرے داری۔ گھر کے کام کاج کے لئے خاندان کے ہر فرد کی ڈیوٹیاں لگانا، نتیجے میں سبھی کام خود کرنا — مہینے کے آخر میں سبھوں کو حسب مراتب گالیاں دینا۔ گالیوں کے معیار اور مقدار میں کبھی فرق نہیں آنے دیتی تھیں۔

3. چندربالا — بڑی بیٹی — تیس برس تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مگن رہیں ۔ نتیجہ میں عمر بھر کنواری رہنے کا عہد ٹیوشنوں سے مناسب نقدی کی کمائی ۔ سماج سدھار کو بہت بڑا عیب سمجھتی تھیں۔

4. چندر کمار ۔ ۔ اکلوتا بیٹا — میٹرک فیل۔ لہٰذا آٹو رکشا ڈرائیوری کو تعلیم پر ترجیح دی، خاصی کمائی کرتا، آدھی کمائی شاہی خزانے کی نذر ۔ باقی آدھی کے متعلق اُسے خود بھی علم نہ ہوتا کہ کہاں گئی۔ خاندان والے اُسے بیک وقت خاندان کا ڈوبتا ابھرتا ستارہ کہا کرتے۔

5. چندرولی — اکلوتی بہو — کام، ایک پرائمری سکول میں بیسک ٹیچر، ایک اور کام، ساس کی گالیاں کھانا، تیسرا کام، اپنے خاوند کو بغاوت پر اُکسانا، ناکام رہنا — مقام؟ خواہ مخواہ کی کج کلاہی، کج ادائی، مگر ٹھنڈی آہ کے ساتھ، حکم حاکم، مرگ مفاجات۔

6. فقط چندرا — چھوٹی بیٹی — چندرا کے ساتھ فقط اس لئے ریزرو کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ ایک کلرک کے ساتھ بیاہی گئی

تھی جو چندر بنسی خاندان کی شان کے شایان شان نہیں تھا چنانچہ شان برقرار رکھنے کے لئے چندرا طلاق یافتہ ہوگئی۔ شاہی خاندان میں واپسی پر شناخت کی خاطر اُسے نقط چندرا کا خطاب عطا کیا گیا ـــــ املاً اُس کلرک کو بھی فقط کلرک کہا جاتا تھا ـــ کام، اہل محلہ کے کپڑوں کی سلائی ۔ مقام، بیک وقت عالی مقام، خالی مقام۔ اگرچہ اپنے مقام کے سلسلے میں اکثر یہ شعر دھیرے دھیرے گنگنایا کرتی ــ

ترے لئے ہیں غم دو جہاں بھی سہہ جاؤں
مرے لئے تری دنیا میں کچھ روا بھی نہیں

4۔ سوال:۔ چندر بنسی خاندان کی سلطنت کا رقبہ کتنا تھا ؟

جواب:۔ دو کمرے۔ ایک کچن۔ ایک اسٹور، جسے بعد میں خاندان کو اعزازی مقام دینے کے لئے کچن میں تبدیل کر دیا گیا۔

جب نقط چندرا، خاندانی نمود کی خاطر طلاق زدہ بن کر لوٹ آئی۔ تو پانچ فٹ لمبے، چار فٹ چوڑے برآمدے میں دو دیواروں کی ایزادی کر دی گئی اور اسے کمرے کا نام دے کر نقط چندرا کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ یوں لگے کہ اس میں خاندان کی ایک معزز بیوہ رہتی ہے۔

5۔ سوال:۔ کیا چندر بنسی خاندان میں کبھی باہمی جنگ و جدل بھی رہتی تھی ؟

جواب:۔ پڑوسی جب بھی کبھی چندر بھان سے کہا کرتے کہ کل رات آپ کے گھرانے سے برتن توڑنے، گالی گفتار اور بلند چیخ دھاڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ خاندان میں خیریت تو ہے ـــــ تو ہمیشہ چندر بھان مسکرا کر جواب دیتے "جی، چندر کمار کے کچھ ساتھی ایک ڈرامے میں پارٹ کرنے والے ہیں۔ کل رات اُس ڈرامے کی ریہرسل تھی۔"

6۔ سوال:۔ کون سے تواریخی شواہد کی بنا پر یہ خاندان اپنے آپ کو چندر بنسی گردانتا تھا ؟

جواب:۔ 1۔ چندر بھان کا دعویٰ تھا کہ اُن کے دادا جان فرمایا کرتے تھے کہ میرے دادا جان کے پاس ایک شجرۂ نسب تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دور ماضی کے معروف ترین چندر بنسی خاندان سے ہی ہمارا ناطہ تھا۔

2۔ چندر بھان کے دادا جان جس مکان میں مقیم تھے ۔ قضا و قدر سے ایک مرتبہ وہ مکان دریا کی طغیانی کی زد میں آ گیا۔ جس سے پورا مکان دریا برد ہوگیا۔ اُسی مکان میں ہی وہ شجرۂ نسب اور دوسری خاندانی دستاویزات محفوظ تھیں مکان اور شجرہ دونوں غرق ہو گئے۔

3۔ چندر بنسی خاندان سالہا سال سے اب اُس دریا کے سوکھنے کا انتظار کر رہا ہے جو اُس تواریخی مکان پر بہہ رہا ہے۔

سوال:۔ کیا چندر بنسی خاندان میں کبھی کچھ سنجیدہ بحران بھی پیدا ہوئے اور کیوں ؟

جواب:۔ "کیوں ؟" کا جواب سوائے خداوند تعالیٰ کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔

ہاں، کئی بحران پیدا ہوئے۔ مثلاً ایک مرتبہ چندر بھان سیلز ٹیکس انسپکٹر کی جان پہچان کے سیلز ٹیکس آفیسر کا تبادلہ ہو گیا اور اُن کی جگہ نیا سیلز ٹیکس افسر تعینات ہوگیا۔ جو خلاف توقع ایماندار تھا۔ (اُن دنوں سرکاری محکموں میں ایمانداری کو

خلافِ تہذیب سمجھا جاتا تھا)۔ نئے افسر مذکور نے چندر بھان کی کرپشن کے تین چار سنجیدہ کیس پکڑ لیے اور اس کی برخواستگی کا آرڈر اس کے حوالے کیا۔ آرڈر دیکھتے ہی بے اختیار چندر بھان کے منہ سے غالب کا یہ مصرعہ نکل گیا کہ صاحب! ؎

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا

اتفاقاً افسر مذکور غالب کا بے حد پرستار تھا۔ مصرع سنتے ہی جذباتی ہوگیا اور برخاستگی کا آرڈر ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔

ایک دوسری مرتبہ خاندان کا اکلوتا میٹرک فیل بیٹا چندر کمار قانون کی گرفت میں آگیا۔ یعنی اپنی آٹو رکشا چلاتے ہوئے ایک بوڑھے راہ گیر کو لپیٹ میں لے لیا۔ جس سے راہ گیر کی بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پولیس کیس کا اندراج ہونے سے ایک منٹ پہلے تھانے دار نے چندر کمار کو نیک مشورہ دیا کہ بچنا چاہتے ہو تو فوراً دو کام کرو۔ ایک تو مجھے پانچ سو روپے نذرانہ پیش کرو۔ اور دوسرے خود وشنو دیوی کی یاترا پہ چلے جاؤ۔ نذرانے میں دو چار روپے کم و بیش بھی ہو سکتے ہیں — چنانچہ چندر کمار نے فوراً دونوں کام پورے کر دیئے۔ احتیاطاً ٹوٹی ہوئی ہڈی والے راہگیر کو بھی اپنے ہمراہ وشنو دیوی پر لے گیا۔ کیونکہ وہ راہگیر بھی وشنو دیوی کا معتقد تھا۔

وشنو دیوی کی برکت چندر کمار پر کچھ زیادہ تھی۔ اس لئے وہ اب بھی شہر میں آٹو رکشا چلاتا ہے اور خوب کماتا ہے۔ بلکہ کمائی کچھ زیادہ ہونے لگی۔ تو میگسائی کے میدان میں بھی کود پڑا۔

اور اس بوڑھے راہگیر پر وشنو دیوی کی برکت کچھ کم ہوئی۔ بلکہ ہوئی ہی نہیں۔ اور آج تک وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بڑ رہا ہے۔ اور چندر کمار اُسے ہر روز صبح ایک مندر میں پوجا پر لے جاتا اور لے آتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی نہیں کمند

(حالانکہ) دو چار ہاتھ جب کہ زندگی کا لب بام رہ گیا۔

۸۔ سوال:۔ چندر بنسی خاندان کے پڑوسیوں سے تعلقات کیسے ہیں؟

جواب: چندر بنسی خاندان کے سبھی افراد پڑوسیوں کے یہاں ہر فنکشن میں بڑی عقیدت اور کرّ و فر سے شرکت کرتے تھے۔ بلکہ کئی مرتبہ تو بغیر دعوت نامے کے بھی شرکت کرتے تھے۔ لیکن اُن کے اپنے خاندان میں کوئی فنکشن ہو تو دعوت نامہ ملنے کے باوجود کوئی پڑوسی شامل نہیں ہوتا تھا۔ اور چندر بنسی خاندان اس پر برا نہیں مانتا تھا کیونکہ اس سے ان کا شاہی وقار قائم رہتا۔ بادشاہ اور رعایا کے تال میل کو وہ موزوں نہیں سمجھتے تھے اور یوں بھی پڑوسیوں کی عدم شمولیت سے انہیں اقتصادی فائدہ بھی ہوتا، کافی روپے بچ جاتے۔

لیکن اس رویّہ سے کئی لوگ چندر بنسی خاندان کو اقتصادی احمق بھی سمجھتے۔ کیونکہ ان دنوں فنکشن کئے بھی فائدے کے لئے جاتے تھے۔ فنکشن کا خرچہ ایک ہزار تو فنکشن کی آمدنی ڈھائی ہزار ہو جاتی تھی۔ اسی لئے کئی لوگ تو اپنے جنم دن بھی سال میں دو دوبار مناتے تھے۔

۹۔ سوال:۔ چندر بنسی خاندان نے سماجی بہبودی کے لئے کون سے کارنامے انجام دیئے؟

جواب:۔ خاندان کے ہر فرد نے سماجی بہبودی کے لئے کئی کارنامے کئے اور کارنامے کرنے کے بعد پچھتائے۔

مثلاً —

1. ایک مرتبہ کرپشن کے خلاف زبردست جلوس نکلا۔ تو چندربھان نے صف اول میں آکر گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک نعرہ ایک ہزار ایک بار لگایا۔ "کرپشن! تیرا ستیاناس! نکلے تیری ننگی لاش!" — اس پر سیلز ٹیکس دفتر کے ہر کرمچاری نے اُسے فحش گالیاں دیں۔ بلکہ کئیوں نے اُسے یہ طعنے دے کر چیلنج کر دیا کہ اُس نے جلوس کے منتظمین سے ایک ہزار ایک روپئے لے کر ایک ہزار ایک نعرے لگائے تھے۔

2. چندر کمار نے ودھوا وواہ کا سات دن تک شہر میں پرچار کیا۔ سات نوجوان ودھوائیں بھی دستیاب ہوئیں، مگر اُن سے بیاہ کرنے والا ایک بھی اُمیدوار دستیاب نہ ہوا — سماج کی ناہنجاری دیکھی۔ تو مایوس ہو کر بہبودی کا یہ کام ترک کر دیا۔

حالانکہ ایک نوجوان ودھوا خود اُسی سے شادی پر مصر ہو گئی تھی۔ مگر مایوسی کے عالم میں اسے بھی کہہ دیا کہ مجھے بھی ناہنجار سمجھو۔

3. بڑی لڑکی چندربالا سماجی بہبودی کو اصولاً معیوب سمجھتی تھی اور اس عیب جوئی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی تھی۔ اُس کی منطق تھی کہ سماج میں جب بھی بہبودی کی تحریک عروج پر پہنچتی ہے۔ تہذیب کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

4. بہو چندراوتی نے اپنے پرائمری سکول کے بچوں میں سچ بولنے کا مسلسل اندولن چلایا تو بچوں کے والدین نے افسران تعلیم سے شکایت کی کہ یہ ٹیچر ہمارے بچوں کو گمراہ کر رہی ہے۔ اُن کے سچ بولنے سے ہمارے گھروں کا پورا ڈھانچہ بگڑ رہا ہے۔ لہٰذا . . . . . . لہٰذا چندراوتی نے افسران بالا کو باقاعدہ تحریری معذرت لکھ کر دے دی۔

بقول اُس کے اُس نے سچے دل سے معذرت کی تھی۔

5. فقط چندرا — طلاق یافتہ بیٹی نے شاعری شروع کر دی۔ طلاق کے خلاف بڑی ہنگامہ خیز نظمیں لکھیں۔ اُن نظموں پر مشتمل ایک کتاب تک شائع کر دی۔ مگر کسی ساہتیہ اکیڈیمی نے اُس کتاب پر ایوارڈ نہیں دیا اور کہا کہ یہ سستے قسم کا پروپگنڈہ ادب ہے۔ خالص ادب نہیں ہے۔

6. چپت راوتی — خاندان کی صف اول کی خاتون — وہ سماجی بہبودی کا مطلب ہی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنے خاندان کو ہی پورا سماج سمجھتی تھی اور خاندان کی بہبودی کے لئے وہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتی تھی۔

9۔ سوال:۔ کیا چندر جیسی خاندان نے اپنی محدود سلطنت کو کبھی وسعت دینے کی کوشش بھی کی تھی؟

جواب:۔ اپنے ہی واحد برآمدے میں دو دیواروں کی ایزادی کی۔ تاکہ اُسے ایک کمرہ کہا جا سکے۔ وہ کمرہ سلطنت کو وسعت دینے کا ایک دلیرانہ کارنامہ تھا۔ وسعت کے اس کارنامے کے عوض انہوں نے میونسپل کارپوریشن کے ایک افسر کو دو سو روپے رشوت بھی دی تھی۔ لیکن ایک ماہ بعد پہلے افسر کی بجائے نیا افسر آگیا، بل ڈوزر اپنے ہمراہ لایا اور سلطنت کی وسعت کو تاج محل اور

لاقانونی کہہ کر بُل ڈوزر سے تباہ و برباد کر دیا۔

بُل ڈوزر چلانے سے پہلے وہ افسر دو سو روپے مزید رشوت مانگتا تھا۔ مگر چندر بنسی خاندان نے اس "ڈبل گیم" کو برداشت نہیں کیا۔

11 سوال:۔ اس خاندان کا سیاسی نظریہ کیا تھا؟

جواب:۔ نظریہ بڑا بے ضرر۔ لوگ لاج کے مارے ووٹ دے آتے تھے اور پھر یہ بھول جاتے تھے کہ انہوں نے یہ قبیح حرکت کیوں کی تھی۔

12 سوال:۔ مذہب کے متعلق اس خاندان کے خیالات کیا تھے؟

جواب:۔ مذہب کی بنا پر جب فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے تو مذہب کو ایک بہت بڑی طاقت سمجھتے تھے ورنہ نارمل حالات میں مذہب کے متعلق غیر جانب دار رہتے تھے۔ روٹی کھانے، کپڑا پہننے اور مکان رہنے کو ملتا رہے۔ اسے ہی سب سے بڑا خدائی مذہب کہتے تھے۔

البتہ فرقہ وارانہ فسادات میں خدا کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔

13 سوال:۔ اکلوتا بیٹا، تیس بتیس سال کی عمر تک پہنچنے کے باوجود شادی سے کیوں گریز کرتا رہا؟

جواب:۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک میرے والد محترم چندر بھان انتقال نہیں فرمائیں گے۔ میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا۔ دراصل خاندانی روایت کے مطابق والد صاحب کے انتقال کے بعد گدی نشینی کی اُمید لگائے رہتے تھے۔ چندر بھان ستر برس کے پیٹے میں جا چکے تھے۔ اور بقول ایک جوتشی کے وہ ابھی تیس برس مزید زندہ رہیں گے۔ اس لئے چندر کمار شادی کے خواہاں تو تھے مگر گدی کے خواہاں شادی سے زیادہ تھے۔ نتیجے کے طور پر وہ زندگی بھر خواہاں ہی خواہاں رہے۔

14 سوال:۔ چندر بنسی خاندان کا شیرازہ کب بکھرا۔ اور کیوں بکھرا؟

شیرازہ بکھرنے کا عمل پہلے عبرت ناک ہوا۔ پھر شرمناک ہو گیا۔ مالک مکان، عدالت کا فیصلہ جمع پانچ غنڈے لے آیا۔ خاندان میں جنگ مہابھارت ہوئی۔ دو افراد اُس جنگ میں ملبے میں دب کر مرے جو اُن کے خاندانی مکان پر پہرہ دے رہا تھا۔ ایک فرد بمبئی بھاگ گیا۔ نجانے فلم ایکٹر بننے کے لئے یا مونگ پھلی بیچنے کے لئے۔ اور چوتھا، پانچواں بغیر یہ جانے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں غائب ہو گئے۔ ———— البتہ والد محترم چندر بھان شہر کے ایک چوک پر بیٹھ کر بھیک مانگنے لگا۔ بقول اس کے وہ اس وقت تک بھیک مانگتا رہے گا۔ جب تک سو سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد فرشتۂ اجل اُسے اُٹھا نہیں لیجاتا۔

15 سوال:۔ کتاب کے مورخ کا خیال ہے کہ اس خاندان کا شیرازہ ابھی پوری طرح نہیں بکھرا کیونکہ چندر بھان ابھی زندہ ہے۔ کیا مورخ سے تم اتفاق کرتے ہو، اور کیوں؟

جواب:۔ کیونکہ چندر بھان ہر ایک سے یہی کہتا ہے کہ "میں آخر کیوں مروں؟ کیونکہ ؎
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤں گا

رضا نقوی واہی

ابابیل

[میرے ایک بے تکلف شاعر دوست پروفیسر اویس احمد دوراں نے، جو کمیونسٹ پارٹی (مارکسی) کے بڑے سرگرم لیڈر ہیں، اپنے زیرِ طبع مجموعۂ کلام کا نام "ابابیل" رکھا ہے۔ اس نام نے طبیعت کو اُکسایا تو میں نے اُنھیں درجِ ذیل منظوم خط لکھ بھیجا ہے۔]

اے کامریڈ اویس "ابابیل" کے پدر — رکھا ہے نورِ چشم کا نام اتنا مختصر؟
تیتر بٹیر، زاغ و زغن بھی تو ہیں طیور — شاہین و مور بھی ہیں پرندوں میں نامور
ہے پہرہ دارِ شب بھی، شتر مرغ بھی پرند — رکھتے ہیں فاختہ بھی، کبوتر بھی بال و پر
چینی بطیں بھی، قاز بھی کہسارِ قاف کے — چکّر لگاتے رہتے ہیں تالاب و جھیل پر
چڑیوں کے اژدہام میں، واللہ تاک کے — ڈالی بھی آپ نے تو ابابیل پر نظر
مجموعہ چھاپ دیتے بگیری کے نام سے — چھوٹی ہی نسل آپ کو مرغوب تھی اگر
ورنہ پرند سب سے، شتر مرغ ہے بڑا — یہ نام رعب ڈالتا کل قارئین پر
دو چار بانس تک ہے ابابیل کی اُڑان — رفتار دوسروں کی ہے جٹ سے قریب تر
کیا چین کی طرح سے نظریہ بدل گیا — کیا اشتراکیت سے سوئے دین ہے سفر؟
چکّر میں پڑ گئے ہیں کسی مولوی کے کیا؟ — جن کی نگاہ میں ہے ابابیل معتبر
اللہ کی کتاب میں آیا ہے اس کا نام — افواجِ ابرہہ پہ ہوئی تھی جو حملہ ور
شاید خیال ہو، تبرک یہ نام ہے — مجموعے کی نکاسی پہ ڈالے گا جو اثر
سُن لیجئے، ملے گا چڑی مار کا لقب
کھائیں کمائیں گے جو ابابیل بیچ کر

-٠- -٠- -٠-

غزل

طالبؔ خوندمیری

واقعہ یہ ہے کہ بیوی کی بہت داب میں تھا
کوئی شوہر ہو، بہادر تو فقط خواب میں تھا

دوسرے عقد کا ارماں دلِ بے تاب میں تھا
ضعف جب حد سے سوا شیخ کے اعصاب میں تھا

کیا پتہ مجھ کو میری جیب، تراشی کس نے؟
میں تو بیٹھا ہوا خود اپنے ہی احباب میں تھا

ڈوب مرنے کا کسی کو کبھی آیا نہ خیال
ورنہ پانی تو بہت شہر کے تالاب میں تھا

قیس لیلیٰ کے زرِ مہر پہ راضی نہ ہوا
مسئلہ عقد کا اٹکا ہوا ایجاب میں تھا

کچھ تو خوراک تھی واعظ کی، ڈکاروں کا سبب
کچھ تناسب بھی غلط نسخۂ 'جُلّاب' میں تھا

اُس کو سمجھاتا بھلا وصل کا مطلب کیسے
وہ تو اُلجھا ہوا اس لفظ کے اعراب میں تھا

آج طالبؔ کی کوئی قدر نہیں ہے نہ سہی
ایک دن تھا کہ وہی نادرِ نایاب میں تھا

قطعہ

اِک نوجوان اتنا کفایت شعار تھا
دیکھو وہ کس سلیقہ سے پیسہ بچا گیا
شادی کے بعد اپنے ہنی مون کے لئے
شملہ کی وادیوں کو اکیلا چلا گیا

یوسف ناظم
(بمبئی)

قطب مینار کس کی تصنیف ہے؟

ہمارے جتنے بھی آثارِ قدیمہ ہیں یعنی جتنی بھی پرانی عمارتیں، کھنڈر اور غار وغیرہ قسم کی چیزیں ہیں ان کی از سرِ نو کھدائی ہونی چاہیئے۔ یہ بہت ضروری ہے اور معاملہ ایمرجنسی کا ہے۔ یہ آثارِ قدیمہ کھدائی کے ذریعے ہی ہم تک واپس پہنچے ہیں تاج محل کی بات اور ہے۔ اس پر آثارِ قدیمہ کا کتبہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ تو ابھی حال حال کی عمارت ہے یعنی یہی کوئی دو چار سو برس پہلے کی اور اسے غور سے دیکھا جائے تو یہ اب تک تازہ دکھائی دیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے شاعر نے یہ کلام ابھی ابھی کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے اسٹون کینسر ہو گیا ہے لیکن اسٹون کینسر چوں کہ آدمیوں کو نہیں ہوا کرتا اس لئے اس کا علاج ممکن ہے اور اگر تاج محل کی ٹھیک سے تیمار داری کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ یہ صحت یاب ہو جائے اور آنے والی نسلیں اسے اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکیں۔ ہم اصل میں قدیم اور بہت پرانے آثارِ قدیمہ کی بات کرنا چاہ رہے ہیں (پرانے آثارِ قدیمہ کی ترکیب شاید آپ کی طبعِ نازک پر بار گزرے لیکن ان آثار کی بہت زیادہ قدامت کے اظہار کے لئے یہی ترکیب مناسب ہے)۔

ہم ان قدیم آثارِ قدیمہ کی از سرِ نو کھدائی پر اس لئے اصرار کر رہے ہیں کہ ہمیں شبہ ہے کہ اب تک اِن آثار کے بارے میں جو کچھ معلومات تواریخ ہند کے مختلف نسخوں میں درج ہیں وہ سب کی سب غیر مستند، مشکوک، مشتبہ بلکہ بعض صورتوں میں جعلی نظر آتی ہیں۔ ہمارے بہت سے مورخ جنھیں ہم معتبر اور راست گو سمجھتے تھے تحقیق کرنے پر نہایت ناقابلِ اعتبار ثابت ہوئے ہم سمجھتے تھے غلط بیانی کا رواج بیسویں صدی کی بات ہے لیکن اس کی جڑیں تو صدیوں پہلے مضبوط ہو چکی تھیں بھیرئیے بکرنے کی ضرورت نہیں ہم اپنے مورخوں پر خواہ مخواہ کا کوئی الزام نہیں لگا رہے ہیں کیوں کہ ہم کوئی تھانے دار نہیں ہیں بلکہ معزز نہ سہی نیم معزز شہری ہیں اور تاریخ ہمارا پسندیدہ مضمون رہا ہے یوں تو ہمیں شاعری سے زیادہ دلچسپی رہی ہے لیکن چوں کہ تاریخ میں بھی کچھ کم شاعرانہ باتیں نہیں ہوتیں اس لئے ہمارا جھکاؤ ادھر بھی رہا اور ہم نے مدرخوں اور مورخوں کو ہمیشہ ایک ہی سطح پر رکھا لیکن جیسے جیسے ہماری دلچسپی اس مضمون سے بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ جو تاریخ ہمیں اسکول میں پڑھائی گئی غیر مستند تھی اور ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے سابقہ مورخوں میں کوئی

میر تقی میر نہیں پیدا ہوئے جن کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔ اب اسی قطب مینار کی بات لے لیجئے۔ یہ اتنا اونچا، بلند و بالا، ہمالیہ پہاڑ سے بحث کرتا ہوا مینار ہے لیکن اس کی تاریخ تک صحیح نہیں پڑھائی گئی۔ قطب مینار کو بنا ہوا سب نے دیکھا ہوگا اور گھر بیٹھے دیکھا ہوگا کیوں کہ اِسے کھدائی کے ذریعہ تو برآمد نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ شاید آثارِ قدیمہ کی فہرست میں یہی ایک عمارت ایسی ہوگی جو کھدائی کے بغیر دستیاب ہوئی ہوگی۔ اب تک یعنی ۱۹۸۴ء تک ہم سب یہی سمجھتے رہے کہ یہ مینار، جو شہر دلی کے نواح مہرولی کے علاقے میں کھڑا ہے، قطب الدین ایبک کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی دن پہلے سمتِ مگدھ سے یہ اطلاع آئی کہ یہ قطب مینار تو اصل میں چندر گپت اور سمدر گپت کا بنوایا ہوا ہے۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ قطب الدین ایبک جیسا شخص اتنی اونچی عمارت نہیں بنوا سکتا۔ وہ اتنے اونچے خیالات کا آدمی ہی نہیں تھا جہاں تک ہمیں یاد ہے وہ چوگان کا بے حد شوقین تھا چوگان کو آج کل ہم لوگ پولو (POLO) کے نام سے جانتے ہیں اور اس کھیل میں گھوڑوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے آج تک اس بات کا تصفیہ نہیں ہو سکا کہ پولو کا اچھا کھلاڑی آدمی ہوتا ہے یا وہ جانور جس پر یہ آدمی سوار ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس بحث کو آنے والے ایشیاڈ تک ملتوی رکھا جاسکتا ہے۔ اصل موضوع قطب الدین کے مشاغل ہیں۔ قطب الدین کا تو انتقال بھی چوگان کے میدان میں ہوا۔ جو شخص اپنی زندگی میں آخر دم تک چوگان کھیلتا رہا ہو وہ قطب مینار کیسے تعمیر کرواسکتا ہے۔ چوگان کھیلنے والے کی نظریں ہمیشہ زمین پر رہتی ہیں۔ یہ کھیل ہی نیچی نگاہ کا ہے۔ کھیل کے دوران میں بھی اور باقی کے اوقات میں بھی نگاہیں زمین میں گڑی رہتی ہیں کیوں کہ چوگان کھیلتے کھیلتے آنکھوں کا ایک خاص زاویہ بن جاتا ہے اور وہ ایک مخصوص اور معینہ سطح سے زیادہ اوپر اٹھ نہیں سکتیں۔ ہم نے تو اس قسم کے کھیل کھیلنے والوں کو اخبار پڑھتے اور مطالعہ کرتے بھی دیکھا ہے کہ وہ بیٹھ کر یا سیدھے لیٹ کر یہ کام نہیں کرسکتے۔ انھیں پیٹ کے بل لیٹنا پڑتا ہے۔ قطب الدین ایبک بھی سال میں ایک یا دو مرتبہ عید لقرعید کا چاند دیکھ لیا کرتا ہوگا ورنہ عام طور پر اس کی نظریں نیچی ہی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے ایسا شخص اتنی اونچی عمارت بنواتا ہی کیوں جسے وہ خود نہ دیکھ سکے۔ ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ جب کسی ایک فن یا ایک مشغلہ سے آدمی کو دلچسپی ہو جاتی ہے تو کسی اور فن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور خاص طور پر اسپورٹس کے شوقین لوگوں کو کسی اور کام کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایک اسپورٹسمین کو خود اپنی صحت وغیرہ کا اتنا خیال رکھنا اور اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ وہ بیوی بچوں کو بھی بھول جاتا ہے قطب الدین ایبک نے تو اپنے لئے کھیل کا انتخاب بھی کیا تو چوگان جیسے کھیل کا۔ اپنے آپ کو بھی تندرست و توانا رکھو اور اپنے گھوڑے کی صحت جسمانی کے لئے بھی متفکر رہو۔ ہمارا خیال ہے چوں کہ قطب الدین ایبک ایک بادشاہ تھا وہ اپنے گھوڑوں کو بھی شاہانہ غذا کھلاتا ہوگا۔ یہ گھوڑے دانہ چارہ اور بھوسہ وغیرہ تو کھاتے ہی نہیں ہوں گے۔ ان کا کھانا خود قطب الدین ایبک کی ہدایات کے مطابق تیار ہوتا ہوگا اور یہ کم سے کم چار پانچ کورس پر بھی مشتمل ہوتا ہوگا۔ جو شخص اتنا سارا وقت اِن مصروفیات کی نذر کر دے اُسے قطب مینار بنوانے کی فرصت کیسے مل سکے گی۔ سوچنے کی بات ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ہمارے مورخین نے کبھی محنت نہیں کی اور محنت شاقہ کا تو انہوں نے نام تک نہیں سنا ہوگا۔ گھر بیٹھے تاریخ نکالا کرتے تھے۔ گھر بیٹھے جو تاریخ نکلی جاتی ہے وہ شاعروں کا کلام ہوتا ہے اور اُسے مادۂ تاریخ کہا

جاتا ہے۔ مثلاً کسی گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوا دو شعر کہہ دیئے یا کسی شاہ زادے (یہ آج بھی ہوتے ہیں) کی سالگرہ کی تقر
منعقد ہوئی تو ایک قطعہ کہہ دیا اور آخری مصرع کے نیچے ایک لکیر کھینچ کر تقریب کا سنہ لکھ دیا۔ یہ تاریخیں گھر بیٹھ کر لکھ
جا سکتی ہیں لیکن وہ تواریخ جو طالب علموں کو پڑھنی پڑتی ہیں، تحقیق کر کے لکھی جانی چاہئیں۔ یہ نہیں کہ گھر میں پڑوسن نے آ کر
پان کھاتے کھاتے کوئی خبر سنادی اور مورخ صاحب نے اُسے تاریخ کا واقعہ بنا دیا۔ نانی ماں نے نواسوں نواسیوں کو کو
کہانی سنائی اور مورخ صاحب نے اُسے تاریخ کا باب بنا دیا۔ ہمارے خیال میں قطب مینار کے تعلق سے بھی اِسی
قسم کی افواہیں اور کہانیاں اِدھر اُدھر پھیلی ہوں گی اور مورخوں کی سہل انگاری اور غیر ذمہ دارانہ رویہ کی بنا پر یہ سب تاریخ
حصہ بن گئیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مگدھ یونیورسٹی کے ایک تاریخ داں شخص نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اس راز سے پردہ
اُٹھایا ورنہ ہم تو گمراہ ہو ہی چکے تھے ہماری آئندہ نسلیں بھی اس قطب مینار کو قطب الدین ایبک کی تخلیق سمجھ کر اپنی عاقبت
خراب کرتیں۔ جن صاحب نے بھی یہ کام انجام دیا اُن کی تعریف کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ یونیورسٹی میں تو صرف پڑھانے کی تنخواہ
دی جاتی ہے اور وہ بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ آدمی تحقیق کا کام کر سکے۔ یہ تو صرف لگن اور محبت تھی جس کی وجہ سے
قطب مینار کی اصلیت معلوم ہو سکی۔

سمجھ میں نہیں آتا اس کا نام قطب مینار کیسے پڑ گیا۔ اتنی زبردست گھوسٹ رائٹنگ۔ قطب مینار کا نام فوراً
تبدیل کیا جانا چاہیئے۔ کیا بُرا ہے اگر کوئی اچھا سا نام بھی وہی صاحب تجویز کردیں جنھوں نے بتایا ہے کہ یہ تصنیف ہے کس کی!

▫ جوہر سیوانی مرحوم *

"میں نے کب اُس سے کہا تھا مجھے دریا دیدے"

انتخاب آگیا وعدوں کا کھلونا دیدے
قوم کے راہنما، قوم کو جھٹکا دیدے

اے خدا دیش کو ایسا کوئی نیتا دیدے
اپنے ہاتھوں سے جو مہنگائی کو دھکا دیدے

نا سمجھ جنتا کو بہلاتا ہے یوں ہر نیتا
جیسے بچے کے کوئی منہ میں انگوٹھا دیدے

میرے قاصد، میری چاہت کا بھرم تو رکھ لے
خط نہیں دیتا نہ دے، خالی لفافہ دیدے

فکر کے دربے میں بیٹھی ہوئی فن کی مرغی
کاش! میرے لئے اک طنز کا انڈا دیدے

کم نہیں ہوگی میری پیاس کی شدت ساقی
تو جو دس بیس کو دے گا مجھے تنہا دیدے

دختر نو شرم و حیا پر ترا احساں ہوگا
لڑکیاں نکلیں جو بے پردہ تو پردہ دیدے

آپ نے لڑکے کو ہیپی تو بنایا ہے جناب
اب کسی لڑکی سے کہئے اُسے نخرا دیدے

شیخ کو ملتی ہے ہر عید میں ململ کی قمیض
جا، انھیں اب کے برس ڈسکو کا کرتا دیدے

میں نے دریا نہیں، گھونگھے کی گذارش کی تھی
"میں نے کب اُس سے کہا تھا مجھے دریا دیدے"

غیر شاعر کو غزل دیتے ہیں اُستاد ایسے
جیسے اندھے کے کوئی ہاتھ میں ڈنڈا دیدے

شیخ نے مانگی دعا صبح کی پڑھ لی جو نماز
یا خدا، آج مجھے تگڑا سا مُرغا دیدے

ہر نئے دوست کو پہلے ہی پرکھ لے جوہر
دوست بن کر کوئی ایسا نہ ہو دھوکا دیدے

-۲-

اُستاد کی دیوڑھی پہ یہ اعلان ٹنگا ہے
آٹھ آنے میں لے جاؤ غزل، ریٹ کھلا ہے

ہونے لگی نلکی میں جو بچوں کی ولادت
ہر ایک زچہ خانے میں اب قفل پڑا ہے

لنگڑانے لگی صنف غزل بزم سخن میں
آزاد غزل کا جو مرض عام ہوا ہے

کس چیز سے اب پیٹ بھرے بھوکے سخن کا
ہانڈی میں تیری فکر کا چاول نہ گلا ہے

اب پھول تبسّم کے سر بزم کھلیں گے
وہ دیکھو اُدھر جوہر طنّاز کھڑا ہے

* مرحوم نے یہ غزلیں انتقال سے قبل شگوفہ کے سوونیر میں اشاعت کے لئے ارسال کی تھیں (مدیر)

سید ضمیر جعفری

عطاء الحق قاسمی

ایک نہری کالم نگار

اب کچھ یاد نہیں آرہا کہ عطاء الحق قاسمی سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی، البتہ ایک بات یاد ہے کہ اس کی ذات میں ظرافت کا چشمہ اُبلتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی گفتگو اتنی چمکدار تھی کہ وہ دوزخ میں سے بھی خلد کا راستہ ڈھونڈ لیتا تھا۔ اس کا کوئی جملہ ایسا نہ تھا جو غمِ ایّام کے سر پر دو ٹوکرے مٹی نہ ڈال جاتا ہو۔ بعد کی ملاقاتوں میں یہ تاثر مزید گہرا، تہرا ہوتا چلا گیا۔ اس شخص میں ایک ایسا شخص ملا جس سے محبت واجب ہو جاتی ہے۔

میں اخبارات کے مزاحیہ کالموں کو اردو کے مزاحیہ ادب کا دست و بازو، بلکہ بازوئے شمشیر زن سمجھتا ہوں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اچھی غزل کی طرح اچھا کالم بھی کم کم لکھا جاتا ہے بہرحال میرے نزدیک ان کالموں نے ہمارے مزاحیہ ادب کی آبیاری اور طرحداری میں بڑا نمک آفریں حصّہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت کے بغیر اُردو مزاح نگاری نہ اتنی "سچل سرمست" ہوتی اور نہ وہ انسان اور زندگی کے اتنی قریب ہوتی جتنی کہ اب ہے۔ اخبارات کے شگفتہ کالموں کے بغیر میرا اعتقاد ہے، بے شمار مسکراہٹیں، اجنبی کبوتروں کی طرح بستی سے باہر شہتوتوں اور بیریوں کے درختوں پر ہی جھومتی رہتیں اور ان گنت مسرتیں مکانوں کی اونچی منڈیروں سے گھروں کے آنگنوں میں کبھی اترنے نہ پاتیں!

دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور سب سے آسان کام دوسروں پر تنقید کرنا ہے۔ بعض لوگ اتنی سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں کہ ادب بری چہرہ لوگوں کی اتنی مودچھل برداری کیوں کرتا ہے۔ ادب محبوب کے رخساروں کی ٹوٹ

ٹوٹ کر بلائیں لے یا والہانہ سرمستی میں اس کے گیسوؤں میں کنگھی کرے، حسینوں کی روٹی پکائے یا ان کا بستر بچھائے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن ادب کا یہی ایک وظیفہ تو نہیں کہ وہ بارہ مہینے گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے حقہ پیتا رہے۔ اس میں ظالم کی کلائی مروڑنے کی کچھ ہمت بھی تو ہونی چاہیے۔ اس "ہلا شیری" میں صحافتی کالموں کی آواز سب سے بلند سنائی دیتی ہے۔

حسین چیزوں کی طرح حسین کالموں کی بھی اتنی مختلف صورتیں ہیں کہ ہر صورت پہ دم نکلے۔ عملاً دم کس پر نکلتا ہے، اس کا فیصلہ اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے۔ کسی کو نرگسی آنکھ پسند، کسی کو نرگسی کوفتہ، میں ذاتی طور پر خوش خلق، ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے کالم کو پسند کرتا ہوں جو زخموں کی نشاندہی کرے، زخموں کی نمائش نہ لگائے۔ گلی کوچوں میں پتھر مارے یا جمہوریت کی لالٹین اٹھائے اٹھائے ہوئے پھرے۔ اس کا اپنا سراپا اور پبلک سے اس کا "ورتارا" شریفانہ و شگفتہ ہونا چاہیے۔ کالم آرائی میں اگر عالم آرائی نہیں۔ تیشے سے بربطِ کوہسار بجانے کی لٹک نہیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں، تو وہ اداریہ ہے، شذرہ ہے، جواب مضمون ہے، انشائیہ ہے، اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے، مگر کالم نہیں ہے۔ کالم "ثقہ" ہو مگر "پھکا" نہ ہو۔ باوقار کے ساتھ ساتھ دل بہار۔ جس طرح کوئی اجل عالم، اپنی دستار اور کتابوں کا تھیلہ میدان کے کنارے رکھ کر محلے کے چھوکروں کے ساتھ فٹ بال یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جائے قلم بے شک ٹہلتا ٹہلتا چلے ــــ دائیں بائیں گھومے۔ ادھر اُدھر ڈھلکے لڑھکے ــــ جھانکتا پھاندتا جائے، مگر کسی منزل کی طرف چلے۔ اگرچہ ہم اس منزل کو بھی، قابلِ التفات نہیں سمجھتے کہ جس کی کھجوریں اور خیمے پہلی سطر ہی میں سامنے کھڑے نظر آجائیں۔

کالم کو جرنیلی سڑک پر نہیں پگڈنڈیوں پر چلنا چاہیے۔ وہ گرجے کم، برسے زیادہ۔ ان توقعات پر وہی کالم پورا اترتا ہے جو توقعات سے بے نیاز ہوکر لکھا جاتا ہے اور عطا الحق قاسمی کا یہی وہ بے نیازانہ انداز ہے، جس کی صحت اور زندگی کی دعا ــــ دوست دشمن دونوں مانگتے ہیں۔

عطا الحق قاسمی معاشرتی، معاشی، سیاسی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔ ظالم اور مظلوم کی نشاندہی، اس کے کالموں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ آستین چڑھائے، ڈنڈا اٹھائے "بُرے کو اس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے"، لیکن اس ساری کارروائی میں وہ اپنے کو بدمزہ یا ماحول کو افسردہ نہیں ہونے دیتا۔ اس کا غصہ ایک ایماندار شخص کا غصہ ہے جو آتا بھی جلد ہے اور جاتا بھی جلد ہے۔ وہ جہاد کرتا ہے، فساد نہیں کرتا۔ طنز کو وہ عینک کی طرح نہیں پہنا کرتا کہ اپنے چہرے کے سوائے سب کچھ نظر آئے۔ اس کا دھاوا دفاعی اور رفاعی ہوتا ہے۔ اس کے کالموں کی مقبولیت کا راز اس "سواد بے" طرزِ تحریر میں مضمر ہے جس کا مزاج طبیبانہ نہیں، جیبیانہ ہے۔ اور ہاں اس کی نثر میں کارفرما جراحی کا وہ طلسم بھی موجود ہے جو نثر کے ایک عام ٹکڑے کو ادب کی پرت عطا کر دیتا ہے جس کو میر تقی میر نے شعور سے جنوں کرنا کہا ہے۔

میری دانست میں کالموں کو چار قومیتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بنجر، بارانی، چاہی اور نہری۔ بنجر کالم محض وقت گھیرتا اور وقت ضائع کرتا ہے۔ بارانی کالم میں ہریالی کم اور خشکی زیادہ ہوتی ہے۔ مینہ کا چھینٹا پڑ گیا، تو کوئی شگوفہ آ گیا۔ ورنہ موعظ و پند کی حدّت، لُو جھکڑ سے بُجھے ہوئے کھیت، اُڑتی ہوئی ریت۔ ان کی گرمی سے چٹانیں اور ان کی خشکی سے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

کالموں کی بہترین صورت چاہی اور نہری کالموں میں نظر آتی ہے۔ البتہ چاہی میں بہاؤ کم اور کھنچاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ مطالب باریک۔ نکات؟ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ اور رجب علی بیگ سرور دونوں کو اکٹھا گزرتے دیکھ لو۔ علم گہرا۔ فلسفہ گھنا۔ محاورہ بیسن میں تلا ہوا۔ شگفتگی کبھی آئی ہوئی، کبھی لائی ہوئی۔ کپڑا معمولی۔ سلائی چست، بٹن روشن، زبان کھلی ہوئی کم، دُھلی ہوئی زیادہ۔ حرف جلیل، ظرف قلیل۔ ع

جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

نہری کالم ـــــ لبالب بھری ہوئی کشادہ نہر کی طرح رواں دواں چلتا ہے۔ گاتا، گنگناتا، شادابی پھیلاتا گرد و پیش کو آئینہ دکھاتا ـــــ اتھلا کم، چھلکتا زیادہ، اپنے پہاڑوں، اپنے دریاؤں کا اپنا پانی۔ روانی میں جوانی ـــــ حقائق بُلبلے، بِتھر پانی افسانہ و حقیقت ہم آغوش ـــــ نیچے کم، خوشحال گھرانہ۔

عطاء الحق قاسمی کے اکثر و بیشتر کالم نہری ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں پانی ہوگا، اُتار چڑھاؤ بھی ہوگا۔ بالائی منطقوں میں اگر برف پگھل جائے گی، تو لہروں میں شکن بھی آجائے گی۔ سیاست کا کوئی گلیشیر ٹوٹ گیا، تو کنارے بھی ٹوٹ جائیں گے، مگر یہ عجیب نہر ہے کہ اس کا پانی برسات میں بھی گدلا نہیں ہوتا۔ اس نوع کے کالم جاگتے دل اور اونگھتی آنکھوں سے لکھے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اردو کے عظیم اور امر کالم نویس مولانا چراغ حسن حسرت کو دیکھا ہے، انہوں نے مولانا کو عموماً اونگھتے ہی دیکھا۔

اُردو کے منفرد کالم نگاروں کی فہرست بڑے بڑے پہاڑ ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ان پہاڑوں کے بیچوں بیچ ـــــ اپنی کوئی الگ روش تراشنا کوئی آسان کام نہیں ہے، مگر عطا کے ہاں ہم جیل بادلوں کے ایک ایسے جھرمٹ کو بڑی تیزی سے اشکال پذیر ہوتا دیکھ رہے ہیں جو کسی تحریر کی مخصوص چھاپ کہلاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریر باریک چنائی کی تحریر ہے۔ اس میں کوئی دراڑ، کائی یا "بھوبھل پن" نہیں ہے۔ اس کے جملے رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ فوج کے جوانوں کی طرح قدم ملا کر چلتے ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ اس عمل میں فاصلہ زیادہ طے کرتے ہیں اور گرد کم اڑاتے ہیں۔ اس کی سوچ بشاشت میں گھلی اور صداقت میں تلی ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت کی بے اندازہ شگفتگی کالم کی ایک دن کی زندگی کو ـــــ شیر کی زندگی بنا دیتی ہے اور اس کی روایتی وقتیت میں عصری تاریخ کی ایک تصویر متحرک ہو جاتی ہے۔

آرٹ اپنی سرشت میں خاصی بدلحاظ، بے مقصد اور بے لگام چیز ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے جس کمالِ قدرت

سے اس وحشی کو رام کیا ہے، اس پر وہ داد کا مستحق ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کالموں کے پرانے کھدر سے ہوئے مورچوں میں جاکر کالم لکھتا، وہ کالموں کو کھینچ کر اپنی پسند کے محاذ پر لے آیا ہے۔ جس سے کالم کی چھب کے علاوہ اس کی نشست و برخاست کا اندازہ بھی بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ یہ "اجنبیت" کے مقابلے میں "اپنائیت" کا عمل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ عطاء کے کالموں میں اردو کالم نگاری نے پہلی مرتبہ انگرکھا اتار کر گلے میں پٹکا اوڑھنا سیکھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں اس قسم کا "بودیاں والا" اور "تعویذاں والا" بلھے شاہیاں کرتا ہوا گھبرو کالم، جو پاکستان کی مٹی میں "کلا ولا" رہتا ہے اور ہمارے کھیتوں میں اُگنے والی کپاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہے، شاید کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اگر میرے دوست انتظار حسین ساہیوال یا جہلم میں پیدا ہوئے ہوتے، تو ان کا کالم بھی یہی بولی بولتا۔

تحریر میں سمت کی اہمیت کی طرف ہم اشارہ کرچکے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں سے غیر متزلزل وابستگی رکھتا ہے۔ اس محاذ پر اس کے کالم "عسکری کالموں" کی طرح نبرد آزما رہتے ہیں اس اعتبار سے عطاء کے کالم اردو ادب میں بی۔ آر۔ بی نہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ع دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جُو بہ جُو

--- ☆ ☆ ☆

عطاالحق قاسمی

نام میں کیا رکھا ہے!

ایمسٹرڈیم کے بارونق سٹیشن پر پیرس جانے کے لئے گول مول سی چھت، مٹیالے رنگ اور بڑے بڑے شیشوں والی ٹرین میری منتظر تھی۔ یہاں آنکھیں وہی منظر دیکھ رہی تھیں جو دنیا کے کسی بھی ریلوے سٹیشن پر نظر آسکتا ہے، وہی مسافروں کا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنا، چہروں پر قدرے گھبراہٹ کے آثار، مناسب بوگی کی تلاش اور اس تلاش میں کامیابی پر سامان محفوظ جگہ پر رکھنے کے بعد یوں اطمینان سے سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھنا گویا ابھی ابھی بچہ جننے کے عمل سے فارغ ہوتے ہوں۔ ہوٹل سے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے میرے سُوٹ کیس کی "مُٹھ" ٹوٹ گئی تھی، چنانچہ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ میں نے گلے میں ایک بھاری بھرکم بیگ لٹکایا ہوا تھا، ٹوٹی ہوئی "مٹھ" والا سوٹ کیس کاندھے پر تھا، جسے میں نے اپنے ہاتھ سے سہارا دیا ہوا تھا جبکہ دوسرا سوٹ کیس میرے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ جس کاندھے پر سوٹ کیس تھا، بیگ کا وزن بھی اُسی جانب تھا، جس سے نہ صرف یہ کہ میری گردن ایک جانب کو ٹیڑھی ہوگئی تھی بلکہ اس طرف وزن بھی زیادہ ہوگیا تھا اور یوں میں چلتے وقت اس پتنگ کی طرح "کنی" کھا رہا تھا، جس کی "تراوزیں" صحیح نہ ڈالی گئی ہوں۔ دوسری طرف ایسی چال چلنے کے باعث میرے لئے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ چلتے وقت ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس بار بار میری ٹانگ سے آ ٹکراتا، جس سے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا میں پنجاب کے کسی میلے میں رسّے پر چلنے کے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور نیچے کوئی بچہ جمورا کھڑا ہے جو مسلسل "ڈھول" بجانے میں مشغول ہے۔ اگر وطنِ عزیز میں مجھے کوئی اس ہیئتِ کذائی میں دیکھ لیتا تو میرا نام معززین کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے خارج ہو جاتا، مگر یہاں تو ایسے معاملات میں راوی "ستے ای خیراں" لکھتا ہے۔ چنانچہ میں اردگرد سے بے نیاز مناسب بوگی کی تلاش میں افتاں و خیزاں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بالآخر ایک جگہ پائیدان پر پاؤں رکھ کر ٹرین کی راہداری میں داخل ہوگیا۔ یہ راہداری والی بات یوں ہے کہ یورپ میں چلنے والی ٹرینوں میں شروع سے آخر تک ایک طویل راہداری کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ بنے ہوتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں یہ سسٹم ایئر کنڈیشنڈ یا فرسٹ کلاس کی بوگیوں میں نافذ ہے۔ بہرحال میں کچھ دیر راہداری میں چلنے کے بعد بائیں جانب ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔ یہ یقیناً ایک بہتر کمپارٹمنٹ تھا، کیوں کہ اس میں گنتی کے چند لوگ تھے، جنہوں نے اپنا سامان آہنی ریک پر رکھا

مخصوص جگہ پر رکھا اور دوسرے لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی اطمینان کا سانس لے کر سر کو سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں ایک نہیں، بیک وقت دو بچوں کو جنم دے کر فارغ ہوا ہوں!

سگریٹ کا ایک طویل کش لگانے کے بعد میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو اپنے ہاں کے کسی خوش ذوق شخص کے ڈرائنگ روم جیسے صاف و شفاف اور خوبصورت کمپارٹمنٹ میں ایک بوڑھا، اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک گول مٹول سا بچہ، دو نوجوان اور ایک خاتون بیٹھے نظر آئے تاہم ان میں سے دو افراد بالکل خاموش تھے۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا، جس نے ایک اخبار نہ صرف یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پوری مضبوطی سے تھاما ہوا تھا بلکہ اسے اتنی بلندی پر رکھا تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری اسی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون تھی جس کی گردن کھڑکی کی جانب تھی۔ اور اس کا منہ اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے بند کیا ہوا تھا انجن نے وسل دی تو اس کے ساتھ بیٹھا ہینڈسم ڈچ نوجوان اٹھا اور راہداری کو تیزی سے عبور کر کے نیچے پلیٹ فارم پہ آ گیا۔ دوشیزہ اپنے کمپارٹمنٹ کے باہر بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔ چند ہی لمحوں میں ٹرین کے تمام بیرونی دروازے خود بخود بند ہو گئے اور پھر ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ اس پر پلیٹ فارم پہ کھڑے ڈچ نوجوان نے آہستہ آہستہ گاڑی کے ساتھ رینگنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص اسی انہماک کے ساتھ اخبار کے دونوں سروں پہ اپنے پنجے گاڑے اور اپنا چہرہ اس کے پیچھے چھپائے بیٹھا تھا۔ یہ مقامی اخبار تھا اور یوں اس میں درج عبارت میری سمجھ سے بالا تھی مگر اچانک میری نظر ایک تصویر پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی میرے لبوں پہ مسکراہٹ کھیل گئی کیوں کہ اس نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا۔ اس پہ میرے دل میں اس عجوبۂ روزگار شخص کو دیکھنے کے لئے پیدا شدہ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔ اب گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم پہ ڈچ نوجوان ایک جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور اب وہ رومال ہلا رہا تھا۔ خاتون اسی طرح اپنی ناک شیشے سے چپکائے کھڑی ہوئی تھی اور جب رومال کے ساتھ اس نوجوان کا چہرہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یہ خاتون سیدھی کھڑی ہو گئی اور پھر مضمحل قدموں اور اداس چہرے کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور اب وہ پرس میں سے رومال نکال رہی تھی۔ اس کے برابر والا مسافر اسی طرح الٹے اخبار کو تھامے چہرہ چھپائے بیٹھا تھا اور اب مجھے اس پر جیمز بانڈ کا شبہ ہونے لگا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے!!!" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بچپن سے ذہن پر نقش یہ کلمات عادتاً ادا کئے۔ "ہیں جی!!!؟" سامنے والے مسافر نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں یکدم اخبار چہرے سے نیچے کرتے ہوئے یہ لفظ خالص پنجابی لہجے میں ادا کئے، اس پر میری نظر فوراً اس کے چہرے پر گئی۔ یہ ایک پاکستانی شکل و صورت تھی۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر فرطِ مسرت سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے لاہوری لہجے میں "سا ما لیکم" کہا اور خیر خیریت پوچھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تہا، جی۔ تسی وی اپنے لاہور دے لاگے تگے او" (بھائی جان۔ آپ بھی اپنے لاہور ہی کے باسی لگتے ہیں) جب میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ایک ہاتھ میری بغل میں دیا اور پھر مجھے قدرے اوپر اٹھا کر بھینچ لیا۔ اس پر میں نے گھبرا کر کنکھیوں سے اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھا جو یہ "فحش" منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے خود کو اپنے اس پر خلوص ہم وطن کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی جو نہیں جانتا تھا کہ یورپ میں عورت اور مرد تو ایک دوسرے کو

کے ساتھ شارع عام پر گلے مل سکتے ہیں مگر یہاں مرد کا مرد کے ساتھ یوں معانقہ کرنا "قابلِ دست اندازی پولیس" جرم ہے اور ایسے جوڑوں کو "شارع عام پر فحش حرکات" کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس اثنا میں میرے ہم وطن نے معانقے کے "دو پھیرے" مکمل کر لیے تھے اور پھر اس نے تیسرا پھیرا مکمل کر کے مجھے بازو سے کھینچ کر سیٹ پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر وہ محبت اور مسرت تھی جو کسی ہمدم دیرینہ کو مل کر محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے رویے میں کچھ خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی، جیسے وہ محسوس کر رہا ہو کہ وہ اب اکیلا نہیں اس کا کوئی رفیق بھی اس کے ساتھ ہے۔

"میرا نام رشید بٹ ہے اور میں کوچہ حیدر پہلوان میں رہتا ہوں"! اس سُرخ و سفید اور صحت مند نوجوان نے نام کے ساتھ "بٹ" کے اضافے سے کشمیری نژاد ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی کشمیری نژاد ہوں، تمہاری رنگت اور نقوش دیکھ کر پہلے ہی اندازہ ہوا تھا کہ تم اپنی ہی برادری سے تعلق رکھتے ہو"۔ میرے اندر کی اس عصبیت نے سر اُٹھایا جو انسان کو ایک وسیع برادری کا فرد ہوتے ہوئے بھی خود کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ کر بجانے کیوں تسکین پاتی ہے۔ میں نے بڑے ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے "تم" سے مخاطب کر کے بے تکلفی کا رویہ بھی اپنا لیا تھا۔

"واقعی؟" اس نے مسرت سے سیٹ پر سے اُچھلتے ہوئے کہا "پھر تو ہماری نانی بھی ایک ہو گی۔ "بے جی" کہا کرتی ہیں کہ کشمیریوں کی نانی ایک ہوتی ہے"۔

"تم چہرے کو اخبار سے کیوں چھپائے بیٹھے تھے؟" میں نے اس کی بات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔ یہ اُلجھن مجھے مسلسل تنگ کر رہی تھی اور میں اسے ہر حال رفع کرنا چاہتا تھا۔

"اوجی! بات یہ ہے کہ میرے ماموں جان نے چلتے ہوئے سمجھایا تھا کہ ٹرین میں کسی سے بات نہ کرنا اور چہرہ بھی چھپائے رکھنا"۔

"مگر کیوں؟" اس کی اس وضاحت سے میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"جی! دراصل بات یہ ہے کہ میرے ماموں ایمسٹرڈیم میں آباد ہیں۔ میں نے لاہور سے انھیں کئی خط لکھے کہ وہ میرے لیے ٹکٹ کا بندوبست کریں تاکہ میں بھی یہاں آسکوں، مگر وہ مجھے ٹرخاتے رہے پھر جی ایک دن میں گھر والوں کی اجازت سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے دو مہینے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر کہا کہ تمہارے لیے یہاں نوکری کا انتظام نہیں ہو سکتا، تم پیرس جا کر قسمت آزمائی کرو لہٰذا اب میں پیرس جا رہا ہوں . . . "!

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے اخبار سے اپنا چہرہ کیوں چھپایا ہوا تھا؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"اوجی، ماموں جان نے بتایا تھا کہ ایمسٹرڈیم میں قیام کے لئے تمہارا ویزا صرف ایک ماہ کا تھا، جب کہ تم نے یہاں دو مہینے قیام کیا ہے، لہٰذا راستے میں کسی سے فری نہ ہونا، کوئی پاسپورٹ چیک کرنے آئے تو چہرے پر پریشانی ظاہر نہ ہونے دینا اور اس کے لئے یہ ہے کہ کوئی اخبار وغیرہ سامنے رکھ لینا۔ چنانچہ ڈبے میں داخل ہوتے ہی میں نے اخبار تھام لیا تھا کہ فوراً سامنے تم

کوئی آجائے؟" بائیس تیئیس برس کے اس صحت مند، خوبرو مگر سادہ لوح نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور اس پر ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"تمہیں علم ہے کہ تم نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا؟"

"تو کیا فرق پڑتا ہے جی، سیدھا بھی پکڑا ہوتا تو کون سا پڑھا جانا تھا۔ وہ تو بس یونہی تھا جی"۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"لاہور میں تمہارا کیا شغل تھا"؟ میں نے خالص پاکستانی ہونے کا ثبوت دینے کے لئے ایک خالص ذاتی سوال پوچھا۔!

گرمیوں میں شربت لگاتا تھا اور سردیوں میں ریوڑیاں بیچتا تھا"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک بار پھر ندامت کے آثار نمودار ہوئے۔ جیسے اس کا پیشہ محنت نہیں راتوں کو نقب لگانا تھا۔

"بہت خوب!" میں نے بھی منافقت سے کام لیتے ہوئے اس طرح سر ہلایا گویا اس کے پیشے کی بابت سن کر میرے دل میں اس کی قدر بڑھ گئی ہے۔ حالانکہ ہم انسانی محنت کو تحقیر کی نظروں سے دیکھنے والے جس معاشرے کے فرد ہیں، وہاں اس صحتمند رویئے کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تاہم میرے دل میں اس نوجوان کے لئے ہمدردی سی پیدا ہوگئی تھی اور یہ غالباً اس کے بھولے پن کی وجہ سے تھی!

"تم بہت بھولے ہو اور مجھے بہت اچھے لگتے ہو، عیار لوگ مجھے زہر لگتے ہیں!" میں نے دلی جذبات اس تک پہنچائے۔ میری خواہش تھی کہ اس نوجوان میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہو۔

"جی، مجھے گھر میں اور باہر سبھی بھولا ہی کہتے ہیں، رشید بٹ کے نام سے تو مجھے کوئی جانتا ہی نہیں، یہ تو میں یونہی آپ پر رعب ڈال رہا تھا! آپ کا کیا نام ہے؟" اس نے کچھ بے ساختگی سے یہ بات کہی کہ میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"گھر والے "شہزادہ" کہتے ہیں۔ باہر لوگ قاسمی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں"۔

"لیکن میں آپ کو بھاجی کہوں گا!"

"جو جی چاہے کہو" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بھاجی، بھاجی" اچانک اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے مجھے کہنی سے متوجہ کرتے ہوئے کہا، "وہ لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے!" میں نے کنکھیوں سے سامنے والی سیٹ پر دیکھا تو وہ پرس میں سے رومال نکال کر اپنی چشم تر کو دھیرے دھیرے پونچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ابھی تک حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا اور لگتا تھا اس کا محبوب اس کی آنکھوں سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی عکس بن کر اس "پانی کے گھر" میں رہتا ہے"۔

"بھولے، بیوقوف بنا رہے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"نہیں، بھاجی، خدا کی قسم وہ ابھی آپ کو دیکھ رہی تھی"۔

"دیکھو بھولے، . . . ."

"جی، میں آپ کی بات کاٹنا اچھا تو نہیں لگتا، لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"۔
"ایسی کون سی بات ہے جس کا میں بُرا مانوں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"جی، وہ بات یہ ہے کہ آپ میرے بڑے بھائیوں جیسے ہیں، آپ مجھے مار بھی لیں تو میں آنکھ نہیں اُٹھا سکتا۔ لیکن جی ایک بات کا ذرا خیال رکھیں"!
"وہ کیا؟" میری حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔
"وہ جی جب پاسپورٹ والا آئے تو اس کے سامنے مجھے بھولا نہ کہیں، "بٹ صاحب" کہیں۔ عزت کا معاملہ ہے!"
یہ سُن کر میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس پر بھولے نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ندامت کے آثار اُبھرے۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے رویے پر شرمندگی سی محسوس ہوئی اور میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بھولے میں معافی چاہتا ہوں، میرا مقصد تیرا دل دکھانا نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پاسپورٹ والے کے سامنے اگر میں تمہیں "بٹ صاحب" بھی کہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ وہ ہماری زبان نہیں جانتا"۔
"آپ کی بات درست ہے!" میری وضاحت پر اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ "لوگ اگر مجھے بھولا کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہیں"!

اس دوران شام ہو چکی تھی اور کمپارٹمنٹ میں بجلی کے قمقمے جل اُٹھے تھے۔ بھولے کے برابر والے مسافر نے اپنے بیگ میں سے سینڈوچ نکالے اور ضرورت سے زائد ایک سینڈوچ یورپین بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے بھولے کی طرف بڑھایا اور کھانے کی دعوت دی۔ بھولے کے چہرے پر ممنونیت کے آثار نمایاں ہوئے اور پھر اس نے بے ساختہ کہا "بس جی بسم اللہ کرو"، اور اس کے ساتھ ہی اپنی غلطی کا احساس ہونے پر عجیب رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔۔۔ باقی مسافر غالباً خاصے تھکے ہوئے تھے کیوں کہ انھوں نے ابھی سے آنکھیں موند لی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے سر ایک دوسرے کے شانوں سے جا لگتے تھے۔
سامنے والی دوشیزہ اب خاصی پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک کتاب کھولی ہوئی تھی اور خاصے انہماک سے محو مطالعہ تھی۔ لگتا تھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے بلکہ اس کے چہرے پر طمانیت کی لہریں یہ ظاہر کرتی تھیں گویا کچھ دیر پہلے کی جذباتی کیفیت یکسر ختم ہوگئی ہے اور اب وہ قطعی نارمل ہے۔ میں نے گردن پھیر کر بھولے کی طرف دیکھا جو نیند بھری آنکھوں کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھنے کے بعد آنکھیں موند لیتا تھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سونا تو چاہتا ہے مگر "تکلفاً" ایسا نہیں کر رہا، تب میں نے اسے کہا کہ اگر نیند آئی ہوئی ہے تو سو جاؤ، میں ابھی کچھ دیر بعد سوؤں گا۔ یہ سُن کر وہ اُٹھا سوئے ہوئے لڑکے پر ایک نگاہ ڈالی اور ٹائلٹ کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو اس نے پینٹ قمیص کی بجائے کُرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی اور دھوتی کا پلّو ایک ہاتھ سے اسی طرح اٹھایا ہوا تھا، جس طرح اسے اُٹھایا جانا چاہیئے یا یوں کہہ لیں کہ جس طرح ہمارے ہاں اِدھر اُدھر دیکھے آنکھیں بند کرکے اٹھایا جاتا ہے۔ وہ خطے اخلاقی معیاروں کے حامل یورپی معاشرے میں یہ لباس فحاشی کی ذیل میں آتا ہے اور میں بھولے کو انہی لوگوں کی چبھتی نظروں کا نشانہ بنتے نہیں دیکھ [illegible]

چنانچہ میں نے اس کی حساس طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کسی اور طریقے سے کہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بھولے تمہیں دھوتی میں نیند آجاتی ہے"؟

"کیا مطلب جی، مجھے تو نیند ہی دھوتی میں آتی ہے" اس نے حیرت سے جواب دیا "اگر آپ کو بھی ضرورت ہو تو لا دوں، میرے پاس دو تین ہیں"

"نہیں یار، مجھے اس کی عادت نہیں" میں نے کہا "ایک بار دھوتی پہن کر سویا تھا، صبح جب آنکھ کھلی تو دیکھا، اُو پرلی ہوئی تھی!"

"ہاہاہا!" بھولے نے پہلی بار کھُل کر بے تکلفی سے قہقہہ لگایا "اُس لباس میں بہت سہولت ہے۔

"وہ تو ٹھیک ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر دیکھو یہاں ایک بی بی بھی بیٹھی ہوئی ہے نیند میں آدمی آدھا مرا ہوا ہوتا ہے سو اگر تمہارے پاس کوئی شلوار ہو تو پہن لو"

وہ یہ سُن کر بولا "بھاجی آپ ٹھیک کہتے ہیں، بہنیں اور بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں!" پھر وہ شلوار پہننے کے لئے چلا گیا۔ میں نے بھی کپڑے تبدیل کئے اور پھر ٹانگیں پھیلا کر اپنی ایک کٹر مذہبی ذہن کی امریکی گرل فرینڈ لوری کی تحفتاً دی ہوئی بائبل کھول کر بیٹھ گیا جو اس نے مجھے آخری DATE کے موقع پر دی تھی اور جس پر اس نے لکھا تھا "ATA, THE ONLY THING I CAN GIVE YOU IS THIS BIBLE" بھولا پھر کچھ دیر بعد خراٹے لینے لگا تھا اور خُدا جانے خراٹوں کی یہ کونسی قسم تھی؟ سامنے والی دوشیزہ نے اس دوران کتاب بند کر کے اپنے پہلو میں رکھی اور پھر سونے کی نیت سے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ ٹکا دیا۔ مگر لگتا تھا کہ بلب کی روشنی میں وہ سونے کی عادی نہیں ہے، کیونکہ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ دو ایک بار اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا بھی مگر میں "پملا" بن گیا، کیونکہ مجھے اس وقت تک نیند نہیں آتی جب تک کسی کتاب کے کچھ صفحے نہ پڑھ لوں یا کم از کم سونگھ نہ لوں ــــ

"ایکسکیوزمی" بالآخر اس نے مجھ سے براہِ راست مذاکرات کا آغاز کیا "اگر تم بُرا نہ مانو تو بتی گُل کر دوں؟" اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

"ضرور ضرور" میں نے اس کے لہجے سے حوصلہ پا کر شرارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری موجودگی میں کتاب پڑھنے کے لئے میں بلب کی روشنی کا محتاج نہیں ہوں!"

میں جانتا تھا کہ یہ فلیٹرنگ ریمارکس دنیا کے کسی بھی حصے کی خاتون کا خانہ خراب کرنے کے لئے کافی ہیں، چنانچہ اس نے خوش دلی سے چہکتے ہوئے کہا "واقعی؟"

"ہاں" میں نے ہاتھ والی کتاب پرے دھرتے ہوئے سامنے والی کتاب پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "بلکہ خوبصورت چہروں کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے بینائی بھی درست رہتی ہے، ورنہ میں جتنا کتابوں کا کیڑا رہا ہوں، ابھی تک میرے چہرے پر کئی عینکیں چڑھی ہوتیں، مگر دیکھ لو ایک بھی نہیں ہے"!

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خاصے پروفیشنل قسم کے مطالعہ کرنے والے ہو" اس نے اپنے گھٹنوں پر دونوں کہنیاں

جماتے ہوئے آگے کی طرف جھک کر کہا۔

" نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں " میں نے مسکراتے ہوئے کہا" البتہ کفرانِ نعمت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا!"

" تم خاصے کی چیز ہو، کہاں سے آرہے ہو" ؟ اس نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

" جہاں سے تم آرہی ہو" !

میں تو امریکہ سے آرہی ہوں، تم بھی ادھر ہی سے . . . ؟"

" ہاں - میں بھی ادھر ہی سے آرہا ہوں اور اب اپنے وطن کو واپسی ہے"!

" تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں امریکی ہوں ؟"

" جس طرح ہر احمق شخص کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے کہ حضرات! میں احمق ہوں، اسی طرح ہر امریکی اپنے امریکی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے"!

" تو تمہارا کیا خیال ہے، امریکی احمق ہوتے ہیں"؟ اس نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

" نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، بعض نہیں بھی ہوتے۔ ویسے اگر تم چاہو تو میں تمہارا نام بھی بتا سکتا ہوں"!

" سچ مچ "؟ اس نے حیرت سے کہا" اگر تم میرا نام بتادو تو میں تمہیں مان جاؤں"!

" یہ کون سی مشکل بات ہے" میں نے کہا" تمہارا نام لنڈا، شیری، ڈیبرا، باربرا، نینسی اور میری وغیرہ کی پیٹنٹ فہرست سے باہر نہیں ہو سکتا"۔

" اوہ خدایا !" اس نے قہقہے کو ضبط کرتے ہوئے کہا " میرا نام واقعی نینسی ہے!"

" اب اگر تم کہو تو اس کا نام بھی بتادوں، جو تمہیں اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا" میں نے صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

"کیا تم اب کے بھی مذاق تو نہیں کر رہے"؟ نینسی کے چہرے سے جوش و خروش جھلکنے لگا۔

" ارے نہیں" یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔

" تو پھر جلدی سے اس کا نام بتایئے" ، نینسی نے بے تابی سے کہا۔

" تو پھر سنو! اس کا نام "بی" (B) سے شروع ہوتا ہے"! میں نے یہ سوچ کر تکا لگایا کہ اگر تیر نشانے پر بیٹھا تو اپنی ولایت پکی ہے ورنہ کہہ دوں گا کہ پامسٹری میں بڑے بڑے ماہر بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں، کیوں کہ غیب کا علم صرف خدا کو ہے!

لیکن ہوا یوں کہ "بی" کا لفظ سن کر اس ڈبل بی (بی بی) کے منہ سے " اوئی اللہ" قسم کی چیخ برآمد ہوئی اور وہ جوشِ جذبات میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے اور بھولے کے درمیان تنگ سی جگہ پر آکر بیٹھ گئی"۔ اس کا نام واقعی بوب ہے، تم نے کافی حد تک ٹھیک بتایا ہے، تم ۔۔۔ تم پامسٹری کے پروفیسر تو نہیں ہو"؟

"ہاں، میں پامسٹری کا پروفیسر ہوں" میں نے گڑبڑا کر کہا" اور سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر طوطے سے توپ ہیں ہی چلاتا ہوں"!

"وہ بہت سویٹ ہے،" نینسی نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا" میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں فنونِ لطیفہ کی طالبہ ہوں، اپنے مقیسر کی تکمیل کے لئے ایمسٹرڈیم آئی تھی اور اب اسی سلسلے میں ایک روز کے لئے پیرس جارہی ہوں، مجھے اسی روز واپس ایمسٹرڈیم پہنچنا ہے کیوں کہ وہاں ابھی میرا کام باقی ہے۔ میری اس سے ملاقات دو روز قبل ایمسٹرڈیم کی آرٹ گیلری میں ہوئی تھی۔ ہم اس قلیل عرصے ہی میں ایک دوسرے کو بہت چاہنے لگے ہیں، مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"میں اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں جانتا۔" میں نے خود پر نرم شم سا دباؤ محسوس کرتے ہوئے قدرے سرک جانے میں عافیت سمجھی اور پھر کہا" البتہ تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے بے تابی سے اپنا سنہری ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیا اور میرے سرکنے سے جو تھوڑی سی جگہ پیدا ہوئی تھی، اس نے گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خلا کو نہ صرف یہ کہ پُر کر دیا بلکہ میں نے خود کو پہلے سے زیادہ "آرام دہ تکلیف" میں پایا۔

"پہلی بات یہ ہے کہ . . . ." میں نے دماغ کو ایک جھٹکا دیا اور پھر پورے اعتماد سے کہا" تم بہت جذباتی ہو۔ فیصلے بہت عجلت میں کرتی ہو۔"

"بالکل ٹھیک ہے، میری ماں شروع سے مجھے اس پر ٹوکتی آئی ہے۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ تم ایک بہت مخلص لڑکی ہو اور پیار کرنا تمہاری زندگی ہے۔"

"اوہ خدایا! تم تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے" اس نے اِک ادائے خاص سے مجھے قریباً انہی نظروں سے دیکھا، جن کی تاب لانے کے لئے خاصے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں، اور سنو" میں نے میدان صاف پا کر پیش قدمی کرتے ہوئے کہا" تم آج تک جس شہزادے کو ڈھونڈتی رہی ہو، اب اسے بہت جلد پالوگی اور اس کے لئے تمہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا کیوں کہ میرا نام شہزادہ ہے!"

"تم بہت شریر ہو۔" اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "جب تم کتاب پڑھ رہے تھے، اس وقت تو اتنے خطرناک نہیں لگتے تھے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھولا ٹھیک ہی کہتا تھا"

"یہ بھولا کون ہے اور وہ کیا کہتا تھا؟" نینسی نے پوچھا۔

"بھولا وہ ہے جو اس وقت تمہارے کاندھوں پر سر رکھے سو رہا ہے اور وہ کہتا تھا کہ تم اس خاکسار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی ہو!"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" نینسی نے ایک زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا" میں نے تو تمہیں یونہی ایک سرسری سی نظر دیکھا تھا اور اس قسم کی نظر تو میں نے بھولے کے ساتھ والے بوڑھے پر بھی ڈالی تھی، جو اس وقت اپنے ساتھی کے کاندھوں پر سر رکھے یوں سو رہا ہے جیسے برسوں سے اس کے ساتھ رومانس چل رہا ہو۔"

"اوہ! ان کی بات چھوڑو" میں نے ہنستے ہوئے کہا" یہ بتاؤ اب اس خاکسار کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کل شام کی ٹرین سے مجھے واپس ایمسٹرڈیم جانا ہے، اتنا عرصہ ہم اکٹھے پیرس میں گھومیں پھریں
اور دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ اب سویا جائے کیوں کہ ایک بجنے کو ہے" اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہ
ایسا کرنے سے بھولا لڑھک کر مجھ پر آن گرا کیوں کہ ابھی تک اس کا سر نینسی ہی کے کاندھوں پر تھا۔ اس نے نیند کے ء
میں ہڑبڑا کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر مجسم شباب نینسی کو اپنے بالکل قریب پاکر گھبراہٹ کے عالم میں قمیص گھٹنوں تک
میں نے اس دوران نینسی کو الوداع کہا تو بھولے نے نیم خوابی کے عالم میں پوچھا "بھاجی، بھاجی، پیرس آگیا ہے"؟
"نہیں لیکن یہ سمجھو کہ ہم پیرس ہی میں ہیں"، میں نے مسکرا کر اسے تھپکی دیتے ہوئے جواب دیا اور کچھ ہی دیر بعد ا
کے خراٹوں کا کارواں پھر سے بادہ پیما ہوگیا ـــ ٹرین رات کی خموشی اور ظلمتوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور بوگیوں
نکلنے والی روشنیوں میں درختوں کے جھنڈ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نمودار ہوتے تھے اور آنکھوں سے اُوجھل ہو جاتے تھے
اگلے روز صبح پانچ بجے ہم پیرس کے اسٹیشن پر تھے۔ ہم نے اپنا سامان اسٹیشن کے لاکر میں محفوظ کر کے چابیاں جیب
میں ڈالیں اور باہر نکل گئے۔ بھولے کو اس کے ماموں نے اپنے کسی دوست کا ایڈریس دیا تھا۔ چنانچہ وہ اسٹیشن ہی سے ہم سے رخصت
ہوگیا۔ اس نے اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر مجھے لکھ دیا تھا۔ نینسی اپنے تعلیمی فرائض کے سلسلے میں کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ
بھی ان مقامات پر کھینچتی پھری، جن سے مجھے چنداں دلچسپی نہیں تھی، البتہ بقیہ وقت باہمی دلچسپی کے امور پر "مذاکرات" میں صرف
ہوا، اور پھر شام کو میں اسے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں گاڑی چلنے کے انتظار میں اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ
تھا اور اس کے ہونٹوں پر وہی پرانی خاموشی کی "مہر" ثبت تھی۔ اور اس دانے پر یہ "مہر" اس دفعہ میری تھی۔ سامنے والی سیٹ پر
دو معمر خواتین بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک نوجوان فرانسیسی تھا، جس نے کتاب کھولی ہوئی تھی۔ انجن نے وِصل دی تو میں
سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے پلیٹ فارم پر آگیا اور پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ نینسی راہداری میں
کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کی لکیریں نمایاں تھیں اور وہ اپنے پرس میں سے
رومال نکال کر آنکھوں کو تھپتھپا رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کر ہلانا شروع کر دیا اور پھر رفتہ رفتہ اس
کا خوبصورت چہرہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اسے الوداع کہتے وقت مجھے یہ ہدایت کرنا یاد نہ رہا کہ ایک تو اس سفر کے
دوران سامنے والے فرانسیسی نوجوان سے ہتی گل کرنے کو نہ کہنا اور دوسرے اس سے میرا نام جاننے کی کوشش نہ کرنا شکسپیر
نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے ؟!

OO

نامور مزاح نگار
نریندر لوتھر
کے
مضامین کا نیا مجموعہ
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

ناشر : زندہ دلانِ حیدرآباد

* پاگل عادل آبادی *

الیکشن میں ہار کے ......

ناکامیوں کا گھونٹ حلق سے اُتار کے
وہ جا رہا ہے کوئی الیکشن میں ہار کے

پہنائے پھول چھچوں نے سولہ سنگھار کے
تھے اِن میں تین نقد تو تیرہ اُدھار کے

تھا گھر کا لکھ پتی وہ مگر روزِ انتخاب
لٹکائے جھولی پھرتا تھا دامن پسار کے

چمچے تھے اس کے گرد کہ تھیں گڑ پہ مکھیاں
جاتا تھا صدقے ہر کوئی اُمیدوار کے

ٹکٹی لگا کر دیواریں تھیں دروازے سے ایسٹ من
ہر گھر پہ پوسٹر تھے لگے اشتہار کے

جورو کا پاندان تلک بک گیا مگر
پھر بھی نہ بھاگ کھل سکے اُمیدوار کے

اُترا نہ پھر بھی بوجھ الیکشن کے قرض کا
بیوی نے اپنے دیدیئے زیور اُتار کے

باقی ہے پھر بھی دوستو تھوڑا بہت حساب
لوٹائے قرض لوگوں کے ڈنڈی بھی مار کے

اب راتوں رات ہائے یہ کیا ہو گیا غضب
حلیے بگڑ گئے ہیں ہر اک تیس مار کے

منہ دیکھتے ہی رہ گیا ہے حزبِ اختلاف
میداں کسی نے مار لیا "ہاتھ" مار کے

چمچوں کے ہاتھ گھی میں تو سر تھے کڑھائی میں
دروازے کھل گئے تھے کئی روزگار کے

آرام سے اب سوئیں گے حلقے کے سارے لوگ
موسم لو ختم ہو گئے چیخ و پکار کے

کاشی کا اُس نے سنتے ہیں پاگل ٹکٹ لیا
پھر کیا کرے غریب ضمانت بھی ہار کے

رانگ نمبر ملا دیجئے
دھونس اپنی جما دیجئے

مجھ کو چلتر بنا دیجئے
نوٹ میری بُھنا دیجئے

کوئی چکر چلا دیجئے
قومی چندہ دبا دیجئے

اس کی ہر چیز انشورڈ ہے
شوق سے گھر جلا دیجئے

آئے چندے کا ڈبہ اگر
اُس کو آگے بڑھا دیجئے

مرغ شاید پڑوسی کا تھا
گھر کا چورن کھلا دیجئے

گھر کرایہ کا ملتا نہیں
دل میں اپنے جگہ دیجئے

دیجئے شاک پاگل کو کیوں
میری غزلیں سنا دیجئے

گھوڑا - جوڑا - جہیز

سرپٹ حیدرآبادی

گھوڑے جوڑے کی رقم میں سارا بیڑا پار ہے
آج کل شادی بھی اچھا خاصا کاروبار ہے

ہیں اہم شادی کے اجزاء گھوڑا، جوڑا اور جہیز
درگزر امکان ہے، خیالِ خام ہے، دشوار ہے

گھوڑے اور جوڑے کے پیسے اور سامانِ جہیز
اِن پہ جو قابض ہے اُس کا راستہ ہموار ہے

ہو رہے ہیں اس سے اہلِ زر بھی مخبوط الحواس
آج کل کی شادیوں کا کچھ عجب معیار ہے

گھوڑے جوڑے کی رقم، فہرستِ سامانِ جہیز
بس انھیں دو ایٹموں کی گرمیٔ بازار ہے

گر نہیں ہے گھوڑے جوڑے کی رقم بنیاد میں
جو عمارت بھی ہے ایسی، سمجھو وہ مسمار ہے

دے نہیں سکتے ہیں جو بھی گھوڑے جوڑے کی رقم
ان گھروں کی لڑکیوں کی زندگی دشوار ہے

باپ جو ہے غربت و افلاس کا مارا ہوا
اس کی بیٹی، خود اسی کے واسطے اک بار ہے

اور کیا کیا گُل کھلاتی ہے یہ یورش دیکھئے
ہر کنواری لڑکی بہرِ خودکشی تیار ہے

کم سے کم، دلہن کے رشتہ داروں کی ہے پیش کش
زیادہ سے زیادہ یہ دلہے والوں کا اصرار ہے

دھاندلی ہیں نا آشنا، افہام اور تفہیم سے
دونوں ہٹ دھرمی پہ ہیں، کچھ تصفیہ دشوار ہے

باپ ماں ہیں مُہر بر لب، ان کی کچھ چلتی نہیں
دلہا خود بالذات دور اندیش، خود مختار ہے

خاندانی جو بزرگ و معتبر افراد ہیں
گو بظاہر ان کا ایسی باتوں سے انکار ہے

غور سے دیکھیں اگر تو صاف آتا ہے نظر
ان کا بھی در پردہ جاری سارا کاروبار ہے

دیدنی ہیں آج شادی کی براتوں کے جلوس
قافلہ آگے ہے، پیچھے قافلہ سالار ہے

آنکھوں پر پردے پڑے ہیں کچھ نظر آتا نہیں
ہے بپا ہنگامہ، چوپٹ سارا کاروبار ہے

کچھ نہیں آتا سمجھ میں، کیا کرے سرپٹ کوئی
آجکل کے دور میں، قانون بھی بے کار ہے

ہینڈ لوم

اسرار جامعی

دیکھ کر جی خوش ہوا ہے، ارتقائے ہینڈ لوم
نت نئے رنگیں کپڑوں کو بنائے ہینڈ لوم

آج اس دھرتی پہ کوئی شخص ننگا کیوں رہے
چشمِ بد سے جسم کو ہر دم چھپائے ہینڈ لوم

چست جمپر، بیل باٹم، شیروانی اور قمیص
آئے دن فیشن پہ فیشن ہی بڑھائے ہینڈ لوم

یہ ترقی خوب ہے لیکن ہے میرا مشورہ
میرے مخلص مشورے کو سن جو پائے ہینڈ لوم

آج تک ننگی کی ننگی ہی رہی انسانیت
کاش! اس کے واسطے کپڑے بنائے ہینڈ لوم

رشید قریشی

ہم پہ ڈھایا ہے ستم مشاطہ نے

ہمارے شوہر دوست بیویوں کا دُکھڑا روتے ہیں
دوستوں ہی پر کیا منحصر ہے اس معاملہ میں دشمن بھی
یکساں ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ایک انبوہِ
نوحہ گراں ہے جو ہائے بیوی! ہائے دل!! چلاتا
رہتا ہے۔ لیکن ہم انصاف پسند ہیں، ہم بیوی
کو بیچ میں نہیں لاتے۔ مشاطہ کی دہائی دیتے ہیں
کیونکہ فتنہ کی اصل جڑ تو وہی ہے۔ اب آپ ہی
کہیئے زہریلی گیس ہمارے گھر میں گھس آئے تو گیس
پر کیا الزام؟ قصوروار تو وہ قطاً مہ ہے جس
نے زہریلی گیس کے لئے باہر نکلنے کی راہ کھولی اور
اُسے ہمارے گھر میں لا بسایا۔ ہماری مشاطہ دشمنی
نے ہمارے دوستوں کو دو گروہوں میں تقسیم
کر دیا ہے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم بیوی کو
اپنے سے بڑی ذات کا اشرف المخلوقات مانتے
ہیں اور دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ ہم اپنی
بیوی کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اس سے کسی
شکایت کو وابستہ کیا جائے۔ ان گروہوں میں
چھپے ہوئے کچھ منچلے ایسے بھی ہیں جو اپنے
چبھتے ہوئے اشاروں سے اس اندیشے کا اظہار
کر جاتے ہیں کہ ہم نے مشاطہ ہی کو بیوی بنا لیا ہے

یہ تمہید ہم اس لئے باندھ رہے ہیں کہ ہمارے غیر شادی شدہ بھائیوں کی سنجیدہ توجہ ہمیں حاصل ہو اور وہ ہماری بپتا سے عبرت یاب ہوکر، اس گڑھے کے کنارے پر ہی رُک جائیں جس کے اندر ہم گرے پڑے ہیں۔

ہائے وہ دن .... جب درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی .... یعنی جب ہم کنوارے تھے اور شادی کے بہت بے چین اُمیدوار .... کہ دروازہ کھلا اور ایک خاتون .... نہیں ایک دوشیزہ .... نہیں ایک خاتون نما دوشیزہ .... یا ایک دوشیزہ نما خاتون .... اندر آئی ۔ ہم نے بے تعلقی کے انداز میں اس کی رہنمائی کر دی ۔ " عامل صاحب بازو کے گھر میں رہتے ہیں ۔" وہ مسکرانے لگی ۔ اور ہم نے دیکھا اس کے موتی دانت ایک دوسرے سے چست پیوست ہوکر ، ایک روشن آسمانی دھات کی مسلح پٹی بن گئے ہیں اور جب وہ مسکراتی ہے تو روشنی ان دانتوں سے منعکس ہوکر چکا چوند پیدا کرتی ہے ۔

"میں تو آپ سے ملنے آئی ہوں .... آپ کو دُلہا بنانے " اس کی آواز میں پہلے کوئل کوکی ، .... پھر شہنائی بجی ... اور وہ اس طرح شرماگئی جیسے خود دلہن ہو۔ ہم نے کھنکار کر گلہ صاف کیا اور پوچھا:

" آپ کا نام ؟ "
" کہاں رہتی ہیں آپ ؟ "
" کیا آپ شادی شدہ ہیں ؟ "
" کس نے آپ کو اس گھر کا پتہ دیا ؟ "

ہم سوالات داغتے رہے اور وہ ٹکٹکی باندھے اس طرح ہم پر نظریں گھماتی رہی جیسے کوئی پولیس والا چور کو رسی سے باندھتا چلا ہو ۔ ہم بھی اُسے گھورنے لگے تو وہ گھبرا گئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔

" یہ گھر آپ کا ذاتی ہے ؟ "
" والد صاحب بھی ذاتی تھے اس لئے اُن کا چھوڑا ہوا گھر بھی ذاتی ہے "
" آپ کی والدہ بھی نہیں ہیں ؟ "
" جہاں بہو آنے والی ہوتی ہے ۔ وہاں ساس نہیں رہتی ۔ "
" ملازمت سے آپ کو کیا ملتا ہے ؟ "
" ایک سلیقہ مند بیوی کے لیے کافی سے زیادہ ۔ اور ایک فضول خرچ بیوی کیلئے ناکافی سے کم "

شاملہ نے ... انگڑائی لی .... پھر جماہی .... اور اپنے منہ کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے ، ایک تصویر ہمارے ہاتھ میں تھمادی ،

ہم نے دیکھا ایک عورت ، چنبیلی کی بیل سے پھول توڑنے سے پہلے پلٹ کر مسکرا رہی ہے ۔ پھول مرجھا رہا ہے ہم نے شاملہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔ " پھول بھی ہے بیل بھی ہے

کہئے کیا خیال ہے؟ ہم نے سوال کیا "عمر؟" مشاطہ پھر مسکرائی ... "صرف چالیس!"
ہم نے بھی وحشت زدہ لہجہ میں دہرایا "صرف چالیس"۔ مشاطہ نے سودے کی اہمیت بتاتے ہوئے سمجھایا۔ "لیکن ہر برس کے لئے ایک ہزار کے حساب سے چالیس ہزار ملیں گے۔" ہم نے بیزارگی کا اظہار کیا تو دوسری تصویر بتائی گئی۔ "اور یہ لیجئے ... یہ ساٹھ ..." ہم تصویر کو دیکھتے دیکھتے مجسم بن گئے۔
ایک عورت مفلر لپیٹے پہیوں دار کرسی پر بیٹھی ہوئی۔ اور منہ کھولے آسمان کی طرف اس طرح دیکھتی ہوئی جیسے اب آسمان ہی سے پھولوں کا ہار اُترے گا۔

ہم نے بناوٹی اشتیاق سے پوچھا ... اور اسّی والی"
مشاطہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مسکرائی تھی تو چکا چوند ہوئی تھی ... ہنسی ہے تو گھنگرو بھرا آتشبازی کا انار چھوٹ گیا۔ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔ "اسّی والی کو ابھی دواخانے سے ڈسچارج نہیں کیا گیا۔ دراصل اسی کے طلبگار سب سے زیادہ ہیں ... آپ کا نام بھی اس فہرست میں بڑھا دوں؟" ہم نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مشاطہ النساء اب آپ اپنی دکان یہاں سے بڑھائیے۔ آپ کے پاس ہماری پسند کا مال نہیں۔" مشاطہ اور زیادہ جم کر بیٹھ گئی۔ "لیکن دولھے میاں یہ تو بتائیے۔ آخر آپ کیسی دلہن چاہتے ہیں؟"

ہم نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "ہم مشاطہ کے توسط سے ہرگز شادی نہیں کریں گے۔ ہم خود دل لگا کر محبت کریں گے ... اور محبوبہ کو دلہن بنائیں گے۔" مشاطہ کچھ سوچنے لگی۔

ہم نے اسے سمجھایا۔ "تم کیوں فکرمند ہوتی ہو، تمہارا تو پیشہ ہی ہے۔ اونٹ کے گلے میں بلّی باندھنا۔ گینڈے کے ساتھ ہرن کو جوڑنا۔ محنتانے کی خاطر۔ دلہا دلہن۔ دوزخ میں پڑتے ہیں ... پڑا کریں .. تمہیں کیا؟ ان کی قسمت! ۔ ان نااتفاقی حادثوں میں تم اپنے آپ کو فریق بنا کر سوچو گی تو دھندہ نہیں چلے گا تمہارا۔" مشاطہ چونک گئی۔ "نہیں میں سوچ رہی تھی، محبت تو ایک خوبصورت خواب ہے۔ اُسے زندگی میں کس طرح برتا جا سکتا ہے؟"
ہم بھی محبت ناک ہو گئے۔ "محبت اگر خواب ہے تو زندگی بھی خواب ہے ... خواب میں سونا، خواب میں جاگنا .. مزہ اسی طور جینے میں ہے۔" مشاطہ کے چہرہ پر مایوسی کے نقوش اُبھر آئے، وہ سنبھل کر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ "کیجئے محبت دل لگا کر، اور کیجئے شادی دھوم دھام سے۔ لیکن سُن لیجئے محبت اور شادی دونوں کردار کی استقامت اور ذہن کی پاکیزگی چاہتے ہیں اور یہ صفات عام طور پر مردوں میں نایاب ہیں۔ آپ کے بارے میں، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے ... اور وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔
مشاطہ کے ساتھ۔ ہم محبت کو بھی بھول گئے۔ اور ہوا کے جھونکے کی زندگی گذارنے لگے۔ ایک شام ہم خواہ مخواہ

اُداس تھے ... اور پریشان تھے کہ یہ اُداسی کس اُفتاد کا پیش خیمہ ہے کہ دستک ہوئی۔ ہم نے دروازہ کھولا، دیکھا عالی صاحب دہن کی پوری کشادگی میں مسکراتے کھڑے ہیں۔ ہم نے تشریف آوری کی وجہ پوچھی تو ارشاد ہوا۔ "بابا میری بچی بی۔اے کا امتحان دے رہی ہے۔ اُردو اس کی مادری زبان ہے لیکن بن ماں کی بچی ہے ... اس لئے اس میں ذرا کمزور ہے۔ تم تو اُردو کے سپہ سالار ہو۔ کچھ وقت اُسے دے دو، تو اس کا بیڑہ پار ہو جائے ... " اُردو کی خدمت کو... ہم عبادت سمجھتے ہیں اس لئے دوسرے ہی دن سے اُردو کی تعلیم شروع ہو گئی۔ عالی صاحب کی صاحبزادی نے اُردو کو برقعہ کے اندر پڑھنا مناسب سمجھا، اور یہ اچھا بھی ہوا کیونکہ یہ اُردو زبان، ظالم، غزل کی زبان ہے۔ حسینوں سے باتوں کی زبان ... ہم برقعہ سے مخاطب ہو کر فیض کے اشعار کا مطلب سمجھاتے۔

وہ آ رہے ہیں نہ شب انتظار گزری ہے　　تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

اور برقعہ اس طرح گپ چپ، جیسے پھولوں کے چمن میں سیاہ، بدنما، کھادکا تودا۔ لیکن غزل ختم ہوتے ہوتے حجاب کچھ ٹوٹا اور وہ ہماری ہدایت کے مطابق ہم کو "مولوی صاحب" کے بجائے "میاں" پکارنے لگیں۔ کیونکہ ہمارا پورا نام 'مقبول شریف' ہے۔ حصۂ نظم ختم ہوا تو ہم نے مٹھائی کی فرمائش کی ... جواب ملا ... "آج نہیں کل"....

اور وہ کل بھی آ گیا۔ بیدار رات سے طلوع ہونے والا کل ... ہم نے مٹھائی کی بات چھیڑی بھی نہ تھی کہ برقعے کے اندر سے ایک حنا آلود ہاتھ .... باہر نکلا۔ "یہ کیا ہے؟" ہم جانتے انجانے بن گئے

"یہ گاجر کا میٹھا ہے۔ میں نے بنایا ہے ... آپ کے لئے ..."

ہماری ہمت کو بڑھاوا ملا۔ ہم نے کہا۔ "جب یہ میٹھا ہمارے لئے بنا ہے تو بنانے والا خود ہی کھلا دے اپنے ہاتھ سے۔" — تھوڑے سے پس و پیش کے بعد.. وہی حنا آلود ہاتھ ہماری طرف بڑھا۔ اور ایک اضطرابی جھپٹ کے تحت وہ ہاتھ ہمارے ہاتھ میں آ گیا... اور پھر ہاتھ میں تھمے ہوئے گاجر کے میٹھے کا چمچہ اور ایک انگلی ... ہمارے منہ میں ..."

دھڑ سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اور عالی صاحب کی گھن گرج سنائی دی۔ "اُردو اسی طرح پڑھائی جاتی ہے میاں؟ واہ وا، کیا آسان طریقۂ تعلیم ہے۔" حلوہ کڑوے گاجروں کا حلوہ بن گیا اور ہم اس طرح کانپنے لگے جیسے تار کے اندر پروئی ہوئی کھلونا مچھلی، اوپر سے نیچے اُترتے ہوئے کانپتی ہے۔ "اور یہ کیا انداز ہے میاں۔ حلوہ کے چمچے کی ڈنڈی کے ساتھ، کھلانے والے کی انگلی بھی ہڑپ"۔ عالی صاحب اُچھل رہے تھے۔ اور ہماری روح قفسِ عنصری میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہم نے سسکتے ہوئے کہا۔ "غلطی ہو گئی عالی صاحب۔ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا"

عالی صاحب کڑک اُٹھے۔ "میری معصوم بچی کو محبت کا سبق پڑھا کر کہتے ہیں آپ، کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ آج آپ یہاں سے جائیں گے تو کل نہیں آئیں گے نا؟ دیکھتا ہوں، کیسے جاتے ہیں آپ؟"

ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور عامل صاحب کے ہمارے درمیان آنسوؤں کی چادر آگئی۔ لیکن عامل صاحب ذرہ برابر نہ پسیجے اور انہوں نے سخت آواز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو میرے ساتھ پولیس ناکہ چلئے یا اسی وقت، اسی جگہ مری بچی سے عقد کیجئے۔" ہم بچرانے لگے تو للکارا گیا۔ "چلئے ناکے چلئے"

ہم نے ایک آہ بھری۔ ہیرخ کا گلا گھوٹا۔ اور کہا۔ "عقد کرا دیجئے!"

برقعہ کے اندر سے ہنسی کی آواز پھوٹی۔ گھنگرو بھرا آتشبازی کا انار جیسے چھوٹتا ہے۔ اری مشاطہ ــــ تو ...... اس کے بعد ہم کچھ کہنے کو تھے کہ قاضی صاحب آ دھمکے۔ اور انہوں نے جو چاہا ہم سے کہلوا لیا۔

عقد کے بعد ہم باہر نکلے تو گھر تک روتے پیٹتے گئے۔

ہائے میرے چالیس ہزار ــــ ہائے میرے ساٹھ ہزار ــــ ہائے میرے اسّی ہزار !!!

گھر پہنچ کر ہم بستر پر گر پڑے اور آنسوؤں کا نالہ دائیں آنکھ سے ابل کر ناک کا پشتہ پار کرکے، بائیں آنکھ میں گرا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ اور مشاطہ۔ نہیں، دلہن۔ نہیں۔ بیوی۔

عورت کے تین روپ۔ مشاطہ۔ محبوبہ۔ بیوی۔ لیکن ہم محبوبہ اور بیوی کو برا نہیں کہیں گے۔ ہم تو خبردار کریں گے مشاطہ کے مکروفن سے کہ یہ ستمگر تینوں روپ دھارتی ہے اور ہر روپ میں راجتی ہے۔ مرد بیچارہ شوہر کا شوہر ہی رہتا ہے۔ ــــ!

* *

غزل

▪ اسمٰعیل ظریف

ہم بہت ڈرتے ہیں محفل میں کہیں جانے سے
آ گئے آج یہاں بھائی کے بہکانے سے

بات بنتی نہیں یوں چیخنے چلانے سے
شاعری آتی ہے بس عاشقی فرمانے سے

دولہا بھائی مان گئے سالوں کے سمجھانے سے
رنج و غم دور ہوئے عید کے آجانے سے

باپ پی کھاکے چلے آتے ہیں میخانے سے
بیٹا حیران ہے باوا کے بگڑ جانے سے

بیٹا قائل نہ تھا جوڑے کی رقم کا لیکن
جھانپ میں آ گیا وہ باپ کے بہکانے سے

جا کے جس روز سے وہ رہ گئے اِلی بن میں
کیا نکھار آیا ہے چہرے پہ میگر کھانے سے

ویسے میک اپ سے کشش بڑھ تو گئی ہے لیکن
راز چٹلے کا کھلا زلف کے کھل جانے سے

گا رہے ہیں وہ نہاتے ہوئے فلمی گانے
گنگناتے ہوئے نکلیں گے غسل خانے سے

لوٹ آئے گی جوانی انہیں رنگوا لیجے
فرق پڑتا نہیں کچھ بالوں کے پک جانے سے

داغ دوزی بھی ضروری ہے عمارت کیلئے
بات بن جائے گی اب چوکڑ الگواتے سے

دل جواں ہے تو جوانی بھی سلامت ہے حضور
فرق پڑتا نہیں کچھ عمر کے ڈھل جانے سے

مع محل آ گئے چوتھی میں بھی بچوں کو لئے
صرف دعوت تھی انہیں عقد کی مردانے سے

تاج پوشی سرِ بازار نہ ہوگی جب تک
ہیرو مانے گا نہیں اس طرح دھمکانے سے

جب سے لوٹے ہیں وہ انگلینڈ کا پانی پی کر
کچھ بدل ہی گئے باہر کی ہوا کھانے سے

ہاتھ آپس ہی میں دیدیتے ہیں یارانِ وطن
دشمنی اچھی ہے اس دور کے یارانے سے

بڑھ گیا ذوقِ سخن ان کا جنوں کی حد تک
بیٹے حیران ہیں باوا کے نکل جانے سے

آپ نے داد جو محفل میں یہاں دی یا ئی ظریف
بات بن ہی گئی حالات کو نظمانے سے

* * *

مزاحیہ

▪ مختار یوسفی (مالیگاؤں)

چاول نہ گھر میں دال مرا موڈ آف ہے
شاعر کا اُف یہ حال مرا موڈ آف ہے

اُن کے لیے غرارہ بناؤں انہیں یہ ضد
آئی ہے جب سے شال مرا موڈ آف ہے

اب آپ ہی بتائیے صورت نباہ کی
پھولے ہیں اُن کے گال مرا موڈ آف ہے

جب سے یہ ٹھن لیا ہے کہ جوتی میں رات دن
بٹنے لگی ہے دال مرا موڈ آف ہے

پیچ ہے غریب خانے میں بچوں کو چھوڑ کر
ہر چیز کا ہے کال مرا موڈ آف ہے

کوئی خدا کے واسطے واعظ کو ٹوک دے
ٹن ٹن کے قیل و قال مرا موڈ آف ہے

میں نے لگایا تیل چکنے کے واسطے
جھڑنے لگے ہیں بال مرا موڈ آف ہے

اسمٰعیل آذر

غریبی نہ ہٹاؤ

بولا غریب خاں سے غربت ہٹانے والا
غربا کی زندگی میں ہونے کو ہے اُجالا
دھرتی سے اس چمن کی ہٹنے کو ہے غریبی
ہوگا غموں کے بدلے خوشیوں کا بول بالا
بجنے لگیں گے گھر گھر خوشیوں کے ڈھول تاشے
سب کو گرانٹ ہوگا سُکھ چین کا قبالہ
ہم نے اک ایسا منتر معلوم کرلیا ہے
بھاگے گی دم دبا کر شیطان کی یہ خالہ
پیارے بھاؤ تالی بولو ہماری جے جے
کیا یاد پھر کروگے کس سے پڑا تھا پالا

o

سن کر غریب خاں نے اپنی زبان کھولی
اوندھی سمجھ سے اوندھا طرزِ سخن نکالا
بولے یہ پوئنٹ ہم پر ہوتا نہیں ہے واضح
آپ اس پہ اور ڈالو کچھ لائیٹ حضور والا
غربت ہٹی تو پھر کیا کہلائیں گے یہ مفلس
عبدالجلیل منشی یا مول چند لالہ!
منشی ہوئے کہ یا وہ نواب ہو تتڑوں کے
دونوں کی زندگی ہے ناقابلِ حوالہ
جیون کی دوڑ ہی میں اُلجھے رہے یہ منشی
ریسنگ کرتے کرتے سب بہہ گیا مسالہ
لالہ کو یوں دیا ہے بھگوان نے تو سب کچھ
پھر بھی سکونِ دل کی بل میں لگا ہے تالا
دونوں کی زندگی میں شوگیں ہے ضروری
پیٹ ہی چکا نہ کیوں ہو گودام کا دوالہ
اِک ہم کہ جن کو کہئے فٹ پاتھیے بھیچیہ
جیتے رہے ہیں ہر دم خوشحال خاں کی مالا
مانا غریب ہیں ہم چلئے فقیر میں ہم
لیکن ہمارا باوا آدم ہی ہے نرالا
دھن کی ہوس نہ ہم کو دولت کی فکرمندی
نفسِ طلب کو ہم نے خود ہی کھدیڑ ڈالا
محنت ہے اپنی روٹی، شرم و حیا لنگوٹی
غیرت گداز بستر، آسودگی دوشالہ
یوں اپنی ذات میں ہم ہوتے ہیں مست مولا
کاٹے ہے ہم سے کتنی رنج و الم کا بھالا
پھر جن کے ہاتھ میں ہوں خوشحال خاں کے لڈو
دہ روٹیوں پہ پڑکر توڑیں گے کیا نوالہ
ایسے میں بابو صاحب کیجو نہ کوئی گڑبڑ
چکر میں شانتی کے ہو جائے گا گھٹالہ
پھر اگر ہٹانا عبدالجلیل منشی و مول چند لالہ ہی کو نہ کیوں ہٹاؤ
جو ہو پسندِ خاطر تو اے غریب پرور ہم سا غریب بابے حضور کو بناؤ

o

پرویز یداللہ مہدی

گدھا الیکشن

[اس طنزیئے کے کردار، واقعات حتیٰ کہ انتخابی نشان تک فرضی ہیں، کسی سے ان کی مطابقت اتفاقی حادثہ ہی ہو سکتی ہے]

ایک روز اچانک بستی کے پرانے "سماج سیوک" شری بجرنگی لال ولد لونگی لال نے ایک "گپت بیٹھک" میں شاعری کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کے پروگرام کو بالائے طاق رکھ کر الیکشن لڑنے کا دھڑلے سے اعلان کر دیا۔ "میں نے آئندہ الیکشن میں کھڑے ہونے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے ۔ !"

ہم نے ایک خیر خواہ کی حیثیت سے انہیں ٹوکا ۔ "بجرنگی لال جی، آپ ابھی ابھی ٹائیفائیڈ سے اٹھے ہیں، ڈاکٹر نے آپ کو لیٹے رہنے کی سختی سے تاکید کی ہے ۔ !"

وہ بولے "ٹھیک ہے، میں لیٹے لیٹے ہی الیکشن لڑوں گا۔"

ہم نے مین میخ نکالی ۔ "جہاں تک لڑنے لڑانے کا سوال ہے یہ ہر ہندوستانی کا جمہوری حق ہے لیکن آپ الیکشن ہی کیوں لڑنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولے ۔ "برخوردار، میری پتنی ہمیشہ کے لئے میکے چلی گئی ہے، گھر سُونا سُونا ہو گیا ہے۔ آئے دن کے گھریلو جھگڑے بند ہو جانے سے ساری رونق ختم ہو گئی ہے ۔ !"

ہم نے حیرت سے کہا "اسی لئے آپ الیکشن لڑنا چاہتے ہیں، گویا آپ کی نظر میں الیکشن

لڑنا' بیوی سے لڑنے کے برابر ہے ۔! " ـــــــ "یوں ہی سمجھ لو ۔!" وہ لاپروائی سے بولے ۔
ہم نے تشویشناک لہجے میں پوچھا ۔ "آپ سمجھتے ہیں کہ آسانی سے ٹکٹ مل جائے گا ۔ "
"سیدھے راستے سے نہیں ملے گا تو بلیک میں خریدوں گا ۔!" وہ ٹھوس لہجے میں بولے ' ہم نے جواباً انھیں چھیڑا
"غالباً آپ میری بات سمجھے نہیں ' میں الیکشن کے ٹکٹ کی بات کر رہا ہوں ' سنیما کے ٹکٹ کی نہیں ۔!"
"میں بھی الیکشن کے ٹکٹ کی بات کر رہا ہوں ۔!" وہ طنزیہ لہجے میں بولے ۔ "ہماری سیاست کے پچھلے دروازے سلامت رہیں' تم اگر چاہو تو بلیک میں' ساری ریاست کی ٹکٹیں خرید سکتے ہو ۔!"
ان کے خطرناک تیور دیکھ کر ہم نے پوچھا ۔ "اب جبکہ آپ نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یقیناً اپنے انتخابی نشان کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور سوچا ہوگا ۔!"
"بالکل سوچا ہے برخوردار ! بلکہ اپنا انتخابی نشان قریب قریب طئے کر لیا ہے ۔!" وہ بڑے مدلّل انداز میں بولے ' پھر محتاط نظروں سے اطراف و اکناف کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا ۔ "تم نے یقیناً یہ سنا ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ' اور اس وقت ہم ہوٹل کے ایک کیبن میں بیٹھے ہیں جس کی دیواریں لکڑی کی ہیں اور لکڑی کی دیواروں کے نہ صرف کان ہوتے ہیں بلکہ آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور زبان بھی ' لہٰذا تم اپنے کان میرے قریب لاؤ ۔!"
ہم نے فوراً حکم کی تعمیل کی' وہ ہمارے کان میں پھسپھسائے ـــ "میرا انتخابی نشان ہوگا گدھا ۔!"
"گدھا ـــ !" ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ' وہ جھنجھلا کر بولے ـــ "آہستہ آہستہ ' اگر کسی نے سُن لیا تو گدھا ہو جائے گا ' میرا مطلب ہے غضب ہو جائے گا ـــ !"
ہم نے ان کی جھنجھلاہٹ پر سر سے پیر تک انھیں گھورتے ہوئے بڑبڑا کر کہا ـــ "گدھا ـــ !"
"میں نہیں ـــــ " انہوں نے سٹپٹا کر تصحیح فرمائی ۔ "میرا انتخابی نشان گدھا ـــ "
"ایک ہی بات ہے ـــ !" ہم نے برجستگی سے کہا ۔
"پھر وہی بات ـــــ !" وہ مزید جھنجھلا گئے ـــــ "میں کہہ رہا ہوں گدھا صرف انتخابی نشان ہے ' ورنہ گدھا' گدھا ہے اور میں' میں ہوں ـــ !"
"معاف کیجئے ' بجرنگی لال جی ۔!" ہم نے انہیں ٹوکا ۔ "اگر آپ اس طرح اپنے اور اپنے انتخابی نشان کے درمیان' چھوٹے بڑے ' جانور اور انسان کا یہ فرق ' یہ امتیاز ' یہ فاصلہ رکھیں گے تو پھر الیکشن میں آپ کی جیت ناممکن ہو جائے گی ـــ !" ہماری اس خوفناک وضاحت نے انھیں غالباً انہیں ڈرا دیا ' گڑبڑا کر بولے ۔ "اگر میرے دل میں ذات پات' چھوٹے بڑے' انسان اور حیوان میں فرق ہوتا' کسی قسم کا تعصب ہوتا تو انتخابی نشان کے طور پر گدھے کا انتخاب کبھی نہیں کرتا ـــ !" اتنا کہہ کر وہ خلاء میں گھورنے لگے' پھر لیڈرانہ اسٹائیل میں بولے ۔ "تم نہیں جانتے ' میں نے گدھے کا درجہ بلند کرنے کے لئے کیسے کیسے 'پنج سالہ پلان' بنائے ہیں ' انتخابی مہم کے دوران جب میرا انتخابی نشان اپنے پیروں پر چل کر جلسے کا

گشت لگائے گا تو سیاست کی تاریخ میں تہلکہ مچ جائے گا ۔!"

ہم نے فوراً لقمہ دیا ۔۔۔ "آپ صرف تاریخ کہتے ہیں ، میں کہتا ہوں آپ کے گدھے کو دیکھ کر سیاست کے جغرافیہ کا حل ساقط ہو جائے گا ۔۔۔!" اس سے پہلے کہ ہمارا چھوڑا ہوا یہ لقمہ انہیں بدہضمی میں مبتلا کرتا ، ہم نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا ۔ "ویسے یہ بتلائیے کہ اس قدر معرکتہ الآراء دھوبی کا سہارا ، کمہار کی آنکھ کا تارا ، انتخابی نشان آپ کے ذہن میں کیسے گھسا ۔؟"

وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولے ۔ "ہر انسان میں ایک گدھا موجود ہوتا ہے ، بس اس تک پہنچنے والی نظر چاہیئے ، اچھے اچھے سیاست دانوں کی سیاسی نظریں اپنے اندر چھپے گدھے تک نہیں پہنچ سکیں آج تک ، اور میں نے گدھے کا انتخاب کرکے آدھا میدان تو یقیناً مار لیا ۔۔۔!"

"اس کا کیا ثبوت کہ آپ ہی کی نظر گدھے تک گئی" ہم نے فوراً چوٹ کی ۔ "ہوسکتا ہے خود گدھے کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی ہو ۔"

"ایک ہی بات ہے ۔" وہ بے غیرتی سے بولے ۔ "میں گدھے پر گروں یا گدھا مجھ پر ۔!"

"ویسے آپ نے انتخابی نشان کے طور پر جس گدھے کا انتخاب کیا ہے ، وہ دھوبی کا گدھا ہے ، کمہار کا یا خالص گدھا ؟" ہم نے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا وہ گڑبڑا کر بولے ۔ "یہ کیا نئی راگنی چھیڑ دی تم نے ، ابھی کچھ دیر پہلے تو تم نسلی امتیاز اور تعصب کے خلاف بھاشن دے رہے تھے ، اور اب گدھوں کی بھی درجہ بندی کرنے لگے ، میں پوچھتا ہوں کیا فرق ہوتا ہے دھوبی کے ، کمہار کے اور خالص گدھے میں ۔!" ہم نے انہیں مزید اُلجھانے کے لئے کہا ۔ "یوں دیکھنے میں دھوبی کا گدھا ، کمہار کے گدھے یا خالص گدھے سے مختلف نہیں ہوتا ، وہی چار پاؤں ، وہی کھردرا سراپا ، وہی فلاسفرانہ شان لیکن رہن سہن کے فرق کی وجہ سے ان کے عادات و اطوار مختلف ہوتے ہیں ، دھوبی کا گدھا ، گھاٹ کا عادی ہوتا ہے ، کمہار کا "ہاٹ" (بازار) کا اور خالص گدھا لیڈروں کی طرح "ٹھاٹ" کا ۔۔!" اس تشریح پر بچوں کی طرح چہک کر بولے "گدھوں کے تعلق سے تمہاری معلومات قابلِ رشک ہیں ، تم تو گدھوں کا چلتا پھرتا "انسائیکلوپیڈیا" معلوم ہوتے ہو ۔"

"یہ دراصل آپ کی صحبت کا اثر ہے بجرنگی لال جی ۔" ہم نے فوراً ٹکڑا لگایا جسے نظر انداز کرکے وہ باوزن لہجے میں بولے ۔ "میں نے ابھی اور اسی لمحے فیصلہ کیا ہے کہ میری انتخابی مہم کے کرتا دھرتا سبھی کچھ تم ہوگے ۔!"

ہم نے برجستگی سے کہا ۔۔ "گویا اب آپ کے لئے اوپر خدا ، نیچے گدھا یا یہ گدا ہے ۔۔!!"

-٥- -٥- -٥-

● دھندوں کا موسم پھر آگیا ۔۔۔۔

انتخابات کی فصل پھر سے لہلہانے لگی — شریمان بجرنگی لال نے پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی سر کر لیا۔ بلیک میں ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہو گئے لیکن دوسرے مرحلے میں اٹک گئے۔ ان کے انتخابی نشان کو چیف الیکٹورل (Chief Electoral) آفیسر نے رد کر دیا' اور اس کی جگہ سرکار کے منظور کردہ مختلف انتخابی نشانوں میں سے کوئی ایک منتخب کرنے کا مشورہ دیا۔ بجرنگی لال جی بھی اڑ گئے فرمایا — "سرکار کی یہ کیسی ناانصافی ہے' ہاتھی، گھوڑے، گلشے، بچھڑے یہاں تک کہ لوہے کے انجن اور لکڑی کی بے جان سیڑھی تک پہ مہربان لیکن ایک بے ضرر منہ مرے جانور سے یوں انجان' یہ سراسر تنگ نظری ہے' تعصب ہے —!"

آفیسر نے بے بسی سے کہا — "اوپر کے آرڈرس کے آگے ہم بھی مجبور ہیں جناب! بہرحال میری مانیئے تو اپنے انتخابی نشان کے طور پر ترازو منتخب کر لیجئے جو انصاف، مساوات اور برابری کی علامت سمجھا جاتا ہے!"

"یہ تو تصویر کا صرف ایک ہی رُخ ہے جناب!" بجرنگی لال جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ کے اس ترازو کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے' یہ انصاف، مساوات اور برابری کی نمائندگی کم اور ڈنڈی مارنے والوں' کم تولنے والوں کی نمائندگی زیادہ کرتا ہے —!" اس کھلی چوٹ پر آفیسر نے غصے سے کہا۔ "اگر ترازو بدعنوانیوں کی علامت ہے تو آپ کا گدھا کس کی نمائندگی کرتا ہے —؟"

"محنت کش طبقے کی —!" بجرنگی لال جی کے اس برمحل جواب نے آفیسر کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا' اس نے حتمی لہجے میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ "ہم محنت کش طبقے کے مسائل حل کرنے کے مجاز نہیں ہیں' بہتر ہوگا اگر آپ اپنے گدھے کے تعلق سے مرکز والوں سے ربط پیدا کریں —!!!"

مرکز سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہم نے' بجرنگی لال جی کا گدھے سے رابطہ توڑنے کی ایک اور کوشش کی۔ عرض کیا "مانا کہ گدھے میں بے شمار اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں لیکن بجرنگی لال جی' آپ نے شاید اس کے سب سے مشہور "اوصاف غیر حمیدہ" صرف "دولتی" پر غور نہیں فرمایا —!"

وہ جھنجھلا کر بولے۔ "تم میں یہ بہت بُری عادت ہے کہ ہر چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہو' دیکھ لینا ایک دن یہ عادت تمہیں بدنام کر کے چھوڑے گی —!" ہمارے کردار پر شک و شبہ کا کیچڑ اچھالنے کے بعد بڑے ہی فلسفیانہ بلکہ "گدھیانہ" لہجے میں فرمایا۔ "مانا کہ مالک کی اگھاڑی' اور گھوڑے و گدھے کی پچھاڑی کا شمار خطرناک چیزوں میں ہوتا ہے لیکن میں نے اس کا بھی حل ڈھونڈ لیا ہے' ہم اپنے انتخابی پوسٹروں میں گدھے کا صرف "فرنٹ پوز" (Front Pose) ہی دیں گے —!" ہم نے ان کی تجویز کو سراہتے ہوئے مشورہ دیا۔ "آئیڈیا بڑا زوردار ہے بجرنگی لال جی، اگر آپ اس میں میرا آئیڈیا بھی شامل کر لیں اور گدھے کے فرنٹ پوز کے ساتھ اپنا "بیک پوز" (Back Pose) بھی دے ڈالیں تو انتخابی پروپگنڈہ دو آتشہ ہو جائے گا —!"

"تم پھر پشت پر پہنچ گئے۔" وہ جھلا کر بولے' اور ہم نے گڑگڑا کر جواب دیا۔ "غلط مت سمجھئے بجرنگی لال جی

میں تو آپ کی پشت پناہی کر رہا ہوں — !"

"فی الحال میری پشت پناہی چھوڑو اور یہ سوچو کہ کس طرح میرے گدھے کے آگے مرکز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے"
اس گمبھیر مسئلے کو چھیڑ کر موصوف خود کسی گدھے کی طرح گمبھیر سوچ میں ڈوب گئے — !!

کسی ضروری کام کی وجہ سے ہم بجرنگی لال جی کے ساتھ مرکز کا سفر نہیں کر سکے ' وہ اکیلے ہی ہو آئے اور کمال یہ کہ کامیاب و کامران لوٹے تھے ہم نے حیرت سے پوچھا — "آپ نے آخر کیا چکر چلایا ' کس طرح مرکز کو اپنے گدھے کا قائل کیا — ؟" فخریہ لہجے میں فرمایا — " برخوردار تم بجرنگی لال ولد نورنگی لال کو کیا سمجھتے ہو ' جنتادری نیتاؤں کی بھری سبھا میں ' میں نے نہایت ٹھوس لہجے میں کہا ' ہمیں آزادی ملے لگ بھگ اڑتیس برس ہو گئے لیکن جس سوشلزم کو لانے کا وعدہ ہم جنتا سے کرتے آئے ہیں وہ سوشلزم ابھی تک نہیں آیا ' یہ بات نہیں کہ سوشلزم ہمارے ہاتھ نہیں لگا ' ضرور لگا لیکن اس کا بوجھ ہمارے فرسودہ انتخابی نشان نہیں اٹھا سکتے ' بس اس سے ثابت ہوا کہ محض غلط انتخابی نشانات کے انتخاب نے رسوا کیا ہمیں ۔ بھارت ماتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سوشلزم کا بھاری بوجھ صرف گدھا ہی اٹھا سکتا ہے ' صرف گدھے میں یہ قوتِ برداشت پائی جاتی ہے لہٰذا آپ تمام سے میری بنتی ہے کہ ایک بار مجھے اور میرے گدھے کو عوام کی خدمت کا ' جنتا کی سیوا کا موقع عنایت فرما کر دیکھئے ' ہم دونوں سوشلزم کے سہانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے آپ حضرات کو جو برسوں سے عوام کے آگے شرمندہ ہوتے چلے آرہے ہیں سُرخرو کروا کے ہی دم لیں گے — "

بجرنگی لال جی کا بھاشن ختم ہوتے ہی ہم نے تالیوں سے ان کا سواگت کیا ' وہ چہکے — "بالکل اسی طرح مرکز کے کرتا دھرتاؤں نے بھی بے اختیار ہو کر تالیاں بجائیں اور کھٹاک سے میرے گدھے کو لائن کلیر کا سگنل دے دیا — !"

"گدھا مبارک ہو بجرنگی لال جی !" ہم نے فوراً مبارک باد دے ڈالی پھر جوشیلے انداز میں کہا — "آپ اُدھر مرکز میں مصروف تھے اور اِدھر میں نے آپ کی انتخابی مہم کے تعلق سے نئی نئی اسکیمیں بنا ڈالیں ' آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کا انتخابی نشان خود اپنے پیروں پر چل کر سارے حلقے کا گشت کرے گا ' میں نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حلقہ کی ہر گلی میں آپ کو بھی آپ کے انتخابی نشان پر بٹھلا کر گھمایا جائے — " ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ وہ چراغ پا ہو کر بھڑکے
"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو — "

"ہرگز نہیں — !" ہم نے جواباً قندیل پا ہونے کا ناٹک کیا ۔ "آپ کا دعویٰ ہے کہ سوشلزم کا بھاری بوجھ صرف گدھا ہی اٹھا سکتا ہے ' یہی بات میں عوام پر اس طرح ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ گدھا اب اپنے اُمیدوار کا بوجھ اُٹھائے خوشی خوشی پھر رہا ہے اسی طرح کل کو الیکشن جیت جانے کے بعد اپنے حلقۂ انتخاب کا سارا بوجھ ' تمام مسائل اپنی پیٹھ پر لادے پارلیمنٹ میں پہنچ جائے گا — " اسی وضاحت نے بجرنگی لال کا غصہ کافور کر دیا وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے ۔ "بہت اچھے جا رہے ہو ! گدھے کے ساتھ تمہارا انتخاب کر کے میں نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے ' اب فوراً ایک گدھا ٹنگ کر لو ۔"

..

"کریں گے ایسی جلدی بھی کیا ہے —" ہم نے شرارتی لہجے میں کہا — "جب تک گدھے کا بندوبست نہیں ہوجاتا آپ بہ نفسِ نفیس اپنے حلقے کے چکر لگائیے —"

"وہ تو میں لگاؤں گا —" وہ فوراً بولے — "لیکن اب گدھے کے بغیر مجھے چین نہیں پڑنے والا، تم فوراً گدھے کی تلاش شروع کردو ؟" ہم نے مسکراکر جواب دیا — "شروع کرنا کیا معنی ؟ میں تو تلاش بھی کر چکا، اپنے دھوبی رام کھلاون کا گدھا — !"

خوشی سے اُچھل کر بولے — "رام کھلاون تو اپنا ہی آدمی ہے، اس کا گدھا بھی ظاہر ہے اپنا ہی ہے — !"

"بالکل — !" ہم نے لقمہ دیا "یوں سمجھئے آپ ہی کا بچہ ہے — !!!"

٭٭٭

● جس وقت ہم دھوبیوں کی بستی میں پہنچے بڑی خاموشی تھی، غالباً تمام دھوبی اور ان کے گدھے گھاٹ گئے ہوئے تھے، رام کھلاون گھر پر ہی مل گیا البتہ۔ اس کا گدھا اپنی مالکن کے ہمراہ گھاٹ گیا ہوا تھا۔ جب اُسے ہماری آمد کا مقصد معلوم ہوا تو چہک کر بولا — "اِن کا مطلب یُو ہوا کہ آپ لوگن ہمارا گدھا کے لیڈر بناوا کی بات کرت ہو — !"

بجرنگی لال جی تڑاک سے بولے — "بالکل یہی بات رام کھلاون بھیا ! تمہارا گدھا بہت بڑا لیڈر بنے گا — !"

یہ سنتے ہی رام کھلاون فوراً اپنی گھر والی کو گھاٹ پر یہ خوش خبری سناکر گدھے کو ہمارے حضور میں پیش کرنے کی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

جب رام کھلاون لوٹا تو اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ سارے دھوبی گھاٹ کی رونق تھی، اس نے بڑے فخر سے اپنے گدھے کو ہمارے روبرو پیش کیا جیسے اگلے وقتوں میں بادشاہوں کے آگے نذرانے پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن رام کھلاون کے گدھے کو دیکھ کر ہم دونوں کو سخت مایوسی ہوئی، اس قدر مریل تھا اس کا گدھا کہ سوشلزم کا بوجھ سہنا تو دور ہم نے سوچا اگر کسی کپڑے پر لفظ سوشلزم لکھ کر اس مریل کی پیٹھ پر ڈال دیا جائے تو کم بخت یقیناً کھڑی جگہ بیٹھ جائے گا۔ بجرنگی لال جی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ "رام کھلاون بھیا، تمہارا گدھا تو لیڈر کم اور گیدڑ زیادہ دکھائی دیتا ہے، ہمیں تو ایک صحت مند، تندرست توانا، کڑیل جوان گدھا چاہیئے، اس نوجوان کی طرح — !" موصوف نے ہماری طرف اشارہ کیا، اس انکشاف پر جتنی بھی دھوبی برادری وہاں موجود تھی ہمارے قدموں میں بچھ گئی، ہر ایک کی زبان پر یہی رٹ تھی کہ اس کا گدھا تمام لیڈرانہ اوصاف کا حامل ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام دھوبیوں نے بطور نمونے کے اپنے اپنے گدھے ہمارے سامنے لاکر کھڑے کردیئے، اتنے سارے تندرست و توانا گدھوں کو دیکھتے ہی بجرنگی لال جی کی رال ٹپکنے لگی۔ ہمیں فوراً ایک نئی ترکیب سوجھی، ہم نے ان کے کان میں کہا۔ "سچ کہا ہے کسی نے، اللہ مہربان تو گدھا پہلوان، اگر ہم ان سارے گدھوں کی خدمات حاصل کرلیں تو تمام حلقۂ انتخاب میں صرف گدھے ہی گدھے نظر آئیں گے — !"

"اس سے کیا ہوگا — ؟" بجرنگی لال جی نے دیدے نچاکر پوچھا۔

"وہ ہوگا جو سیاست کی تاریخ کی ہیئت بدل دے گا ۔ روزآنہ ایک آدمی اگر اتنے سارے گدھوں کو ہر جگہ ، ہر موڑ پر دیکھے گا تو نفسیاتی طور پر اس کے دل و دماغ میں گدھے کی تصویر سما جائے گی ، نتیجتہً رائے دہندگی کے روز بے اختیار اس کے ہاتھ گدھے کے نشان پر مہر لگانے کے لیے مجبور ہوجائیں گے — !" ہماری اس دوراندیشی پر بجرنگی لال جی من ہی من خوش ہوتے ہوئے بولے ۔ "ان گدھوں پر کل کتنا خرچ آئے گا — ؟" ہم نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جواب دیا —— "گدھوں کے مالک تو سستے میں پٹ جائیں گے ، اب رہا گدھوں کے خورد و نوش کا خرچہ تو یہ بھی مفت میں ہوجائے گا ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں گدھے کو کاغذ کس قدر مرغوب ہوتے ہیں لہٰذا گھاس کے چکر میں مت پڑئیے ، آپ نے اور آپ کے باپ دادا نے شاعری کے روپ میں جو ردّی کا ڈھیر لگا رکھا ہے وہ کس دن کام آئے گا ، چھپتے چھپانے سے تو رہا — !"

ہمارے اس مشورے پر بھڑک کر بولے ۔ "تم میری اور میرے پُرکھوں کی شاعری کو گدھوں کی غذا سمجھتے ہو — !"

"اکھڑئیے مت جناب ! یہ سچ ہے کہ سچ بڑا کڑوا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے پی جانا صحت کیلئے مفید ہوتا ہے !" ہماری اس پینترے بازی نے انہیں کسی قدر ٹھنڈا کردیا ، چنانچہ ہم مزید شیر ہو کر بولے ۔ "جب گدھوں کو بریک فاسٹ لنچ ، ڈنر تینوں وقت شاعری کھانے کو ملے گی تو اس سے دہرا فائدہ ہوگا ، ایک تو آپ کی شاعری ہضم کرنے کے بعد تمام گدھے جب بھی رینکیں گے بحر میں رینکیں گے ، ردیف قافیہ وزن وغیرہ کا پورا پورا خیال رکھیں گے ، اور دوسری اہم بات جو لوگوں کے سامنے آئے گی وہ گدھوں کے تعلق سے مشہور غلط فہمی کا ازالہ کردے گی کہ یہ گدھے کوئی معمولی گدھے نہیں جن کے ہاں زعفران کی کوئی قدر نہیں ، بلکہ یہ گدھے وہ "سخن فہم" و "سخن ہضم" گدھے ہیں جو زعفران اور شاعری دونوں کی قدر کرنا جانتے ہیں —— !" ہماری اس تشریح نے وہ اثر دکھایا کہ بجرنگی لال جی نے فوراً دھوبی بستی کے سارے گدھے بُک کرلیے سوائے رام کھلاون کے مریل گدھے کے —— !!

گدھا گشت کے تیر بہ ہدف نسخے نے دیکھتے ہی دیکھتے نمائندے سے زیادہ گدھوں کو عوام سے قریب کردیا ، اور پھر اس سے پہلے کہ گدھوں کی یہ فوج عوام کے گھروں اور دلوں میں گھر کرلیتی ، رائے دہندگی سے چند روز قبل اچانک یک سانحہ پیش آیا ۔ صبح جو گدھے راؤنڈ پر بھیجے گئے تھے وہ شام میں حسبِ معمول لوٹ کر نہیں آئے ۔ ان کی تلاش میں دی دوڑائے گئے جو حلقۂ انتخاب کا چپّہ چپّہ چھاننے کے بعد یہ منحوس خبر لے آئے کہ مخالف کیمپ' کے غنڈوں نے ان رھوں کو آوارہ ثابت کرکے انہیں میونسپلٹی کے "کانجی ہاوز" میں بند کروادیا ہے ، اس خبر نے سب کے ہوش و حواس ىطل کردیئے ، یہ افتاد پڑی بھی تو کب ، دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا تھا ، اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ جرمانے بھر کے نہیں چھڑوایا جاتا ، بجرنگی لال جی کا رو ، رو کر بُرا حال ہوگیا ، لگتا تھا جیسے گدھے غائب نہیں ہوئے بلکہ ماں باپ کا ایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا ۔ ہمیں اچانک ایک ترکیب سوجھی ، انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا — "کیا ہوا جو سارے گدھے ن وقت پر دشمنوں نے پکڑوا دیئے ، اُمید کی ایک کرن ابھی باقی ہے ۔"

"اُمید کی کرن —" سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ وہ کمرے میں نیم روشن بلب کے ملگجے اُجالے میں اُمید

کی کرن تلاش کرنے لگے۔

تلاش کے اس غلط سُر پر ہم نے انہیں چھیڑا۔ " شریمان جی، اُمید کی کرن یہاں نہیں رام کھلاون دھوبی کے پاس ہے ـــــ!"

"رام کھلاون کے پاس ـــــ!!"

"ہاں اُس کا گدھا ـــــ!" ہم نے لفظ گدھے پر واقعی گدھے برابر زور دے کر کہا۔

"مگر وہ تو ایک دم مریل، ادھ مرا گدھا ہے۔" انہوں نے منھ بنا کر فرمایا۔ "بلکہ اس گدھے کو گدھا کہنا "گدھا جاتی" کی توہین ہے، اس کی جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اس گدھے میں دو چشمی "ھ" ہی نہیں ہے ـــــ!"

"مانا کہ وہ گدھا نہیں "گدا" ہے ـــــ" ہم نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن نہیں ماموں سے نکٹا ماموں غنیمت ہوتا ہے، اگر وقت پر کام آجائے ـــــ!" ہماری اس بامحاورہ دلیل نے انہیں قائل کر دیا اور اُسی وقت رات کے اندھیرے میں ہم دونوں رام کھلاون کے مریل گدھے کے اغوا کی مہم پر نکل گئے ـــــ!!

-o- -o- -o-

● انتخابات کی فصل کٹ گئی ـــــ

خوش نصیب اُمیدوار منتخب ہو کر وعدوں کی ڈور کے سہارے پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ اور بجرنگی لال ولد نورنگی لال ایک ساتھ کئی الیوں کی نذر ہو گئے۔ ایک تو عین وقت پر ان کے گدھے، ان کی ساری شاعری چٹ کر کے وعدوں کی رسیاں تڑا کر بھاگ نکلے، دوسرے اپنی ڈوبتی ہوئی الیکشن کی نیّا کو پار لگانے کے لئے انہوں نے جسے اُمید کی آخری کرن سمجھا تھا، اسی نے ان کی دنیا اندھیر کر دی ـــــ بجرنگی لال جی نے جس بے دردی سے رام کھلاون کے مریل گدھے کو ٹھکرایا تھا، اس نے، اس سے کہیں زیادہ بے دردی سے ان کے "دُلتّی" جھاڑ دی ـــــ تقدیر نے چونکہ انہیں الیکشن سے زیادہ گدھے کی دُلتّی کی زد کے لئے نامزد کیا تھا، نتیجتہً ضمانت کے ساتھ اگلے چار دانت بھی گنوا بیٹھے۔ البتہ ضمانت اور دانت گنوانے کے بعد یہ قابلِ ذکر تبدیلی ان میں آگئی ہے کہ جہاں کہیں کوئی گدھا نظر آتا ہے وہاں سے یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ـــــ!!!

-o- -o- -o-

رشید عبدالسمیع جلیل

تضمین بر غزلِ غالبؔ

اُف یہ منظر میکدے کی شام کے
ہیں شگوفے ساقیٔ گلفام کے
داغ ہیں کچھ گردشِ ایّام کے
"غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے"

بوگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
تیرگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
تشنگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
"خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے"

چُپ کھڑیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہنس پڑیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
کچھ کہیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
"خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے"

دانۂ تسبیح طے اور ذکر کم
منہ میں اک حقّے کی نے اور پیٹھ خم
کی مسلسل قے پہ قے اور آنکھ نم
"رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے"

پردہ رکشوں نے اُٹھایا کیا مگر
جلوہ برقعوں نے دکھایا کیا مگر
چہرہ ہاتھوں نے چھپایا کیا مگر
"دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے"

پہلے آئی غسلِ میّت کی خبر
پھر اُڑی اک تازہ تربت کی خبر
اب یہ پھیلی ہے مسرت کی خبر
"شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے"

شخصیت کو اک معمہ کردیا
زندگانی کو تتمّہ کردیا
دم غنیمت تھا کہ دمّہ کردیا
"عشق نے غالب نکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"

اس دورِ سیاست میں یہ فلمی ستارے ہیں
ناچیں گے وہ سیٹوں پہ دنیا جو ہمارے ہیں

لیڈر پہ ستم جتنے عشاق تمہارے ہیں
کچھ دن میں سمجھ لینا اللہ کو پیارے ہیں

افلاس کے پیکر ہیں، تقدیر کے مارے ہیں
ہیں شادی شدہ جتنے مقروض بچارے ہیں

برسات کے مینڈک ہیں لیڈر جو ہمارے ہیں
آیا ہے الیکشن تو دن رات پکارے ہیں

اولاد کی کثرت کا اک میں ہی نہیں مجرم
کچھ میری حماقت ہے، کچھ اُن کے اشارے ہیں

جیک پاٹ کی خواہش تو گھر دار بکا دے گی
یہ ریس کے گھوڑے بھی دُم دار ستارے ہیں

پھر جائیں گے لانے کو، کا نسے کا پدک ہم بھی
ہر کھیل میں ہارے ہیں ہمت نہیں ہارے ہیں

میناڑ اپوزیشن یکلخت گرا دھم سے
ان فلمی ستاروں سے گردش میں ستارے ہیں

مہمانوں کی آمد سے، یہ حال ہوا اپنا
مئے خانے میں مسجد میں دن رات گزارے ہیں

بیکاری و ناداری، مجبوری و لاچاری
دھندے ہیں سبھی چوپٹ، چند دن یہ گزارے ہیں

کشکول ہے دونوں کا پھرتے ہیں گلی کوچے
قسمت کے ستائے ہیں تقدیر کے مارے ہیں

میدانِ سیاست میں اب آنے لگے ایکٹر
تقلید ہے ریگن کی، ریگن کے اشارے ہیں

شاباش رحیم اب تک موٹاپا نہیں اترا
ہیں شادی شدہ لیکن لگتے تو کنوارے ہیں

رؤف رحیم

سراج زبلی

غزلیں

وہ کسی کام کے قابل ہی کہاں ہوتا ہے
لاڈ اور پیار میں پل کر جو جواں ہوتا ہے

روتی صورت سے بہت خشکی کا گماں ہوتا ہے
کچھ نہ کہنا بھی اک اندازِ بیاں ہوتا ہے

ہوں تو شوہر ہی ترا، پھر بھی سبھی لوگوں کو
تیرے برتاؤ سے نوکر کا گماں ہوتا ہے

شاعری چھوڑ دے، یوں جاگنا اُلّو کی طرح
ہیلت کے واسطے نقصان رساں ہوتا ہے

بیاڈ ہابٹ ہے میاں! چھوڑ دے سگریٹ نوشی
"زہر آہستہ اثر" اس کا دھواں ہوتا ہے

ایج پچپن ہو تو سرکاری مُلازم، بوڑھا
ساٹھ کے سن میں بھی لیڈر تو جواں ہوتا ہے

تمہاری دال رہی، اب تو دوست! گلنے سے
نہ دیں گے ووٹ، فقط پارٹی بدلنے سے

یہاں کے لوگ ہیں واقف تمہاری خصلت سے
وہ جھوٹے وعدوں سے اب تو رہے بہلنے سے

بدل نہ جائے گا یہ کارٹون سا چہرہ
"نظر بدلتی نہیں آئینہ بدلنے سے"

محلے بھر میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد
سکون ہو گیا، مُردہ ترا نکلنے سے

لکھا تھا بس یہی قسمت میں، جو ہوا سو ہوا
ملے گا کیا؟ کفِ افسوس ایسے ملنے سے

یہ ٹوسٹ ہے یا کوئی ناچ وحشیوں کا سراج
نہ گر پڑے تو کہیں زوش تر پھسلنے سے

مسیح انجم

ہوئے مر کے ہم جو رسوا

اس دنیائے دوں ودنہ میں ہر شخص حسب حیثیت باعزت طریقے سے زندگی گزارنے کے جتن کرتا ہے۔
لیکن باعزت طریقے سے مرنا بہت ہی کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔

دیکھا یہ گیا ہے، بہت ہی کم لوگ مناسب موقع پر مرتے ہیں۔ لیکن بیشتر لوگ مناسب موقع پر مرنے کے انتظار میں مسلسل جئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ورثا، تیمار داری سے تنگ آکر موت کی دعائیں کرنے لگتے ہیں (اپنی موت کی نہیں بلکہ مرنے کے انتظار میں مسلسل جئے جانے والے کی) یوں بھی، بقول یوسفی، انسان کو موت قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

فی زمانہ باعزت طریقے سے مرنا ایک آرٹ ہے۔ یہاں "باعزت طریقہ سے مرنا" سے ہماری مراد ظاہری شان وشوکت سے ہے۔ میت کے باطن کا حال تو خدا جانتا ہے۔ ہم کوئی عالم و فاضل تو ہیں نہیں کہ دنیا سے منہ موڑ کر جانے والے کے اعمال کا تجزیہ کرکے اس کے جنتی ہونے کی بشارت دیں۔ یا دوزخی ہونے کے بارے میں آگاہی بخشیں۔ یہ تو صرف کشف قبور کا علم جاننے کا دعویٰ کرنے والے ہی بتائیں گے کہ شہر خموشاں کے باسی کس حال میں ہیں اور ان کی قبروں میں کتنی کھڑکیاں اور کتنے روشن دان کھل گئے ہیں۔

ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ جس شخص کا بینک بیلنس جتنا بڑا ہوتا ہے، اس کا جنازہ بھی اتنی ہی دھوم دھام سے اُٹھتا ہے۔ خواہ اُس کے اعمال نامہ میں نیکیوں کا بیلنس "منفی صفر" ہی کیوں نہ ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی موت کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل جاتی ہے چند ریڈی میڈ (READY MADE) مرثیہ خواں جنھیں عرف عام میں چمچے کہا جاتا ہے حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور یہ چمچے مرحوم کے عیوب باطنی کو محاسن باطنی میں کچھ اس طرح تبدیل کر دیتے ہیں کہ اگر مرحوم دوبارہ زندہ ہوکر ایک تردیدی بیان بھی شائع کروا دے تو لوگ اس عمل کو عجز و انکسار پر محمول کریں گے۔ اب رہا ظاہری عیوب کا معاملہ، تو ان ظاہری عیوب کو کمخواب یا اطلس کے کفن اور پھول مالاؤں سے

ڈھانک دیا جاتا ہے۔ اب ہم کہاں تک گنائیں۔ حتیٰ کہ جلوس جنازہ کی باضابطہ رننگ کومنٹری بھی دی جاتی ہے۔ ہم نے ایک ایسے نام نہاد سوشیل ریفارمر کی میت کے درشن کئے تھے جن کا چہرہ لقوہ مارنے کی وجہ سے ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ لیکن چمچوں نے یہ افواہ اڑادی کہ مرحوم کے چہرے پر غضب کی مسکراہٹ تھی۔ غالباً مرحوم چمچوں کی حرکتوں پر مسکرارہے ہوں گے۔

اُسی نام نہاد سوشیل ریفارمر مرحوم کے چہلم کی دعوت کا ذکر ہے جس میں ہم بھی مدعو تھے۔ دعوتوں میں آہستہ کھانا اور مجلس کے برخواست ہونے تک بیٹھے رہنا ہماری عادت ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مدعوئین کی غیبتوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ اسی دعوت میں ایک بزرگ جو ستر کے پیٹے میں تھے، بریانی کی مہک اور بوٹیوں کی فراوانی کو مرحوم کے جنتی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے۔ ایک اور معزز مہمان سے رہا نہ گیا۔ بوٹی کو نوچتے ہوئے بولے "مرحوم بڑے سخت جان تھے!" اس پر جنت کی بشارت دینے والے بزرگ نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ "سخت جان" کہنے والے بزرگ سٹپٹا گئے اور فوراً اپنی تصحیح کرلی ـــــ "میری مُراد بوٹیوں کی سختی سے ہے۔ شائد مرحوم بکرے خاں بڑے سخت جان تھے۔ کاش کہ گوشت کو پپئی لگادی جاتی!" وہ تو اچھا ہوا کہ بات اسی پر ٹل گئی۔ اگر مرحوم کے لواحقین سن لیتے تو "سخت جان" کہنے والے بزرگ کو ہی پپئی لگادیتے!

لیکن کنجوسوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ نہ تو اپنی زندگی میں کبھی ایک پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اور نہ مرنے کے بعد خرچ کرنے کی وصیت کرجاتے ہیں۔ غالباً آپ نے اُس کنجوس کا قصّہ سُنا نہ ہوگا جو اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اس کے لڑکے جو اس سے بھی زیادہ کنجوس تھے آپس میں صلاح مشورہ کررہے تھے کہ میت کو کم سے کم خرچ میں قبرستان تک کس طرح لے جائیں۔ ایک لڑکے نے تجویز رکھی کہ ہسپتال سے امبولنس منگوالی جائے۔ دوسرے لڑکے نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ٹھیلے سے کام چل جائے گا۔ کنجوس اپنے لڑکوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ آنکھیں کھول کر بولا: "تم کچھ مت کرو۔ صرف میرے جوتے لادو۔ میں خود ہی پیدل قبرستان چلا جاؤں گا!"

شہر خموشاں کو مقام عبرت کہا گیا ہے۔ لیکن آج کل یہ مقام بچوں کے لئے پلے گراؤنڈ، مویشیوں کے لیے چراگاہ اور نوجوانوں کے لیے پناہ گاہ کی نوعیت اختیار کرگیا ہے۔ ایک دن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر سے یہ آواز آرہی تھی:

چار آنے میں بادشاہ باہر!

ہم حیران ہوگئے کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا مُردے بھی اب بولنے لگے ہیں۔ اور بولتے بھی ہیں تو politics (پالیٹکس) پر! یہ صحیح ہے کہ آج کل جمہوریت کا دور دورہ ہے اور بادشاہ کی Market Value (مارکٹ ویلیو) گرگئی ہے۔ لیکن یہ مارکٹ ویلیو اتنی نہیں گری کہ چونّی میں بادشاہ باہر آئے! ـــ ڈرتے ڈرتے قریب جاکر جو دیکھا تو پتہ چلا دو نوجوان قبر پر پتے کھیل رہے تھے۔ اور بادشاہ پر چونّی لگائی جارہی تھی۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی بھی ملاحظہ فرمائیے:

گرما کے موسم میں سرِ مغرب ایک قبرستان میں ایک نوجوان سفید لباس میں ملبوس ایک قبر پر کچھ اس طرح لیٹا ہوا

تھا جیسے کوئی نیا نیا مُردہ قبر پھاڑ کر باہر آگیا ہو۔ ایک راہرو سے قبر کی یہ بے حرمتی دیکھی نہ گئی۔ طنزیہ انداز میں کہا "کیوں بھائی! کیا اندر گرمی ہورہی ہے جو باہر آگئے ہو!؟"

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب شاعر کے اس جہاں سے گزر جانے کے بعد اس کے گھر سے چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط برآمد ہوا کرتے تھے لیکن آج شاعروں کا یہ حال ہے کہ ان کی جیبوں میں سے کاغذ کے چند مڑے تڑے ٹکڑے اور سگریٹ کی چند خالی ڈبیاں برآمد ہوتی ہیں جن پر کہیں مصرعہ طرح، کہیں مطلع اور کہیں ہم قافیہ الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ البتہ مقطع کہیں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ شاعر کی ساری عمر شاعری کرنے اور ادب میں مقام پیدا کرنے میں گزرتی ہے اس لئے اس کا مالی موقف نہایت ہی کمزور رہتا ہے۔ اور مالی موقف سے کہیں زیادہ کمزور بلکہ مخدوش اس کا اعمال نامہ ہوتا ہے۔ جبکہ شاعروں اور ادیبوں کی آخرت اور ان کو سرفراز کئے جانے والے مقامات کے بارے میں بڑی عجیب وغریب بشارتیں دی گئی ہیں۔ چنانچہ جب ایک ادیب سے یہ پوچھا گیا کہ تم جنّت اور دوزخ، ان دونوں میں، کس ایک میں جانا پسند کروگے؟ تو ادیب نے جواب دیا کہ "مجھ سے یہ مت پوچھئے! کیوں کہ ہر دو جگہ میرے احباب موجود ہیں!"

جب صورت حال ایسی ہو تو ادیبوں اور شاعروں کو چوکس رہنا چاہیئے۔ اور ایک آدھ شعر یا قطعہ ایسا بھی کہنا چاہیئے جو خدا کے موڈ کو مائل بہ کرم کرنے کا موجب بنے۔ جیسا کہ جوشؔ نے کہا ہے۔

پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا جلال تیرا

اس قسم کے کلام سے شائد خدا کو شاعر کی ادا بھا جائے اور اُس کا کام نکل جائے۔ لیکن بینک بیلنس کے بغیر دُنیا کے کاروبار پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں کہ دُنیا سے رخت سفر باندھتے وقت کوئے یار میں دوگز زمین پانے کے لئے اور چہلم کی دعوت کے ذریعہ دوست احباب کا منہ بند کرنے کے لئے پیسے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ادیبوں اور شاعروں کو چاہیئے کہ وہ جیتے جی اپنے مَن پسند خطہ زمین یا Area میں دوگز زمین خرید کر محفوظ کروالیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تربت پر لگنے والی لوح کا مضمون بھی زیور طبع سے آراستہ کرالیں اور احتیاطاً لفظ "راقم الحروف" بھی لکھ دیں۔ حتیٰ کہ چہلم کی دعوت کے مینو (MENU) کی تفصیلات معہ مشروبات و ماکولات، پسندیدہ و ناپسندیدہ بھی لکھ چھوڑیں۔ یہی نہیں بلکہ فہرست مدعوئین بھی ترتیب دے دیں تاکہ کوئی ناپسندیدہ ادیب یا شاعر دوست مدعو نہ ہونے پائے۔ ان ساری باتوں پر عمل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ میت کو بلد از جلد ٹھکانے لگانے میں لواحقین کو دوڑ دھوپ نہ کرنی پڑے۔ چنانچہ غالبؔ نے اس قسم کی دور اندیشی کو ملحوظ نہ رکھنے والوں کے لئے ہی یہ شعر کہا ہے ؎

ہوئے مَر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!

ظہیر ابن قدسی
(مالیگاؤں)

اُجڑی اُجڑی ہے بہت ہند میں دنیا میری
ہے پریشان مرے ساتھ حسینا میری
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شیخِ عرب سی ہو خدایا میری

تو مجھے جلدی سے اک ویزا عطا کر یارب
میں بھی بن جاؤں کسی شیخ کا بٹلر یارب

گر سیاست کا ہے مجھ میں نہ اثر ہے یارب
کوئی ڈپلوما نہ ڈگری، نہ ہنر ہے یارب
زر تجوری میں نہ کچھ لعل و گہر ہے یارب
بال بچوں سے بھرا، ڈربے سا گھر ہے یارب

کچھ تو کم ہوں گے زمانے کے یہ ظلم اور ستم
کسی بدّو ہی کی ہو جائے اگر نظرِ کرم

شیخ کو تیل ملا، دولت و ثروت بھی ملی
ساری دنیا میں اسے عزت و شہرت بھی ملی
کریں عیاشیاں جی بھر کے یہ فرصت بھی ملی
اور ہم لوگوں کو خدمت کی اجازت بھی ملی

اس اجازت کا ذرا فائدہ مجھ کو دے دے
ریال کی شکل میں خدمت کا صلہ مجھ کو ملے

آدھی روٹی مجھے مل جاتی ہے عزت سے یہاں
پھر بھی دولت کی تمنا ہے مرے دل میں جواں
مانجھنا، دھونا، پکانا تو یہاں پر ہے گراں
جھاڑو دینے میں بھی کچھ عار نہیں ہوگا وہاں

مری خواہش ہے عرب والوں کی خدمت کرنا
ان کی دولت سے، تجوری سے محبت کرنا

نوکری کرنے عرب کنٹری جو جاتے ہیں
وہ سفیرانِ حرم ہند کے کہلاتے ہیں
تھیلیاں سونے سے اور چاندی سے بھر لاتے ہیں
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

مرے اللہ غریبی سے بچانا مجھ کو
کویت و ریاض کے رستے پہ چلانا مجھ کو

٭٭

حفیظ خان مذاق

سُنو سنو جی میرے یار

سنو سنو جی میرے یار تم بھی ذرا سنو
۵۵ سال کی مار میں آکو ہوگیئں ہم بیکار
بیوی بھی اک نوٹس دیدی بکو اب یہہ بار
نوکری گئی اب بیوی جارئی سُوڑدین ٹی آر
ہم پُو چلا دیو اپنی کار تم بھی ذرا سنو
سنو سنو جی میرے یار تم بھی ذرا سنو

بیٹی کو باہر دیدے کو آس کرے تھے کیا کیا
بنگلہ لیں گے امّاں باوا اور بیٹے کو جاوا
ڈراف سمجھ کو کھولے لفافہ، طلاق نامہ نکلا
اب روتے ہیں زار و زار تم بھی ذرا سنو
سنو سنو جی میرے یار تم بھی ذرا سنو

ڈُسکو پکڑے بین کو عاشق ہوندی چلریں چال
صورت شکل ہاتھاں پاواں لکڑیوں کی ہے ٹال
گھر میں بچونے ڈسکو کریں ککیاں ہیں نہ دال
اُوپر سے آتیئے ان کو تار تم بھی ذرا سنو
سنو سنو جی میرے یار تم بھی ذرا سنو

۸۰ برس کا لڑکا لڑکی جل کو کریں شادی
دانا داں دھنگا نہ پکڑیں پوترے بنے براتی
باوا دُولا بن کو بیٹھیں بیٹے بن گئیں قاضی
بھوواں پھولوں کا دالیں ہار تم بھی ذرا سنو
سنو سنو جی میرے یار تم بھی ذرا سنو

ان پڑھ بھونگری

دو غزلیں

دور والے قریب ہوتے ہیں
زر کے رشتے عجیب ہوتے ہیں
ہم جو اُن کے قریب ہوتے ہیں
اُن کے نخرے عجیب ہوتے ہیں
جس جگہ بھی فساد ہوتا ہے
صرف زد میں غریب ہوتے ہیں
بھوکے ہوتے ہیں داد کے یارو
یہ جو شاعر ادیب ہوتے ہیں
زلفِ جاناں سے کھیلنے والو
اس کے سائے مہیب ہوتے ہیں
بھول کر بھی نہ کھائیے دعوت
جب بھی "بُڈھے" قریب ہوتے ہیں
کچھ تو ہوتے ہیں آپ سے ان پڑھ
سب کہاں کچھ خطیب ہوتے ہیں

-۲- -۲- -۲-

مجھ کو جو ہاتھ دینے والا ہے
ہم نوالہ ہے ہم پیالہ ہے
اپنا بیمہ کرالے کیا جانے
ہارٹ کب فیل ہونے والا ہے
سُسرا چپکا شو ہی گیا چمچہ
ساس اب تک گرم مسالہ ہے
زندگی کے لئے ہوئی شادی
گھوڑے جوڑے نے مار ڈالا ہے
لڑکی بی۔ اے ہے دنیا دیکھی ہے
لڑکا ان پڑھ ہے گاؤں والا ہے
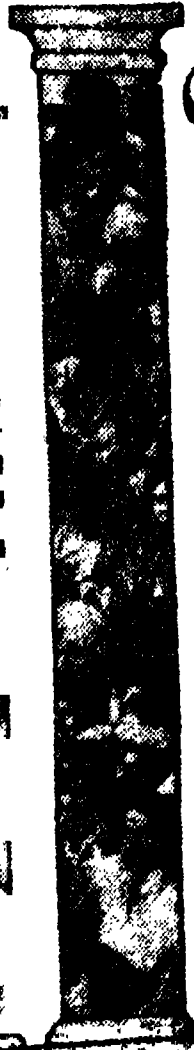
اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ

مجیب صدیقی (پروڈیوسر بی بی سی لندن)

بالمشافہ

یہ بات نوجوانی کی نہیں، بھرپور جوانی کی بھی نہیں۔ یہ آج کی بات ہے۔ آج جب قُویٰ میں انحطاط اور بالوں میں سفیدی نمایاں ہونے لگی، تو ایک دن سویرے سویرے اچانک دل میں ایک عجیب سا جذبہ جاگا۔ بالکل انجانا اور اجنبی احساس!

جوانی کی ٹوٹتی ہوئی فصیلوں میں مدافعت کا حوصلہ نہ تھا۔ لہٰذا مذکورہ جذبہ بعد اپنے محرکات کے بے دریغ شہرِ دل میں دَر آیا۔ ہم نے پاس جاکے، چپکے کنام پتہ پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ یہ نیکی کا جذبہ ہے۔ جو اکثر اس عمر میں یا اس کے تھوڑا اور بعد۔ دل میں جاگتا ہے۔ اور اسی کو برت کر جنت ملتی ہے۔ ہم پر اس جذبے کے منکشف ہونے کا عمل گزر رہا تھا اور ہم گو مگو کے عالم میں سرنگوں بیٹھے تھے کہ تبھی۔ ایسا لگا، جیسے کوئی چپکے سے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو بے ساختہ ساحر لدھیانوی کا مصرعہ یاد آ گیا۔

"اجنبی ہو مگر غیر نہیں لگتے ہو"

سوال کیا۔ کون۔؟ برجستہ جواب ملا۔ ابلیس۔!

ہم نے چونک کر دل ہی دل میں پڑھا۔ لاحول ولا قُوۃ!

وہ جوں کا توں کھڑا رہا۔

اس بار ہم نے بہ آوازِ بلند کہا۔ لاحول ولا قُوۃ!

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

ہم نے تیسری بار کچکچا کے پڑھا۔ لاحول ولا ——!

وہ مسکرانے لگا —— ہم نے جھنجلا کے کہا۔ آخر تم جاتے کیوں نہیں ہو ——

کہنے لگا —— ایک لاکھ دفعہ پڑھو، نہیں جائیں گے۔

عرض کیا —— مگر ہم نے تو سب جگہ یہی پڑھا اور سُنا ہے کہ لاحول پڑھنے سے تم بھاگ جاتے ہو۔

بولا —— ٹھیک ہی سنا ہے۔ مگر وہ پڑھنے والے اور ہوتے تھے، جن کے دل میں لاحول کا خیال آتے ہی ہم

رفو چکر ہو جاتا تھا۔ مگر تم۔ تم اپنی حیثیت تو پہچانو۔ بساط کیا ہے تمہاری۔ ماردوں جھاڑ تو مرگی آجائے ـــ

ہمارے کانوں میں غصّے، سکشت اور اس کے بارعب لہجے کے باعث سَن سَن ہونے لگا۔ کئی لمحے لگے ہمیں اپنے کو سمیٹنے میں۔ پھر کچھ سوچ کر ہم نے ایک دم پینترا بدلا۔ نرم لہجے میں کہا۔

مگر بھائی یہ تو کوئی منطق نہ ہوئی۔

کہنے لگا کیوں نہیں ہوئی۔ تم تو یہ بھی سُنتے آئے ہو کہ "قم باذنی اللہ" پڑھنے سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے مگر تم سے تو کسی کی میت بھی نہیں اٹھتی۔ اس کے لئے بھی کرائے کے آدمی بلاتے ہو۔

ہم نے کہا۔ وہ اور بات تھی۔ لیکن لاحول پڑھ کر تمہیں بھگانے کے لئے پیغمبر ہونے کی شرط تھوڑے ہے۔

وہ بولا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ انسان ہونے کی تو شرط ہے۔

ہم نے اکڑ کر کہا ـــ تو دیکھو، ہم انسان ہیں ـ وہی جسے اللہ نے خلیفۃ الارض بنا کے بھیجا ہے بس اتنا سُنتے ہی وہ فلک شگاف قہقہے لگانے لگا۔ ہاتھوں سے گھٹنے پیٹ پیٹ کے ہنسی سے دوہرا ہو گیا۔ ہم بھی خواہ مخواہ اس کی ہنسی کا ساتھ دینے کے لئے دانت نکورتے رہے۔ کئی منٹ بعد اُس نے ہنستے ہنستے کہا۔ ایسی ـ ایسی لالچ میں تو تم کھیل گئے۔ تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ خلیفہ حجام کو کہتے ہیں۔ جس کی کِسبت میں ایک اُسترا، ایک قینچی ہوتی ہے ـ اِسی لئے صدیوں، قرنوں سے تم ایک دوسرے کی حجامت بنا رہے ہو۔ وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا ـ ہم نے سوچا ـ کون اس مُنہ پھٹ کے مُنہ لگے۔ لہٰذا بحث چھوڑ کے، انٹرویو شروع کر دیا ـ پوچھا ـــ

اچھا دولت ایک بات بتاؤ ـ لاکھوں کروڑوں سال ہو گئے۔ کیا تمہارا کبھی دل نہیں چاہا کہ اب توبہ کر لیں ـ اللہ میاں نے تو بہر حال قیامت تک توبہ کے دروازے کھُلے رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

کہنے لگا ـ پہلے تو کبھی نہیں چاہا۔ مگر اب تمہیں دیکھ کر توبہ کر لینے کو واقعی دل چاہتا ہے ـــ ویسے مَیں تمہاری بات نہیں کرتا۔ لیکن میری اپنی نظروں سے مُدتوں پہلے توبہ کی آبرو ختم ہو گئی۔

ہم نے پوچھا ـــ ایسا کب ہوا ؟!

بولا ـ جس دن ابو سفیان کی توبہ قبول ہوئی تھی ـ

اُس کا جواب سُن کر ہم بہت دیر تک عقیدے اور منطق کی سُولی پر جھولتے رہے ہَوا کے جسم پر ہاتھ رکھ کر نشان بنا دینا آسان ہے، لیکن اپنے دل پر ثبت عقیدے کی مُہر کو مٹا پانا بہت مشکل ہے ـ کائنات کی اٹیلس پر یہ کُرّۂ ارض صرف ایک نقطے کے برابر ہے ـ اس نقطے کے اندر رینگتے ہوئے کروڑوں انسان ـــ ان گنت اُن کے جھمیلے ـ آخر کون محترم ہے کون نہیں، یہ فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے۔ ظاہر ہے حتمی فیصلہ کرنے والا ـــ وہی خالقِ کائنات، وہی قادرِ مُطلق ہے۔ پھر یہ قدم قدم پر سوال کرنے کا شعور، انسان کے شر پسند ذہن کو کیوں بخش دیا ـــ ان سوالوں نے ہی تو ہمیں خراب کیا ہے ـــ یہ ودیعت، آدم کی تو ہو نہیں سکتی ـــ وہ تو سدا سر جھکائے راضی بہ رضا رہے ـــ سوال تو ـــ پہلی بار، آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر، ابلیس نے کیا تھا۔ غور کرنے لگو تو ۔۔۔ اپنے خمیر کی نجابت مشکوک نظر آنے لگتی ہے ۔۔۔

کچھ بھی ہو ۔۔۔ ہم بہرحال اشرف المخلوقات ہیں۔ اس خیال نے کوندے کی طرح لپک کر سہارا دیا تو گفتگو کا سرا ہاتھ میں تھا ۔۔۔

ہم نے کہا ۔۔۔ دیکھو بھائی ابلیس ۔۔۔ تمہارا مسلک کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے۔ بہکاؤ ۔۔۔ اور بہکاؤ ۔۔۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہم اشرف المخلوق ہیں اور تم ہم سے جلتے ہو ۔۔۔ یہ سنتے ہی وہ پھر ہنسنے لگا ۔۔۔ کٹیلی ہنسی ۔۔۔ بولا ۔۔۔

تم ۔۔۔ یعنی ساری مخلوقات میں اشرف ۔۔۔ جب گھر سے باہر نکلتے ہو تو غلاظت پر سے اُڑ کر ایک ذلیل مکھی تمہارا منہ پر لات رسید کرتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتی کہ اشرف المخلوقات جا رہا ہے، ذرا راستہ دیدیں۔ بغل سے کوئی بچھو نکلا اُس نے کاٹ لیا ۔۔۔ پتہ چلا، اشرف المخلوقات بیٹھے رو رہے ہیں ۔۔۔ اور بچھو، ڈنک لہراتا اینڈتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ میری آنکھوں نے ہزار بار یہ تماشہ دیکھا ہے کہ۔ بڑھیا نے بائیس برس تک اپنے اکلوتے بیٹے کو تل تل کر کے پالا۔ ایک سانپ آیا۔ اُس نے ڈس لیا۔ بیٹا مر گیا۔ بڑھیا پتھر ہو گئی۔ سانپ نے اُسی رات اپنی بانبی میں شب زفاف منائی ۔۔۔

ہم نے کہا ۔۔۔ ارے وہ سب تو نادان مخلوق ہے۔ اُسے اللہ میاں نے عقل کہاں دی!

وہ بولا ۔۔۔ اچھا۔ تو تم سمجھتے ہو کہ عقل تمہیں دی گئی ہے ۔۔۔ ارے عقل ہوتی تمہارے پاس تو یہ نہ سوچتے کہ جس اشرف المخلوق کے سامنے مجھے۔ یعنی مُعلّم الملکوت کو سجدے میں گرنے کا حُکم دے دیا، اُسی اشرف المخلوق کے لئے باقی سب کو کُتے بلّی تک کو چھوٹ دے دی کہ جب چاہو اس آدم زاد کو بھنبھوڑ کھاؤ ۔۔۔

ہم نے کہا ۔۔۔ پہلے جملہ درست کرو۔ مُعلّم الملکوت کے ساتھ ۔۔۔ "سابق" کا لفظ لگاؤ ورنہ پروٹوکول میں گڑبڑ ہوگی۔

مسکرا کے بولا ۔۔۔ اچھا تو تم پروٹوکول بھی جانتے ہو۔ تب تو تم پر پروٹوکول کی خلاف ورزی کا جُرم عائد ہوتا ہے۔ میرے آنے پر تم نے مجھے ۲۱ توپوں کی سلامی کیوں نہیں دی!

ہم نے کہا۔ تو پھر تم بھی سمجھ لو کہ وہ کوئی اور ہوتے ہوں گے جو تمہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دیتے ہیں۔ ہمارا معاملہ تو دل کا ہے۔ ہم دل سے عزّت کرتے ہیں، اور دل سے ہی بے عزّتی بھی۔ اِسی لئے تمہارے آنے پر لاحول پڑھا ۔۔۔

کہنے لگا ۔۔۔ تو پھر نتیجہ بھی تم نے دیکھا ۔۔۔

ہم نے کہا ۔۔۔ نتیجے کی فکر ہم نے کب کی ہے۔ نتیجے کی فکر ہوتی تو ہم خود ہی پیغمبر بن کر خود ہی پیغمبروں کا قتل تھوڑے ہی کرتے ۔۔۔

کنّی کاٹتے ہوئے بولا ۔۔۔ یہ تو میرے اپنے اصولوں کی مجبوری تھی کہ میں آج تمہارے پاس بہ نفسِ نفیس آگیا ورنہ تم تو اِس لائق بھی نہیں کہ میں تم پر وقت ضائع کرتا۔

ہم نے کہا ۔۔۔ ابھی ہم پر اور وقت ضائع کرو ۔۔۔ اچھا لگ رہا ہے۔

بولا ۔۔۔ ایک دن اُس بالانشین، قادرِ مطلق سے یہ تو پوچھو کہ کبھی کوئی سانپ ایسا کیوں نہیں نکالا، جو بڑھاپے کا

بوڑھے ہوتے ہوئے کسی نحیف و لاغر انسان کو کاٹ لیتا اور وہ ایکدم سے بائیس برس کا جوان بن جاتا۔

ہم نے کہا — بڑھاپا، جوانی تو سب فطری عمل ہے۔ چلتا ہے، چلتا رہے گا۔ اس میں کیا ہے۔ اور پھر ایمانِ راسخ کو معجزوں کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی —

بولا — کھائے جاؤ جھانسے پہ جھانسہ۔ ارے چار دن میں تمہیں بوڑھا کر دینے والے کی — خود کی — کروڑوں اربوں سال گزر جانے کے بعد، اب تک مسیں بھی نہیں بھیگیں۔

ہم نے کہا — کچھ بھی کہہ لو یار — مگر تمہیں اس بہکانے دھمکانے سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔

کہنے لگا —— کیا مطلب ؟!

ہم نے کہا۔ مطلب یہ کہ، اب جیسے، ہمارے ضلع کے حلقۂ انتخاب سے جن صاحب نے پانچ لاکھ لوگوں کو بہکایا تھا وہ ممبر پارلیمنٹ بن گئے۔ پھر وزیر ہو گئے۔ لیکن تم تو کروڑوں کو بہکانے کے بعد بھی کچھ نہ بن سکے۔

بولا — دیکھو۔ سیاست کا ذکر مت چھیڑو۔ ورنہ مجھے متلی ہونے لگے گی۔ ہُنہ، سیاست۔ لاحول ولا قوۃ!

اس نے کچھ ایسے خلوص سے لاحول پڑھا کہ اس کے بعد — نہ جانے کیسے ہوا — نہ جانے کیوں ہوا —— میں وہاں نہیں تھا ——!!

○●
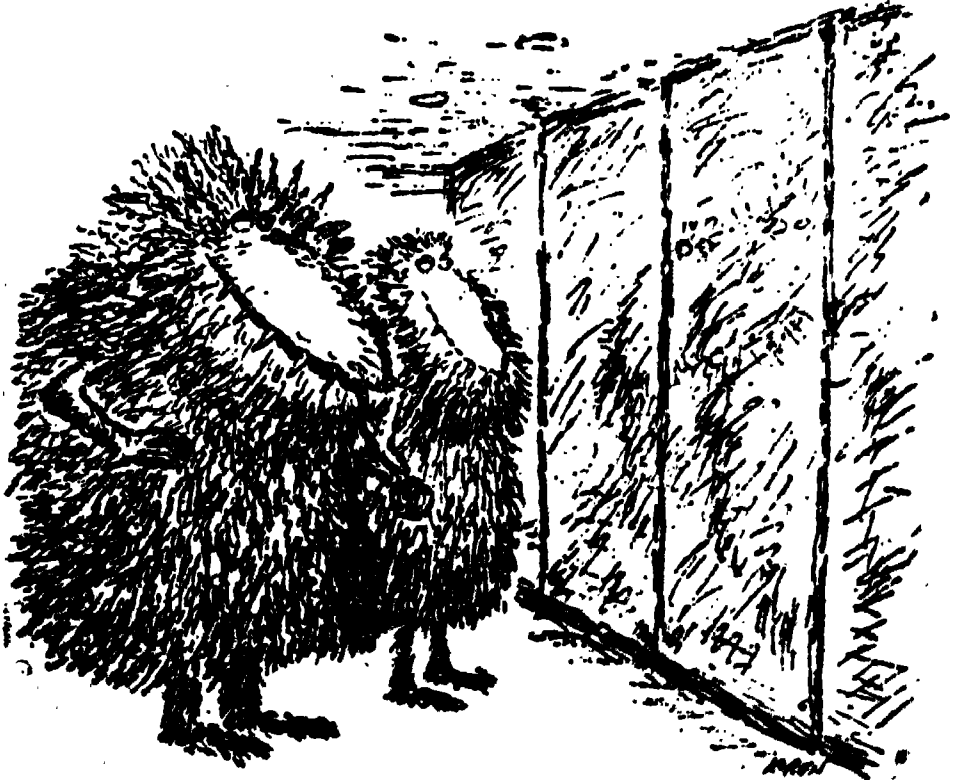
"You've got to admit we look good together."

صبغت اللہ مبارک

"LOVE INSTITUTE"
لَو انسٹی ٹیوٹ

موڑ پر بازار کے تھا ایک چھوٹا سا مکاں
لَو انسٹی ٹیوٹ کا تھا بورڈ آویزاں جہاں
جسم کے پوشیدہ اعضاء تھے عیاں دیوار پر
ہر طرف چسپاں تھے ملیالی فلم کے پوسٹر
تھی ہر ایک تصویر کچھ اس طرح لہرائی ہوئی
جیسے ہو کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
مجھ کو حیراں دیکھ کر پہلے تو وہ ہنسنے لگا
ٹھیک کر کے اپنی عینک پرنسپل کہنے لگا
ویسے یہ مکتب ہے لیکن اس کو کالج جانیئے
اور مجھے الفت کے ماروں کا معالج جانیئے
نوجوان دل تھام کر پھر اس طرح گویا ہوا
عشق میں میں نے نہ پایا کچھ مگر رسوا ہوا
جب بلاتا ہوں میں اس کو ریشمی سی شام میں
مجھ سے ملنے آتی ہے اسکول یونیفارم میں
پیار سے ڈرتی ہے اور بوسے سے کتراتی ہے وہ
نرم و نازک ساعتوں میں ٹافیاں کھاتی ہے وہ
جب کہ اُن کی خالہ یہ گاتی ہیں جھولا ڈال کے
میں ہوں اب سولہ برس کی اور وہ سترہ سال کے

اور نانی اُن کی گل سے گلستاں ہونے کو ہیں
کان کا جھمکا بریلی میں کہیں کھونے کو ہیں
پہلے دن تو آں سبق بوسہ تمہیں دینا نہ تھا
وہ جو آیا ٹافیاں کھائے تو کچھ لے جانا نہ تھا
عشق بھی اک آرٹ ہے شعر اور نغمے کی طرح
دل کی وادی میں کھنک اٹھتا ہے جھرنے کی طرح
ٹافیاں دینے کا صبر کرنے کا رہے جاری ریاض
جلد بازی سے ہے لازم عاشقوں کو احتراز
پھر بقولِ جوش ایک دن یہ تو ہونا ہے ضرور
مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی، ضرور
دیکھنا گہری نظر سے گنگنا لینے کے بعد
یا کما لینے سے پہلے یا کما لینے کے بعد
پھر سمجھنا دل کی رانی مسکراتی ہے کہیں
ہو نہ ہو ظالم جوانی گنگناتی ہے کہیں
وہ ابھی کمسن ہے اس کو ٹافیاں کھلواؤ تم
عشق کے کالج میں اپنے ساتھ اس کو لاؤ تم
آئی اک دن نازنیں جب پرنسپل کے سامنے
جیسے تتلی کوئی اٹھلاتی ہے گل کے سامنے
میں نہیں! ہے میرا بنگلہ ان کے حق میں عشق بیز
ان کے آبا مانگتے ہیں میرے ڈیڈی سے جہیز
کوئی چڑھ بھاؤ پوچھے کوئی مانگے تھوک میں
جیسے سودا کر رہے ہوں مرغیوں کے چوک میں
پرنسپل پہ چیخ اٹھا نہے سب سے بڑی لعنت جہیز
چاہیے بنگلہ ہو کہ موٹر چاہیے کرسی ہو کہ میز
اے میرے پیارے پرنسپل میں رہوں گی تیرے ساتھ
پست ہمت، لالچی عاشق نہ تھامے میرا ہاتھ

معین امر بمبو

غزل

نظر کا کالا ٹیکہ حُسن کی پہچان ہوتا ہے
جہاں بھی ہوتی ہے دولت وہاں دربان ہوتا ہے

عیادت کیلئے وہ اس قدر میک اپ میں آتے ہیں
مریضِ عشق کے جذبات میں ہیجان ہوتا ہے

سزا انسان کو کیا جرم سے پہلے بھی ملتی ہے
نکاح نامہ پہ کیوں نوشاہ کو چالان ہوتا ہے

جہاں داماد کے چال وچلن دیکھے نہیں جاتے
بہو کے لوٹ جانے کا وہاں امکان ہوتا ہے

تجرد رنگ لاتا ہے، غزل تخلیق ہوتی ہے
حسین چہرہ کوئی جب مائلِ احسان ہوتا ہے

نظر رکھنا خود اپنی خامیوں پر بات مشکل ہے
کسی پر طنز کر دینا بڑا آسان ہوتا ہے

کبھی چکنی غذا کھائے نہیں بمبو میاں لیکن
مسلسل گھورتے رہنے سے بھی یرقان ہوتا ہے

مصطفیٰ علی بیگ

★

تُو نے ھارا ہے الیکشن، آل رائٹ
پیدا کر لے نیو کنکشن، آل رائٹ

اپنے غم بھی تھوکتے ہیں مجھ پہ وہ
بن گیا ہوں واش بیسن، آل رائٹ

نت نئی فرمائشیں ہیں وائف کی
کیا رُکے گا اب کرپشن، آل رائٹ

گالیاں بھی سوئیٹ ھیں دلدار کی
اُس کا لہجہ اُس کا ڈِکشن، آل رائٹ

میرے دل کے آپریشن کے لیے
ایک ہو یا دس ہوں سرجن، آل رائٹ ق
ہارٹ کی یہ آرزو بھی ہے مگر!
نرس کا بھی ہو اٹینشن، آل رائٹ

ہیں منسٹرز، اسّی اسّی سال کے!
ہم کو اٹھاون میں پنشن، آل رائٹ

خطرے میں آج اپنی پوزیشن ہے کیا کروں
اُن کی سہیلیوں میں RECEPTION ہے کیا کروں

بالوں کا DYE کرانا ضروری ہے اِس لیے
پنشن کے بعد اُن کا اٹینشن ہے، کیا کروں

تم قتل کرو، FACE کروں گا میں ہر طرح
اِس گلستاں میں میرا نشیمن ہے کیا کروں

میں کیا بتاؤں ناک کٹی میری کس طرح
اُس دل رُبا کا باپ بھی سرجن ہے کیا کروں

ہم عاشقی میں AGE کے قائل نہیں مگر
اُن کا کلاس میٹ مرا SON ہے کیا کروں

❖ ❖ ❖

رشید الدین

شہرت کی خاطر

"ایک رات میں سو کر اُٹھا اور اپنے آپ کو مشہور پایا" یہ جملہ مشہور انگریزی شاعر بائرن کا ہے جو انگلستان کے رومانی دور کا شاعر تھا اور اپنی ایک ہی نظم کے چھپنے کے بعد راتوں رات مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن یہ خوش قسمتی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انسان کو مشہور ہونے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس کے لئے انسان کو مسلسل ایک ہفتہ سیکل چلانی پڑتی ہے تو دو ہفتے سر کے بَل کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ کسی جھیل میں پانی پر چلنا پڑتا ہے تو کسی تقریب میں انگارے پھانکنے پڑتے ہیں اس کے بعد بھی شہرت کی دیوی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ —— آتی ہے پر نہیں آتی۔ ظاہر ہے ایک انسان کی حیثیت سے ہم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

اردو زبان کے کسی شاعر یا ادیب کے لئے یہ مشکل مزید بڑھ جاتی ہے کیوں کہ ہمارے سماج میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر یا ادیب کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہوتا ہے اور اس کا ہمارے سماج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے یہاں مشکل ہی سے کسی کو باکمال سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً اس میدان میں نئے آنے والے لوگوں کو مشکل ہی سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی دنیا کسی کی صلاحیت اور قابلیت کو مشکل ہی سے مانتی ہے۔

ہمیں اپنے ایک شاعر کی اب تک یاد ہے بے چاروں نے جب ہمارے زمانے طالب علمی میں شاعری شروع کی تھی تو ہم جماعتوں کو مشکل ہی سے یقین آتا تھا ہم نے تو خیر اپنی عادت کے مطابق انھیں جلدی شاعر مان لیا تھا (کسی میں بھی کسی کمال کو تسلیم کر لینا ہماری پرانی عادت ہے) لیکن بعض احباب کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا۔ ایک صاحب نے تو بچوں کا وہ رسالہ جس میں ان کا کلام بلیغ چھپا تھا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ان سے کہا کہ یہ نظم اگر واقعی آپ کی ہے تو زبانی پڑھ کر سنا دیجئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ نظم واقعی انھیں زبانی یاد تھی ورنہ ان کی شاعری اور عزت دونوں ہی خطرے میں پڑ جاتے تھے۔

ہم نے چوں کہ نثر کا میدان چُنا تھا اس لئے ہمیں زیادہ دقت اور مخالفتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا ورنہ ہمارے بہت سے شاعر دوستوں کو تو ان کے بزرگوں سے بڑے طعنے سننے پڑے۔ گھر میں ہماری بھی مخالفت ہوئی مگر صرف اس قدر کہ اس

سے تعلیم پر حرج ہوگا۔ اسی لئے ہم نے ابتداء میں اپنے بھائی صاحب کی چوری سے اور چھپ چھپ کر مضامین لکھے۔ چوں کہ ہم نے مزاح کا میدان منتخب کیا تھا اس لیے اس میں کچھ زیادہ ہی محنت کرنی پڑی لیکن اپنے دوسرے نثر نگار ساتھیوں کے مقابلہ میں داد بھی ہمارے حصہ میں زیادہ آئی۔

اس وقت ہمیں اپنے ایک افسانہ نگار دوست بُری طرح یاد آرہے ہیں جنھوں نے ہمارے ہی ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ نوجوان لڑکے ظاہر ہے رومانی افسانے ہی لکھتے ہیں۔ اب ان کا المیہ یہ تھا کہ جس پرچہ میں ان کی کوئی چیز چھپتی تو وہ اسے گھر والوں سے چھپاتے پھرتے حتیٰ کہ جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ چھپا تو انھوں نے دنیا جہاں میں اسے تقسیم کیا لیکن اپنے بڑے بھائی کو بھیجنے کی جسارت نہیں کی جو بمبئی میں متعین تھے۔ انھیں ایک دن ہماری ہی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے بھائی صاحب بھی جنھیں وہ کندۂ ناتراش سمجھتے تھے خیر سے صاحب کتاب بن چکے ہیں۔

اپنے کو نمایاں کرنے کی عادت ہر انسان میں ہوتی ہے اور اگر کوئی فنکار ہو تو اس میں یہ عادت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اگر کوئی اتفاق سے شاعر ہو تو یہ عادت کمزوری یا لت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک ایسے ہی شاعر دوست کا نام "عرض کیا ہے" پڑ گیا تھا کیوں کہ وہ ہر کس و ناکس کو اپنا کلام بے نظیر سنانا ضروری سمجھتے تھے اور اس کی تمہید "عرض کیا ہے" سے باندھتے تھے۔ ہمیں اپنی نرم و بامروت طبیعت کی وجہ سے انھیں کچھ زیادہ ہی بھگتنا پڑا ہے اور ایک بار تو سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر ہی ان کا کلام سننا پڑا ہے۔

تو بات شہرت کی چل رہی ہے اور اس سلسلہ میں موضوع تگ و دو کرنے یا پاپڑ بیلنے کا ہے۔ اس تعلق سے ہمیں بھی دوسروں کی طرح کافی جد و جہد کرنی پڑی۔ اب ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ ہی کتنے ہیں اور جو ہیں وہ کونسے صاحب ذوق ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اپنے آٹے دال کے چکر ہی سے کہاں فرصت ہے کہ بے چارے زبان و بیان اور علم و ہنر کے پیچیدہ نکات پر غور کرسکیں اور ان کی خاطر خواہ داد دے سکیں۔ پھر ہمارے سماج میں جو چور شاعروں اور ادیبوں کا شہرہ ہو چکا ہے تو بہت سے سنجیدہ لوگ کسی نئے لڑکے کے بارے میں مشکل ہی سے یہ باور کرتے ہیں کہ یہ صاحبزادے بھی کچھ لکھ لکھا سکتے ہیں۔ اس طرح نئے لکھنے والوں کی پوزیشن زیادہ تر مشکوک سی ہوتی ہے۔ بعض لوگ تو اخلاقاً خاموش رہتے ہیں مگر بعض بڑی بے باکی سے کہہ دیتے ہیں کہ جناب یہ آپ نے کس پرانے رسالہ یا کتاب سے اُڑائی ہے۔ ہم سے بھی ایک صاحب نے ابتدائی دور میں یہی جملہ کہا تھا جسے ہم نے بڑی مشکل سے حلق سے اُتارا تھا۔ ویسے تو اب ہماری حیثیت بھی مسلّمہ ہو چکی ہے اور لکھتے لکھاتے ربع صدی بیت چکی ہے اور ہم خیر سے "صاحب تصنیف" بھی ہوگئے ہیں۔ پر یہ قصہ اس وقت کا ہے جب آتش ناپختہ کار تھا۔

اردو کے اور نئے ادیبوں کی طرح ہماری تخلیقات بھی رسالے کے ایڈیٹروں کے پاس سے واپس آئی ہیں اور بعض نے تو واپس کرنے یا شائع نہ ہوسکنے کی اطلاع دینا تک ضروری نہیں سمجھا۔ بعض ایڈیٹروں نے ہماری حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس زمانے میں ایسے خطوط پاکر ہم بے حد خوش ہوئے اور کئی کئی دن اپنے ساتھ رکھ کر اپنے دوستوں کو دکھاتے اور اتراتے پھرتے۔ اس زمانے میں ہماری بڑی برادری (یعنی ادیبوں شاعروں) کے بعض بڑوں نے ہمیں "لفٹ" بھی کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے

کیوں کہ ہمارے پاس چھوٹوں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھنے کا رواج قدیم سے چلا آرہا ہے۔ مگر بہت سے بڑوں نے ہماری حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ اس لئے ہمیں گھر پھونک کر شہرت چاہنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی جیسا کہ ایک صاحب نے کیا تھا کہ اپنے گھر کو اپنے ہی ہاتھوں آگ لگا دی تھی اور دوسرے دن اخبار میں جو خبر چھپی تھی اس کے آخر میں درج تھا کہ جن کا گھر جلا وہ اردو کے فلاں ابن فلاں تھے جو صرف اپنے مضامین کا مسودہ لیئے گھر سے نکل سکے تھے باقی ہر چیز جل کر خاکستر ہو گئی۔

ہم نے بھی اپنے ابتدائی زمانے میں کسی رسالے میں اپنی کوئی چیز چھپنے پر فرضی خط لکھواتے اور پوسٹ کیئے اور بہت سی ادبی تقریبات میں جہاں ہم کچھ سنانے والے تھے اپنے ہاتھوں سے اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں کو دعوت نامے تقسیم کیئے اور شرکت کی درخواست کی بلکہ بعض کو چائے اور بیسریٹی کی رشوت بھی دی۔ لیکن آپ اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ اس مضمون کے چھپنے کے بعد مدیر "شگوفہ" کو جو خطوط اس تعلق سے موصول ہوں گے وہ بھی ہم ہی لکھوائیں گے۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور کوئی بھی بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ اب تو ہماری مصروفیت کا عالم یہ ہے کہ مضمون لکھنے کے لئے ہی مشکل سے وقت نکال پاتے ہیں پھر اس کے بارے میں خطوط لکھوانے کا وقت کہاں سے پائیں گے۔ اب تو خیر سے ہم بھی پانچوں سواروں میں شامل ہو چکے ہیں اور شہر میں چار جاننے والے ہمارے بھی پیدا ہو گئے ہیں بقول اقبالؔ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں
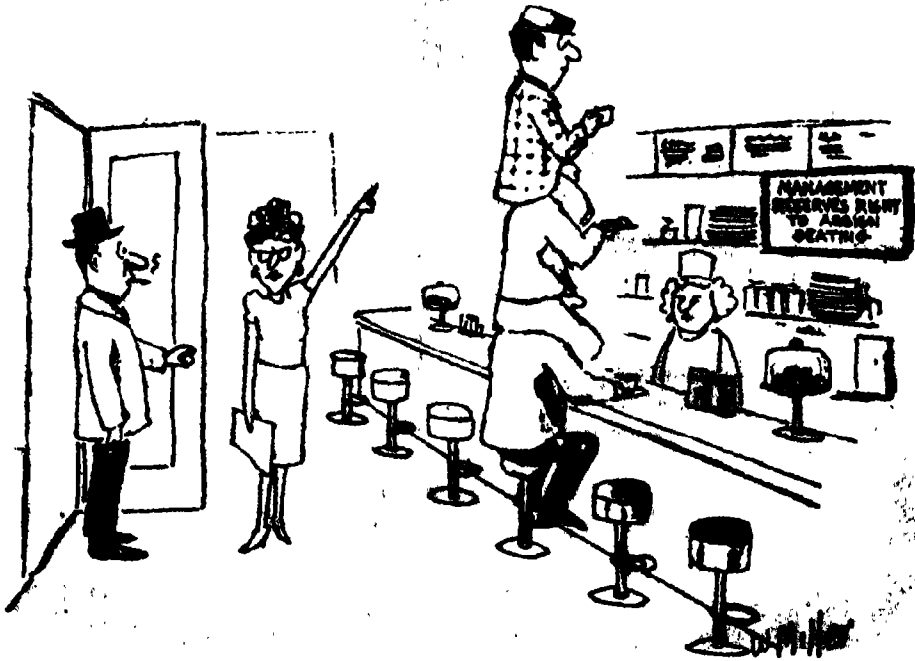
□□

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے
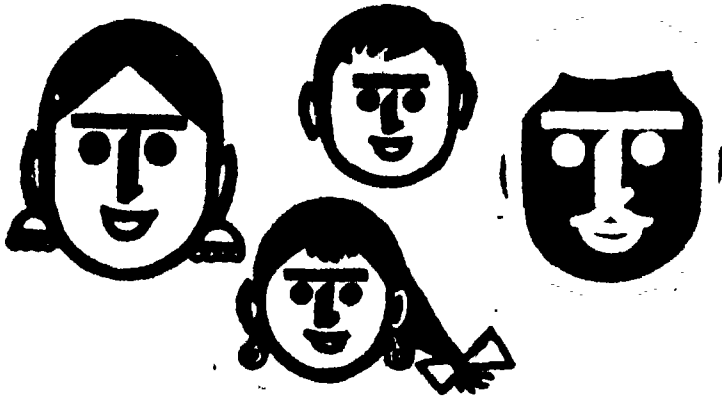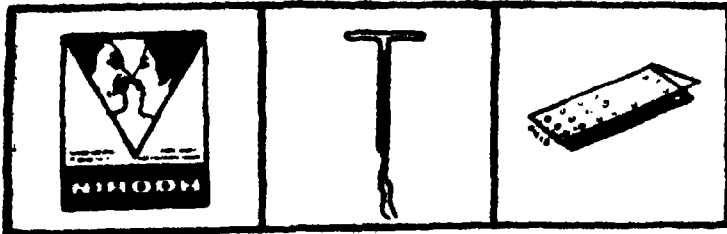
کوئی بھی طریقہ اپنائیے

عابد معز (حیدرآباد)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد)

افواہوں کا شہر: حیدرآباد

مختلف مقامات کے لوگ مختلف خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی وضعداری اور جاپانیوں کی کاریگری مشہور ہے۔ یہودیوں کی کنجوسی تو اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی بے وقوفیوں کا چرچا عام ہے۔ مُرادآباد کے برتن اور علیگڑھ کے تالوں کی بازار میں مانگ ہے اور جناب ہم حیدرآبادی شہری افواہوں کو جنم دینے، انھیں پھیلانے اور ان سے نقصان اُٹھانے کے لئے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

بچپن میں ہم نے انگریزی کتاب میں ایک کہانی "آسمان گر رہا ہے" پڑھی تھی۔ مرغی کا چوزہ درخت کے نیچے دانہ چگ رہا تھا کہ دفعتاً اس کے سر پر ایک پتہ آن گرا۔ اس نے صدا لگائی "آسمان گر رہا ہے" اور جنگل کے بادشاہ کو آسمان گرنے کی اطلاع دینے کے لئے دوڑنے لگا۔ راستے میں چند مرغیاں اور بطخیں ملیں۔ سبھی نے اس واقعہ کو سنا آسمان گرنے پر تشویش کا اظہار کیا اور چوزے کی قیادت میں بادشاہ کو اطلاع دینے جلوس کی شکل میں جانے لگے۔ راستے میں بی لومڑی سے ملاقات ہوئی۔ آسمان گرنے کے واقعہ پر افسوس کرتے ہوئے جنگل کے بادشاہ سے ملانے کے لئے وہ چوزہ اور اس کے ساتھیوں کو جنگل کے ایک غار میں لے گئی جہاں سے کوئی بھی واپس نہ آیا ـــــ کچھ اس کہانی جیسا حال ہمارے شہر کا ہے یہیں ہر شہری ایک چوزہ دکھائی دیتا ہے "پتے" کی مانند کبھی پانی آتا ہے تو کبھی مُردہ قبر سے بات چیت کرنے لگتا ہے۔ کبھی فائرنگ کی آواز آتی ہے تو کبھی زلزلہ آتا ہے بس جناب پھر شہر پر "ن برسانے" والا آسمان خود گرنے لگتا ہے اور شہریوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

ہم یوں ہی نہیں کہہ رہے ہیں کہ حیدرآباد' افواہوں کا شہر ہے۔ جناب ہمارے پاس اس دعوے کا دستاویزی ثبوت بھی موجود ہے۔ چند سال قبل "پانی آیا . . . پانی آیا . . . پانی آیا . . ." نامی ایک زبردست افواہ اخباروں کی زینت بن چکی ہے۔ سرِشام جب زندگی کی ہما ہمی تیز تر تھی ایک افواہ' شہر میں پانی لے آئی۔ لوگ "پانی آیا . . . پانی آیا . . . کا نعرہ لگاتے اونچے مقامات کی طرف دوڑنے اور چڑھنے لگے۔ پوچھنے پر کہ "بھائی پانی کہاں ہے؟" ہر کوئی کہتا "میرا پیچھا کرتے آرہا ہے"۔ افواہ کے پیچھے ہم اور ہمارے پیچھے پانی کچھ کم آدھے گھنٹے تک دوڑتا رہا۔ اس مرحلہ کے بعد دوڑنے کے دوران چھوڑی ہوئی اشیا

کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا. جوتے اور چپلوں کو تو خیر کوئی ڈھونڈا نہیں. چند لوگوں کا اثاثہ ایسے گم ہوا کہ پھر ملا ہی نہیں ہمارے ایک شاعر دوست کی محبوبہ نے اسی پانی آیا . . . . پانی آیا . . . دوڑ میں شاعر صاحب کا ساتھ چھوڑا تھا جس کے فراق میں صاحب موصوف چار دو اوین کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔

ہم حیدرآبادی شہریوں نے افواہ کے ذریعہ طغیانی لانے پر قناعت نہیں کی، "افواہی زلزلہ" بھی لے آئے۔ شہر ہلنے لگا۔ مکانوں میں گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ مکانات سے باہر نکل پڑے کہ کہیں مکان ان پر گر نہ جائے۔ جب "افواہی زلزلہ" ختم ہو گیا تو پتہ چلا کہ گھروں سے کئی اشیاء غائب ہو چکی تھیں۔

افواہی طغیانی اور زلزلہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً ہمارے شہر میں کئی اور افواہیں اڑائی اور پھیلائی جاتی ہیں۔ کسی کے انتقال پر ملال کی خبر پھیلانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انتقال کی افواہ اتنی سنجیدگی کے ساتھ اُڑائی جاتی ہے کہ مرحوم و مغفور صاحب خود اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیں تب بھی انھیں مُردہ اور انھیں، ان کا بھوت سمجھا جائے گا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ افواہی انتقال کرنے والا شخص طویل عمر پاتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں اب تک خدا کے فضل و کرم سے ہمیں دو مرتبہ مار ڈالا گیا ہے۔ یہ حال تو جناب زندہ لوگوں کا ہے۔ ہمارے شہر میں افواہوں نے مردہ لوگوں کو زندہ کیا اور ان سے بات چیت کی ہے۔ کچھ عرصہ قبل کسی مرحوم کی قبر سے بات چیت کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ مرحوم نے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کی. بریانی کی فاتحہ دے کر دوستوں کو پیٹ بھر کھلانے کی وصیت کی۔ اس اطلاع کے عام ہوتے ہی قبر کے اطراف لوگوں کا مجمع لگنے لگا۔ لوگ اپنی مشکل اور تکلیف کا حل پوچھنے لگے۔ نذر و نیاز چڑھنے لگی۔ کچھ دن بعد پتہ چلا کہ قبر سے جو آواز آرہی تھی وہ ایک چوہے کی تھی۔ الغرض ہمارا شہر افواہوں کا گڑھ ہے۔ اس نقطہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید گڑھ کو اعراب کے ردّ و بدل کے ساتھ "گڑھ" کی اصطلاح چل نکلی تھی۔ ایک وقت تھا جسے دیکھئے گڑھ . . . گڑھ". کا نعرہ بلند کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔

افواہیں اور فسادات ایک سکّہ کے دو رخ ہیں۔ یہ کھوٹا سکّہ ہمارے شہر میں خوب چلتا ہے۔ جلوس پر پتھراؤ کی افواہ پھیلتی ہے۔ جلوس مشتعل ہو جاتے اور فساد بپا ہوتا ہے۔ یوں تو سال کے بارہ مہینے ہمارے شہر میں افواہیں جنم لیتی، پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہیں لیکن فسادات کا موسم افواہوں کے لئے زرخیز اور شباب کا موسم ہوتا ہے۔ ہمہ اقسام کی افواہیں جنم لیتی ہیں کہیں فائرنگ ہو رہی ہے کسی جگہ حملہ کا امکان ہے کہیں باہر سے لوگ آئے ہیں کہیں پولس کے مظالم غضب ڈھا رہے ہیں۔ افواہیں اس تیزی اور ٹھوس دلائل کے ساتھ جنم لیتی اور پھیلتی ہیں کہ ارباب اقتدار کو تردید کرتے نہیں بنتی پچھلے فسادات میں افواہیں پھیلانا ہمارے شہر میں قابل دست اندازی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر افواہوں کا حقیقت پسندانہ اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماضی میں افواہیں دروغ گوئی کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں۔ آج انھیں ہوشیاری اور چابکدستی سے شروع کرنا اور پھیلانا پڑتا ہے۔ افواہیں گڑھنا اور پھیلانا ایک آرٹ اور فن کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ ایسی افواہیں اُڑائی جاتی ہیں کہ تعریف کرتے نہیں بنتی۔ چند دن قبل ایک صاحب نے ہم سے کہا "آج امریکہ میں جو مشینی آدمی یا رابوٹ کی دھوم مچی ہوئی ہے وہ تو مرغ کی مخلوق ہیں۔ اڑن طشتریوں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے دس سال قبل اپنے ملک میں آئے تھے۔ ملازمت کے لئے منت سماجت کرتے رہے۔

ہمیشہ کی طرح ہم خواب غفلت میں رہے۔ مایوس ہوکر ان لوگوں نے یورپ کا رُخ کیا۔ میں نے محلہ والوں کی مخالفت کے باوجود دو زمانہ شیشی انسانوں کو رکھ لیا تھا لیکن تمہاری بھابی نے انھیں اتنا ستایا کہ انھیں یہاں سے بھاگ کر ہی چھٹکارا حاصل ہوا۔

تقریباً ہر بڑے واقعہ کے بعد کچھ ایسے ہی واقع کی افواہ اُڑائی جاتی ہے کسی کی ناگہانی موت کے بعد ایک یا دو اور لوگوں کو یقینی طور پر مار ڈالا جاتا ہے۔ اصل طوفان (جو دراصل سنی طوفان ہوتے ہیں) کے بعد نقلی طوفان آتے ہیں۔ ہمیں خوب یاد ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے دوران پڑوسیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ہم نے طوفانی بارش کے مضر اثرات پہ روشنی ڈالی تھی۔ کچھ ہی دیر میں بارش رُکنے کے افواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ شہر کی مشہور تاریخی عمارت زمین بوس ہوگئی۔ تالاب بہہ گیا وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر افواہوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ افواہوں کے بغیر زندگی کا رنگ پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں شوہر کے لئے افواہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنتی ہیں۔ یار دوستوں کی محفل سے لوٹنے کے بعد افواہ گڑھنی پڑتی ہے۔ سیاست میں افواہوں کے سہارے لیڈر اپنی دوکان چمکاتے ہیں۔ "غریبی ہٹاؤ" "بے روزگاری دور کرو" "قومی یکجہتی کو عام کرو" اور ایسے ہی کئی افوا ہی نعرے ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ انتخابات میں ہم نے اُسے زائد ووٹ دیئے جس نے سب سے زیادہ افواہیں اڑائیں اور ڈینگیں ماری ہیں۔ صحافت میں بھی افواہوں کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے لیکن یاد رہے کہ اکثر افواہوں کو باوثوق ذرائع کا نام دیا جاتا ہے۔

افواہوں سے بہت زیادہ فائدہ مزاح نگاری کو پہنچتا ہے۔ افواہوں اور مزاح نگاری میں چولی دامن کا رشتہ ہے یہی وجہ ہے کہ افواہوں کے شہر حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی بہتات ہے۔ انھیں شہرت بھی شاید اسی لئے حاصل ہوئی۔ افواہوں کے شہر میں مزاح نگاروں نے زندہ دلان کے نام سے انجمن بنائی، منفرد مزاحیہ رسالہ شگوفہ پابندی سے نکالا اور لوگوں کو مزاح کا اسیر بنالیا۔ کئی لوگوں کو مزاح نگاری پر اکسایا گیا۔ فائیلوں میں کھوئے ہوئے سنجیدہ افسران، طالب علموں کو ہڑتال پر اکسانے والے ٹیچر، مسیحائی کرتے والے ڈاکٹر، عمارتیں بنوانے والے انجینئیر غرض ہر کوئی قلی قطب شاہ کے شہر میں افواہوں سے متاثر ہوا اور مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا۔ اور اب تو جناب خدا نظر بد سے بچائے ہم اس وبا کو اپنے ہی شہر تک محدود رکھنا نہیں چاہتے ساری دنیا میں اسے وسعت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس ماہ عالمی جشن مزاح منایا جارہا ہے۔ ہم حصہ لینے والوں کا استقبال کرتے ہوئے نعرہ بلند کرتے ہیں شہر حیدرآباد زندہ باد، زندہ دلوں کا شہر پائندہ باد!

Vol. 18 Copy 2

SHUGOOFA Hyderabad-1

WORLD HUMOUR CONFERENCE ISSUE

Postal Regd. No. H/HD 5

February 1985 Phone : 567716

FTP U2-77

شگوفہ

MARCH 1985

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۱۸
شمارہ : ۳

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت :
بھارت چند کھنّہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

نمبر : مسیح جلیل

سرورق : میرا میر اللہ
(ماہنامہ مزاح کے نئے بنانے گئے پوسٹل کور کا ڈیزائن)

قیمت فی پرچہ : 3/- روپیے
زرِ سالانہ : تیس روپیے
عرب ممالک : ایک سو روپے
امریکہ و یورپ : ایک سو پچاس روپے

کتابت :
محمد عبدالرؤف

طباعت :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ :
شگوفہ ، اے اللہ ہاؤس، ... ،
معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد ۱ ...

فون آفس : 557718 فون مکان : 521054

(فہرست)

= قاضی جی ڈرامے (رپورتاژ)

عالمی جشن ظرافت ___ یوسف ناظم ___ ۷

حیدرآباد دکن میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس ___ عطاء الحق قاسمی ___ ۱۵

= مالِ مفت (انشائیے)

الہ دین کے جن کا زوال ___ عطاء الحق قاسمی ___ ۱۹

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ___ مسیح انجم ___ ۲۳

ادبی رسائل ___ شکیل اعجاز ___ ۲۹

سیل [illegible] نکا کر دیا ___ حلیمہ فردوس ___ ۳۷

دعوتیں [illegible] ___ عابدہ محبوب ___ ۴۳

کُتّے ___ علیم جہانگیر ___ ۴۵

= مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

شاباش اظہر میاں ___ عابد معز ___ ۴۷

= ادب کا جغرافیہ

بنگال کے چند مزاحیہ اخبارات و رسائل ___ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ___ ۵۳

چھوٹے۔ (منظومات):

رضا نقوی واہی ۱۸ | مصطفیٰ رحیم ۲۱ | پاگل عادل آبادی ۲۲

عبدالکریم ماہر ۲۲ | ظفر کمالی ۳۵ | بھائیز ناگپوری ۳۵

سرہٹ حیدرآبادی ۳۶ | اسرار جامعی ۳۶

= [illegible] ___ مراسلے ___ ۵۷

= [illegible] اگر نہ ہوا ___ اداریہ ___ ۵۸

یوسف ناظم

عالمی جشنِ مزاح

دُنیا کا نقشہ اسی دن سے بدلنا شروع ہو گیا تھا جس دن دنیا وجود میں آئی تھی۔ ہر لمحہ ہر لحظہ اس نقشے میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۸۵ء کے اوائل میں اس نقشے پر جس نام کا اضافہ ہوا ہے وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد ایک چھوٹی سی انجمن تھی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں اس کا آفس تھا۔ (اب بھی وہیں ہے)۔ یہ انجمن اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ وہ لوگ جو اپنے اپنے گھروں میں ہنس نہیں سکتے ہیں کہیں ملیں بیٹھیں اور ہنسیں۔ حیدرآباد کی 'زندہ طلسمات' کی طرح اس انجمن نے بھی رفتہ رفتہ اپنے قدم جمائے اور اب تو اس کے قدم کچھ اس طرح جم گئے ہیں کہ یہ انجمن زندہ دلانِ عالم بن گئی ہے۔ اس انجمن نے فروری ۱۹۸۵ء میں وہ کام کیا جو رُستم سے نہیں ہوا تھا۔ ہمیں ٹھیک سے معلوم نہیں ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کتنی ریاستیں ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی ریاست کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ہنسی کا اہتمام کرے اور ساری دُنیا کے لوگوں کو دعوت دے کہ آؤ بھائی تھوڑا ہنس لو۔ چاہے انگریزی میں یہ سوچا ہے جرمن میں لیکن ہندوستان کی ساری ریاستیں شاید ڈرتی ہیں کہ اگر لوگوں کو ہنسنے کیلئے بلایا گیا تو کہیں وہ ان ہی کاموں پر نہ ہنسنے لگیں جو ان کی ریاست میں ہوتے رہا۔ ان کا یہ خوف واجبی تھا۔ اور کسی دوسری ریاست میں ہنسنے کا بندوبست اس لئے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہاں کوئی زندہ دلان رہتے نہیں۔ زندہ دلان کی یہ ترکیب یعنی نام پنجاب کا عطیہ ہے لیکن چونکہ ان لوگوں نے اس نام کا ڈیکلریشن صرف اپنے نام نہیں لیا تھا اور نہ اس نام کو سرکاری محکمے میں درج رجسٹر کروایا تھا اس لئے یہ نام کچھ اور ریاستوں میں بھی استعمال ہوا (لیکن صرف نام) جسے برائے نام کہا جا سکتا ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد پچھلے کئی سالوں سے ہر سال اپنا ایک جلسہ بعد مشاعرہ مزید منعقد کرتے ہیں۔ یوں سمجھئے حیدرآباد میں دو نہیں تین عیدیں ہوتی ہیں۔ دو بمطابق احکامِ الٰہی اور ایک ادبی عید۔ اس ادبی عید کے موقع پر ہندوستان کے کونے کونے سے مزاح گو شاعروں کو بلایا جاتا ہے کہ تشریف لائیے اور مشاعرہ لوٹ کر لے جائیے (سلیمان خطیب کہا کرتے تھے سب سے اچھا شاعر سامعین ہوتے ہیں)۔ البتہ مقالہ نگار آگئے تھے تو کافی مشاعرہ لُٹ کر باہر چلا گیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نثر نگاروں کو بھی بلاتے ہیں کہ تشریف لائیے اور آپ بھی نثر کی اصلاح میں کچھ زور لگائیے۔ زحمتی جس سے

ہوتے تھے اور مشاعرے تو معرکے کے ہوتے تھے بٹتا ہے وقتِ واحد میں ۲۰-
مقابلہ رہتا تھا) یہ جلسے بے حد کامیاب ہوتے تھے اور گھر میں بھی کئی دن ہنستے پائے جاتے تھے بلکہ اکثر صورتوں
۲۵ ہزار کا مجمع ہو جاتا تھا. لوگ مشاعرے میں بھی ہنستے تھے - زندہ دلانِ حیدرآباد کا یہ سارا کام بزبان اردو
میں تو انھیں منع کرنا پڑتا تھا کہ بچے ہوم ورک کر رہے ہیں اب مت ہنسو۔ کیلی گرافی کا مظاہرہ کرتے تھے کہیں
انجام پاتا تھا. حتیٰ کہ لوگ ہنستے بھی تھے تو اردو رسم الخط میں ہنستے تھے اور ہنسی میں بھی
قوسِ قزح بن رہی ہے تو کہیں کہکشاں. کوئی خط نسخ میں محوِ تبسم ہے تو کسی کی مسکراہٹ نستعلیق ... لیکن اس مرتبہ
پتہ نہیں زندہ دلانِ حیدرآباد کے دل میں (یا شاید دماغ میں) یہ خیال کیسے آگیا کہ اس مرتبہ اس ہنسنے کے عمل کو بین الاقوامی
شکل دینی چاہیئے ـــ ہندوستان میں پچھلے دو چار سال میں جو عالمی تقاریب ہوئیں جیسے کہ ایشیاڈ - (جس کی بھی
کچھ بسیں اب بھی چلتی ہیں)، فلم فیسٹول یا ناوابستہ ممالک کی کانفرنس. بس ان تقاریب نے زندہ دلانِ حیدرآباد کو میونسپل
سطح سے عالمی سطح پر پہنچادیا. عالمی جشنِ مزاح کا مضمون غالباً انھیں جلسوں کی بنا پر خیال میں آیا ـــ اگر ہم خود اس
عالمی جشنِ مزاح میں شریک نہ ہوتے تو یہی سمجھتے کہ یہ بھی ایک لطیفہ ہے لیکن ۸ فروری کی صبح کو جب ہم اپنے حیدرآباد پہنچے
تو پتہ چلا کہ یہاں تو سبھی ہنسنے پر کمربستہ ہیں۔ ہماری وہ ٹرین جس میں ہم سفر کر رہے تھے ذرا دیر سے پہنچی تھی اور نا پلی
اسٹیشن پر یہ پہنچی بھی تو غلط پلیٹ فارم پر پہنچی۔ (ظ. انصاری ساتھ تھے) اسٹیشن پر لینے بھی کوئی نہیں آیا. ظ انصاری
کی سمجھ میں نہیں آیا کہ غصہ کس پر اتاریں اس لئے انھوں نے صرف عینک اتار کر جیب میں رکھ لی. جوں توں کر کے فتح میدان
کلب پہنچے تو وہاں ابھی کسی کی آنکھ ہی نہیں کھلی تھی. بڑی مشکل سے کھلوائی۔ آنکھ کیا کھلی درِ فتنہ باز ہو گیا. بتایا گیا یہاں
ہم نہیں ٹھہر سکتے۔ (ایسا مردم شناس اسٹاف شاید ہی کسی دوسرے کلب کو نصیب ہوا ہو)۔ عارضیتاً ایک کمرے میں
سامان رکھنے کی اجازت ملی. کمرے کا کھلنا تھا کہ ظ انصاری باتھ روم میں داخل ہو گئے اور پھر بڑی منت سماجت کے بعد
واپس ہوئے (صرف ڈیڑھ گھنٹہ اندر رہے) اور ہم ساتھ ہی رویندرا بھارتی ہال پہنچے. رویندرا بھارتی ہال جنھوں نے
دیکھا ہے اُن سے تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن جنھوں نے نہیں دیکھا ہے انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر اس میں صدر دروازے
سے داخل ہوں تو کافی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں اور اگر بائیں سمت سے داخل ہوں تو سیڑھیاں نہیں چڑھنی پڑتیں (دائیں
بازو والے ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں) بہت وسیع ہال ہے۔ بہت تو نہیں لیکن کافی خوبصورت ہے. یعنی قبول صورت
ہے اور میک اپ کے بعد تو اس کا حسن نکھر آتا ہے۔ اس دن تو اس پر غضب کی چھبن تھی. سیڑھیوں پر سُرخ بانات بچھا
دی گئی تھی. پولس کا وہ زبردست انتظام تھا کہ میں ڈر گیا کہ لوگ اس بندوبست میں ہنسیں گے کیسے. کہیں کہیں تو بندوقیں
بھی نظر آئیں ـــ اِن کے گھوڑے بھی چڑھے ہوئے تھے ـــ پولس افسروں کی وردی میں سب سے زیادہ نمایاں چیز
پستول تھی. یہ سارے انتظامات اس لیئے تھے کہ اس عالمی جشنِ مزاح کا افتتاح ہماری پارلیمان کے اسپیکر بلرام جھکر
انجام دینے والے تھے. موجودہ پارلیمان کے افتتاح کے موقعہ پر ہم نے بالارام جھکر کو ٹی وی پر دیکھا تھا (یوں تو اس
سے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اس دن کی بات اور تھی) وہ سارے جلوس پر چھائے ہوئے تھے. ایک تو خود طبعاً ...

آواز آئی لیکن یہ ہنسی شوہر کی تھی۔ یہ مائم شو واقعی بہت اچھا تھا۔ مزاح کی اتنی قسمیں ہیں اور انھیں یکجا کیا جاسکتا ہے اس کا علم مجھے نہیں تھا۔ یہ تو بالکل موسیقی کی طرح کی بات ہوگئی۔ آواز کی موسیقی، ساز کی موسیقی، الفاظ کی موسیقی، حرکات کی موسیقی، اس عالمی جشن مزاح میں کارٹون نمائش بھی تھی اور اہلِ ذوق بس چلے ہی آرہے تھے جیسے انھیں کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے۔ میریو مرانڈا بھی موجود تھے۔ جو چند لمحوں میں اپنے کارٹون بنا کر بطورِ آٹوگراف دے رہے تھے۔ کاش مزاح نگاروں کے دستخط بھی اتنے حسین و جمیل ہوتے۔ لیکن شکایت اس لئے نہیں کرنی چاہیئے کہ بعض کے دستخط بھی کچھ اس وضع کے ہوتے ہیں کہ میریو مرانڈا کے کارٹون معلوم ہوتے ہیں۔

اب ذرا اردو کی باتیں ہو جائیں۔ ۹ فروری کو دن میں ڈھائی بجے اردو ہال میں 'عصری مزاح' پر ایک سمپوزیم تھا۔ یہاں بھی ہال کی وہی کیفیت تھی جو رویندرا بھارتی ہال کی تھی۔ کھچا کھچ تو نہیں لیکن کافی بھرا ہوا تھا۔ (یہ کوئی ہمہ لسانی مجمع تھا بھی نہیں۔ صرف اہل اردو کا مجمع تھا اور وہ بھی ان لوگوں کا جنھیں تنقید سے دلچسپی تھی) گوپی چند نارنگ نے صدارت کی اور ظ انصاری نے نثری مزاح اور سلیمان اطہر جاوید نے شعری مزاح پر مقالے پڑھے۔ تنقید پر تنقید کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی لیکن سچ پوچھیے تو تنقید نگار، مزاح نگاروں کا لحاظ کر گئے۔ سلیمان اطہر جاوید کا مقالہ تو بالکل توصیفی تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں ڈر ہے کہ اگر انہوں نے سب کی تعریف نہیں کی تو انھیں واپس جانے نہیں دیا جائے گا یا اگر واپس جانے دیا گیا تو کرایہ نہیں دیا جائے گا۔ سری نواس لاہوٹی، ڈاکٹر حامد حسین، اور شاید کسی اور نے کچھ کہا بھی۔ ظ انصاری کے مقالے پر بھی بحثیں ہوئیں (جو ہمیشہ ہی ہوتی ہیں) عزیز قیسی، لاہوٹی، یوسف ناظم، یوسف آعظمی، انور معظم اور عاتق شاہ تھے جس کے جو جی میں آیا کہا۔ کسی نے کہا ہاں کسی نے کہا نا۔ یوسف ناظم نے البتہ جب یہ کہا کہ ظ انصاری کو اپنے مقالے سے زیادہ اقتباسات پر داد ملی تو تالیاں بجیں اور ظ انصاری بھی مسکرائے۔ صدر جلسہ نے بھی مفصل تقریر کی اور ظرافت کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی مزاح نگاروں کے اقتباسات سنائے اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ بحث میں گرمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ (سمپوزیم میں یہ تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ پھر سمپوزیم کا فائدہ کیا ہے) حاضرین محفل چونکہ درمیان سے اٹھے نہیں اس لئے سمجھنا چاہیئے سمپوزیم کامیاب رہا۔ یہ اتنا لمبا کھینچا کہ نثری اجلاس کے سامعین رویندرا بھارتی ہال میں بیٹھے سوکھتے رہے۔ اردو ہال اور رویندرا بھارتی ہال میں فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن فاصلہ تو ہے جو طے کرنا پڑتا ہے۔ سامعین، حاضرین، مقررین بھاگے بھاگے وہاں پہنچے تو جلسہ تیار ملا۔

حیدرآباد میں نثر کا اجلاس ہمیشہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے ہوا یا نہ ہو، سامعین کے اعتبار سے تو ہوتا ہی ہے۔ نثری اجلاس کی صدارت، اردو کے قدآور شاعر ضمیر جعفری نے کی۔ مجتبیٰ حسین نے نظامت کی۔ مضامین پڑھنے والوں میں حبیب ضیاء، مسیح انجم، پروین یداللہ مہدی، شفیقہ فرحت، رشید قریشی، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، یوسف ناظم، کے علاوہ پاکستانی مزاح نگار عطاالحق قاسمی بھی تھے۔ یہ اجلاس بھی کوئی ڈھائی گھنٹے تک چلتا رہا۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے سفرنامے کا ایک باب سنایا جس میں بکثرت حیدرآبادیوں کا ذکر تھا۔ محفل زعفران زار

ہوگئی۔ (خاص طور پر اس وقت جب کنول پرشاد کا ذکر آیا) ضمیر جعفری نے مشاعروں کا حال سُنایا اور شاعروں کی کیفیت بیان کی جو بہت پسند کی گئی۔

۱۰ فروری کو صبح دس بجے رویندرا بھارتی میں محفل تہنیت برپا ہوئی۔ نظامت کے فرائض اور نوافل انجام دیئے تبسم نے یہ اسی دن صبح وہاں پہنچی تھیں اور لوگ چشم براہ تھے۔ لطیفے کون سُننا نہیں چاہتا۔ لوگ ٹکٹ خرید کر لطیفے سننے آئے تھے۔ یہ ہمہ لسانی مقابلہ تھا۔ بیرونی ممالک سے جو لوگ آئے تھے اُن میں سے اکثر کے ساتھ ایک مترجم موجود تھا (تھی بھی) کچھ لوگ لطیفے لکھ کر بھی لائے تھے۔ خواتین بھی تھیں اور کچھ بچے بھی۔ سامعین ٹیپ ریکارڈ ساتھ لائے تھے (کسی چیز کی کوئی ممانعت نہیں تھی)۔ لطیفہ گو حضرات و خواتین کی تعداد دیکھ کر منتظمین جلسہ نے ہر شخص کیلئے صرف دو لطیفے سنانے کا کوٹا مقرر کیا۔ اس کا انتقام بہتوں نے اس طرح لیا کہ ان کا ایک لطیفہ ہی دس لطیفوں کے برابر وسیع و فراخ تھا۔ ایک لطیفہ ہمیں بھی پسند آیا۔ مقرر نے بیان کیا کہ وہ ایک جگہ تقریر کر رہے تھے کہ کہیں سے یہ آواز آئی کہ صاف سنائی نہیں دے رہا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر درست کرنے والے شخص نے اسٹیج پر آکر کچھ ٹھوک پیٹ کی اور مائکروفون ٹھیک ہوگیا۔ مقرر نے اس سے پوچھا کیا ہوا تھا۔ جواب ملا کچھ نہیں اسپیکر کا ایک اسکرو ڈھیلا ہوگیا تھا۔ رویندرا بھارتی کی چھت اُڑتے اُڑتے بچی۔ تبسم شاید پہلی مرتبہ حیدرآباد گئی تھیں اس لئے لوگوں نے انھیں بہت غور سے دیکھا اور سُنا اور انھوں نے بھی اپنی مہارت کا سکہ جمایا۔ (سکے سے مُراد ایک روپے اور دو روپے کے وہ نوٹ نہیں ہیں جو ریزرو بنک انھیں خرچ کرنے کیلئے دیتا ہے اور انھیں واپس لینا بھول جاتا ہے۔ یہ نوٹ بھی تو سستے لطیفوں کی طرح ناگواری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوٹ دینے والا شرمندہ اور لینے والا ناراض۔ ہم تو ڈرتے ہیں ان نوٹوں کی وجہ سے کہیں کوئی فساد نہ ہو جائے)

۱۱ فروری کو رات میں فتح میدان کلب کے نٹ بال اسٹیڈیم پر اردو ہندی کا ملا جلا مشاعرہ تھا۔ (ہمیں اسے نظم و نثر کا مشاعرہ کہنا ہوگا) ہندی کا شاعر بہت بے باک ہے اور فقروں میں ایسی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جو اردو کے شاعروں کی زبان سے نہیں ہوسکتیں۔ اردو شاعری میں صرف طنز نہیں رمز بھی درکار ہے جب کہ ہندی شاعری میں سیاسی موضوعات کو برتنے میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ اپنا اپنا رویہ ہے۔ سامعین کے لیے بہرحال یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ حکومت اور پولیس کے خلاف اسٹیج پر کھڑے رہ کر باواز بلند فقرے کہے جائیں تو سامعین کا خوش ہونا ضروری تھا ہے۔ اس مشاعرے کی نظامت بھی دو کرتے تھے یعنی سردار کنور مہندر سنگھ بیدی اور مرلیدھر شرما جی۔ دونوں نے مشاعرے کو بخوبی سنبھالا ڈھائی بجے رات تک پہنچایا۔ آندھرا پردیش کے گورنر شنکر دیال شرما نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور خالص حیدرآبادی زبان میں تقریر کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگاں بہت خوش ہوئے۔ جلسہ گاہ کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور پنڈال ... [illegible] ... اس کام کے لئے بھی ماہرین فن کو کہیں نہ کہیں سے بلایا گیا ہے۔ خوبصورت اسٹیج ... کی ... ایک محفل ... [illegible] ... دی جا سکتی تھی۔ نواب شاہ عالم خان نے مشاعرے کی صدارت ... [illegible] ... دل ہی دل میں ... [illegible] ...

لفافہ ہے۔ کاش اس پہ زندہ دلانِ حیدرآباد اردو میں بھی چھپا ہوتا۔ محکمہ ڈاک سے تو اردو بالکلیہ خارج ہوگئی ہے۔ اردو کو دوبارہ وہاں بھیجنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد نے اتنے لوگوں کو پانچ دن گھمایا، پھرایا، کھلایا، پلایا۔ اور ان سب پہ مستزاد ہنسایا۔ اس کا اجر انھیں ضرور ملے گا۔ (بشرطیکہ ورلڈ ہیومر آرگنائزیشن اس بات کو فراموش نہ کرے کہ یہ درخت کس بیج سے پیدا ہوا ہے)

پس نوشت: یہ کوئی صاحب اسے مضمون نہ سمجھیں۔ یہ تو صرف اندراجات (نوٹس) ہیں ■■

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں!

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپے
دھرتی کے بول	سرپٹ حیدرآبادی	〃	۸ 〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ 〃
بہرحال	〃	مضامین	۷ 〃
بالآخر	〃	〃	۱۲ 〃
تکلف برطرف	〃	〃	۱۴ 〃
قطع کلام	〃	〃	۱۲ 〃
البتہ	یوسف ناظم	〃	۱۰ 〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸ 〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۰ 〃
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۲ 〃
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲ 〃
مابین مابین قش	پروفیسر یزید اللہ بیدی	〃	۱۵ 〃
چنانچہ	مسیح انجم	〃	۱۲ 〃
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	〃	۱۲ 〃
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	〃	۱۰ 〃
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۱ 〃

عطاالحق قاسمی (پاکستان)

حیدرآباد دکن میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس

بھارت یاترا کے حوالے سے ہم اپنا تفصیلی رپورتاژ تو اپنے اخبار کے جمعہ میگزین میں قسط وار لکھیں گے، مگر دو چار تاثراتی کالم تو ہیں۔ بہرحال ان صفحات میں لکھتے ہیں کیوں کہ اس دفعہ ہم نے بھارت کو قدرے تفصیل سے دیکھا ہے۔ پہلے دو دفعہ تو ہم دہلی، لکھنؤ، امرتسر، چنڈی گڑھ، انبالہ اور سہارن پور وغیرہ تک گئے تھے مگر اب کے ہماری مار جنوبی بھارت تک تھی۔ یعنی ہمیں راما راؤ کا آندھرا پردیش دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس کے علاوہ ہم بمبئی کے ساحلوں تک بھی پہنچے تاہم آج کے کالم میں خود کو حیدرآباد دکن تک محدود رکھیں گے۔ جہاں ۸ فروری سے ۱۲ فروری تک عالمی طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس گزشتہ کچھ برسوں سے زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہو رہی ہے۔ مگر اس دفعہ کانفرنس کا دائرہ وسیع کر کے اسے بین الاقوامی سطح پر منعقد کیا گیا۔ جس کے لئے زندہ دلان حیدرآباد نے حکومت ہند کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ دوسرے ملکوں سے آنے والے وفود کی میزبانی کے فرائض بھارتی حکومت نے انجام دیئے۔

اب ایک سچی بات ہم آپ کو کالم کے شروع میں بتا دیں کہ جب سید ضمیر جعفری اور راقم الحروف اس کانفرنس میں شرکت کے لئے بھارت روانہ ہوئے تو ہم نے اس کانفرنس کو بھی اسی طرح کی "بین الاقوامی" کانفرنس سمجھا تھا۔ جس طرح کا بین الاقوامی مشاعرہ اپنے برادرم غضنفر مہدی اسلام آباد میں منعقد کراتے ہیں مگر یہ بھید تو وہاں جا کر کھلا کہ یہ تو سچ مچ کی عالمی کانفرنس ہے اور اس میں بھارت کی تمام زبانوں کے مزاح نگار بھی شریک ہیں مزید یقین اس وقت آیا جب ہم نے اسٹیج پر پاکستان سمیت چودہ ملکوں کے پرچم لہراتے دیکھے اور اسٹیج پر جلوہ گر دیکھے ان ملکوں کی نمائندگی کرنے والے امریکی، روسی، جرمن، جاپانی، مصری، بلغارین، بنگلہ دیشی، ساؤتھ کوریَن اور دوسرے ملکوں کے مزاح نگاروں کو براجمان دیکھا۔ کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں بھارتی ٹیلی ویژن، ریڈیو اور بھارت میں شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات نے کانفرنس کی مکمل کوریج کی۔ وہاں بیرونی خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے بھی یہاں موجود تھے۔ چنانچہ بی بی سی نے اس عالمی مزاح کانفرنس کے حوالے سے آدھ گھنٹے کا پروگرام نشر کیا۔ بھارت کے محکمہ ڈاک نے اس موقع پر خصوصی ٹکٹ جاری کئے جن پر چارلی چپلن کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

رضا نقوی واہی

بچارے دَل بدل
(دل بدلی مخالف قانون پاس ہو جانے کے بعد)

○

وقت پر سمجھے نہ موسم کے اشارے دل بدل　　پڑ گئے طوفان کی زد میں بچارے دل بدل

جس طرح دُم دار تارے ہوں نحوست کے سفیر　　تھے سیاست کے اُفق پر یونہی سارے دل بدل

کودتے پھرتے تھے وہ اس ڈال سے اُس پات پر　　فطرتاً تھے ڈارون زادے ہمارے دل بدل

رَوندکر اپنا ہی دَل، جُے پال کے ہاتھی بنے　　مارتے رہتے تھے شبخوں پہ نیارے دل بدل

آن ذرا سی منفعت کو رکھ کے اپنے سامنے　　راج نیتی کے بدل دیتے تھے دھارے دل بدل

چل رہا تھا ملک میں دو نمبری یہ کاروبار　　رات دن تھے منہمک اس میں ہمارے دل بدل

دفعتاً آئین میں ترمیم ہو جانے کے بعد
سر کے بل پاتال کی جانب سدھارے دل بدل

جڑ ہی نخلِ آرزو کی کٹ گئی اک وار میں　　ہو گئے محتاجِ سایہ بیچارے دل بدل

جب سے نسبندی کی دھارا ان پہ لاگو ہو گئی　　جنس ہی تبدیل کر بیٹھے بچارے دل بدل

خواجگی کا شوق تھا، خواجہ سرا بننا پڑا　　اب دکھلائیں گے فن کے نظارے دل بدل

اب کہاں وہ پھر سے اُڑنا رخ ہوا کا دیکھ کر　　آج ہیں بے بال و پر سارے کے سارے دل بدل

ناگہاں ساری چراگاہوں میں تالے لگ گئے　　گھاس چرنے اب کہاں جائیں بچارے دل بدل

حال یہ ہے کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو
سر جھکائے پھر رہے ہیں مارے مارے دل بدل

○

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

الٰہ دین کے جن کا زوال*

الٰہ دین کا چراغ نسل در نسل ہوتا ہوا جب الٰہ دین ہفتم کے ہاتھ آیا (جو ایک سیدھا سادہ انسان تھا) تو اُس نے باپ کی وفات کے اگلے ہی روز چراغ زمین پر رگڑا جس سے فضا میں دھواں پھیل گیا اور پھر اس دھوئیں میں سے ان کا خاندانی جن خوفناک قہقہے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے تھے اور قد آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ جب یہ دھواں چھٹا اور اس قوی ہیکل جن کی دہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی "کیا حکم ہے میرے آقا" ؟ تو الٰہ دین ہفتم نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کہا: "ذرا دوڑ کر نکڑ والی دُکان سے میرے لئے ایک سادہ پان لاؤ"۔ جن کو اپنے نئے باس کے اس حکم کی تعمیل میں بڑی شرم محسوس ہوئی مگر اس نے تعمیل کی اور دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الٰہ دین نے اسے حکم کا منتظر پایا تو کہا "میں نہانا چاہتا ہوں، بالٹی اٹھاؤ اور سرکاری نلکے سے پانی بھر کر اسے صحن میں رکھ دو"۔ جن کو اگرچہ ایک بار پھر بڑی سبکی محسوس ہوئی مگر اس نے "جو حکم میرے آقا" کہا اور غائب ہو گیا! نہانے سے فراغت پا کر الٰہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی، فضا دھوئیں سے بھر گئی اور پھر خوفناک قہقہے لگاتا ہوا جن نمودار ہوا۔ اس نے جھک کر کہا "کیا حکم میرے آقا"؟ الٰہ دین نے کہا "بازار سے سبزی وغیرہ لے کر آؤ اور میرے لئے جلدی سے کھانا تیار کرو، بڑی بھوک لگی ہے"۔ یہ سن کر جن بہت شرمندہ ہوا اور گردن جھکا کر بازار کی طرف چل پڑا۔ کھانا وغیرہ کھا کر الٰہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر جن ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الٰہ دین نے حکم دیا کہ ہمسایوں سے تھوڑی سی پتی مانگ کر لاؤ اور چائے بناؤ۔ یہ سن کر پسینے کے قطرے جن کی پیشانی پر نمودار ہوئے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے اور بادل نخواستہ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ دن، مہینے اور سال گزرتے گئے اور وہ اپنے آقا کی خدمت میں اسی طرح مشغول رہا۔

---

* یہ عنوان [illegible]

غزل ــ پاگل عادل آبادی

نت نیا انقلاب آیا ہے کیا زمانہ خراب آیا ہے
ہاتھ قاصد کے کٹ کے آئے ہیں میرے خط کا جواب آیا ہے
کاٹ کر جیب اپنے سسرے کی رومیو کامیاب آیا ہے
اس طرح آپ کیوں اکڑتے ہیں جانتا ہوں شباب آیا ہے
میہماں میرے گھر جو آئے ہیں زندگی میں عذاب آیا ہے
آج پہلی ہے گھر کی دہلیز پہ لے کے بنیا حساب آیا ہے
لیلی بھوکی ہے اپنی محمل میں پی کے مجنوں شراب آیا ہے

خوب آنکھوں کو سینک لو پاگل
آج وہ بے نقاب آیا ہے

لیڈر اور ووٹر ــ محمد عبدالکریم ماہر

ایک لیڈر کہہ رہا تھا پارٹی میٹنگ میں مرحلہ نازک ہے بدلو اپنا ماٹو بھائیو
ووٹروں کے ہاتھ چومو بڑھ کے لو ان کے قدم تا الکشن عاجزی سے یوں ہی کاٹو بھائیو
چھوڑ دو ساری اکڑ فوں ان پہ غراؤ نہیں ان کو بھولے سے نہ بھونکو اور نہ کاٹو بھائیو
شام ہی سے ان کے اک اک در کی دربانی کرو صبح اٹھ کر روز تلوے ان کے چاٹو بھائیو

اتفاقاً سن کے یہ سب ایک ووٹر نے کہا مفت میں بھی کسی کا یوں نہ چاٹو بھائیو
مرغ روٹی کھاؤ تم گھی میں ہوں پانچوں انگلیاں مجھ کو ملتے بھی نہیں آلو ٹماٹو بھائیو
پیٹ میرا بن رہا ہے بھوک سے اندھا کنواں مر رہا ہوں پہلے اس خندق کو پاٹو بھائیو
ڈال دو چپکے سے میری جیب میں سو سو کے نوٹ کوئی گھر بھی نام پر میرے الاٹو بھائیو
دن الکشن صاحب آئے میں ضرور آجاؤں گا بھیجنا اس روز میرے گھر پہ آٹو بھائیو

ووٹ میں دیتا رہوں گا ایک ہی کو عمر بھر
میں نہیں بدلوں گا چاہے دل بھی بدلو تم اگر

مسیح انجم

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

حضرات! حمایت بھائی کے قدکو اور لمبا کرنے کئی خوبیوں کے حامل ہیں۔ اُن میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری ذات میں پوشیدہ صلاحیتوں کو تلاش کیا کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی ادبی میدان یا گنڈیاڑھا ہماری پوشیدہ صلاحیتوں کے عین مطابق میل کھاتا نظر آتا ہے تو وہ فوراً ہمیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔ بڑھا کیا دیتے ہیں، بلکہ ڈھکیل دیتے ہیں۔ ایک بار انھیں ہماری ذات میں ایک تلگو پنڈت بیٹھا نظر آیا۔ ہماری تلگو دانی کا امتحان لینے کے لئے ایک چھوٹی سی دُکان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "اُس دُکان والی سے تلگو میں پوچھو تو سہی کہ انڈے ہیں؟" —— ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ! اپنی تلگو دانی کا رعب جمانے کے لئے دُکان میں بیٹھی ہوئی سیٹھانی سے پوچھا:

"ఏ అమ్మా! మీ వద్ద కోడి గుడ్లు దొరుకుతాయా!?"

(اے ماں جی! کیا آپ کے پاس انڈے ملتے ہیں!؟)

سیٹھانی نے غصے کے عالم میں، مارنے کے لئے باٹ اُٹھاتے ہوئے پوپلے مُنہ سے کہا:

کیوں رے جاتا نہیں یہاں سے! تیرے مُنہ میں مٹی پڑو! کیا تجھے ہماری دکان میں انڈے نظر آرہے ہیں، داڑھیال؟

ہم تو ویجیٹیرین ہیں "ویجیٹیرین"!

وہ تو اچھا ہوا کہ ہم فوراً ایک گلی میں بھاگ گئے۔ ورنہ فساد کی بنیاد کے لئے تو "ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین" کا مسئلہ پہلے ہی چھا تھا۔ صرف نعرہ بلند ہونے کی دیر تھی!

پھر یوں ہوا کہ کافی طویل عرصے کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے موقع پر حمایت بھائی کو ہماری ذات میں ایک کمپیئر چھپا نظر آیا۔ حسب عادت فوراً ہمیں آگے بڑھا دیا۔ یعنی ڈھکیل دیا۔ ہم یہ سوچ کر خاموش ہو رہے کہ ہمارے شہر کی روایت کے مطابق یہی موقع ہے ہمارے کرتب دکھانے کے لئے یا ہمارے [illegible] کی فرد اُٹھے، [illegible] لیپر ہمارے رعب پر گئی۔ ہم تو یہی دیکھتے آئے ہیں کہ کل ہند مشاعرہ کے موقع پر جب ہم [illegible]

پر غور کرتے رہے۔ ہم نے اپنے ایک شاعر دوست سے یہ سن رکھا تھا کہ آواز کو بٹھانے کے لئے مشروبات سے زیادہ موزوں کوئی اور شئے دریافت نہیں ہوئی ہے۔ جس شاعر سے ہم نے مشروب والی بات سنی تھی وہ ایک متشرع قسم کے شاعر ہیں اور شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ البتہ مشاعرہ کے روز جب ان کے شاعر دوست یک گونہ بے خودی کو پانے کے لئے بادہ نوشی کا سہارا لیتے ہیں تو ہمارے شاعر دوست "FOR THE SAKE OF COMPANY" لمکا سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اسی مشروب سے استفادہ کرنے کی غرض سے بازار سے "لمکا" منگوایا۔ اور بیوی کو حکم دیا کہ وہ فوراً ڈبل چھالیہ اور پودینہ کا ایک پان بنادے۔ بیوی نے ان غیر شاعرانہ حرکتوں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا: "گھر بیٹھے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا "ذرا آواز کو بٹھا رہا ہوں!"

محترمہ نے فرمایا "ہائے ہائے! اس عمر میں آواز کو کیوں بٹھاتے ہو؟ اب آپ کے پاس یہی ایک چیز تو کھڑی ہوئی ہے اگر یہی آواز بھی بیٹھ جائے تو پھر مجھ پر اور بچّوں پر کس طرح بھونک سکیں گے۔ اگر آواز کو بٹھانا ہی ہے تو کورے گھڑے کا پانی پیجئے۔ آواز بھی بیٹھ جائے گی اور گھر میں نیا گھڑا بھی آجائے گا!"

ہم بیوی کے اس ملٹی پرپز (Multipurpose) مشورے پر دھیان دیئے بغیر "لہرا کے پی گیا" کے مصداق غٹاغٹ لمکا پی گئے۔ اور پھر بیوی کے مبارک ہاتھوں سے بنی گلوری چبائی۔ بس یہیں سے ہماری تباہی کے آثار شروع ہوگئے۔ ہم نے بیوی کو ڈبل چھالیہ اور پودینہ کے پان کا حکم دیا تھا۔ لیکن نیک بخت نے ڈبل چھالیہ کے ساتھ پودینہ بھی ڈبل کر دیا تھا۔ یہ تو پان کھانے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جب پان میں پودینہ کی مقدار ڈبل ہو جاتی ہے تو منہ میں کس غضب کی ٹھنڈی آگ لگ جاتی ہے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے حلق میں برفیلی ماؤنٹ ایورسٹ آکر بیٹھ گئی ہے اور چاروں طرف ایر کولر (AIR COOLER) کھل گئے ہیں۔ ہم نے بیوی کو ڈانٹنے کے لئے منہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہوا کا ایک لپکا حلق میں گھس گیا اور فوراً ہمارا منہ بند کر گیا تب ہم نے منہ کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھ کر سانس کے سارے نظام کو ناک کے نتھنوں سے رجوع کیا جو پچھلے کئی دنوں سے کوئی خاص کام انجام نہیں دے رہے تھے یا یوں کہیئے کہ سرکاری ملازمین بن گئے تھے۔ خدا خدا کر کے جب آدھا گھنٹہ گزر گیا اور حلق میں ماؤنٹ ایورسٹ کی برف پگھل گئی تو جلسہ کی کمپیرنگ کا خیال آیا۔ آواز کے امتحان کے لئے فلمی گانے کا یہ ٹکڑا گنگنایا:

یہاں کون ہے تیرا، مسافر تو جائے گا کہاں؟

تب ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کھلونے بیچنے والا بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے گھوڑے کے بال اور مٹی کی کٹوری سے بنا کھلونا گرگرا "بھرا رہا ہو ـــــ "غائیں، غائیں! غائیں، غائیں!" اس "بھربھری" آواز کو سن کر ہمیں سخت تشویش ہوئی کیونکہ آواز ہمارے منشاء کے مطابق نہیں "بیٹھی" تھی۔ بلکہ منشاء الرحمٰن منشاء کے مطابق بیٹھ گئی تھی۔

چنانچہ ہم اسی بھرائی ہوئی آواز کو لیے جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ ڈھارس بندھی ہوئی تھی کہ ادبی اجلاس کا معاملہ ہے سامعین کی تعداد شعراء پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ہم سے ضرور تعاون فرمائیں گے۔

پروگرام کے مطابق منتظر صاحب کی افتتاحیہ تقریر کے بعد ہمیں مائک پر نمودار ہونا تھا۔ ہم اسٹیج پر مزاج [illegible]

ساتھ بیٹھے آگے پیش آنے والے امکانی خطرات اوران کے سدباب کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ منسٹر صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر کا آغاز کب کیا؟ اور تقریر کب ختم کی؟ ان کی تقریر کے بعد از روئے پروگرام، ہمیں مائک سنبھال کر ادبی اجلاس کی کارروائی کا آغاز کرنا تھا لیکن منسٹر صاحب نے اپنی تقریر ختم کرتے ہی، اچانک ایک مضمون سنانا شروع کر دیا جس کا ہمارے فلسفے میں کہیں ذکر نہ تھا۔ یہ ہمارے حق میں تباہی کا مطلع ثابت ہوا۔ کیوں کہ ادبی اجلاس کا باضابطہ آغاز ہو چکا تھا۔ اور ہماری تعارفی تقریر جو چار صفحات پر مشتمل تھی، اور جس میں بڑے دلچسپ انداز میں مزاح نگاروں کا تعارف کروایا گیا تھا، اور جس کے لئے ہم نے اپنی ساری توانائی صرف کر دی تھی، بے مصرف کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ منسٹر صاحب کے رخصت ہونے کے بعد کارروائی کا آغاز کہاں سے کریں؟ (تقریر لوٹ کر کے پڑھنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے) جوں جوں منسٹر صاحب اپنے مضمون کے اختتام کی جانب بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ہم میں اختلاجی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہماری خود اعتمادی بھی "رخصتی گیت" "چھوڑ بابل کا گھر" گانے لگی تھی۔ اتنے میں وزیر باتدبیر نے اپنا مضمون ختم کیا اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں رخصت ہوئے۔ اور جاتے جاتے ہماری خود اعتمادی اور دو عدد لطیفے بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہاں ہم کیوں نہ اس بات کی نشاندہی کر دیں کہ وہ منسٹر صاحب وہی تھے جو ہماری اسمبلی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اسمبلی میں اچانک بے ہوش ہو گئے تھے۔ اُس وقت تو وہ ناسازئ مزاج کی وجہ سے بیہوش ہو گئے تھے لیکن اب ہمارے ہوش و حواس کے ساتھ بے ہوش ہونے کی ہماری باری آگئی تھی۔ کیوں کہ ہماری تعارفی تقریر اور دو عدد لطیفوں کے بے مصرف ہو جانے کے بعد ہمارے پاس آئیٹم بچا ہی کیا تھا جو ہمارے کام آتا۔ خاتمے کے اعلان کے ساتھ ہی ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہمارا بشرٹ پکڑ کر کھینچا۔ ہم سمجھے کہ شاید کرسی نے ہمارے بشرٹ کو پیچھے سے پکڑ لیا ہے اور وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ آنا چاہتی ہے "تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا جیسے پتنگ پیچھے ڈور"۔ ہم نے گھوم کر جو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ حرکت ایک مزاح نگار نے کی تھی۔ ہم نے غصیلی نظروں سے اُن کی جانب دیکھا تو ان کی نظروں میں التجا نظر آئی کہا "مجھے پہلے پڑھا دو! لال ٹیکری جانا ہے"۔ اُن کی عجلت اور ہماری ہیبت میں، ہمیں لال ٹیکری جانا ہے کی بجائے لیٹرین جانا ہے" سنائی دیا۔ اب اس کو کیا کہئے کہ ہماری ضرورت ان کو لاحق ہوتی سنائی دی۔ ہم اُن کی بات پہ دھیان دیئے بغیر آگے بڑھنا چاہتے ہی تھے کہ سامعین کی پچھلی صف سے ایک آواز سنائی دی "لپھترا"۔ یہ لفظ "لوفتہ" ہمارے ایک پچھلے مضمون کا عنوان تھا، جو چلا ہے ہے، ہماری حوصلہ افزائی کے لئے دہرایا گیا تھا۔ مگر یہ ہمارے حق میں ایک ہتک گمان ثابت ہوا۔ ہمارے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہم نے سمجھا کہ یہ ایک نفسیاتی دباؤ ہے اور اس سے نکلنا چاہیئے۔ [illegible] کے بارے میں کسی منکر [illegible] تھا کہ [illegible] چاہیے کہ وہ [illegible] آپ کو [illegible] ارسطو کے فیل [illegible] حضرات الاسفی [illegible] فرق ہوتا ہے [illegible]

[illegible]

دکھائی دیتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا "بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دیو دکھائی دے آگے بڑھ کے حملہ کر دینا۔ وہیں پتہ چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچے نے جواب دیا "امّی! اگر اس کالے دیو کی امّی نے بھی اُسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

تو کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے ہم بھی دوچار تھے۔ ویسے "ہم بچہ" تو نہیں تھے، بلکہ "بور بچہ" تھے۔ لیکن حاضرین بھی تو کوئی بچے نہیں تھے۔ ان میں بھی تو بور بچے اور بور بچیاں تھیں جن کی تعداد کو ہماری اضطراری کیفیت نے دگنا تگنا کر کے دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اسی اضطراری کیفیت میں ہمارے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا: "اب سارے مزاح نگار اپنے مضامین سنائیں گے"۔ پلٹ کر جو دیکھا تو واقعی سارے مزاح نگار مائک کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ شاید انھیں ڈنر میں شرکت کی عجلت تھی۔ ہمیں احساس ہوا کہ اعلان میں کہیں گڑبڑ کر دی ہے مگر اب تو تیر نکل چکا تھا اور سارے مزاح نگار مائک کی طرف بڑھنے لگے تھے جنھیں دنیا کی کوئی بھی طاقت بٹھا نہیں سکتی تھی۔ ہمیں یاد آیا کہ جب ادیب اور شاعر بے قابو ہو جاتے ہیں تو انھیں بٹھانے کے لئے چھوٹے اور بڑے کا تنازعہ کھڑا کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے اسی حربے کو آزمانے کے لئے مائک پہ اعلان کیا کہ "سب سے پہلے سب سے چھوٹے اور سب سے جونیئر مزاح نگار اپنا مضمون سنائیں گے جن کے مقام کا ادب میں ابھی تعین نہیں ہوا!" یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ پلٹ کر جو دیکھا تو سارے مزاح نگار اپنی اپنی کرسیوں کی طرف کچھ اس تیزی سے جھپٹتے نظر آئے جیسے میوزیکل چیئرس کے مقابلے میں بچے کرسیوں پر قبضہ کرنے کے لئے لپکتے ہیں شاید انھیں اپنے مقام کے چھن جانے کا خوف تھا۔ وہ تو بڑا فضل ہوا کہ صدرِ محترم اور مہمانِ خصوصی کی کرسیاں محفوظ رہیں وہ بھی محض اس لئے کہ جنابِ صدر اور مہمانِ خصوصی پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنی اپنی کرسی سے اُٹھ نہیں پائے تھے۔ اسی اثناء میں اچانک ہمارے ذہن میں ایک مفکر کا قول یاد آگیا۔ ہم نے جھٹ مائک پر کہا کہ کسی مفکر کا قول ہے کہ فقیر کی گالی، عورت کے تھپّڑ اور مسخرے کی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہیئے۔ اس جملے نے آگ پر شبنم کا سا کام کیا۔ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے اعلان کیا کہ "مزاح نگاروں میں ایک خاتون مزاح نگار بھی ہیں۔ لیڈیز فرسٹ کے اصول سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان سے مضمون سنانے کی درخواست کی جاتی ہے"۔ یہ اعلان کر کے ہم پلٹے ہی تھے کہ بدحواسی کے عالم میں مائک کے تار میں اُلجھ گئے اور اسٹیج پر گر پڑے۔ آنکھیں جو کھلیں تو ہم اپنے ہی گھر میں بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ البتہ ہمارے چھوٹے صاحبزادے ہمارے پیروں میں اُلجھ کر ہم پر گر پڑے تھے۔

ہم اس خواب کے بارے میں بڑی دیر تک سوچتے رہے۔ اس خواب نے ہمیں خاصا پریشان کر دیا تھا کیوں کہ اس دن شام میں ہمیں ادبی اجلاس کی کارروائی چلانی تھی۔ ہم بہت دیر تک غور کرتے رہے۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ بقول فرائڈ انسان کی ادھوری خواہشات اور آرزوئیں خواب میں سر اُٹھاتی ہیں۔

اس روز ہم نے کمپیرنگ کے فرائض کس طرح انجام دیئے! اور اس کی کامیابی کا جشن کیوں کر منایا! یہ ساری تفصیلات بتانے کے لئے ایک اور مضمون لکھنا پڑے گا!

(یہ مضمون عالمی جشنِ مزاح کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا اور بے حد پسند کیا گیا)

شکیل اعجاز (اکولہ)

ادبی رسائل

جھلملاتے، چمچماتے، پھولوں جیسے رنگ برنگی رسالوں کے اسٹال پر کچھ ایسے رسائل نظر آئیں جو احساسِ کمتری سے کسی گوشہ میں بے یار و مددگار پڑے ہوں تو یہ شرط جیتی جا سکتی ہے کہ وہ اردو کے اَدبی رسائل ہیں۔

کاغذ پیلا پیلا، چھپائی ناقص، کتابت واجبی سی، سرورق کے نام پر مضامین کی فہرست یا کسی مفلوک الحال شخص کی تصویر جو یقیناً اردو کا نامور شاعر یا ادیب ہوگا۔ ان رسائل میں اس بات کا پورا بندوبست ہوتا ہے کہ ورق گردانی کرکے بھی خریدنے کی خواہش سر نہ اٹھا سکے۔ اس لئے ان میں جنسی بیماریوں، اسنو، پاؤڈر اور بنیان انڈرویئر کے ایسے اشتہارات نہیں ہوتے جن میں عورتوں کی عریاں تصاویر کو خواہ مخواہ ٹھونسا جاتا ہے۔ پورے ملک میں ادبی رسائل کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی گنجے کے سر میں بالوں کی۔ ادبی رسائل کی ایک خاص پہچان بلکہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ پابندی سے نہیں نکلتے۔ پابندی سے نکلنے پر ان کی اَدبی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ پھر ان ہی میں سے بعض رسائل ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بند ہونے اور نکلنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ معاملہ ہوتا ہے کہ رسالے کی میعادِ اشاعت ایک ماہ ہوتی لیکن یہ تین ماہ میں ایک بار نظر آتا۔ اس سے خواہ مخواہ واویلا مچا رہتا کہ پابندی سے نہیں نکل رہا ہے۔ اب اس کا حل یہ نکالا کہ دو ماہی، سہ ماہی رسائل نکلنے لگے ہیں۔ سہ ماہی رسائل بھی وقت پر نہیں آتے چنانچہ غور کیا جا رہا ہے کہ ان کی برسیاں منائی جائیں اور دو برسی، سہ برسی قسم کے رسائل نکالے جائیں۔ اس میں ایک فائدہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے موجودہ ادبی تحریک کے زیرِ اثر غزل لکھ کر بھیجی تو اس کے شائع ہونے تک کوئی دوسری تحریک سرگرمِ عمل ہوگی چنانچہ غزل کو آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے گا۔ اس سے بددل ہو کر لوگ شاعری چھوڑ دیں گے یعنی جرائم کی طرح بڑھتی ہوئی شعراء کی تعداد کچھ کم ہو سکے گی۔ چند مخصوص قلم کاروں کا گروپ جمع ہونے لگے تو اسے شرمندہ کرنے کا بھی یہی راستہ ہے کہ نئی ادبی تحریک چلائی جائے۔

آدمی جس شعبے سے منسلک ہوتا ہے اس کے اثرات زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ کسان کہتا ہے کہ کسی سے دشمنی نکالنا

چھپوا دیں سے [illegible] کروائیے۔ مزدوروں کی ہٹ دھرمیوں اور بارش کی شرارتوں کے باعث، دن رات ایک کر کے بھی دنیا دکھا سکے گا اور پاگل ہو جائے گا۔ شعراء حضرات سے دشمنی نکالنے کا یہ طریقہ ہے کہ ان سے شاعری نہ لکھوائیے لکھو چھاپیے خیال میں دشمنی نکالنے کا سب سے آسان حربہ یہ ہے کہ انہیں اسعد کا ادبی رسالہ جاری کرنے کا مشورہ دیا جائے اگر کوئی در غلانے میں آکر رسالہ جاری کرے اور بد نصیبی سے ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی بھی ہونے لگے تو دو رکعت شکرانہ ادا کیجئے آپ کی مراد بر آئی ہے۔ اب وہ رسالہ کو نہ بند کر سکے گا نہ ہی جاری رکھ سکے گا۔ اب اگر وہ کہیں یہ ذکر کر دے کہ "رسالہ آخری سانسیں لے رہا ہے" تو ادبی حلقوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی لوگ بڑی تعداد میں خطوط لکھیں گے کہ صاحب! آپ کے رسالہ سے ملک میں اردو زبان زندہ ہے۔ یہ بند ہو گیا تو زبان کا کیا ہوگا۔ آپ تو صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اگلے شمارے میں اعلان ہوگا کہ گو ہم نے رسالہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم قارئین کے خطوط اور خریداروں کے تعاون سے اسے دوبارہ جاری کر رہے ہیں۔ یہ ادبی حلقوں میں نیند کی گولی کا کام کرے گی۔ اب یہ ادبی لوگ اس وقت تک نہیں جاگیں گے جب تک کہ دوسری "آخری سانس" کی اطلاع نہ ملے۔

ادبی رسائل میں اس قسم کے خطوط اکثر شائع ہوتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ آپ اتنا ضخیم رسالہ اتنی کم قیمت پر کیسے نکال لیتے ہیں (کہیں آپ اسمگلنگ میں ملوث تو نہیں)؟

یہ آپ ہی کا دم خم ہے کہ رسالہ جاری رکھے ہوئے ہیں (میں نے تو اپنا رسالہ بند کر کے بھینسوں کا دھندا شروع کر دیا ہے اور اللہ کے فضل سے دو بلڈنگوں کا مالک ہوں)

آج ایک دوست سے رسالہ پڑھنے کو مانگا تو معلوم ہوا کہ یہ ادبی رسالہ ہے۔ میں ابھی تک اسے کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔ اس میں ملک کے تقریباً تمام نامور قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں (کیا یہ سب اصلی ہیں؟ معاف کیجئے ادب میں بھی دو نمبر کے کام ہو رہے ہیں اس لئے پوچھنا پڑتا ہے)

اور جس وقت قاری اس قسم کے خطوط لکھتا ہے کاغذ کے نیچے ایک جنسی ڈائجسٹ یا فلمی میگزین ضرور ہوتا ہے جسے وہ چائے، پان اور سگریٹ کے پیسے بچا کر خریدتا ہے۔

کسی شہر میں ادبی رسائل کے قارئین کی تعداد بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ملک میں ادبی رسائل کی ہوتی ہے۔ ان قارئین کی شخصیت پر اسرار ہوتی ہے۔ کم گو، کم آمیز اور (بقول ایک شخص کے) کم عقل ہوتے ہیں۔ گھر کے افراد ان سے [illegible]

ادبی رسائل چونکہ اپنے اصولوں میں سخت ہوتے ہیں اور اوسط قسم کی تخلیقات بہت ہی کم شائع کرتے ہیں لہٰذا اوسط قسم کے شعراء و ادباء ہمیشہ ہی بد ظن رہتے ہیں اور خامیاں تلاشتے رہتے ہیں۔ اپنی تخلیق کی اشاعت یا عدم اشاعت کے مطابق رسائل کا معیار بھی ان کی نظروں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً مسلسل بھیجتے رہنے پر بھی غزلیں شائع نہ ہوں تو صاحب یوں کہیں گے۔

"یہ انداز کا معیار تو بالکل ہی گر گیا ہے۔ تازہ شمارہ دیکھا آپ نے؟ خواہ مخواہ صفحات ضائع کئے ہیں۔ ایسا گل

بھی پیسہ کمانے کا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ اب سے کچھ برس پہلے جب میری غزل شائع ہوئی تھی یہ ملک کا واحد معیاری ادبی رسالہ تھا۔"

"نہیں صاحب۔ آپ انتہا پسندی سے کام لے رہے ہیں اس کا معیار اتنا بھی گھٹیا نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہی ماہ تو میری کہانی شائع ہوئی ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ معیار گر رہا ہے۔"

چند ماہ بعد شکایت کنندہ کی غزل بھی شائع ہو جاتی ہے۔ رسالہ جیب میں چھپائے تمہید باندھتے ہیں۔

"آپ اس دن ... انداز ... کے معیار کے بارے میں کیا فرما رہے تھے؟"

"یہی کہ اتنا گھٹیا نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں!"

"اس دن گھر جا کر میں نے چند شمارے دوبارہ نکال کر دیکھے اور غور کیا تو یقین ہو گیا کہ آپ ٹھیک فرما رہے تھے — تازہ شمارہ دیکھا آپ نے؟"

"جی نہیں۔"

(جیب سے نکالتے ہوئے) "یہ شمارہ تو قابلِ تعریف نکلا ہے۔ مضامین اور منظومات سے لے کر اشتہارات تک سب کچھ معیاری ہے۔ (تھوڑا توقف کرنے اور اس دوران مخاطب کو کنکھیوں سے دیکھنے کے بعد) اس بار میری غزل بھی شائع ہوئی ہے"

اب مخاطب کی باری ہے کہ اس کے غیر معیاری ہونے کے ثبوت فراہم کرے اور یہ اعتراف کرے کہ "اس دن میں ہی غلطی پر تھا۔ آپ ٹھیک فرما رہے تھے کہ معیار گر رہا ہے۔ اور اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے"

ادبی رسالے قوتِ برداشت ناپنے کے بھی کام آتے ہیں۔ آپ کسی سے خوشگوار تعلقات دیکھنا چاہتے ہوں تو تنقیدی اور تحقیقی مضامین انہیں دے کر پڑھوائیے۔ آدھ گھنٹہ نہیں وہ دست و گریباں ہو جائے گا۔

ویسے تو ان دنوں قدرے اعتدال سے شاعری اور افسانے تخلیق کئے جا رہے ہیں جو اب کچھ کچھ سمجھ میں بھی آنے لگے ہیں۔ البتہ ماضی قریب میں ان کو پڑھ کر آدمی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ اب تک جو کچھ پڑھا خاک پڑھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ادب ہے یا معمے بازی؟ ہاں کچھ کہانی کاروں کی بدولت اتنا ضرور ہوا کہ قارئین نے اپنے دادا پردادا کے زمانے کی [illegible] میں قدم رکھا۔ وہاں کھوئے جانے سے صاف بچے۔ [illegible] کو جھاڑ کر [illegible] الماری کو [illegible] اور [illegible] قسم کی کتابیں نکال کر پڑھنا شروع کیں۔

داستانِ امیر حمزہ، گلستان بوستان، [illegible] کا بیان، قصہ نوح علیہ السلام وغیرہ وغیرہ۔

مصنفین اور [illegible] ادیبوں کی پیٹ میں آ جاتے ہیں۔ بے شمار لوگ اسی طرز کے افسانے لکھنے لگے۔ بعض کا خیال ہے کہ ایسی تحریریں ہر کسی کے بس کا روگ نہیں لیکن ہم نے لکھنے کی کوشش کی تو بہت آسانی سے کئی صفحات لکھ ڈالے [illegible]۔ [illegible] پیروں کے نیچے [illegible] اور ذہن میں ان کے [illegible] تھی۔

اور درخت الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ پرندے اس طرح اُڑ رہے تھے کہ ان کی پیٹھ اس کی طرف اور پُشت زمین کی طرف تھی (یعنی آسمان کی طرف) تھی۔ یہ اُڑتے اُڑتے نڈھال ہوجاتے تو نیچے گرنے کی بجائے اُوپر گرجاتے۔ یعنی پہاڑوں پر جو الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اچانک اُسے ایسا لگا کہ بارش ہو رہی ہے۔ اس نے گھبراکر آسمان کی طرف (یعنی زمین کی طرف) دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ پھر یہ بارش کہاں سے ہورہی ہے؟ اچانک اُسے خیال آیا کہ آسمان تو نیچے ہے۔ اس نے دوبارہ گھبراکر نظر نیچی کی۔ تو زمین سے (یعنی آسمان سے) فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اُسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا جسے وہ فوارے سمجھ رہا تھا وہ بارش کی پھوار تھی۔ جو آسمان سے جو اس کے پیروں میں تھا، زمین کی طرف گر رہی تھی جو اس کے سر پہ تھی۔ چلتے چلتے ایک گڑھے میں گر پڑا۔ معلوم ہوا وہ دراصل پانی کھڑا ہے جو تبدریج بڑا ہوتا جارہا ہے۔ پھر نیچے سے سورج نکل آیا تو دیکھا کہ اندر قبریں ہیں۔ اور مُردے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم کہاں آگئے؟ ہمارے ساتھی کیا ہوگئے؟ اچانک اس کے گنجے سر پہ کسی نے چپت لگادی اس نے غصّہ میں پانچوں طرف نظر دوڑائی تو بہت سے ہاتھ دکھائی دیئے جن کے نیچے گنجے سر تھے اور وہ اسی اطمینان سے چپتیں کھا رہے تھے جیسے پریشان مریض اطمینان کے لئے کیپسول کھاتے ہیں۔ بعض گنجوں کو سزا کے طور پہ چپتوں سے محروم کردیا گیا تھا۔ یہ رو رہے تھے۔ ان کے ہر آنسو سے ایک گنجہ پیدا ہوتا اور رونا شروع کردیتا۔۔۔!

(بہت طویل کہانی تھی۔ کچھ یاد بھی نہیں رہا)

ان رسائل میں نظمیں بھی اس طرح کی ہوتی تھیں ــــ

میرے پاؤں بندھے ہیں پھر بھی۔
میں ان گلیوں میں جاتا ہوں جہاں کوئی جا سکتا نہیں۔
میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں تاہم
میں ان پھلوں کو بھی توڑ لیتا ہوں جو
ابھی درختوں پر نہیں لگے۔
دنیا نے میرے کانوں میں گرم گرم
کھولتے شور لگا دیئے تو کیا ہوا۔
میں
ان آوازوں کو صاف سنتا ہوں جو سناٹے سے آتی ہیں۔
کیا میں جن یا بھوت ہوں؟
میں سوچتا ہوں لیکن
دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہے۔
سوچ نہیں پاتا۔

شرمندہ ہو کر پیپروں کو دیکھنے لگتا ہوں جو
بندھے ہوئے ہیں بھی
اور نہیں بھی ہیں۔

یوں تو ادبی رسائل کی بنیادی پالیسی یہی ہوتی ہے کہ ان کی ادبی حیثیت ہو تاہم ہر رسالہ کی ایک ضمنی پالیسی بھی ہوتی ہے جو بنیادی پالیسی سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس ضمنی پالیسی کے پیشِ نظر فن پاروں کو لفٹ ملتی ہے (فنکاروں کو لفٹ نہ سیڑھیاں ملتی ہیں) ضمنی پالیسی کے نام پر نئی نئی بدعتیں نکالی جاتی ہیں۔ ایک رسالہ میں فنکاروں کے نام خفی اور کہانیوں جلی لکھے جاتے ہیں۔ دوسرے میں کہانیوں کے نام غیر واضح مگر فنکاروں کے نام بہت نمایاں لکھے جاتے ہیں۔ اس رسالے نو آموز بہت خوش ہوتے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب تخلیقات اور رسائل ان کے نام پہ بکنے لگے ہیں۔ اس طریقۂ اشاعت میں قارئین کا سراسر نقصان ہے۔ اگر وہ کسی فرد مخصوص کی کہانیوں سے ادب چکے ہوں تو نام دیکھتے ہی ورق پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی نامور فنکار کی کہانی واقعی اچھی ہوتی ہے لیکن قاری پچھلے تلخ تجربہ کی بناء پر اس مرتبہ ایک اچھی کہانی سے محروم رہ جاتا ہے۔ بعض انتہا پسند رسائل' فنکار کا نام ہی غائب کر دیتے ہیں صرف کہانی چھاپتے ہیں۔ ایک حیرت ناک رسالہ ایسا بھی ہے جو کہانی کار اور کہانی کا نام تو چھاپتا ہے۔ کہانی نہیں چھاپتا۔ لیکن یہ رسالہ ابھی جاری نہیں ہوا۔

رسائل اور ادبی تحریکوں کا دامن اور کپڑوں کا سا ساتھ ہے۔ اس لئے بعض رسائل تحریکوں کے زیر اثر چلتے ہیں! کچھ معصوم تحریکیں رسائل کے دست شفقت سے پروان چڑھتی ہیں۔

مدیر حضرات کے نظریاتی اختلافات یعنی ضمنی پالیسیوں کی وجہ سے ہر شہر کے ادبی حلقوں میں آپسی رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یوں بھی سننے میں آتا ہے ــــ تو اسی گدھے نے موتی بن سارنگ کے مضمون کو ناقص کہا تھا؟ ذرا قریب آنے دو میں تو کتا چھوڑ دوں یار اس پہ۔

یعنی تم حفظ الرحمٰن باوودی کو عقل سے خارج سمجھتے ہو؟ بیٹا جی خبردار' جو آئندہ میری چوکھٹ پہ قدم رکھا۔ تمہارا سر توڑ دوں گا۔

ارے آؤ آؤ تم بھی ڈاکٹر غ۔ انکاری کے مداح اور ہم بھی۔ اے ہوٹل والا۔ صاب کا بل نا ہیں دے گا۔ ان سے مانگے گا تو ٹانگ توڑ دے گا۔ یہ ہمارا ادبی بھائی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ادبی رسائل زیادہ اور لکھنے والے کم تھے۔ اب حالات اس کے برعکس ہیں۔ مدیرانِ رسائل پریشان ہیں۔ ہر ماہ سیکڑوں تخلیقات موصول ہوتی ہیں۔ ماہنامہ' تین ماہ میں ایک بار نکلتا ہے اس میں بھی زیادہ سے زیادہ سولہ غزلیں اور تین چار کہانیاں سما سکتی ہیں۔ اس لئے ان دنوں اس قسم کے ضروری اعلان بھی شائع ہونے لگے ہیں۔

غیر طلبیدہ تخلیقات ارسال نہ کریں۔

دفتر میں غزلوں کا ڈھیر لگا ہے (لوگ ردی کا غذ کا بیوپاری سمجھنے لگے ہیں)

کم سے کم پانچ برس تک کوئی کچھ نہ بھیجے (پانچ برس بعد ہی اعلان کیا جائے گا)
رسائل اسی طرح گھٹتے اور لکھنے والے بڑھتے رہے تو یہ معاملہ ایک قدم یوں بھی بڑھ سکتا ہے۔
غیر طلبیدہ تخلیقات بھیجنے والوں کے ساتھ سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔
منی آرڈر کے بغیر تخلیقات پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اس حساب سے رقم روانہ کریں۔

غزل	سو روپئے
نظم	نوے روپئے
افسانہ	ستر روپئے
مزاحیہ مضمون	پچاس روپئے
انشائیہ	چالیس روپئے
تنقیدی مضمون	بیس روپئے
ترجمہ	دس روپئے

تحقیقی مضامین مفت شائع کئے جائیں گے۔

ادبی رسالہ کی سب سے اہم چیز اس کا اداریہ ہوتا ہے۔ بلکہ صرف اسی ایک صفحے کی خاطر لوہا رسالہ چھاپنا پڑتا ہے!

۴/فارم IV بابت ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

مقام اشاعت۔ حیدرآباد، وقفۂ اشاعت۔ ماہنامہ، پرنٹر کا نام۔ سید مصطفیٰ کمال، ہندوستانی
۶۸ ـ ۶ ـ ۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

پبلشر کا نام: سید مصطفیٰ کمال، مدیر: سید مصطفیٰ کمال

ملکیت: مسز قیصر کمال، ہندوستانی ۶۸ ـ ۶ ـ ۱۷ دبیر پورہ، حیدرآباد۔ ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال اعلان کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۸۵ء
دستخط پبلشر

سید مصطفیٰ کمال

غزل - سرپٹ حیدرآبادی

مشکل ہے نباہ حسینوں سے، یہ کام بڑا جھنجھٹ کا ہے
چلتی ہیں رقیبوں سے چوٹیں، ہر دم خطرہ کھٹ پٹ کا ہے

وہ دوست ہیں بیسیوں برس سے میرے کیا جانے نبھتی ہے کب تک
معشوق نہ وہ عاشق ہیں، یہ واقعہ سن چونسٹھ کا ہے

بس کا، موٹر کا، سیکل کا، آٹو رکشا کا دور ہے یہ
بگھی ہے نہ ٹم ٹم ہے، رتھ ہے شکرم ہے نہ کوئی جھٹکا ہے

جو ہوگا وہی آئے گا نظر، ان سیدھی آنکھوں والوں کو
یہ شعبہ مفید و کارآمد، معیار نظر سرپٹ کا ہے

زلفیں ہوں کہ سر پر بال گھنے، دونوں شکلیں کچھ خاص نہیں
کہتے ہیں اسے سب خوش قسمت، اعزاز یہ تالو چٹ کا ہے

نل لگوا کر دیہاتوں میں، اک ظلم کیا ہے حکومت نے
لاتی ہے نہ پنہارن گگری، منظر نہ وہ اب پنگھٹ کا ہے

برسوں میں کوئی آتا ہے وہاں، اک بھیڑ لگی رہتی ہے یہاں
پٹ دار ہیں خلد کے دروازے، دوزخ کا در بے پٹ کا ہے

باز آیا میں ہجر کے صدموں سے، ہے لذت وصل کو میرا سلام
یہ عشق تو میری نگاہوں میں، بجلی کے شاک کا جھٹکا ہے

دانائی ہے میری فطرت میں، پیدائشی عاقل و بالغ ہوں
بدنام کیا ہے جس نے مجھے، یہ کام کسی ہولٹ کا ہے

خود بزم میں رہ کر سنجیدہ، اوروں کو ہنسانا کھیل نہیں
ٹھہرے گا مقابل کیا کوئی، میدان تو یہ سرپٹ کا ہے

بعد از فساد

اسرار جامعی

بعد از فساد بولے کیا کیا ہمارے لیڈر
گرچہ تھے اس سے پہلے وہ سب نہاں تو کیا ہے
اسرار جامعی جی موقع ہے یہ غنیمت
چھپ جائے آپ کا بھی گر اک بیان تو کیا ہے

شانِ سخاوت

اسرار جامعی

اک شخص سرِ راہ لگاتا تھا یہ نعرہ
بھوکا ہوں کئی روز سے روٹی دو خدا را
بلوائی بڑی شانِ سخاوت سے یہ بولے
لو! پیٹ بھرو، تم بھی چھرا کھا کے ہمارا

حلیمہ فردوس (بنگلور)

"سیل نے ہم کو نکمہ کر دیا"

زبانوں کا بھی عجیب کرشمہ ہے کہ ایک ہی لفظ دو زبانوں میں دو علحدہ معنی دیتا ہے۔ اس کو کیا کیجئے کہ اکثر ایک ہی لفظ ایک زبان میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کا "نکمہ" پن نہیں تو اور کیا ہے "سیل" sale نے سیلِ بےپناہ کی طرح ہمیں بھی ڈبو دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔ سیل سے پہلے ہم نے کیا کام کیا اس کا تو حساب نہیں لیکن خدائے تعالیٰ کے ہاں جب "خلافت سیل" کا بازار گرم ہوا تو بچارے آدم کی باری آئی۔ گو کہ یہ "ظلوم وجہول" تھے۔ اور وہ اس سیل کے ہاتھوں نکمے ہو گئے۔ اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ روزآنہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہی ہوں گے۔ اخبار کے ذکر سے ہی ہمیں یاد آیا کہ اخبار بین علحدہ ہوتے ہیں اخبار کے قارئین علحدہ۔ قارئین کی بھی کئی اقسام ہیں۔ چند ایک وہ جو سرخیوں پر نظر ڈالتے ہیں انہیں صرف اخبار کے دوسرے صفحے سے مطلب ہوتا ہے۔ جس میں "APPOINTMENT یا WANTED" کی سُرخیاں منہ چڑھاتی نظر آتی ہیں لیکن یہ اس قدر بے حیا ہوتے ہیں کہ روزانہ درخواست گزارتے رہتے ہیں صرف اِس اُمید پر کہ صبح ضرور آئے گی۔ دوسرے نمبر کے قارئین وہ ہیں جو صرف ضرورتِ رشتہ کا کالم پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چند ایک ایسے بھی ہیں جو سینما گائیڈ کے لئے ہفتے بھر میں صرف ایک دن کا اخبار بڑے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ اور چوتھے نمبر کے قارئین میں ان کا شمار ہوتا ہے جنھیں صرف اخبار کے آخری صفحے یعنی کھیل کھلاڑی کا سے مطلب ہوتا ہے۔ آخری نمبر پر ایسے قارئین آتے ہیں جو اشتہارات کی معلومات کے لئے اخبار بینی کرتے ہیں اور ایسے اشتہار جو زندگی سے بھی کوتاہ وقت کے لئے دیئے جاتے ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں کسی سیل کا ذکر نہ ہو۔ بفرضِ محال کوئی دن اخبار اس اشتہار کے بغیر آ بھی جائے تو ہمیں اس اخبار پر بیوگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ جس طرح حسینہ کے لئے سولہ سنگھار کی ضرورت ہے اسی طرح اخبار کے لئے sale۔ جیسے اشتہار کی اس سیل کے بھی کئی نام ہیں۔ sale۔ sale عظیم سیل۔ رعایتی سیل گرینڈ سیل وغیرہ۔ خدا کا شکر ہے کہ کانگریس سیل۔ بی۔ جے۔ پی سیل کا نام نہیں رکھا گیا۔ جس سیل کا بھی اشتہار ہو بس یہی لکھا ہے گا کہ "آج کا آخری

یہ سنہری موقع پھر نہیں ملے گا۔ اس کا بھرپور فائدہ اُٹھائیے۔ اردو شاعری میں محبوب وعدہ تو کرتا ہے اور یہ وعدہ کبھی وفا نہیں ہوتا۔ یہی حال سیل کا بھی ہے۔ آخری دن آج ہوگا لیکن پھر یہ آج کل کے لئے آج ہو جائے گا۔ اور یہ آج کا سنہری موقع جاکر دو پہلی بن جائے گا اور لوگ ہیں کہ اس سنہری جال میں پھنسنے کے لئے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ ایک زمانہ تک صرف کپڑوں پر ہی sale رکھا جاتا تھا۔ لیکن دوسرے تاجروں نے دیکھا کہ خریداروں، گاہکوں کو بے وقوف بنانے اور کمانے یعنی اپنا اُلّو سیدھا کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ٹھان لیا ہے کہ وہ اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہیں گے ایک اور پُر فریب انداز کو "Exhibition cum Sale" کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی کہ فروخت کرنا ہمارا مقصود ہے اور نمائش کرنا ہمارا ایمان۔ کوئی بے وقوف اس میں پھنس جائے تو واللہ عالم بالصواب۔ ظروف، فرنیچر فلاں فلاں بہت کچھ ہوتا ہے اس سیل میں سوائے اشیائے خورد ونوش کے۔ اگر یہ بھی سیل میں رکھے جائیں تو ہندوستان کو ویسے بھی امریکہ اور روس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اس کے بعد پتہ نہیں کس کس کا محتاج ہونا پڑے گا۔ ہوٹل میں سڑی گلی ترکاریوں، بھوسی بھرے اناج کو استعمال کر کے ہی اس قدر منافع حاصل کیا جاسکتا ہے کہ پھر انہیں "سیل" میں رکھ کر مزید منافع کمانے کا سوال ہی بیکار معلوم ہوتا ہے۔ آخر دھن کی بھی تو کوئی انتہا ہے۔

اکثر "سیل" میں خریدنے کے لئے صرف عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں جب کہ فروخت کے لئے Sales Men اور Sales Girls دونوں کو رکھا جاتا ہے ایک بار ہم شہر کی بہترین ہوٹل گئے دیکھا کہ اس کے کانفرنس ہال میں ظروف کا سیل لگا ہوا ہے (ہوٹل کے مالکان جب اپنے ہال کو ویران دیکھتے ہیں تو اُسے آباد کرنے کے بہانے ایسے ہی سیل کا سہارا لیتے ہیں) اس کی پرچی ہمارے ہاتھ لگی تو منہ میں پانی آگیا۔ ویسے پرس میں اس قدر گنجائش نہیں تھی کہ ہم سیل میں لگی چیزوں کو خریدتے لیکن ہماری ایک ساتھی نے یہ بھی بتایا تھا کہ سیل میں کوئی چیز خریدنا ضروری نہیں وہاں آنکھوں کی زکواۃ بھی دی جاسکتی ہے۔ ہم نے ہمت باندھ وہاں قدم رکھا۔ سامان ہے کہ اپنی شان آپ، کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے ان چیزوں کو چمکانے میں روشنی کا ہاتھ تھا تو دوسری طرف لچھے دار باتیں کرتے ہوئے فروخت کرنے والوں کا بھی برابر کا حصہ۔ ہماری نظر ایک نازک نازک "لیمن سیٹ" پہ پڑی۔ تیلی سی کانچ کا بنا بڑا خوبصورت تھا۔ ہم نے دام پوچھا تو بس صاحب اس کی تعریف میں گھنٹہ بھر لکچر سننا پڑا۔ یہ فلاں جگہ کا بنا ہے یہ ایکسپورٹ کرنے والی کمپنی کا ہے سیل میں یہ آپ کو آدھی قیمت میں ملے گا ورنہ اس کی اصل قیمت فلاں ہے۔ ہم نے پرس کے سارے خانے ڈھونڈے تب بھی آدھی کی آدھی قیمت بھی ہمارے ہاتھ نہ لگی۔ ہماری پریشانی کو تاڑتے ہوئے ان صاحب نے کہا کوئی گھبرانے کی ضرورت نہیں آپ کچھ رقم دے کر اُسے محفوظ کر دیجئے اور اپنی اولین فرصت میں آکر بقیہ رقم ادا کر کے اپنی چیز لے جائیے۔ ہم نے اپنے صاحب سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت لے لی۔ ہمارے ایسے سیل کے معاملات میں وہ کبھی دخل نہیں دیتے کیوں کہ شادی کے دن ہی ان کے والدین نے منہ مانگی قیمت حاصل کر کے انہیں "سیل" کر دیا تھا۔ ان کے بعد

[illegible]

دوسرے ہی دن شوہرِ نامدار کو دوڑایا۔ وہ بیچارے بل ادا کرکے بڑی حفاظت کے ساتھ اُس ڈبے کو آٹو میں رکھے گھر آئے۔ سُنا کہ آٹو ڈرائیور کو پہلے ہی ہدایت دی گئی تھی کہ بہت سُست رفتار سے چلائے وہ ہر ہر دھچکے پہ یہ شعر پڑھتے جاتے تھے —

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے لیمن سیٹ
پھر ٹوٹ نہ جائے کہیں دل میری بیوی کا

خدا خدا کرکے صاحبِ سلامت نے وہ سیٹ گھر کو صحیح سلامت پہنچایا اور ہم نے بڑی خوشی خوشی سے اس کو کھولا مگر دیدہ زیب لیمن سیٹ بڑا مشکل تھا۔ کئی کاغذ کے پُرزے، گھاس کے تنکے ہٹانے کے بعد تب کہیں آہستہ آہستہ آسمانی رنگ کے خوبصورت گلاس دکھائی دیئے۔ بڑی احتیاط سے نکالا اور خوشی خوشی سب کی داد سمیٹنے کے لئے اس کو ٹیبل پر سجا دیا۔ میری چھوٹی بہنا نے بتایا باجی آپا پیسوں کا کیا ستیاناس کیا ہے آپ کی عقل کیا چرنے گئی تھی۔ دو گلاسوں میں بال برابر خراش آ گئی ہے۔ ہم نے چشمہ سنبھالا اس کی تحقیق کی اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ہم نے دل کو تسلی دی ارے خراش سے کیا ہوتا ہے یہ تو آج کل ہر ایک انسان کے دل میں پڑی ہے۔ یہ تو آج کے دور کی نشانی ہے۔ غیر دوسروں نے تعریف کی اور ہم مطمئن ہو گئے۔ سوچا کہ اب شادی کی پانچویں سالگرہ آ رہی ہے یہ پانچ گلاسوں کا افتتاح اُسی دن ہوگا [یاد رہے کہ آج کل لیمن سیٹ کے چھ گلاسوں کی تعداد کو گھٹا کر پانچ کر دیا گیا ہے کیوں کہ فیکٹری والوں کو بھی منصوبہ بندی کا بروقت پتہ چل گیا ہے کہ آج کے دور میں تین بچے دو میاں بیوی تو پھر چھٹے گلاس کی ضرورت کیا ہے] آپ بھی پہلے کی طرح درجنوں برتن رکھنے کی خواہش نہ کیجئے کیوں کہ جو بھی خاندان آئے گا ان کی تعداد صرف پانچ کی ہوگی۔ صد افسوس کہ خراش زدہ دو گلاس تو دھوتے وقت ہی چٹاخ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ چھن چھن کی آواز ایسی آئی کہ ہمارے میاں جی دوڑے آئے اور کہا کہ آپ کو آج ہی سب کے سامنے پائل پہنے گھومنے کی ضرورت کیا تھی۔ ہم نے صفائی پیش کی یہ ہمارے گلاسوں کی جھنکار ہے پائل کی نہیں۔ اُنہوں نے وقت کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے کہا کہ اب بحث کا موقع نہیں وہ تین گلاسوں اور ایک عدد جگ سے ہی کام چلایئے۔ ہم نے بھی مشورہ قبول کیا۔ محفل میں رونمائی کے لئے تین عدد گلاس اور ایک عدد جگ ہی پیش کیا گیا۔ جس کی نظر بھی اس لیمن سیٹ پہ پڑتی وہ واہ واہ کرتے۔ ہماری ایک ساتھی اس سیٹ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے خریدنے کی داستان جاننا چاہ رہی تھیں کہ ان کی بیٹی صاحبہ بضد ہو گئیں کہ ہم اُسی گلاس سے پانی پئیں گے حالانکہ اُنہوں نے سمجھایا بھی کہ تم تو چھوٹی ہو اسٹیل کے گلاس سے پیو یہ تو نازک کانچ کا گلاس ہے ٹوٹ جائے گا تو اس قدر خوبصورت سیٹ ادھورا رہ جائے گا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جھٹ لڑکی نے جواب دیا آنٹی یہ جامِ جمشید نہیں کہ بازار میں نہ ملے۔ اس جواب کو سُن کر ہم حیران ہو گئے کہ آج کا بچہ اتنا ہوشیار ہے۔ اس کا جواب [illegible] در میں کوئی اُس [illegible] ہماری حیرانی ابھی ختم ہوئی تھی کہ پریشانی شروع ہو گئی کیوں کہ بچی نے اپنے ہاتھ سے گلاس [illegible] پھر [illegible] آپ کا تو [illegible]

سیٹ کو کسی کی نظر لگ گئی ہوگی" ہمارے دل کو یہ بات بھا گئی اور ہم چپ رہ گئے۔ ایک صاحبہ نے یہ بھی کہا کہ آپ نے شاید اسے سیل میں خریدا ہوگا۔ آئندہ سے محتاط رہئے سنا کہ سیل میں فروخت ہونے والی ساری اشیاء ایسی ہی ناقص رہتی ہیں اس لئے وہ کم قیمت میں فروخت ہوتی ہیں۔ یہی اس کا راز ہے۔ ہم نے ان کی بات اَن سنی کر دی اور بقیہ دو گلاسوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر شوکیس میں محفوظ کر دیا۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ زن ازل سے زر و زیور کی غلام رہی ہے۔ جہاں تک زیور کا تعلق ہے آج کل اصل اور نقل کا فرق مٹ گیا ہے۔ امیر زادیاں بطورِ فیشن نقلی زیور بھی پہنیں تو اسے اصلی سمجھا جاتا ہے اور غریب زادیاں خون پسینے کی کمائی سے اصلی زیور بھی پہنیں تو لوگ اسے کھوٹا قرار دیتے ہیں گھر کی ساری ضروریات پورا کرنے کے بعد ہمارے پاس اس قدر دولت نہیں ہوتی کہ ہم اُسے اپنی زیبائش میں لگائیں گو کہ نئے نئے زیورات کو دیکھ کر دل ضرور مچلتا مگر شادی میں دیئے ہوئے مائیکہ کے زیورات کو ہم آثارِ قدیمہ کی طرح ہر مجلس میں پہنے رہتے ہیں جب ہم نے اخبار میں دیکھا کہ سونے کے زیورات پر بھی رعایت دی جا رہی ہے۔ تو جھٹ سے تیار ہوئے اور راہ لی ساتھیوں کے ساتھ مشورہ سے خوب ٹھونک بجا کر ایک لاکٹ خریدی جس میں "اللہ" لکھا تھا کیوں کہ آج کل مومن کی یہی پہچان ہے۔ شومئی قسمت ہوا یہ کہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ اپنا رنگ دکھانے لگا۔ سنہری سے وہ روپہلی ہوگیا۔ جب ہم اس کی جانچ کے لئے دکان گئے تو پتہ چلا کہ چاندی پر سونے کا ملمع تھا۔ اب ہمارا خود ملمع اُتر گیا۔ اور ہم خود اپنی نظروں میں نکمے ہوگئے۔

آج کل شہروں کی مستقل دکانوں کی اہمیت نہیں رہی کیوں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ البتہ جو "سیل" کے نام سے دکانیں لگائی جاتی ہیں ان کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ نمائش کا لفظ پہلے پہل عام تھا آج کل "سیل" نے اس نمائش اور میلوں کی جگہ لے لی ہے بس EXPO 70، EXPO 80 کا ہر طرف شہرہ ہے۔ بیچارے گاندھی جی چرخا چلا چلا کر مر گئے لیکن لوگوں نے کھادی کی طرف توجہ نہ دی نہرو جی نے ان کی ساکھ رکھنے کے لئے کھدر کی ٹوپی اور شیروانی پہننی شروع کی تو یہ رواج ایسے عام ہوا کہ آگے چل کر سیاستدانوں کا یونیفارم بن گیا۔ آج کل اس EXPO کی کرامت کا نتیجہ ہے کہ سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ افسران بھی ان دستی پارچہ جات کے دالا و شیدا بن گئے ہیں۔

شہروں میں جو چیزیں بڑی بڑی سجی سجائی دوکانوں میں فروخت ہوتی ہیں تو اس کے دام کچھ اور ہوتے ہیں اور وہی چیزیں سڑکوں پر فروخت کی جاتی ہیں تو بالکل کم دام پر لیکن شرفا سڑکوں پر سے خریدنا نکمہ پن سمجھتے ہیں۔ بیچارے جب بڑے شہر میں جاتے ہیں تو اسی نکمے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بمبئی کی چوپاٹی ہو یا دہلی کا قرول باغ اسی لئے تو مشہور ہیں۔ وہاں چیزیں سجائی نہیں بلکہ ڈھیروں سے ڈال دی جاتی ہیں۔ آپ دودھ بھائی یا پیر بھائی کے بارے میں جانتے ہی ہوں گے مگر ہماری سرکار نے اس بھائی بند کے رشتے میں ایک اور کا اضافہ کیا ہے وہ ہے L.T.C بھائی۔ کیوں کہ سرکار کی اس رعایت و عنایت پر بیچارے اوسط گھرانوں کے ترقیتین کی بھی قسمت چمک اٹھی ہے۔ جو ہنی مون منانے کے قابل نہیں تھے وہ ہنی مون منانے کے قابل ہوگئے ہیں۔ ہماری ایک ساتھی اسی رعایت پر بمبئی، دلی، آگرہ، اجمیر اور خدا جانے کہاں کہاں ہو آئیں اور

اپنے ساتھ سارا ہندوستان خرید لائیں۔ اور ایسی ڈینگیں مارنے لگیں کہ ہمیں ان کے آگے دم مارنے کی ہمت بھی نہیں رہی لائی ہوئی چیزیں بتائیں اور کہیں کہ یہ زعفران کشمیر کے سرکاری شوروم سے خریدا ہوا ہے جو بالکل اصلی ہے۔ اس کو جو بھی کھائے گا زعفران زار بن جائے گا۔ یہ جوتیاں دلی کے "صنعت گھر" Hand Craft سے خریدی گئی ہیں اس کی قیمت فلاں ہے ایک اور صاحبہ یعنی ان کی C.T.L بہن آئیں اور کہنا شروع کیا کہ آپ بڑی عقلمند رہیں کہ آپ نے ساری چیزیں سڑکوں پر خریدا پاسیل میں۔ ہم شوروم (معتبر دوکانوں) کے چکر میں ایسے پھنسے کہ چار آنے کی چیز چار روپے میں خریدی۔ ہم نے پرائے شہر کی خریداری سے توبہ کر لی ہے۔ بہر حال یہ سیل کا چکر کبھی مہنگا ہوتا ہے کبھی سستا۔

اکثر سیل عید و تہوار کے موقعوں پر ہی رکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ عید کے دن چولھا نہ سلگے لیکن کپڑے پہننا ہمارا شیوہ ہے۔ قومی یک جہتی کی مثال اگر دیکھنا ہو تو سیل میں۔ آگادی سیل۔ X - MAS سیل۔ رمضان سیل، دسہرہ سیل وغیرہ۔ سیل میں رعایت کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ شروع ہوتی ہے دس فیصد سے اس کا سلسلہ پچاس فیصد تک جا پہنچتا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام کا معاملہ ہوتا ہے۔ کیا ساری کیا سوٹنگ، کیا چادریں، کیا بچوں کے کپڑے ہر چیز موجود اکثر جگہ تو یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ "By one Take Two" ایک خریدیئے دوسرا مفت لے جایئے۔ بتایئے اس جال میں کوئی کیسے نہ پھنسے اگر آپ کی دس لڑکیاں بھی ہیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں بہر حال موقع دیکھ کر آپ شادی طے کیجئے۔ یعنی جب شہر میں سیل کا بازار گرم ہو تو آپ باسانی جہیز جمع کر سکتے ہیں۔ آپ کو سیل میں جو بھی مال ملے گا مفت تو نہیں آدھی قیمت میں ضرور ملے گا۔ ویسے بھی بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے۔ پرائے گھر کو سجانے کا یہی بہتر طریقہ ہے۔

تلخ تجربات کی بدولت ہمیں سیل سے ازلی نفرت ہو گئی ہے۔ یہ چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی کے مصداق جی ضرور مچل جاتا ہے۔ جب ہم نے دیکھا کہ پڑوسی سیل میں صرف چار سو بیس روپے میں گھر بھر کے افراد کے لئے کپڑے لے آئیں تو ہم نے بسم اللہ کی۔ ایک عدد ساری، پینٹ بشرٹ [illegible]، بچی کے لئے دوپٹہ خریدا مگر سب میں جاذب نظر ہماری ساڑی ہی تھی۔ بعد میں کپڑوں کا برا حال ہوا میاں جی کے جو کپڑے لائے تھے وہ دھل کر اس قدر چھوٹے ہو گئے کہ بچے کے کام آئے اور بیٹی کے دوپٹہ کا رنگ اڑ [illegible] اڑا تھا البتہ اسے پہننے کے بعد ہمارا رنگ ضرور اڑ جاتا تھا۔ جب بھی پہنتے کسی نہ کسی شکایت [illegible] کہ سیل میں ایسی ساڑیاں بھی فروخت کی جاتی ہیں جو بیواؤں کی مری ہوئی عورتوں کی ہوتی ہیں۔ اس خبر کو سننے [illegible] ساڑی پہننا تو دور کی بات اس کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ کیوں کہ ہم آسیب بھوت پریت سے [illegible]

گو کہ لباس [illegible] ہے لیکن اس میں فیشن کا عمل دخل کچھ اس قدر ہے کہ کبھی [illegible] مقصد پیدا ہوتا نظر آتا ہے اور کبھی لباس سے ستر پوشی کا کوئی رشتہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ عورتیں فیشن کی خاطر سردیوں میں آستین کٹ بلاوز استعمال کرتی ہیں تو مرد گرمیوں میں بند گلے کا کوٹ۔ ایک زمانے میں تنگ لباس کی [illegible]۔ نوجوان ہیں کہ اس قدر تنگ پینٹ پہنتے کہ وہ ننگا نظر آتے اور لڑکیاں ایسے تنگ شرٹ پہنتیں کہ اب پھٹا کہ تب پھٹا۔ یہ کپڑے کے قحط کا دور

سینہ تھی فیشن کا نزول اور اس کی برکت تھی۔ اب اللہ اللہ سب اس تنگنائیے لباس سے آزاد ہو چکے ہیں۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے لباس آج کل عام ہیں کہ بدمعاش بھی اسے پہن کر شریف نظر آتا ہے اس فیشن نے ہر ایک کو حیاداری سکھائی ہے۔ آج کل دوپٹوں کا چلن عام ہو گیا ہے۔ بے حیا سے بے حیا لڑکی بھی بڑی حیاداری سے دوپٹہ اوڑھے سربازار گھومتی ہے۔ بات نکلی تھی سیل کی اور پہنچی فیشن پرستی تک۔

آج کل ملبوسات میں اُترن اور کترن کی بڑی اہمیت ہے۔ پہلے کسی لباس کی تیاری میں تھان تھان کپڑا درکار تھا لیکن آج کل کترنوں کو جوڑ کر ہی کام چلایا جاتا ہے۔ ایک رنگ کا اگلا تو دوسرے رنگ کا پچھلا اور آستین کوئی سا سب رنگ گے۔ خیر کفایت شعاری اچھی چیز ہے۔ لیکن اُترن کس قدر معیوب بات۔ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام میں اُترن کا چلن عام تھا۔ بی بیوں کی اُترنیں صرف باندیاں پہنا کرتی تھیں۔ جمہوری نظام میں جنتا دور میں جہاں بی بی اور باندی کا فرق مٹ گیا ہے اس لئے ہر کوئی اُترنوں میں اترا رہا ہے۔ سنا کہ آفیسروں۔ اور تاجروں کی بیویاں نئے نئے ملبوسات کی دلدادہ ہوتی ہیں کپڑوں کی صرف دو چار بار دھلائی کے بعد اونے پونے دام میں بیچ دیتی ہیں۔ اور یہی چیزیں پالش، استاریچ وغیرہ ہو کر سیل کی رونق بنتی ہیں۔ بیچارے جنتا سیل میں خریدنے والی جنتا ان اُترنوں کی خریدار بن جاتی ہیں اور ان کی رگِ حمیت کبھی نہیں پھڑکتی۔ اگر آپ میں ذرا برابر بھی شرافت ہے خودداری کا مادہ ہے تو ہم آپ کو نیک مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو سیل سے بچائے رکھیئے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب ہم خود ایسے سیل کا بائیکاٹ کر دیں گے تو خود بخود ہمارے ننگے پن کا تدارک ہو جائے گا اور ہم کسی نہ کسی کام کے قابل ہو جائیں گے۔

OO

بولے

"میں تو تم لوگوں سے بے زار ہو گیا ہوں! اسے کم [illegible]
تم دونوں بھی "لڑکیاں" کیوں نہ ہوئے؟!!"

۳۔ "چوکا": ایک کرکٹ کھلاڑی کی بیوی کو بچہ ہونے والا تھا اور وہ آپریشن روم کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر کھلاڑی کو اطلاع دی۔

"مبارک ہو! آپریشن کامیاب رہا اور پہلے اوور اور پہلے بال پر ہی "چوکا" ہو گیا! دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔"

۴۔ "تقریر کی لذت": الیکشن کے سلسلے میں ایک مقام پر ایک سترہ سالہ لڑکا تقریر کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں تیزی اور جوش تھا۔ اسی مقام سے ایک صاحب اپنی چار سالہ لڑکی کے ساتھ گزر رہے تھے۔ لڑکی نے جوشیلی تقریر سنی تو سہم گئی اور ڈرتے ڈرتے باپ سے پوچھا۔

"ڈیڈی! یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟"

"آدمی تقریر کر رہا ہے بیٹی!"

تقریر کر رہا ہے؟ لڑکی نے حیرت سے کہا "میں تو سمجھی کہ وہ لڑ رہا ہے!"

۵۔ "خیال رہے": ایک پولنگ بوتھ پر جیسے ہی ووٹرس نے دھاندلی شروع کر دی۔ ایک صاحب جو اپنا ووٹ استعمال کر چکے تھے، اپنے ایک ہم نام شخص کا ووٹ ڈالنے دوبارہ پولنگ بوتھ گئے۔ پولنگ افسر نے سلسلہ نمبر چیک کر کے ان سے والد کا نام پوچھا۔ ان صاحب کے منہ سے بے ساختہ ان کے اپنے والد کا نام نکل گیا۔ پولنگ افسر نے مسکراتے ہوئے صفائی کی اور کہا۔

"سوری! آپ دس بار ووٹ دینے آ چکے ہیں مگر ذرا ولدیت کا خیال رہے!"

۶۔ "دوسرا جنم": ایک پولنگ بوتھ پر ایک صاحب اپنا ووٹ دینے آئے تو سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے۔ دوبارہ بوگس ووٹ ڈالنے کے لئے انہوں نے کرتا اور پاجامہ پہنا اور مصنوعی مونچھیں بھی لگا لیں۔ مگر پولنگ افسر نے ان کو پہچان لیا اور پوچھا

"آپ کتنی بار ووٹ ڈالیں گے؟"

ووٹر نے حاضر جوابی سے کہا "جی! یہ میرا دوسرا جنم ہے!"

۷۔ "ڈیمانڈ" (DEMAND)

گلبرگہ کے ایک پولنگ بوتھ پر ایک ستر سالہ خاتون ووٹ ڈالنے آئی مگر ووٹ ڈالنے کے بجائے وہ اپنا بیلٹ پیپر ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی! پولنگ افسر نے جب اس کو ووٹ ڈالنے کو کہا تو بولی "پچھلی بار مجھے ووٹ دینے کے لئے پیسہ ملا تھا۔ اس دفعہ کوئی بھی روپیہ پیسہ نہیں بلا [illegible] پھر میں ووٹ کیسے ڈالوں؟"

لکھنؤ کے کسی آنا دائیں [illegible] نے جن [illegible]

۸۔ "شرط": انتخابات [illegible] اپنا ووٹ ڈالنے ہاتھی پر گئے۔ یہ خبر اخبار [illegible] ایک صاحب [illegible] ہم بھی [illegible] ہم نے بھی [illegible] ووٹ ڈالنے [illegible]

ہم نے کہا "ابھی اس کی آنکھیں نہیں کھلیں"۔

وہ بولے "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

ہم نے مطلب سمجھاتے ہوئے تفصیل سے کہا "کلاس میں ایک بچے نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کی کتیا نے چھ بچے دیئے ہیں وہ سب کے سب انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے بچے کو شاباشی دی۔ کچھ عرصے بعد جب انسپکٹر معائنے کے لیے ہمارے اسکول آیا تو ہم نے اسی بچے سے کہا وہ کتیا کے بچوں والی بات پھر کہو"۔

بچہ مودبانہ کھڑا کہنے لگا "ہماری کتیا نے چھ بچے دیئے تھے۔ اب وہ سب کے سب بچے جمہوریت پسند بن گئے ہیں"۔

ہم نے بوکھلا کر کہا "مگر دو ہفتہ پہلے تو تم نے ایسا نہیں کہا تھا"۔

بچہ بولا "سر! اب کتیا کے بچوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں"۔

بعض اشخاص جو کتے کی خصلت کے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کی کوتاہی یا زیادتی پر "کتے کی اولاد" "کتے کا بچہ" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ہمارے پڑوسی کے بیٹے نے جیب خرچ نہ ملنے پر باپ کی ناک جھنجوڑ ڈالی باپ نے جھنجھلا کر بیٹے کا کندھا چبا ڈالا۔ کہتے ہیں۔ باپ نے پلاسٹک سرجری کی مدد سے دو انگل ناک کی جگہ چھ انگل کی ناک لگوا کر اپنی خاندانی ناک بچالی لیکن بیٹے نے جان کی خیر مناتے ہوئے باپ کے خلاف پولیس کیس کر دیا ہے!

کتوں پر دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ خارش جیسی متعدی بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ بلڈ پریشر یا شکر کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ملاوٹ چور بازاری اور اسمگلنگ نہیں کرتے۔ پبلسٹی کے قائل ہوتے ہیں نا آٹو گراف [illegible] کرواتے۔ تصویریں کھنچواتے ہیں ٹی وی پر جھلک بتاتے ہیں۔ ریڈیو اور اخبار والوں کو انٹرویو نہیں دیتے۔ اسپورٹس میں شریک ہوتے ہیں۔ کامنٹری نہیں سنتے۔ ہرن کے برخلاف کتے بہت تیز دوڑتے ہیں۔ گو کہ ان کی اسپیڈ معلوم کرنے کا ابھی تک کسی قسم کا میٹر ایجاد نہیں ہوا ہے۔

کتوں میں اتفاق رائے کی کثرت پائی جاتی ہے۔ دوسری گلی کے کتے کو دیکھ کر ہر کتا اپنی گلی میں شیر ہو جاتا ہے۔ اور بھونک بھونک کر لنگوٹیے کتوں کو جمع کر کے اس اجنبی کتے کو تڑی پار کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اس مثالی اتحاد کے پیش نظر انہیں اقوام متحدہ میں مناسب نمائندگی کے حقوق ملنا چاہیئے۔ ان میں اشرف المخلوقات سے زیادہ اتحاد پایا جاتا ہے۔

آج کل کتوں کے ستارے زوروں پر ہیں۔ بیمہ کمپنی ان کی پالیسی تیار کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ اب وہ کتے اور نمائش کے محدود دائرے سے نکل کر نامی "شیرو" اور "ٹائیگر" کے نام سے فلموں میں ایکٹنگ بھی کر رہے ہیں۔

ان کی بے لوث خدمات کا نہ صرف انسان بلکہ سرکاری ریکارڈ بھی ممنون ہے۔ دیکھو [illegible] قتل و خون کی جائے واردات کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کتے سائیکولوجی کی مدد سے اچھلتے کودتے [illegible] مجرم تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب وہ بھی "پدرم سلطان بود" کے تصور پر پھبکا کریں گے۔

ترقی یافتہ ممالک میں خواتین کے لحافوں میں کتوں کی موجودگی ان کے شوہر نامدار کے لیے عزت [illegible] خواتین کے بیان کے مطابق فالتو شوہر سے پالتو کتے زیادہ وفادار ہوتے ہیں!!

جدھر دیکھئے کرکٹ کے بارے میں بات چیت کرتا نظر آتا ہے۔ ہمیں چند لوگ ایسے بھی ملے جو کرکٹ سے زیادہ اظہر
میاں کے تعلق سے معلومات رکھتے ہیں۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ بولنگ اور بیاٹنگ کسے کہتے ہیں لیکن وہ جانتے تھے کہ
اظہر میاں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک صاحب نے کہا ٹسٹ کرکٹ میں اظہر میاں نے تین سنچریاں بنائی ہیں۔ نوجوان
اور بچے گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلنے لگے۔ وکٹوں کے نام پر دیوار پر تین لکیریں کھینچی گئیں لکڑی کا ٹکڑا بیاٹ بنا اور کنکر پتھر سے
لے کر ہاکی اور فٹ بال کے گولے بولنگ کے لئے استعمال ہونے لگے۔ کرکٹ اتنی چھوٹی جگہوں پر کھیلا جانے لگا کہ اب ہمیں
کرکٹ پر انڈور گیم کا شبہ ہونے لگا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کو ڈرائنگ روم میں مصروف کرکٹ دیکھ کر ڈانٹا تو ہمارے
ایک بزرگ نے کہا کھیلنے دو۔ ہمارے شہر میں میدان کہاں ہیں۔ اظہر میاں ایسے ہی جگہوں میں کھیل کر عالمی کھلاڑی بنے ہیں"۔

کرکٹ ایسا کھیل ہے جسے دیکھنے اور سننے میں بھی مزا آتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ کرکٹ کھیلنے سے
زیادہ دیکھنے اور سننے کا کھیل ہے۔ ہمارے شہر میں جگہ جگہ لوگ ٹی وی یا ریڈیو کے اطراف بیٹھے کرکٹ کو دیکھتے یا سنتے
رہتے ہیں۔ جب اظہر میاں کھیلنے آتے ہیں تو سبھی لوگ کام کاج چھوڑ کر اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ کرکٹ دیکھنے اور سننے
لگتے ہیں۔ اظہر میاں کے کھیل کے ساتھ ناظرین اور سامعین کی خوشی اور سسپنس قابلِ دید ہوتا ہے۔ یقین مانئے ہمیں
کرکٹ کھیلنے، دیکھنے یا سننے سے زیادہ لوگوں کو کرکٹ دیکھتا یا سنتا ہوا دیکھ کر لطف آتا ہے۔

" خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے"۔ اظہر میاں کی کامیابی دیکھ کر اس محاورہ پر ہمارا یقین پختہ ہوا
ہے۔ ریکارڈ قائم کرنے سے پہلے اظہر میاں ایک گمنام لڑکا تھا لیکن سنچریاں بنانے کے بعد شہرت اظہر میاں کے قدم چومنے
لگی۔ اخباروں کی سرخیوں میں وہ تھے۔ رسالوں میں انٹرویو آنے لگے۔ مبارکبادیوں کے انبار لگ گئے۔ انعام و اکرام سے
نوازے گئے۔ ترقی ملی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اظہر میاں تھے۔ ان کے روزمرہ کے مشاغل کی اطلاع آنے لگی۔ ان کی چھینکوں
اور سر درد پر تشویش کا اظہار ہونے لگا۔ ان کی پسند ناپسند، خواہش اور ارمان کا ذکر ہونے لگا۔ اکیس سالگرہوں کا پتہ
نہیں، بائیسویں سالگرہ سبھی نے مل کر منائی۔ جہاں بھی جاتے لوگ ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے
جانے کی کوشش کرتے۔ انھیں حالات نے ہمیں اس محاورہ میں ترمیم کرنے پر اکسایا کہ خدا جب دیتا ہے تو کھلاڑی
سنچریاں بناتا ہے۔

کامیابی کے بعد ہر کوئی اظہر میاں سے وابستگی میں فخر محسوس کرنے لگا ہے۔ اظہر میاں کے کئی لوگ رشتہ دار
بن گئے۔ ایک صاحب نے کہا "اظہر میاں ہمارے بھائی کا لڑکا ہے" جب ہم رشتہ کی تفصیل میں گئے تو پتہ چلا کہ موصوف
کے ہم زلف کے پھوپھیرے برادر نسبتی کے خالہ زاد بھائی اظہر میاں کے پڑوس میں رہتے ہیں جو حقیقی رشتہ دار ہیں۔ ان کا
تعارف اظہر میاں کے توسط سے ہونے لگا۔ چند دن قبل ایک صاحب کا ہم سے تعارف کروایا گیا "آپ اظہر میاں کے چچیرے
بھائی ہیں" یہیں تعارف ختم ہوا۔ اظہر میاں کے چچیرے بھائی کا نام اور نہ ہی اتا پتہ بتلایا گیا۔ جو ایسے اصحاب بھی
ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اظہر میاں کو بچپن سے جانتا ہوں جب وہ اپنے گھر کے سامنے کرکٹ کھیلتے تھے۔ میں

کچھ دیر ٹھہر کر اظہر میاں کا کھیل دیکھتا اور مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکا ایک دن ضرور بڑا کھلاڑی بنے گا۔"

ہمارے سماج میں سیاسی قائدین نامی ایک جنس ہوتی ہے جو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ موقع ہاتھ آیا کہ فائدہ اٹھانے لگے۔ اظہر میاں سنچریاں بناتے ہی قائدین مبارکباد پیش کرنے اور فائدہ اٹھانے لگے۔ ایک قائد نے اپنی انتخابی تقریر میں کہا "ہمارا ملک کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہمارے یہاں باصلاحیت نوجوانوں کی کمی نہیں ہے فرق صرف موقعوں کا ہے۔ مواقع فراہم کئے جائیں تو کئی اظہر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں میرے انتخاب کے بعد ہر محلہ میں ایک میدان ہوگا جہاں نوجوانوں کو کرکٹ کھیلنے کے تمام مواقع فراہم ہوں گے۔ ایک اور قائد نے فرمایا "فرقہ پرستی، گروہ بندی اور علاقہ واریت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہمیشہ نقصان ہی ہوتا ہے۔ اظہر میاں کو بہت دیر بعد موقع دیا گیا اور جب انھیں موقع ملا انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ ہم چاہتے تو پہلے ہی سے اظہر میاں کی صلاحیتوں کا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جانے آج ایسے کتنے اظہر لوگوں کی کوتاہ ذہنیت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔"

سیاسی قائدین کے بعد موقع سے فائدہ اٹھانے والوں میں تاجرین کا نمبر آتا ہے۔ اخباروں میں مبارکبادی کے اشتہارات شائع ہونے لگے "ہم اظہر میاں کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں —— ہمارے یہاں ہر قسم کا زیور خرید فرمائیے" "اظہر میاں کو ہمارے ٹی وی پر کھیلتا ہوا دیکھئے دس آسان قسطوں میں ٹی وی آپ کا ہو جائے گا۔" اس طرح کے اشتہاروں کے علاوہ اب اظہر میاں خود اشتہار بنیں گے کسی ٹوتھ پیسٹ کے لئے دانت دکھائیں گے تو کسی کپڑوں کی دکان کے لئے اچھے کپڑے پہنے پوز دیں گے۔ ریزر بلیڈ کے اشتہار میں داڑھی بناتے ہوئے کرکٹ کھیلیں گے۔ کوئی چائے ان کی ذاتی پسند ٹھہرے گی تو ساتھ میں وہ کوئی خاص برانڈ کی سگریٹ بھی استعمال کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ٹانک اظہر میاں کی کامیابی کا راز بنے گی۔

ہم نے مضمون ختم کر ڈالا لیکن اصل بات دھری کی دھری رہ گئی۔ ہم اور مدیر شگوفہ اظہر میاں کی ہیٹ ٹرک سنچریوں پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی عدیل الوجود ساز اور ریکارڈ توڑ کارنامے انجام دیتے رہیں۔

آمین ——!

عوام کی بے پناہ پشت پناہی کے ذریعے تلنگو سرزمین پر خوشحالی کے دور کا نفاذ

زمانے قدیم سے ہی تلگو عوام آرٹ اور کلچر کے پرستار رہے ہیں۔ تلگو عوام کی سرزمین ستواہنہ۔ اکشواکو، بسا کتیہ اور وجے نگر جیسی طاقتور سلطنتوں کی مسند رہی ہے اس علاقے کو بجا طور پر افراط و خوشحالی کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

عظیم الشان ماضی کے جذبہ کو اپنے اندر لیے ہوئے مسٹر این، ٹی، راما راؤ کی فعال قیادت کے تحت حکومت کی جانب سے بیشتر شعبوں میں ریاست کی ہمہ جہتی ترقی کی سمت پیش رفت کی گئی ہے۔ سماج کے کمزور طبقات کے لئے غذا، رہائشی سہولتیں اور لباس کی فراہمی میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔

حالیہ اسمبلی انتخابات میں عوام کی بے پناہ پشت پناہی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عوام حکومت کی کارگزاری سے مطمئن ہیں اور ترقی پذیر فلاحی اقدامات کی رفتار مزید تیز تر کرنے کے لئے لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔

کامیابی کے زائد از دو سال

★ ۹۶۶۵۴ لاکھ خاندانوں

چاول دو روپے فی کیلو

سے کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

کمزور طبقات کے لئے مستقل مکانات

★ ۱۱۸۵ لاکھ مستقل مکانات تعمیر کرائے گئے۔

★ مزید ۹۰ ہزار مکانات زیر تعمیر ہیں۔

★ ۱۰۱۸ لاکھ مکانات کی زمین تقسیم کی گئی۔

★ ۱۳۰۵۴ لاکھ کمزور طبقات کے خاندانوں کو فائدہ پہنچایا گیا۔

★ ہر ضلع میں درج فہرست اقوام کے طلبار کے لئے دو اقامتی مدارس کا قیام۔

★ پسماندہ طبقات کے طلبار کے لئے ۵۹۵ ہاسٹل کا قیام۔

پینے کا پانی

★ پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۲۸۱۸ نئے ذرائع مہیا کیے گئے ★ پینے کے پانی کے مسئلے سے دوچار ... مواضعات میں پانی کا مسئلہ حل کیا گیا۔

دیہی علاقوں کو بجلی کی سربراہی

★ ۳۳۱۰ مواضعات دیہی کو بجلی سربراہ کی گئی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بنگال کے چند مزاحیہ اخبارات و رسائل

تاریخ صحافت میں بنگال کا نام سرِفہرست آتا ہے چونکہ کلکتہ اردو صحافت کا جنم بھوم ہے۔ یہیں سے اردو کا پہلا اخبار (ہفتہ وار) "جامِ جہاں نما" نکلا جس کو ایک بنگالی ہری ہردت نے جاری کیا تھا اور جس کے ابتدائی چند شماروں کے مدیر اُن کے ایک ساتھی سدا سکھ تھے۔ بعد میں ہری ہردت ہی اس کے مالک و مدیر ہوگئے تھے۔ "جامِ جہاں نما" کا پہلا شمارہ ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو نکلا۔ یہ کبھی اردو، فارسی اور کبھی صرف فارسی اور پھر اردو فارسی کا مشترکہ پرچے کے طور پر نکلتا رہا اور کوئی چار سال تک زندہ رہا۔ اردو کا پہلا روزنامہ "اردو گائیڈ" بھی کلکتے سے نکلا۔ یہ بطور ہفتہ وار ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۸۵۸ء میں اسے روزنامہ میں بدل دیا گیا۔ اس کے مدیر ایک بنگالی مسلمان مولوی کبیر الدین احمد تھے۔ مکمل طور پر اردو نثر میں شائع ہونے والا پہلا ماہنامہ "نورِ بصیرت" جولائی ۱۸۸۸ء میں کلکتہ سے نکلا تھا جس کے مدیر سید محمد عبدالغفور شہباز تھے۔ یاد رہے کہ ماہنامے اس سے بہت پہلے ہی نکلنے لگے تھے [illegible] ہوتے تھے۔ کلکتے کو اردو صحافت میں اس لئے بھی بلند مقام حاصل ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہیں سے اپنا ہفت روزہ "الہلال" (۱۹۱۲ء) نکالا تھا جس نے صحیح معنوں میں اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا۔

بہر حال میں یہاں بنگال کی اردو صحافت کی تاریخ لکھنے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ مجھے صرف چند ایسے اردو اخبارات کے سلسلے میں مختصر طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں جو مزاحیہ تھے اور بنگال سے نکلے۔ [illegible] اردو صحافت بنگال [illegible] ہے اور نہ ہی بنگال کے طنزیہ مزاحیہ صحافیوں پر کوئی تحقیقی کام سامنے آیا ہے۔

ایسی صورت میں "پنچ" کا نام پہلا [illegible] مزاحیہ اخبارات ہندوستان کے کونے کونے سے نکلنے لگے [illegible] پنچ نام سے جو مزاحیہ ہفتہ وار نکلے ان میں "کلکتہ پنچ" [illegible] "بنگال پنچ" [illegible] شامل ہیں۔ "بنگال پنچ" ہر ماہ کی یکم، ۱۰ اور ۲۲ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر غلام حضرت خاں تھے۔ یہ رسالہ آٹھ صفحے کا [illegible]

حاجی محمود قاسم روداجی سیکش انتہائی ملنسار اور دوست نواز تھے۔ وہ کلکتہ کے مندر اسٹریٹ میں ایک پریس کے مالک تھے۔ خود ادیب یا شاعر نہیں تھے لیکن ادب دوست تھے۔ اُنہوں نے ایک ماہنامہ "صہبا" بھی ۱۹۳۸ء میں جاری کیا تھا۔

ہفتہ وار "چپت" کلکتہ :- یہ مزاحیہ ہفتہ وار بھی خوب مقبول ہوا لیکن اس نے بھی طویل عمر نہیں پائی۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں نکلا اور اپریل ۵۱ء میں بند ہوگیا۔ اسے رفیع احمد فدائی اور فہیم الدین احمد نکالا کرتے تھے اور اس کے مدیر جناب اقبال مرزاپوری تھے۔ "چپت" کے سرورق پر درج ہوتا تھا --- "چپت ہندوستان کا اکلوتا غم توڑ، قہقہہ آور، ادبی اور علمی دلچسپیوں سے لبریز ہفت روزہ شاہکار ہے"۔ اور اس کی قیمت کا ذکر یوں کیا جاتا ہے --- "چپت باز علامہ سنکی شاہ سلمہ الرحمان کی چپت چار آنہ، سالانہ دس روپیہ --" "چپت" میں خبریں کیوں کر شائع ہوتی تھیں کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو: ۱۲ر جنوری ۵۱ء کو ریلوے کرایہ بڑھنے کی خبر اُس نے یوں شائع کی ہے -- "سُنا ہے ریلوے کرایہ میں اضافہ ہونے والا ہے۔ مگر کرایہ پہلے اور دوسرے درجے کا نہیں تیسرے درجے کا بڑھے گا۔ سچ مچ کرایہ بڑھ جائے تو سرکار کی عقل مندی کا ایک اور ثبوت ملے گا۔ تیسرے درجہ میں سب سے زیادہ لوگ سفر کرتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح کرایہ سب سے زیادہ وہی لوگ دیتے ہیں۔ جب تھرڈ کلاس کا کرایہ بڑھے گا تو ریلوے آمدنی بہت بڑھ جائے گی"۔

عبدل ویکلی، کلکتہ :- پہلا شمارہ ۱۳ر نومبر ۵۳ء کو نکلا تھا۔ صرف ۲،۳ شمارے ہی نکلے ہوں گے اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ہفتہ وار مزاحیہ کارٹونوں کے لئے پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے مدیر اردو کے نامور کارٹونسٹ (جن کا وطن حیدرآباد تھا): غالب کے کارٹونسٹ کے طور پر مقبول ہوئے یعنی وہاب حیدر مرحوم کے چھوٹے بھائی مجید عبدل تھے۔ اُن دنوں وہاب حیدر کلکتہ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے اور "روزنامہ ہند" کلکتہ کے علاوہ راقم الحروف کے ہفتہ وار "فلم ویکلی" سے بھی وابستہ تھے۔ بعد میں وہاب حیدر بمبئی چلے گئے اور ہفتہ وار "عبدل ویکلی" بند ہوگیا۔ "عبدل ویکلی" کا ایک اشتہار "روزنامہ ہند" کلکتہ مورخہ ۲۸ر اگست ۵۳ء میں نکلا تھا جس میں کہا گیا --- "تصاویر، خاکے، کارٹون، ہنسنے اور ہنسانے کے لئے کلکتہ کی کسی ایک گلی سے عبدل ویکلی کا اجراء ہونے والا ہے۔ اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو بے تابی سے انتظار فرمائیں --"

ہفتہ وار "مابدولت" کلکتہ :- میرا خیال ہے کہ "مابدولت" کے بعد سے اب تک کلکتے سے پھر کوئی مزاحیہ پرچہ نہیں نکلا۔ حالانکہ ہفتہ روزہ "آبشار" میں بھی مزاحیہ مضامین ہوتے تھے لیکن اسے صرف مزاحیہ اخبار قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ بھی دو تین سال تک نکلنے کے بعد مالی دشواریوں کی بناء پر بند ہوگیا۔ ہفتہ وار "مابدولت" کو ڈسمبر ۶۶ء میں اقبال اکرامی مرحوم نے جاری کیا تھا۔ اقبال اکرامی مرحوم اردو کے نامور شاعر سید حرمت الاکرام (مرحوم) کے بڑے بھائی تھے۔ اقبال اکرامی کی پوری زندگی میدان صحافت میں کلکتے ہی میں گزری۔ وہ مختلف اخبارات کے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ اگر وہ اخبارات کے مزاحیہ کالم نہ لکھ کر ایک ادیب یا شاعر کی حیثیت سے کام کر سکتے تو ہندوستان کے نامور مزاحیہ [illegible] زندگی بھر روٹی کے چکر میں وہ کلکتہ کے مختلف اخبارات و رسائل سے منسلک ہی رہے اور ان کو ادب میں کوئی مقام [illegible] انہوں نے کتنے اخبارات میں کام کیا اور کتنے مختلف ناموں سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے کہنا مشکل ہے۔ ہفتہ وار "مضحکہ" کلکتہ کے حقیقی مدیر [illegible] [illegible] اور موت سے پہلے تک وہ روزنامہ "امروز" کلکتہ کے مدیر رہے ہیں!!

خرافات — مراسلے

محترم کمال صاحب، اسلام علیکم۔

میں یہاں بخیریت پہنچ گیا۔ کانفرنس ختم ہوئی لیکن ابھی تک آپ کو فرصت نہ ملی ہوگی۔ بہت سے کام نپٹا رہے ہوں گے۔ حیدرآباد میں ایک ہفتہ آپ حضرات کے درمیان بہت اچھا گزرا۔ یاد رہیں گے وہ چند دن افسوس رہے گا اس بات کا اپنے میزبانوں سے سر جوڑ کر گفتگو کا موقع نہ مل سکا۔ مگر مجبوری تھی۔ آپ کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ ہمارے سر پر سفر سوار تھا لیکن یہ بھی کم بات نہیں کہ ملنے اور ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ اس بڑی کامیاب کانفرنس کے منعقد کرنے کا سہرا آپ حضرات کے سر ہے۔ خدا ہمت اور حوصلے میں اضافہ کرے۔ کانفرنس کا انتظام مذاق نہیں تھا۔ مگر آپ سب کے اشتراک اور بے لوث خدمت نے سب کچھ کو آسان بنا دیا۔

میں ذاتی طور پر آپ کی مہمان نوازی کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے بحیثیت میزبان خاطر داری میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی۔ میری دعائیں آپ سب دوستوں کے لئے ——

مسیح انجم، حمایت اللہ، مجتبیٰ حسین، اطہر صاحبان کو سلام۔

جہاں قدر چغتائی بھوپال

۴۲۵ چراغ دہلی

نئی دہلی ۱۷

وقت [illegible]

عالم [illegible] صادق

تاریخ [illegible]

نام [illegible]

تعلیم [illegible]

پیشہ گدھوں کو انسان بنانا

قد صرف چھ فٹ (بعد از مرگ یہی سائز ہوتا ہے)

آمدنی نہ آمد نہ درآمد

شوق اردو فروشی

میاں کمال،

۲۶ دسمبر کو فرحت قمر کے ہاں چلا گیا۔ گوشت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ آج کل بیویوں کی زیادہ چلتی ہے لہٰذا کچھ تاخیر طعام میں ہوئی کہ اعلام نے شگوفہ دے ڈالا۔ وقت جو کاٹنا ٹھہرا مگر بھوکے پیٹ بھجن نہ ہو گوپالا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ:

عورت شادی کے بعد ایک سال تک چندر مکھی

عورت شادی کے بعد دو سال تک سورج مکھی

عورت شادی کے تین سال بعد جوالا مکھی، ۱۹۴۸ء میں پہلی بار فوجی کے طور پر پولیس ایکشن میں آیا تھا۔ خوب گولیاں چلائیں۔ مگر مرحوم مخدوم اور نائیڈو ذہن میں تھے اس میں زیادہ تر ہاتھ تھے عبداللہ مرحوم سجاد ظہیر ہی کا تھا۔ ۱۹۵۲، ۱۹۵۶، ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد آیا۔ ڈاکٹر علی زور، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی اور دوسرے ادیبوں شاعروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ حیدرآباد میرے لئے بربادآباد ہی ہو کر رہ گیا اب کہاں جاؤں! گورنر صاحب دلی میں، مجتبیٰ دلی میں یہ الفاظ دیگر حیدرآباد دلی میں اور ہاں ڈاکٹر امیر عارفی دلی [illegible] شایاں نہ کرے کہ میں آپکے خط کا انتظار کروں اور اگر آپ نے نصف ملاقات کرنے کی کوشش کی تو وہ شگوفہ چھوڑوں گا کر بارا۔ پھول رات کو [illegible] میں تبدیل کر دوں گا۔

مخدوم [illegible] آپ کو "ہم" کہتے ہیں یا [illegible] علام

طیب پاشا ایم اے بی ایڈ

[illegible]

R. No. 15822/68
SHUGOOFA Hyderabad-1
Vol. 18 Copy 3
Postal Regd. No. H/HD 8
March 1985 Phone : 557716

APRIL 1985 **Rs. 3-00**

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

جلد ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء شمارہ ۴

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مجلس ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد منظور
مسیح انجم

منیجر:
سمیع جلیل

سرورق:

کتابت: محمد عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان حیدرآباد ۲

قیمت فی پرچہ: -/3 روپے
زر سالانہ: تیس روپے
عرب ممالک سے: ایک سو روپے
امریکہ، برطانیہ: ایک سو پچاس روپے

خط وکتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: آفس 557716 مکان [illegible]

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے [فہرست]

○ قاضی جی دُبلے [رپورتاژ]

ایک سفر ہیومرادلمپکس کے لیے ؛ عطاءالحق قاسمی ۷

○ مَالِ مُفت: [انشائیے]

ہمارے شاعر ؛ ڈاکٹر حفیظ قتیل ۱۵

دستی ؛ ڈاکٹر راہی قریشی ۱۹

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ؛ بانو سرتاج ۳۵

ضرورت رشتہ ؛ غافل انصاری ۴۵

میرے عہد میں ؛ بیدبرادی قاں ۴۷

حاجی مولا بخش ؛ پرویز باغی ۴۹

خرافات - (مراسلے) ۴۴، ۵۷

○ گیس کا شہر [بھوپال]

شہر آشوب ؛ جہاں قدر چغتائی ۲۳

بھاگو بھاگو ؛ سیّد مصطفیٰ تاج ۲۹

○ مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (حیدرآباد)

نہیں لگا مگر پھر لگ گیا ؛ عابد معز ۳۹

○ مَالِ مسروقہ: [ڈائجسٹ]

نام کی برکت ؛ وجاہت علی سندیلوی ۵۲

○ چُوں [منظومات]

ضیاءالحق قاسمی ۱۸
بانغ بہاری ۲۲
چنان شرقی ۳۴
شہزاد مجھوی ۳۸
مسٹر بھارتی ۴۴

پاگل عادل آبادی ۱۸
عالم تاجوری ۲۲
دلیپ بادل ۳۴
خنجر عادل آبادی ۳۸
جگن نظام آبادی ۵۵
شاغہ ــــ ۵۵

بے دھڑک ــــــــ ۲۲
مجنوں ــــــــ ۲۲
رشید عارف ــــــــ ۳۴
ہاشم عظیم آبادی ــــــــ ۴۴
مولانا ورث موی ــــــــ ۵۵

ماہنامہ **شگوفہ**

کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر [نثر]

مہمان مدیر : یوسف ناظم

● ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں :۔
گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی) گل کی (ٹامل)، دلونو بھٹ اور گگن بہار لال مہتا (گجراتی) فتور آنند (اڑیا) راؤ (تلگو) بیجی (کنڑا) ایپا پانی کر (ملیالم) نارائن گنگو پادھیائے (بنگال) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری) فسرن پورن شرما (راجستھانی) شرد جوشی (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم۔ ○ ہندوستان کی چند اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ :۔
وے ویش ٹھاکر (ہندی)، ہمانیش گوسوامی (بنگالی) عزیزہ تمنائی (ٹامل) این وی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ (تلگو) شیام سندر مصرا (اڑیا)، ڈاکٹر سکنیا جوہری (گجراتی) حمید الماس (کنڑی) ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی) ڈاکٹر اعجاز مدنی (مراٹھی) پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم) کرت بابانی (سندھی) ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی) اور ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی)۔

○ اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم

○ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء ○ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں، فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پرویز ید اللہ مہدی کے منتخب مضامین اور خود نوشت سوانح

○ پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیا گیا ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا انٹرویو ○ مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی
○ تخلیق کاروں کی تصویریں ○ اور دوسری کئی دلچسپیاں۔

○ ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحات ○ قیمت : ۳۰ روپے، ۴۰ روپے (مجلد)

---

* سالانہ خریداروں سے ۱۵ روپے، ۵ روپے زائد بھجوانے پر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا۔

نوٹ :۔ خریداروں کو یہ نمبر مئی کے مہینہ میں پوسٹ کیا جائے گا۔

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

سفرنامہ بھارت

ایک سفر "ہیومر اولمپکس" کے لئے!

میں لاہور ایئرپورٹ کے انٹرنیشنل ڈیپارچر میں کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر اب پیر و مرشد سید ضمیر جعفری کے انتظار میں تھا دہلی جانے والی فلائٹ کے بارے میں اگرچہ ابھی تک کوئی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی تھی مگر اس کی روانگی کا وقت "قریب سے قریب تر" ہوتا جا رہا تھا اور ضمیر صاحب کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا اس دوران میں دو تین دفعہ باہر سے بھی جھانک آیا تھا مگر اس "تانک جھانک" کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ چوتھی دفعہ جھانکنے پر گیٹ پر کھڑے "دربان" نے مجھے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ حضرت ذوقؔ کا شعر یاد آ گیا؎

جھانکتے تھے ہم انھیں جس روزن دیوار سے | وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

لیکن بالآخر افلاک سے نالوں کا جواب آیا میں نے دیکھا کہ ۶۸ سالہ سید ضمیر جعفری اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ جھومتے جھامتے کچھ اس تیزی سے لاؤنج میں داخل ہو رہے ہیں۔ جیسے پابندی وقت کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلے ہوئے ہوں میں نے انہیں راستے ہی میں جا لیا اور پوچھا "حضرت! اتنی دیر کیسے ہوئی؟ بولے "دیر؟ میں تو بہت دیر سے باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں! میں نے پوچھا کتنی دیر سے؟ یہی کوئی گزشتہ پانچ منٹ سے! میں نے ہنستے ہوئے ان کی ٹرالی کسٹم والی لائن کی طرف کھینچتے ہوئے کہا ان گزشتہ پانچ منٹوں سے پہلے آپ کہاں تھے؟ بولے گھر سے تو صحیح وقت پر نکلا تھا مگر راستے میں "میٹھا" ڈھونڈتے ہوئے دیر ہو گئی مٹھائی کی دوکانیں تو راستے میں کئی نظر آئیں مگر اچھا میٹھا بڑی مشکل سے ایک دوکان سے ملا "تم بھی کھاؤ" یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیٹھے کے دو ٹکڑے مجھے تھما دیئے!

کسٹم پر کھڑے خوش پوش، خوش رو اور خوش ذوق نوجوان فرحت عباس نے جس طرح مجھے پہچان لیا تھا اسی طرح وہ ضمیر صاحب کو دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھا ان کے چار پانچ خوب صورت شعر خود انہی کو سنائے اور معمول کی کارروائی کے بعد چار پانچ منٹ میں انہیں فارغ کر دیا یہی "سلوک" امیگریشن والوں نے کیا اور پھر ہم پی آئی اے والوں سے انڈین ایرلائنز

کا بورڈنگ کارڈ لے کر سیکورٹی کے عملے کو تلاشی دینے کے لئے لائن میں کھڑے ہو گئے سیکورٹی والوں نے خودکار مشین کے ساتھ جسم ٹٹولنا شروع کیا تو میرے پورے جسم سے جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگیں سیکورٹی والوں نے تو خیر چونکنا ہی تھا خود میں بھی کچھ حیران سا ہو گیا کہ

خود مجھ کو اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

جب کہ سید ضمیر جعفری کی باری آنے پر خودکار مشین نے چوں تک نہ کی آواز صرف خالی برتن پیدا کرتے ہیں بھرے ہوئے برتن آواز نہیں کیا کرتے!

اب کیا کیا جائے فلائٹ تو خاصی لیٹ ہے میں نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے مسافروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

کرنا کیا ہے؟ پیٹھا کھایا جائے یہ کہہ کر ضمیر صاحب نے جیب سے پیٹھے کے دو اور ٹکڑے نکالے اور ان میں سے ایک میری طرف بڑھا دیا۔

میں اور سید ضمیر جعفری حیدرآباد دکن میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے بھارت جا رہے تھے اس کانفرنس میں پاکستان کی شرکت کے حوالے سے ہماری حکومت نے بھی خاصی دلچسپی لی تھی اور یوں ہماری حیثیت پاکستانی مندوبین کی تھی ادھر اگرچہ یہ کانفرنس "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے زیر اہتمام منعقد ہو رہی تھی مگر ہم مہمان حکومتِ ہند کے تھے آئی سی سی آر (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز) نے ہماری آمد و رفت اور بھارت میں قیام کے اخراجات نیز خود ہمیں بھی برداشت کرنا تھا اس سے قبل صرف فیض صاحب آئی سی سی آر کے مہمان رہ چکے تھے اور یوں میزبانی کا یہ دائرہ پہلی بار وسیع ہوا تھا آج ۶ فروری ۸۵ء کی رات ہمیں دہلی میں قیام کرنا تھا اور اگلے روز یعنی سات تاریخ کو حیدرآباد کے لئے روانہ ہونا تھا جہاں آٹھ سے بارہ فروری تک کانفرنس منعقد ہو رہی تھی حیدرآباد دکن تک ایک زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نقطۂ عروج! لیکن ہمیں آج کا حیدرآباد دیکھنا تھا! جیب اللہ اوج نے بھی کہا تھا حیدرآباد کو میرا سلام کہنا اور میرا بہت پیار بھی دینا! مجھے حیدرآباد کو یہ پیغام پہنچانے کی بہت جلدی تھی۔

پونے پانچ بجے انڈین ایئرلائنز کا جہاز دہلی کے لئے پرواز کر رہا تھا پائلٹ ایک سردار جی تھے ہم دہلی تک کی دوری چالیس منٹ میں پوری کریں گے ہمیں امید ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا دھنیواد! ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمنٹ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد پلاسٹک کی ایک تھیلی میں کاجو اور ایک کیک کا ٹکڑا ماتھے پر بندیا لگائے ساڑھی میں ملبوس ایک ایئر ہوسٹس نے مسافروں کو تھمانا شروع کر دیا میں نے "موازنہ انیس و دبیر" کی غرض سے انہیں غور سے دیکھا کہ پی آئی اے اور انڈین ایئرلائنز کی ایئر ہوسٹسوں میں عقیدے کے علاوہ کیا فرق ہے معلوم ہوا کہ انڈین ایئرلائنز والوں نے بھی ایئر ہوسٹسوں کے انتخاب میں اخلاقی پہلو کو اولیت دی ہے تاکہ مسافروں کے دل میں وسوسے پیدا نہ ہوں اور یوں ان کا ایمان خطرے میں نہ پڑے تاہم اس کے بعد دہلی سے حیدرآباد، حیدرآباد سے کلبرگہ، بمبئی سے پھر سے دہلی اور دہلی سے واپس لاہور پرواز کرتے ہوئے مجھے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنا پڑی امید ہے پی آئی اے والے بھی اپنے انتخاب پر نظر ثانی کریں گے۔

لاہور سے پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہم بھارت کی فضائی حدود میں تھے فداجانے اپنے ملک کی حدود سے نکلتے ہی میں خود کو غیر محفوظ سا کیوں محسوس کرنے لگتا ہوں بس یوں لگتا ہے جیسے ایک مشفق ہاتھ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے میں نے گھبرا کر "ٹائمز آف انڈیا" اٹھالیا اور اس کے مطالعے میں محو ہو گیا! اس کے اندرونی صفحات پر ایک چار کالمی سُرخی تھی "ہومر اور لیک" اور یہ سُرخی اسی عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے حوالے سے تھی جس میں شرکت کے لئے میں اور ضمیر جعفری حیدرآباد جا رہے تھے مجھے اس سُرخی نے بہت مزہ دیا اور جب خبر کا متن پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس کانفرنس میں پاکستان سمیت چودہ ملکوں کے مزاح نگار شریک ہو رہے ہیں خبر میں باقی مندوبین کے نام نہیں تھے البتہ پاکستان کے حوالے سے ضمیر صاحب کے ساتھ میرا نام بھی توصیفی جملوں سمیت درج تھا۔

صحبت صالح ترا صالح کند

مجھے اس دوران سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ ہم نان سموکنگ ایریا میں ہیں حالاں کہ میں نے بورڈنگ کارڈ لیتے وقت تاکید کی تھی کہ مجھے سگریٹ نوشوں کی صحبت میں جگہ دی جائے تاہم میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ہر قریب سے گزرتے ہوئے سٹورٹ سے احتیاطاً پوچھا یہاں سگریٹ پینے کی ممانعت تو نہیں ہے پوچھا اس لئے کہ بقول ایک خان صاحب کے پوچھنے میں کیا حرج ہے ؟

نہیں نہیں آپ شوق سے پیئں! سٹورٹ نے خوش دلی سے کہا۔

بس پھر اللہ دے اور بندہ لے بندے نے وہ دھواں دھار سگریٹ نوشی کی کہ اس سے پہلے کھڑکی سے باہر تو بادل تھے ہی اندر بھی بادل ہی بادل چھا گئے تھوڑی دیر بعد برابر والی رو سے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر آیا "ایکسکیوز می" میں نے دیکھا کہ ایک گورے چٹے ننھی منی داڑھی والے مولوی صاحب مغربی سوٹ میں ملبوس مجھ سے مخاطب ہیں میں سمجھا اپنے مولانا کوثر نیازی ہیں مگر جب انہوں نے بزبان انگلیسی مجھ سے مذاکرات کا آغاز کیا تو پتہ چلا کہ یہ تو کوئی ناکارۂ خلائق امریکی ہے۔

آپ مہربانی فرما کر سگریٹ بجھا دیں ان نشستوں پر سگریٹ نوشی ممنوع ہے امریکی نے قانون کا حوالہ اس طرح دیا جیسے امریکہ نے ہیروشیما پر بم کوئی قانونی تقاضا پورا کرنے کے لئے پھینکا تھا۔

میں تعمیل ارشاد ضرور کرتا مگر جہاں بیٹھ کر میں سگریٹ نوشی کر رہا تھا وہاں اس کی اجازت ہے میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے عرض کی۔

یہ درست نہیں ہے اس لائن میں سگریٹ نوشی کی ممانعت ہے امریکی نے کہا۔

ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں مگر آپ احتیاطاً سٹورٹ سے پوچھ لیں ہو سکتا ہے اس ضمن میں میری معلومات ہی درست ہوں!

تھوڑی دیر بعد امریکی نے قریب سے گزرتے ہوئے سٹورٹ کو روک لیا کیا اس لائن میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے ؟

یس سر!

پھر یہ صاحب! سگریٹ کیوں پی رہے ہیں امرکی نے پوچھا۔

ان کی سیٹ دیوار کے سامنے ہے اور یہ دی آئی پی سیٹس ہیں وی آئی پی سگریٹ نوشی کر سکتے ہیں!

یہ سن کر میں نے کمینی سی نظروں سے اس بونے سے امرکی کو دیکھا ابھی پونا سگریٹ باقی تھا مگر میں نے ایش ٹرے میں بجھا دیا فتح یابی کی صورت میں اپنی عظمت کا ثبوت عموماً اسی طرح پیش کیا جاتا ہے۔

اب دہلی قریب آرہا تھا اور جہاز آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا ضمیر صاحب اس دوران اونگھ رہے تھے میں نے انہیں ٹھوکا دیا ضمیر صاحب اُٹھیئے دہلی آگیا ہے ضمیر صاحب نے آنکھیں کھولیں اور کہا کم بخت اپنی زبان درست کر، دہلی نہیں آیا ہم دہلی پہنچ گئے ہیں اور ساتھ ہی ہنسنا شروع کر دیا کہ یہ جملہ شفیق الرحمٰن کا تھا جن کا ایک کردار اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے ارے کم بخت لکھنؤ نہیں آیا ہے، ہم لکھنؤ پہنچ گئے ہیں۔ اس پر مجھے ابن انشاء یاد آگئے جنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجاب والے جتنا خیال اپنی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا خیال زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور یوپی والے جتنا خیال زبان کی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا خیال اپنی صحت کا بھی رکھیں۔

اب جہاز لینڈ کرنے والا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد سکھ پائلٹ نے آرام سے لینڈ کرنے کی بجائے دھم سے جہاز زمین پر گرا دیا غالباً یہ سوچ کر کہ اور کچھ نہیں تو جہاز کو ہی نقصان پہنچاؤ میں نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دہلی کے پالم ایرپورٹ پر قدم رکھا تو گھڑی پر پونے چھ بجے تھے میں نے گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا ضمیر صاحب دہلی سے لاہور کتنا قریب ہے؟

ہاں ضمیر صاحب نے کہا اور کتنا دور بھی ہے۔

دہلی کے پالم ایرپورٹ پر اب جو مسئلہ درپیش تھا۔ وہ امیگریشن اور کسٹم والوں سے جان بخشی کروانے کا تھا کیوں کہ یہاں تو کوئی چہرہ شناس حتیٰ کہ مردم شناس بھی نظر نہیں آتا تھا سو میں نے ضمیر صاحب سے کہا ضمیر صاحب، ہمارے لئے "علاقہ غیر" شروع ہو گیا ہے۔ اب کیا کیا جائے" ضمیر صاحب نے کہا "کرنا کیا ہے، شرافت سے قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کیا جائے" سو ہم دو طویل قطاروں میں سے ایک طویل قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دراصل ایک قطار دولت مشترکہ کے ممبر ملکوں کے باشندوں کے لئے تھی اور دوسری قطار ان مسافروں کی جو دولت مشترکہ کے رکن ملکوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر عالم یہ تھا کہ یہ دونوں قطاریں اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتی تھیں اور یوں دولت مشترکہ سے وابستہ یا نا وابستہ مسافروں سے یکساں سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔ میں نے ضمیر صاحب سے کہا "دولت مشترکہ سے پاکستان کی علیحدگی کا فیصلہ مجھے آج پہلی بار دانشمندانہ محسوس ہوا ہے کیوں کہ ہر دو صورتوں میں اگر قطار ہی میں لگنا تھا تو پھر لے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟" اسی دوران ضمیر صاحب قطار میں سے نکال کر ایک خالی بنچ پر جا کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر بعد وہ ٹائلٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اس کے بعد انہوں نے ڈیوٹی فری شاپ میں جھانکنا شروع کر دیا اور اب وہ ایک لالہ جی سے باتوں میں مشغول تھے یعنی

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

اور پھر یوں ہوا کہ پاکستانی شلوار کرتے میں ملبوس، جیکٹ پہنے عینک لگائے گندمی رنگ کا ایک بوتا سا نوجوان ہماری طرف آیا اور ہمیں مخاطب کر کے کہا "ضمیر صاحب؟ قاسمی صاحب؟" اور پھر اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مجھے اشفاق گوندل کہتے ہیں میں یہاں پاکستانی سفارت خانے میں پریس اتاشی ہوں" گویا یہ "اپنے وطناں دی بولی" تھی۔ ان کے ساتھ ہمارے ویزا سیکشن کے معین صاحب بھی تھے۔ شاعر نے کہا تھا

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا ÷ بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اور یہ شعر ہماری قوم کے گوڈوں گٹوں میں بیٹھ گیا ہے کیوں کہ ہم رہنمائی کے لئے بھی کسی مسیحا یا کسی خضر کی بجائے کسی ہمدم دیرینہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اشفاق گوندل ہمارے ہمدم دیرینہ نہیں تھے کیوں کہ آج پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہو رہی تھی، چنانچہ وہ ہمارے لئے مسیحا اور خضر ثابت ہوئے ہمیں لائن میں سے نکالا، منٹوں، سکنڈوں میں امیگریشن کے مراحل سے فارغ کیا، چشم زدن میں کسٹم کے پل صراط پر سے گزارا اور پھر ہم ان کے رفیق کار معین صاحب کے ساتھ باہر آگئے!

اور باہر ایک نوجوان تیر کی طرح میرے پاس آیا "قاسمی صاحب" مجھے وہ شکل صورت سے نجومی نہیں لگتا تھا۔ مگر اس کے ستاروں کا حساب بالکل درست تھا۔ "جناب نے بالکل درست فرمایا، بندہ قاسمی صاحب ہی ہے اور یہ ضمیر جعفری صاحب ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ "اچھا اچھا، جیرزازی صاحب" اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمستے کیا "میرا نام گپتا ہے۔ میں آپ کے سواگت کے لئے آئی سی سی آر (انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز) کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ حکومت ہند کے مہمان ہیں۔ مسز ترہ پاٹھی نے آپ کو آداب کہا ہے" یہ مسز ترہ پاٹھی آئی سی سی آر کی ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھیں۔ بعد میں ان کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تو جی میں آئی کہ ان کی حسن کارکردگی میں ان کے حسن اور حسن اخلاق کے نمبر بھی شامل ہونے چاہئیں مگر ایسے معاملات میں وطن میں ہماری کون سنتا ہے کہ پردیس میں سنے گا؟

آپ کے لئے "کنشکا" ہوٹل میں کمرے ریزرو ہیں۔ اور ایک گاڑی بھی آپ کی ڈسپوزل پر ہے۔ آپ سیدھا ہوٹل جانا پسند کریں گے یا اس سے پہلے کوئی اور پروگرام بھی ہے؟" گپتا جی نے پوچھا

اس وقت میری گھڑی میں شام کے سات بجے تھے۔ انڈیا ہم سے آدھ گھنٹہ آگے ہے، چنانچہ میں نے اپنی گھڑی کی سوئیاں ساڑھے سات پر کیں اور گپتا جی سے کہا "ہم سیدھے ہوٹل چلیں گے" اشفاق گوندل نے کہا "اور پھر وہاں سے سیدھے میرے گھر، کیوں کہ آپ لوگوں نے رات کا کھانا میری طرف کھانا ہے۔ میں نے اپنے اور آپ کے بعض دوستوں کو بھی مدعو کیا ہوا ہے!"

اور پھر مسٹر گپتا کے ساتھ بھارت کی بنی ہوئی ایمبیسیڈر کار میں بیٹھ کر ہم ہوٹل کنشکا کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں

راستے میں منیر صاحب کے کان میں کہا "ہم بھارت سے آدھا گھنٹہ پیچھے ہیں اور اس آدھ گھنٹے میں بھارت نے اپنی صنعت اور جمہوریت کی بنیادیں مستحکم کی ہیں" ظاہر ہے قوموں کی زندگی میں بتیس چھتیس سال ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے

دہلی کی کشادہ سڑکوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے چوراہوں سے گزرتے ہوئے راستے میں کئی باراتیں روایتی انداز کی نظر آئیں۔ ایک بارات کا دولہا سر پر لنگی باندھے فٹن میں بیٹھا ہوا تھا، آگے آگے بینڈ باجے والے تھے اور پیچھے بیسیوں باراتی ہاتھوں میں ہنڈولے اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ذرا آگے چل کر ایک فٹ پاتھ کے کنارے یہ کچھ باراتی جن میں خواتین بھی تھیں کچھ پریشان سے کھڑے تھے۔ ان کے برابر میں چاندی کے زیورات سے لدا ہوا گھوڑا کھڑا تھا، جس پر دولہا موجود نہیں تھا، غالباً یہ مردِ دانا موقع پا کر فرار ہو گیا تھا۔ کار نئی دہلی کی سڑکوں پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد ہم فائیو سٹار کنشکا ہوٹل کی عظیم الشان لابی میں کھڑے کاؤنٹر کلرک سے اپنے کمرے کی چابیاں وصول کر رہے تھے۔ گپتا جی ہمیں کنشکے کہہ کر رخصت ہو گئے تھے، اب انھیں ہمیں کل ایئر پورٹ پر چھوڑنے کے لئے آنا تھا، جہاں سے ہم نے حیدرآباد دکن میں عالمی مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہونا تھا۔

۶۱۷ اور ۶۱۸ نمبر کمرے میں پہنچنے کے لئے جونہی ہم لفٹ میں داخل ہوئے، لفٹ کچھ اس پھرتی سے بند ہوئی جیسے اوپر پہنچنے کی ہم سے زیادہ اسے جلدی تھی۔ اسی طرح چھٹے فلور پر پہنچ کر لفٹ میں سے نکلتے ہوئے ہم اس کی پھرتیوں کی وجہ سے ایک بار پھر اس میں پھنستے پھنستے رہ گئے۔ اور اس کے بعد دو چار ایسے تجربات سے گزرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ "لفٹ" خواہ لفٹ سے مانگی جائے یا امریکہ سے، اپنی گردن بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔

سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اس ہوٹل کی لفٹ کی کرشمہ سازیاں تو ہم دیکھ چکے تھے، اس کی بدحالی کی دوسری صورتیں کمرے میں پہنچ کر بھی نظر آئیں۔ پس ثابت ہوا کہ سرکار کی تحویل میں جو چیز چلی جائے اس میں خیر کا پہلو ذرا کم کم ہی نظر آتا ہے چنانچہ ضمیر صاحب نے ہوٹل کی خوبصورت لابی دیکھی تھی اور اب پریشانی کے عالم میں اس ہوٹل کا باطن دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ان سے نہ رہا گیا کہنے لگے "اقبال نے ایک مصرعہ اس ہوٹل کے بارے میں بھی کہا ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کونسا!" بولے یہی کہ ؎

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

میں نے ہنستے ہوئے منیر نیازی کے انداز میں کہا "بالکل ٹھیک، لیکن اب میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، آپ بھی ذرا منہ ہاتھ دھولیں، ابھی اشفاق صاحب کے ہاں جانا ہے" اور ابھی میں یہ جملہ ادا کر رہا تھا کہ تین صاحب آدھمکے "چلئے جناب! اشفاق گوندل صاحب کے ہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے!"

سروجنی نگر میں واقع اشفاق گوندل کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ان کی بیگم منورما اور ڈاکٹر خلیق انجم کے علاوہ پاکستان ایمبیسی کے منسٹر انفارمیشن حسن عسکری بھی موجود تھے۔ حسن عسکری کسی زمانے میں اردو کے معروف افسانہ نگار، جو ابن سعید کے نام سے افسانے لکھا کرتے تھے اب انہیں کالعدم افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے کہ فرائض منصبی

غفلت کے اندیشے سے افسانہ نگاری چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہاں ساجد صاحب بھی تھے ہمارے کرشن آتاشی، بے حد ہنس مکھ۔ ڈاکٹر خلیق انجم محقق ہونے کے باوجود اپنے برادرِ عزیز مشفق خواجہ کی طرح بے پناہ فقرے باز ہیں۔ چنانچہ وہ دائیں بائیں جملے لڑھکاتے رہے۔ انہیں فقرہ سوجھ جائے تو فقرہ ضائع نہیں کرتے، خواہ بندہ ضائع ہو جائے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "دہلی میں داغ پر سیمینار ہو رہا ہے اگر آپ ایک دن اور رک جائیں تو اس کے ایک اجلاس کی صدارت فرما کر ہماری عزت افزائی کریں!" مگر ابھی ان کا فقرہ ادھورا تھا، بولے "ہمارے یہاں بڑے بڑے عجیب لوگ صدارت کرتے ہیں آپ تو ماشاء اللہ پھر بھی تھوڑے سے بہت معقول آدمی ہیں؟" ڈاکٹر گوپی چند نے اس پر قہقہہ لگایا اور خلیق انجم سے کہا "انہوں نے تو کل چوں کہ لا دیا جاتا ہے، لہٰذا اس دفعہ بھی سابقہ روایات کے مطابق آپ خود صدارت کریں" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان دنوں اپنے مضامین کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ ابھی انہوں نے اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا، میں نے کہا "نارنگ صاحب اس مجموعے کا نام "نارنگ خیالی" رکھ لیں"۔

جب ہم کھانا کھا کر نکلے تو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ صبح صبح میرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف ہوٹل کی افسر مہمان داری تھیں۔ ایک تو میں نیند میں تھا، دوسرے میں پردیسی تھا اور تیسرے وہ انگریزی بول رہی تھیں، مجھے جو سمجھ آیا وہ یہ تھا کہ کوئی خاتون ہے جو نیچے لابی میں موجود ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے، کمرے میں تشریف لے آئیں"۔ بہت دیر انتظار کیا، مگر وہ آئی ہی نہیں۔ . . . میں نے ضمیر صاحب کے کمرے میں فون کیا اور کہا اس قوم پر ابتلاء کا نزول ہونے والا ہے کیوں کہ یہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں ہیں اور پھر میں نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ ضمیر صاحب یہ سن کر ہنسے اور کہنے لگے "اس نے مجھے بھی ابھی ابھی فون کیا تھا اور پوچھا تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے نیز یہ کہ رات کیسی بسر ہوئی ہے۔ میں نے کہا کوئی تکلیف نہیں، باقی رات ویسے ہی بسر ہوئی ہے، جیسی پردیس کی بسر ہوتی ہے!" تب میں نے جانا کہ اس دیوی نے غالباً مجھ سے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ بس میرے اور ضمیر صاحب کے جواب میں فرق صرف یہ پیدا ہوا کہ میں دسویں جماعت کی طرح اس دفعہ بھی ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی غلطی کر بیٹھا۔

ناشتے کی میز پر ضمیر جعفری نے کہا "یار ہم تو خاصے امپورٹنٹ لوگ ہیں، ایک عالمی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں، جس میں دنیا کے دوسرے چودہ ملک بھی شریک ہیں، ایئرپورٹ پر حکومتِ ہند کا نمائندہ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا، ہمارے سفارت خانے کے لوگ بھی ہمیں ریسیو کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جہاز میں بھی ہمیں وی آئی پی نشستوں پر بٹھایا گیا۔ ٹائمز آف انڈیا اور دوسرے موقر اخباروں نے ہماری آمد کی خبر کو اہمیت دی ہے چنانچہ اپنی اہمیت کا اندازہ تو بس ان دو چار گھنٹوں ہی میں ہوا ہے!" میں نے عرض کیا "آپ نے بجا فرمایا، مزید اہمیت اور اپنے وی آئی پی ہونے کا اندازہ آپ کو ناشتے کے فوراً بعد ہوگا!" ضمیر صاحب نے پوچھا "وہ کیسے؟" میں نے کہا "وہ ایسے کہ یہاں سے اٹھ کر ہم سیدھے تھانے جائیں گے اور بیتہ الف کے بدمعاشوں کی طرح اپنی حاضری لگوائیں گے کیونکہ قانون کے مطابق چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہمیں تھانے میں اپنی حاضری لگوانی ہے"

ضمیر صاحب کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم بھارتی حکومت کے مہمان ہیں، پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں، ادیب ہیں، دانشور ہیں، کیا ہمیں اس حاضری سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا، ہمارا سفارت خانہ تو بھارت سے پاکستان جانے والے دانشوروں کو بیشتر صورتوں میں اس قانون سے مستثنیٰ قرار دے ڈالتا ہے!" ... "کرتا ہوگا" میں نے کہا "لیکن آپ جلدی سے چائے ختم کریں، نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!"

اور اب ہم دی آئی پیز، انکم ٹیکس کے دفتر کے پاس واقع پولیس کمشنر آفس میں دہلی میں اپنی آمد لکھوانے کے لئے قطار میں کھڑے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں جب میں اور اجمل نیازی انبالے کے مشاعرے میں شرکت کے بعد اسی دفتر میں اپنی ارائیول لکھوانے کے لئے پہنچے، تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے پولیس کے اہلکار نے ہمارے کاغذات دیکھ کر کہا تھا "آپ نے انبالے سے روانہ ہوتے ہوئے وہاں سے ڈیپارچر نہیں لکھوایا۔ لہٰذا ہم آپ کی ارائیول نہیں لکھ سکتے کیوں کہ جب آپ انبالے سے روانہ ہی نہیں ہوئے تو دہلی میں آپ کی آمد کیسے لکھی جا سکتی ہے" پھر اس پولیس والے نے ہمیں بتایا کہ آپ نے سنگین جرم کیا ہے، اس کی سزا پانچ سال قید ہے۔ لیکن تین وجوہ کی بنا پر آپ کو معاف کیا جاتا ہے، پہلی وجہ یہ کہ آپ مہمان ہیں، دوسری یہ کہ آج ہولی ہے اور تیسری وجہ یہ کہ آپ قوال ہیں!" تیسری وجہ سن کر اجمل نیازی اپنے لمبے لمبے بالوں کو نوچنے لگا مگر پولیس والے نے ازراہِ لطف و کرم پورے اطمینان سے کہا "اب آپ فوراً واپس انبالے پہنچیں!" وہاں تھانے سے ڈیپارچر لکھوائیں اس کے بعد دہلی آئیں تاکہ ہم آپ کی ارائیول لکھ سکیں!" ہم نے بہت کہا کہ ہم انبالے سے ڈیپارچر لکھوا کر آئے ہیں، مگر اس کا کہنا تھا کہ ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں مگر کاغذوں پر یہ ڈیپارچر درج نہیں ہے، خدا کا شکر ہے اس دفعہ ہمیں کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی شرمتی جی نے جلد خلاصی کر دی۔

ہوٹل واپس پہنچے تو گپتا جی ہمارے انتظار میں تھے۔ ہم نے انھیں اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا، وہ جھجکتے جھجکتے کمرے میں آئے۔ ہم نے کافی کا پوچھا، انہوں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔ وہ ہمیں حیدرآباد لے جانے کے لئے ایئرپورٹ تک چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ ہم نے کہا آپ کچھ دیر انتظار کیجئے، ہم ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ گپتا جی کچھ "ان ایزی" سے محسوس کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "میں نیچے لابی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں، آپ وہاں تشریف لے آئیں!" میں ان کا مسئلہ سمجھ گیا تھا، ایک پاکستانی کے کمرے میں ایک بھارتی شہری کی اتنی دیر موجودگی خواہ وہ بیچارہ سرکاری فرائض ہی ادا کیوں نہ کر رہا ہو، اس کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی، چنانچہ میں نے کہا "ٹھیک ہے آپ تشریف لے چلیں، ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں!" اللہ جانے شکوک و شبہات کی یہ فضا کب ختم ہوگی؟

ایئرپورٹ پر گپتا جی نے ہمیں الوداع کہا اور پھر ہم مقامی مسافروں کی طرح بورڈنگ کارڈ لے کر سکیورٹی چیکنگ کے لئے مخصوص بوتھ میں داخل ہو گئے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوگی بھارتی جہازوں کے پے در پے اغوا کے باوجود سکیورٹی کے انتظامات انتہائی ناقص تھے۔ سکیورٹی اسٹاف نے ہماری تلاشی اس طرح لی کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اتنے پیسوں میں تو اتنی ہی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ اور پھر ایک بجکر پچاس منٹ پر جہاز فضا میں تھا۔ اب ہماری منزل حیدرآباد دکن تھی، حیدرآباد دکن جہاں ہم پہلی بار جا رہے تھے مگر جہاں ہمارے بزرگ صدیوں پہلے گئے تھے اور پھر صدیوں تک وہاں رہے تھے!!

ڈاکٹر حفیظ قتیل

ہمارے شاعر

قتیل صاحب مرحوم کا یہ مضمون مئی ۱۹۷۰ء
میں ریڈیو کے لئے لکھا گیا تھا کسی وجہ سے
اسکی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ اب بطور تبرک قارئین
کی نذر ہے ——— ادارہ

یہ کچھ ضروری نہیں کہ شاعر شعر سنانے پر ہی شاعر سمجھا جائے۔ ہمارا شاعر تو صرف صورت سے پہچان لیا جا سکتا ہے۔ اس کی وضع قطع ہی کچھ ایسی نرالی ہوتی ہے کہ ایک نظر دیکھتے ہی آپ کہہ دیں گے کہ یہ شاعر ہے۔ شاہ حاتم نے فقیری اختیار کرلی تھی اور شاہ تسلیم کے تکیے میں بیٹھک ہوتی تھی مگر بانکوں کی طرح روپیہ سر پر باندھتے تھے۔ میر حسن جلوۂ آئین شرافت اور آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے اتنا تھا کہ ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ سر پہ بانکی ٹوپی۔ تن میں تن زیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستین۔ کمر سے دوپٹا بندھا ہوا۔ میر صاحب مشاعرے میں آئے ہیں۔ کلکی دار پگڑی۔ پچاس گز کے گھیر کا پاجامہ ایک پورا تھان پستولئے کمر سے باندھا ہوا۔ ایک رومال پٹڑی دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں۔ ناگ پھنی کی کلائی دار جوتی جس کے ڈیڑھ بالشت اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف دوسری طرف کٹار۔ غالب شرفائے دلی کا عام لباس پہنتے مگر کلاہ پاپاخ سر پہ اور ہم نے جن شاعروں کو دیکھا اکثروں کے بال بڑھے ہوئے قینچی اور تیل دونوں سے بے نیاز۔ ڈاڑھی کی کھونٹیوں سے رخسارے کھردار۔ آنکھیں چڑھی ہوئی سگریٹ کا ہر کش غم جاناں اور غم دوراں کو دھواں کرتا ہوا۔ اس حلیے کے ساتھ لباس خوش پوشی کی سعی ناکام کا مظہر۔ شیروانی سلی تو کھڑکی استری کا پاجامہ۔ بش شرٹ شاندار تو پتلون پر دھبے دونوں اچھے تو جوتا دریدہ دہن۔ اور اگر کبھی کسی شاعر کا لباس نک سک سے درست دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ آرائش زندگی ہی میں مستعار ہے۔

نرالا پن شاعر کی وضع قطع ہی میں نہیں اس کے مزاج میں بھی ہوتا ہے اور یہ بات بھی بزرگوں سے ہوتی آئی ہے۔ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی کا کمال یا بزرگی، صاحب کو جچی دکھائی نہ دیتی تھی۔ بے دماغی کا یہ حال کہ کسی کا ٹکا سا بال سے بات کرنا گوارا نہیں۔ حاکم وقت بلاتا ہے اور یہ نہیں جاتے۔ ان کے کلام و کمال کے مشتاق شعر سننے حاضر ہوتے۔ مگر یہ انہیں اس قابل نہیں سمجھتے۔ ذوق جس مکان میں بیٹھتے تھے تنگ و تاریک تھا۔ قدر دان اچھے مکانات باغ آرام و آسائش کے سب سامان دیتے تھے مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ اللہ ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ ناسخ کی تنگ مزاجی کے لطیفے

آزاد نے لکھ ڈالے۔ اس صدی کے شعراء کی بھی کوئی نہ کوئی کل ٹیڑھی ملے گی۔ ایک بزرگ شاعر عاشقی کو جنس اور جنس کو آوارگی کی سند دیتے ہیں اور اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس کا جبلتی فلسفہ جبلتی آوارگی کو ان کا فطری تقاضا ہی نہیں پیدائشی حق قرار دیتا ہے۔ اکثروں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ شراب شرط شاعری ہی نہیں شرط انسانیت بھی ہے۔ لسان الغیب حافظ شیرازی کے فکر و فن کے اس فیضان پر کوئی ایمان نہیں دے گا۔ شاعری اور شراب کوئی ربط باطن ہو یا نہ ہو شاعر اور شراب کا ربط ظاہر لازم و ملزوم کا سا ہو گیا ہے۔

بعض شاعر شراب کے شیدائی ہوتے ہیں پتہ نہیں یہ لت ہے یا فیشن کہ جیسی ملے اور جیسے ملے پی جاتے ہیں مگر خرید کر نہیں پیتے خواہ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ شراب کا کیا ذکر چائے اور سگریٹ بھی خرید کر نہیں پیتے۔ شعراء کی کچھ مشترکہ خصوصیات بھی ہوتی ہیں جن میں کوئی استثناء نہیں۔ رات دیر گئے تک جاگنا ذکر میں نہ سہی شغل ہی میں سہی اور چاشت تک سونا ان کی ایسی عادت ہے کہ کبھی خرق عادت کرتے دیکھا نہیں گیا۔ شاعری پر میں تسنیم کی دھلی ہوئی زبان استعمال کریں گے۔ مگر نجی صحبتوں میں سودا کی ہجویات کی زبان زیادہ پختگی اور برجستگی سے برتیں گے۔ گھر سے وحشت اور اس سے زیادہ گھر والی سے وحشت نہ جانے ہر شاعر پر کیوں ہوتی ہے۔ شاید میر کو گھر میسّر تھا نہ گھر والی۔ البتہ غالب کا گھر کرائے کا تھا اور گھر والی ذاتی۔ وہ گھر سے کبھی نالاں تھے۔ اور گھر والی سے بھی مگر بے چارے کو ہمارے عہد کی ترقی یافتہ تہذیب کی ہوا نہیں لگی تھی اس لئے نہ گھر چھوڑ کر سڑک بازار اور ریسٹورنٹ پر وقت گزارا نہ بیوی کو طلاق دی۔ یہ وصف مُردہ اور زندہ سبھی شعراء کا طرہ امتیاز تھا اور ہے یہ سب بیویوں کو کچھ دنوں تک رنگین اور عمر بھر سنگین غلطی سمجھتے ہیں یعنی جو بیویاں شاعری کے لئے قوت محرکہ اور مناجات کی محبت کا جواز فراہم کرتی ہیں ان میں سب سے زیادہ بربادی کا باعث بیویاں ہوتی ہے۔ عام شعراء کا کیا ذکر پیمبرانہ شاعری کرنے والے اور شاعری کو ہندوستانی تہذیب کی عظمت رفتہ عطا کرنے والے عظیم شعرا تک بیویوں سے نالاں رہے۔ اور بیویاں ان سے نالاں اور دنیا ان پر ہنستی اور ان کی قدر کرتی رہی۔ کسی کی بیوی بدصورت بھی ہے اور بدسیرت بھی۔ کسی کی بیوی خوب صورت ہے مگر جاہل کسی کی بیوی خوب صورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی لیکن شاعر کی فکری بلندی یا اخلاقی پستی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لئے ہر شاعر جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر شادی کرنے کے بعد بھی چند ہی دنوں بعد بیوی سے اکتا جاتا ہے۔ اور برباد ہو جاتا ہے اور اس بربادی سے شاعری اور آوارگی ایک ساتھ جنم لیتی ہے۔

بے چارے شاعر کی بربادی پر گھر والی ہی کا حصّہ نہیں ہوتا باہر والے بھی اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ گھر میں بیوی … گھر کے باہر ارباب ذوق سے برہم۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کو میر و غالب کی طرح سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا جاتا تو جھنجلا کر کہتا ہے کہ لوگ بدذوق ہیں یعنی مشاعرے میں چیخ کر داد نہیں دیتے۔ دُنیا میں کمال کی قدر نہیں ہے یعنی لوگ شاعر اور اس کے بال بچوں کی کفالت نہیں کرتے۔ اس کا خونِ جگر ضائع ہو رہا ہے یعنی اس کے کلام کو آرٹ پیپر پر شائع کرنے کے لیے اتنا چندہ جمع نہیں کیا جاتا کہ اس رقم سے شاعری کی اشاعت اور شاعر کی رفع حاجت کے دونوں کام چلیں۔ دنیا مُردہ پرست

ہے کسی شاعر کے جیتے جی اس کا یوم نہیں منایا جاتا اور کیونکہ اس کے ورثا کی بجائے خود اس کو پیش نہیں کیا جاتا۔
شاعر کی جان کے پیچھے تیسری مصیبت خود اس کے ہم پیشہ و ہم پیالہ ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہر شاعر اپنے کو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہے اس لئے ہر شاعر کسی دوسرے شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہر محفل میں حاضر شعرا خلاقاً ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں اور غیر حاضر شعراء کی جی کھول کر مذمت۔ محفل سے اٹھتے ہیں تو غیر حاضر شعراء۔ بل کہ ہر ایک، محفل کی روداد اس طرح سناتا ہے جیسے ساری محفل میں ان کا وہ واحد مرید اور معترف تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے شاعر رات دن ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں مگر ایک کی صورت دیکھ کر دوسرے کا خون کھولتا رہتا ہے۔ سنتے ہیں کہ آتش مشاعرے میں قرابین لے کر گئے تھے مگر خالی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس دور کے شاعر کے منہ کی قرابین تو ہر وقت خالی ہوتی رہتی ہے
ماضی میں شعر سناتے تھے اس صدی کے شعراء شعر گاتے ہیں۔ چند سال پہلے تک شاعر کے لئے گلوکار ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسے خوانچہ والے کے لئے تک بندی ضروری ہوتی ہے۔ جب تک وہ چنا جور گرم پر مہمل مصرعے نہیں لگاتا بچے اس کی طرف نہیں لپکتے اسی طرح جب تک شاعر تان نہیں اڑاتا اہل ذوق داد نہیں دیتے واہ واہ کے شور سے شعر سنائی نہیں دیتا مگر جب وہی نظم کسی رسالے میں چھپتی ہے تو داد دینے والوں کو اپنی کج ذوقی پر ہنسی آتی ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ادھر کچھ عرصے سے شاعری کو موسیقی سے تقویت پہنچانے کا رجحان کم ہوا ہے تو شعر اب صرف شعریت سے پرکھا جانے لگا ہے۔ مگر تحت اللفظ پڑھنا بھی ایک فن ہے اور بڑا ریاض طلب فن۔ انیس کا بانکپن۔ جوش کا اور شاذ تمکنت کا رچاؤ ٹھیک ہی نہیں دہب بھی ہے مشاعرے میں کیسے کیسے تہہ دار شعر آواز کے بھونڈے پن اور نشیب و فراز کی بد سلیقگی سے خاک میں مل جاتے ہیں۔ مگر یہ تو ہے کہ کاغذ پر اگر اپنی قیمت منوا لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ مشاعرے کو سر پہ اٹھا لیا مگر چھپ کر آئیں تو کاغذ کو ضائع کریں۔
شاعر کے بارے میں سب سے اہم بات تو یہ ہوتی ہے کہ ہمارا شاعر صرف شاعر ہوتا ہے۔ وہ کسی مذہب کا پابند نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ شاعر ہے۔ وہ تہذیب کے تمام قوانین سے آزاد ہوتا ہے اس لئے کہ شاعر ہے۔ وہ دوسروں کو درس دیتا ہے مگر خود عمل نہیں کرتا اس لئے کہ شاعر ہے وہ انفرادی یا اجتماعی کسی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اس لئے کہ شاعر ہے۔ اس کے ہر کام میں بے قاعدگی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ شاعر ہے۔ وہ بیوی کے سوائے ہر عورت سے محبت کرتا ہے اس لئے کہ شاعر ہے۔ وہ چار چار روز گھر کو نہیں جاتا اس لئے کہ شاعر ہے وہ راتوں کو نٹ پاتھ پر پایا جاتا ہے اس لئے کہ شاعر ہے۔ وہ کام نہیں کرتا اور پوری تنخواہ اٹھاتا ہے اس لئے کہ شاعر ہے۔ وہ کسی حالت سے مطمئن نہیں ہوتا اسلئے کہ شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعر رنگ نسل مذہب، جغرافیائی حدود فرسودہ نظام اخلاق ہر بندھن سے آزاد ہوتا ہے وہ صرف انسان ہوتا ہے اور ہر ایک کو صرف انسان سمجھتا ہے۔ مگر چوں کہ انسانیت کے ہر تقاضے کو ٹھکراتا ہے اس لئے وہ صرف شاعر رہ جاتا ہے اور شاعر ہونے میں بھی شاعری کی شریعت سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ صرف بزعم خود شاعر رہ جاتا ہے اور یہ ہمارے شاعر کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے!!

ضیاء الحق قاسمی

ہزل

میں ناچوں کیا مجھے دیکھو کہ لڈی ہی نہیں آتی
اکھاڑے میں میں اتروں کیوں کبڈی ہی نہیں آتی

لیا تھا سوٹ لنڈے سے کہ ترشیا دوں گا اپنوں کو
مری قسمت ہی پھوٹی ہے کہ سردی ہی نہیں آتی

مرے احساس کی دنیا پہ اتنی برف باری ہے
وہ غصہ بھی دلاتے ہیں تو گرمی ہی نہیں آتی

مرے مدقوق چہرے پر پیلاہٹ ہی پیلاہٹ ہے
میں غازہ بھی لگاتا ہوں تو سرخی ہی نہیں آتی

مرغن سب غذاؤں سے مجھے رغبت تو رہتی ہے
مگر اس جسم لاغر پہ تو چربی ہی نہیں آتی

بڑی ہی انکساری سے میں ان سے بات کرتا ہوں
مگر اس بت کے لہجے میں تو نرمی ہی نہیں آتی

مرا محبوب آیا ہے مجھے ملنے تو بصرہ سے
مگر یہ مجھ میں خامی ہے کہ عربی ہی نہیں آتی

مجھے بھیجا تھا برما کے محاذوں پر فرنگی نے
میں کیا کرتا وہاں جا کر کہ برمی ہی نہیں آتی

اندھیرے ہی میں لکھتا ہوں ہزل ہو یا غزل کوئی
بٹن جب بھی دباتا ہوں تو بجلی ہی نہیں آتی

بڑے تعویز کروائے ہیں میں نے اپنے سسرال سے
بڑھاپے پر مرے پھر بھی جوانی ہی نہیں آتی

سنا ہے ہچکیاں لگتی ہیں بھر کر پیٹ کھانے سے
میں اک مانا ہوا پیٹو ہوں پر ہچکی ہی نہیں آتی

بڑی کوشش کری میں نے بگاڑوں اپنے یاروں کو
مگر ان ڈھیٹ لوگوں میں خرابی ہی نہیں آتی

○

پاگل عادل آبادی

غزل

ایسا مجھ کو پچھاڑا گیا
میرا نقشہ بگاڑا گیا

ان کی پوری وصیت ہوئی
میکدے ہی میں گاڑا گیا

ناک میں میرے تکلیف تھی
کان میرا اکھاڑا گیا

میرا ہلنا بھی ممکن نہ تھا
پھر بھی جڑ سے اکھاڑا گیا

کم سے کم اک رضائی تو دو
کب دوپٹے سے جاڑا گیا

جھوٹ بولا تو لڈو ملے
سچ کہا تو لتاڑا گیا

ایسا لگتا ہے پاگل ترا گھر
الٹی جھاڑو سے جھاڑا گیا

ڈاکٹر راہی قریشی
گلبرگہ

دستی

(HANDKERCHIEF)

عہد حاضر کی رواداری میں وہی دستی بہتر سمجھی جاتی ہے، جو دست بدست آئے اور ہاتھوں ہاتھ چلی جائے۔ عام طور پر دستی، زبردستی حاصل کی جاتی ہے، اس طرح وہ اپنے پُرانے مالک کو تہی دستی پر مجبور کر کے نئے مالک کی بالادستی قائم کر دیتی ہے۔

یہ لطیفہ نہیں۔ واقعہ ہے کہ ایک شاگرد نے غالبؔ کے شعر ؎

ڈھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

کے بارے میں اُستاد سے بہ معصومیت تمام یہ استفسار کیا تھا کہ کیا کسی سراپا ناز کو دستی پیش کرنے سے صرف ڈھول دھپّے ہی کی نوبت آتی ہے؟

دستی امیر اور غریب، دونوں کے کام آتی ہے۔ غریب اپنے چہرے کا پسینہ، اور امیر، پرائی عورتوں کی لپ اسٹک دستی ہی سے پونچھتا ہے۔

بیوی کے ہاتھ کا پکوان، شوہر کی دستی سے ڈھانپ کر پچّے کے ذریعہ بھیجا جائے تو پڑوسی بے تکلف نہیں ہونے پاتے۔ چاندرات کو جو دستی خریدی جائے، وہ عید کے دن ہی "عید کا چاند" ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں عید ملاقات کا دائرہ وسیع کرنا چاہیے کیونکہ شیر خرمے کے علاوہ نئی دستیاں اسی دن دستیاب ہوتی ہیں۔

دستی کو دھونے کے لیے بیوی کی بجائے مُنّے کو مامور کیا جائے تو اُس کے رنگ اور ہیئت میں نمایاں تبدیلیاں فوری ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس طرح نئی دستی خریدنے کے لیے نئے مُنّے کی خدمات سے استفادہ ضروری ہے۔

مُقرّرین کے لیے دستی نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے۔ تقریر، موضوع سے جتنی ہٹتی جاتی ہے ـــــ دستی، چہرے سے اتنی

ہی قریب آتی جاتی ہے۔ بعد میں پسینہ اور پریشانی ـــــ سب دستی میں سما جاتے ہیں۔

عام دنوں میں کالجوں کی خاص لڑکیوں اور خاص الخاص لڑکوں کے درمیان دستیاں کھلے عام تحائف کی شکل میں گشت کرتی رہتی ہیں، لیکن امتحان ہال میں یہی دستیاں صرف مٹھیوں میں مقید ہوجاتی ہیں۔ بعض بے رحم نگران کار امتحانات ان دستیوں میں مخفی گنج ہائے گراں مایہ دریافت کرکے خواہ مخواہ کشیدگی کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

دستی کے رنگ، سائز اور نمونے سے مختلف نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سرخ دستی، مالک کے کامریڈ ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ سفید دستی صلح پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے (اس لئے کم نظر آتی ہے) ریشمی اور پھولوں والی دستی دل پھینک نوجوانوں کے گلے کا ہار ہوتی ہے۔ البتہ اگر دستی کا اصلی رنگ نہ پہچانا جائے تو اُسے کسی شاعر کی ملکیت سمجھ کر صبر کر لینا چاہیئے۔

کانفرنس ہال کے طویل و مسلسل مباحث سے مستفید و محظوظ ہونے کے نتیجے میں آپ بالآخر کمر اور سر جھکائے، مردوں سے بچتے اور عورتوں سے دانستہ ٹکراتے ہوئے باہر آجائیں تو کانفرنس کے بانیوں کو آپ کی واپسی کا یقین دلانے والی صرف اور صرف وہی دستی ہوتی ہے، جو نہایت کسمپرسی کے عالم میں آپ کی کرسی پر پڑی رہتی ہے۔

ناکارہ سُرخ ساڑی کے کارآمد حصے کو دستی میں تبدیل کیا جائے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ خاتونِ محترم کو "سرخ مثلث" سے روگردانی نے یہ دن دکھائے اور ایسی دستی پیش کی ہے۔

مسجد میں ایسی دستی باندھ کر شریکِ نماز ہونا چاہیئے جو رکوع میں لہرائے اور آپ کے سجدے سے پہلے دوسرے کی آغوش میں سجدہ ریز ہو جائے۔ (اس طرح دوسروں کی نماز میں زیادہ خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے)

سر پر دستی باندھ کر درگاہ میں داخل ہو جائیے تو باوضو ہونے کے بارے میں خیال تک نہیں آتا۔ فاتحہ کے بعد وہی دستی، حصولِ تبرکات کے کام آتی ہے (بشرطیکہ مجاور، آپ کی تہی دستی سے لاعلم ہو)

اگر آپ ٹرین یا بس کے رُکنے سے قبل کھڑکی سے محض اپنی دستی اندر گرا دیں تو وہ ہجوم کے باوصف تن تنہا آپ کے داخل ہونے تک آپ کی انفرادیت اور جگہ دونوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن "حُسنِ اتفاق" سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس عمل کے دوران دستی کھڑکی سے اندر اور آپ باہر گرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بس یا ٹرین آپ کی اکیلی دستی کو لے کر روانہ ہو جاتی ہے اور آپ تنہا ایمبولنس کار میں روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح دستی لوگوں کے حلقے میں اور آپ نرسوں کے نرغے میں پہنچ جاتے ہیں۔

اگر آپ کے گھر میں بیوی اور جیب میں دستی ہو تو، موخر الذکر پر کسی کی لپ اسٹک کا نشان آپ کے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی ثبت کر دیتا ہے۔ ایسے "ایمرجنسی" حالات میں دستی بیوی کے تصرّف میں اور دستی پر PRINTED ہونٹ آپ کے تصوّر میں رہ جاتے ہیں۔

گھر، دفتر، جلسہ گاہ، پارک، ہوٹل اور سنیما وغیرہ کے علاوہ دستی، سرکس میں بھی دکھائی دیتی ہے

— بلکہ ایک نیا عالم دکھاتی ہے۔ سرکس کی نازک، نوخیز اور نیم عریاں لڑکی سامنے آتی ہے — پھر زمین پر دستی رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے — پھر دستی کو خواہ مخواہ منہ سے اٹھانے کیلئے اس طرح جھکتی، مڑتی اور بل کھاتی ہے کہ اہلِ نظر، دستی کے سوا سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔

دستی کو دھلائی کے لئے دھوبن کے حوالے کیا جائے تو دو خوش گوار نتائج متوقع ہوتے ہیں — یا تو رنگین دستی بدرنگ ہو کر واپس ملتی ہے — یا سب کپڑوں کا حساب دینے کے بعد دستی کے بارے میں سوال کیا جائے تو دھوبن کی مسکراہٹ دیکھنے کو ملتی ہے۔

روز افزوں گرانی نے دستی کو باسکٹ کا "قائم مقام" اس طرح بنا دیا ہے کہ ساری شاپنگ ایک ہی دستی میں سما جاتی ہے۔ ایسی دستی سے بچے ناراض اور بیوی خوش ہوتی ہے۔

دستی اگر بدرنگ، بدوضع اور بدشکل ہو جائے تو جیب میں رکھنے کی بجائے ہر جگہ مناسب معلوم ہوتی ہے — بالکل اسی طرح، جس طرح پرانی بیوی اپنے گھر کے سوا ہر جگہ بھلی لگتی ہے — !!

بیوی نامہ

شاداب بے دھڑک مدراسی

یہ نہ ہوں تو نامکمل بیویاں! دال، آٹا، اور چاول، بیویاں
ڈھونڈتی رہتی ہیں اکثر آئینہ پاؤڈر، اسنو، دکاجل، بیویاں
پڑھنے والوں کے ہوئے ہیں گم حواس ہوتی ہیں "سسپنس ناول" بیویاں
پھر سے اڑ جاتی ہے ساری شوہری جب دکھا دیتی ہیں سگنل بیویاں
کم برستی ہیں گرجتی ہیں بہت بادلا ہوتی ہیں یا دل بیویاں
لگ گئی پیری کی عینک آنکھ پر ہوگئیں نظروں سے اوجھل بیویاں
وحشتوں کے ہیں بگولے آج کل جن کی آنکھوں میں تھیں ہر پل بیویاں
دھکے کھاتے پھر رہے ہیں در بدر کرگئیں مردوں کو پاگل بیویاں
دھنس گیا بچوں کی "کل کل" میں پتی بن گئیں شاداب دلدل بیویاں
شوہروں کے نام سے منسوب ہے میرے افسانے کا "ٹائیٹل" بیویاں
تھے جو کل تک دوستو موٹر نشین کرگئیں اُن سب کو پیدل بیویاں

بے دھڑک ذہنوں کو ساکت کرگئیں
بولنے والی یہ "بے کل" بیویاں

○

باز غ بہاری (کلکتہ)

ھزل

ہماری والدہ آخر بنیں گی دادی ماں کب تک
ہمارے گھر میں بھی دی جائے گی بیگم اذاں کب تک

شریف انساں ہی ڈرتے ہیں پولیس اور بیوی سے
سمجھ میں آئے گا یہ آپ کے راز نہاں کب تک

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو
تمہیں اغیار پہناتے رہیں گے لوپیاں کب تک!

کسی دن ماں قسم میں حشر برپا کر کے چھوڑوں گا
تمہارے باپ کی سنتا رہوں گا گھر کیاں کب تک

میاں باز غ بہاری اس طرح مسجد میں جا جا کر
چراؤ گے نمازی بھائیوں کی جوتیاں کب تک

وہ پرمیشن پرنسپل سے دلا دیتے تو اچھا تھا۔

عالم تاجپوری

وہ نظروں سے نہ یوں مجھ کو گرا دیتے تو اچھا تھا
جو آئے غیر محفل میں بھگا دیتے تو اچھا تھا

زبان بندی نشہ بندی دھکبندی کہ نسبندی
اگر بندے کو بندی سے چھڑا دیتے تو اچھا تھا

میسر ہے نہیں تو کیا ہوا عطر غنیمت ہے
میں شاعر ہوں مجھے کچھ بھی پلا دیتے تو اچھا تھا

کیا کرتے ہیں جو وعدوں پہ وعدے ہر الکشن میں
انھیں ووٹر اگر الو بنا دیتے تو اچھا تھا

سلیقہ نقل بازی کا ہمیں معلوم ہے عالم
وہ پرمیشن پرنسپل سے دلا دیتے تو اچھا تھا

مجنوں حیدرآبادی

نظم

مشورہ

مانگنے سے کچھ بھی مت شرمائیے
جتنا بھی پائے وہ سب اپنائیے
زندگی میں کچھ نہ بن پائے اگر
غم نہیں داماد ہی بن جائیے
کوئی گر پوچھے ولیمہ کیا ہوا
راس یہ ہم کو نہیں فرمائیے
گر نہ دے پائیں خسر پاکٹ منی
رہن زیور بیوی کا رکھوائیے

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

شہر آشوب

جب آدمی بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے تو اسے ماضی کی یادیں زیادہ ستانے لگتی ہیں۔ ہم کو بھی جب اپنے لڑکپن کی باتیں یاد آتی ہیں تو سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے ؎

لوٹ جائے گردشِ ایام پیچھے کی طرف

چنانچہ سینکڑوں پردہ نشین یادوں کے علاوہ جس کی یاد بہت آتی ہے وہ ہے مداری — جی ہاں مداری — جو ہمارے لڑکپن میں ہماری تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ جس پر تفریحی ٹیکس نہیں لگتا تھا — وہ اپنے وقت کا سچا مسیحا تھا۔ کیونکہ بھرے بازار میں اپنے بیٹے کا گلا کاٹتا تھا۔ ہم سے تالیاں بجانے کو کہتا تھا اور پھر مُردے کو زندہ کر دیتا تھا۔ لوہے کے گولے منہ میں رکھتا۔ نگلتا اور پھر منہ سے نکال کر دکھاتا۔ ایک ٹین کے ڈبے میں اُڑنے والا سانپ بند کر کے رکھتا اور کہتا کھیل ختم ہونے پر، اُڑنے والا سانپ ضرور دکھائے گا۔ مگر ہر بار سانپ کے ڈبے کو جھولی میں رکھ کر چلا جاتا، ہم ترستے رہ جاتے۔ ہم نے جب علامہ اقبال کا یہ شعر سنا ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

تو ہم کو بہت افسوس ہوا — مداری گیا — اب ہم کبھی اُڑنے والا سانپ نہ دیکھ سکیں گے۔ مداری چلا گیا مگر یہ دنیا ہے یہاں) سے ایک مداری جاتا ہے سو مداری آجاتے ہیں۔ کھیل تماشے ضرور بدل جاتے ہیں۔ مداری کے نام بدل جاتے ہیں کام بدل جاتے ہیں۔ آج کے لوہے کے گولے سنہری وعدے۔ مردہ لڑکے کی جگہ مردہ مسائل زندہ ہوتے ہیں۔ اُڑنے والا سانپ غریبی ہٹاؤ کا نعرہ بنے زمانے کے نئے مداری۔ برابر کھیل دکھا رہے ہیں۔

دنیا میں دو ایتھنس ہیں۔ ایک ایتھنس میں اب سے دو ہزار چار سو چون (۲۴۵۴) برس پہلے ایک بہت لائق آدمی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا جس کو آج کی دنیا بہت بڑا فلاسفر مانتی ہے اور سقراط کہتی ہے سقراط نے وہ زہر بخوشی پی لیا کیونکہ وہ جانتا تھا Hem Lock پلانٹ کا رس پی رہا ہے۔ سقراط زہر کے اثر سے واقف تھا۔

دوسرے ایتھنس میں ڈھائی ہزار سقراط زہر پی کر مرگئے مگر ان میں سے کسی کو زہر کا نام تک معلوم نہ تھا۔ پچاس ہزار ایسے ہیں جو آدھ مرے ہوئے۔ اور ہزاروں ایسے ہیں جن کے مرنے میں صرف ایک سانس کی کسر رہ گئی تھی اُن میں سے ایک یہ مداری بھی ہے جس کو زہر کا اصلی نام اب تک معلوم نہیں۔ تو کیوں نہ اس مشہورِ عالم شہر کا احوال سنا دیا جائے تاکہ بات بھی بن جائے کام بھی ہو جائے۔ اس شہر کا احوال حقیقت کی حقیقت ہے تماشے کا تماشہ ہے —— کیا یہ تماشہ نہیں کہ سائنس کا مداری زہر کے تین نام بتاتا ہے۔ تاس جین، ایم آئی سی۔ سائی نائڈ۔ جیسے مایا کے تین نام پرسو۔ پرسا۔ پرس رام۔

۲ دسمبر کی سرد ترین رات تھی۔ ہم دونوں میں خانگی جھڑپ کے بعد جنگ بندی ہوئی تھی۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے وجہ وہی پرانی۔ بازار میں بھاؤ کا بڑھنا آمدنی کا کم سے کمتر ہوتا جانا۔ ہمارے جھگڑے ہمارے بچے ہی طئے کرا دیتے ہیں کیونکہ باہر کی دخل اندازی ہم کو پسند نہیں۔ لڑ جھگڑ کر سو گئے پھر تین بجے کے قریب سر جو ہلایا تو منہ لحاف سے باہر نکل آیا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں عرصے سے ایسے لحاف چلے آرہے ہیں جن سے منہ باہر نکالنے کے لئے لحاف کو سر سے نیچے کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ صرف سر کو ذرا سی اِدھر اُدھر حرکت دینے سے یہ کام ہو جاتا ہے۔ اب آنکھ جو کھولی تو لگا کسی نے آنکھ میں مرچیں جھونک دی ہوں۔ اُٹھ کر بیٹھے تو ناک سے پانی جاری۔ کمرے سے دالان میں آئے تو کھانسی۔ صحن میں آکر بیوی بچوں کو آواز دی تو گلا بند۔ گھر کی بتیاں روشن۔ بیوی بچے غائب۔ ہم سوچنے لگے کیا قیامت آگئی۔ ہم کو سوتا اور روتا چھوڑ کر سب کہاں چلے گئے گھبرا کر گھر سے باہر نکلے تو دیکھا سارا محلہ گلی میں ہماری طرح آنسو بہاتا کھانستا۔ پوچھا کہ ہمارے بیوی بچے کہاں گئے تو ایک بچے نے کھانستے ہوئے جواب دیا پنڈت گیندا لال لے گئے —— گیندا لال کو سارا شہر جانتا ہے۔ اس کی زہریلی تقریریں برسوں سے سن رہے ہیں، دو دن پہلے ہی کہا تھا مسلمانوں کو سمندر میں پھینک دوں گا۔ میرے بیوی بچوں کو لے گیا نہ جانے کون سے سمندر میں پھینکا ہوگا۔ تین سمندر ہیں ملک کے آس پاس۔ کہاں تلاش کرنے جاؤں گا۔ اے خدا غصہ نے دسمبر کو جون بنا دیا پسینے میں نہلا دیا۔ اتنے میں سندر چار اور اُس کے بیٹے نے ہم کو آدبوچا، ہم بھول گئے بیوی بچوں کو۔ زندگی اور موت کا فاصلہ بہت کم نظر آنے لگا۔ دونوں نے پکڑ کر ایک ٹرک میں چڑھا دیا جس میں سامان کی طرح مرد عورت بوڑھے بچے بھرے ہوئے تھے۔ ہم حیران کہ یہ سب کیا ہے۔ ہماری آواز کو کیا ہوا۔ یہ سب چپ کیوں ہیں۔ پھر ہماری نظر نرمل جین کی بہو پر پڑی۔ اسی رات کی دلہن تھی۔ مانگ میں سیندور۔ ہاتھ میں مہندی پاؤں میں لالتا۔ پیٹی کوٹ اور بلاؤز۔ وہ بھی ٹرک میں چڑھا دی گئی۔ آنسو کھانسی، مگر بے آواز۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے۔ نئی دلہن کے بدلے میں ہمارے بیوی بچے مل سکیں گے ٹرک کے ایک کونے سے مولوی امداد علی کی آواز دبی دبی سی سنائی دی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس جھنتر کی بچی نے کپڑے خراب کر دیئے۔ ٹرک گلی سے بڑی سڑک پر آگیا

جہاں انسانوں کا ریلا بہہ رہا تھا۔ مرد۔ عورت۔ بچے بوڑھے آنسو بہاتے۔ کھانستے۔ شہر کی پہاڑیوں کی جانب رواں دواں مگر سب خاموش ۔۔ ہم سوچنے لگے کہیں یہ سب حضرت موسیٰ سے فریاد کرنے تو نہیں جا رہے۔ آگے چل کر ایسی خواتین نظر آئیں جن کا پلو بھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا مگر اب وہ ساری کی ساری دیکھی جا سکتی تھیں۔۔۔۔۔

حسین و جمیل لڑکیوں کے پرے مگر یہ سارا جمالِ دلفروز صورتِ بہ نیم روز والا۔ نیم وا۔ آنکھوں سے کیا آئے نظر کیا دیکھے۔ کیونکہ ہر چشم۔ چشمِ گریاں۔ ہر آواز بند بند۔ ہر سانس گھٹی گھٹی۔ ایک پہاڑی پر برہنہ سر۔ برہنہ پا خواتین کے قافلے دھندلے دھندلے نظر آئے جو شاید دریائے فرات کی تلاش میں تھے۔ تمام راستے پر بے ہوش ہو کر گرتے ہوئے بوڑھے بچے اور عورتیں۔ مگر سب زندگی کے ساز کی طرح بے آواز، چند گھنٹوں میں شہر ویران اور صحرا آباد ہو گئے لوگ کہتے ہیں کہ سعودی عرب میں دکاندار دکانیں خالی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں مگر چوری نہیں ہوتی۔ یہاں پوری آبادی مکان خالی چھوڑ کر چلی گئی اور ایک جگہ بھی چوری کی واردات نہیں ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے پولس والے بھی تو ساتھ بھاگ رہے تھے ۔۔۔ جب نگارِ آتشیں رخ سر کھلا نظر آیا تو پہاڑوں سے لوٹے قافلے بے زبانوں کے۔

واپسی پر جمیل صاحب ہمیں ملے تو ہم نے پوچھا حضرت رات آپ ٹھیڑے کیوں چل رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ کیا بتاؤں۔ میری تہہ بند کی گرہ کھل گئی تھی جس کو اپنی کہنی سے دبائے تھا، گود میں بچی تھی جس کی حالت اتنی خراب تھی کہ گود سے اتار بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا نے خیر کی ورنہ ہم دونوں کا کام تمام ہو جاتا۔ واپسی پر ایک ندائے آسمانی سنائی دی وہ یہ تھی کہ سب لوگ گھروں کو لوٹ جائیں۔ اب گیس کا اثر کم ہو گیا ہے۔ یہ آواز سن کر ہمارے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ کیونکہ اب تک ہم جس کو خواب سمجھ رہے تھے وہ حقیقت نکلی۔ خالی گھر کے دروازے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو پھر بیوی اور بچوں کی یاد آئی۔ پنڈت گیندا لال۔ ہائے ظالم کیا کیا تو نے۔ اتنے میں جوان بیٹی دوڑتی گھر میں داخل ہوئی سینے سے چمٹ کر بولی۔ گیندا لال چاچا ہم کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے تو ہم گھٹ کر مر جاتے۔ وہ اپنی گاڑی میں ہم سب کو اپنے گاؤں لے گئے تھے۔ خوب ناشتہ کر کے آئے ہیں ہم سب لوگ۔ اب ہمیں خیال آیا نرل جین کی نئی دلہن کا۔ مولوی امداد حسین کا، جن کو ہندو دیش کا دشمن کہتے ہیں۔ اتنے میں دولہا آیا اور کہنے لگا۔ شیلا کو مولوی امداد صاحب گھر پر چھوڑ کر ابھی گئے ہیں۔ اور میں سندر چار کی بچی کو اس کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب سب ٹھیک ہے شہر میں۔ اشوک تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ مگر ہم سوچنے لگے رات کو جو کچھ شہر پر گذری وہ بھی ٹھیک ہی تھی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی بوڑھے بچے، مرد، عورتیں۔ پنڈت، ملا۔ برہمن اور ہریجن سب ایک ہی صف میں بھاگ رہے تھے۔ نہ ان میں کوئی محمود تھا نہ ایاز۔ سب ایک باپ کی اولاد، یہ سب دراصل یونین ساز بھائی تھے ۔۔ یونین کاربائڈ نام کا ایک بڑا پلانٹ بستی کے پاس دیکھ بھال کر لگایا گیا تھا۔ رات میں وہ گیس کارخانے سے نکلی جس نے تمام باشندوں کو ایک ڈوری میں پرو دیا۔ دن میں کہرام سا مچ گیا شہر میں۔ ہر ایک کی زبان پر مرنے والوں کی تعداد

— ہزار سے شروع ہوکر دس ہزار تک جا پہنچی۔ لیکن آکاش وانی نے جو خبر پہلی بار سنائی وہ صرف نو تھی۔ جو ڈھائی ہزار سے آگے نہیں گئی۔ بلکہ یہ بھی ہوا کہ مزید تحقیقات کے بعد سرکاری تعداد ڈیڑھ ہزار رہ گئی ہو سکتا ہے باقی کے لوگ زندہ ہوکر بھاگ گئے ہوں۔ کیونکہ ایسا بھی ہوا تھا کہ جب لاشیں ٹرک میں بھر کر پھینکی جارہی تھیں تو بہت سے زندہ لوگ بھی ٹرکوں میں چڑھ گئے تھے۔ کارخانے کی آغوش میں ہزاروں غریبوں کی جھونپڑیاں تھیں — کارخانہ غریبی دور کرنے کے خیال سے قایم ہوا تھا۔ غریبی تو ختم نہ ہو سکی البتہ آس پاس کے غریب ختم ہوگئے۔ گھروں میں سوتے کے سوتے رہ گئے۔ پچاس ہزار بیمار بن کر اسپتالوں اور کیمپوں میں رکھے گئے۔ شہر ویتنام کا میدان نظر آنے لگا۔ یہ گیس کیڑے مارنے کے لئے تیار کی گئی تھی مگر اس گیس نے گائیں۔ بھینسیں۔ بکریاں۔ اور انسانوں کو کیسے مار ڈالا۔ سب مرگئے مگر مچھر نہ مرے۔ ہم نے خیال کیا جب مچھر کی دوا سے انسان نہیں مرتے تو مردم کش گیس سے مچھر کیسے مریں گے۔ بات ہمارے ذہن میں صاف ہوگئی۔ اب شروع ہوا تماشہ علاج کا۔ بازار میں جس قدر آنکھ کی دوائیں موجود تھیں سب کام آگئیں۔ قے اور سینے کی جلن سانس کی تکلیف میں دمہ والی دوائیں کام میں لائی گئیں۔ ہر بخار کی دوا تو کونین نہیں۔ تو پھر یہ ڈاکٹر مداری کا تماشہ کیوں دکھا رہے تھے۔ آج بھی کوئی نسخہ ایسا نہیں معلوم ہوا جو گیس کے اثر کو زائل کرسکے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سی گیس کی دوا۔ فاس جین۔ ایم آئی سی یا سائنائڈ یہ بات اکثر لوگ جانتے ہیں کہ جہاں ایلوپیتھی ختم ہوتی ہے وہاں سے ہومیوپیتھی شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ گیس کے مریضوں کا علاج موجود تھا یہ دوا گھر میں تھی اور گھر والے استعمال نہ کرسکے۔ شہر بھوپال اپنے تال کے لئے ہندوستان میں مشہور ہے۔ وہ جو گیس بھی رہی ہو۔ اس گیس کے بادل اس مشہور تالاب میں تین گھنٹے تک اُترتے رہے اور شہر والوں سے لئے دوا تیار کرتے رہے لیکن کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ صرف پاور معلوم کرکے مریضوں کو دیدیتے۔ ہمارے خیال میں مریضوں کی دوا دنیا میں چاہے نہ ہو مگر بھوپال تال میں ضرور تھی۔ کیا یہ تماشہ نہیں — خیر چھوڑتے ہیں اس بحث کو کیونکہ ہم میڈیکل مداری نہیں ہیں۔ علم سائنس دریاؤ ہے — اس کے بعد عوام دو طبقوں میں بٹ گئے۔ زندہ عوام اور مردہ عوام۔ ویسے ملک میں قوم کے خادموں کی کمی نہیں۔ ہر الیکشن کے موقع پر برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر پہلی بار مُردوں کے خادم دیکھے گئے۔ قبرستانوں میں جیسے میلہ لگا ہو۔ ایک ایک قبر میں چھ چھ مُردے دفن کئے جارہے تھے۔ سُنا تھا قیامت کے دن ایک قبر سے ستر ہزار مُردے نکلیں گے مگر ہمارے ملک میں قیامت بھی اُلٹی ہوگئی۔ ایک اور تماشہ ہم نے دیکھا وہ یہ کہ شمشان گھاٹ سے لاشیں قبرستان میں امپورٹ ہورہی تھیں اور قبرستان سے شمشان گھاٹ کو ایکسپورٹ ہورہی تھیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں تھی مرنے والے ساتھ ساتھ مرے تھے۔ مسجد اور مندر ایک نہ ہوسکے ہوں۔ مرگھٹ اور قبرستان ضرور ایک ہوگئے تھے۔ بچن جی کی مشہور کویتا "مدھ شالہ" جیسے دھیمی پڑگئی ہو۔ عورتوں کے معاملے میں ضرور تھوڑی گڑبڑ ہوگئی ہو۔ یعنی جلنے والی دفن ہوگئی ہوں جن کو دفن ہونا تھا وہ جل گئی ہوں اس میں قصور زندہ عوام کا نہیں تھا۔ پوشاک کا تعلق خدا

معاف کرنے والا ہے۔ وہ سب کا رب ہے۔ یہ فتنہ آدمی
کی خانہ ویرانی کو کیا کم تھا۔ کہ آکاش وانی نے نہ ندہ عوام
کے لئے ہدایت نامہ بنایا — وہ یہ کہ عوام کو چاہیئے کہ پانی
اُبال کر پئیں۔ سبزیاں دھو مانجھ کر استعمال کریں۔ گوشت
کو ہاتھ نہ لگائیں۔ گیس خور دال خور ہو گئے۔ ہم جیسے گوشت
خور مسلمان نے اتنی دال کھائی کہ خواب میں مندر نظر آنے
لگے۔ پھر شام کو اسی لکڑی کے ڈبے سے آواز آئی کہ
پانی پر گیس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ دونوں باتیں ڈھول کے
لٹھ تھے، کیونکہ یہاں ہوا اور پانی کے تجزیے کا کوئی انتظام
نہیں۔ محض انسانی بنیاد پر فیصلہ بدلا گیا ہوگا یہ سوچ کروہ
غریب ابال کر پانی کیسے پی سکتے ہیں جن کے چولھے ربر کے
پرانے ٹائروں کے ٹکڑوں یا ریل کے چرائے ہوئے
کوئلوں سے جلتے ہوں —— دس بارہ دن قیامت
صغرا کے عذاب میں گرفتار ہوئے گزر رہے تھے کہ ایک
آفت کا گولہ ۱۶ دسمبر کو شہر کے سر پر آگرا۔ اتنے
انتقالوں کے بعد شہریوں کو ایک ہفتہ کے لئے انتقال
آبادی پر مجبور ہونا پڑا۔ شہر ویران ہوگیا۔ بہادر شاہ
ظفر کے زمانے میں دہلی کیا اجاڑ ہوئی ہوگی جس کو دیکھ کر
انہوں نے کہا تھا۔ "لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار
میں" شہر کا یہ عالم تھا کہ۔ مکان والے مکان سے باہر
مکان میں تالے پڑے ہوئے تھے۔ اور تالے بھی متر فیدری
نئے۔ کسی دل جلے نے ٹھیک کہا تھا کہ کسی وزیر کا قریبی
عزیز تالہ فروش ہوگا ورنہ شہر خالی نہ کرایا جاتا — ہزار
منہ تھے ہزار باتیں۔ بچے ہم سے پوچھ سکتے ہیں کہ جب
شہر خالی ہوگیا تو پھر کیا ہوا پایا — ؟ - پھر یہ ہوا کہ
کارخانے میں لگی گیس کی بہت بڑی ٹنکی کو ٹاٹ کا مقنعہ

پہنایا گیا۔ بیلی کوپٹر اس پر بارش کرتے رہے۔
شہر کی سڑکوں پر موٹر گاڑیاں ایک ہفتہ تک دن رات
چھڑکاؤ کرتی رہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔
شہر میں چھڑکاؤ ہوا کس نے دیکھا۔ سرکار نے کہا
پندرہ ٹن زہریلی گیس جو ٹنکی میں باقی رہ گئی ہے اس
کو بے اثر کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر جب گیس کو دوا
سازی کے لئے استعمال کیا گیا تو وہ ۲۶ ٹن نکلی، ۴۵ ٹن زہریلی
گیس دو دسمبر کی رات کو نکل چکی تھی تو بچے تباہ ٹنکی میں کل کتنی
گیس تھی۔ بیچارے کارخانے والوں کو نہیں معلوم تھا کہ ٹنکی میں
کتنی گیس باقی تھی۔ ملٹی نیشنل بیچارے چلو یہ کھیل بھی ختم ہوا اور
ایک بار پھر شہر کی گلیوں سے دودھ کیلئے بلکتے بچوں کی طرح ئیں

سنی جانے لگیں۔ شاہراہوں پر دوڑتی موٹر کاروں کی دھول
راہ گیروں کی پلکوں پر بیٹھنے لگی۔ پھر جب مرنے والوں کو
معاوضہ ادا کرنے کی بات چلی تو پھر کیا تھا۔ مُردے
کیو (Que) میں لگ گئے۔ ہر مرنے والے کا کوالٹی
کے اعتبار سے نرخ مقرر کیا گیا۔ تاکہ بلیک نہ کیا جا سکے
دس ہزار سے زیادہ نہیں ایک ہزار سے کم نہیں۔ دیکھتے
ہی دیکھتے مُردوں کا بازار گرم ہوگیا۔ مرا باپ دس ہزار
کا۔ ہم کو بھی پہلی بار اپنے والد کے بے وقت مرنے کا
شدید احساس ہوا۔ بوڑھی عمر کی لاشیں چوری ہونے
لگیں۔ پرانی بیوہ نے نیا مردہ شوہر پا لیا۔ کسی نے مردہ بہن
خریدی، کسی نے ماں۔ تو کسی نے بھائی۔ اس زمانے میں
زندہ بیٹے تو کام آتے نہیں، مردہ باپ کیا کام آتے۔
ایک بیٹے کو باپ کے معاوضہ کی رقم ادا ہونے والی تھی
کہ پولیس نے زندہ باپ تلاش کر لیا — زندگی میں ایسے
تماشے ہوتے ہی رہتے ہیں، امریکہ کے بڑے بڑے وکیل

گیس زدگی میں آ گئے اور پچیس ہزار نجی مقدمے امریکی عدالت میں دائر کیے گئے ـــــ ایک مقدمہ ہمارا بھی ہے۔ اگر مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بھی گھر ہوگا، ہمارے پاس بھی چھوٹی سی ہندوستانی کار ہوگی۔ جس میں بیٹھ کر ہم اپنی تمام گذشتہ تکالیف بھول جائیں گے ـــــ اس کے بعد سلسلہ شروع ہوا سرکار کی مہربانی کا۔ گیہوں۔ چاول۔ شکر۔ تیل گیس خوردوں میں مفت تقسیم ہوا۔ ہم بچپن میں ہی خودی کو کافی بلند کر چکے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ مگر خودی کا پرانا قطب مینار ضرورت مندی کی تیز آندھی میں ڈھ گیا اور ہم غلہ کی سرکاری دکان پر جھولی پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ خدا سرکار کو کچھے کچھے کامیابی دے، وزیروں میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔ جن کو عوام کی بھلائی کا خیال تو ہے۔ اگر آج کوئی راجہ یا نواب ہوتا تو پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ اس فسانۂ عجائب میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ عوام تماشہ تھے ـــــ عوام کی سرکار تماشائی ـــــ اگر زندہ عوام۔ مردہ عوام اور بیمار عوام کی دل و جان سے دیکھ بھال نہ کرتے تو کچھ اور ہی گُل کھلتے۔ آج کے دن تک عوام کے جانی اور مالی نقصان کا اندازہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔ مگر سرکاری گیہوں کے مُہر لگے دانے دانے کا حساب مفت کا غلہ کھانے والوں کو معلوم ہو چکا ہے۔ اسی طرح مردہ عوام میں سے کسی ایک کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کسی عام آدمی کو معلوم نہ ہو سکی۔ ایک وارڈ بوائے۔ خدا۔ شفاخانے کی بات ۔ شفاخانے کے باہر لے آیا۔ وہ یہ بات ہے کہ گیس خوردہ مریضوں کے پھیپھڑے پانی ہو کر بہہ گئے تھے مگر اُس کی بات پر بھروسہ کون کرے گا۔ کیونکہ وہ ملک کا سب سے بڑا وارڈ بوائے نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ اس عالی خون کا سہرا کس کے سر بندھے۔ یونین گیس کے سر۔ نہیں وہ بیچاری تو پانی بنا کر۔ اسٹیل کی ٹنکی میں بند کر دی گئی تھی۔ جو چوری چھپے پانچ گھنٹے میں بندی خانے کے روزن سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئی ـــــ اگر صیاد ۔ چمن والوں کو بروقت خبر کر دیتا تو گیس لینڈ کے گلشن میں ایک بھی بُلبُل کی جان نہ جاتی ـــــ مگر ان بیکار کی باتوں میں کیا دھرا ہے۔ موت ہمارے دیش میں ۔ نہ کبھی مسئلہ تھی ۔ نہ ہے ۔ نہ ہوگی ۔ پچھلے ۳۷ برس سے لوگ غربت سے مر رہے ہیں ـــــ اور الزام ۔ کبھی جاڑے۔ کبھی گرمی اور کبھی برسات کے سر پر آ رہا ہے۔ اس بار بھی جو جان سے گئے غربت کے مارے ہوئے تھے۔ گیس نے تو لوگوں کو ساتھ جینا اور ساتھ مرنا سکھایا۔ یقین نہ ہو تو تجربہ کر لیں۔ تھوڑی سی گیس سے بہتوں کا کام ہو جائے گا۔ وہ گیس پھیلتی جائے گی عوام متحد ہوتے جائیں گے، ساتھ بھاگیں گے۔ ساتھ آنسو بہائیں گے۔ ساتھ کھانسیں گے۔ ساتھ گریں گے۔ ساتھ جلیں گے۔ یونین گیس ہے کام کرے گی۔ ایکتا کمیٹی نہیں کہ فقط بات کرے۔ ـــــ

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے
آنکھ والا مرے لفظوں کا تماشا دیکھے

ــ ــ

سید مصطفیٰ تاج (بھوپال)

بھاگو... بھاگو

بھوپال کی موت کی تاریخ کچھ اس طرح ہے...

سنہ ۱۹۸۴ء اندرا گاندھی مہینہ راجیو گاندھی تاریخ کرفیو دن بھاگو بھاگو' یہ تاریخ بھوپال ہی نہیں بلکہ ساری دنیا نہیں بھلا سکتی۔

دادی اماں کہتی تھیں بیٹا جب سنہ میں بھوپال میں طاعون پڑا تو لوگ چینے چیلیوں کی طرح مر گئے۔ ایک ایک گھر میں چار چار لاشیں رکھی ہوئی تھیں، کوئی کاندھا دینے والا نہیں ملتا تھا... اور بیٹا جب ہیضہ پڑا تو سلسلہ ہی ہو گیا بھوپال ہی خالی ہو گیا لوگ جنگلوں میں بھاگ گئے... اور بیٹا جب ایکبار کال پڑا تو آس پاس کے شہروں سے کال کے مارے کنگرے بھوپال پر ٹوٹ پڑے بیٹا الی کے نیچے تک بھون کر کھا گئے سرکار سلطان جہاں انکو روٹیاں بٹواتی تھیں۔ بھیا ایک ایک روٹی پر ایسے گرتے تھے جیسے مرے ڈھور پر گدھ گرتے ہیں۔ جیسے راشن کی دوکان پر تم لوگ گرتے ہو۔

لیکن دادی اماں کے منہ سے ایسے قصے الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی تھیں کیونکہ ایسی کہانیاں تو آج بھی لوگ سنایا کرتے ہیں..... کبھی ہیروشیما ناگاساکی کے قصے کبھی ویت نام اور ایتھوپیا کی باتیں آج بھی اخبار والے ایسے ڈراونے قصے روز ہی شائع کرتے ہیں کبھی ترکمان گیٹ دکھاتے ہیں تو کبھی مرادآباد بھیونڈی کی باتیں کرتے ہیں..... لیکن بھوپالی ایسی باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیتے وہ جانتے ہیں کہ یہ دیش دروہی ہیں، شرارتی لوگ ہیں، دیش کو بدنام کرتے ہیں اور صاحب کیا بھوپالی پاگل ہو گئے ہیں جو سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیں۔ اگلے بھوپال میں تو ایسے واقعات کبھی نہیں ہوتے بھوپال تو امن کا گہوارہ ہے یہاں کوئی آفت بلا نہیں آتی، بس ایسی ہی چھٹ پٹ گھٹنائیں ہو جاتی ہیں اور فوراً ہی اکسیڈنٹ ہو جاتی ہے مثلاً کوئی رکشا یا ٹیمپو ٹکرا گیا دو چار مر گئے یا کبھی شوقیہ ہندو مسلم فساد ہو گیا

تو وہ بھی مجرم کے اکھاڑوں کی طرح دن بھر دونوں پارٹیاں بنائیں، لڑائی ہوئی اور رات کو ایک ہی ہوٹل پر بیٹھ کر چائے پی لی۔ اور صاحب اب تو وہ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا جب سے جن سنگھ نے دل بدل کر اپنا نام بھارتیہ جنتا پارٹی رکھا ہے یا بھی بھوپال اپنے ہاتھ پیر بچھڑے کرنے کے لیے کوئی بھی مانگ اٹھا کر سرکار کو چھیڑ دیتے ہیں۔ سرکار بھی غصہ میں پولس کو شوکر دیتی ہے۔ بس صاحب آپس میں لاٹھی چارج تھوڑا پتھراؤ ہوا..... اور بودوں کی لڑائی کی طرح بھگدڑ میں کچھ مرے کچھ زخمی ہوئے اور اسٹیج نیں ترٹن ہو گئی۔

سُنا ہے بھوپال میں بڑے بزرگوں کا سایہ ہے بڑے پاتے کے بزرگوں کے علاوہ یہاں دو صحابی بھی دفن ہیں، جب ہی تو یہاں کوئی دبا نہیں آتی۔ نہ کوئی سردی سے مرتا ہے نہ گرمی سے نہ طوفان آتے ہیں نہ زلزلے..... لیکن پھر بھی ان بزرگوں کے ہوتے ہوئے یہ قیامت بھوپال پر کیسے نازل ہو گئی کیا اسی رات سارے بزرگ جنت میں دعوت پر گئے ہوئے تھے یا سب بزرگ بھوپالیوں سے ناراض ہو گئے تھے تو صاحب بھوپالیوں نے کوئی بدعت کے کام بھی نہیں کیے چند پیشہ ور لوگ ہیں جو مزاروں کی چادریں سمیٹنے بیٹھ گئے ہیں اور چند مجبوروں نے قبرستانوں میں مکان بنا لیے ہیں تو صاحب اس کی سزا سارے بھوپالیوں کو کیوں دی جائے۔ خیر اپن کیوں کسی پر الزام لگا کر گناہ گار بنیں..... اپن تو توبہ توبہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ قہرِ خدا کا ڈھایا ہوا تھا۔ انسانوں کی غلطی کو خدا پر کیوں ڈالیں..... بقول بنے خاں بھوپالی کے خاں میاں اپنے بھوپالی کبھی نہیں سدھر سکتے... انہیں تو نوابی دور میں یوسف علی خاں کوتوال بھی نہیں سدھار پایا — بنے بھائی نے غصہ میں کہا..... اب دیکھو تو تاج صاحب اچھی خاصی اپنی گورنمنٹ پٹھان بین کر رہی ہے کہ ارجن سنگھ قصوردار ہے کہ سکلیچہ.... اپنے امریکہ پٹھان کی حرکت ہے کہ وہی کار بائیڈ خان کی چار سو بیسی ہے اور اپنے بھوپالی بھائی ہیں کہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ بس کہے جا رہے ہیں کہ وہ تو اللہ میاں کی طرف سے ہوا ہے یہ لوگ خاں میاں اللہ پر الزام ثابت کر کے اپنا کلیم بھی گول کرائینگے اور تو اور کہتے ہیں یہ تو اللہ نے قیامت کی ریہرسل کی تھی یہ چھوٹی قیامت تھی۔ تاج صاحب یہ تو انسان کی ڈھائی ہوئی قیامت تھی۔ قرآن کی قسم میاں خاں اگر یہ اللہ میاں کی ڈھائی ہوئی قیامت دیکھ لیتے تو آنکھیں نیلی کر لیتے..... اور صاحب ایک سرکاری آدمی کہنے لگا کہ یہ تو خدا نے گناہوں کی سزا دی ہے تاج صاحب میں نے تو کہہ دیا کہ مولانا قرآن کی قسم اگر یہ گناہوں کی سزا ہوتی تو تم نربدا میں پھولے پڑے ہوتے۔

اب آپ ہی بتائیے تاج صاحب بھوپال میں بس غریب ہی گنہگار تھے ان لوگوں کا تو وہ حساب ہے کہ چت بھی میری پٹ بھی میری انٹا میرے باپ کا۔ پورے ہندوستان میں کانگریس آئی جیت گئی تو کہتے ہیں راجیو گاندھی کا چمتکار ہے۔ یونین کار بائیڈ کی گیس پھٹ گئی تو کہتے ہیں اللہ کی طرف سے ہوا۔

اچھی فصل آگئی تو گورنمنٹ کا چمتکار ہے سوکھا پڑ گیا تو اللہ نے کیا بنے بھائی نے چونا چاٹتے ہوئے کہا خیر صاحب
چھوڑو ان جاہلوں کو آپ تو یہ بتاؤ تاج صاحب آپ اس رات کہاں بھاگے تھے. میں نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا
ارے بنے بھائی جب اس بھاگو بھاگو کی رات کا خیال آتا ہے تو کلیجہ کانپنے لگتا ہے. لیکن بنے بھائی ایک
بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ اپن میں دم خم بہت ہیں. اگر اس بات کا اندازہ پہلے ہو جاتا تو اپن پی ٹی اوشا
کو چیلنج پھینک دیتے. بنے بھائی یقین مانو بس ایک سانس میں بھدبھدے کا پل کراس کر لیا. ہمیں تو بس اتنا یاد
ہے کہ ہماری بیوی نے ہمیں مع لحاف کے پلنگ پر کھڑا کر دیا اور ہمارے مختصر سے ستر چھپاؤ کپڑوں کو نوچتے
ہوئے ریس کے گھوڑوں کو "بک آپ" کرنے والی آواز میں چیختے ہوئے کہا. بھاگو ۔ بھاگو بس صاحب
جو ہم نے پہلی سانس لی تو ہم بھدبھدے کے پار تھے اور ہماری بیوی ہم سے دس قدم آگے کھڑی تھیں
اور صاحب کمال کی بات تو یہ ہے کہ ان کی سانس بھی نہیں پھولی جبکہ کمرے سے باورچی خانے تک جانے میں
انکی سانس [illegible] کی طرح چلنے لگتی ہے ... اور تو اور ہمارے خالو میاں جو تقریباً ایک سال سے ہم کو اپنے ساتھ
پاخانے لے جاتے تھے اور کمربند بھی ہم ہی سے کھلواتے' بندھواتے تھے ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی
جب ہم نے دیکھا کہ وہ ٹی ٹی نگر کی گھاٹی ہم سے آگے چڑھ رہے ہیں... لیکن بھدبھدے سے واپسی پر
وہ ہمارے کاندھے پر ہی بیٹھ کر آئے. اف خدا کتنی قیامت کی رات تھی لوگ کتنے بدحواس تھے ... ..

پرانے گلے پر ایک ٹرک پر سینکڑوں آدمی سوار تھے ٹرک ڈرائیور انھیں چڑھنے کو منع کر رہا تھا تو لوگ اسے مار رہے تھے.
وہ بیچارہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، بھائیو میری بات تو سنو لیکن کوئی اللہ کا بندہ اس غریب کی سننے کو تیار نہیں تھا بس اس کو دھکے
دیکر ٹرک چلانے پر مجبور کر رہے تھے بمشکل تمام اس نے چیخ کر کہا' ٹرک جیک پر کھڑا ہے اس میں پہیئے نہیں ہیں . . . .

ہماری بہن صاحبہ جن کی اکلوتی بچی بھیڑ میں کھو گئی تھی. انہوں نے کسی طرح اسے ڈھونڈ نکالا... اور اپنے سینے سے
لپٹا کر بھاگیں اور ایک بغیر انجن کی جیپ میں جس میں بیٹھ کر بھاگنے کی لالچ میں سینکڑوں آدمی اسے دھکا دے
رہے تھے بیٹھ کر داہود ڈیم تک پہونچ گئیں وہاں جاکر جب سکون ہوا تو اپنی بچی کو خوب پیار کیا اور ایک
چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں کیونکہ وہ بچی انکی نہیں تھی' گھبراہٹ میں کسی اور کی بچی اٹھا لائی تھیں.

سنا ہے قیامت کے دن ساری دنیا ایک ہی زبان بولے گی اور وہ ہوگی عربی' اسی کی ریہرسل ہم
نے بھاگو بھاگو کی رات دیکھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے ہندوستان کی ایک ہی بھاشا ہے سندھی
ہو کہ پنجابی' مدراسی ہو کہ بنگالی' گجراتی ہو کہ بھوپالی. سب ایک ہی بھاشا میں چلا رہے تھے... بھاگو
بھاگو. اگر سارے ہندوستان میں گیس پھیل جاتی تو زبان کا مسئلہ تو حل ہو جاتا' کیا قیامت کی رات تھی
ارے قیامت کیوں کہتے ہو بھائی قیامت کے دن تو سارے انسان اپنے اپنے خداؤں کو یاد کرینگے
تو عجیب رات تھی جب انسان خدا کو بھی بھول گیا تھا کوئی رب کا نام نہیں لے رہا تھا.

نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان کوئی سکھ تھا نہ عیسائی۔ بس سب کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا... بھاگو.. بھاگو
لوگ بھاگ رہے تھے' ملّا بھاگ رہے تھے' پادری بھاگ رہے تھے۔ بے ایمان کیسا تھ ایمان دار
بھاگ رہے تھے۔ سرمایہ دار کے ساتھ فقیر بھاگ رہے تھے پولیس اور چور ایک ساتھ بھاگ رہے تھے
کانگریس آئی بھاگ رہی تھی' جنتا پارٹی بھاگ رہی تھی' ڈاکٹر بھاگ رہے تھے' مریض بھاگ رہے تھے۔ دولہا کا
ہاتھ پکڑے ہوئے دلہن بھاگ رہی تھی ... باراتی بھاگ رہے تھے ہڑتالی بھاگ رہے تھے... تو صاحب
ہم بھی بھاگ رہے تھے اور صاحب

جو رُک گیا' وہ گر گیا پتھر کا ہو گیا
جس نے لگائی دوڑ وہ خطرے کے پار تھا

مجھ میں کتنے چھپے ہوئے گن ہیں' کتنی صلاحیتیں ہیں اسکا اندازہ بھاگو بھاگو کی رات کو ہوا۔ میں پی ٹی
اوشا سے تیز دوڑ سکتا ہوں' دلیپ کمار سے اچھی ایکٹنگ کر سکتا ہوں ... ایک فلم آیا تھا دلیپ کمار کا...
نام تھا مشعل ..... اس میں دلیپ کمار کی بیوی سڑک پر بے ہوش ہو کر گر گئی اور وہ ادھر آنے جانے
والی گاڑی کو مدد کے لیئے روکتا اور دُہائیاں دیتا تھا۔ صاحب جس نے بھی فلم دیکھی اُسکی ایکٹنگ کی بہت
تعریف کی۔ لیکن صاحب اس وقت کوئی میری ایکٹنگ دیکھ لیتا تو دلیپ کو بھول جاتا اور مجھے گرو مان لیتا...
جب میری بیوی نے بھاگتے بھاگتے ذرا سا جھوکا کھایا تو ہماری زمین پر زلزلہ آگیا... اور ہم بھاگتی ہوئی
گاڑیوں کو دلیپ کے انداز میں روکنے کے لیے دوڑ پڑے اور اسی انداز میں چلا چلا کر گڑگڑا کر انکی ..
خوشامد شروع کر دی..... او بھائی خدا کے واسطے گاڑی روک دو میری بیوی مرجائیگی۔ او بھائی خدا
تم پر اور تمہارے گھر والوں کو مہربان کر دے۔ اے نیتا جی گاڑی روک دو خدا تمہیں منسٹر بنا دے۔ اے ڈرائیور صاحب
اللہ تمہیں تھانیدار بنا دے۔ اے بھائی او مولانا خدا تمہاری خوراک بڑھا دے' ثواب کما لو' گاڑی روک دو
اے میری بیوی مرجائے گی۔ اے رہبر قوم خدا تمہارے چندے میں برکت دے' اے سیٹھ گاڑی روک لو
خدا تمہیں برلا ٹاٹا بنا دے... اے سردار جی رحم کھاؤ گرو تم کو خالصتان دے... اے نیتا جی تمہارا
ایک ووٹ کٹ جائے گا... اے مولانا اے قائد اعظم خدا تمہاری مسجد بنوا دے' آخرت کما لو میری
بیوی کو بچا لو... لیکن صاحب بھلا اس نفسا نفسی کے عالم میں کون کس کی سنتا ہے نہ کسی کو منسٹر بننے کا ہوش
تھا نہ تابعداری۔ آخر مایوس ہو کر خود ہی بیوی کو اٹھانے کی کوشش کی۔ ابھی پوری طرح گود بھر ابھی نہیں
تھا کہ انہوں نے پلٹ کر ہمیں وہ دھوبی پاٹ مارا کہ ہم چاروں خانے چت سڑک پر جا پڑے...
اور صاحب ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ انھوں نے اُٹھ کر ہمیں غنڈہ لوفر کہہ
اور سڑک پر بھاگنا شروع کر دیا' اور انتہائی شرمندگی اس وقت ہوئی جب ہماری بیوی نے یہ کہتے ہوئے

ہمیں گھسیٹ کر زمین پر سے کھڑا کیا۔ کہ ..... اس وقت بھی تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ کب سے تم کو ڈھونڈ رہی ہوں چلو بھاگو۔ بھاگو ... صبح ہونے والی تھی بھاگتے بھاگتے دم پھول چکے تھے آنکھوں پر گیس کا غلاف چڑھ چکا تھا اب لوگ ایک دوسرے کا سہارا لے کر بھاگ رہے تھے ... ابھی اندھوں کی بھاگ دوڑ چل ہی رہی تھی کہ پولیس وین نے اعلان کرنا شروع کر دیا... بھگوڑے بھائیو مت گھبراؤ یونین کاربائیڈ کا جن گرفتار ہو گیا ہے اسے دوبارہ بوتل میں بند کر دیا گیا ہے اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ... آپ لوگ اپنے اپنے قبرستانوں میں واپس جا سکتے ہیں۔

ایک بھوپالی نے آنکھوں سے رومال ہٹا کر کہا۔ ارے خاں میاں ان کی باتوں میں مت آنا یہ پولس والے ہیں ڈمہ دے رہے ہیں، خدا خدا کرتے لاشوں کو اُلانگتے پھلانگتے ... اور گھبراہٹ میں بغیر وضو ہی نماز شکرانہ ادا کی۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے بڑے صاحب زادے بھی تشریف لائے جو ہم سب لوگوں کو سوتا چھوڑ کر پہلے ہی بھاگ گئے تھے ... میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا کیوں رے مطلبی اپنی جان بچا کر بھاگ گیا... گھر والوں کی کوئی فکر نہیں ہوئی اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا... بابو جی میں نے سوچا اپنے خاندان کا کوئی فرد تو زندہ رہے ... ورنہ اپنے خاندان کا تو نام ہی مٹ جائے گا۔

اور صاحب پھر روشنی ہو گئی سورج نکل آیا ... لاشوں کے شہر میں صبح ہو گئی یہی وہ صبح تھی جس کی آرزو لئے بڑے بڑے چنگیز ہلاکو ہٹلر مسولینی یہی گاتے گاتے مر گئے۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی ..... وہ صبح کبھی تو آئیگی۔

اس صبح کا سورج دنیا میں پہلی بار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے شہر میرے وطن میری جنت میں نمودار ہوا۔ بھوپال جو کبھی تالابوں کا شہر کہلاتا تھا۔۔ آج لاشوں کا شہر کہلانے لگا لاشوں کا تھوک بیوپاری۔۔ لاشوں کا بینک بن گیا۔ اسرائیل سے بھی بڑا وہیٹ نام سے بھی بڑا۔ لاشیں ہی لاشیں۔ تا حدِ نظر لاشیں مشرق سے مغرب تک لاشیں۔ ان لوگوں کی لاشیں۔ سارے مذاہب دفن ہو گئے صرف انسانیت جاگ اٹھی۔۔ لاشیں دفن ہونے لگیں۔ لاشیں جلائی جاتے گئیں لاشیں ندیوں میں ڈالی گئیں۔ بلا تفریق ؎

تفریق کرے انسانوں میں
اس شہر کا یہ دستور نہیں

دستور بدل گئے دستور بنانے والے روپوش ہو گئے نہ کوئی مُلا تھا نہ پنڈت نہ کوئی رہبر تھا نہ رہنما تھا۔۔ نہ ہندو کو روتا تھا نہ مسلمان کو ہندو قبریں کھود رہے تھے مسلمان ارتھیاں اٹھا رہے تھے۔ میں دُعا کر رہا تھا۔۔
کاش میرے بھوپال کی یہ ایکتا ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے!! ☐☐☐

غزلیں

چٹان مشرقی

چھن گئے سائے بھی زلفِ یار کے
اب کہاں جائیں الکشن ہار کے

پیچھے کہدوں میں اُنھیں اپنا رقیب
وہ تو چمچے ہیں مرے دلدار کے

دن ہی میں تارے نظر آنے لگے
دیکھتے جاؤ کرشمے پیار کے

کم نہیں راکٹ سے وہ اسپیڈ میں
صدقے جاؤں میں تری گفتار کے

کوئی ناصح ہے نہ اب کوئی رقیب
سارے جلوے ہیں مری سرکار کے

جم گیا چٹان بزمِ ناز میں
اب اٹھائے کوئی دھکّے مار کے

○

رشید عارف

آپ اپنا گھر جلانے کے سوا کچھ بھی نہیں
تیل کی دولت کا مصرف کیا لیا کچھ بھی نہیں

روح میرے جسم سے گھبرا کے باہر آگئی
پیٹ کے اندر بجز نقلی دوا کچھ بھی نہیں

اس قدر میکے سے بیگم ساتھ لائیں مال و زر
آج تک روزی کی خاطر کیا کیا کچھ بھی نہیں

باعمل اقوام نے ڈالیں کمندیں عرش پر
شیخ جی کا کام شیخی کے سوا کچھ بھی نہیں

دوستوں نے لوٹ لی پونجی مری اچھا ہوا
اب کسی رہزن کی خاطر کیا بچا کچھ بھی نہیں

غیر کے اشعار پڑھ کر شاعرِ اعظم بنے
اور فرماتے ہیں غالب کا کہا کچھ بھی نہیں

موٹا بٹوا مار کر خوش تھا بڑا اس میں نو عدد
غیر انعامی ٹکٹ تھے اور کیا کچھ بھی نہیں

ایک دھوتا ہے اگر تو دوسرا ڈھوتا ہے بوجھ
پھر بھی دھوبی ہی کا ہے سب اور گدھا کچھ بھی نہیں

○

دلیپ بادل (نئی دہلی)

ہزل

میری ممی تجھے ہوا کیا ہے
تجھکو ڈیڈی نے کر دیا کیا ہے

دو ہی بچے کریں گے اب پیدا
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

ہم تو کرتے ہیں پیار انگلش میں
تم نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

اپنی بیوی کی مار کھائی ہے
اور بادل تجھے ملا کیا ہے؟

بانو سرتاج
چندراپور

کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی....

ہم بچے تھے تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ کسی پر طنز کرنا اچھی بات نہیں۔ کسی کے تئیں دل میں رنجش ہو، کسی کی ذات پر غصہ ہو تب بھی دشمنی پر کمربستہ نہ ہو جاؤ۔ دوسروں کے ساتھ مِل کر دشمن پر طنز کے تیر نہ برساؤ۔ وہ اپنی راہ جائے تم اپنی راہ چلو۔ ہم نے ایک سعادت مند بچے کی طرح یہ نصیحت گانٹھ باندھ لی تھی ایک طویل عرصے تک نصیحت کی یہ گانٹھ پکّی بندھی رہی ذرا سی ڈھیلی بھی نہیں پڑی مگر اس نئے زمانے میں، جب کہ نصیحت فرمانے والے ہمارے بزرگ خلا کو آباد کر چکے ہیں، ہمیں اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ نصیحت کی یہ گانٹھ کھل گئی ہے اس کی معقول وجوہات بھی ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ شرفاء بھی اب طنز کرنے، طنزیہ بولنے اور طنزیہ لکھنے لگے ہیں۔ چاہے اپنی ساس ہو یا سیاست کے میدان کی ساس، مہنگائی ہو یا بے دفائی، ٹی وی ہو یا وی سی آر، فیملی کی پلاننگ ہو یا غریبی ہٹانے کی پلاننگ۔ چناؤ کی گرمی ہو یا چڑھے ہوئے دماغوں کی گرمی... سب کو طنز کے جوتے مارے جا رہے ہیں کبھی کبھی مزاح کی مخملی چادر میں لپیٹ کر اور واہ واہ لوٹے رہے ہیں۔

حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے کہ معاف کرو، معاف کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ عیسیٰ مسیح فرما گئے کہ کوئی تمہیں ایک چانٹا مارے تو تم دوسرا گال بھی اُس کے آگے کر دو جس سے کہ اس پر بھی چانٹا مار کر وہ اپنا شوق پورا کرلے۔ گوتم بدھ، مہاتما گاندھی وغیرہ سبھی کچھ ایسی ہی نصیحتیں کرتے ہوئے عالمِ بالا کو سدھارے مگر طنز نگار کا ایمان اتنا کچا نہیں ہوتا۔ "دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو" والی کہاوت اس کے خیال میں لغو ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے میں یقین رکھتا ہے۔ دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر طنز نگار کا ایمان ہوتا ہے کہ اگر ہم دنیا میں دوسروں کا بھلا کرنے آئے ہیں تو دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

جیسے بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے ویسے ہی ناکام نثر نگار، طنز نگار بن جاتا ہے معذرت کے ساتھ واپس آنے والی تخلیقات کا سلسلہ... نثر نگار کو مدیروں کے قصائد لکھنے کے لئے نہیں مرثیے لکھنے کے لیے مجبور

رتا ہے۔

ایک کم پڑھے لکھے شخص نے میدانِ سیاست میں اس شان سے قدم رنجہ فرمایا کہ لیڈر سے منسٹر بننے کی منزلیں ایک ہی بار میں سہل ہوگئیں۔ پہلے دن آفس پہنچا تو کرسی کی پشت کی دیوار پر لگے ہوئے دنیا کے نقشے کو بہت دیر تک دیکھتا رہا پھر بولا۔ ۔ ''یہ کیا نقشہ ہے؟ اس میں فارن تو ہے ہی نہیں۔ اب تو ہمیں فارن جانا پڑے گا۔ معلوم تو ہو فارن کہاں ہے۔؟ مطلب یہ کہ موقع ملتے ہی نہ بولنے والا بھی بولنے لگتا ہے۔ تقریر بھی یوں ہی انٹ شنٹ کرتا ہے۔ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ دھیان لگا کر سنتا کون ہے؟ ایک کوئنٹل گیہوں میں ایک دو کلو ریت آسانی سے کھپ جاتی ہے۔

طنز نگار جب لکھتا ہے تو باورچی خانے کے توے، فرائنگ پین سے لے کر ۔ ۔ ۔ بیوی کے 'مٹاپے تک' آنگن کے لوکی کدو سے پڑوسی کی مونچھوں تک اور دفتر کے افسر سے لے کر پان کی دوکان تک سب پر لکھ مارتا ہے۔ بس دو چار فقرے چست کرنا جیسے آگیا وہ لکھنے کو قلم اٹھا لیتا ہے چاہے مادری زبان بھی صحیح لکھنی نہ آتی ہو۔

جیسے رام کے ساتھ سیتا، کرشن کے ساتھ رادھا، سیاست کے ساتھ خرافات ویسے ہی طنز کے ساتھ مزاح ہوتا ہے۔ اتنی سمجھ تو طنز نگار میں ہوتی ہی ہے کہ درد کے ساتھ دوا بھی مہیا کرے۔ خالص طنز نگار البتہ ذرا گہری فلاسفی رکھتے ہیں۔ ان کے تئیں درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ۔ ۔ ۔ چوٹ پر چوٹ لگائے جاتے ہیں۔

موقع شناس اُسے کہتے ہیں جو اچانک پانی میں گر جائے مگر فوراً ہی تیرنے بھی لگے جس سے معلوم نہ ہو غلطی سے گرا ہے۔ موقع شناس کا دوسرا نام طنز نگار ہے جو بظاہر تو ہر کسی کی بات ہنستے ہنستے برداشت کر لیتا ہے مگر بعد میں ایک طنزیہ لکھ کر آگے پیچھے کے سب حساب برابر کر لیتا ہے۔

ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ پاگل سب سے اچھے طنز نگار ہوتے ہیں۔ پاگل ہو کر وہ دنیا پر ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ دنیا ہوش مندوں کے رہنے کے لائق نہیں۔ کل ایک پاگل کو دیکھا۔ شہر کی بھری پُری سڑک سے کار کے ہارن، سائیکل کی گھنٹی، ٹرک کی گھرر گھرر ۔ ۔ ۔ کی نقل کرتا، پھیری والوں اور خوانچے والوں کی آواز میں آواز ملاتا اپنی دنیا میں مگن چلا جا رہا تھا۔ ایک رکشہ کے پاس جا کر وہ رک گیا۔ رکشہ میں بیٹھا ہوا شخص لاوڈ اسپیکر پر چیخ چیخ کر لاٹری کے ٹکٹ فروخت کر رہا تھا ایک روپئے کا ٹکٹ ہے اور لاکھوں کا انعام ہے۔ ۔ ۔ ایک روپئے کا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پاگل کچھ دیر تک کھڑا لاٹری کے ٹکٹوں کی خرید و فروخت دیکھتا رہا پھر گردن جھٹک کر وہاں سے ہٹ گیا۔ ہاتھوں کا بھونپو بنا کر لاٹری والے کی طرح چیختا ہوا چلنے لگا ۔ ۔ بنانے والا ایک ہے ۔ ۔ ۔ بننے والے لاکھوں ہیں ۔ ۔ ۔ بنانے والا ایک ہے ۔ ۔ ۔،

جس طرح اللہ تعالیٰ کو اچھے بُرے، کالے گورے، موٹے دُبلے خوبصورت بدصورت انسان و جانور ۔ ۔ ۔ چرند پرند بنانے میں کمال حاصل ہے اسی طرح طنز نگار کو الفاظ کے ردو بدل، نئی عجیب و غریب اصطلاحات وضع کرنے ۔ ۔ ۔ اور انسانوں و اشعار کی پیروڈی کرنے کا حق حاصل ہے جو اس نے خود ہی حاصل کیا ہے۔ ایک بار ہم نے ایک حکیم صاحب کی شہرت سُن کر ان کے مطب کی طرف بغرضِ علاج کوچ کیا۔ مطب کے راستے میں ہمارے ایک طنز نگار دوست ہم سے ٹکرا گئے۔ ہمارا مدعا جان کر ہمیں اُلٹے پیروں واپس جانے کو کہا۔ ہم نے وجہ جاننی چاہی تو ایک اچھے خاصے خوبصورت شعر کی ہڈی پسلی توڑتے ہوئے یوں گویا ہوئے ۔ ۔ ۔

وہ فرشتۂ موت ہے اُس کے کلینک میں
میرے حبیب بھول کر بھی نہ قدم رکھنا

اردو ادب میں طنزیہ ادب کو ادب ہی نہیں مانا جاتا . . ستم در ستم یہ کہ منی کہانیوں کو جھنڈے پر چڑھا جاتا ہے . . . آج ہی کسی اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک منی افسانہ نگار نے اپنا منی افسانہ تار سے ایڈیٹر کو بھیجا۔ ایک ناکام کہانی کار نے مسلسل تین راتیں جاگ کر ایک طویل افسانہ لکھا اور تین رسالوں کو روانہ کیا۔ تینوں رسائل سے کہانی معذرت کے ساتھ واپس آگئی۔ انہوں نے نہایت غصّے میں اُس کہانی کے ٹکڑے کر کے پھینک دیئے اور کبھی طویل افسانہ نہ لکھنے کی قسم کھائی۔ تین روز گزرے ہوں گے کہ پھر قلم اُٹھایا۔ کاغذ تلاش کرنے لگے تو ایک پُرزے پر لکھی ہوئی ایک نہایت شاندار منی کہانی دستیاب ہوئی انھیں یاد نہ آیا کہ یہ کہانی انہوں نے کب لکھی تھی۔ کاغذات کو دوبارہ دیکھنے پر پندرہ، بیس اور منی کہانیاں دستیاب ہوئیں . . . کافی غور کے بعد خیال آیا کہ یہ کہانیاں ان کے طویل افسانے کے ٹکڑے ہیں جو کوئی اُدھر گرا تھا کوئی ادھر گرا تھا۔ انہوں نے کہانیاں فیر کر کے بیک وقت کئی رسائل کو روانہ کر دیں . . . آج وہ ایک مشہور منی افسانہ نگار ہیں

آج نہ جانے کہاں سے بھولی بسری یاد آتی جا رہی ہے . . . اس طرح کا دورہ ہم پر کبھی کبھی پڑتا ہے۔ حواسوں پر لوٹنے پر اپنا لکھا جب ہمارے آگے آتا ہے تو اپنی خیر مناتے ہوئے ہم دل ہی دل میں کہتے ہیں . . .

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے . . . کوئی

۱۵

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کبوتر کے کابن — سلیمان خطیب — مجموعہ کلام — ۱۵ روپے
دھرگھسیٹ — سرٹے حیدرآبادی — ۸ ″
آدمی نامہ (خاکے) مجتبیٰ حسین ۹ روپے، بہرحال (مضامین) مجتبیٰ حسین ۷ روپے، بالآخر (مضامین) مجتبیٰ حسین ۱۲ روپے
تکلف برطرف (مضامین) مجتبیٰ حسین ۱۲ روپے، قطع کلام (مضامین) مجتبیٰ حسین ۱۲ روپے
البتہ — یوسف ناظم — مضامین — ۱۰ ″
سمن زار — خواجہ عبدالغفور — ″ — ۸ ″
سنی سنائی — لئیق صلاح — ″ — ۱۰ ″
گویم مشکل — ڈاکٹر حبیب ضیاء — ″ — ۱۲ ″
غبارِ خاطر — رؤف خوشتر — ″ — ۱۲ ″
ٹائیں ٹائیں فش — پرویز یداللہ مہدی — ″ — ۱۵ ″
چنانچہ — مسیح انجم — ″ — ۱۲ ″
ہنستے ہنستے — برق آشیانوی — ″ — ۱۲ ″
سکنڈ ہینڈ (مضامین) رفیق شاکر ۱۰ روپے، مطلع عرض ہے (مجموعہ کلام) دلاور فگار ۱۲ ″

کُدال

شہزاد معصومی

استرار جامعی کا نشان جو کُدال ہے
منصوبۂ حریف غضب پائمال ہے

یہ اپنی کاٹ چھانٹ میں خنجر سے تیز تر
بس دیکھ کر ہی اس کو بُرا اب کا حال ہے

ہل بیل، ہنسوے اور ہتھوڑے کی کیا بساط
پنجہ کلائی سے جو اُڑا دے کُدال ہے

یہ سب صفت کُدال میں موجود ہے جناب
لیکن چلانا اس کا ہر اک سے محال ہے

علامہ جامعی کی جسامت تو دیکھئے
پھر دیکھئے کہ اُٹھتی بھی ان سے کُدال ہے

لڑنے کو انتخاب کھڑا دیکھ کر انھیں
حیرت زدہ ہے فکر پریشاں خیال ہے

کل تک قلم تھا ہاتھ میں طنز و مزاح کا
یہ کیا کہ آج اس کی جگہ پر کُدال ہے

جیسے کبھی ہو چتا نا ہے قالین کے شیر کو
یہ آبروے اہل قلم کا سوال ہے

(اسرار جامعی کے انتخابات میں حصہ لینے پر لکھی گئی)

اپنی ہی قبر کھودلی، اپنی کُدال سے

استرار جامعی ہیں وہ مجموعۂ صفات،
جو شِ عمل سے رہتے ہیں جو اضطراب میں

رکھ کر قلم کو طاق پہ طنز و مزاح کے
لے لی کُدال کود پڑے انتخاب میں

اہلِ سخن کے دل میں لگی رشک حسد کی آگ
سب کو تھا ناگوار یہ اقدام جامعی

ہر شاعر و ادیب نے دھوکا دیا انھیں
آیا نہ ووٹ ڈالنے کو ایک شخص بھی

بیٹھے تھے دوستوں پہ بھروسہ کئے ہوئے
پر شاعرِ غریب کی عزت نہ بچ سکی

مت پوچھئے کہ ردِ عمل اس کا کیا ہوا
اس درجہ غیر ہوگئی حالت ملال سے

سنتے ہی اپنی ہار کی علامہ نے خبر
اپنی ہی قبر کھودلی، اپنی کُدال سے

(اسمبلی کے چناؤ میں علامہ کا انتخابی نشان کُدال تھا)

غزل

غنچہ عادل آبادی

باپ دادا تو بہت کچھ کہہ گئے
ہم فقط رمّی کھاتے رہ گئے

بیچ کر میرا کفن تک کھا گئے
دوستوں کے یہ ستم بھی سہہ گئے

ذکر جب بھی چھڑ گیا اولاد کا
ڈال کر گھٹنوں میں منڈی رہ گئے

بھٹ بھٹی پر بیٹھ کر وہ چل دیئے
ہم فقط پیدل بھٹکتے رہ گئے

گلگلے کھانے لگے غنچہ گدھے
عقل والے گھاس چرتے رہ گئے

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

نہیں لگا مگر پھر لگ گیا کرفیو

فساد کے ساتھ کرفیو کا نفاذ شہر حیدرآباد کا مقدر بن چکا ہے۔ یوں تو سال کے بارہ مہینے اور تین سو پینسٹھ دن فساد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لیکن عید و تہوار اور انتخابات کے وقت فسادات کا ہونا مسلّمہ ہے۔ ہم حیدرآبادی شہری فسادات اور کرفیو کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ جو شخص فسادات اور کرفیو سے گھبرائے وہ حیدرآبادی نہیں ہو سکتا۔ مستقبل میں حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی کا مسئلہ کھڑا ہوا تو اس صفت کو کسوٹی بنایا جا سکتا ہے۔

حیدرآبادی شہری اتنے فسادات اور کرفیو برداشت کر چکے ہیں کہ اب تجربہ کی بنیاد پر فساد کی پیشن گوئی کے ساتھ احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں۔ حیدرآبادیوں کو یقین تھا کہ پچھلے مہینے منعقد ہونے والے انتخابات کے دن فساد اور غیر معینہ مدت کا کرفیو نافذ ہوگا۔ ہر شہری پریشان ایک ہی سوال کرتا نظر آیا "اس مرتبہ معلوم نہیں کتنے دن فساد اور کرفیو چلے گا" حیدرآبادی شہری موسم، سیاست، گرانی وغیرہ پر بات چیت کرنے کے بجائے شہر کی فرقہ وارانہ صورتحال پر بحث و مباحثہ کرتے نظر آنے لگے۔

فساد اور کرفیو کے خطرناک نتائج کے پیش نظر حیدرآبادی شہری، عزیز و اقارب اور دوست احباب سے ہر ملاقات کو آخری ملاقات تصور کرنے لگے ہیں۔ اکثر حضرات اپنی آخری خواہش کا اظہار اور وصیت بھی کرتے ہیں اس مرتبہ ہم بھی رشتہ داروں سے مل کر آبدیدہ ہو گئے۔ ان سے کہا "بھائی بولا چالا معاف کرنا، انتخابات کے دن معلوم نہیں کیا ہو؟ زندگی باقی رہی تو پھر آپ سے رشتہ داری نبھائیں گے ورنہ مغفرت کی دعا کرنا" بیوی بچوں کو جمع کر کے وصیت کی۔ اپنے اثاثہ کی تفصیلات بتلائیں۔ لوگوں کا قرض واپس کرنے کی تاکید کی۔ گھر والوں نے ہماری باتوں کو غور سے سنا، کچھ وضاحت طلب کی لیکن کسی نے آنسو بہایا اور نہ ہی ہماری اس حرکت کو بدشگونی قرار دیا۔ شہر فساد اور کرفیو میں رہتے ہوئے ہم میں جینے کا اتنا سلیقہ تو آ ہی چکا ہے۔

شہر کے بعض محلے حساس علاقہ قرار دیئے گئے ہیں۔ امکانی فساد اور کرفیو سے پہلے لوگ ان علاقوں سے نقل
ان کر کے محفوظ مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ لوگ شہر چھوڑ کر ویرانے میں بسنا چاہتے ہیں جہاں کوئی نام لیو پوچھنے والا نہ
۔ چند شہری فساد اور پھر کرفیو کی چھٹیوں میں شہر سے باہر سیر سپاٹے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ حالات قابو میں آنے اور امن
ُم ہونے کے بعد شہر واپس آتے ہیں۔ فساد اور کرفیو کے ڈر کے علاوہ پولس کی جانب سے ممکنہ گرفتاری سے بچنے کے
ے بھی اکثر شہری نقل مقام کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست اپنے محلہ میں پولس پیکٹ قائم ہوتے ہی اپنے بچوں کو دور
راز مقام پر بھیج دیتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہا "کیا کروں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی تو نہیں ہے۔ میرے بچوں
ی جوانی پولس کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔

ہمارے شہر میں کرفیو کئی دن بلکہ کئی ہفتے نافذ رہتا ہے۔ اس دوران زندہ رہنے کی طمانیت حاصل کرنے کے لئے
حیدرآبادی شہری ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے ان سے کہا "ڈاکٹر صاحب فساد ہوگا اور پھر
کرفیو نافذ کیا جائے گا۔ ہمارا تفصیلی معائنہ کر کے بتلایئے کیا ہم آپ کے بغیر دو چار ہفتہ صحت مند رہ سکیں گے۔" ڈاکٹر
صاحب نے ہمارا معائنہ کیا اور کہا آپ طبی نقطہ نظر سے تو صحت مند رہ سکتے ہیں لیکن شہر کی فرقہ وارانہ صورتحال کی روشنی
میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" ہمارا ابھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹروں کے بغیر ہماری صحت بہتر رہتی ہے۔ ہم نے پھر بھی احتیاطاً سردی
زکام بخار جیسے عام امراض کی دوائیں ڈاکٹر صاحب سے لے لیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا "کرفیو میں گھر پر
رہنے سے صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر سوچ کر بتلایا "فیملی پلاننگ متاثر ہوتی ہے۔" اور
شاید یہی وجہ ہے کہ پرانا شہر جہاں بار بار کرفیو نافذ ہوتا ہے گنجان آبادی والا علاقہ بن گیا ہے۔

حیدرآبادیوں کو اپنے اپنے گھروں میں اناج کا بفر اسٹاک رکھنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کب کرفیو لگ جائے کرفیو
کے اندیشہ کے تحت بازاروں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ جسے دیکھیئے ہر چیز خرید کر گھر میں محفوظ کر لینا چاہتا ہے۔ نتیجتاً
قیمتیں بڑھ جاتی ہیں دوکاندار کرفیو کی دھاک جما کر سڑا گلا مال گاہک کے حوالے کر کے منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔
اس طرح کی تجارت کو ہمارے ایک دوست نے "کرفیو سیل" کا نام دیا ہے۔ کئی حیدرآبادی ایسے بھی ہیں جو کرفیو سیل
میں خریداری نہیں کرسکتے۔ وہ خریدنے والوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم رات دیر گئے تھیلیوں اور تھیلوں
سے لدے پھندے تیز تیز گھر کی جانب جارہے تھے۔ ایک بے سروسامان صاحب نے ہم پر طنز کیا "قیامت کے بوریئے
سمیٹے گھر جارہے ہو میاں!"

کرفیو کے دوران وقت کاٹنا ایک مسئلہ ہوتا ہے کرفیو کے اندیشہ کے ساتھ پرانے رسائل اور کتابوں پر سے گرد
صاف کر کے قرینے سے رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک ہی کتاب کو ہر بار کرفیو کے دوران پڑھا جاتا ہے اب آپ سے کیا چھپائیں
ہمیں "شاہی دسترخوان" ازبر ہوچکی ہے پرانی کتابوں کے علاوہ کھیلنے کے لئے سامان سے ٹوٹے پھوٹے بیاٹ اور
گولے نکالے جاتے ہیں بعض لوگ کرفیو کے دوران کام کرنے کے لئے ایک فہرست بنا رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ہماری بیوی
نے کرفیو کے دوران انجام دینے والے کام کی جو فہرست حوالے کی ان میں بچیوں کے سر سے جوئیں صاف کرنا بھی شامل
تھا۔ ہمارے ایک ساتھی ادیب ہر کرفیو کے بعد چند مضامین لے کر ایڈیٹر کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ ایک شاعر
دوست کرفیو کے دوران موڈ میں آتے ہیں یا غزل در غزل اور نظم در نظم کہہ کر کرفیو اُٹھنے کے بعد مجموعہ کا رسم اجراء کراتے

ب۔ ایسے حضرات کرفیو کے نفاذ سے بہت خوش رہتے ہیں۔ بچے بھی کرفیو کے نفاذ کو پسند کرتے ہیں۔ کرفیو کی چھٹیوں میں
و پڑھنے سے آزاد رہتے ہیں۔ کھیل کود اور شرارتوں کا ایک ماسٹر پلان تیار رکھتے ہیں۔ کرفیو کے دوران ٹی وی ایک نعمت غیر
رقبہ ثابت ہوتا ہے۔ حیدرآبادی شہری کرفیو کے دوران ہر دم ڈم ساد ھے بیٹھے ٹی وی کا نظارہ کرتے رہتے ہیں اور جناب
س گھر میں ٹی وی نہیں ہے وہاں اہل و عیال ٹی وی خریدنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کی بیوی
بچوں نے دھمکی دی "اس بار اگر آپ نے ٹی وی نہیں خریدا تو ہم کرفیو کی خلاف ورزی کر دیں گے۔ وقت گزارنے کے
ئے سڑکوں پر گھومنے جائیں گے۔"

فساد اور کرفیو کے نفاذ کے خلاف صرف عوام ہی احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کرتے حکام بھی وسیع بندوبست کرتے ہیں۔
ختلف مقامات سے پولس آتی ہے۔ مقامی نوجوانوں اور وظیفہ یاب پولس والوں کو بھی پولس میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ مختلف
ارتیں اور سواریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ پولس کی گشت شروع ہوتی ہے۔ گلی گلی پیکٹ قائم کئے جاتے ہیں۔ سر شام ڈونڈی
کرائی جاتی ہیں۔ مے خانوں کے اگلے دروازوں پر تالے لگوائے جاتے ہیں۔ لوگوں کے اکٹھا گھومنے پھرنے پر امتناع عائد
جاتا ہے احتیاطی اقدام کے طور پر چند گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ عوام کو غیر سماجی عناصر اور افواہوں سے ہوشیار
ہنے کی تاکید کی جاتی ہے کسی بھی قسم کے تشدد کو سختی سے نمٹنے کی وارننگ دی جاتی ہے۔ احتیاطاً کرفیو بھی نافذ کیا جاتا
ہے۔ لیکن جناب ان تمام اقدامات کے باوجود فساد ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی تمام انتظامات کئے گئے اس کے باوجود ہم حیدرآبادی
ہریوں کو یقین تھا کہ وہی ہوگا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔

کئی دن کی تیاریوں اور انتظار کے بعد انتخابات کا دن آگیا علی الصبح شہریوں نے پھر دکانوں پر یلغار کر دی۔ جتنا
دہ وہی اکٹھا کر سکتے تھے کر لیا۔ ترکاریاں بھی جمع کر لیں۔ انڈے الگ سے اکٹھا کر لیئے۔ جسے ووٹ ڈالنے کا شوق
ا صبح ہی یہ کام انجام دے دیا۔ اکثر شہریوں نے ووٹ نہ ڈالنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہماری
یشانی بڑھتی گئی۔ سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کو ایسے دیکھتے جیسے وہ اطلاع دے گا "بھائی جائیے چھپ جائیے کرفیو
گیا ہے"۔ دوپہر تک کہیں سے بھی کوئی اطلاع نہ آئی کہ فساد ہوا۔ گولی چلی اور کرفیو لگ گیا ہم نے سوچا خدایا کیا ہمارے
ہر کو نظر خوب لگ گئی پھر سے کیا روائتی یک جہتی لوٹ آئی۔ گنگا جمنی تہذیب پھر سے زندہ ہو گئی۔!

آدھا دن گزر گیا پھر بھی امن و امان کی خبریں آتی رہیں۔ شہر میں جسے بھی دیکھتے وہ پر امید ایک ہی سوال کرتا نظر
"کیا ہوا" جواب بھی یکساں ملا کچھ بھی نہیں۔ کچھ وقت اور گزرا۔ انتظار تکلیف دہ ہوتا گیا۔ چار بجے پولنگ ختم ہوئی لوگوں
سے پوچھا کیا ہوا؟" جواب ملا کچھ نہیں"! اب ہمیں لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں آنے لگا۔ ہم نے سوچا انتخابات ہوں
ر دن فساد اور کرفیو کے بغیر گزر جائے یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہم نے گلی کے نکڑ پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لینا چاہا۔ سہمے
وئے ہم گلی کے پاس پہنچے۔ تمام دکانیں بند۔ لوگ کرفیو کے انتظار میں خود پر کرفیو مسلط کئے گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔
پولس والے سڑکوں پر لکڑیاں بجاتے گشت کرتے نظر آئے کرفیو کے نفاذ کا صرف ہمیں ہی اندیشہ نہ تھا۔ شہر حیدرآباد
کے بچے بچے کو یقین تھا کہ کرفیو نافذ ہوگا گلی کے نکڑ پر گھر سے باہر دو کمسن بھائی بہن ٹھہرے سڑک کے دونوں جانب
یکھ رہے تھے۔ ایک پولس پارٹی کا گذر ہوا۔ لڑکی نے پولس والوں سے دریافت کیا "اجی باجی۔ کرفیو لگا دیئے"! اس

سرِ شام تمام لوگ ریڈیو کے اطراف علاقائی خبریں سُننے جمع ہوئے۔ خبروں میں غیر ضروری اطلاعات نشر ہوئی تھیں۔ "ووٹ ڈالنے کے لئے چلچلاتی دھوپ میں خواتین و مرد حضرات صبر و سکون کے ساتھ کھڑے تھے۔" "فلاں شخص نے دس بج کر ساڑھے چھبیس منٹ پر اپنے حلقہ کے پولنگ بوتھ پر حق رائے دہی سے استفادہ کیا۔" "ایک نابینا شخص نے ووٹ ڈالا" "ایک قریب المرگ شخص اپنے پوتوں کی مدد سے ووٹ ڈالنے آیا۔" بوتھ پر سب سے پہلے ایک معذور شخص نے ووٹ ڈالا۔ یہ شخص پچھلے پانچ الیکشن سے مسلسل سب سے پہلے ووٹ ڈالتا چلا آرہا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ کہیں بھی کرفیو نافذ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملی حتیٰ کہ کہیں سے بھی گڑ بڑ اور جھگڑنے کی بھی اطلاع نشر نہیں ہوئی۔ خبریں سن کر ہم حیرتوں کے پہاڑ تلے دب گئے۔ ہمیں یقین ہی نہ آیا کہ شہر میں گڑبڑ نہ ہوئی اور کرفیو نافذ نہ ہوا۔ ہم اپنے قریبی دوست سے تبادلۂ خیال کرنے، ان کے گھر جانا چاہا تو بیوی نے بچوں کا اور بچوں نے ماں کا واسطہ دیا۔ ہمیں گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

تقریباً ہر شہری گھر کی چوکھٹ تھامے کرفیو کی راہ دیکھتے رہے۔ اسی انتظار کے دوران ہمارے محلہ میں ایک صاحب آئے۔ تمام لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور سوالات کرنے لگے۔ "کہاں سے آرہے ہیں؟" "شہر کے حالات کیسے ہیں؟" "کیا کرفیو لگ گیا ہے؟" موصوف نے ایسے وقت میں باہر نکلنے کو بہادری تصور کرتے ہوئے سینہ پھلا کر کہا "کچھ بھی نہیں ہوا بالکل سکون ہے۔" اور پھر ایک گھر کے پاس پہنچ کر دستک دی۔ بہت دیر بعد ایک بچے نے کھڑکی سے جواب دیا۔ "ممی کہتی ہیں پپا گھر سے باہر نہیں نکل سکتے اور آپ بھی جلد از جلد اپنے گھر لوٹ جائیں۔

ہم نے سوچا کہیں جھگڑا یا فساد نہ ہوا ہو گا نہ سہی لیکن روایت کے مطابق احتیاطاً کرفیو تو نافذ کیا جانا چاہئے تھا۔ ہم پھر سے ریڈیو اور ٹی وی کے پاس بیٹھ گئے۔ ہر اسٹیشن سے خبریں سُنیں کہ کہیں نہ کہیں سے کرفیو کے نفاذ کی اطلاع نشر ہوگی اکثر ایسا ہوا ہے کہ مقامی اسٹیشن خاموش رہے دور دراز کے اسٹیشن سے بلوہ فساد اور کرفیو کی خبریں نشر ہوئیں۔ لیکن اس مرتبہ تمام اسٹیشن خاموش تھے۔ اب بھی ہمیں امید تھی کہ رات میں کسی بھی وقت کرفیو نافذ ہوگا اور جب صبح ہوگی تو کرفیو میں نرمی ہوگی یہی وجہ تھی صبح ہماری بیوی نے شکایت کی "رات تمام آپ کرفیو، کرفیو، بڑبڑاتے رہے" رات بے چینی سے کروٹ بدلتے گزری۔ صبح صبح نیند لگی۔ اُمید تھی کہ ہماری صبح یقیناً کرفیو میں ہوگی۔ دیر تک سونے کا پلان بنایا تھا کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا "اُٹھیئے! دفتر جانا نہیں ہے؟" ہم نے پوچھا "دفتر کیوں؟ کرفیو نہیں لگا" بیوی نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا "جی نہیں" ہم نے پوچھا "بیگم سچ کہہ رہی ہو" بیوی نے روٹھتے ہوئے جواب دیا "ورنہ کون صبح ہی صبح جھوٹ بکے گا۔" چار و ناچار بستر سے اُٹھ کر اخبار دیکھا۔ اخبار میں بھی انتخابات کا دن پُرامن گزرنے کی خوشخبری تھی۔ کچھ دیر گم سم بیٹھے سوچتے رہے پھر گھڑی کو دیکھ کر دفتر جانے کے لئے چھلانگ لگائی۔

انتخابات کی دوسری صبح ہمیں سہانی نظر آئی۔ ہر شہری خوش نظر آیا۔ بسوں میں وہی رش تھا زندگی کی ہمہ ہمی ایسے ہی تھی شہری کرفیو نافذ نہ ہونے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ خوشی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ایسے بھی اشخاص تھے جو کرفیو نافذ نہ ہونے سے اداس تھے۔ ہمارے ایک شاعر دوست کو افسوس تھا کہ وہ اپنے دیوان پر نظرِ ثانی نہ کر سکے ہمارے لڑکے کو قلق تھا کہ اسے کھیلنے کے لئے چھٹیاں نہ ملیں۔ چار طرف پولس والوں کی تعریف ہونے لگی۔ پولس کے بندوبست کی شان میں قصیدے پڑھے جانے لگے۔ اخباروں میں شکریہ اور مبارکبادی کے پیغامات چھپنے لگے۔ الغرض ہمارے شہر میں انتخابات کے دوران فساد نہ ہونا اور کرفیو نہ لگنا ایک معجزہ تھا!!

لیکن جناب آج کل معجزے رونما نہیں ہوتے انتخابات کے صرف دو دن بعد گلی دس میں فساد ہوا، پولیس نے گولی چلائی اور آناً فاناً کرفیو نافذ کر دیا گیا لوگ دفاتر، کالجوں، اسکولوں سے حیران پریشان واپس گھروں میں قید ہوئے ہم بھی سر پر کفن باندھے دفتر سے گھر پہنچے۔ دروازوں [illegible] اور بیوی نے ہمیں دیکھ کر کہا "شکر ہے! ہمارے شہر میں روایت شکنی کی روایت نہیں پڑی ہے"!

ایک شام - قمرالزماں کے نام

جمہوری ادیبوں کی انجمن کے زیر اہتمام ایک محفلِ مذاکرہ کا انعقاد "ایک شام - قمرالزماں کے نام" کے عنوان سے بمقام ڈرونڈہ اُردو لائبریری جناب پرکاش فکری کی صدارت میں ہوا جس میں شاعر موصوف کی پانچ نظموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔

اس محفلِ مذاکرہ کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کنوینر جمشید قمر نے اس پہلو پر زور دیا کہ زیر بحث نظموں کے حوالے سے براہ راست گفتگو فن پر کی جائے تاکہ ہر زاویئے سے ان نظموں کی تفہیم ممکن ہو۔ جناب پرکاش فکری نے اپنے افتتاحی خطبہ میں طنز و مزاح کی مختلف صورتوں، رولیوں اور حربوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو نثر کی جاندار روایتوں کا ذکر کیا، تاہم انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی موجودہ صورتِ حال سے اپنی نا اطمینانی کا اظہار کیا ظریفانہ شاعری کے معیار میں پستی کا ایک سبب بقول ان کے شاید یہ حقیقت ہے کہ اکبر کے بعد کوئی دوسری شخصیت نہیں ابھری جو بیک وقت سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں رنگوں کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتی ہو۔ دوسری طرف انہوں نے ایک سبب یہ بھی بتایا کہ آج کے مزاحیہ شاعر مشاعرے کے عام مذاق کی خاطر اپنے معیار کو گرانے کے نتیجے دائرہ خود میں انہوں نے مزید کہا کہ اچھا کہلانے کے لئے ایسی شاعری لا محالہ گھسے پٹے اور محفوظ موضوعات کا سہارا لیتی ہے۔ یہ اس دائرے میں قید ہے اور شاید نکلنا بھی نہیں چاہتی ہے کہ اس سے نکلنے میں ٹھوکر کھانے کا اور پُر خطر سچائیوں سے سامنا ہونے کا خطرہ ہے۔ اس افتتاحی خطبے کے بعد قمرالزماں قمر نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں اپنی نظمیں پڑھیں۔ پھر سرور ساجد، عبدالمتین اور ڈاکٹر عبدالقیم ابدالی نے اپنے مقالات پڑھ کر سنائے۔ مقالوں کی روشنی میں شاعر موصوف کی نظموں پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک چلتا رہا۔ مقالہ نگاروں اور شرکائے مباحثہ نے متفقہ طور پر شاعر موصوف کی پانچ نظموں (لیلۃ القدر کی دعائیں، مثنوی عین البیان، فکر گندم، محبوب جبر فقیہ کے آئینے میں، غم گھاٹ) میں فکر گندم اور غم گھاٹ کو اہم اور معنی خیز نظمیں قرار دیا۔ آخر میں شاعر موصوف نے زیر بحث نظموں کی تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے شرکاء مباحثہ کے اٹھائے ہوئے دلچسپ سوالوں کے جواب دیئے۔

محفل مذاکرہ کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنی پر مغز تقریر میں طنز و مزاح کے مختلف مسائل پر بحث کرتے ہوئے عالمی ادب کے حوالے سے ظریفانہ شاعری کے حدود، معیار نیز سمت و رفتار پر سیر حاصل بحث کی اس کے بعد پرکاش فکری نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا کہ اگرچہ شاعر موصوف کی زیر بحث نظمیں شاعرے کے عام مذاق سے قریب اور دائرے میں اسیر ہیں مگر ان کے یہاں دائرے سے باہر نکلنے کا عزم ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ شاعر موصوف کو معلوم ہے کہ مزاح کیسے پیدا کیا جاتا ہے الفاظ کا اندازِ استعمال اور شعری پیکر میں ڈھالنے کا عمل بھی انکی دسترس میں ہے۔ ان میں تجسس ہے، بے چینی ہے، انھیں کھلے آسمانوں اور [illegible] کی تلاش ہے علاوہ ازیں وہ ان لوگوں میں قطعی نہیں ہیں جو چار شعر جوڑ کر خود بخود خود سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بصارت پر اعتماد کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے آگے کی راہ کو متور دیکھ

* ہاشم عظیم آبادی

عالمِ بالا سے غالب کا خط ہاشم عظیم آبادی کے نام

خط جو پرسوں تمہارا آیا ہے — اُس میں مُلّا کا ذکر پایا ہے
اُن کو کیا کیا نہیں بناتے ہو — کیسی کیسی ہنسی اُڑاتے ہو
تم نے لکھا ہے داڑھی مُلّا کی — ہے طفیلِ خضاب کالی سی
تم کو شکوہ ہے اُن کے کھانے کا — دعوتوں میں تمام جانے کا
قورمہ کھا کے ہنہناتے ہیں — جَو کی روٹی سے منہ بناتے ہیں
جاگتے سوتے خواب حوروں کا — دیکھنا کام ہی ہے مُلّا کا
لے کے تسبیح گھر سے چلتے ہیں — عطر داڑھی پہ اپنے ملتے ہیں
ہو مجرّب نہ کتنا ہی کھانا — ہضم کرتے ہیں دم میں مولانا
اُن کی جو بات ہے، نرالی ہے — مضحکہ خیز ہے۔ مثالی ہے
ہفتوں، ہفتوار نہیں نہاتے ہیں — صرف حضرت وضو بناتے ہیں
اور دن رات لڑتے مرتے ہیں — یہ حماقت ضرور کرتے ہیں
چاہتے ہیں یہاں بھی تہمد ہی — گر ہو لُنگی تو چار خانے کی

دیکھو پیچھے پڑو نہ مُلّا کے
ہے حقیقت جو کہتا ہوں تم سے

-:- -:- -:-

* مسز بھارتی (بھوپال)

مزہ انگور کا تیندو میں آیا

وہ میرے ساتھ جب ٹیمپو میں آیا
مزہ انگور کا تیندو میں آیا
صدا آیا کو دی بیگم نے جس دم
تو بولے جھٹ میاں بیٹھو میں آیا
پکا کر جب وہ لائیں ڈالڈا میں
مزہ تربوز کا کدو میں آیا
چراغِ عشق ہاتھ آیا نہ جب تک
اثر کب حُسن کے جادو میں آیا
نہ چھوڑوں گا میں ملّا جی کا بکرا
وہ جس دن بھی مرے قابو میں آیا
وہ شیریں ہاتھ سے گھولے ہے ایسے
نہ پھیکاپن کبھی ستّو میں آیا
وہ پھنس کر رہ گیا اُلّو کا پٹھا
جو ہنس کر سایۂ گیسو میں آیا
پہاڑ اس کو تصور کر لیا ہے
جو تنکا چشمۂ آہو میں آیا
پڑا اُس رات مسٹر دل پہ ڈاکہ
وہ کرتا ڈانس جب پہلو میں آیا

غافل انصاری (سنارپوری)

ضرورتِ رشتہ

فارسی میں ایم۔ اے کی تیاری کرتی ہوئی، اردو سے بی۔ اے ہندی میں بی ٹی سی پاس، تاریخ قدیم و جدید میں مولڈ گولڈ لسٹ، جدید آرٹ کی وضع قطع والی، امور خانداری میں ماہر، چالیس بیالیس برس کی کالی کلوٹی، سانولے رنگ روپ اور بڑے بڑے نخرے والی دوشیزہ کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی آنکھوں میں مقناطیسی کشش، ناک بمانند مغز سنگھاڑا، قد میانہ اور دل و دماغ سیانا ہے۔ آنکھیں شراب ارغوانی کے دو چھلکتے ہوئے جام اور دل میں مچلتی ہوئی شادی کی حسرت تا تمام اس کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اُسے باغبانی اور مرغبانی سے خصوصی شغف ہے۔ اس کے حسن کا چرچا عرش سے فرش تک ہر طرف ہے۔ لڑکی نے اپنے نصف درجن چھوٹے، سال بر سال ٹپکنے والے بھائی بہنوں کو پال پوس کر بڑا کیا ہے اس لئے بچوں کے لالن پالن کا عملی تجربہ رکھتی ہے۔ اسے دن میں کبھی کبھی رتوندھی اور رات کو کبھی کبھی موتیا بند کی شکایت ہو جاتی ہے جس کے تدارک کے لئے وہ بجلی کا سرمہ ممیرہ معتدل جواہر والا ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ گرمیوں میں نظر کا اور جاڑوں میں دھوپ کا چشمہ لگاتے ہوئے صرف تیس برس گزرے ہیں۔ غریبی میں گزر بسر کرکے بھی اس کے ٹھاٹھ امیری کے رہے ہیں۔ اس کا دن تمام روزہ نماز میں، رات کا نصف اول سینما اور نصف آخر سیر سپاٹے میں گزرتا ہے۔ چوں کہ گھر میں غربت و افلاس کا تلخ تجربہ کر چکی ہے اس لئے شوہر کے گھر اسے دیر لگنے سے گھبراتی ہے۔ لڑکی کی والدہ اردو ہندی کے اخبار و رسائل کی ایڈیٹر اعزازی، والد آل انڈیائی مشاعروں کے صدر اور نمازی، بھائی ملک کے یوتھ فورم کے سکریٹری اور بہن دنیاداری کے جھمیلوں سے بے نیاز و بری ہے۔

لڑکی مرغی کے انڈوں کی تجارت میں ماہر ہے۔ موسم کے اعتبار سے ادلتے بدلتے رہنے والے بھاؤ کے لحاظ سے اس کا عمدہ تاجر ہونا جگ ظاہر ہے۔ جتنی دیر گھر میں رہتی ہے، دوپٹہ سر سے نیچے نہیں سرکتا۔ البتہ باہر نکلنے پر دوپٹہ کی ضرورت اسے نہیں رہتی۔ غسل خانے میں مجاز ردولوی کے اشعار گنگناتی ہے۔ رات کو مرحوم کا کلام پڑھ کر تسکین پاتی ہے۔ دریافت کرنے پر لڑکی کی عادت و خصلت، قابلیت اور لیاقت کی مزید جزئیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ چسپاں لفافہ یا جوابی پوسٹ کارڈ آنا شرط ہے۔

لڑکے کا برسرروزگار ہونا پہلی شرط ہے۔ ہائی اسکول فیل سے زیادہ تعلیم یافتہ حضرات زحمت کرکے شرمندہ نہ ہوں۔ تعلیم و

حیثیت کے مقابلہ میں لڑکے کے بینک بیلنس کو ترجیح دی جائے گی۔ جہیز کی فرسودہ لعنت پر عمل درآمد قانونی اور اخلاقی جرم تصوّر کیا جائے گا۔ "دلہن ہی جہیز ہے" یہ لڑکی والوں کا ایمان ہے۔ لڑکا ٹیچر ہو خواہ لیکچرر، شادی تک اسے باقاعدہ ایک عدد داڑھی کا مالک بن جانا لازمی ہے خواہ ٹھڈی پر بال گنے چنے ہی کیوں نہ اُگے یا اُگے ہوں۔ بعد شادی خصوصی درخواست پر بچوں کو شادی کی قید سے مستثنیٰ کیے جا سکتے ہیں۔ علاوہ رقم مہر بیس ہزار روپے سکۂ رائج الوقت، جس کے نصف مبلغ دس ہزار روپے ہوتے ہیں، پانچ برس کا ایڈوانس نان و نفقہ اور کم از کم غیر ممالک سے امپورٹ کئے ہوئے اطلس و کمخواب کے دس جوڑے کپڑے، چھبیس کیرٹ والے خالص سونے کے ایک درجن زیورات لڑکی کے گھر شادی سے تین ماہ قبل پہنچا ضروری ہے، تاکہ اس کی سکھی سہیلیاں لڑکی کی جیتی جگمگاتی قسمت پر رشک کر سکیں۔

لڑکی والوں کے یہاں رسم منگنی اور دھن جھوا نہیں ہوگی۔ صرف عین شادی کے دن رسم نکاح و رسم چائے پانی ادا کرا کر تمام باراتیوں کو، چاہے کڑکڑاتا جاڑا ہو یا تپتی دھوپ، شام ہوتے ہوتے آر۔ آئی۔ او کر دیا جائے گا۔ چوں کہ بارات کا قیام مائیکے اور سسرال کے درمیان کہیں بس اسٹاپ یا ریلوے اسٹیشن پر کرنا ہوگا اس لئے بارات کے ساتھ کم از کم تین وقت کے کھانے اور ناشتے کا انتظام ہونا ضروری ہے۔ دولھا کے والد یا سرپرست کو لڑکے کے عادات و اطوار اور اچھے چال چلن کا سرٹیفکیٹ قاضی کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ لڑکی کے والدین اور سرپرست کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر شرائط مندرجہ بالا کی خلاف ورزی پائیں تو بارات کا تمام سامان روک کر بارات کو بے دخل کر دیں اور پھر "ضرورتِ رشتہ" کا اشتہار دوبارہ ان اخبار و رسائل میں شائع کرائیں، جو اجرت اشاعت لینے کی بجائے اخبار کے سرکولیشن کو اہمیت دیتے ہیں۔

لڑکی کو مہر کی ادائیگی نکاح سے قبل اور بارات کے بعد صرف دو مرتبہ کرنی ہوگی چوں کہ بچپن سے لڑکی نے اپنے ماں کی خدمت کرتی رہی ہے اس لئے بقیہ زندگی بھی انھیں کی خدمت کرتی رہے گی۔ دولہا میاں اگر سروس پیشہ ہوں تو انھیں پوری تنخواہ ماہ بہ ماہ پوری مستعدی سے بیوی کے ہاتھوں پر رکھنا ہوگی۔ اگر سروس کی مصروفیات آمد میں الجھن پیدا کرتی ہیں اور وہ بہ نفس نفیس حاضری سے قاصر ہوں تو بیمہ، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ سے بھی رقم بھیجی جا سکتی ہے۔ مالک کارخانہ اور کاشت و مکان ہونے کی صورت میں جائیداد منقولہ و غیر منقولہ لڑکی کے نام شادی سے دس روز پہلے لکھ دینا ہوگا تاکہ آئندہ لڑکے کی طرف سے خدشات عدم ادائیگی حقوق زوجیت پیدا ہونے کا امکان نہ رہے!!

المشتہر
معرفت صندوق نمبر ۸۰۸
روز نامہ قومی دمساز لکھنؤ ۔ ۲۴

مضامین صاف اور صفحہ کے ایک ہی جانب لکھے جائیں ـــ !

(ادارہ)

بیسد براری خاں (اکولہ)

میرے عہد میں

میرے عہد میں نوجوانوں میں عام طور پر دو بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ اپنے آپ کو برتر سمجھنا اور اپنے ہر دوست کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا کہ وہ اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے۔ اکثر نوجوان آدھا دن اخبارات، رسائل پڑھنے اور ریڈیو سننے میں گزارتے ـــــ بقیہ آدھا دن لوگوں کو سناتے پھرتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور کیا سنا ہے۔ اُن کے اخلاق، کردار اور زبان کی تلواروں نے اُن کے بزرگوں کے دلوں میں جینے کی ہوس باقی نہیں رکھی تھی ـــ ایسے نوجوان مذہبی بنتے تو باقی دنیا کو دہریا کہنے کے لئے۔ علمی اور سیاسی میدانوں میں اُترتے تو اس طرح جیسے اُن سے بڑا کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جاسوسی ادب کا بیڑہ غرق کرنے کچھ نو مشقِ سخن بھی اس میدان میں کود پڑے تھے لیکن دہلی کے ایچ۔ اقبالوں سے زیادہ گھٹیا جاسوسی ادب پیش کرنے میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا تھا۔

کچھ نوجوان نوکریوں کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر بیرونی ممالک کی راہ لیتے تھے۔ کئی سالوں بعد اپنے وطن لوٹتے اور پرانے دوستوں کے ساتھ بن ٹھن کے سڑکوں پر چہل قدمی کرنے نکلتے تو کہتے تھے "یار تمہارے انڈیا میں گرمی بہت ہوتا ہے"۔ اکثر اپنی تمام تر کمائی کو وطن لوٹنے پر لباس، ٹیپ ریکارڈ، گھڑی، چین، اسکوٹر اور انگشتریوں کی شکل میں ساتھ لئے لئے پھرتے تھے۔ کچھ اُونچے ظرف والے مکان دوکان کی بھی فکر کر لیتے تھے۔ ان میں وہ نوجوان بہت ترقی کرتے جو احسان پروف ہوتے اور ہمیشہ نئے نئے محسنوں کو کھوجتے رہتے تھے۔

میرے عہد میں عورتوں کی سینما بینی کو اس وقت مکمل فروغ حاصل ہوا جب مردوں نے اس پہ جائز اور ناجائز پابندی عائد کی۔ اس وقت امیتابھ بچن ملک کا سب سے مشہور اداکار تھا جس کو ہر مرد، عورت، بوڑھا، بچہ پسند کرتا تھا۔ اس پریشانی میں اس اداکار کو چند عجیب و غریب بیماریاں ہوگئی تھیں کہ وہ کیوں اتنا پسند کیا جاتا ہے؟ وہ الہ آباد سے لوک سبھا کا الیکشن جیت گیا بڑا اچھا ایکٹر تھا! افسوس!! ـــہ

میرے عہد میں فلمی موسیقی کو خاصا عروج حاصل تھا. نوشاد کو موسیقار اعظم کا خطاب دے کر اتنے اونچے طاق پر بٹھا دیا گیا تھا کہ وہ کسی کو نظر ہی نہیں آتا تھا. مختلف فلمی فنکار راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتے۔ دن نکلتا تو پھر زمیں پر ہوتے. بیشتر فلموں میں موسیقار کے طور پر آر. ڈی برمن اور گیت کار کے طور پر آنند بخشی کا نام لکھا ہوتا تھا. ساحر لدھیا نہ جانے کونسی بات پر ناراض ہو کر دنیا سے ہی منہ موڑ کر چلا گیا تھا. دلیپ کمار واحد اداکار تھا جس کے متعلق تمام فلمی پرچے لکھتے کہ اس کا عہد ختم ہو گیا ہے. لیکن کم بخت وہ عہد کبھی آتا ہی نہیں تھا جس میں دلیپ کمار ختم ہو گیا ہو.

ھزاروں سال پرانے دستور کے مطابق سماج پر کم ظرف مالدار لوگوں کا غلبہ تھا. غریب اور با اخلاق لوگوں کی نہیں کی جاتی تھی. ان کا ذکر بھی اچھے لفظوں میں کیا جاتا ــ لیکن زندہ رہنے کے لئے ایک دن ان کو بھی مر جانا پڑتا تھا کہ مالدار ایسے لوگوں کی میتوں میں ضرور جاتے.

میرے عہد میں بھی لوگ کہتے تھے کہ زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں جبکہ ساری قدریں ایک ہی قدر 'معاشی' میں ضم ہو گئی تھیں. جس آدمی کی معاشیات خراب ہوتی تھی اس کا خانہ خراب تھا. جب سے ہندوستان کی ایک اہم شخصیت نے رشوت کو 'global phenomenon' کہا تھا ملک کے چھوٹے بڑے رشوت خوروں کو اس دنیا میں ہی نجات مل گئی تھی سقراط کے بعد پھر کوئی سقراط نہیں پیدا ہوا تھا.

رشوت خوروں، غاصبوں، ظالموں اور منسٹروں پر تنقید کرنے والے صرف اسی لئے چلاتے تھے کہ یہ مواقع انہیں نصیب نہیں تھے. سارے 'حق گو' وہی سچ کہتے تھے جس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچے اور ان کا کوئی نقصان نہ ہو. اِکّا دُکّا سر پھرے اپنے نقصان کی پرواہ کئے بغیر اگر سچ کہتے بھی تھے (کچھ لوگ تو شارع عام پر لاؤڈ اسپیکر میں چیخ کر کہتے تھے) تو ان لوگوں کے (یعنی رشوت خوروں، غاصبوں، ظالموں اور منسٹروں کے) کان پر جوں تک بھی نہیں رینگتی یہ سب کچھ ہونے کے لئے آدمی کا 'بے غیرت' ہونا ضروری تھا. ایسے لوگ سب کچھ بعد میں ہوتے تھے بے شرم) بے غیرت پہلے ہوتے تھے!

لوگ امیر بنتے تو امیر ہی بنتے چلے جاتے. غریبوں کو مزید غریب بنانے کے لئے حکومت نے بہت ساری سہولتیں مہیا کر دی تھیں. لاٹری خود ریاستی حکومتیں چلا رہی تھیں. سٹہ بازار کی حفاظت پولیس کرتی. شراب ارزاں حالانکہ لائسنس کے لئے لاکھوں خرچ ہو جاتے تھے.

میرے عہد میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ الکشن صرف پیسے والے ہی لڑ سکتے تھے. ورنہ حکومت کے ایوان نہ کتنے غریب، شریف اور اسی قسم کے مخلص و فرض شناس قسم کے نمائندوں سے بھر جاتے. ہم فرقہ وارانہ فسادات کے لئے ترس جاتے تھے اور ملک میں سوائے مساوات اور بھائی چارگی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا. وہ تو بھلا ہو مال سیاست والوں کا جن کے دم سے ایسا کبھی کچھ نہیں ہوتا تھا.

پرویز باغی (شارجہ)

حاجی مولا بخش

حاجی مولا بخش ہمارے گاؤں کی بہت مشہور شخصیت ہے۔ بھرا بھرا جسم عمر ساٹھ سال لمبی داڑھی سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ آنکھوں پر عینک۔ کچھ دن ڈاکٹر ذاکر حسین ٹائپ کی داڑھی رکھی تھی تاکہ ذاکر حسین نظر آئیں لیکن وہ اس داڑھی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بجائے اسمگلر نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ پوری داڑھی رکھ لی کبھو لنگی اور کرتا پہنتے ہیں اور کبھی بشرٹ اور پتلون سر پہ سفید ٹوپی رہتی ہے اور منہ میں پان . . . .

حاجی مولا بخش بحرین میں ملازمت کرتے تھے۔ وہیں سے کمپنی کے خرچ پر مکہ شریف گئے اور حج کر آئے۔ اُن کے بھائی بھتیجے بیٹے دوست احباب سب اُنھیں حاجی صاحب ہی کہتے ہیں۔ اب نہ اُنھیں کوئی ابا کہتا ہے نہ چچا نہ ماموں۔ اگر کوئی انھیں حاجی صاحب نہیں کہتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ گاؤں والے اُن کے سامنے تو اُنھیں حاجی صاحب کہتے ہیں لیکن پیٹھ پیچھے کوئی حاجی نہیں کہتا۔ حاجی مولا بخش تین باتوں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ پان کھانے کے لئے اور جھوٹ بولنے کے لئے اور بات بات میں سنہ کا حوالہ دینے کے لئے۔ جب بھی وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو شروعات اس طرح کرتے ہیں

جناب صدر بھائیو اور بہنو!

میں سنہ ۱۹۶۰ء میں بحرین سے آیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں گاؤں کا مکھیا بنا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں فلاں کام کیا۔ اس سے پہلے سنہ ۱۹۳۱ء میں جب میں پندرہ سال کا تھا فلاں کھیتی نہائی تھی . . . لوگ اُن کی تاریخ دانی سے اتنے تنگ آ چکے ہیں کہ جب یہ تقریر کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو ہال میں منتظمین اور حاجی مولا بخش کے علاوہ کوئی نہیں رہتا . . . اسی لئے ہر جلسہ میں ان کو تقریر کرنے کیلئے آخری نمبر دیا جاتا ہے۔ جب یہ کسی آفس میں جاتے ہیں تو اپنی بات شروع کرنے سے پہلے ہی افسران سے کہتا ہے کہ کام کی بات ہم کو بتاؤ اور سنہ گھر والوں کو . . . . لیکن یہ اتنے ڈھیٹ ہیں کہ جب بھی موقع ملے درمیان میں سنہ کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ جھوٹ بولنے میں گاؤں میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ اگر کوئی ٹوکے کہ کل آپ نے

فلاں بات کہی تھی تو فوراً انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں خدا کی قسم میں نے ایسی بات نہیں کہی تھی۔ میں ابھی ابھی وضو کر کے آیا ہوں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ . . . اور ٹوکنے والا اُن کے وضو کا احترام کرتے ہوئے اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک تجویز پر دوسرے لوگوں کے ساتھ حاجی مولا بخش نے بھی دستخط کر دیئے۔ دو چار ماہ بعد کسی نے پوچھا تو صاف انکار کر دیا اور کہا کہ خدا کی قسم ایسی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ میں ابھی ابھی وضو کر کے آیا ہوں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ . . . جب اُس شخص نے اُن کے دستخط والا کاغذ اُن کے سامنے رکھ دیا تو اِس طرح چاروں طرف دیکھنے لگے جیسے ڈوب مرنے کے لیے چُلّو بھر پانی کی تلاش ہو!

ایک بار اُن کے جھوٹ کا پول عدالت میں کھلا۔ ہوا یوں کہ اُنہوں نے گاؤں کے ایک شخص پر مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ . . . ایک پیشی کو حاجی مولا بخش عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔ اور درخواست دی کہ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے حاضر عدالت نہیں ہو سکتا۔ وکیل مخالف نے اگلی پیشی پر حاجی مولا بخش سے پوچھا:

"فلاں تاریخ کو آپ بیمار ہونے کی وجہ سے عدالت میں حاضر نہیں ہو سکے؟"

"جی ہاں!"

"اس تاریخ کو آپ نے گاؤں میں جمعہ کی نماز میں شرکت کی تھی؟"

"جی ہاں"۔

"اُس تاریخ کو آپ نے گاؤں کی ایک میٹنگ میں شرکت کی تھی؟"

"جی ہاں"۔

"اُسی دن آپ گاؤں میں ایک شادی کی دعوت میں شریک تھے؟"

"جی ہاں"۔

حاجی مولا بخش نے روانی میں جی ہاں جی ہاں تو کہہ دیا لیکن اچانک انہیں احساس ہوا کہ اُنہوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار دی ہے۔ وکیل مخالف نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"می لارڈ" مدعی نے فلاں تاریخ کو اپنی بیماری کا عذر بتایا تھا۔ لیکن اُسی روز جمعہ کی نماز گاؤں کی میٹنگ اور شادی کی دعوت میں شرکت کی تھی۔ . . . اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاجی مولا بخش نے جھوٹی درخواست دی تھی۔ لہٰذا جو شخص اِس قدر جھوٹ بول سکتا ہے۔ وہ کسی کو پریشان کرنے کے لیے جھوٹا مقدمہ بھی دائر کر سکتا ہے۔ لہٰذا اِس مقدمے کو خارج کر دیا جائے۔ . . . جج نے وکیل مخالف کی دلیل کو مانتے ہوئے مقدمے کو خارج کر دیا۔

حاجی مولا بخش پھر بھی نہ لڑتے تو لوگوں نے اُن کو گاؤں کا مکھیا بنا دیا۔ اور پھر حاجی مولا بخش نے عقل کا ایسا چکر چلایا کہ گاؤں کے تمام عہدے اُن ہی کے قبضے میں آگئے اور اب یہ حالت ہے کہ گاؤں کے لوگ انہیں ہٹانا چاہتے ہیں مگر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اور وہ لوگ ــــ جنہوں نے حاجی مولا بخش کو سنگھاسن پر بٹھایا تھا اپنی اپنی قسمت کا

مام کر رہے ہیں۔ حاجی مولا بخش خود کو ہر فن مولا سمجھتے ہیں۔ لیکن جو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی بھی فن کے مولا نہیں ہیں گاؤں کے بھولے بھالے لوگ اِن کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر انہیں کے گن گانے لگتے ہیں۔ وہ خود کو شاعر، گلوکار، حکیم، انجینئر لیڈر نجانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ . . . حاجی مولا بخش بحرین میں ایک بلڈنگ — کنٹراکٹر کے یہاں لیبر تھے لیکن لوگوں کہتے پھرتے ہیں کہ میں وہاں انجینئر تھا بیسیوں بلڈنگیں بنائی تھیں۔

الیکشن کے زمانے میں اِن کی لیڈری عروج پہ آجاتی ہے۔ جگہ جگہ تقریریں کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تقریروں میں اُمیدوار کی تعریف کم اور اپنی تعریف زیادہ ہوتی ہے . . . . اور جب کوئی امیدوار ہار دل شانے چت ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس نے میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا ورنہ اسس کی جیت یقینی تھی۔

حاجی مولا بخش خود کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں لیکن ان کا بھائی ان سے زیادہ عقل مند نکلا۔ اُس نے جلسے جلوسوں کے بہانے ان کی ساری دولت ہتھیالی اور اُن کو پتہ بھی نہ چلا . . . حاجی مولا بخش آج کنگال ہوچکے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں اُن کے بھائی کی طرح کوئی اُن سے پیار نہیں کرتا۔

حاجی مولا بخش ہمارے گاؤں کی بہت مشہور شخصیت ہیں۔ آپ جب کبھی ہمارے گاؤں آئیں تو اُن سے ضرور ملئے۔ لیکن خدا کے لئے اُنہیں حاجی ہی کہیئے۔ ورنہ آپ گاؤں سے واپس نہ جاسکیں گے اس لئے کہ گاؤں کا پورا انتظام اُن کے حالی موالیوں کے ہاتھوں میں ہے!

وجاہت علی سندیلوی

نام کی برکت

ہمارے دوست اور ہم سبق فضلو بھائی انگریزی لکھنے اور بولنے میں اب بھی وہی غلطیاں کرتے ہیں جو وہ ہائی اسکول میں کیا کرتے تھے البتہ اب انگریزی میں ایم اے کر لینے کے بعد وہ اپنی ڈگری کی لاج رکھنے کی خاطر اکثر انگریزی ادبا کے مشاہیر کے قول اور لطیفے سناتے رہتے ہیں۔ ہمارے مرزا صاحب کو جو سیکڑوں مشاعرے سر کئے ہوئے ایک گرگ باراں دیدہ قسم کے شاعر ہیں، اُن کی یہ مغرب زدگی پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی۔

ایک روز جب مرزا صاحب، ہم دوستوں کو اپنا یہ کارنامہ سُنا رہے تھے کہ انہوں نے اپنے ملازم خیراتی کے لڑکے کا نام نادر حسین رکھ دیا ہے تو فضلو بھائی اپنے پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔ "آپ نے اس کا نام شبراتی کیوں نہیں رکھا؟ شکسپیئر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب، گلاب ہی رہتا ہے خواہ اُس کو کسی بھی نام سے پکارا جائے"

مرزا صاحب قریب قریب اپنا سر پیٹتے ہوئے چیخے۔ "غلط! بالکل غلط! شکسپیئر کیا جانے سونٹھ کا مزہ؟ یہ ڈارون کے ہم قوم جو بندر اور آدمی میں امتیاز نہیں کر سکتے، نام کی اہمیت کیا سمجھیں؟ میں تو کہتا ہوں جو کچھ ہے وہ نام ہی تو ہے نام سے قسمت کے ستاروں کو بھی جنبش ہوتی ہے۔"

اور اس کے بعد مرزا صاحب نے نام کی برکت پر ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ اُن کا فرمانا تھا کہ نام کا بہت بڑا اثر عادات و اطوار بلکہ کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اُنہیں کی تحریک پر خرمن علی نے اپنا تخلص برق رکھ لیا تھا اور خوب چمکے تھے اور جب سے محمد سالم نے اپنا تخلص شکست رکھا تھا انہیں کسی مشاعرے میں ہوٹنگ کی وجہ سے پوری غزل پڑھنا نصیب نہ ہوا۔ میر تقی میر اپنے تخلص ہی کی بنا پر بزم سخن کے میر مجلس بنائے گئے۔ محمد ابراہیم ذوق کو صرف شعر و سخن کا ذوق رہا۔ لیکن اسد اللہ خاں اقلیم سخن پر غلبہ کر کے سچ مچ کے غالب بن گئے۔ اور پھر دور کیوں جائیے اقبال کی اقبال مندی، شبیر حسن خاں کا اور فیض احمد کا فیض کس کور چشم نے نہیں دیکھا؟"

مرزا صاحب نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب نام کی کرامت دیکھئے۔ چھیو میرے محلہ میں رہتا۔ جب

تک چھبو نام تھا تیلی کا تیلی رہا پھر اُس نے اپنا نام چھبیت رکھا۔ بازار میں تیل کی دکان کھل گئی ۔ اپنا نام چھبیت رائے کر دیا تو ایک سے رفتہ رفتہ چار دُکانیں ہوگئیں ۔ پھر سیٹھ چھبیت رائے بنا تو تیل کا کارخانہ کھل گیا۔ ملاوٹ کے جرم میں کیا، رشوت نہ دینے کے جرم میں آج کل جیل میں ہے تو اُس کا نام گھٹ کر پھر چھبو ہوگیا ہے ——————

—————— جھبّو کو دیکھیے ! دن بھر قینچی لیے مکھیاں مارا کرتا ۔ شاید ہی کوئی بھولا بھٹکا گاہک کرتا، پائجامہ یا بنڈی سلانے اُس کی دکان پر پہونچتا ہو لیکن جب سے اُس نے اپنی دکان پر " ڈریسیز فرام ہیون" کا چمکدار سائن بورڈ لگایا ہے اُس کی دکان پر گاہکوں کا ایسا تانتا بندھ گیا ہے بلکہ کیو، لگنے لگی ہے جیسے درزی کی دکان نہ ہو کوئی سنیما گھر ہو۔ میں نے بڑے بڑے کج کلاہوں کو اُس کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا ہے کہ ذرا سینہ چوڑا اور کمر پتلی کر دیجیے اور وہ اس غرّے سے جیسے کپڑے نہیں انسان بناتا ہو، قینچی بجا بجا کر یہی کہتا ہے " ہر کام پبلسٹی سے ہوتا ہے۔ قینچی چل گئی تو بس چل گئی "

مرزا صاحب ذرا دم لینے کے لیے رُکے اور پھر کسی خودکار مشین کی طرح خود ہی رواں ہوگئے ۔ " بندہ پرور ! آج کل کام کون دیکھتا ہے ؟ جو کچھ ہے بس نام ہی نام ہے ۔ ہماری زندگی کام کم اور نام زیادہ کے اصول پر کاربند ہے ۔ شیشی کے اندر کیا ہے ؟ اس کو جاننے کیلئے کس مسخرے کے پاس وقت ہے ؟ شیشی کیسی ہے اور اس پر نام کیا لکھا ہے اس کے لئے سب کے پاس آنکھیں ہیں ۔ ادب تک کے میدان میں دیکھیے ۔ ہر جگہ نام کا سکّہ چل رہا ہے ۔ ہمارے شاعر اور ادیب جتنی توجہ اور وقت کتاب لکھنے پر نہیں صرف کرتے اُس سے زیادہ اس کے نام کی تلاش میں اپنا سر کھپاتے ہیں ۔ کتاب میں چاہے گوڈر بھرا ہو لیکن نام بہت شاندار ہونا چاہیئے ۔ سنہرے حرفوں میں لکھا ہونا چاہیئے ! —————— اور پھر چاہے اُس کی کتابت کی غلطیاں ٹھیک کرنے کیلئے لیاقت اور وقت نہ ہو لیکن اُس کی رسم اجراء کیلئے خوب پبلسٹی ہونا چاہیئے ۔ اور پھر رسم اجراء ہو تو کسی بڑے نام کے ہاتھوں ! کاش کہ غیر ضروری کتابوں کو دفن کرنے کی بھی کوئی رسم ایجاد ہو تو ہم جیسے چھوٹے نام والوں کا بھی کوئی مصرف نکل آئے ۔

فضلو بھائی اُٹھ کر چلے گئے تو مرزا صاحب نے اُن پر بھی چھینٹا کسا ۔ " اب اسی فاضل کو دیکھیے، اچھا خاصا پڑھا لکھا ہے لیکن اپنی عرفیت فضلو کی وجہ سے غلط سلط انگریزی لکھتا ہے اور بلا ضرورت، بالکل فضول جانسن ملٹن اور شکسپیئر وغیرہ کا وظیفہ پڑھا کرتا ہے ۔ شکسپیئر نے کہا کہ نام سے کچھ نہیں ہوتا ۔ یہ اس حد تک ضرور صحیح کہا جا سکتا ہے کہ کسی چیز یا انسان کی خاصیت اور جبلت میں نام سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن یہ اس حیثیت سے بالکل غلط ہے کہ کسی دوسرے کی نظر میں نام کی تبدیلی کی وجہ سے وقعت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اب یہی دیکھیے کہ جب تک میرا تخلص مسکین تھا، مشاعروں میں پہلے ہی پڑھوا کر ٹرخا دیا جاتا لیکن جب سے میں نے اپنا تخلص بدل کر عظیم کر دیا ہے، ہمیشہ آخر میں پڑھوایا جاتا ہوں اور کسی بھی اناؤنسر یا ناظم مشاعرہ کو اُس وقت تک کھانا ہی نہیں ہضم ہوتا جب تک وہ میرے تعارف میں یہ مصرع نہ پڑھ دے ۔ ع نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے ، اور اس اطلاع کے بعد ہوٹنگ کرنے والے بدمعاش بھی ذرا دائرۂ اعتدال میں رہتے ہیں اور میرے کلام سناتے وقت کم از کم بکرے یا مینڈھے کی آوازیں

نہیں بلند کرتے ۔"

اور پھر مرزا صاحب تام بڑا درشن چھوٹے' کے موضوع پر آگئے ۔ "بھئی میرا ایک قلمی دوست تھا جو 'کاشانۂ رفعت' سے مجھے خط لکھا کرتا ۔ میں اس کے کاشانے سے بہت مرعوب بلکہ مغلوب تھا اور اپنی نشست گاہ کو اُس کے مقابلے میں کلبۂ احزاں سمجھا کرتا ۔ اُس نے ایک مرتبہ مجھے لکھا کہ "میں اپنی سب سے بالائی منزل سے جب چاند، تاروں اور کہکشاں کا نظارہ کرتا ہوں تو اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر اُن کو پکڑ لوں ۔" میں نے سراپا رشک ہو کر جواب دیا ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے

زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

—— اور ایک بار میرا بریلی جانا ہوا اور میں نکلا 'کاشانۂ رفعت' کی تلاش میں ۔ ایک گلی در گلی میں ایک چھوٹا سا پستہ قد آدھا کچا آدھا پکا لیکن پورا بوسیدہ مکان تھا ۔ اور اُس کے ایک کواڑ کے سینے پر داغِ دال کی طرح ایک چھوٹی سی ٹین کی تختی لگی ہوئی تھی 'کاشانۂ رفعت' ۔ میں اپنا سر پیٹتا ہوا بغیر کنڈی کھٹکھٹائے لوٹ آیا ۔"

"اب بریلی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو میرے اوپر اس سلسلے میں جو ایک اور سانحہ گذرا ہے اُسے بھی سنتے چلیئے ۔"

مرزا صاحب کچھ تازہ دم ہو کر پھر گویا ہوئے "بریلی، بہت عرصہ گذرا میں ایک مشاعرے میں گیا ہوا تھا ۔ ایک شاعرہ صاحبہ اور اُن کے شوہر، مجھے مشاعرے کے پنڈال سے اپنے گھر لے گئے اور کئی گھنٹوں تک نہ صرف میرا کلام سُنا بلکہ میری بڑی خاطر تواضع بھی کی ۔ پھر یہ شاعرہ میری شاگرد ہو گئیں اور ذریعۂ ڈاک اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بھیجنے لگیں ۔ ہر خط میں ان کے شوہر کے ساتھ برخوردار 'جگنو' کا بھی ذکرِ خیر ہوتا، اور میں جواب میں دونوں کو دعائیں لکھ دیا کرتا، بلکہ جب مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ 'جگنو' مجھے یاد کرتا ہے تو میں نے لکھا "نورِ چشم برخوردار 'جگنو' کو نہ صرف دعائیں بلکہ میری جانب سے پیار بھی کر لینا، اُس کو دیکھنے کا بہت جی چاہتا ہے" —— جب اُن محترمہ نے لکھا کہ وہ صرف میری زیارت کرانے 'جگنو' کو لکھنؤ لا رہی ہیں تو میں سراپا انتظار بن کر چارباغ اسٹیشن پہونچ گیا —— اور پھر جب نورِ چشم برخوردار 'جگنو' پورے دو من کے خوفناک السیشین کی شکل میں مجھ سے معانقہ کرنے کیلئے مجھ پر جھپٹے —— پھر یہ نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گذری ۔ میں تو ایک ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا تھا ۔ البتہ یہ پوچھیے کہ پورے چارباغ اسٹیشن پر کیا گذری ؏

واں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

غزل

جگر نظام آبادی

اُس نے محبت سے گھیرا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
پیٹ میں اُس کے کوئی دولہا ہو ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
یا تو پڑوسی گانا سُننے گھر پہ میرے آیا ہو گا
یا پھر کوئی اور گدھا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
ایسا بھی تو ہو سکتا ہے وہ دادا دادُوں کا دادا ہو
یا بیچارا اک نیتا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
وہ جو سڑک پر کود رہا ہے اس کو دِوانہ کیوں کہتے ہو
شاید ڈسکو ناچ رہا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
بھارت میں یہ عام رہا ہے ہندو مُسلم کا جھگڑا ہے
یا یہ سیاسی اک حربہ ہو ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
کیا یہ ضروری ہے جو رد کے ہاتھ میں چپل ہو، مسلّی ہو
یا رد کرکٹ کا بلّا ہو ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
ہوسکتا ہے اس ہنڈی میں میرے مٹّے کی اماں ہو
یا پھر چاول کا تھیلا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
راتوں کو وہ جاگنے والا اسرا چوکیدار ہے شاید
یا پھر اُلّو کا پٹھّا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کمرے میں کچھ چکر ہو گا
شاید جگر ہی تنہا ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

○

غزل

شائستہ (نظام آباد)

مولانا دقت ...

شاعرو پھینک دو دیوان خُدا خیر کرے
شعر کہنے لگے ناداں خُدا خیر کرے
بھیگی بلّی کی طرح بیٹھے ہیں بیوی کے قریب
شہر کے نامی پہلوان خُدا خیر کرے
ہوگیا تیرِ نظر سے میرا سینہ چھلنی
اب ہے ہر زخم نمکدان خُدا خیر کرے
جب سے لے آئی ہیں بیوی میرے گھر میں ٹی وی
ہر پڑوسی ہے مہربان خُدا خیر کرے
ان کے آنے کی خبر جب سے سُنی ہے دِقت
جیتے جی ہو گئے بے جان خُدا خیر کرے

○

کوئی چوری کی غزل ہو تو مزہ آتا ہے
اسمیں کچھ ردّ و بدل ہو تو مزہ آتا ہے

اپنے ہاتھوں سے محل اپنا بنا دو یارو
اپنے ہاتھوں میں جو بل ہو تو مزہ آتا ہے

لوگ جب لڑتے ہیں پانی کے لئے نل کے قریب
بند ہوتا ہوا نل ہو تو مزہ آتا ہے

خُد بہ خُد شعر نکلتے ہیں زباں سے میرے
کھوپڑی میں جو خلل ہو تو مزہ آتا ہے

فالتو ٹیپ ہے یہ اور وہ کیسٹ بے کار
[illegible]

خُرافاتؓ (مُراسلے)

عزیزی مصطفیٰ کمال صاحب! خوش رہیئے!
عالمی مزاح کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ دوسرے تمام منتظمین کو بھی میری جانب سے مبارکباد کہہ دیجئے۔ میں نے دو روز ٹی۔ وی پر مختصر روئداد دیکھی۔ اخبارات میں بھی تھوڑی تھوڑی خبریں آتی رہیں۔ لوک سبھا کے اسپیکر نے دو چار جملوں میں طنز و مزاح کی جو تعریف کی وہ بڑے بڑے مضامین پر بھاری ہے جتنی خوبی اور گہرائی سے اُنہوں نے اس صنفِ ادب کی روح کو سمجھا ہے، وہ اُنہی کا حصّہ ہے — رضا نقوی واہی، پٹنہ

برادرم محبی مصطفیٰ کمال صاحب۔ خلوص و نیاز
مارچ کا شگوفہ ملا۔ خوب ہے۔ آپ ہر مرتبہ اس انداز سے نیا شگوفہ کھلاتے ہیں کہ داد دینے والے تھک گئے لیکن آپ نہیں تھکتے۔ اور خدا کرے کہ نہ تھکیں۔ "ہزار بادہ ناچکیدہ در رگ تاک است"۔ آپ کی مسلسل تعریف کرنا اب چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتا ہے۔ بس یہی دُعا ہے کہ آپ زندہ اور خوش رہیں اور اسی طرح قہقہے اور مسکراہٹیں بکھیرتے رہیں۔ عالمی جشن مزاح کی کامیابی پر دلی مبارکباد۔ اس جشن میں شریک نہ ہونے کی آپ سے زیادہ خود مجھے اپنے سے شرمندگی ہے۔ کاش کہ آپ سب سے جی بھر کر مل لیتا
وجاہت علی سندیلوی

یوسف ناظم صاحب کا رپورتاژ بے حد پسند آیا۔ اور حیدرآباد نہ آسکنے کا جو قلق تھا وہ کسی حد تک مٹ گیا۔ پاکستانی ادیبوں کے مضامین بھی دلچسپ ہیں۔ اور مسیح انجم صاحب کی تحریر بھی!
شکیل اعجاز، اکولہ

مخلصی! تسلیم!
شگوفہ کا تازہ شمارہ ملا۔ یوسف ناظم صاحب کا مضمون اور عطاء الحق قاسمی کا اخبارچہ پڑھا۔ اچھا لکھا ہے جشنِ مزاح کی تفصیلات کا انتظار ہے۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کا مضمون بہت خوب ہے اور دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں۔ عالمی جشن مزاح کا یہاں کے اخبارات نے بھی اچھا خاصا تذکرہ کیا ہے اس کامیابی پر آپ سب لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں، اسرار جامعی، پٹنہ۔

برادر عزیز القدر۔ السلام علیکم!
عالمی مزاحیہ کانفرنس کی جھلکیاں ٹی۔ وی پر دیکھیں۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ آپ سب کی مساعی قابلِ داد اور لائق تحسین ہیں۔ ڈاکٹر راہی قریشی، گلبرگہ

ڈیر کمال بھائی صاحب!
پچھلے چند دنوں سے اخبار سیاست میں مسلسل عالمی جشن مزاح کی تفصیلات پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ پاکستانی اخباروں میں بھی اِس جشن کے تعلق سے بھی خبریں آ رہی ہیں اور اخبار جنگ نمایاں طور سے خبروں کے کالم میں تفصیلات لکھ رہا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ زندہ دلان کا جھنڈا ساری دنیا میں اُونچا ہوگیا۔ آپ کی جو خدمات اس ادارے سے وابستہ ہیں اور آپکی کوشش جو ہمیشہ رہی ہے اس کی وجہ سے آج وہ دن آیا ہے کہ حیدرآباد میں یہ جشن منایا جارہا ہے اور دنیا بھر کے ممالک سے مندوبین شرکت کر رہے ہیں یہ کام آج تک کوئی اِدارہ نہ کرسکا یہ آپ۔ لوتھر صاحب اور حمایت بھائی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ مجھے بہت مایوسی ہوتی ہے کہ اس وقت میں اپنے لوگوں سے دُور اور ایسے ماحول سے بالکل مختلف پیٹ کی خاطر دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔ اخباروں میں پڑھتا ہوں بیحد خوشی ہوتی ہے اور آپ لوگوں کی رات دن کی محنت کا نقشہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ کاش میں ان دنوں وہاں ہوتا تو اس عالمی جشن میں شریک رہتا۔ یہاں بہت سے لوگوں کے پاس مزاحیہ مشاعروں کے کیسٹ ہیں جو بہت شوق سے سُنے جاتے ہیں پیارے مسیح انجم اور طالب بھائی بھی بیحد مصروف ہوں گے۔ اِس عالمی جشن کی کامیابی پر میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد زندہ باد
شگوفہ پائندہ باد — الطاف، جدہ

محترم مصطفیٰ کمال صاحب۔ سلام و رحمۃ
عالمی جشن مزاح نمبر ملا۔ مزید یہ کہ مجھ میں تحریک مزاح ہوئی اس کے لئے ممنون ہوں۔ آپ جس خوش اسلوبی سے زندہ دلانِ

حیدرآباد اور "شگوفہ" کو زندگی کی حرارتوں سے لبریز کیے ہوئے ہیں وہ آپ کی لگن اور خلوص کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

یوسف ناظم صاحب اب کے بھی مزہ دے گئے۔ لطیفہ گوئی اور واقعہ نگاری کے سہارے مزاح پیدا کرنے کے لئے بہت سے لوگ ہیں لیکن الفاظ اور جملوں کی نشست و برخاست اور روانی و پیچیدگی سے مزاح پیدا کرنا انھیں کا کام ہے۔ وہ کبھی تیز لکھ کر مزاح پیدا کرتے ہیں تو کبھی یک بہ یک رک کر جیسے کوئی آدمی اگر ہنستے ہنستے دفعتاً سنجیدہ ہو جائے تو بڑا ہی قہقہہ انگیز لمحہ ہوتا ہے۔ وہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی اپنے اس ہنر سے اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ مخاطب ہر وقت سب گیا تب گیا کی کیفیت میں رہتا ہے۔

حضرت واہی کی نظم ادیس احمد دوراں کے نام بھی خاصے کی چیز ہے۔ منظوم مکتوب نگاری کو فن کی حیثیت دینے پر واہی صاحب تلے ہوئے ہیں۔ منظوم اور مزاحیہ مکتوب نگاری اب ایک الگ حیثیت بنا چکی ہے۔ ابابیل کو اگر ابابیل الگ الگ کر کے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں محنت کش ہیں اور دوراں صاحب کو اس لئے ہمدردی ہے۔

جوہر سیوانی جیسا ظریف شاعر مرگیا۔ بس یوں ہی معلوم ہوا گویا ل بہار نے کچھ نہیں کیا۔ ان کی نظمیں یاد رہیں گی۔ سوونیر میں شامل کلام بھی عمدہ ہے۔

نریندر لوتھر اور فکر تونسوی بھی خاصے کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر ایم کمال الدین، دربھنگہ

مکرمی مصطفیٰ کمال صاحب۔ آداب!

. . . . دوسری مبارکباد عالمی جشن مزاح کے انعقاد کی اور تیسری مبارکباد اس جشن کی کامیابی کی قبول فرمائیے۔ اُمید ہے کہ اس طرح کے آئندہ جشن میں حصّہ لینے والے ممالک کی تعداد بڑھے گی اور ایک دن وہ آئیگا کہ آپ کا "ناتی جشن مزاح منعقد کرانے کے متعلق سوچنے لگیں گے۔ اللہ کرے زورِ مزاح اور زیادہ۔

فیاض احمد فیضی، بمبئی

مارچ کا شگوفہ ملا۔ خدا کے فضل سے نظم و نثر دونوں شعبوں میں خاصا نکھار آگیا ہے۔ اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔ اس بار ایک منظوم لطیفہ لیکر حاضر ہو رہا ہوں۔ ۴ر فروری کو اپنی نوجوان اور نئی شادی شدہ بچی کی بے وقت موت نے ایک ماہ تک مجھے صاحب فراش رکھا۔ دعا کیجئے کہ یہ زخم پوری طرح مندمل ہو جائے۔

ظفر چکدینوی

خرافاتی کمال صاحب۔

آپنے خلافِ توقع شگوفہ دے مارا یہ الفاظ دیگر اسے روشن چراغ دل کے سارے چراغ دم توڑ گئے۔ تعریفی کلمات معذرت ہی نہیں بلکہ وجہ قتلِ انسانیت بھی ہوتے ہیں مرحومہ اندرا جی کی مثال آپ کیسا تھ ہے۔ مرحوم قبلہ رشید احمد صدیقی کو اس جملے پر بہشت مل گئی کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو دو نادر تحفے عطا فرمائے "تاج محل اور اردو" اب میں کیا کروں مرنا تو مجھے بھی ہے چنانچہ میں نے بھی ایک جملہ تراش لیا۔ "خدا جب مجھ سے پوچھے گا "نالائق! اپنے ساتھ کیا لایا ہے؟ کہدوں گا "زندہ دلانِ حیدرآباد کے عالمی جشن کی کانفرنس کی رپورتاژ (یوسف ناظم) اور دلی میں اردو اکاڈمی کی زعفرانی و ادبی" دلی والے" اردو کانفرنس کے خاکے یہ بات جدا کہ اس میں دِلّی والے اتنے کم تھے جتنا آٹے میں نمک۔ مگر یہاں نمک کے بغیر گزارا کہاں؟ اس کانفرنس میں خاکے پڑھے گئے مگر اکثر خاکہ نگاروں نے خاکے کم خاکوں کی خاک خوب اڑائی البتہ ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر ضمیر حسن، ڈاکٹر اسلم پرویز، خواجہ حسن ثانی نظامی وغیرہ نے خوب داد پائی مجتبیٰ حسین کا صدارتی خاکہ واقعی اظہر میاں کی تین سنچریوں پر حاوی تھا مگر ڈاکٹر صلاح الدین اور اردو اکاڈمی کے سیکریٹری کی داد نہ دینا نمک حرامی ہی نہیں بلکہ "گوشت حرامی بھی ہوگی" (طعام کے وقت نظام الدین کا ہرا بھرا غیر ا صاحب قلم نظر آیا) ۔ "دھجیاں" یہ سلسلہ خوب رہیگا شگوفہ کا نثری حصّہ کنگ کانگ ہے اور حصّۂ نظم مری صحت سے بھی دبلا نحیف۔ اسرار جامعی کا قطعہ شانِ سخاوت بے حد پسند آیا ـــ!

دلیپ بادل
چراغ دہلی

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے

کھانے کی گولی	کاپر ٹی	نرودھ
		NIRODH

کوئی بھی طریقہ اپنائیے

SHUGOOFA Hyderabad-1
Vol. 18 Copy 4
April 1986 Phone : 557716

MAY 1985

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۸

شمارہ ۵

مئی ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت: ۳ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے: ۱۰۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف، مسعود النور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان۔ حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ:۔
شگوفہ ۲۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون:
آفس: 557716
مکان: 521064

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

○ قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومرادلیکس کے لیے - عطاالحق قاسمی ۷

○ مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

امتحان ؛ ڈاکٹر عابد مُعِز ۲۷

○ مالِ مُفت (انشائیے)

عید ؛ ڈاکٹر حبیب ضیاء ۲۳

داستان نشان ہائے رنگارنگ ؛ بانو سرتاج ۲۳

اور میں چناؤ ہار گیا ؛ مرزا کھونچ ۵۱

نخلستان کے چکنے گھڑے ؛ ممتاز مہدی ۵۴

○ حق تو یہ ہے کہ . . . . (ترجمہ)

یہ کالج کی لڑکیاں ؛ گنگادھر گاڈگل ۴۱
اعجاز مدنی

○ چُورن (منظومات)

پاگل عادل آبادی ـــــــ ۳۱

سراج نرملی ـــــــ ۳۱

بے دھڑک ۳۲ ساجد زیدپوری ۳۲

کرشن پرویز ۳۹ واحد انصاری ۳۹

برق آشیانوی ۴۰ دوست محمد ۴۱

افروز عالم ۴۰

ماہنامہ **شگوفہ** کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر : یوسف ناظم

● ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں :
گنگادھر گاڈگل (مراٹھی)، کُل کی (ٹامل) دلاذ بھٹ اور بگن بہارلال مہتا (گجراتی) فنتور آنند (اُڑیا) راوی کونڈل راؤ (تلگو) بیچی (کنڑا) ایپاپانی کر (ملیالم) نارائن گنگو پادھیائے (بنگلہ) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری) شرن پورن شرما (راجستھانی) شردجوشی (ہندی) رتی لال شاہین کی تخلیقات کے تراجم

● ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ :-
دیے دیش ٹھاکر (ہندی) ہمانیش گوسوامی (بنگالی) عزیز تمنائی (ٹامل) این دی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ (تلگو) شیام سندر مصرا (اُڑیا) ڈاکٹر سکنیا جوہری (گجراتی) حمید الماس (کنڑی) ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی) ڈاکٹر اعجاز ہمدانی (مرہٹی) پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم) کرت بابانی (سندھی) ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی) اور ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی)

● اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :- ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم

● عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مناظر عاشق ہرگانوی اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء

● اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشاہ، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پرویز یداللہ مہدی کے مضامین اور خود نوشت سوانح

● ڈاکٹر عبدالمغنی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیے گئے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے انٹرویو

● مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی ● تخلیق کاروں کی تصویریں ● اور دوسری کئی دلچسپیاں

● خوبصورت دورنگی سرورق ــــ سعادت علی خان

● ضخامت : ۳۸۶ صفحات ● قیمت : ۵۰ روپئے

● سالانہ خریداروں سے ۲۰ روپے، ۵ روپے زائد بھجوانے پر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائیگا!

مسافتیں

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

ایک سفر ہیومر اولمپکس کے لیے

یہ غالباً ایئربس تھی جس میں ہم سوار ہوئے تھے سو یہ جہاز کیا تھا کوئی دو کنال کا بنگلہ تھا جو ہلکی پھلکی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑتا چلا جارہا تھا مگر اس "بنگلے" کے مکینوں کو پیاس بہت لگ رہی تھی چنانچہ جہاز کے سیدھا ہوتے ہی مسافروں نے حفاظتی پیٹیاں ڈھیلی کرنے اور سگریٹ سلگانے کے بعد اپنی نشست پر لگی گھنٹیاں بجانا شروع کردیں اور "العطش العطش" پکارنے لگے جدھر سے گھنٹی کی آواز کے ساتھ نشست کے اوپر لگی سرخ بتی روشن ہوتی جہاز کا عملہ دوڑا دوڑا اس طرف آتا اور کچھ اس طرح پانی پیش کرتا کہ پینے والا پانی پانی ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد جہاز کے عملے پر مجھے فائر بریگیڈ کے عملے کا گمان ہوا باقی لوگوں کا تو ذکر کیا خود مجھے بہت پیاس لگ رہی تھی چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے گھنٹی بجانا پڑتی جس پر ایک سالونی سلونی ایئر ہوسٹس ماتھے پر لگی بندیا کے ساتھ جگ ہاتھ میں لئے چلی آتی مگر پیاس تھی بجھتی ہی نہیں تھی ایک دفعہ تو اس کے ماتھے پر بندیا کی جگہ تیوریاں نظر آئیں اس وقت مجھے اپنا ایک دوست محمود بہت یاد آیا میں اور وہ ترکی جارہے تھے فضا میں پرواز کے دوران ایئر ہوسٹس آئی اور اس نے شائستگی سے پوچھا آپ کیا پئیں گے؟ میں نے کہا گریپ فروٹ جوس پھر اس نے محمود سے پوچھا آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ محمود نے اپنی عینک اتاری اس کے شیشے صاف کئے اور پھر آغا حشر کے کسی رومانوی کردار کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عاشقانہ انداز میں کہا جو آپ پلا دیں! اس پر میں اپنے جوس سے بھی محروم ہوگیا کیوں کہ وہ واپس ہی نہیں آئی آج سید ضمیر جعفری میرے ہم سفر تھے تھوڑی دیر بعد کھانا "سرو" ہونے والا تھا میں نے انہیں بھوکا رکھنا مناسب نہ سمجھا چنانچہ خود پیاسا رہنا منظور کر لیا۔

"یار آج کل لوگ جس طرح سے محروم ہوتے جارہے ہیں" سید ضمیر جعفری نے پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد کہا۔

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے!" میں نے خلال کرتے ہوئے جواب دیا "صورتِ حال تو اس قدر افسوس ناک ہے کہ اخبار کے اداریے پڑھ کر بھی لوگوں کے ہونٹوں پر ہنسی نہیں آتی۔"

"تم یہاں بھی سیاست گھسیٹ لائے" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا میں تمہیں اپنے ایک دوست کی زندہ دلی کا واقعہ سنانے لگا تھا ان دنوں اتنا حوصلہ بہت کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں آپ ارشاد فرمائیں" حالاں کہ اس وقت میرا جی پھر گھنٹی بجانے کو چاہ رہا تھا پیاس جو محسوس ہو رہی تھی۔

"ہمارا ایک دوست تھا" ضمیر صاحب نے کہا "شاعر بھی تھا زبردست ہومیوپیتھ بھی اور اس کے ساتھ نہایت بذلہ سنج تھا جب وہ بیمار ہوا اور بستر مرگ پر تھا تو میں نذیر احمد شیخ اور دوسرے دوست اس کی عیادت کو گئے وہ اپنی جگہ سے ہلنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا نحیف سی آواز میں کہنے لگا میری ایک آخری خواہش ہے۔

ہم نے آزردہ لہجے میں پوچھا وہ کیا؟

"کہنے لگا تم لوگ ابھی میرے سامنے بیٹھے بیٹھے میرا مرثیہ لکھو مگر شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی شعر سنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے!

"ہم نے کہا یہ تم کہہ رہے ہو ایسا نہیں ہو سکتا!"

بولا "گویا تم میری آخری خواہش پوری نہیں کرنا چاہتے؟" اور پھر اس نے اتنا اصرار کیا کہ ہمیں طوعاً و کرہاً اس کی فرمائش پوری کرنی پڑی ہر شعر پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل جاتی وہ کھل کر ہنسنا چاہتا مگر اس میں ہنسنے کی سکت نہیں تھی!

"پھر کیا ہوا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا میری اس ہنسی میں شدید حیرت بھی پنہاں تھی "پھر اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ ہوا!" ضمیر صاحب نے بتایا "جب اس کی سانس اکھڑ رہی تھی تو ایک دیہاتی مریض اندر داخل ہوا کیونکہ یہی کمرہ اس کا کلینک بھی تھا اس نے بغیر صورت حال جانے اپنی تکلیف بیان کی ہمارے اس دوست نے اس کی تکلیف سنی پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اندر سے فلاں فلاں دوا لے آؤ بیوی وہ دوا لے آئی ہمارے اس دوست نے ادھ لیٹے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا یہ پڑیاں رات کو سونے سے پہلے کھا لینا دیہاتی نے کہا اگر میں اس وقت نہ کھا سکوں تو؟ ہمارے دوست کے چہرے پر آخری مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا تو پھر جب سو جاؤ تو اس وقت کھا لینا! اور اس کے ساتھ ہی وہ آخری ہچکی لے کر خاموش ہو گیا"

یہ واقعہ سناتے ہوئے ضمیر صاحب کچھ اداس سے ہو گئے تھے خود میں نے بھی اپنی اداسی پر قابو پانے کے لئے کہا "اب ایک لطیفہ میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں!"

"سناؤ!" ضمیر صاحب نے کچھ اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں سناؤ اور جان چھوڑو! مگر پھر وہ اچانک چونک پڑے کہنے لگے "تم لطیفہ بعد میں سنانا میں کہیں بھول نہ جاؤں پہلے تم ایک بات حیدرآباد پہنچتے ہی مجھے یاد کرا دینا!"

وہ کیا؟ میں نے پوچھا

"وہاں تھانے جا کر ارائیول لکھوانی ہے" گویا اب ارائیول اور ڈیپارچر میرے علاوہ ضمیر صاحب کے اعصاب پر بھی سوار ہو چکی تھی۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا مگر لطیفہ سنیں "ایک شخص چھ مہینے پاگل خانے میں گزارنے کے بعد جب میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو ڈاکٹروں نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ اب بالکل مکمل طور پر تندرست ہو چکا ہے چنانچہ ڈسچارج کرنے سے پہلے انہوں نے اس سے پوچھا کہ پاگل خانے سے رہائی کے بعد اس نے مستقبل کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟ اس پر متذکرہ شخص نے جواب دیا کہ وہ پاگل خانے سے نکلتے ہی سیدھا اپنے گھر جائے گا ایک غلیل بنائے گا اور پھر اس سے سارے محلے کے شیشے توڑ دے گا اس پر ڈاکٹروں کا ماتھا ٹھنکا چنانچہ انہوں نے اسے مزید چھ ماہ کے لیے ہسپتال میں ایڈمٹ کر لیا چھ مہینے بعد وہ مریض دوبارہ میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے نہایت دانائی کی باتیں کیں مگر آخر میں کہا کہ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد وہ ایک غلیل بنائے گا اور محلے کے سارے شیشے توڑ دے گا چنانچہ اسے ایک بار پھر ہسپتال میں روک لیا گیا تیسری بار ڈاکٹروں نے اس سے اپنی گفتگو کا آغاز ہی یہاں سے کیا کہ وہ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد کیا کرے گا اس پر متذکرہ شخص نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ وہ پاگل خانے کا فضول کھانا کھا کھا کر تنگ آ چکا ہے چنانچہ وہ یہاں سے نکلتے ہی کسی اچھے

سے ریستوران میں جائے گا اور بہت اچھی خوراک کھائے گا اس کے بعد وہ اپنے لیے اچھے اچھے کپڑے سلائے گا پھر اپنی محبوبہ کو فون کرے گا اور اس کے ساتھ ڈرائیو پر جائے گا یہ سن کر ڈاکٹر دل نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا پھر کیا کروگے ؟ کہنے لگا ڈرائیو سے واپسی پر میں اپنے کمرے میں واپس آؤں گا اپنے پاجامے میں سے الاسٹک نکالوں گا پھر اس کی بناؤں گا غلیل اور محلے کے سارے شیشے توڑ دوں گا!

ضمیر صاحب کی ہنسی سے جہاز ڈولنے لگا تبھی حفاظتی پیٹیاں دوبارہ باندھنے کی عبارت روشن ہوگئی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمنٹ سے اندازہ ہوا کہ ہم تقریباً دو گھنٹے کی فلائٹ کے بعد حیدرآباد دکن کے ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں چنانچہ اب طیارہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا حیدرآباد دکن حیدرآباد سندھ کی طرح لگ رہا تھا۔

"اب جلدی سے بتاؤ آج حیدرآباد پہنچنے کے بعد کیا کرنا ہے"؟ ضمیر صاحب نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں" میں نے کہا ایئرپورٹ پر کانفرنس کے منتظمین ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوں گے وہ ہمیں کار یا بس میں بٹھائیں گے پھر ہمیں ہوٹل لے جائیں گے وہاں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے دوسرے مندوبین بھی مقیم ہوں گے"۔

"پھر کیا ہوگا"؟ ضمیر صاحب نے پوچھا۔

"پھر ہم ان سے گپ شپ کریں گے!"

"پھر ــــ؟"

"پھر ہم نہائیں گے صاف ستھرے کپڑے پہنیں گے عمدہ سا کھانا کھائیں گے"

"پیٹھا بھی کھائیں گے" ضمیر صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

"ہاں پیٹھا بھی کھائیں گے"

"پھر؟"

"پھر اس کے بعد ہم معزز مہمان تھانے جائیں گے اور ایوبل رپورٹ لکھائیں گے"۔

"ہت تیرے کی" ضمیر صاحب کے منہ کا مزا خراب ہوگیا، چنانچہ انہوں نے جیب میں سے پیٹھے کی ایک قاش نکالی اور آدھی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو تم بھی کھاؤ"

اب جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ سیڑھیوں کے قریب وہی ایئر ہوسٹس ہاتھ جوڑے کھڑی مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی۔ محمود یہاں ہوتا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔

بسوں میں بیٹھ کر جب ہم لاؤنج کی طرف جانے لگے تو میں نے دیکھا میرے برابر میں ایک بارعب سی شخصیت شیروانی اور شلوار میں ملبوس کھڑی ہے۔ یہ اپنے حسن عسکری تھے۔ ہمارے سفارت خانے کے منسٹر انفارمیشن!

"آپ دہلی سے اس بس میں آئے ہیں" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی آپ بھی اسی جہاز میں تھے؟ میں نے آپ لوگوں کو دیکھا ہی نہیں" انہوں نے مجھے اور ضمیر جعفری کو اچانک اپنے سامنے پاکر کہا حسن عسکری حکومت پاکستان کی نمائندگی کے لیے اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ انہیں اس طرح اپنے پاس پاکر [illegible]

"جب لاؤنج کے قریب پہنچے تو دروازے کے قریب لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا جو ہاتھوں میں جھنڈیاں لیے' زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا' ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے! مجھ پر کچھ رقت سی طاری ہو گئی!

پھر ہم نے ایک لمبا تڑنگا صحت مند شخص دیکھا' جس نے کرتا پہنا ہوا تھا اور ہندوؤں کے مخصوص انداز میں دھوتی باندھی ہوئی تھی' وہ لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا اور لوگ اسے دیکھ کر پوری وارفتگی سے زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ یہ بھارت کی قومی اسمبلی کے اسپیکر بلرام جاکھڑ تھے' جو عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے افتتاح کے لیے اسی جہاز سے ہمارے ساتھ حیدرآباد پہنچے تھے۔ اور لوگ انہی کے استقبال کو پہنچے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جو مجھ پر رقت طاری ہوئی تھی وہ اب زائل ہو چکی تھی میں نے ضمیر صاحب سے کہا آپ کے پاس تھوڑا سا پیٹھا ہوگا؟"

فساد کی جڑ — نریندر لوتھر

جہاز کی سیڑھیوں سے لاؤنج تک کا فاصلہ طے کیا تو اچانک مجھے کچھ تلاش کرتی آنکھیں نظر آئیں اور تھوڑی دیر بعد میرے سامنے میرے رفیق تلم کھڑے تھے جنھیں میں غائبانہ طور پر جانتا تھا اور جو مجھے جانتے تھے مگر اس سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا سو تعارف پر میں مسرت سے انھیں تک رہا تھا۔ اچھا تو یہ ہیں نریندر لوتھر سارے فساد کی جڑ یعنی "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے جنرل سیکریٹری یہ ہیں اپنے دربار جی! اب ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے' اتنی بڑی کانفرنس کے انعقاد کے جھمیلے میں یہ مزاح نگار سٹی بھولے ہوئے تھے اور میں ان کی اس کیفیت سے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "ہتر ہوا چولو" میں نے دل ہی دل میں کہا اور جی چاہا کہ انھیں اس فقرے کا مطلب بھی سمجھاؤں مگر اس دوران وہ ایک اور شخص سے بغل گیر ہو رہے تھے' دراز قد' سرخ و سفید رنگ یہ صاحب مجھے کشمیری بٹ لگ رہے تھے!

"ان سے ملیں" نریندر لوتھر "بٹ صاحب" کا ہاتھ تھامے ہماری طرف آئے "یہ بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے آپ کے ساتھ اسی جہاز میں آئے ہیں یہ روسی مزاح نگار آندرے این یاختنوف ہیں!"

چاقو سے گدگدیاں:- روس پاکستان کو چاقو سے گدگدیاں کر کے ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر اس مزاح نگار کے چہرے پر تو بچوں ایسی معصومیت ہے۔ ویسے عمر بھی کچھ زیادہ نہیں' چند برس پہلے تک اس کا آدھا ٹکٹ لگتا ہوگا!

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ہمیں واقعی ایک دوسرے سے مل کر دلی خوشی ہوئی تھی حالاں کہ یہ الفاظ ہم نے ایک دوسرے سے کہے نہیں تھے صرف دل میں محسوس کیے تھے!

اس دوران ہمارا سامان جہاز سے اتر چکا تھا اور اب ہم فی نگ کے حساب سے سامان کا "جگا ٹیکس" ادا کر کے لاؤنج سے باہر کھڑے تھے۔ دریں اثنا ہمارے میزبانوں نے کانفرنس کے افتتاح کے لیے آئے ہوئے بھارت کی لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بلرام جاکھڑ کو ان کی گاڑی میں بٹھا کر انہیں الوداع کہہ دیا تھا۔ اب انھیں مجھے' ضمیر جعفری' حسن عسکری' آندرے اور اڑیا زبان کے ایک مزاح نگار کو "ڈیسپیچ" کرنا تھا! باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں ان میں ہمارا سامان رکھا گیا اور ڈرائیور کو ہدایت کی گئی کہ انہیں ہوٹل سمپورنا چھوڑ آؤ۔ سمپورنا ہندی کا لفظ ہے جس کا مطلب "مکمل" ہے اور "یہ مکمل ہوٹل" کے معنوں میں

بھی استعمال ہوتا ہے ۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں میرا سامان لادا گیا تھا ۔ اس میں ورما جی تھے اور اڑیا زبان کے وہ مزاح نگار جن کا نام ذہن میں "اڑیاں" کر رہا ہے، مگر یاد نہیں آ رہا۔ دوسری گاڑی میں اپنے ضمیر صاحب تھے اور عسکری صاحب تھے۔
ضمیر صاحب نے آواز دی "تم نے حیدرآباد پہنچتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو" میں ۔۔۔ ان کی آواز پر کان دھرا اور اپنی گاڑی سے نکل کر ان کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا اور بعد میں یہ بات ایک دفعہ پھر ثابت ہوئی کہ جس کسی نے ضمیر کی آواز پہ کان دھرا اس نے اس کا خمیازہ بہر حال بھگتا مگر یہ داستان بعد میں بیان ہوگی ۔
"میں نے گورنر ہریانہ مظفر برنی صاحب کے سیکریٹری کو آپ کی بھارت کی آمد کی اطلاع دے دی تھی، وہ ادب کے بہت اچھے پارکھ ہیں اور آپ کے بہت مداح ہیں!" حسن عسکری کہہ رہے تھے!
"یہ آپ نے بہت اچھا کیا" ضمیر صاحب نے کہا اور اس خوشی میں جیب سے میٹھے کی ایک قاش نکال کر حسن عسکری کو پیش کی۔ "لو منہ میٹھا کرو"۔
"نہیں یار میں پہلے ہی بہت موٹا ہو رہا ہوں!"
تقریباً دو سو پاؤنڈ وزن کے حامل ضمیر صاحب نے اپنے جُثّے پر ایک نظر ڈالی اور کہا "نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، آپ مجھے دیکھیں!"
حسن عسکری تو ہنس کر بات ٹال گئے، مگر میں نے ان دونوں کے جُثّوں کی طرف دیکھا اور مجھے راجہ مہدی علی خاں اور الطاف مشہدی یاد آ گئے جو ایک دفعہ لڑتے جھگڑتے احمد ندیم قاسمی صاحب کے پاس "پھول" کے دفتر پہنچے اور ان سے دادرسی چاہی۔ تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ دونوں میں سے زیادہ موٹا کون ہے ۔ راجہ مہدی علی خاں کا دعویٰ تھا کہ وہ زیادہ موٹے ہیں جبکہ الطاف مشہدی موٹاپے میں اپنی فوقیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ جب قاسمی اس معاملے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ سنا سکے تو طے پایا کہ سامنے لکڑیوں کی ٹال پر موجود "کنڈے" میں وزن کر کے دیکھ لیتے ہیں ۔ چنانچہ کنڈے کے ایک پلڑے میں راجہ مہدی علی خاں اور دوسرے میں الطاف مشہدی بیٹھ گئے ۔ الطاف مشہدی کا پلڑا ایک طرف جھک گیا، چنانچہ دوسری طرف دس سیر کا باٹ رکھا گیا تو وزن برابر ہوا ۔ اس پر الطاف مشہدی نے فخر سے راجہ مہدی علی خان کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھا میں نے کہا تھا کہ میرا وزن زیادہ ہے!"
"نہیں تمہارا وزن زیادہ نہیں ہے" راجہ مہدی علی خاں نے کہا "تم کسی دن بغیر کھائے پیئے وزن کر کے دیکھو، تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم کتنا فالتو وزن اٹھائے پھرتے ہو!"
مگر یہاں تو معاملہ موٹاپے میں برابری کا تھا ہی نہیں، سو کنڈے تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی اور یوں یہ معاملہ ہی ختم ہو گیا!
میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو حیدرآباد دکن کی سڑکیں اور عمارتیں ایک ایک کر کے تیزی سے میرے سامنے سے گزرتی جا رہی تھیں ۔ یہ ہے حیدرآباد دکن ؟ میں نے دل ہی دل میں مایوسی سے کہا یہ تو بالکل عام شہروں جیسا ہے تاہم مجھے یوں لگا جیسے ضمیر جعفری نے میری خاموش صدا سن لی ہے!
"شہر سنگ و خشت کی بنی ہوئی عمارتوں سے نہیں، اپنے کردار سے پہچانے جاتے ہیں" جیسے ضمیر جعفری اپنی خود کلامی کر رہے تھے۔ "اس سرزمین نے اورنگ زیب عالمگیر کے قدموں کی چاپ سنی ہے ، قطب شاہی خاندان کا دور دیکھا ہے ۔

اس میں دلی دکنی کی خوشبو ہے یہ سرزمین سلطنت آصفیہ کے سات فرمانرواؤں کی داستانوں کی امین ہے۔ یہ زمین نواب میر عثمان علی خان، مہاراجہ کشن پرشاد، یوسف علی خان سالار جنگ، سروجنی نائیڈو، بہادر یار جنگ، سر اکبر حیدری اور مولوی عبدالحق کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ یہ قاسم رضوی اور اس کے رضاکاروں کی سرزمین ہے۔ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور ہمارے دوسرے ادبی مشاہیر کا رشتہ بھی اسی سرزمین سے رہا ہے۔"

ہم اس وقت سکندر آباد سے گزر رہے تھے، آگے حسین ساگر کا پل تھا، جس کے دوسرے کنارے پر حیدرآباد آباد ہے۔
"قاسم رضوی کے رضاکار یہیں کہیں ایک ایسی جنگ میں اپنی جانیں قربان کر رہے ہوں گے، جس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلنا تھا اس دور دراز علاقے میں تو اورنگ زیب کے پاؤں بھی نہیں جمے تھے۔ تین دنوں کے اندر اندر نظام کی فوجوں نے بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ جنرل چودھری نے اپنی فتح کا جشن یہیں کہیں منایا ہوگا!"

"ضمیر صاحب، تھوڑا سا میٹھا تو کھلائیں!" میں نے ان کی گفتگو درمیان میں روک کر کہا۔

"یار، وہ تو ختم ہو گیا ہے، ڈرائیور سے کہو کوئی مٹھائی کی دکان آئے تو کار تھوڑی دیر کے لیے روکے۔"

اور اب ہم حسین ساگر سے آگے نکل آئے تھے۔ اسلامی طرز تعمیر کی حامل شہر کی تاریخی عمارتیں کہیں کہیں اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ تیلگو کے اس خطہ زمین میں دکانوں کے سائن بورڈوں اور سنگ میل پر اردو کی عبارتیں نظر آئیں تو مجھے خوشگوار مسرت ہوئی۔ حیدرآباد شہر میں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں مگر یہ شہر آج بھی اپنے سابقہ اور موجودہ آثار کے حوالے سے بھارت میں اردو اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک جزیرہ ہے۔ تیلگو بولنے والوں کا تصادم اردو کے ساتھ نہیں ہندی کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اردو تاحال یہاں کی ایک اہم زبان ہے اور یا پھر انگریزی ایک بلند مقام پر فائز ہے جس کا اندازہ اس شہر ہنر دواں میں سات دن قیام کے دوران ہوا۔

شہر میں راما راؤ کی چالیس فٹ لمبی تصویریں لگی ہوئی تھیں" جو اب آن غزل" کے طور پر اندرا گاندھی اور راجیو کی تصویریں بھی اسی سائز میں موجود تھیں۔ ایک علاقائی جماعت کے لیڈر نے ملک کی قومی جماعت کو نتھ ڈال دی ہے!

اور پھر اس شہر میں میں نے مجتبیٰ کو یاد کیا۔

مجتبیٰ حسین بھارت کے چوٹی کے مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ وہ آج کل دہلی میں مقیم ہیں مگر ان کا تعلق بھی حیدرآباد سے ہے، بلکہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کی تشکیل اور تعمیر میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ حیدرآباد پہنچ گئے ہوں گے مگر نرنید لوتھر نے بتایا کہ وہ دہلی میں کانفرنس کے انتظامات میں مشغول ہیں۔ تاہم آج شام کو حیدرآباد پہنچ جائیں گے۔

"تو آج شام کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے ضمیر صاحب سے پوچھا
تھانے جائیں گے۔ اور ایوِل ... ؟
"لاحول ولاقوۃ"

اور اس کے ساتھ ہی ہماری کار ہوٹل سمپورنا کی صدر میں داخل ہو رہی تھی۔

فرسٹ امپریشن

حسن عسکری کی شیروانی اور ضمیر صاحب اور میرے شلوار کرتے پر نظر پڑتے ہی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ایک دلکش خاتون نے بھرپور مسکراہٹ اور "دیل کم" کے پرخلوص لفظوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور پھر وہ کاؤنٹر سے نکل کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اسے ہماری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی، اور اب وہ اپنے پاکستانی

مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ سیندور تھا اور گلاب کے پھول تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر سیندور لگایا اور پھر تھال کو میرے گرد پھیرے دیئے حالاں کہ میں نے سنا تھا کہ آگ کے گرد سات پھیرے مکمل کئے جاتے ہیں، مگر وہ غالباً شادی وغیرہ کے موقع پر ہوتا ہے۔ پھر اس دیوی نے مجھے ایک گلاب کا پھول پیش کیا اور اب گویا میری آرتی اتارنے کی رسم پوری ہوگئی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے دھڑکا تھا یعنی ضمیر جعفری اور حسن عسکری کی آرتی بھی اتاری گئی!

میں نے اس مکمل عورت کو ایک نظر دیکھا اور کہا "یہ سمپورنا ہوٹل کا نام ہے یا . . .

اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹی اور کہا "میرا نام پریدھان ہے!"

"پری دھان؟"

اس کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ ابھری "آیئے! میں آپ لوگوں کو آپ کے کمروں تک چھوڑ آؤں!"

میرا کمرہ پہلے فلور پر تھا اور ضمیر جعفری اور حسن عسکری تیسرے فلور پر تھے۔ بڑے آدمی جو ہوئے!

پہلے فلور پر لفٹ رُکی تو پری دھان نے ضمیر صاحب اور عسکری صاحب سے کہا "آپ چلئے میں ابھی آتا ہوں"۔

میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پری دھان نے کہا "آپ کے لیے چائے کافی منگواؤں یا کوئی اور چیز پسند کریں گے"۔

"نہیں کچھ نہیں۔ شکریہ"

"آپ تکلف نہ کریں آپ کو کسی چیز کی ضرورت [illegible] تو بتایئں"۔

نہیں میں تکلف نہیں کر رہا، آپ نے [illegible] طرح ہمیں خوش آمدید کہا ہے، اس کے بعد واقعی کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہی!"

مجھے یہ دیوی اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے بھی بہت اچھی لگی، اس کے برتاؤ میں، اس کی منصبی خوش اخلاقی کے علاوہ ذاتی لاگ بھی شامل تھا۔ حیدرآباد دکن کا "فرسٹ امپریشن" بہت اچھا تھا اور یہی میرا "لاسٹ امپریشن" بھی ثابت ہوا۔

میں نے کمرے میں موجود ٹیلی ویژن آن کیا اس پر ہوٹل کے سرکٹ سے کوئی فلم دکھائی جارہی تھی۔ میں اپنی پشاوری چپل [illegible]ت فوم والے بستر پر دراز ہوگیا تاکہ تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرلوں . . . اس پر مجھے اپنے ایک دوست یاد آگئے جن کی [illegible]ں ایک بہت بڑا ابھار تھا۔ وہ جب بھی ہمارے ساتھ کسی دوسرے شہر میں مشاعرہ پڑھنے کے لیے جاتے کمرے میں پہنچتے [illegible]وتے اتار کر ایک طرف رکھتے اور بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہتے "میں ذرا کمر سیدھی کرلوں" بس میں اس دن سے بامحاورہ نا بولنے کے خلاف ہوں۔

میں نے کروٹ لیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر نظر ڈالی تو ہیرو کو ہیروئن کے ساتھ کچھ نازیبا حرکات میں مشغول پایا۔ میں ایک [illegible]ڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "میرا سامان؟"

اور اس کے ساتھ ہی لفٹ کا انتظار کئے بغیر دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے لابی میں پہنچ گیا۔

سامنے پری دھان کھڑی تھی اس نے میرے چہرے پر بارہ بجے دیکھے تو کہا "کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں"۔

"میرا سامان دوسری کار میں رہ گیا ہے"

آپ کے بعد ایک کار آئی تو تھی مگر اس میں تو کچھ نہیں تھا!"

یہ پرائیویٹ کاریں تھیں، خود منتظمین کو بھی ان کے ڈرائیوروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوگا اور ان کے لیے مرے

سامان کا کھوج لگانا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ سوچتے ہی میرے پسینے چھوٹ گئے کیوں کہ میرے کپڑے، کتابیں، پاسپورٹ وغیرہ سب کچھ اسی میں تھا . . . . اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اراٹیول ڈیپارچر والا کاغذ بھی جس کی عدم موجودگی میں پانچ سال قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے۔

میں دوڑا دوڑا واپس اپنے کمرے میں گیا ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھایا اور آپریٹر سے کہا" میں ۱۲۸ نمبر کمرے سے بول رہا ہوں"۔

" بولو" آپریٹر نے کہا یہ "بولو" لفظ" فرمایئے" کا بدل تھا۔ پریشانی کے باوجود مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی۔

" ۳۲۶ نمبر ملا دو"

" ابھی لو صاحب"

میں نے ضمیر صاحب کو اپنی پریشانی بتائی۔ اُنہوں نے کہا تم نیچے لابی میں پہنچو، میں بھی وہیں آتا ہوں ۔

اب میں اور ضمیر جعفری نیچے لابی میں بیٹھے سامان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب کوئی کار ہوٹل کے دروازے پر آکر رکتی اور اس میں سے کوئی سامان نہ اترتا تو مجھے یوں لگتا میدان جنگ سے کوئی گھوڑا بغیر سوار کے آیا ہے !

میں اگر اسی کار میں بیٹھا رہتا جس میں میرا سامان تھا، تو اس پریشانی سے بچ جاتا۔ میں نے "ضمیر" کی آواز پہ کان دھر کر اپنے لیے اچھا نہیں کیا تھا !

ماتھے پر سُرخ بندیا سجائے، پھولدار ریشمی ساڑھی باندھے سفید رنگت اور بھرے بھرے جسم والی پری دھان ایک دفعہ پھر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سدا بہار مسکراہٹ تھی۔ میں نے بھی جواب آں غزل کے طور مسکرانے کی کوشش کی، مگر کاغذ کے پھولوں سے خوشبو کس طرح آسکتی ہے، میرا دھیان تو اپنے سامان کی طرف تھا جس کی ابھی تک کوئی "سُو" نہیں ملی تھی!

سامان کا کچھ پتہ چلا؟ پری دھان نے پوچھا

"نہیں"

مل جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔ اس میں پیسے وغیرہ تو نہیں تھے؟

"تھے!"

" پھر بھی مل جائے گا" مگر اس دفعہ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

" میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے" ضمیر جعفری نے کہا" تم نرنیدر لوتھر یا طالب خوندمیری کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کر دو تاکہ وہ ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کر سکیں"۔

تجویز تو بہت اچھی ہے میں نے کہا" مگر میرے پاس ان میں سے کسی کا بھی فون نمبر نہیں ہے!"

" میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" ضمیر صاحب نے کہا" اب ایک تجویز اور ہے!"

"وہ کیا؟" میں نے بے دلی سے پوچھا

" یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہم اپنے کمرے میں چل کر سامان کا انتظار کرتے ہیں"

گویہ تجویز بھی پہلی تجویز جیسی تھی، مگر میں نے اس ڈر سے کہ ممکن ہے ضمیر صاحب اس دفعہ اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار نہ ہوں، اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

چلیے! میں نے کہا
اور پھر ضمیر صاحب میرے کمرے میں تھے!
"ہماری اردو شاعری بہت بے ہودہ ہے" میں نے کہا۔
"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" ضمیر صاحب نے کہا حتیٰ کہ تم بھی ٹھیک ٹھاک شعر کہتے ہو، مگر تم یہ اردو شاعری پر غصہ کیوں اتار رہے ہو؟"
"میں تو مولانا حالی کی تائید کر رہا ہوں کہ ہمارے شاعر غیر حقیقی شعر کہتے ہیں اب دیکھیں یہ شاعر سامان کے ہونے پر اعتراض کرتے ہیں کہ سامان سو برس کل سے پل کی خبر نہیں، مگر بے سر و سامانی کے خلاف کچھ نہیں بولتے!"
"اچھا تو یہ بات ہے" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا
لیکن ......"
مگر ان کی یہ "لیکن" درمیان میں ہی رہ گئی کسی نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور پھر اس کے ساتھ ہی دو شخص ایک بہت بڑا پیٹی نما اٹیچی کیس اٹھائے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔
"میرا سامان آگیا" میں نے خوشی سے کھلکھلا کر کہا۔ یہ اٹیچی کیس میں نے ابوظہبی میں مشاعرے کی کمائی سے خریدا تھا اور اب یہ حیدر آباد میں دھکے کھاتا کھاتا وفادار بلی کی طرح واپس مجھ تک پہنچ گیا۔ مجھے یہ گندے مندے سے شخص اس وقت کتنے اچھے لگ رہے تھے جی چاہتا تھا کہ ان کی پیشانی چوموں ـــ!
صاحب ہمیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سامان کس کا ہے، بڑی مشکل سے پوچھتے پاچھتے یہاں تک پہنچے ہیں! ان "مردوں" میں سے ایک نے کہا اور پھر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "صاحب! یہ بھاری بہت ہے؟"
اس میں "معاصر" کا ایک تازہ شمارہ ہے" ضمیر صاحب بولے
ان بچاروں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر ان میں سے ایک کی طرف بڑھایا۔ پیشتر اس کے کہ میں ساتھ میں کچھ کہتا، ضمیر صاحب نے انہیں مخاطب کر کے کہا "ان پیسوں کا میٹھا کھا لینا!"
اس وقت رات کے نو بجنے کو تھے مگر اب تھکن نام کو نہ تھی۔
"کیا پروگرام ہے؟" ضمیر صاحب نے پوچھا
پہلے کھانا کھاتے ہیں، پھر شہر کی سیر کو نکلتے ہیں!
اب ہم گراؤنڈ فلور پر ہوٹل کے ریستوران میں تھے۔
"ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین؟" ویٹر نے پوچھا!
انڈیا میں ہر جگہ کھانے سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا ہے یعنی آپ سبزی خور ہیں یا گوشت خور ہیں؟ حالاں کہ سبزی خور اور گوشت کے ساتھ آدم خور بھی پوچھا جانا چاہیے کہ مذہب کے نام پر انسانوں کا خون پینے والے بھی بہت ہیں۔ یہاں دعوتوں پر بھی دو الگ میزیں لگ جاتی ہیں ایک سبزی خوروں کے لیے، ایک گوشت خوروں کے لیے...... حالاں کہ رش گوشت والی میز پر ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک ہندو دوست کیول لاہور میں میرے ہاں مہمان ہوا۔ کھانے کی میز پر شامی کباب بھی تھے میں نے اسے ساری ہر چیز چکھنے پر اصرار کیا مگر اس کے مذہبی معتقدات کے پیش نظر ان کبابوں کی دعوت نہیں دی، جبکہ وہ کھانا کھاتے ہوئے

بار بار "ٹیری" آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "یہ کباب کس چیز کے بنے ہوئے ہیں ؟" بشیر اس کے کہ میں اسے بتا تا کہ گائے کے گوشت کے ہیں اس نے ایک کباب اٹھا کر منہ میں ڈالا اور کہا "دیکھی جائے گی جو ہوگا"

کھانا کھا کر ہم ہوٹل کی لمبی راہداری طے کرکے باہر سڑک پر آگئے اور پھر منہ اٹھا کر بائیں جانب کو چلنا شروع کر دیا کیونکہ دائیں جانب والی سڑک پر خاصا رش تھا۔ معلوم ہوا ادھر صنعتی نمائش لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم ایک بہت بڑے چوراہے پر آگئے۔ یہ منظم جاہی مارکٹ تھی اور جس جگہ ہم کھڑے تھے یہ پھلوں کی منڈی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ یہاں فروری کے مہینے میں ہر موسم کے پھل موجود تھے۔ چنانچہ آم، انگور اور خربوزے بھی نظر آرہے تھے، مگر یہ پھل سستی اور لاغری وغیرہ کا شکار تھے۔ وہاں ٹوکریوں میں جو آم دھرا تھا وہ اگرچہ لنگڑا آم نہیں تھا، مگر لگتا "لنگڑا" ہی تھا ! یہاں بھی پرانی سوتی ساڑھیوں میں ملبوس عورتیں یہ تربوز اور ناریل کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھیں۔ میں اور ضمیر صاحب مختلف دکانوں سے پھلوں کی قیمتیں معلوم کر کے آگے بڑھنے ہی کو تھے دکاندار نے روک لیا اور پھر اس نے اپنی سیلز مین شپ کے کچھ ایسے نادر نمونے پیش کئے کہ مجھے ایک کلو انگور خریدتے ہی بنی۔ مجھے لگا کہ سیلز مین اگر چاہے تو ایک اسکیمو کے ہاتھ فریج بیچ سکتا ہے !

مختلف سڑکوں پر سڑ گشت (براہ کرم اسے مڑ گوشت نہ لکھیں) کرتے ہوئے ہماری نظریں عمارتوں پر اٹھیں تو ان میں اسلامی و تعمیری جھلک نمایاں نظر آتی۔ کئی جگہوں پر خوب صورت مسجدیں بھی نظر آئیں۔ دکانوں پر سائن بورڈ جا بجا اردو میں نظر آئے اور یہ منظر "لما نواں لما نواں" نظر آتا ہے۔ ایک بالو مارکہ ہوٹل پر نظر پڑی "مکہ ہوٹل" !

یہاں ایک "کڑک" چائے پینی چاہیئے ضمیر صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر اس عوامی ریستوران میں داخل ہوگئے۔

اندر داخل ہوتے ہی حیدرآبادی بریانی کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر گئی جس طرح شیروانی حیدرآبادیوں کا قومی لباس ہے اسی طرح بریانی ان کی قومی ڈش ہے۔ اس بریانی کی لذت کا یہ عالم ہے کہ ایک سینہ گزٹ روایت کے مطابق دہلی کے ایک نواب زادے کسی شاہ عالم کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جب بستر مرگ پر پڑے تو انہوں نے آخری سانس لیتے ہوئے نہایت حسرت سے کہا "کاش اس وقت حیدرآبادی بریانی کے دو لقمے نصیب ہو جاتے۔

حیدرآبادی بریانی کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ حیدرآباد کے کسی امیر الامراء کی خدمت میں ایک ایسا باورچی پیش کیا گیا جو بریانی پکاتا تھا جو لذیذ ہونے کے علاوہ مقوی بھی ہوتی تھی۔ اسے ملازم رکھ لیا گیا لیکن اس نے دو شرطیں پیش کیں۔

۱. بریانی پکانے کا حکم ایک دن پہلے دیا جائے۔

۲. جیسے ہی بریانی کی تیاری کا اعلان ہو، اسے فوراً کھا لیا جائے۔

یہ شرطیں منظور کرلی گئیں لیکن ایک دن اس کے حکم کے مطابق بریانی پکائی تو امیر الامراء صاحب مصروف تھے۔ باورچی کے مسلسل اصرار کے باوجود وہ دسترخوان پر نہ پہنچ سکے یہاں تک کہ بریانی ٹھنڈی ہوگئی۔ نواب صاحب کی وعدہ خلافی دیکھ کر باورچی کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بریانی کی دیگچی کو ایک خشک درخت کی جڑ میں الٹ کر مستعفی ہو گیا۔ دو تین روز بعد نواب صاحب اور ان کے مصاحبین یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ بریانی کے اثر سے اس خشک درخت میں نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ حیدرآبادی بریانی کی "فضیلت" کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بقول شاہد صدیقی کچھ لوگ حیدرآبادی بریانی کے مقابلے میں لکھنوی پلاؤ کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہی ہے جیسے انیس کے مقابلے میں دبیر کو کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔

"ایک پلیٹ بریانی !" ضمیر صاحب نے ہوٹل بوائے احمد کو آرڈر دیا !

بریانی کھا کر میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک انگڑائی لی "اب کیا کیا جائے؟ یہاں تو کوئی خشک درخت بھی نہیں ہے"

"چائے پیتے ہیں!" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

ریستوران سے نکلتے ہوئے میں نے احمد کو ایک کلو انگور والا لفافہ پیش کیا حالاں کہ اس بچارے نے ہمیں بریانی کھلائی تھی!

حیدرآباد نگینہ: اندر مٹی اوپر چونا: حیدرآباد کے متعلق ایک کہاوت مشہور ہے حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا۔ یہ کہاوت اس شہر کے سماجی تضاد کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر اس کے نگینہ ہونے کی وضاحت حیدرآباد پر متعدد مضامین کے مصنف شاہد صاحب نے اس طرح کی ہے کہ جو لوگ سفر کرتے رہتے ہیں اور جن کی عمر سیاحی میں گزرتی ہے ان کے بیانات کی روشنی میں دہلی کا رنگ سفید ہے کلکتہ کا سیاہ، بمبئی کا آسمانی، لکھنؤ کا سبز، آگرے کا زرد، الہ آباد کا قرمزی بنارس کا انگوری اور مرادآباد کا فاختی لیکن حیدرآباد کا معاملہ جداگانہ ہے۔ اس شہر کا کوئی رنگ نہیں بلکہ اس میں رنگ کی بجائے ایک طرح کی چمک ہے جو دور سے سمجھ میں نہیں آتی اور قریب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ چمک دائیں بائیں آگے پیچھے اور نیچے غرض کہ ہر طرف پائی جاتی ہے۔ ہر موسم میں پائی جاتی ہے ہر وقت پائی جاتی ہے بلکہ اس وقت بھی پائی جاتی جب چراغ بجھ جاتے ہیں اور ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا!

اس وقت چراغ بجھے ہوئے ہیں اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا مگر حیدرآباد واقعی نگینے کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک بجھے ہوئے چہرے اور سفید داڑھی والا بزرگ سائیکل رکشہ چلاتے ہوئے میرے قریب سے گزرتا ہے مگر مجھے اس کے چہرے پر بھی ایک امید ایک یقین کی چمک نظر آتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے واپس ہوٹل کی طرف چلتے ہوئے مجھے یہ شہر خوب صورت لگ رہا ہے روشن اور تابندہ میں نے سنا تھا کہ شہر اپنی پہچان آہستہ آہستہ کراتے ہیں، مگر مجھے تو ابھی سے لگ رہا ہے جیسے میں صدیوں سے اس شہر میں بس رہا ہوں۔

ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہوئے تو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، ارے یہ تو غیاث متین ہیں، ن۔ م۔ راشد پر تحقیقی مواد کی تلاش میں لاہور آئے تھے اور پھر ان سے کتنی ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نہایت خوب صورت شاعر۔ ان کی شاعری نے تو لاہور کے ادبی حلقوں میں خود کو بڑے زوروں سے منوایا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا اور بغل گیر ہو گیا۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان علی الدین نوید بھی تھے اچھے نین نقش، ننھی منی داڑھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ نوجوان وہی علی الدین نوید ہیں جن کا شعری مجموعہ "صدف تمام ریت ریت" غیاث میرے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں آگے بڑھا اور ان سے "جپھی" ڈال کر ملا۔

ضمیر صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے اور پھر سونے کے لیے اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے، مگر میں غیاث متین اور علی الدین نوید بہت دیر تک لابی میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ غیاث لاہور کو یاد کرتے رہے اور لاہوریوں کی دن کے تمام اوقات میں کھانے پینے کی عادات کا ذکر کر کے ہنستے رہے۔

اب میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی اور خود غیاث اور نوید کی آنکھیں بھی میں نے دو تین دفعہ کھلتی اور بند ہوتی دیکھیں سو تھوڑی دیر بعد ہی انہوں نے رخصت چاہی اور پھر میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ صبح آٹھ فروری تھی، عالمی طنز و مزاح کانفرنس کا پہلا دن! مجھے صبح اٹھنا بھی جلدی تھا کیوں کہ ہمیں لینے کے لیے نو بجے گاڑی ہوٹل پہنچ جاتی تھی۔

آپریٹر نے حسب ہدایت صبح سات بجے فون کی گھنٹی بجا کر جگایا تو یاد آیا کہ کپڑے تو استری ہونے والے ہیں۔ میں نے ہوٹل کے ملازم کو بلایا وہ آ کر مودب کھڑا ہو گیا۔

"استری کا بندوبست ہو سکتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

یہ سن کر اس کے کان کی لویں ایک دم سرخ ہو گئیں اور پھر اس نے کہا "صاحب! ہم ایسا آدمی نہیں، ہم شریف لوگ ہے!"

میں اس کی بات سن کر سٹپٹا گیا مگر پھر مجھے یاد آیا کہ ہندی میں استری گھر والی کو کہتے ہیں اور یوں میری فرمائش اور اس کا غصہ دونوں ٹھیک تھے :

طنز و مزاح کانفرنس ــ پہلا دن : شہر کے درمیان میں خاصی بلندی پر واقع رویندر بھارتی ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی. آج عالمی طنز و مزاح کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا. اسٹیج پر کانفرنس کے منتظمین کے علاوہ امریکہ، روس، چین، بنگلہ دیش، سوئٹزرلینڈ، مصر، بلغاریہ، نیپال، جرمنی، ملائیشیا، جاپان، ارجنٹائن، برطانیہ، فرانس اور جنوبی کوریا وغیرہ کے مزاح نگار بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے دھری میز پر ان کے ملکوں کے پرچم لہرا رہے تھے. ان میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بھی تھا اپنے ملک اپنے پرچم اور اپنی قوم سے وابستگی اور افتخار کا احساس بیرون ملک جس طرح بیدار ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں. سو ان لمحوں میں جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس پرچم کو چوم لوں جو یہاں بھی ہماری پہچان ہے. مگر یہاں صرف "فلائنگ کس" ہی ممکن تھی. سو میں نے اپنے پرچم کا "ہوائی بوسہ" لیا اور پھر اسٹیج پر موجود دوسرے معززین کو پہچاننے کی کوشش کی اور ظاہر ہے میری یہ سعی سعی رائیگاں ہی کی ذیل میں آتی تھی تاہم یہاں میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست نے میری رہنمائی کی اور تب میں نے جانا کہ اسٹیج کی اگلی رو میں بھارت کی لوک سبھا (قومی اسمبلی) کے اسپیکر بلرام جاکھر بیٹھے ہوئے ہیں وہی بلرام جاکھر جن سے حیدرآباد ایئرپورٹ پر ہمارا "ٹاکرا" ہوا تھا اور حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ان کے لیے جمع شدہ استقبالی مجمع کو ہم اپنا استقبالی مجمع سمجھ کر آبدیدہ ہو گئے تھے. ان کے برابر میں ریاستی وزیر صحت (جن کی صحت کچھ اتنی اچھی نہیں تھی) اور صدر عالمی مزاح کانفرنس مسٹر آنند گجپتی راجو ایم پی تھے. ان کے علاوہ چیف سکریٹری شرادن کمار تھے کانفرنس کے ورکنگ صدر نریندر لوتھر اور جنرل سکریٹری طالب خوندمیری بھی یہاں موجود تھے. دوسری قطار میں غیر ملکی مندوبین اور ان کے ساتھ بھارت کی پندرہ زبانوں کے مزاح نگار تشریف فرما تھے. یہاں حکومت پاکستان کی نمائندگی ہمارے سفارت خانے کے منسٹر انفارمیشن حسن عسکری کر رہے تھے. میں اور ضمیر جعفری قدرے تاخیر سے ہال میں پہنچے تھے. چنانچہ جب ہم التاؤں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے اس ہال میں داخل ہوئے اس وقت ریڈی ویمنز کالج کی طالبات اقبال کا "ترانہ ہندی"

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

گا رہی تھیں ہندوستان اور پاکستان دونوں اقبال کے عاشق ہیں بس اتنا ہے کہ وہ اقبال کی ابتداء اور ہم اس کی انتہا کے پرستار ہیں. یہ لڑکیاں "ترانہ ہندی" گا کر فارغ ہوئیں تو ایک بار پھر ہاتھوں میں ہار اور گجرے لے کر اسٹیج پر نمودار ہوئیں اور مہمانوں کے لیے گل پوشی کی رسم ادا کی بھارت میں گلپوشی کی یہ رسم بہت عروج پر ہے. ہر تقریب میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور یہ اچھا لگتا ہے چنانچہ یہاں کسی مہمان کو بھی

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی : اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

والا شعر پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ "گل مراد" اس کے بغیر ہی ہاتھ آ جاتا ہے۔

اور اب تقریب کے مہمان خصوصی بلرام جاکھر اس عالمی مزاح کانفرنس کے افتتاح کے لیے اپنی جگہ سے اٹھے اور جونہی انہوں نے شمع روشن کی ہال میں چاروں طرف سے قہقہے گونجنے لگے یہ دراصل قہقہوں کی ٹیپ تھی جو آن کر دی گئی تھی. بلرام جاکھر اندرا کانگریس کے آدمی ہیں اور جس صوبے میں وہ مہمان تھے. وہ ان کے حریف راما راؤ کا تھا سو ممکن ہے ایک دفعہ وہ یہ سوچ کر رہ گئے ہوں کہ راما راؤ کے "عوام" انہیں "ہوٹ" کرنے کے لیے قہقہے لگا رہے ہیں مگر یہ میرا اپنا وہم تھا کیوں کہ بھارت میں اتنی جمہوری اور سیاسی

رواداری کم از کم بالائی سطح پر موجود ہے کہ حکومتی پارٹی کا لیڈر اپوزیشن کے علاقے میں بھی مکمل عزت و تکریم کا مستحق سمجھا جاسکتا ہے افتتاحی شمع روشن کرنے کے بعد بلرام جاکھر نے انگریزی میں تقریر کی دوران تقریر انہوں نے ایک دفعہ سامعین سے اردو بولنے کی اجازت بھی طلب کی مگر ہال کے ایک گوشے سے "نہیں" کی آواز سن کر وہ دوبارہ انگریزی میں رواں ہوگئے مسٹر جاکھر کی تقریر اتنی پُر لطف تھی کہ انہوں نے خود کو اس کانفرنس میں مہمان خصوصی بنائے جانے کا مستحق قرار دے دیا صوبائی وزیر صحت آنند گجپتی نے اپنی صدارتی تقریر کو مختصر ہی رہنے دیا اور ان کی یہ اختصار پسندی سامعین کو اچھی لگی۔ انہوں نے کہا کہ سابق حکمرانوں راجوں مہاراجوں کے دربار میں مسخروں کا نہایت اہم رول ہوتا تھا۔ وہ ہنسی ہی ہنسی میں حکمرانوں کو ان کی خامیوں سے آگاہ کرتے تھے۔ مسٹر آنند نے یہاں خواہ مخواہ "سابق حکمرانوں" کے الفاظ استعمال کئے حالانکہ تمام حکمرانوں کے درباروں میں آج بھی مسخروں کا نہایت اہم رول ہے اور جب وہ "درباری" نکلتے ہیں یا نکالے جاتے ہیں تو باہر آکر وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ تو جو کچھ کرتے تھے حکمرانوں کی اصلاح کے لیے کرتے تھے۔

طنز و مزاح کی اس عالمی کانفرنس کے موقع پر حکومت ہند کے محکمہ ڈاک نے ایک یادگاری ٹکٹ اور لفافہ بھی جاری کیا تھا۔ یادگاری ٹکٹ پر چارلی چیپلن کی تصویر تھی اور اس کے برابر میں ایک دلچسپ کارٹون بنا ہوا تھا اس موقع کی مناسبت سے ایک سووینیر بھی شائع کیا گیا تھا اور یہ دونوں یادگار تحفے یہاں مہمانوں میں تقسیم کئے گئے۔

مسکراہٹ چہرے کے ۳۷ اور قہقہہ ۸۰ عضلات کو متاثر کرتا ہے:- زندہ دلان حیدرآباد کے صدر نریندر لوتھر جو ایک ممتاز مزاح نگار ہی نہیں ریاستی محکمہ صحت کے پرنسپل سیکریٹری بھی ہیں اس کانفرنس میں "وج گج" کر سامنے آئے۔ ان کی تقریر بہت "کھڑکے دڑکے" والی تھی۔ انہوں نے اس تقریر کو "منشور قہقہہ" کا نام دیا اور ہمیں اس تقریر کا یہ حصہ خصوصاً بہت دلچسپ لگا جس میں انہوں نے ڈاکٹروں کے حوالے سے بتایا کہ مسکراہٹ چہرے کے تین عضلات کو متاثر کرتی ہے۔ معمولی ہنسی سینتیس عضلات کو اور بھرپور قہقہہ اسی عضلات کو متاثر کرتا ہے۔ ایک فزیالوجسٹ کا کہنا ہے کہ قہقہہ جسم میں ایسا مادہ پیدا کرتا ہے جو جسم کی کارکردگی کو توانائی بخشتا ہے۔ نریندر لوتھر نے بتایا کہ پچھلے دنوں اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اینڈر نامی ایک لڑکا ورجینیا (امریکہ) میں بغیر دماغ کے پیدا ہوا وہ رو تو سکتا تھا لیکن ہنس نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو دماغ کی ضرورت ہنسنے یا مسکرانے کے لیے ہے۔

ڈاکٹر آنند راج ورما نے کانفرنس کی کارروائی چلائی۔ طالب خوندمیری نے شکریہ ادا کرنے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا۔ واضح ہے کہ اس نوعیت کی پہلی کل ہند کانفرنس مجتبیٰ حسین کی تحریک اور بھارت چند کھنہ، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، مدیر شگوفہ سید مصطفیٰ کمال، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ وغیرہ کے تعاون سے ۱۹۶۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اور آج اس کانفرنس نے ایک عظیم الشان بین الاقوامی تقریب کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے سلسلے میں بتانے کی ایک بات یہ ہے کہ اس کی ساری کارروائی انگریزی میں ہوئی یعنی اردو ہندی دونوں کو لال جھنڈی دکھا دی گئی۔ حاضرین کے RESPONSE سے بھی اندازہ ہوا کہ انگریزی ان کے گھر کی لونڈی ہے بلکہ بعض کو بولتے دیکھ کر پتہ چلا کہ وہ اس کے ساتھ سلوک بھی لونڈیوں والا ہی کرتے ہیں خیر یہاں تو انگریزی کا راج چلنا ہی تھا کیوں کہ یہ بین الاقوامی کانفرنس تھی اور یوں انگریزی نے یہاں رابطے کی زبان کا کام انجام دیا لیکن حیدرآباد میں سات دن قیام کے دوران انگریزی کی بالادستی کے اور بھی بہت سے نمونے نظر آئے۔

ایک نہایت دلچسپ آئٹم کا ذکر تو میں بھول ہی گیا یہ پروگرام کے دوران کلکتہ کے مائم آرٹسٹوں شنکر داس گپتا اور نرنجن

گوسوامی نے کوئی لفظ ادا کئے بغیر محض جسمانی حرکات و سکنات سے مزاحیہ آئٹم پیش کئے یہ دونوں آرٹسٹ بہت شہرت کے مالک ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے اختتام پر مختلف زبانوں کے مزاح نگاروں کے الگ الگ گروپ بنا کر ان کے کنوینر مقرر کردیئے گئے تھے تاہم یہ داستان ہم ذرا تاخیر سے بیان کریں گے کیوں کہ ایسا ہونے میں ویسے بھی تاخیر ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سائیں مہمانوں سے مشتاق ملاقات میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے اور ان کے علاوہ مندوبین تھے جو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے یعنی معانقہ کر رہے تھے۔ ریڈیو ٹیلویژن والے الگ تھے۔ جو مندوبین سے کانفرنس کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھ رہے تھے۔

ایک ٹیلی ویژن کیمرے کی روشنی مجھ پر پڑی اور پھر ایک مائیک میری طرف بڑھا "کانفرنس کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنی نوعیت کی بالکل منفرد کانفرنس ہے اور شاید اتنے بڑے پیمانے پر پوری دنیا میں پہلی بار ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے منتظمین کو اس کانفرنس کے انعقاد پر جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے!"

"آپ اور سید ضمیر جعفری کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی کانفرنسیں دونوں ہمسایہ ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟"

میرے خیال میں اس قسم کی کانفرنسیں باہمی محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیتی ہیں تنگ نظری کی بجائے کشادہ دلی پیدا کرتی ہیں۔ اور اس عالمی مزاح کانفرنس سے یقیناً دلوں کی کدورتوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی تاہم میرے خیال میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے مزاح سے زیادہ سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔"

اور اب ٹیلی ویژن کیمرہ سید ضمیر جعفری پر تھا۔ ضمیر صاحب نے اپنے تاثرات ریکارڈ کرواتے ہوئے پہلے تو کانفرنس کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انہوں نے ہماری جو عزت افزائی کی یہ دراصل ہمارے ملک کی عزت افزائی ہے۔ ضمیر صاحب نے زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس کو ایک عظیم الشان تجربہ قرار دیا اور کہا کہ یہ اپنی نوعیت کی واحد کانفرنس ہے جس میں چھوٹے بڑے سب ہی ملکوں کے مزاح نگار ایک ہی گھاٹ پانی پی رہے ہیں۔

اس اثناء میں سامعین اسٹیج پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے مندوبین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین مندوبین کو ان کے گھیرے سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ اس ہال میں مندوبین کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے لیے ان کے علیحدہ مل بیٹھنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ایک نوجوان کے چہرے پر داڑھی اور عینک تھی۔ ناٹا سا قد اور سانولا سا رنگ تھا میرے پاس آئے اور گرمجوشی سے بغلگیر ہو گئے۔ یہ مسیح انجم تھے۔ میں نے حیدرآباد سے سید مصطفےٰ کمال کی زیر ادارت پابندی سے شائع ہونے والے "شگوفہ" میں ان کے شگفتہ مضامین پڑھ رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے احباب کے گھیرے میں سے نکالتے ہوئے کہا "اس طرح تو آپ شام تک یہیں کھڑے رہیں گے میں اس کانفرنس میں شریک اردو کے ادیبوں کا کنوینر ہوں چلئے آپ کو باقی مندوبین سے ملواتا ہوں" اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے یہ قہقہہ اپنی آنکھوں سے مسیح انجم کے حلق سے نکلتے دیکھا تھا مگر مسیح انجم کے چہرے پر اس کے کوئی "آثار" نہ تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوع کا قہقہہ دراصل مسیح انجم کا "تکیۂ کلام" ہے۔ پیشتر اس کے کہ پرخلوص مسیح انجم مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوتے میرے سامنے سید مصطفےٰ کمال کھڑے تھے سانولے سے چہرے پر عینک اور مسکراہٹ سجائے ہوئے اور پھر میں نے سات دن تک سخت افراتفری کے عالم میں بھی انہیں اسی طرح مسکراتے دیکھا۔ سید مصطفےٰ کمال خدا کرے تم ساری عمر اسی طرح مسکراتے رہو اور لوگوں کے چہروں پر اسی طرح مسکراہٹیں بکھیرتے رہو۔ اور اب ان سے ملیں یہ ڈاکٹر بیگ احساس ہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرار،

کرشن چندر پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے کتنے ہی انکشافات کر ڈالے مثلاً یہ کہ ابوالکلام آزاد کی طرح کرشن چندر کی جائے پیدائش بھی وہ نہیں ہے جو وہ بتاتے ہیں۔ یا یہ کہ برصغیر کے ممتاز انشاء پرداز رشید صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی سے شادی کے لیے کرشن کے مسلمان ہونے کا افسانہ بس افسانہ ہی ہے اور یہ بھی کہ بیگ احساس کوشش کے باوجود وہ نکاح نامہ نہ دیکھ سکے جو سلمیٰ صدیقی کے بقول ان کی والدہ کے پاس موجود ہے۔ بیگ احساس کے ساتھ ذہانت علی بیگ ہیں حیدرآباد سے نکلنے والے ہندوستان کے وقیع اردو روزنامہ "سیاست" کے سب ایڈیٹر۔ دونوں خوبصورت نوجوان اور دوسرے سب دوستوں کی طرح محبت سے لبالب بھرے ہوئے۔ اور اب میں حمایت اللہ سے مل رہا ہوں یہاں کے "منے تنے" مزاحیہ شاعر اللہ جانے وہ واقعی اتنے نہیں ہیں جتنے نظر آتے تھے یا آج اس کانفرنس کے لیے خصوصی اہتمام کر کے آئے تھے۔ طنز و مزاح کانفرنس کی بھاری ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر بھی ہیں۔ جو بہرحال ناتواں کندھے نہیں ہیں۔ اور لو مجتبیٰ حسین بھی یہیں مل رہے ہیں موصوف کل شام کو حیدرآباد پہنچے اور ملاقات اس ہجوم میں ہو رہی ہے۔ ابراہیم جلیس اور محبوب حسین جگر کے اس "برادرِ خورد" سے میری غائبانہ دوستی ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی جب احمد حسن حامد کی دہلی یاترا کے دوران اس نے اپنی کتابیں اور سلام میرے لیے بھجوایا تھا۔ اس کے بعد جب مجھے دو دفعہ بھارت جانے کا اتفاق ہوا تو پے در پے اتنی طویل ملاقاتیں ہوئیں کہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے۔ اس دوران میں نے ایک چھوٹے سے قد کے بنگالی نوجوان کو دیکھا۔ یہ کون ہیں؟ یہ بنگلا دیش کے خوندکر علی اشرف ہیں اتنی محبت سے بغلگیر ہوئے کہ سب گلے شکوے جاتے رہے۔ اور یہ "طنز و مزاح گھر" بلغاریہ کے ڈائریکٹر مسٹر اسٹیفن ہیں۔ ان کے ساتھ خوبصورت قد و خال والی مس گیلینا ہیں۔ ان کا تعلق بھی بلغاریہ کے "ہاؤس آف ہیومر اینڈ سیٹائر" سے ہے آنے والے سات دنوں میں جو مزاح نگار اس خوبصورت قد و خال والی مس گیلینا کو دیکھتا تھا بے بس ہو جاتا تھا روسی مزاح نگار مسٹر آندرے بھی یہاں "گوا چی ہوئی گاں" کی طرح پھر رہے ہیں کیوں کہ گفت و شنید میں زبان آڑے آ رہی ہے۔ انگریزی سے نابلد ہیں گویا "اردو میڈیم" ہیں۔

اب مسیح انجم کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر پہلے ضمیر جعفری کے پاس لے کر جاتے ہیں جو ہجوم عاشقاں میں گھرے ہوئے ہیں اور پھر مجھے ان کی "بینی" پکڑنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مسیح انجم مجھے اور میں ضمیر جعفری صاحب کو تھامے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتر کر ہال کی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھتا ہوں جہاں بھارت کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مزاح نگار پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں اردو کے صف اول کے طنز نگار فکر تونسوی ہیں جنہیں پڑھ پڑھ کر بیسیوں نے قلم ہاتھ میں پکڑنا سیکھا ہے۔ یوسف ناظم ہیں۔ نامور افسانہ نگار جوگندر پال اور ان کی بیگم کرشنا پال ہیں۔ جوگندر پال ہیں، شفیقہ فرحت ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی، جہاں قدر چغتائی، ڈاکٹر حبیب ضیاء، رشید قریشی اور مجتبیٰ حسین ہیں۔ سردار دلیپ سنگھ بھی یہاں ہیں۔ سرداروں جیسے حسن طبیعت کے مالک اردو کے مزاح نگار اور بھارت کے محکمۂ خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری۔ دہلی سے آئے ہوئے ہیں یہاں راج نرائن راز سے بھی ملاقات ہوئی۔ خوبصورت شاعر اور خوبصورت باتیں کرنے والا شخص "آج کل" کا ایڈیٹر ہے اور ان کے علاوہ یہاں کتنے ہی دوست ہیں اردو کے بزرگ مزاح نگار احمد جمال پاشا کی کمی یہاں محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ دوستوں سے گپ شپ ہوتی ہے اور پھر یہ قافلہ چٹکلوں، لطیفوں اور قہقہوں کی رفاقت میں لنچ کے لیے جوبلی ہال کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ جہاں باغ عامہ میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سکھ من حیث القوم ابھی ہنسنے کے موڈ میں نہیں ہیں:

اور یہاں کتنے ہی اور دوستوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے فیشنی داڑھی والے "ہندوستان ٹائمز" کے کارٹونسٹ اور طنز نگار

وشیل اور ٹائمز آف انڈیا کے بکشمی بھاٹیا۔ یہ بکشمی بھاٹیا بڑا مسخرہ نوجوان ہے مندھی ہے فکر تونسوی کے ساتھ پہلا ہور آیا
ا تعارف لاہور میں ہوا تھا بے تکلفی حیدرآباد میں ہو گئی۔ ان کے علاوہ ایک بزرگ تارا سنگھ کامل سے بھی یہیں تعارف ہوا۔ مگر پتہ
ا کہ یہ بزرگ ہم "مبلیّنہ" نوجوانوں سے زیادہ زندہ دل ہے۔ یہ بزرگ بعد کی ملاقاتوں میں لطیفہ گو بھی ثابت ہوا اور لطیفہ ساز
ی! سردار دلیپ سنگھ اور موصوف یعنی سردار تارا سنگھ کامل کانفرنس کے دنوں میں الجبرے اور جیومیٹری کی طرح ساتھ ساتھ رہے۔
لمی عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں پنجاب سے براست کوئی وفد نہیں آیا تھا (متذکرہ دونوں سردار دہلی میں مقیم ہیں) شاید سردار
ن حیث القوم ابھی ہنسنے کے موڈ میں نہیں ہیں کیوں کہ ان کا غصہ فرد نہیں ہوا۔ انفرادی سطح پر ان میں خوش طبعی کا جوہر موجود ہے، مگر
یا تک ان کی آنکھوں میں ویرانیاں سی جھانکنے لگتی ہیں۔

جس ہال (جوبلی ہال) میں ظہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا اس ہال کی تعمیر سلطنت آصفیہ کے آخری تاجدار میر عثمان علی خان نے اپنی
حکومت کے پچیس سال مکمل ہونے پر کروائی تھی چنانچہ یہاں دیواروں پر اس تاریخی واقعے کے حوالے سے بنائی گئی پینٹنگز آویزاں تھیں ان
کے علاوہ میر عثمان علی خان اور دوسرے فرمانرواؤں کی بڑی بڑی تصویریں یہاں لگی تھیں۔

اس دوران کھانے کا نقارہ بجا تو مہمان اپنی نشستوں سے اُٹھے اور ایک بار پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا نان
ویجیٹرین ایک طرف اور ویجیٹرین دوسری طرف لگی میز کی طرف چلے گئے میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ رامپوری ٹوپی پہنے۔ شیروانی اور پاجامے
میں ملبوس ہاتھ میں پلیٹ لیے مجمع چھٹنے کے منتظر ہیں۔ یہ ظ۔ انصاری تھے اردو کے معروف نقاد اور ادیب۔ جن سے اپنے بھی خفا اور
بیگانے بھی ناخوش رہتے ہیں۔۔۔۔ اور ایک چالیس بیالیس سالہ خاتون جن کی ساڑی کا پلو بار بار ڈھلک ڈھلک جاتا تھا اور جو کبھی یقیناً
بہت خوبصورت رہی ہوں گی کیوں کہ آثار یہی بتا رہے تھے، کھانے کے دوران جوگندر پال سے محو گفتگو تھیں۔ یہ بکشمی دیوی تھیں۔ جوگندر پال
نے بتایا کہ یہ حیدرآباد کی تہذیبی اور ادبی زندگی کی جان ہیں۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ یہ یہاں کی کشور ناہید ہیں۔ جوگندر پال کے اس تعارف کے
بعد شوق ملاقات فزوں ہوا۔ مگر بعد میں حیدرآباد والوں کی بے پناہ مہمان نوازیوں نے تفصیلی ملاقات کی حسرت پوری نہ ہونے دی۔

میں کھانے سے فراغت کے بعد ایک صوفے پر جا بیٹھا تھا اور تلگو روزنامہ "آندھرا پربھا" کے سینئر سب ایڈیٹر پی ان سوامی
سے گپ شپ میں مشغول تھا کہ ضمیر جعفری میرے پاس آئے میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ضمیر صاحب سے کہا "چلیں اب واپس اپنے ہوٹل
چلتے ہیں تھوڑا سا آرام کریں گے کیوں کہ رات کو نواب شاہ عالم خاں کے عشائیے میں جانا ہے کہنے لگے بس ذرا کھانا کھا لوں تو چلتے ہیں میں
نے انہیں حیرت سے دیکھا مگر پھر مجھے یاد آیا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں انھوں نے تو ابھی صرف ویجیٹرین کھانا کھایا ہے نان ویجیٹرین کو تو ہاتھ بھی
نہیں لگایا۔ سو ضمیر صاحب حوصلہ افزائی کی غرض سے نان ویجیٹرین میزوں کی طرف بھی گئے۔

قریباً تین بجے سہ پہر واپس ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ضمیر صاحب نے بیگ احساس سے کہا "اگر یہاں کوئی عینکوں کی دوکان ہو تو
کار رکوائیں میری عینک گم ہو گئی ہے۔ اور کل مجھے اردو سیشن میں مضمون پڑھنا ہے" عینکوں کی دوکان پر کھڑے ایک صوفی صاحب نے ضمیر صاحب
کو ہاتھوں ہاتھ لیا مگر معذرت کی کہ عینک ایک دن میں نہیں بن سکتی۔ آپ فی الحال کوئی محدب شیشہ خرید لیں اور اس سے کام چلائیں۔
یعنی بالکل اسی دکاندار کی طرح جس سے گاہک نے بلیڈ مانگا تھا اور دکاندار نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا "معافی چاہتا ہوں جناب بلیڈ تو
نہیں ہے آپ ریگ مال لے جائیں" مگر ضمیر صاحب نے تو واقعی محدب شیشہ خرید لیا۔ گو انہیں اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیوں کہ
حسن عسکری صاحب نے انہیں اپنی ایک اسپیئر عینک مستعار دے دی۔ (جاری)

ڈاکٹر حبیب ضیاء
حیدرآباد

عید

عید کے معنی خوشی کے ہیں۔ عید اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ کسی کو اچانک بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے بے وقت کی عید منائی۔ بہت دنوں تک غائب رہنے کے بعد کوئی آتا ہے تو اسے کہتے ہیں "تم تو عید کا چاند ہوگئے" وقت گذر جانے کے بعد بے موقع کام کریں تو اس کے لیے "عید کے پیچھے ٹر" والی کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔

ماہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی لوگ عید کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ عید کے لیے خریدی جانے والی چیزوں میں سب سے پہلا نمبر کپڑوں کا آتا ہے۔ بعض لوگ سہولت کی خاطر علی الحساب بیس پچیس میٹر کپڑا ایک ہی پرنٹ کا خرید لیتے ہیں صدر خاندان کا شرٹ بنانے کے بعد جو کپڑا بچتا ہے اس میں سلسلہ وار بچوں کی عمر اور قد کے لحاظ سے درزی کو ناپ دے کر چار پانچ جتنے بھی شرٹ درکار ہوں سلوا لیتے ہیں۔ یہی فارمولہ لڑکیوں کے کپڑوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر مختلف گھروں کے شیر خرمے کا ذائقہ چکھنے کے لیے جب یہ یونیفارم والی ٹیم باہر نکلتی ہے تو ہر کسی کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ کثیر العیال دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے ماشاءاللہ نکل جاتا ہے۔ "ہم دو، ہمارے دو" والا دیکھتا ہے تو زبان کو لگام دیئے بغیر پوچھتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ "گھر میں اور کتنے ہیں"؟

عید کی آمد سے قبل زکوٰۃ دینے کے فرض سے بھی سبکدوشی ضروری ہے۔ اکثر لوگ زکوٰۃ کے کپڑے خریدنے کے لیے ایسی دکان تلاش کرتے ہیں جہاں کم سے کم روپیوں میں زیادہ سے زیادہ زکوٰۃ کا ثواب مل جائے۔ "ایک ساڑی کی قیمت میں تین ساڑیاں"۔ ایسے ہی ثواب کمانے والوں کے لیے فروخت ہوتی ہیں۔

عید اور شیر خرما لازم و ملزوم ہیں۔ شیر خرما پینے کی چیز ہے۔ لیکن بعض ماہر پکوان خواتین اس میں سیویوں کے علاوہ گھی، بادام، چرونجی، زعفران اور کھجور اتنی کثیر مقدار میں ملاتی ہیں کہ وہ گاڑھا ہو کر "شیر قورمہ" بن جاتا ہے ہر دفعہ ایک نئی چیز منہ میں آجاتی ہے۔ کبھی چھند کھجور کا بڑا ٹکڑا تو کبھی کشمکش اور کبھی غلطی سے رہ جانے والا ثابت بادام۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر خرما نہیں بلکہ کوئی معجون ہے۔

عید کے دن ہر گھر میں سیویاں ابالی جاتی ہیں۔ سیویوں کا میٹھا بنتا ہے اور سیویوں کا شیر خرما بنتا ہے۔

شیر خرما صرف گھر پر ہی نہیں پلایا جاتا بلکہ اڑوس پڑوس، دوست احباب اور رشتہ داروں کے پاس خاص اہتمام سے بھیجا بھی جاتا ہے۔ مختلف گھروں سے شیر خرمے کے جو حصے آتے ہیں انہیں خالی کرنا اور رکھنا بڑے معرکے کا کام ہے۔ ایک گھر سے آئے ہوئے شیر خرمے میں باریک سیویاں ہوتی ہیں تو ایک میں موٹی۔ ایک میں بیمار چرونجی کی کثرت ہوتی ہے تو ایک میں صحت مند بادام۔ ایک کٹورے میں چمچے کو غوطہ دیں تو اس کی تہہ سے دودھ پیتے ہوئے مست کھجور برآمد ہوتے ہیں تو ایک میں کھوپرا تیرنے کے موڈ میں رہتا ہے۔ سیویوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ ابلی ہوئی بہت ابلی ہوئی بہت زیادہ ابلی ہوئی اور حلوہ نما۔ جیسی بھی ہوں، کھوپرا اپنی رنگینیوں سمیت ضرور موجود رہتا ہے۔ عید کے دن ہوشیار گھریلو عورتیں باورچی خانہ میں دو خالی بگونے رکھتی ہیں۔ مختلف جگہوں سے آنے والے کٹوروں کو ایک بگونے میں اور طشتریوں کو دوسرے بگونے میں انڈیل کر حصہ بھیجنے والے کو شکریہ، سلام اور عید مبارک کہلا بھیجتی ہیں۔ جب انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب کہیں سے حصہ نہیں آئے گا وہ جیتی کے ساتھ اس نورنگ شیر خرمے اور ملٹی کلر سیویوں کے حصے لگانا شروع کر دیتی ہیں۔ اوپر سے اپنے ہاتھ کے تلے ہوئے کاجو اور اپنے ہی ہاتھ سے رنگا ہوا کھوپرا بکھیر دیتی ہیں۔ آن کی آن میں سارے لوگوں سے نبٹ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔

نوکر جتنا پرانا ہوتا ہے مالک کے لیے اتنا ہی عذاب جان بنتا جاتا ہے۔ ایک گھر میں ماما برسوں سے کام کرتی چلی آ رہی تھی۔ پکوان، گھر کی صفائی کے ساتھ ہاتھ کی صفائی میں بھی اسے کامل مہارت تھی۔ مالکن اسے نکال باہر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن جب بھی کوئی چیز چوری جاتی وہ اسے یوں کوستیں۔

"خدا کرے تیرے دیدے گھٹنے پھوٹ جائیں"۔

ماما کو یہ کوسنا یقیناً برا لگتا تھا لیکن چونکہ اس کے ستارے طاقت ور تھے اس لیے اسے کوسا لگتا نہیں تھا۔ ایک عید کے موقع پر اس نے فرمائش کی کہ اسے بالکل ویسی ہی ساڑی چاہیے جیسی مالکن پہننے لگی۔ مالک تو تیار ہو گئے لیکن مالکن کے وقار کا مسئلہ تھا۔ اس کی فرمائش کو انھوں نے ایک ہی لات میں ٹھکرا دیا۔ اس دل جلی نے مالکن کو یوں کوسنا دیا۔

"خدا کرے اس گھر کا شیر خرما پھٹ جائے۔

ماما کے دل سے نکلی ہوئی یہ بددعا سیدھی شیر خرمے کو جا لگی اور سارا کا سارا شیر خرما پھٹ کر "شیر قورمہ" بن گیا۔

کسی گھر میں جب شیر خرما پھٹ کر خراب ہو جاتا ہے تو یہ خبر پاس پڑوس کے گھروں کے علاوہ رشتہ داروں میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ دودھ نہ بھی خراب ہو تو شیر خرما ختم ہونے کے بعد دیر سے آنے والے دوست احباب اور رشتہ داروں کو یہ کہہ کر بہ آسانی ٹالا جا سکتا ہے کہ ہم نے دس لیٹر دودھ کا شیر خرما بنایا تھا مگر سارا پھٹ گیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیر خرما اچھا تو بنتا ہے لیکن ناسازگار حالات میں بعد میں خراب ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ایسا ہی ناخوشگوار واقعہ

پیش آیا۔ ایک بڑے افسر کی زیر نگرانی ایک ہی احاطہ میں دو مختلف ادارے تھے۔ دونوں اداروں والوں نے عید کی خوشی منانے کے لیے شیر خرما لانے کا بطور خاص اہتمام کیا۔ ایک ادارے والے خوشی خوشی اپنے افسر کو مدعو کرنے پہنچے۔ پتہ نہیں اس دن افسر کا موڈ خراب تھا یا کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے ماتحتین کو بُری طرح ڈانٹ دیا کہ میری اجازت کے بغیر تم لوگوں کو ادارے کے احاطے میں شیر خرما لانے کی ہمت کیسے ہوئی۔ اطاعت گزار ماتحتین انتہائی دل شکن ہو کر لوٹ گئے۔ کسی نے بات کا یوں بتنگڑ بنایا کہ افسر کی اجازت کے بغیر دوسرے بھی شیر خرما نہیں پی سکتے۔ شیر خرما کسی نے نہیں پیا۔ افسر صاحب ادھر ڈانٹ پلا کر ادھر شیر خرما پینے چلے گئے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں سارا شیر خرما چھٹ چکا تھا۔

نتیجہ: کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا!

عید کے دن شیر خرما کے علاوہ عیدی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عیدی دینے والے اپنی استطاعت اور لینے والے کی حیثیت دیکھ کر عیدی دیتے ہیں۔ اکثر والدین عید کی آمد سے ایک ماہ قبل اپنے بچوں کو با قاعدہ تربیت دیتے ہیں کہ جو بھی ملنے آئے خواہ وہ دور کا رشتہ دار ہو یا قریبی دوست، ضد کرکے زبردستی عیدی وصول کریں۔ اور جب تک اس کا ہاتھ جیب کا رخ نہ کرے اس کا شیر خرما حرام کردیں۔ اس جرمانے سے ڈر کر لوگ آنے والی عید کے لیے ان گھروں پر سرخ خطرے کا نشان لگا دیتے ہیں۔

ایک نئے پیش امام کو عید کی نماز سے قبل ایک بڑا مجمع ہاتھ آیا۔ انھوں نے موقع کو غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔

"آج آپ نماز پڑھنے آئے ہیں مگر آپ کا دل کہیں اور ہے۔ آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جلدی سے سجدے مار کر کسی سینما کا رخ کریں گے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اتنا بڑا مجمع پھر کبھی نہیں ملے گا۔"

انھوں نے بہت ہی موثر انداز میں حاضرین کے حال پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے آنے والے کل سے ہوشیار کیا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا:

آج آپ نہا کر نئے کپڑے پہن کر خود سے چل کر یہاں آئے ہیں۔ کل آپ کو نہلا کر کفن پہنا کر چار آدمیوں کے کندھوں پر لایا جائے گا۔ آج آپ یہاں سے خوشی خوشی گھر واپس جائیں گے۔ کل آپ کو یہاں سے شہر خموشاں لے جایا جائے گا۔ آج آپ نے اپنے جوتوں کی ڈوریاں اپنے ہاتھوں سے باندھی ہیں کل دوسرے لوگ آپ کے انگوٹھے باندھیں گے ــــــــ"

اس کے بعد وہ ان نوجوانوں سے مخاطب ہوئے جو چست لباس پہن کر آئے تھے۔ ان کی عید کی خوشیاں امام صاحب نے اس طرح ملیامیٹ کیں:

"آج کے نوجوان فیشن پرستی میں گم ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج آپ اپنے والدین کے منع کرنے پر بھی ایسا لباس پہن کر یہاں آئے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کل آپ کو سفید ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کر یہاں لایا جائے گا"ــــــ

بہرحال اس وعظ کے سننے کے بعد لوگوں کا موڈ بن گیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو تیار کرلیا کہ اس سال تو یہاں سے نکل کر دوست احباب کے پاس جائیں گے ۔ آئندہ سال ہوسکتا ہے دوست احباب پھول نچھاور کرنے آئیں گے ۔
وعظ ختم ہوتا ہے لوگوں کی پریشانی بھی ختم ہوتی جاتی ہے ــــ اس دوران کسی کی جیب خالی ہوئی تو کسی کا جوتا غائب ہوا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے، چلتا رہے گا۔ سب خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں ــــ عورتیں سج دھج کر تیار رہتی ہیں۔ انعام کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ رنگ برنگی کشتی پوش پڑی ہوئی کشتیاں ایک گھر سے دوسرے گھر لے جائی جاتی ہیں۔ سڑکوں پر، گلی کے نکڑوں پر لوگ انتہائی گرم جوشی سے گلے ملتے اور عید کی مبارکباد دیتے نظر آتے ہیں ۔
بہرحال عید کے دن کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے ۔ خدا کرے یوں ہی عید ہر گھر آئے اور ہر سال اپنی بہاریں لٹاتی رہے ــ

●●

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

امتحان

کہتے ہیں زندگی کا دوسرا نام امتحان ہے۔ زندگی کے ہر قدم اور ہر مرحلہ پر ایک امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں امتحانوں کی شروعات تعلیمی میدان سے ہوتی ہے۔ تعلیمی امتحان کردار اور قابلیت کا امتحان ہوتا ہے جو انسان کی زندگی کی بنیاد بنتے ہیں۔ ماضی میں تعلیم حاصل کرنا اور امتحان دینا ایک مقدس فریضہ تھا۔ استاد کی بارگاہ میں زانوئے ادب تہہ کرکے عقیدت کے ساتھ علم حاصل کیا جاتا تھا۔ آج زندگی کے اقدار بدل چکے ہیں۔ طالب علموں نے TUDY AND STRUGGLE کا نعرہ وضع کرلیا اور پڑھائی کے ساتھ جدوجہد کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ہمارے خیال میں آج طالب علم صرف جدوجہد ہی کرتے ہیں۔ امتحان پاس ہونے کے لیے تو جہاد کرتے ہیں۔ پڑھنے کے لیے آج طالب علم کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ تعلیمی سال کے ابتدائی حصہ میں داخلہ کا حصول، فیس معاف کرواتے، اور پھر ہڑتال کرتے ہیں۔ ہڑتال کے لیے مختلف موضوعات رہتے ہیں۔ کتابوں اور کاپیوں کی قیمتوں میں اضافہ، بسوں کے کرایہ میں اضافہ، پولس ظلم، سماجی ناانصافیاں وغیرہ وغیرہ۔ ہڑتال ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات ہوتے ہیں۔ انتخابات کی گڑبڑ سے اکثر اسکول، کالج بند ہوجاتے ہیں۔ اور جو اسکول کالج بند نہیں ہوتے، وہاں انتخابات کے بعد چند طالب علم ایجوکیشنل ٹور پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ بقیہ طالب علم چھٹیاں مناتے ہیں۔ ان مصروفیات کے علاوہ ہمارے شہر میں وقتاً فوقتاً کرفیو کے نفاذ سے بھی چھٹیاں ملتی ہیں۔ ہمارے شہر کے طالب علموں کو وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ پڑھ کر امتحانات دیں۔ امتحانات کے دوران "محبت، جنگ اور امتحانات میں سب کچھ جائز ہے" طالب علم نقل سے پرچہ تک اُوٹ کرتے ہیں اور جب یہ نہیں کرپاتے تو امتحانات کا بائیکاٹ ضرور کرتے ہیں۔

آج ہمارے شہر میں امتحان کی تیاری کے انداز بدل چکے ہیں۔ کوئی طالب علم پڑھتا دکھائی نہیں دیتا۔ نوٹس تیار کرنے کی فکر کسی کو نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف ہمارے شہر کے طالب علم خوب کھا پی کر اپنا وزن بڑھاتے ہیں۔ ورزش کرتے اور کراٹے اور جمناسٹک سیکھتے ہیں۔ داڑھی مونچھ اور سر کے بالوں کو بے تحاشہ بڑھاتے ہیں۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ ہردم لڑائی جھگڑے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ قصہ مختصر، طالب علم امتحان سے پہلے خوفناک نظر آنے کی کوشش

کرتے ہیں تاکہ نگراں کاران کے قریب نہ آئیں۔ اب آپ سے کیا چھپائیں امتحانوں کے دوران ہم اپنے لڑکے سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ دبے الفاظ ہی میں اسے نقل سے باز رہنے کے لیے نصیحت تو کجا وصیت کرنے کی بھی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔ امتحانوں کے دوران ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کا انتخاب کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ نوٹس اور گائیڈس چھپا سکیں ہمارے ایک موٹے دوست ہیں۔ امتحانوں کے دوران ہر کوئی ان سے کپڑے مانگنے آتا ہے۔ امتحان سے قبل طالب علم قلم کے ساتھ کھٹکے والی رام پوری چاقو بھی خریدتے ہیں تاکہ چاقو کے زور پر قلم چلا سکیں۔ امتحان ہال جاتے ہوئے متعلقہ مضمون کی گائیڈ خریدتے ہیں۔ ہمارے شہر میں مضامین کی کتابوں سے زیادہ انکی گائیڈس بکتی ہیں۔ ہر مضمون کی شرح چھوٹی سے چھوٹی سائز میں دستیاب ہیں، پاکٹ گائیڈ، منی گائیڈ، حتی کہ نیفے میں چھپانے کے لیے گائیڈ بھی شہر کے بازار میں ملتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب امتحان ہال میں نقل کرنا بڑی معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ نقل کرنے کے لیے جتن کیے جاتے تھے۔ جواب چھوٹی پرچیوں پر باریک قلم سے احتیاط کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ نقل کی پرچیوں کو چھپا کر امتحان ہال میں لے جایا کرتے تھے۔ ڈرتے ہوئے نقل کرتے تھے، پکڑے جانے پر بے عزتی کے ساتھ امتحان ہال کے باہر کر دیے جاتے تھے لیکن جناب آج ہمارے شہر میں دھڑلے کے ساتھ نقل کی جاتی ہے۔ کئی گھنٹے برباد کر کے اور آنکھیں خراب کر کے باریک خط میں چھوٹی پرچیوں پر لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امتحان ہال میں طالب علم گائیڈ کتابیں اور نوٹس جیبوں میں بھر کر لے جاتے ہیں۔ امتحان ہال میں کھلے عام نقل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے جوابات لکھواتے ہیں۔ نگران کار بے بسی سے کسی کونے میں کھڑے امتحان ہال سے باہر خلا میں گھورتے رہتے ہیں۔ جیسے ماضی کو تلاش کر رہے ہوں۔ اگر کوئی نگراں کار ہمت کر کے نقل سے منع کرتا ہے تو پھر اس بے چارے کی خیر نہیں۔ باہر نکلنے کے بعد اسے دیکھ لیا جاتا ہے۔ امتحان ہال میں اس طرح کی "نقلِ عام" کو روکنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جاتے ہیں۔ امتحان ہال میں داخلہ سے پہلے طالب علم کی مکمل جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ نگراں کار کے علاوہ مختلف دستے تشکیل دیئے جاتے ہیں "سٹنگ اسکواڈ" نامی دستہ ایک مقام پر ٹھہر کر نقل کرنے والوں کو پکڑتا ہے۔ فلائنگ اسکواڈ دستہ ایک سے دوسرے مقام کو گھومتے ہوئے طالب علموں کو نقل سے روکتا ہے۔ نقل کرتے ہوئے پکڑے جانے پر طالب علموں کو چند سال کے لیے معطل بھی کیا جاتا ہے۔ ہمیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج ہمارے شہر میں امتحان کا انعقاد جنگی بنیادوں پر ہونے لگا ہے۔ ہمارے شہر میں طالب علم خارجی مدد کو ہم خارجی مدد کہتے ہیں۔ خارجی مدد کے لیے طالب علم باہر سے کی جانے والی مدد کو ہم خارجی مدد کہتے ہیں۔ خارجی مدد کے لیے طالب علم کے عزیز و اقارب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ امتحان سے پہلے امتحان ہال کے محل وقوع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پلاننگ ہوتی ہے۔ کس طرح اور کیسے پرچے کو ہال سے باہر اسمگل کیا جائے اور پھر باہر سے حل کیا ہوا پرچہ درآمد کیا جائے۔ امتحان شروع ہوتے ہی پرچہ باہر آجاتا ہے۔ پرچہ حل کرنے کے لیے ماہرین امتحان ہال کے قریب مقام کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماہرین سے پرچہ حل

کرواکے یا پھر گشت یا اقساط میں پرچہ طالب علم کے پاس پہنچایا جاتا ہے۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جنہوں نے پیر کی ہڈی تڑواکر اپنے بچے کو ساتویں جماعت کا امتحان کامیاب کروایا ہے۔

نقل کے لیے بھی عقل چاہیے۔ گائیڈس، نوٹس اور کتابوں کے ساتھ اٹھنے اور خارجی امداد کے باوجود بعض طالب علم نقل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ایک نگران کار نے ہمیں یہ واقعہ سنایا۔ امتحان ہال میں "نقل عام" ہورہی تھی۔ ایک طالب علم گائیڈ کھولے ناخن کاٹ رہا تھا۔ سبب دریافت کرنے پر اس نے کہا گائیڈ میں جواب نہیں مل رہا ہے صاحب موصوف نے اسے جواب تلاش کرکے دیا۔ لیکن کچھ دیر بعد طالب علم پھر سے ناخن کاٹنے لگا۔ اس مرتبہ پوچھنے پر اس نے بتلایا نشان کھو گیا ہے۔ آپ پھر سے جواب بتلائیے۔

امتحان کا ڈر اور خوف، پرچہ سوالات سے قائم تھا۔ امتحان ہال جانے سے پہلے دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ من پسند سوالات آئیں۔ پیسے خیرات کیے جاتے تھے۔ نگران کار کو دیکھتے ہی وظیفے کا ورد شروع ہوجاتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے پرچہ لیتے۔ اکثر ہاتھوں کے طوطے اڑجاتے تھے۔ آج ہمارے شہر کے طالب علموں کو امتحانی پرچے کا کوئی خوف نہیں ہے طالب علم امتحانی پرچہ کو وقت سے پہلے "آوٹ" کرلیتے ہیں۔ امتحانی پرچہ امتحان ہال کے بجائے وقت سے پہلے افشا ہوکر طلبا برادری میں گشت کرنے لگتا ہے۔ طالب علم پرچہ خرید کر خود اعتمادی سے امتحان ہال میں سوالات حل کرتے ہیں۔ ہمارے شہر نے پرچہ آوٹ کرنے کی ایک تاریخ بنائی ہے۔ چند سال قبل میٹرک کے امتحان کا آوٹ کیا ہوا ایک پرچہ شہر کے مشہور روزنامہ میں چھپ چکا ہے۔ طلبا برادری نے اخبار کے اس جذبہ خیر سگالی کو ناظم امتحانات اور محکمہ تعلیمات کے احسان مند رہے۔ جنہوں نے اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی پرچہ کو منسوخ نہیں کیا۔

وہ زمانہ بیت گیا جب امتحان کا موسم طلبا کے لیے وبال جان ہوا کرتا تھا۔ امتحان کے ڈر سے کسی کو نزلہ تو کسی کو دست آتے تھے۔ پڑھائی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے طالب علم روتے تھے۔ نتیجہ کے خوف سے بھوک مٹ جاتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے دبلے ہوجاتے تھے۔ آج یہ سلسلہ الٹ چکا ہے۔ امتحان کے موسم میں طالب علم عیش کرتے ہیں۔ نتیجہ سے بےفکر خوب کھا پی کر وزن بڑھاتے ہیں۔ جبکہ استادوں کی حالت امتحان کے موسم میں قابل رحم ہوتی ہے۔ اکثر اساتذہ ممتحن اور نگران کار بننے سے بچنے کے لیے بیمار بن جاتے ہیں۔ بعض اساتذہ حقیقتاً خوف کی وجہ سے بیمار بھی ہوجاتے ہیں۔ ہم ایک استاد کو جانتے ہیں جو سال بھر بھلے چنگے رہتے ہیں لیکن اپریل اور مئی کے مہینوں میں بخار، کھانسی، ست، دردِ شکم اور بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر علاج کرکے تھک جاتے ہیں۔ جون کے مہینے میں امتحانات ختم ہوتے ہیں۔ جناب کی صحت بھی بہتر ہونے لگتی ہے۔ ایمان کی بات ہے صاحب زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ جب طالب علم چاقو، چھری، بندوق لے کر امتحان دینے جائیں گے تو اساتذہ کی جان پر بن آئے گی۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی بوکھلاہٹ امتحانی پرچوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ غیر نصابی سوالات پوچھنا

عام شکایت ہے غلط سوالات بھی پوچھتے ہیں ۔ اُردو زبان کے پرچے تو بس جناب غلطیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں ۔

ہمارے شہر میں امن قائم رکھنے کے لیے پولس عبادت گھروں اور اسکولوں اور کالجوں پر بندوبست کرتی ہے ۔ اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات اور امتحانات کے دوران اسکول اور کالجوں کے پاس پولس کا پہرہ مزید سخت کردیا جاتا ہے ۔ پولیس اسکول اور کالج کا محاصرہ کرلیتی ہے ۔ اطراف میں کسی کو ٹھہرنے نہیں دیا جاتا ۔ باہر سے مدد کرنے والوں کو تعاقب کرکے بھگا دیا جاتا ہے ۔ کالج کے پاس ایک استاد کو ہم نے پولس والے سے کہتے ہوئے سُنا ۔ بھائی آپ لوگ خوش قسمت ہیں ۔ امتحان ہال میں آپ کا داخلہ ممنوع ہے ۔ حفاظت خود اختیاری کے لیے آپ کے پاس ہتھیار اور قانون ہے جبکہ ہمیں نہتے طلبار کی نگرانی کرنا پڑتا ہے ۔ انہیں نقل سے باز رکھنا بھوکے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے ۔" امتحانات کا انعقاد اگر طالب علموں کے حسب منشا ہوا تو امن و سکون قائم رہتا ہے ۔ ورنہ برہم طلبار امتحانی پرچہ اور جوابی بیاضات کو پھاڑ کر ممتحنوں کی پٹائی کرکے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اسکول ، کالج سے باہر آکر "چھرا" کرنے لگتے ہیں ۔

چند دن قبل ہمارے ایک دوست نے کہا تھا " موجودہ طریقہ امتحانات میں زبردست تبدیلیوں کی ضرورت ہے ۔" ہمارے خیال میں امتحانات سے پہلے نظام تعلیم میں اصلاح درکار ہے ۔ ہمارے شہر میں نظام تعلیم ایک امتحانی دور سے گذر رہا ہے بلکہ شروع ہی سے امتحانی دور چل رہا ہے ۔ مختلف دور میں مختلف فارمولے اپنائے گئے ۔ کبھی گیارہ جمع دو جمع دو تو کبھی گیارہ جمع ایک جمع تین اپنایا گیا ۔ ان دو فارمولوں کے ناکام رہنے پر دوبارہ جمع تین فارمولہ آزمایا گیا ۔ آج کل دس جمع دو جمع تین فارمولہ چل رہا ہے ۔ اسی طرح امتحانات کے لیے بھی کئی طریقے اپنائے گئے ۔ کبھی ماہواری ، سہ ماہی ، ششماہی اور سالانہ امتحانات ہوئے تو کبھی ٹرائی مسٹر اور سمسٹر طریقہ رائج رہا ۔ کہیں انٹرنل اسسمنٹ ہے تو کہیں نتائج بالکلیہ ایک امتحان پر تکیہ کرتے ہیں ۔ نظام تعلیم اور طریقہ امتحانات میں موجودہ الجھنوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہم گریجویشن کے لیے پندرہ جمع صفر کا فارمولہ پیش کرتے ہیں ۔ صفر سے ہماری مراد امتحان ہی منعقد نہیں کرنا ہے ۔ آج کل جس اہتمام سے امتحان منعقد کیے جاتے ہیں اسے دیکھتے ہوئے بہتر ہے کہ کوئی امتحان ہی منعقد نہ کیا جائے ۔ پندرہ سال تعلیم دی جائے ، بچہ جوان ہونے کے ساتھ گریجویٹ اور رائے دہی کے قابل بھی ہوا ۔

ادارہ دی کلچرل اکیڈمی ، گیا ، "آہنگ" اور "مورچہ" سے اب نثار احمد صدیقی کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے ۔ اس ادارہ سے ہمدردی رکھنے والے اور تجارتی تعلق رکھنے والے نوٹ کرلیں ۔

—— کلام حیدری

پاگل عادل آبادی۔ غزل

اُس نے کیا مذاق میری عاشقی کے ساتھ — وعدہ کبھی کے ساتھ تو شادی کسی کے ساتھ

کنگال اس نے کردیا کس سادگی کے ساتھ — چلّہ بھی صاف کرگیا وہ لوٹ ہی کے ساتھ

وہ جس کو دیکھتے ہی نکلتا تھا میرا دَم — آخر کو میری شادی ہوئی ہے اُسی کے ساتھ

زلفوں کو میری دیکھ کے کرتے ہیں دوستو — میرا شمار بھی وہ کسی چھوکری کے ساتھ

وہ اور ہوں گے جن کو ملیں روز مرغیاں — اپنی تو عمر کٹ گئی باسی کڑی کے ساتھ

جوڑی کو میری دیکھ کے پھبتی کسی گئی — بیٹھا ہوا ہے ریچھ بغل میں پری کے ساتھ

جنّت کی حور کو بھی نہ ڈالیگا گھاس وہ — تو جس کو ہوگیا ہو کسی چھپکلی کے ساتھ

مُنڈن ہو یا ولیمہ جمعہ گی یا فاتحہ — دعوت بغیر شیخ چلے فیملی کے ساتھ

گر لُوٹنا ہو اِن دلوں تم کو مشاعرے — کچھ موسیقی بھی سیکھیے اس شاعری کے ساتھ

دولت ملی تو کیا ہوا فطرت تو ہے وہی — پیتا ہے ٹی سُوپ" اب بھی وہ باسی کڑی کے ساتھ

پاگل ہوا ہوں جس کی محبت میں دوستو
وہ ہوگیا فرار کسی مولوی کے ساتھ

○

سراج نرملی۔ غزل

○

بتاؤں یہ رُت کیوں سہانی نہیں ہے
ترا حُسن، میری جوانی نہیں ہے

کوئی اس کا ہوٹل میں ثانی نہیں ہے
ہوا کیا؟ اگر خاندانی نہیں ہے

اسے خود سے کمتر سمجھنا نہ بیگم
یہ پہلے تھی — اب نوکرانی نہیں ہے

اجی چھوڑیئے، کون مرتا ہے کس پر؟
یہ ناول یا فلمی کہانی نہیں ہے

گئی ہے وہ میکے، اِدھر ہم ہیں بے کل
ہمارے نواسوں کی نانی نہیں ہے

منسٹر بھی لیتا ہے، لاکھوں کی رشوت
ڈکیتی ہے یہ، حکمرانی نہیں ہے

کہے گا یہی جو بھی دیکھے گا تجھ کو
تو بارہ نواسوں کی نانی نہیں ہے

کم از کم مجھے ایک ٹی وی تو دے جا
مرے پاس تیری نشانی نہیں ہے

ہے امپورٹیڈ وائف سے نائف تک سب
کوئی مال ہندوستانی نہیں ہے

پُرانے زمانے میں تھی یار! اب تو
"کہیں بھی وفا کی نشانی نہیں ہے"

ہوئے دس برس بھی سراج! اسکو لکھ کر
ہے تازہ غزل یہ پُرانی نہیں ہے

○

شاداب بے دھڑک مدراسی

کیروسین کا پیام جہیز والوں کے نام

راشن کی ہر دوکان پہ میری قطار ہے
گھر گھر کی چولھا چکّی پہ میری بہار ہے
چاہوں تو میں سنوار دوں منشائے زندگی
بگڑوں تو پھونک ڈالوں میں دنیائے زندگی
اچھے بُرے سبھی مجھے رکھتے ہیں ساتھ میں
بلوؤں میں، خون خرابے میں شادی برات میں
ڈھائے کئی فساد مرے انتقام نے
بھوپال گیس کچھ بھی نہیں میرے سامنے
اخبار میرے ذکر سے خالی نہیں ہے آج
میرے بغیر عید و دیوالی نہیں ہے آج
میں حل بڑا اہم آج کئی مسئلوں کا ہوں
اِک آبروِ غریب کی غمِ دِل جلوں کا ہوں
اس وقت میرے آگے ہے سلمیٰ کی رخصتی
بوڑھے نڈھال باپ کے ارماں کی رخصتی
اسباب شادی خانہ میں ٹی وی فریز ہے
ویسپا ہے گھوڑے جوڑے ہیں ہر ایک چیز ہے
سب کچھ جہیز میں ہے مگر کیوں نہیں ہوں میں
جس سمت ہو تباہی ادھر کیوں نہیں ہوں میں
سُن لو اے نوجوانو! قضا کی پکار ہوں
ساماں ہوں خودکشی کا دُلہن کا وقار ہوں

قطعہ

لڑکی بھی دیں جہیز بھی دیں؟ خُسر نے کہا
میں نے کہا حضور یہ ضد کتنا فضول ہے
لڑکی کو آپ شوق سے رکھ لیجیے اپنے پاس
ہم کو تو بس جہیز ہی دے دیں قبول ہے!

ساجد زیدپوری

قطعہ

مسّے کی کیا بساط کسی تِل کے سامنے
افسانہ کون پڑھتا ہے ناول کے سامنے
میں تو کروں گی بیاہ وہ انجنیر تو ہے
اماں ہیں کون چیز مرے دل کے سامنے

غزل

(محترم جاں نثار اختر سے معذرت کے ساتھ)

ہر ایک بات پہ اس کی اُچھل گیا ہے میاں
کڑی تھی بیوی جبھی تو سنبھل گیا ہے میاں
ہزاروں عشق کے چکر میں پڑ چکا تھا مگر
وہ دیکھو اب تو شرافت میں ڈھل گیا ہے میاں
وہ جا رہا تھا کہیں راستے میں دیکھ لیا
وہ ایک چہرہ کہ جس پر مچل گیا ہے میاں
مجال اس کی نہیں اب کسی کا جیکر ہو
مسز کی بات سے اتنا دہل گیا ہے میاں
ہزاروں خواہشیں اس کی پڑی ہیں لاوارث
کلوٹی بیوی پہ ایسا پھسل گیا ہے میاں
لڑی جو بیوی تو ایسا کرشمہ دکھلایا
خود اپنے گھر سے اکیلا نکل گیا ہے میاں

بانو سرتاج چندرا پور

داستانِ نشان ہائے رنگارنگ

"بائی! آپ کس کو ووٹ دیں گی؟ سبزی والی نے بیگن تولتے ہوئے ہم سے پوچھا۔
انتخابات قریب تھے۔ ہر گلی، ہر چوک میں انتخابات کا چرچا تھا۔ تعلیم یافتہ، جاہل، جاہل مطلق، برسرِ روزگار .... بے کار .... مرد عورت .... بچے .... سب کے پاس گفتگو کا ایک موضوع تھا .... انتخابات — اس لیے ہماری سبزی والی نے انتخابات پر چرچا کرنی چاہی تو ہمیں چنداں حیرت نہ ہوئی۔ آج ویسے بھی وہ کافی فرصت میں نظر آتی تھی۔ ورنہ اکثر تو اتنی عجلت میں ہوتی کہ سبزی وزن کے ہم پلّہ بھی نہیں ہونے پاتی کہ وہ اسے ہماری باسکٹ میں ڈال، قیمت کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیتی .... ہمیں بھی اتفاق سے فرصت ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنی رائے محفوظ رکھ کر الٹا اسی سے پوچھا
"تم کس کو ووٹ دوگی؟"
"میں جھونپڑی کو دوں گی۔" اس نے سادگی سے بتایا "آپ تو کار کو ہی دیں گی نا ووٹ؟"
ہمیں حیرت ہوئی "تمہیں کیسے پتہ کہ میں کس کو دوں گی؟"
"ہم غریب لوگ جھونپڑی کو دیں گے تو آپ بڑے لوگ کار کو ووٹ دیں گے۔ سیدھی سی بات ہے۔"
اس کی سیدھی سی بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتری۔ ہم نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کار سے بڑی کوئی چیز جیسے ہوائی جہاز وغیرہ کسی امیدوار کا نشان ہے کیا؟ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ پانچ کے پندرہ امیدوار تھے مگر ہمیں نو سے زیادہ انتخابی نشان یاد نہ آئے .... اپنے حافظے کو زیادہ تکلیف نہ دیتے ہوئے ہم نے کہا .... "تمہارے پاس رہنے کو جھونپڑی ضرور ہوگی مگر میرے پاس کار نہیں ہے .... کیا یہ تمہیں نہیں معلوم؟ مگر یہ تو بتاؤ تم سے زیادہ بڑے لوگ کسے ووٹ دیں گے؟ کار سے بڑی کون سی چیز ہے؟"
"کار سے بڑی کوئی چیز ہے ہی نہیں" سبزی والی نے پورے اعتماد سے اعلان کیا۔
"کیوں، ہاتھی ہے نا۔" ہم نے جُہل کی۔

وہ ہنسنے لگی "کیوں مذاق کرتی ہیں باجی، ہاتھی کہیں کار سے بڑا ہوتا ہے ؟"
ہم نے اُسے بتایا "ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے جب کہ بہت سی نئی کاریں بھی سوا لاکھ کی نہیں ہوتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا چھوڑو یہ بات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر تم جھونپڑی ہی کو ووٹ کیوں دو گی ؟"
سبزی والی نے نہایت سنجیدگی سے کہا "اپنے والے کو چُن کر دینا ہے نا ۔ جھونپڑی والے سے بڑھ کر اپنا کون ہوگا"
ہمیں نہیں معلوم تھا کہ بھارت کی جنتا نے اتنی ترقی کر لی ہے ۔ ذات پات کی تفریق سے نکل کر اقتصادی مساوات پر غور کرنے لگی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انتخابی نشانات سے متعلق سبزی والی کی غلط فہمی کو رفع کرنے کی زبردست خواہش ہمارے دل میں پیدا ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کالج گرما کی تعطیل میں بند تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکچر دیئے عرصہ گذر چکا تھا ۔ زبان سلسلا رہی تھی سو ہم نے تقریر کے انداز میں کہنا شروع کیا "بھولی بھالی سبزی والی، جھونپڑی نشان جس امیدوار کا ہے وہ تین منزلہ بلڈنگ میں رہتا ہے ۔ مرغا جس کا نشان ہے وہ گوشت تو کیا انڈا تک نہیں کھاتا ۔ طلوع ہوتا ہوا آفتاب، جس امیدوار کی پہچان کراتا ہے وہ روزانہ آٹھ بجے سو کر اٹھتا ہے ۔ شیر والا، حقیقی زندگی میں قالین کا شیر ہے ۔ دو پتوں والا، با دن پتوں کا رسیا ہے ۔ ترازو والا ڈنڈی مارنے کے لیے مشہور ہے ۔
"سچی باجی، سچی بولتیں آپ ؟" سبزی والی کو بڑا لطف آ رہا تھا ۔
اور کتنا گناؤں ؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ کون کیا ہے ؟ یہ جو صبح چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک یہ چار والے گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے گھومتے ہیں، گھر گھر گھس کر اپنے اپنے امیدوار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں وہ نہیں سنتیں تم ؟ یہ بات یاد رکھو کہ جو جو وہ کہتے ہیں ٹھیک اس کا الٹا سمجھا کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے وہ کہیں کہ ہمارا امیدوار جھونپڑ پٹی والوں کے لیے کام کرے گا تو سمجھنا کہ چن کر آنے کے بعد وہ جھونپڑپٹی والوں سے سیدھے مُنہ بات نہ کرے گا ۔
"اپنے کو فرصت کہاں رہتی ہے اُن کی باتیں سننے سمجھنے کی ۔ ہو ہو کر کے منڈی ہلا دیتے ہیں ۔ البتہ میری ساس نے دو کلو ردّی جمع کی ہے کاغذوں کی ۔ اپن تو، جس کو گھر کے آدمی بولتے ہیں اس کے نام پہ ٹھپّہ مار آتے ہیں" سبزی والی نے صفائی دی ۔ ہم نے سمجھایا "ووٹ ہر ایک کا اپنا حق ہے ۔ خود سوچ سمجھ کر دینا چاہیے"
"آپ بولیے باجی، کس کو دینا ہے ووٹ ؟ آپ کی سمجھ ہم سے زیادہ ٹھہری"
ہم اس سیدھے سوال کے لیے تیار نہیں تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بولے "کسی بھلے آدمی کو دینا"
"بھلے آدی کھڑے کہاں ہوتے ہیں ؟"
سبزی والی ٹوکری اٹھا کر چلتی بنی ۔ ہم ہکا بکا اُسے دیکھتے رہ گئے ۔
سبزی ریفریجریٹر میں رکھ کر ہم نے ایک رسالہ لیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر پڑھنے کا ارادہ کیا ۔ مگر پڑھے

میں ہمارا دل نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر یہ خیال ذہن میں کوندر ہا تھا کہ انتخابی نشانات ایسے بے تکے کیوں رکھے جاتے ہیں جیسے لیڈر کا سفید لباس اس کے باطن سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی انتخابی نشان جو امیدوار کی پہچان کراتے ہیں کیوں اس کی شخصیت کی صحیح شناخت نہیں کراتے! مانا کہ الیکشن آفس میں نشانات کی تیار کردہ فہرست ہوتی ہے۔ مگر امیدوار نشان مانگتے وقت اپنے سراپا، اپنی شخصیت کو یاد تو رکھ سکتا ہے .... ہم نے آج تک کسی کو کفن کی طرح لٹھا لپیٹ کر گھومتے نہیں دیکھا۔ صحیح ناپ کے ساتھ سلا کپڑا ہر کوئی پہنتا ہے۔ ریڈی میڈ کپڑوں کے اسٹور اور جوتے کی دوکان میں داخل ہوکر جو سامنے نظر آیا وہی جوتا یا ڈریس نہیں خرید لیتا بلکہ پسند ناپسند ..... ناپ دیکھ کر خریداری کرتا ہے .... انتخابی نشان کے انتخاب میں لاپرواہی کا کوئی جواز ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ پچھلے دنوں لوک سبھا کے چناؤ میں پنجے والا امیدوار اپنے ہاتھ کے پنجے کے علاوہ گتے اور ٹین کے بڑے بڑے پنجے لے کر پرچار کر رہا تھا تو گھوڑے والا گھوڑا، شیر والا شیر اور مرغے والا مرغا لے کر گھومتا ہوا اتنا مضحکہ خیز نہیں لگتا تھا جتنا ہاتھی والا نظر آتا تھا۔ ...... مگر وہ نظر کہاں آتا تھا؟ دراصل وہ اتنا مختصر تھا کہ جنتا ہاتھی کو دیکھتی رہ جاتی تھی۔ ہاتھی کے نکل جانے کے بعد پتہ چلتا تھا کہ ہاتھی پر امیدوار بھی سوار تھا۔

ہم نے سوچا اگر ایک آفس کھول دیا جائے جہاں الیکشن میں کھڑے ہونے والے لوگوں کو صحیح نشان منتخب کرنے کی صلاح دی جائے اور نشان بھی مہیا کیے جائیں تو کیسا ہو؟ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا..... ہم عالم تصورات میں جا پہنچے....... چونکہ تصور ہمارا تھا اس لیے ہیرو بھی ہم ہی تھے۔ یعنی پروپرائٹر کی جگہ پر ہم ہی تشریف فرما تھے۔

پہلا شخص جو ہمارے آفس میں آیا وہ دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ آنکھیں لال، قدم بے حال۔ دھم سے سامنے والی کرسی پر گر کر بولے........ "بہن جی! اپن چناؤ میں کھڑے ہورہے ہیں۔

"آپ!!" حیرت سے ہماری آنکھیں اُبل پڑیں۔

"ہی... ہی... ہی" وہ ہنسے ——— "کیوں، ہم نہیں کھڑے ہوسکتے کیا؟"

ہمارے جی میں آیا کہہ دیں، اپنے پیروں پر سیدھے تو کھڑے ہو نہیں سکتے۔ چناؤ میں کیا کھڑے ہوں گے؟... مگر ہم مسوس کر رہ گئے۔ بزنس میں گراہک خدا نہیں تو خدا کا بھیجا ہوا ضرور مانا جاتا ہے...... یہ جناب بلیر اوجھا شہر کی نامی گرامی شخصیت، شراب و کباب کے رسیا تھے۔ ہم نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فہرست پر نظر دوڑا کر کہا....... تیر کمان ، ...... پھول پتہ نشان ...... آپ کے لیے "شراب کی بوتل اور مرغ مسلّم" مناسب نشان ہے گا"

"یہ دفتر ہے یا مذاق؟ ———" وہ میز پر گھونسہ مار کر کھڑے ہوگئے مگر فوراً ہی لڑکھڑا کر بیٹھ بھی گئے....... ہم نے کہا...... "دیکھیے، آپ کو کھڑے ہونے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ پرچار کے لیے گھومنا آپ کے لیے آسان نہ ہوگا...... اس لیے ایسا نشان اپنائیے جس کو دیکھتے ہی جنتا کو آپ کا اور صرف آپ کا دھیان آئے۔"

انھوں نے بغیر کوئی ردِ عمل دکھائے جانے کا ارادہ کیا اور اٹھ کر الماری، دروازے سے ٹکراتے، بچتے بچتے باہر نکل گئے۔

ایک دوسرے سجن داخل ہوئے۔ کرسی پر بیٹھ کر اپنی موٹی پھولی ہوئی جیب سے جیتی (پان) سپاری کی تھیلی نکالی اور سروتہ لے کر نہایت محویت سے سپاری کاٹنے میں مشغول ہو گئے۔ ہم غور سے ان کی ایک ایک حرکت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ استغراق کا یہ عالم تھا جیسے جناب اسی اہم فریضے کو انجام دینے یہاں تشریف لائے ہوں ..... ہمارے کھنکارنے پر چونک کر بولے ....

"کوئی نشان بتائیے۔ میں وارڈ نمبر ۲۵ سے اس بار پھر کھڑا ہو رہا ہوں۔"

"پھر کا مطلب! کیا پہلے بھی کھڑے ہوئے تھے؟" ہمیں جستجو ہوئی۔

"چار مرتبہ ...... چار مرتبہ کھڑا ہوا اور چار مرتبہ گر گیا۔" انھوں نے سپاری کی پھنکی مار کر پھر سروتہ سے شغل شروع کر دیا ..... اللہ اللہ کیا سکون سے اطلاع دی جیسے چار مرتبہ ہارنے کا نہیں فتح یاب ہونے کا مژدہ سنایا ہو .....

ضرور یہ قابلِ رشک قوت برداشت اسی سپاری کی مرہونِ منت تھی۔

"پہلے کیا کیا انتخابی نشانات تھے؟" ہم نے پوچھا۔

"پہلی بار ہاتھی، دوسری بار مور .... تیسری بار گھوڑا، چوتھی بار شیر۔"

"کیا آپ محکمۂ جنگلات میں ملازمت کرتے ہیں؟" ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں چڑیا گھر کا نگراں ہوں۔ اس سال ڈسمبر میں ریٹائر ہو رہا ہوں ......"

"بس تو چڑیا گھر کے ان نشانات کو بھی طاق پر رکھ کر 'سروتہ سپاری' اپنا نشان رکھ لیجیے۔"

"جی! وہ اس بری طرح چونکے کہ ان کی عزیز از جان سپاری ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ انہوں نے لپک کر اس کا پیچھا کیا۔ فاتح اعظم کی طرح مٹھی میں سپاری کو قید کیا اور کرسی پہ بیٹھ کر سروتہ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ... سروتا سپاری .... کیا آپ سنجیدہ ہیں؟"

"سو فیصدی!" ہم نے کہا۔

"مگر سروتہ سپاری، بھی کوئی نشان ہے؟"

"ہاتھی گھوڑا ..... شیر مور بھی کوئی نشان ہیں؟ ہم نے برجستہ کہا ...... آپ کو جنتا ہمیشہ ہاتھی گھوڑے کے ساتھ دیکھتی ہے یا سروتے سپاری کے ساتھ۔ کب سے کھا رہے ہیں؟"

"تقریباً پچیس سال سے" وہ شرما کر بولے۔

"گویا آپ اور سروتہ سپاری، لازم و ملزوم ہیں۔ جنتا سوچے گی کتنا سچا انسان ہے۔ اس کا ظاہر و باطن ایک

ہے۔ سپاری کھاتا ہے مگر چھپاتا نہیں ..... بس آپ ہی کو ووٹ دیں گے"۔

انھوں نے سروتہ، سپاری چنیچی میں رکھی۔ چینچی کو جیب کے حوالے کیا اور دروازے کی طرف چلے تو ہم نے دیکھا، مسکراہٹ ان کے سپاری سے پھولے گالوں پر آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔

میں اندر آسکتا ہوں؟" مہذب انداز میں اجازت طلب کرنے والے اس شخص کو دیکھے بغیر ہی ہم سمجھ گئے کہ اساتذہ جماعت کا کوئی فرد ہوگا۔ اجازت دینے پر جو شخص اندر آیا اسے دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ گدھ کی طرح مردار کی تلاش میں رہنے والی چمکیلی آنکھیں سوالیہ انداز میں ہم پر مرکوز ہوئیں تو ہم نے سوچا فوراً کہہ دیں کہ جناب جس معزز پیشے سے آپ تعلق رکھتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے کاغذ قلم، آپ کے لیے بہترین نشان ہوگا"۔ مگر ہم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ خیال الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکے .... یہ جناب نفسیاتی مریض تھے۔ انھیں گھریلو سکون میسر نہیں تھا اس لیے اپنے اسٹاف کے کسی بھی شخص کو خوش نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کس کو کیسے تکلیف پہنچائیں بس اسی میں کوشاں رہتے تھے ...... دس مقدمے انھوں نے پڑوسیوں پر کر رکھے تھے تو پانچ مقدمے پڑوسیوں نے ان پر ...... اپنے پڑوسی سے سڑک پر ہاتھا پائی کا مقدمہ اس وقت انھیں پورے شہر میں مشہور کیے ہوئے تھا۔ ہم نے کہا ...... "جناب آفس بند ہونے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کے سوال کرنے سے پہلے آپ کو نشان بتا دیتے ہیں۔ کورٹ کی عمارت پر بیٹھا گدھ آپ کیلیے موزوں ترین نشان ہوگا۔

وہ پھوں پھوں کر کے بولے" میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں آپ کو دیکھ لوں گا۔ آپ کا آفس نہ بند کرا دیا تو دیکھیا"

"شکریہ"۔ ہم نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا:

"چپراسی موجود ہے فی الحال کل تک کے لیے تو اسے آفس بند کرنے دیجیے"۔

اُن کے جاتے ہی پرس سنبھال کر ہم کھڑے ہوئے تھے کہ ایک نہایت فربہ خاتون دھڑ دھڑاتی ہوئی اندر آ گئیں۔ ہم نے آفس بند ہونے کی اطلاع دینی چاہی تو بولیں ...... " جب میں آگئی ہوں تو آفس کیسے بند ہو سکتا ہے۔؟ آپ یہ جان لیجیے کہ میں الیکشن لڑ رہی ہوں"۔

"بہت اچھا کر رہی ہیں۔ زنانہ طاقت کا کچھ استعمال بھی تو ہونا چاہیے۔ انتخابی نشان "توپ" کیسا رہے گا؟"

توپ!" وہ اس زور سے دھاڑیں کہ آواز کا گولہ لمحہ بھر کے لیے ہماری قوتِ سماعت کو ناکارہ کر گیا ......؟

"آپ دوسرا نشان نہیں بتا سکتی تھیں؟"

"بتانے کو تو سوئی بھی بتا سکتے تھے"۔ ہم نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ایسا کیجیے۔ سوئی ہی اپنا نشان رکھ لیجیے۔ کچھ سوئیاں موٹی بھی ہوتی ہیں"۔

"پھر بھی باریک ہی ہوتی ہیں"۔ وہ مایوسی سے بولیں "کوئی دوسرا نشان بتلائیے"۔

اُن کا پارہ بلندی سے لیکایک زیرو ہو جانے پر ہمیں اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ واقعی موٹے لوگ غصہ کرنے

سے گریز کرتے ہیں۔

"تو پھر بیلن....."

"واہ..... واہ پولیاٹ بیلن...." وہ ہمارے فقرے کو اُچک لے گئیں..... "یقیناً پولیاٹ بیلن، اچھا نشان رہے گا۔ خواتین ، خاص کر گھریلو خواتین کو اپیل بھی کرے گا...."

"نہیں، آپ غلط سمجھیں۔ پولیاٹ بیلن تو عام چیز ہے" ہاتھ میں اٹھایا ہوا بیلن،..... میرا مطلب آپ سمجھ رہی ہیں نا......"

کیا کہا؛ اُن کی آواز کا دوسرا گولہ اتنی زور سے چھوٹا کہ ہم سرتا پا لرزا اٹھے۔ پرس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

بیگم! خدارا نیچے لگائیے بھی جلدی۔ شوہر نامدار کی آواز سن کر ہم بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ہاتھ سے میگزین چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا........ اسے اٹھا کر ٹیبل پر رکھا اور پھر اپنے عالم تصورات کے احساسات و تجربات سے شوہر نامدار کو آگاہ کیا تو وہ سنجیدگی سے بولے.....

"کئی مرتبہ آپ سے کہا کہ دوپہر کو دس پندرہ منٹ سے زیادہ سویا نہ کریں۔ ایسے اوٹ پٹانگ خواب نظر نہ آئیں گے تو اور کیا ہوگا۔"
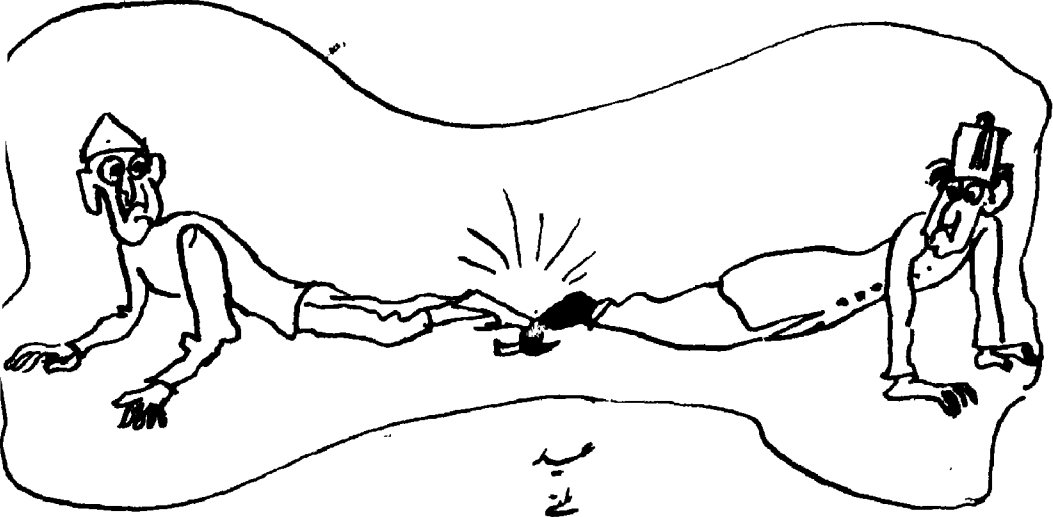
●●

کرشن پرویز کھرڑ

یہ ہمالا سا بدن اور یہ خونخوار نظر — حوصلہ کون کرے آپ سے ٹکرانے کا
التجاؤں پہ مری جب نہ کوئی غور ہوا — ہم نے پھر دعوا کیا اُن پہ تھا ہر جانے کا
جھنجھلاتے کے وہ کہتے ہیں کہ خاموش رہو — ڈھنگ یہ خوب نکالا مجھے بہلانے کا
ٹیکس جینے پہ نہیں مرنے پہ بھی دینا ہوگا — اختیار اب نہیں جینے کا نہ مر جانے کا
شعر پرویز کے ہوتے ہیں وزن سے خارج — شوق ہے پھر بھی انہیں شعر کہے جانے کا

اور تو ممکن ہے سب کچھ دوستو — بات بیوی کی نہ ٹالی جائے گی
آگیا ہے راس اُن کو میرا گھر — اب نہ گھر سے ساس سالی جائے گی
لاٹری نکلے کوئی نمبر لگے — یوں نہ اپنی خستہ حالی جائے گی
گر نہیں پرویز بجلی کیا ہوا — شمع دل جھٹ سے جلالی جائے گی

آگیا ہے پھر الیکشن دوستو — ووٹ دینا ہے کسے یہ سوچ لو
جانے گزرے ہیں کہاں پر پانچ سال — آگیا پھر آج ووٹر کا خیال
اب ذرا کرسی سے فرصت مل گئی — آپ سے ملنے کی مہلت مل گئی
پھر نئے وعدوں سے یہ بہلائیں گے — خواب جنت کے ہمیں دکھلائیں گے
یہ وطن کے غم سے مالا مال ہیں — ووٹروں کے درد سے بے حال ہیں
آپ کو جو چاہیئے لے لیجیئے — ووٹ لیکن آپ ان کو دیجیئے
لوٹ لیں سیتا کہیں راون نہ ہو — رہبروں کے بھیس میں رہزن نہ ہو

واحد انصاری

○ واحد بجمع غالب

یہ تو وہ رم کہ جینا کیا ہے — "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے"
شوق سے پھر اٹھاؤ تم بیلن — "کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"
پائی وہ تمغۂ وفاداری — "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"
بھنگ گانجہ چرس افیم شراب — "اور درویش کی صدا کیا ہے"
لعنتیں بھیجتا ہوں دنیا پہ — "میں نہیں جانتا دعا کیا ہے"

مے کا پینا حرام ہے واحد
"مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے"

خیرات ۔ برقؔ آشیانوی

اک شیخ کے فرزند نے ازراہِ سخاوت　　خیرات کی نیت سے نیا پیسہ نکالا
جب شیخ نے دیکھا تو سمجھ میں نہ کچھ آیا　　پوچھا کہ "یہ کیا کرتے ہو" کہنے لگا بیٹا
کل آپ نے تقریر میں کی تھی یہ نصیحت　　" خیرات جو دے گا تو ثواب اس کو ملے گا "
یہ بات سُنی شیخ نے تو فکر میں ڈوبے　　پھر ہنس کے بڑے پیار سے فرمایا کہ "بیٹا"
یہ وعظ و نصیحت تو مُریدوں کے لیے ہے　　اطلاق کسی بات کا ہم پہ نہیں ہوتا

یہ قاعدہ ہے عام کہ میخانے میں ساقی
رندوں کو پلاتا ہے مگر خود نہیں پیتا

دوست محمد (دہلی)

سہرا پیروڈی

خوش ہو کم بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ کر تے ہوئے بالوں پہ تو کس کر سہرا
کیا ہی اس چاندسی چُندیا پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے گنجِ دل اندوز کا زیور سہرا
سات تھانوں کے فراہم کیے ہوں گے ٹکڑے
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
تب کھلا ہے یہ شرربار سراسر سہرا
"یہ سمجھا اک بے ادبی تھی کہ تیا سے بڑھ جائے"
رہ گیا آن کے کالر کے برابر سہرا
جب کہ اپنے ہی سماتے نہ خوشی کے مارے
باندھے احمق کے بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا
ہم براتی سہی، دولہا کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے لا دے کوئی بدتر سہرا

افروز عالم
(ہیرا سرائے ۔ دربھنگہ (بہار)

غزل

مرے گھر میں کوئی مہمان کردے
بچھا ہر روز دسترخوان کردے
جھگڑا بھی چین سے پاتے نہیں ہم
محلے کو مرے سنسان کردے
مجھے مُردہ ضمیری بخش دے تو
قدم بوسی مرا ایمان کردے
تہی دستی مقدر بن گئی ہے
مرے جینے کا کچھ سامان کردے
بہت محدود ہو کر سوچتا ہوں
ذہن کو میرے روشندان کردے
بڑا راکٹ پہ جو اُڑنے لگا ہے
ذرا حیواں کو تو انسان کردے
محبت اب پُرانی ہو چکی ہے
نیا پیدا کوئی رجحان کردے
مرے حصّے میں جب فاقہ کیا ہے
تو پھر ہر ماہ کو رمضان کردے

گنگا دھر گاڈگل
مترجم: اعجاز علی

یہ کالج کی لڑکیاں

کالج کے دو ہزار لڑکوں کو میں نے کسی طرح قابو میں کر لیا تھا۔ ایک بدمعاش نے کھڑکیوں سے لگیں کانچیں پھوڑ ڈالیں میں نے گھنٹہ بھر جرح کرکے اس کی حالت خراب کردی تھی۔ یوں تو آئے دن شیشے چکنا چور ہوتے اور کوئی بد قماش لڑکوں کو پکڑ نہ پاتا مگر میں نے ایسی غضب کی جاسوسی کی کہ اُدھر اس نے کانچ پھوڑی اور اِدھر میں نے اس کی گردن ناپ لی۔ میرے ایک ساتھی برٹرینڈ رسل پر عالمانہ لکچر دے رہے تھے مگر ایک نٹ کھٹ کو پکّے گانوں کے انداز میں الاپ اور لیکچر کے ساتھ سُر تال ملانے کے جرم میں میں نے سزا سنائی کہ مسٹر گھر پر بیٹھ کر سنگیت شاستر اور پکّے گانوں کا ریاض کرو۔ ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں گیٹ آوٹ۔ اور ایک دل پھینک سڑک چھاپ لڑکا جو غلیل میں دبا کر کچے ٹیلے لڑکیوں پر پھینک کر مار رہا تھا۔ میری نظر پڑی تو میں نے اس کو تین گھنٹے باہر دھوپ میں کھڑا کردیا۔ روز کچھ نہ کچھ شرارتیں ہوتیں۔ دماغ ماؤف ہوچکا تھا سوچا اس غیر شاعرانہ ماحول سے کچھ دیر کے لیے کہیں باہر جانا چاہیئے جہاں جسم و روح کو آرام ملے۔ سوچا چلو اپنے ہم پیشہ پرنسپل کے پاس۔ کالج پڑوس ہی میں تھا۔

یہ کالج آرٹس اینڈ سائینس کا یعنی صنفِ نازک کا راج۔ وجہ آرٹس کی کلاسیس میں ۸۰٪ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اور سائنس میں نصف سے کچھ زیادہ۔ سائنس میں لڑکیاں اس لئے داخلہ پر مُصر ہوتی ہیں کہ مستقبل میں انہیں ڈاکٹر بننا ہوتا ہے۔ گو کہ لیبوراٹری وغیرہ کے تعفن سے دماغ پراگندہ ہو رہا تھا مگر پھر اطمینان کی سانس لی کہ میرے ساتھی خوب آرام و راحت میں ہوں گے اور کیوں نہ ہوتے، لڑکیاں بے چاری اللہ میاں کی گائے، حیا کی پتلی ہوتی ہیں! لہٰذا ماحول خوب راحت فزا ہوگا۔ مجھے بھی تھوڑی دیر چین ملے گا۔ اسی تصور میں ڈبکیاں لگاتا مجاز کی طرح گنگناتا میں کالج کی طرف چل پڑا۔

میں سوچ رہا تھا اس کالج میں پریاں ہوں گی، جو بیشتر خاموش رہتی ہوں گی، یا جنھیں فرسٹ کلاس کی

دھن ہوتی ہوگی وہ پڑھائی میں مصروف۔ بری طرح کا بھنڈی بازار تو نہ ہوگا، جہاں نت نئے ہنگامے، پارٹی بندی، مارا ماری، توڑ پھوڑی، دنگا فساد، مگر میرے دوست کے کالج میں اگر کچھ ہوتا تو بھی ہمنفیشن پریڈ، رانوں کی نمائش ہنسی کی پھلجھڑیاں۔ ہوا کرتے۔ اتنا ہارٹ اٹیک والا ماحول تو نہ ہوگا جو میرے کالج کی چار دیواری میں مجھے دیکھنا پڑتا تھا۔

مگر جوں ہی میں کالج گیٹ سے قریب تر ہوا۔ تو لڑکیوں کا لباس مجھے کچھ عجیب ہی سا لگا۔ اس میں کی ایک ایک موٹی پنجابن اس قدر چست شلوار پہنے ہوئے تھی کہ میں محسوس کر رہا تھا جس طرح نرسنگھ گلا چیر کر باہر نکل آیا یہ لڑکی ضرور اپنی تنگ تُمبا سے کودی مار کر باہر نکل پڑے گی۔ دوسری کے بلاؤز کو پیٹھ نہیں تھی۔ اور تیسری کی ساڑی کو پلو نہیں تھا۔ میں غور سے دیکھنے لگا کہیں اس لڑکی نے پلو گھما تو نہیں دیا۔ مگر پھر نظر آیا کہ محترمہ کے ہاتھ پہ پلو کھڑے کھا رہا ہے۔ چوتھی کے پاؤں کو ہاتھی روگ (فیل پا) ہوگیا تھا۔ میرا دل غم زدہ ہوگیا۔ مگر پھر اندازہ ہوا کہ دوشیزہ نے پائینچے کا منہ بند کر کے پاجامے میں ہوا بھرلی ہے۔ پانچویں نے کہنیوں تک کڑے چڑھا لیئے تھے۔ چھٹی کو شاید سنسار مُکت ہونا تھا۔ رُدرانش کی مالا، بھگوتے رنگ کی کفنی اور کمر میں موٹے موٹے منکوں کی مالا۔ ساتویں کے پیروں میں زبردست موٹے تلوں کی کولھاپوری۔ آٹھویں لنگی میں مست، اور اُوپر سے مَردانہ کُرتا۔ ہوسکتا ہے وہ اس کے بھائی کا پہن آئی ہو۔ اور دسویں کا صرف لہنگا، وہ ناف کے پاس چار انگل کٹا ہوا۔ یہ سب بیچ رنگی دیکھ کر مجھے اُلٹیاں آنے لگیں، دماغ گھومنے لگا، میں نے آنکھیں زور سے موندلیں، اور ٹھنڈی سانسیں چھوڑنے لگا۔

کالج گیٹ کو تین لڑکیوں نے ڈھانک رکھا تھا۔ وہ بے فکر ہنسی مذاق میں مشغول تھیں آنے جانے والوں سے بے پرواہ۔ مجھے کبھی نہ کبھی دیکھ کر اندر جانے کی اجازت دیں گی۔ میں شرافت کا مجسمہ بنا کھڑا رہا۔ مگر کسی نے بھی غلط انداز سہی دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ حالات کو سمجھ کر میں EXCUSEME ایکسکیوز می۔ دو تین بار بولتا رہا۔ مگر کوئی سنوائی نہیں۔ بول ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ عورت راج میں آداب زندگی کو تین طلاق، کوئی مرد دل کو بھاؤ دینے والا نہیں، یہ سمجھ کر میں تھوڑی سی بچی جگہ میں بدن چُرا کر گزرنے لگا۔ قہقہوں کا طوفان، بدتمیزی کی حد ہوگئی ایک تن تن بدن والی مجھ پر دھڑام سے آن گری۔ اس کی ہی نوکر کہنی میرے پیٹ میں گھس گئی۔ میں درد سے تلملانے لگا۔ عورتوں کو پھولوں کی طرح کومل کہنے والے شاعر گدھے ہیں۔ انہیں اپنی اصلاح کرنی چاہیئے۔ یہی سوچتا بڑبڑاتا لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ گرتے کچھ سنبھلتے یں راستہ طے کرنے لگا۔

سوری، معاف کیجئے وغیرہ کسی نے کہا نہیں، الٹا چور کو توال کو ڈانٹے مصداق یہ کون دیہاتی گنوار ہماری خوش گپیوں میں مخل ہوا، فقرہ کسا گیا۔

میں اپنے جگری دوست پرنسپل کے آفس میں بڑا بدحواس داخل ہوا، کُرسی کھینچ کر ٹھنڈی سانسیں چھوڑتا ڈھیر ہوگیا۔ مگر اس اُجلے آدمی نے خوش آمدید ہیلو وغیرہ کچھ کہا نہیں۔ موڈ کچھ خراب معلوم ہوتا تھا۔ ایک ٹوٹتہ پیٹ والی نمائشی ہنسی، پھر لب بند، اور پہلے کی سی ماتمی شکل۔

کیوں جناب خیریت تو ہے، کوئی پریشانی تو نہیں وغیرہ وغیرہ میں پوچھنا چاہتا تھا مگر اسی لمحے دروازہ دھڑام سے کھلا۔ مے آئی کم اِن سر ——— May I come in Sir
"نو" پرنسپل گلا پھاڑ کر چیخے۔
دروازہ پھر اسی شور سے بند ہوا لیکن دوسرے لمحے ایک پروفیسر بڑے خوشامدانہ انداز میں داخل ہوئے اور التجا کرنے لگے۔ "سر وہ ایک گھنٹے سے بڑا پریشان ہے۔ اُسے آنے دیجئے اور فدا ئی لیجئے۔ دیکھئے تو سہی کیا پریشانی ہے اس کی۔
"لڑکا ہے" ٹھیک، میں سمجھا وہ بدمعاش لڑکیاں پھر آگئیں، ڈھائیں، جنھیں میں کل سسپنڈ کر چکا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے بلوالو اُسے۔
سسپنڈ ہونے کی حد تک لڑکیاں جرم بھی کرسکتی ہیں، اس رسوا کن تصور سے دماغ چکرانے لگا۔ مگر پھر میں بڑی جلد ہی اپنے حواس میں آیا اور غور کرنے لگا، ایسا کون سا گناہ کیا ہوگا ان معصوم تتلیوں نے میں اپنے آرام دل دوست سے پوچھنا چاہتا تھا مگر پھر دروازہ کھلا اور ایک چشمہ لگا ہوا بدصورت قسم کا لڑکا اندر داخل ہوا۔ پرنسپل ایک لمحے کے لئے بحال ہوئے اور عملگی سے پوچھا کیا کام ہے ؟
ہمدردی کا لہجہ پاکر وہ لڑکا روہانسا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ رو پڑے گا۔ سر، سر، ان لڑکیوں کا آپ کچھ بندوبست کرو، یہ ہر روز مجھے چھیڑتی ہیں، چڑاتی ہیں، لڑکیاں اور مجھیں چڑاتی ہیں میں بے ساختہ بول پڑا، پوچھ بیٹھا۔
اس سوال کا میرے فاضل دوست نے جواب دیا۔ گاڈ تم گمان بھی نہیں کرسکتے، اس قدر بھیانک روپ ان لڑکیوں نے دھارن کرلیا ہے۔ کیا کیا کرتی ہیں یہ لڑکیاں اوف ؟
سر کالج گیٹ کو گھیر کر یہ لڑکیاں کھڑی رہتی ہیں۔ اور جوں ہی میں داخل ہونا چاہوں میرے آنگ پر گرنے لگتی ہیں۔ میں دامن بچا کر نکل آتا ہوں پھر ایک آنکھ مار کر چڑاتی ہے، اے چشمش پھر دوسری گردن ٹیڑھی کر کے کہتی ہے اے کشمش پھر تیسری ایڑیاں اٹھا اٹھا کر زور زور سے چلاتی ہے چیش رمیش۔ میں بدحواس ہو کر تیز تیز قدم چلتا ہوں۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگتی ہیں۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی ہیں۔
بدحواسی میں میں نے اپنا چشمہ (عینک نکال لیا) مگر آنکھوں کے سامنے جب اندھیرا چھانے لگا تو پھر چڑھا لیا۔
پرنسپل نے اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر جواب دیا۔ تو بھی چڑا۔ خوب خبر لے، سوالی کی طرح چشمیں تو ایسا گھبراتا کیوں ہے۔ جیسا وہ کرتی ہیں تو بھی کر۔
مجھے ان کا یہ مشورہ سننے کو بیٹھے ہی معقول لگا۔ کیوں کہ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مجھ کو بھی اس

کے تجربات ہو چکے تھے، جب لڑکیاں بجلیاں بن کر ٹوٹ پڑتی ہیں تو اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔
دیکھتے ہی دیکھتے پرنسپل ایک دم غضب ناک ہوگئے، کرسی آگے پیچھے کرنے لگے۔ مجھے لگا وہ ابھی فٹاک سے اٹھیں گے اور لڑکے سے کہیں گے، چل میں دیکھتا ہوں اُن آوارہ لڑکیوں کو، اپن دونوں ملکر اُن بیچ لڑکیوں کو خوب چڑاکر آئیں گے چل، مگر میں نے عقلمندی دکھائی اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں کرسی پر بیٹھے رہنے کو کہا۔ انہوں نے کاغذ پن سنبھالا اور شکایت نوٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ کون کون تھیں وہ نامعقول۔ اُنہوں نے فی الفور نوٹس نکالی اور لڑکے کے بتلائے ہوئے ناموں کو جلد پرنسپل سے آکر ملنے کا حکم جاری کیا۔ لڑکا خوش خوش آفس سے باہر جانے لگا۔ میں نے کہا یہ لڑکیاں بے فام جامہ سے باہر ہوگئیں کچھ کرنا چاہیئے۔ بے فام، جامہ سے باہر، اس سے بھی بڑھ کر بھیانک۔
اُس وقت پھر آفس کا دروازہ کھُلا اور دھڑام سے بند ہوگیا۔ غصّے سے بھری ہوئی۔ نتھنے پھلے ہوئے، پاؤں پٹکتی ہوئی ایک غضب ناک کسی لڑکی کی ماں، سیدھے پرنسپل کے ٹیبل تک گئی اور اُن سے پوچھنے لگی، پرنسپل صاحب میں پوچھتی ہوں تمہارے کالج میں یہ سب کیا کالے دھندے ہو رہے ہیں۔
پرنسپل نے سوالیہ بہ استعجابیہ نظروں سے دیکھا، اور لب کھولنا چاہا۔
اماں جان نے کمر سے پلو کسا، دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیئے اور پوچھا۔ میری بیٹی کی کلاس کا اسپیشل اور وہ بھی رات گیارہ بجے تک، یہ نائٹ شوٹنگ کا دھندا تم نے کب سے کھول رکھا ہے جواب دو ؟
پرنسپل نے متعجب لہجہ میں جواب دیا۔ میری معلومات کے مطابق کالج میں کل کوئی اسپیشل کلاس نہیں تھی۔ اور اگر ہو بھی تو وہ آٹھ بجے کے بعد ہرگز نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں آپ کے اطمینان کے لیئے پوچھ گچھ کر لیتا ہوں۔
گھنٹی بجی۔ پیون آیا۔ پھر رجسٹرار آیا۔ جواب ملا کوئی اسپیشل وسپیشل نہیں تھا۔
بھری ماں کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں "مطلب یہ کہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے، خود اپنی ماں سے جھوٹ بولتی ہے! اس بغلی گپ کا اس ماں کو اس قدر بُرا کیوں لگ رہا تھا، اور وہ اس قدر دُکھی کیوں ہوگئی تھی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک عورت اگر جھوٹ بولتی ہے تو دوسری عورت کو اس قدر غضب ناک نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیئے کہ عورت اور جھوٹ نہ بولے۔ چلیئے جھوٹ گناہ سمجھ کر نہ بولیں عادتاً تو بولتی ہیں۔
پرنسپل نے کہا اس لڑکی کو جہاں کہیں ہو پکڑ کر فوری حاضر کرو۔ حکم سنا دیا۔ ایسے نازک وقت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مطلوبہ لڑکا یا لڑکی غائب رہتے ہیں۔ مگر یہ ستم ظریف دروازے کو لگ کر کھڑی تھی۔ ادھر نام کی پکار ہوئی اور وہ یس سر کہتی ہوئی زیرِ لب مسکراتی ہوئی بڑے ناز و انداز سے داخل ہوگئی۔
مجھے لگا یہ لڑکی کافی تجربہ کار ہوگی، مردوں کو اُنگلیوں پر نچانے والی حرافہ، مگر وہ تو کم سن نازک اندام غنچہ دہن بڑی معصوم چہرے والیاں۔ ایسے اطمینان سے کھڑی گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اپنی ماں کو یوں للتا پولا کے جیسا لک پڑا میں بلیو

ٹھائے وہ دیکھتی رہی مگر ڈر خوف کے کوئی آثار نہیں۔ ایک لمحہ کے لئے ہچکی جیسے حوض میں لہر پیدا ہوتی ہے پھر وہی سکوت
ہی زیرلب تبسم ماں کا روایتی مسکراہٹ سے اس نے خیر مقدم کیا اور اسی انداز میں پرنسپل صاحب سے مخاطب ہوئی
یا بات ہے سر، کیوں یاد فرمایا؟
س سے پہلے کہ پرنسپل لب کشائی کرتے بپھری ہوئی ماں پھوٹ پڑی۔ "تو نے مجھ سے جھوٹ کہا، کل کلاس کا اسپیشل تھا۔
ن میں نے معلوم کر لیا تیری تو کیا کسی کلاس کا بھی کوئی اسپیشل نہیں تھا!
ر دہی ہلکی سی لہر، خاموشی، پھر شکر ریز مسکراہٹ، ماحول کو پُر لطف بنانے کی کوشش۔ نہیں تو، میں نے کب کہا کہ میرے
لج کا۔ میں نے تو صرف اتنا کہا کالج کا اسپیشل، وہ نہیں کہا، فورٹ کا کالج اس میں اسپیشل تھا۔
لے کالج کا اسپیشل کہا، دوسرے کالج کی بات تک نہیں کی۔ ورنہ میں تجھے آدھی رات تک بھٹکنے کی اجازت ہرگز
دیتی۔

میں نے کہا ماں، کہ میں دوسرے کالج کے اسپیشل میں جا رہی ہوں، تو رسوئی گھر کے کاموں میں غرق، میری بات
ان سُنی کر دی۔ اطمینان وسکون بدستور جاری، مسکراہٹ کا کبھی نہ ختم ہونے والا، بور دینے والا انداز۔ فضا میں
طرح غبارے اچھالنے کا ماحول، کوئی تبدیلی نہیں۔
وٹ سب فراڈ، مجھ سے تو نے کہا ہی نہیں کہ دوسرے کالج میں جا رہی ہے۔ خود جھوٹ کہتی ہے اور بہرے پن کا
م مجھ پر عاید کرتی ہے۔
کہنے کے لئے اُس نے لب کھولے، جیسے کلی سے پھول بنتا ہے۔ پھر لب سکیڑ لیئے اور بڑے طنزیہ انداز میں پرنسپل
طرف دیکھ کر مسکرائی گویا کہہ رہی ہو دیکھ لیجیے، کس قدر جاہل اور ان پڑھ ہے یہ بڈھی کھوسٹ، شکی، بدمزاج، بدزبان
لیں آخر کو ماں ٹھہری، مسکرا کر جواب جاہلاں دیدہ، چلو چھٹی ہوئی۔
میں نے بڑے بڑے بے شرم، جعل ساز اور فتنہ پرداز دیکھے، مگر اس عمر میں اور اتنی مشاق۔ تعجب ہوتا تھا، اور
ڈھٹائی پر دماغ مفلوج ہوا جا رہا تھا۔ اماں کی حالت یکلخت شیرنی کی سی ہو گئی وہ اپنی جگہ سے چیل کی طرح
ٹھ کر لڑکی تک آ گئی اور کہنے لگی، آوارہ بدمعاش، میں نے تجھے آدھی رات تک لونڈوں کے ساتھ گھومنے پھرنے
ر سپاٹے کی تجھے کھلی چھٹی نہیں دے رکھی۔ اور کبھی نہیں کہا کہ تو تنہا اس طرح بھٹکتی پھرے اور خاندان کا نام ــــــ !
ں میں تنہا کب تھی، وہ دو قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ میرے ساتھ کشور بھی تو تھا۔ ہم دونوں تھے۔ وہ پرنسپل کی طرف
ب ہو کر وضاحت کرنے لگی۔ کشور یعنی میرا ماموں زاد بھائی۔ وہی دلفریب انداز تبسم!! ماں نے انکاریہ لہجہ میں کہا،
ساہے۔
پوچھے اُس سے۔ اب تو اماں کا پارہ اتنا چڑھا تو معلوم ہوتا تھا دانتی سے گردن کاٹ لے گی پھر گالیاں دینے
ں، چڑیل، کلنکنی۔

پرنسپل کو حالے کا خطرہ محسوس ہوگیا، دشمن کے ہوائی جہاز آسمان پر اترتے دکھائی دینے لگے، فوری مداخلت کی اور گرج دار آواز میں گویا ہوئے۔ اُنہوں نے سوچا کالج میں اور وہ بھی پرنسپل کے آفس میں اگر عورتیں کیلیفورنیا ڈالس کی طرح ایک دوسرے سے لڑ جائیں تو کالج کی بڑی بدنامی ہوگی۔ ایوینگ نیوز کے پہلے صفحہ پر خبر چھپے گی، وہ بڑی جلدی میں کہنے لگے، دیکھو مسز مہتا، یہ آپ کا اپنا خانگی جھگڑا ہے، گھر کی چار دیواری میں نپٹ لو اچھا رہے گا یہاں کالج میں اس طرح کا فن کا مظاہرہ ٹھیک نہیں، پرنسپل کے یہ غیر ذمہ دارانہ بول اُسے نشتر کی طرح چبھ گئے وہ تیر کی طرح آفس سے باہر نکل گئی۔ دوسرے لمحے تبسم کو گھراکرتے ہوئے لڑکی بھی نو دو گیارہ ہوگئی۔

پرنسپل نے اپنی عرق آلود چندیا دستی سے صاف کی، گہری گہری سانسیں چھوڑیں، کشادہ ہوئے اور خود بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگے، بہت تھک گئے ہیں، اب چائے ہو جائے؟

میں نے حامی بھری، میں بھی کافی متاثر ہوگیا تھا۔ سوچنے لگا ایک کیوں دو کپ چائے پینی چاہیئے۔ پرنسپل نے پیون کو آواز دی، چپراسی ٹرے میں دو چائے لے آؤ۔ چلو جلدی کرو۔ اور دیکھو جب تک ہم تازہ دم نہ ہولیں کسی کو بھی اندر آنے نہیں دینا۔ مگر اس حکم کی تعمیل نہ ہوسکی۔ ہم دو چار منٹ آپسی گفتگو میں محو تھے بس نا تو باہر شور کا، تو تو میں میں کا، میری تیری کا آواز سنائی دی۔ دیکھا تو بڑی بدحواسی کے عالم میں اور نہایت غم و غصہ میں بھرے سنسکرت کے لیکچرر داخل ہوئے۔

ہم دونوں بڑی تعجب سے انہیں دیکھنے لگے، وہ سیدھے پرنسپل کے ٹیبل کے پاس آن کر کھڑے ہوئے اور اپنا بیان پولس اسٹیشن میں کمپلین کی طرح سُنانے لگے،

سر، سر آپ کو ان لڑکیوں کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا چاہیئے۔ پانی سر سے اُونچا ہو چکا یعنی د ھ از ٹو مچ —— This is Too Much سنسکرت کے پروفیسر نے بتایا کہ جب وہ کالیداس کو پڑھا رہے تھے تو ان لڑکیوں نے ٹرانسفر آن کر دیا اور دودھ بھارتی سے گانے سُننے لگیں۔ یہ تو ہیں وہ قطعاً برداشت نہیں کیا پرنسپل نے کسی طرح انھیں سمجھا منا کر واپس بھجوا دیا۔ میں اور پرنسپل ان کے کمرے سے باہر نکلے۔ کاریڈور کا عجیب حال تھا۔ ایک لڑکی بال بکھرائے اپنے عاشق کیساتھ بیٹھی تھی اور ایک لڑکی دیوار سے لگی ایک لڑکی مخمور نگاہوں سے اپنے بوائے فرینڈ کو دیکھ رہی تھی اور اُسے مشتعل کر رہی تھی۔ لڑکا آپے سے باہر ہوگیا اور اس سے ہم آغوش ہوگیا ایسا آسن اختیار کر لیا کہ بس — خیر جانے دو چھوڑو۔ مختصر یہ کہ کھجوراؤ کی پوزیشن بھرتری ہری کی ہولناک جنسیاتی کیفیت، میگھ دوت کی دل گداز بیڈ روم والی دل گداز سچویشن وغیرہ وغیرہ۔ سب کچھ میری نظروں کے سامنے تھا اور میں خاموش تماشائی احتجاج بھی کروں تو کس سے۔ خاموش کھڑا سوچنے لگا بے شرم بن کر آگے جاؤں اُلٹے پاؤں واپس لوٹ جاؤں ایسی گمبھیر حالت میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ پرنسپل صاحب کی گرج دار آواز سُنائی دی۔ ان کی کڑک آواز نے پولس وِسل کا کام دیا اور وہاں ایک پلے بوائے شو ختم ہوا، راستہ کھلا۔ راستے کا

شاعری ختم ہوئی، سپنے ٹوٹے، اب میری سمجھ میں آیا کہ کالیداس کی شاعری میں لڑکیوں لڑکوں کو کیوں مزہ نہیں آتا۔ ارے صاحب سب کچھ جینیں سڑکیں، پارکوں ہوٹلوں میں میسّر ہو انہیں کتابوں کی لذّت کیا مزہ دے گی۔

میں اور پرنسپل سیڑھیاں چڑھ کر ایک منزلہ اوپر گئے، وہاں کے ایک الوکھے سین نے میرے قدم پکڑ لیے میرے ذہن کو کھینچ لیا۔ لڑکیوں کا ایک غول کلاس سے باہر ھاھا، کھی کھی، تالیاں، شور، اچھل کود، اور بند دروازے پر مستقل دستک، کھولو، کھولو کی آواز، التجا۔ بے بسی، وہ لڑکیاں ہنگا موں میں اس قدر غرق تھیں کہ پرنسپل بازو میں آکر کھڑا ہوگیا مگر کسی کو احساس تک نہ ہوا۔

پرنسپل نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھولی، اندر سے پسینے میں شرابور فلسفہ کے استاد باہر دھڑام سے گر پڑے۔ اُٹھ کر سیدھے کھڑے ہوئے اور پرنسپل کا گلا دھر لیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا پرنسپل، کالر چھوڑ دیا۔ اور ندامت سے گردن جھکالی۔ یعنی لڑکیوں نے فلسفے کے استاد کو قید کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ سوچیئے کس حد تک لڑکیوں کے قدم اُٹھ چکے۔

پرنسپل کے دھیان میں جب فلیش بیک اچھی طرح واضح ہوگئی تو وہ بے حد غصّے میں بپھر گئے۔ قریب کھڑی دو لڑکیوں کی اُنہوں نے باہیں پکڑلیں، انہیں زور سے اندر ڈھکیل دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد باقی بھی لڑکیوں کو گرفتار کرنے کے لئے وہ پیچھے مڑے مگر جنگلی ہرنیں کہیں قابو میں آتی ہیں' وہ تیز رفتار دوڑنے لگیں، یہ جا اور وہ جا۔ پرنسپل نے فول اسپیڈ میں ان کے پیچھے دوڑنا شروع کیا۔ وہ آگے یہ پیچھے سارے کالج میں دوڑتے رہے۔

□ □

محنت کشوں کیلئے
عدل و انصاف

حکومتِ آندھرا پردیش نے چیف منسٹر این۔ ٹی۔ راما راؤ کی زیر قیادت دو سال سے زائد عرصہ کے دوران محنت کشوں کے کئی فلاحی پروگراموں پر کامیابی کے ساتھ عمل آوری کی ہے۔

ریاست میں اس وقت پر امن صنعتی ماحول پایا جاتا ہے جو معاشی ترقی اور صنعتی پیداوار کے لئے بے حد سازگار رہے۔

محنت کشوں کی فلاح کے لئے کئے گئے چند اقدامات

* غیر منظم محنت کشوں کی اُجرتوں میں سالانہ 180 روپے سے 345 روپے کا اضافہ کیا گیا۔
* اقل ترین اُجرتوں کا روزگار کے 48 زمروں میں نفاذ عمل میں لایا گیا جس سے ایک کروڑ مزدوروں کو فائدہ پہنچا۔
* 3 لاکھ غیر منظم مزدوروں کے لئے 73 نئے اداروں کی اقل ترین اجرتوں کو نافذ کرنے کی غرض سے شناخت کی گئی۔
* تقریباً 5 لاکھ ضعیف زرعی مزدوروں کو ماہانہ 30 روپے وظیفہ منظور کیا گیا۔
* ایجنسی علاقوں اور پہاڑی علاقوں میں کام کرنے والے قبائلی مزدوروں کے لئے پہلی دفعہ اقل ترین اجرتوں کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔
* کنٹراکٹروں کے تحت یومیہ مزدوری پر کام کرنے والوں کے لئے 11 روپے 50 پیسے فی یوم مزدوری مقرر کی گئی۔
* علاوہ۔ جز۔ مثلاً محنت کشوں کو اقل ترین اجرتیں اور سماجی تحفظ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں

* اے۔ پی۔ شاپس اور اسٹابلشمنٹ ایکٹ کو مزید 91 اداروں کے ایمپلائز پر لاگو کیا گیا ہے۔
* 415 صنعتی تنازعات کی یکسوئی کر دی گئی۔
* خفیہ رائے دہی کے ذریعے صنعتی یونٹوں کے انتخابات کرائے گئے۔
  50 ہزار مزدوروں نے رائے دہی میں حصہ لیا۔
* صنعتی مزدوروں کو اقساط کی بنیاد پر 4532 مکانات فروخت کئے گئے۔
* ویج کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر جیوٹ کی صنعت میں کام کرنے والے محنت کشوں کی اجرت میں 100 روپے ماہانہ کا اضافہ کیا گیا۔ جس سے 25 ہزار مزدوروں کو فائدہ پہنچا۔

مزدور کا اطمینان

پیداوار میں اضافہ کا ضامن ہے
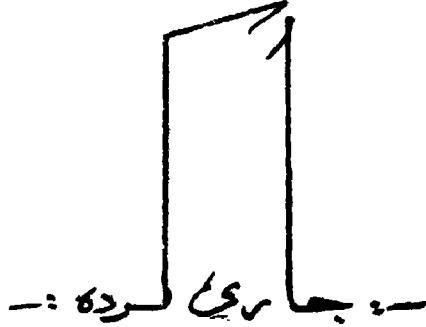
جاری کردہ :۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

DIPR - PDL - 5/Advt. II/C4/85.

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے

نرودھ   کاپر ٹی   کھانے کی گولی
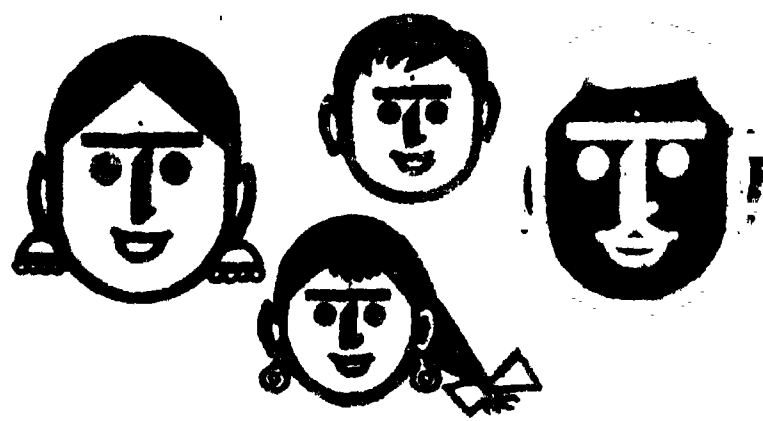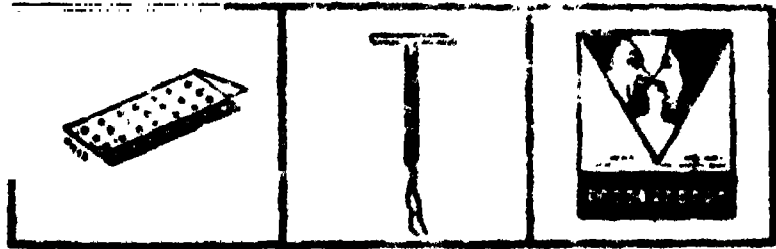
کوئی بھی طریقہ اپنائیے

مرزا کھونچ - نیا ٹولہ بیتیا

اور میں چناؤ ہار گیا

جی ہاں، قدرداں، مہربان، ناقدران، یہ بات ایک سو ایک فی صد سچ ہے کہ اب کی بار بھی میں پرانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس چناؤ میں ہار تو گیا ہی، ضمانت بھی نہیں بچا سکا۔ ہزاروں جتن کیا، لاکھوں کوششیں کیں کروڑوں ہتھکنڈے استعمال کیے، مگر ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ میں ہار گیا، لٹ گیا، برباد ہو گیا! ایک ایک کپ چائے کے لئے محتاج ہو گیا!

ویسے مجھے اب کی بار ہارنے کا ایک انگل بھی شک نہیں تھا! اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو چمچوں کے کہنے پر اتنا نہ خرچ کر دیتا کہ دیوالیہ ہی ہو جاتا! پارٹی سے ملنے والی رقم کو ایک مشت بچا لیتا۔ چناؤ کا نتیجہ نکلتے ہی چائے والے نے اور محلے کے پنساری نے باقی نہ دینے کی نوٹس دے دی ہے۔ چناؤ کے درمیان جو سسرال سے قرض لیا تھا اسے نہ ادا کرنے کی امیدیں بیگم کی نظر میں اس قدر عیاں ہو گئیں کہ اُن پر سیری بیٹھی ہوا دھاک مٹ گیا ہے اور سسرال میں میری ساکھ بالکل ختم ہو گئی ہے۔ بڑے بینروں کے سلسلے میں جو بے مقصد کپڑے ضائع ہوئے نہیں بچا لیتا تو کم سے کم اب کی عید میں بچوں کو کپڑے تو ضرور سل جاتے! میرے بچے انہیں بھی اب کی عیدیں پرانے ہی کپڑوں پر اکتفا کرنا پڑیگا! اگر ان کے نانا نانی مہربان ہوئے تو ان کے پیسے نئے کپڑے کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ پر میرا کیا ہوگا؟ اب کر بھی کیا سکتا ہوں، سوا اس کے کہ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر یہ شعر گنگناؤں ۔

دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے
بعد وہ ٹنگ لٹ لپٹ کر رہ گئے

یہ کیسے ہوا؟ میں کیوں ہارا؟ ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا عوام نے مجھ سے وعدہ خلافی کی ---؟ کیا میرے چمچوں نے کھایا میرا اور گن گایا میرے رقیب رُوسیہ کا؟ کیا میری قسمت ہی کھوٹی تھی؟ کیا اس نجومی نے میرے ساتھ دشواش گھات کیا، جس نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر یہ کہا تھا کہ "آپ کے ہاتھ کی ریکھا فلمی ریکھا سے کم نہیں ہے۔ آپ چناؤ کے درمیان اسکینڈلوں سے گھرے رہیں گے! کبھی یہ افواہ اٹھے گی کہ آپ فلاں امیدوار کی

طرف داری میں بیٹھ گئے ہیں ، اور کبھی یہ افواہ اڑائی جائے گی کہ آپ کی طرف داری میں فلاں امیدوار بیٹھ گیا ہے! مگر آپ ہی رہیے گا! قسمت والوں کے ہی لیے اسکینڈل بنتے ہیں!' ہائے انتخاب کے درمیان میرے لیے افواہیں تو ضرور اڑائی گئیں مگر میں قسمت والا نہیں ثابت ہوا!

ممکن ہے میری تقریریں ہی موثر ثابت نہیں ہوئیں ؛ حالانکہ جہاں جہاں بھی میں تقریر کرنے گیا' میرے کارندوں نے اچھی بھیڑ اکٹھا کر لی تھی۔ میرے ہر جملہ پر خوب تالیاں بجائی گئیں۔ کالا جھنڈا دکھایا گیا نہ گندے انڈے پھینکے گئے نہ مردہ باد کے نعرے ہی لگے۔ میں جہاں جہاں گیا میرے مدّاحوں نے مجھے پھولوں سے لاد دیا۔ میں مجسّم گلزار بن گیا تھا! مگر افسوس میرے بدن پر پھینکے گئے گلاب تو سوکھ گئے ہیں لیکن ان کے کانٹے اب چبھ رہے ہیں۔ کیا میرے انتخابی منشور لکھنے والوں نے کوئی شرارت کی ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا مینی فیسٹو ہی اوٹ پٹانگ طریقے کا ہو ؟ یا ممکن ہے ایسا مینوفیسٹو ہو' جو عوام کی سمجھ سے بہت اونچا ہو! کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں کمی ضرور تھی کہ میں چناؤ میں ہار گیا۔

ذات پات اور مذہب کا واسطہ دے کر میں نے ووٹروں کی قوت فیصلہ کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا' ان کی عقل سلب کر لینے کی کوشش کی تھی ۔ پورے انتخابی ماحول کو تقریباً زور سے مذہبی جنون کا شکار بنانے کی کوشش کی تھی مگر افسوس ۔ صد افسوس' ساری تدبیریں الٹی ہو گئیں میں نے جو ان سے وعدے کیے۔ انھوں نے مجھ سے وعدے کیے مگر یہ بات مجھے اب سمجھ میں آئی کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے ۔ میں نے انتخاب کے درمیان عوام کو مساوات کے جو درس دیے تھے شاید یہ جاہل عوام نہیں سمجھ پائے! ورنہ جیتنے کے بعد واقعی میں اپنے کیے گئے مساواتی وعدوں پر کاربند ضرور ہو جاتا! یہ میرا پختہ ارادہ تھا' کیونکہ میری نظر میں مساوات کا ایک میزان ہے کہ سب کو ایک کر دوں! جاہل کو عالم کے ساتھ ، شریف کو رذیل کے ساتھ کروڑی مل کو بھکو کے ساتھ! استاد اور شاگرد ایک ساتھ بیٹھ کر سگریٹ پی سکتے ہیں ، سینما دیکھ سکتے ہیں ، کسی جاتی ہوئی شوخ حسینہ پر فقرے کس سکتے ہیں ، اپنی داستانِ عشق ایک دوسرے کو سنا سکتے ہیں۔ وفادار غدّار کو آنکھیں نہیں دکھا سکتا' ورنہ وفادار کی آنکھیں نکال لی جائیں گی۔ محکوم اور حاکم دونوں ایک دوسرے کو حکم دیں گے ۔ چور اور سپاہی کو پکا دوست بنا دیا جائے گا۔ چھوڑیئے ان باتوں کو' جب میں ہار ہی گیا ہوں تو مساوات کی قسموں کو کہاں تک گنواؤں !

اب تو یہ ڈر ہونے لگا ہے کہ کہیں پارٹی سے نہ نکال دیا جاؤں ۔ کیوں کہ اب کی بار تو میں نے پارٹی کی آنکھ میں دھول جھونک کر ٹکٹ حاصل کیا تھا۔ اگر جلد ہی اپنی معاشی حالت بحال نہ کر سکا تو بیگم مائیکے تو ضرور چلی جائے گی۔ کیونکہ مشہور فلمی گانا

"میں مائیکے چلی جاؤں گی تم دیکھتے رہیو"

کیسٹ پلیئر پر روز روز دھوم دھڑلے سے بجا رہی ہیں! ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میرے بچّے مجھے ابا کہنے سے بھی گریز کرنے لگیں۔ بلکہ مجھے ادھر دیکھ کر اپنا منہ اُدھر کر لیں اور گنگنا گنگنا کر کہیں ۔

"میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے"

اب میرا گھور سے نکلنا دشوار ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی پوری فضا میں یہ سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں کہ
"وہ جا رہا ہے دیکھو الیکشن میں ہارے"
اور میں یہ سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ انہیں یہ کون سمجھائے کہ ع
میں ہارا نہیں ہوں ہرایا گیا ہوں!

ممتاز مہدی حیدرآباد

تخلستان کے چکنے گھڑے

انجمن تخلستان کی جب بھی کوئی بیٹھک ہوتی ہمارے ایک دوست ایسی کوئی چکنی تجویز پیش کرتے کہ کوئی نہ کوئی اس تجویز کی لپیٹ میں آجاتا اور بسا اوقات اس چکر میں سب ہی اس طرح گھوم جاتے، یقین ہوجاتا کہ یہ دنیا گول ہے۔

ایک بار چکنے دوست ہم ارکان تخلستان مفلسان کو کھینچ کر ایک بہت بڑی ایرانی کا ہوٹل لے گئے۔ چکنے چکنے فرش کو ہم نے اپنی پلاسٹک کی چکنی چپل سے پیر نکال کر رگڑ رگڑ کر دیکھا واقعی ایرانی سیٹھ سے بھی زیادہ چکنا فرش تھا۔ ہوٹل کے ایک مخصوص کمرے میں انہوں نے ہم سب کو یہ کہتے ہوئے ٹھونس دیا کہ چکنی چیزوں کا آرڈر یہیں بیٹھ کر دینا پڑتا ہے۔" چکنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہم نے اس شارٹ کمرے کو بہ نظر غائر دیکھا۔ چکنا چکنا فرنیچر ہماری انگلیاں چکنی مرمریں، کنواری میز پر رقصاں تھیں۔ دیواریں چکنی لکڑی کی بنی تھیں جن پر نقش و نگار لٹنے پھلنے لگ رہے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ ساری چکنی چیزوں پر یوں پھسلیں کہ وہ بھی اور ہم بھی گھر تک چلے جائیں۔ یکایک ایک شمیم شمیم بیرے نے آکر اپنی آواز پھر پھڑائی تو ہمارے چکنے دوست نے لڑکھڑاتے لہجے میں آرڈر دیا۔ "چکن کری" بیرے نے جواب میں کہا۔ کیا صاب چکنی فرائی اس نے اتنی چکناہٹ سے چکنی فرائی کہا کہ ہمارے چکنے دوست لفظ "چکن کری" بھول گئے اور چکنے لفظ پر پھسل کر کہا۔ "وہ ایک ہی بات ہے ذرا جلد لے آؤ ——" آدھے گھنٹے تک ہیبت ناک بیروں کی دھپ دھپ کا انتظار کیا گیا، آخر وہ سنائی دی تو چکنے دوست نے کہا "دیر آید درست آید۔ اب ہمارے آگے عجیب و غریب سالن دھرا تھا۔ ہمارے چکنے دوست گڑبڑائے۔ بیرے سے لڑپڑے۔ یہ کیا اٹھا لائے۔ اتنی دیر انتظار کروا کر بیرے نے دھیمے سے کہا۔ "چکنی فرائی" اس کو اتنا ٹائم ضرور لگتا ہے۔" وہ گیا تو چکنے دوست نے بڑی متانت سے کہا "کھاؤ دوستو!" دوستوں نے چکنے چکنے پلیٹ سنبھالے اور مرغ کا چکنا چکنا گوشت مسلسل بیس منٹ تک بنا رکے کھاتے چلے گئے یہاں تک کہ چکنے پلیٹوں میں جو چکناہٹ بچ رہی تھی "ماڈرن آرٹ" کا مکمل نمونہ پیش کر رہی تھی۔ بیرا آیا، بل پوچھا گیا، اس نے بھدے سے بتایا ۹۰ روپے۔ ہمارے چکنے دوست کا حلق خشک ہوگیا، کہنے لگے "بیرہ، پہلے ایک گلاس پانی تو لانا" بیرہ دوڑا۔ پانی لانے اور ہم دوست لگے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے۔ سب کے چہرے سے چکناہٹ چھوڑ چکے تھے

ہرایک کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا دوسرا رنگ جارہا تھا، اپنی خانہ تلاشی پر ایک اٹھنی کے وجود کا احساس ہوا۔ آہستہ آہستہ چکنے ٹیبل پر چند روپے چکنے فقروں کے ساتھ آنے لگے، "یہ ممی کی ٹانک کے تھے" "یہ ہمشیرہ کے چپلے کے تھے" "یہ میری بنیان کے ..... " جوں توں نوّے (۹۰) کا ٹارگٹ مکمل ہوا۔ ہم نے چکنے اٹھنّی کے سکّے کو پتلون کے خانے میں دبائے رکھا اور اعلان کردیا "ہم بالکل نل (Nil) ہیں"

اراکین نخلستان حواس باختہ ہوٹل سے نکلے۔ ہم نے اپنی چکنی اٹھنّی جراب تک مٹھی میں دبائے رکھی تھی باہر نکالی۔ وہ رو رہی تھی، ہم نے اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، اس کے آنسو پونچھے اور دلاسا دیا کہ "مجھے بھی افسوس ہے کہ تو اب کسی اور کی جیب میں جارہی ہے"۔ ہم نے پان کے ڈبّے سے چکنی سپاری کی پڑیاں خریدیں اور سوگوار دوستوں میں چہرے پر مغموم سی کیفیت طاری کرکے تقسیم کردی، اب جو چلے تو سب کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ زبردستی ہم نے اپنی ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کی۔ بارش کا موسم تھا۔ سب کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔ دوستوں سے مطابقت کی غرض سے ہم نے دو تین بار نالے میں ڈبکیاں کھائیں۔ اور سر سے پاؤں تک اپنے وجود کو کیچڑ سے چکنا کرلیا۔ گھر پہنچے تو گھر والی کے منہ بے ساختہ ہائے نکل گئی، ہم نے ایک سانس میں روداد نخلستان مفلسان بیان کردی انھوں نے ہمارے دوستوں کو ڈھیر سے کوسنے دیئے اور زنانہ گالیوں سے ہمیں نوازتے ہوئے اپنے کام میں مشغول ہوگئیں۔

ہوٹل سے متعلق ہی ایک اور معرکہ عرض ہے کہ ہمارے چکنے دوست اس وعدہ کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے کہ صرف چکناہٹ بھری چائے پی کر نکل جائیں گے، لیکن چکنے ٹیبل کرسی کو سنبھالنے سے پہلے ہی ان کی نظر ایک چکنے مرتبان پر پڑی کہنے لگے "بیوسی مٹھائی" کھائیں گے۔ بیرے سے کہا "بیوسی مٹھائی لے آؤ"۔ بیرے نے سمجھایا "سرکار وہ بیوسی مٹھائی نہیں پنیر ہے بلیرٹ" چکنے دوست اس کی کہاں ماننے والے تھے، اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بیرے کا چہرہ لال ہوگیا۔ اس نے جھٹ پٹ اس سفید سفید متنازعہ چکنی چیز کو لاکر غصہ سے پٹخ دیا۔ آدھا آدھا ٹکڑا ہم دونوں نے منہ میں رکھا ہی تھا کہ اس کھارے پنیر نے ہم دونوں کے معدوں میں موجود ساری غذا کو منہ کے راستے سے باہر لالیا۔ ہمارے منہ کے کھارے پن نے ہم سے ہوٹل میں "ڈسکو ڈانس" کروا ہی دیا، ساتھ میں ہم نے ہر ٹیبل سے پانی بھری گلاس اٹھا کر ہوٹل میں اپنی کلیوں سے فوارے سجادیئے۔ گاہکوں کے قہقہے ہماری ہستی کو ملیامیٹ کررہے تھے۔ غصے سے بھرا بیرہ بھی اپنی ہنسی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ بالآخر فرمائشی قہقہہ اگلتا ہوا بولنے کی کوشش کرنے لگا "میں پہلے ہی ...... بولا .... ایک کلی جب اس کے وجود سے ٹکرائی تو وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا۔

انجمن نخلستان کی ایک نشست میں، چکنے دوست کی تجویز یہ تھی کہ موسم گرما کے پیش نظر ارکان انجمن نخلستان اپنے اپنے سر گھٹوالیں اور سب کے سب چکنے چکنے ہوجائیں۔ اس تجویز کی مخالفت کرنے والے اقلیت میں تھے، صبح سے شام تک کی بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت نے سختی میں اضافہ ہی کیا، ہر جگہ اقلیت کا گلا بے دردی سے گھونٹا جاتا

ہے اور بالآخر ایک سفید چکنے کا غذ پر اقرارنامے کے دستاویز پر دستخط کے لیے اصرار کیا گیا اور دستخط نہ کرنے والے کا خطاب "آپا جان" قرار پایا۔ کانپتے ہاتھوں سے ہم نے دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ لیکن چکنے دوست نے دستخط نہیں کیے تھے۔ اس پر کسی نے غور نہ کیا، وہ ہمارے ساتھ اصلاح خانہ تک آئے اور اصلاح خانے میں چھٹی کرسی کے نہ ہونے کی وجہ باہر ہی ٹھہرے رہے اور اب ہم پانچوں کرسیوں پر پانچوں ارکان انجمن نخلستان براجماں اپنے بال کا دان دے رہے تھے۔ ہمارا حجام چلبلا سا تھا۔ اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قہقہوں کو روک رہا تھا۔ چونکہ سر منڈھانے والے اکثریت میں تھے۔ اور وہ حفظ ماتقدم کے اصول پر کاربند تھا۔ اقلیت حفظ ماتقدم کے اصول سے واقف نہ ہو تو مٹ جاتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سر چکنے ہو گئے۔ ہمارے حواس جاگنے لگے، ہمارا دماغ سوچنے لگا آیا ہم نے کسی درست فیصلے پر دستخط کیے تھے۔ لیکن تمام چکنوں کو دیکھ کر ہمت بندھتی تھی کہ فیصلہ غلط نہیں بلکہ بالکل ٹھیک ہے۔ جونہی حجام نے اپنی مسکراہٹ کو گول گپے میں تبدیل کرنے کی جرارت کی تو ہمارا دل بیٹھ گیا۔

بادلِ ناخواستہ اب جو ہم نے گھر کی راہ لی ہماری ملاقات چکنے دوست کے دوست سے ہو گئی ان کا تعلق انجمن نخلستان سے نہ تھا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ہمارے چکنے دوست سب کے سر کی صفائی ادھر کی اور خود بنگلور کے لیئے روانہ ہو چکے ہیں۔ جس طرح سخن فہم حضرات برمحل شعر اچھالا کرتے ہیں۔ چکنے دوست کے یہ دوست بھی برمحل لطیفہ گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہم سب کے جسموں کے اوپری حصّے میں اتنا بڑا تغیّر بلکہ انقلاب عظیم دیکھا تو لطیفہ زن ہو گئے۔ بعنوان فرمایا "شاکر یا ذاکر" لطیفہ آپ بھی سن لیجیے۔

ایک بار دو جیالے دوست سنیما ہال میں سنیما بینی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ان کو سنیما ہال میں ایک چکنی (سر صفا) نظر آ گئی۔ دونوں کے ہاتھ کھجانے لگے۔ پہلا دوست دوسرے دوست سے ہاتھ ملا کر ہاتھ چکنا کرتا ہوا چکنی کی بلند والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جم کے دھول جمادی۔ جب وہ ہکا بکا ہو گیا تو جیالے نے کہا: "معاف کرنا دوست میں تمہیں صابر ہمارا دوست سمجھا تھا"۔ وہ فاتح و کامران ادھر لوٹے اور ادھر اس نے اپنی نشست تبدیل کر دی، یہ دیکھ وہ دوبارہ پہنچے، اب کی بار حملہ پیچھے سے کیا یہ کہتے ہوئے کہ "صابر! یہاں بیٹھے ہو"، صورت دیکھ کر "ارے یار دوبارہ تم ہی ہو" سہ بارہ چکنی نے اپنی نشست تبدیل کرنے کی جرارت کی تو جیالے نے تیسری بار کہا "میاں صابر! اب تک دو بے چارے صبر کے لقمے کھا چکے ہیں، اب تو تو بچ نہیں سکتا۔" اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ اپنا کمال دکھاتا چکنی نے ان کے گال یہ کہتے ہوئے سرخ کر دیئے کہ "میرا نام شاکر تخلص ہے۔ دو حملوں کا شکریہ لیکن "ہیٹ ٹرک" تو ہونے نہیں دوں گا۔" اور وہ سینما ہال ہی سے رفو چکر ہو گیا۔"

چکنے دوست کی فراری اور لطیفے نے ہماری کیفیت دگرگوں کر دی، ہم نے سوچا ہمارے محبوب مشغلے سنیما

بچی کا کیا ہوگا۔ یار دوستوں کی زبردستی سے کبھی تھیٹر چلے گئے تو ہمیں جنگ و جدال کے لیے ہمیشہ تیار رہنا ہوگا اور یہ خیال ہی کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ جھجکتے جھجکتے دولت کدے میں قدم رنجہ ہوتے تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگیا بچوں کی خاصی بڑی تعداد (جو بدقسمتی سے ہمارے دولت کدے کی رونق بایب ہے) نے تان اسٹا پ قہقہوں کی باڑھ لگادی۔ لطف کی بات یہ کہ سارے بڑے بھی رفتہ رفتہ بچوں کی محفل قہقہہ میں شامل ہوتے گئے اور مسلسل ڈھائی گھنٹے تک جانے کتنے کروڑ قہقہوں کی بارش ہوتی رہی اور ہماری حالت تحت اللفظ میں طویل بحر کے ساتھ یعنی کہ ع

بنا کے چکنی ہم اپنی تماشہ دکھاتے ہیں اہل کرم کو

چھوٹی بہن نے بلا تکلف ایک سالم چکنی کی پوری سر پیرا نڈیلتے ہوئے فرمایا "چکنی سے چکنی کا سنگم ہوا" کیا بچوں نے کامنٹری شروع کردی جیسے ہم کھا نا کھا رہے ہوں تو کہتے "چکنی" کھا رہی ہے"۔ جب آرام کے لیے لیٹے تو کہتے۔ "چکنی سو رہی ہے"۔ خیال آیا کہ ع

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

سوچتے با دحشت ہم نے کھڑے کھڑے گھر میں یہ کون سی آفت اپنے وجود پر نازل کرلی تھی۔

ایک سب سے چھوٹی منّی نے تو غضب ہی کردیا، گھر میں جب بھی داخل ہوتے تھے "چاچا" کہہ کر لپٹ جاتی تھی۔ لیکن "حالت زار" کو جو دیکھا تو اتنی سہم گئی بلکہ گھبرا گئی کہ جب بھی نظر پڑتی بھاگ کر اپنی امی کی گود میں امان پاتی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ہمیں گہری اور چکنی نیند چیر(آ) چکی تھی، وہ ڈرتے ڈرتے ہمارے قریب آئی ہمت سے کام لے کر آہستہ سے سر کو چھو کر دیکھا، جب بھلا محسوس ہوا تو سہلانے لگی اور سہلاتے سہلاتے جو بیدار ہوگئی تو ایک جم کر جما دیا، اور ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

یہ تو رہا گھر کا افسانہ محلہ میں بھی چلنا پھرنا محال ہوگیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرتی تھیں ہم کو دیکھ کر کورس شروع کر دیا۔

چکنی ہانڈی چاٹنا، پیسہ لے کے بھاگنا، چکنی ہانڈی، چائے گرم، پینے والا......

ہماری انجمن گلستان کے "ہیڈ گھڑے" (یعنی صدر صاحب) سے سر بازار ملاقات ہوگئی۔ وہ بہت دیر تک ہم سے گلے ہی ملتے رہے۔ جب سنجیدہ ہوئے تو ہم نے پوچھا "خیریت ـــــــ؟" کہنے لگے۔

"خیریت واللہ کیا کہنے بہت چستی آگئی ہے"۔ ہم نے "ہیڈ گھڑے کے ہیڈ (یعنی سر) کی طرف اشارہ کیا۔ خیریت تو اس کی پوچھیئے" کہنے لگے۔ "مت پوچھو یار بلکہ میں خود حیران ہوں اس کھوپڑی کی ہمت دفاع کو دیکھ کر جب سے حادثہ سر صفائی ہوا ہے کوئی ایک ہزار تین سو چھتّر ٹھونگے، ٹھولے اور چپت سے پذیرائی ہوئی ہے"۔ کچھ رنجیدہ خاطر ہوئے پھر گفتگو جاری رکھی کہ "یار اب ہمارے لیے دعوتیں بھی مسئلہ ہو گئی ہیں پرسوں

ایک دعوت میں گھس گیا' دعوتیوں نے مجھے بیچ محفل میں بٹھا کر وہ طبلہ بجایا کہ توبہ ہی بھلی۔ اب آئندہ سے بن بلائے کی دعوت تو کیا اپنے قریبی رشتہ دار کی دعوت میں بھی نہیں جاؤں گا" اور ہم نے بھی یہ معقول پائینٹ نوٹ کرلیا۔

ہمارے ایک گیسو دراز دوست ملے اور انھوں نے کہا" کیا جناب والا آپ نے بھی' میرا مطلب ہے ...... آپ نے بھی فیشن شروع کردیا" ان سے پتہ چلا کہ بال کو آگے بڑھا لیجئے یا صاف کر دیجیے آج کے فیشن کی پہلی پہچان ہے۔ پھر لیکا یک سر سے وگ نکالی تو دیکھا کہ ان کا سر بھی چکنا یعنی صفا چٹ ہے کہ ان کے دراز گیسو ان کے والد نے غصّے سے اتروا دیئے تھے کہ فرزند کا چہرہ بشرہ اپنی والدہ سے ملتا جلتا تھا۔ وگ پھرتی سے اس لیے نکالی تھی کہ ان کے والد کی سواری مبارک آرہی تھی۔ وگ خریدنے کی وضاحت یہ کی کہ "بوڑھاپن" کا جب دور آئے گا تو فیشن کے دائرے سے نکل جائیں گے لہذا مستقبل کا بندوبست ابھی سے کرلیا تھا۔ ہمارے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "یار! سچ سچ بتا' تجھے کیا سوجھی ؟" ہم نے کہا ع

"ہزاروں غلطیاں ایسی کہ ہر غلطی پہ دم نکلے"

خلفشار کی آبشار میں گرفتار رہا رہے کھولتے ہوئے دماغ نے بغیر بالوں کے سوچا کہ انجمن نخلستان کی جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور دوست برادری پر لعنت بھیج دیں .... لیکن بڑے سے بڑے مشاہیر بھی دوستوں کے عذاب سے آزاد نہ ہوسکے۔ ہر شے سے چھٹکارا ممکن ہے لیکن دوستوں سے نہیں بچ سکتے۔ قیامت تک یہ نخلستانیں آباد رہیں گے۔ اور نخلستان کے چکنے گھڑے ہر لمحہ عزت کی بے عزتی کے لیے آمادہ بیکار رہیں گے قیمتی وقت برباد کریں گے —— جی تو چاہتا ہے کہ زور زور سے چیخیں۔ لیکن جانتے ہیں کہ یہ صدائیں صدا بصحرا ہو جائیں گی —— کہ

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ
مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

●●

رضا نقوی واہی پر پی ایچ ڈی

اردو کے مشہور و معروف مزاحیہ شاعر جناب رضا نقوی واہی کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر محمد عقیل اشرف نے رانچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انھوں نے یہ مقالہ ڈاکٹر وسیم الحق کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر عظیم احمد مقالے کے ممتحن تھے۔ مقالے کا عنوان "رضا نقوی واہی کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ" تھا۔

دن بھر کی
خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے

مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
منھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ
کارخانہ زندہ طلسمات - حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳

JUNE 1985

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

جلد ــــ ۱۸
شمارہ ــــ ۶

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جون ۱۹۸۵ء

قیمت: ۳ روپے، زرِ سالانہ: ۳۰ روپے؛ بیرونِ ہند سے ۱۰۰ روپے
کتابت: محمد عبدالرؤف؛ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان۔ حیدرآباد
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ بیچلر کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد
فون: آفس 557716، رہائش: 521004

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

داستان ٹھگوں کی ـــ یوسف ناظم ـــ ۷
ایک خط۔ خاتون افسانہ نگار کے نام ـ پروفیسر یداللہ مہدی ۱۳
بچپن کے دن بھی . . . ـــ رؤف خوشتر ـــ ۱۷
بس سے بے بس ـــ جاوید کمال ـــ ۲۷
مٹھو میاں سسرال ـــ عزیزہ صدیقی ـــ ۳۱

افسانچے

دھجیاں ـــ عابدہ محجوب ـــ ۲۱

میرا شہر . . . .

کلکتہ کی سیر ـــ سلطان جمہوری ـــ ۳۵

قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومرادلیکس کے لیے ـ عطاء الحق قاسمی ۳۹

حق تو یہ ہے . . . (ترجمہ)

چائے تو آخر چائے ہے ـ اوتار کرشن رہبر / منصور احمد منصور ۴۴

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بات چیت ـ کرنل محمد خاں سے ـ طاہر مسعود ۴۷

چورن (منظومات)

اسمٰعیل ظریف ـــ ۲۰ ـــ نسیم سحر ـــ ۲۰
ادب سندیلوی ـــ ۲۴ ـــ بیکلس ـــ ۲۴
باز غ بہاری ـ ۲۵
خرافات ـــ مُراسلے ـــ ۵۶

ماہنامہ

کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر : یوسف ناظم

○ ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں :-
گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی) دلونت بھٹ اور نگن بھائی لال مہتا (گجراتی) فتور آنند (اڑیا) راؤ (تلگو) بیچی (کنڑا) ایپا پانی کر (ملیالم) مکھوپادھیائے (بنگلہ) ڈاکٹر محمد یاں آذر (کشمیری) شرن پورن شرما (راجستھانی) شرد جوشی (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم۔

○ ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ :-
وے دیش ٹھاکر (ہندی) ہمانیش گوسوامی (بنگالی) عزیز تمنائی (ٹامل) این دی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ (تلگو) شیام سندر مصرا (اڑیا) ڈاکٹر سکنیا جوہری (گجراتی) حمید الماس (کنڑی) ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی) ڈاکٹر اعجاز مدنی (مرہٹی) پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم) کرت بابانی (سندھی) ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی) ، ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی) اور بشیر منذر (کشمیری)

○ اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :- ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم۔

○ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء۔ ○ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں :- فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پرویز یداللہ مہدی کے منتخب مضامین اور خود نوشت سوانح۔ ○ پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیا گیا ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا انٹرویو

○ مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی ○ تخلیق کاروں کی تصویریں اور دوسری دلچسپیاں۔

○ خوبصورت دو رنگی سرورق — سعادت علی خان

○ ضخامت : ۳۸۶ صفحات

○ قیمت : ۵۰ روپے

○ سالانہ خریداروں سے ۴۰ روپے، ۵ روپے زائد بھجوانے پر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا۔

یوسف ناظم

داستان ٹکٹوں کی

ٹکٹ بیسیوں قسم کے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو اپنی روزمرہ زندگی میں کسی نہ کسی ٹکٹ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ ان ٹکٹوں کی شکل و صورت، قد و قامت اور جسامت یہ ساری چیزیں الگ الگ نمونوں کی ہوتی ہیں۔ ان میں بس ایک ہی چیز مشترک ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ سب کے سب بہت گراں ہوتے ہیں اور کسی بھی دن ان کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے یہاں صرف محبوب کی کمر نہیں ہوا کرتی تھی۔ اب عوام کی بھی کمر نہیں ہوتی۔ یہ ٹوٹ چکی ہے۔

بس کے ٹکٹ ہوا میں اڑنے والے ٹکٹ ہوتے ہیں۔ تتلی کے پروں کی طرح ہیں لیکن حسین نہیں، چھوٹے چھوٹے مستطیل شکل کے یہ ٹکٹ چھپتے تو کاغذ ہی پر ہیں لیکن اس نمونے کا کاغذ صرف محکمۂ ٹرانسپورٹ کے قبضے سے برآمد ہو سکتا ہے۔ یہ کاغذ خصوصی طور پر صرف اسی محکمے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ اسے کسی دوسرے مصرف میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بسوں سے سفر کرنے والے مسافروں کو بیک وقت کئی پرزے پکڑا دیے جاتے ہیں جو علاحدہ علاحدہ قیمتوں کے ہوتے ہیں اور کوئی بھی مسافر ان کی رقم ٹھیک سے جوڑ نہیں سکتا۔ کافی سفر اسی جمع تفریق میں کٹ جاتا ہے۔ ٹھیک ہے بس میں دوسرا کوئی کام ہوتا بھی نہیں ہے اور بس کنڈکٹر ٹکٹ فروخت کرنے کے فوراً بعد روشنی گل کر دیتا ہے تاکہ کوئی مسافر ٹکٹوں کی رقم نہ جوڑ لے۔ بی ای ایس ٹی کی بسوں کے ٹکٹ پر کافی لٹریچر چھپا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ بس کے مسافر ادب عالیہ پڑھتے نہیں ہیں۔ پڑھنا چاہیے۔ ادب عالیہ پڑھنے سے مستقبل روشن ہوتا ہے لیکن مسافر اس ٹکٹ کے مطالعے سے اس لیے بھی محروم رہتے ہیں کہ یہ ان کے کھانے کا وقت ہوتا ہے یعنی دھکے کھانے کا۔ بس کی راہداری میں آدمی اور کیا کھا سکتا ہے۔ نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر بھی یہ ٹکٹ نہیں پڑھتے۔ ہر اسٹاپ پر ان کے ہم سفر کا تبادلہ عمل میں آتا ہے اور نئے ہم سفر کو دیکھنے، اس کے لباس کا جائزہ لینے اور اگر ہم نشیں کسی وجہ سے جنس مخالف سے تعلق رکھنے والا (والی) ہو تو اسے خطرے میں ڈالنے یا حفاظت خود اختیاری کے سلسلے میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ ٹکٹ پر کے مطبوعہ ادب سے وہ مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس محرومی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسافروں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے ٹکٹ کی قیمت کے علاوہ ایک اور ٹیکس بھی ادا کیا ہے جو پیدل چلنے والوں یا اپنی سواری میں سفر کرنے والے شہریوں

سے وصول نہیں کیا جاتا ہے۔

بس کا ٹکٹ خرید نے پر کچھ دنوں سے ٹکٹ کے ساتھ ایک اور پُرزہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے کوپن کہتے ہیں۔ اس کی طباعت کے لیے بھی محکمۂ مذکور وہی نادر و نایاب کاغذ استعمال کرتا ہے جسے کاغذ کہتے ہوئے بعض لوگ شرم محسوس کرتے ہیں۔ یہ کوپن ٹکٹ کے مقابلہ میں زیادہ نرم و نازک ہوتے ہیں اور اگر آپ انھیں چھوئیں تو محسوس تک نہیں ہوتا کہ آپ نے کوئی چیز چھوئی ہے۔ یہ اتنا اور ہلکا پھلکا شاید اس لیے ہوجاتا ہے کہ یہ ایک دن میں سو پچاس ہاتھوں کے لمس کا بار اٹھاتا ہے۔ اسے سونگھئے بشرطیکہ آپ میں اس کی ہمت ہو تو ہر کوپن سے ایک علاحدہ مہک آتی ہے۔ کسی سے ناس کی کسی سے دھنیے کی۔ کسی سے ساس کی کسی سے بینٹے کی۔ ان کوپنوں پر ان کی تاریخ وفات بعد درج ہوتی ہے جو ہرگز ہرگز نہیں پڑھی جاسکتی۔ بس کنڈکٹر البتہ دور میں متوفی کوپنوں کو پہچان لیتا ہے اور اس ڈیڈ باڈی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ بہت سے کوپن تو صرف اس لیے مرجاتے ہیں کہ آپ کو بس میں چڑھنے کا فن نہیں آتا۔ بس میں چڑھنے کے لیے جو لوگ بس اسٹاپ پر کھڑے رہنا پسند کرتے ہیں اُن کی قسمت میں بس کا سفر نہیں ہوتا۔ بسوں نے کب سے بس اسٹاپ سے اپنے تعلقات منقطع کرلیے ہیں۔ انھیں اب صرف وہی ہاتھ روک سکتا ہے جو کسی سیاسی جماعت کا نشانِ انتخاب ہو۔ باقی کے سارے ہاتھ تو صرف پھیلانے کے کام کے رہ گئے ہیں۔

بس کے ٹکٹ ایک ایسے کھلے ٹکٹ دان میں رکھے جاتے ہیں جو جست کے بنے ہوتے ہیں اور وقت پڑنے پر اسلحہ کا کام دیتے ہیں۔ مسافر بس کنڈکٹر کے مزاج اور اس ہتھیار کی ماہیت سے واقف ہونے کی بنا پر اپنی حد میں رہتے ہیں۔ مسافروں اور بس کنڈکٹروں کو آج تک آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ مسافروں کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی ہیں۔ بس کنڈکٹروں کے انتخاب کے وقت ان کی آنکھوں پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ جس امیدوار کا چہرہ کرخت اور آنکھیں خشمگیں ہوتی ہیں اس کا انتخاب یقینی ہوتا ہے۔ دوسروں کو ٹریننگ دینی پڑتی ہے۔ (ویسے جلال ہم نشین بھی کافی ہوتا ہے)

ریل کے ٹکٹ:۔ ریل کا ٹکٹ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ ہماری ریلیں۔ ہمیں چوں کہ مخطوطات اور نوادرات سے بھی شغف ہے اس لیے ہم نے بسا مقدور کوشش کی کہ ریل کے ٹکٹ کا کوئی قدیم نسخہ کہیں سے دستیاب ہوجائے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ ایک محکمہ کے کافی سینئر عہدہ دار نے البتہ ہمیں سمجھایا کہ ریل کے ٹکٹ کے قدیم نمونوں کی تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے کیوں کہ اس کا تازہ ترین ٹکٹ بھی دیکھنے میں کم سے کم پچاس سال پُرانا تو نظر آتا ہی ہے۔ ہم نے تازہ ترین ایڈیشن کا ایک ریلوے ٹکٹ اور ایک ۱۲، ۱۵ سال کے پُرانے ٹکٹ کا تقابلی مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں تصنیفات بجنسہٖ ایک ہیں۔

ریل کا ٹکٹ جیسا کہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کاغذ کا نہیں ہوا کرتا۔ یہ دفتی (جیسے مقوا بھی کہتے ہیں) کے ڈیڑھ انچ ضرب سوا انچ کے ٹکڑوں پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس ٹکٹ کا لمس ڈبل روٹی کے اوپری حصّے کی یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ ڈبل روٹی کا بالائی حصّہ عجیب و غریب خصوصیات کا حامل ہوتا ہے یہ نہ نرم ہوتا ہے نہ سخت۔ ریل کے ٹکٹ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ پھٹتا نہیں ہے۔ یہ اُس پُر غرور سر کی طرح ہوتا

جو جھک تو سکتا ہے کٹ نہیں سکتا۔ آپ کے ہاتھ کے پسینے کی نمی اسے بودا تو کر سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہاں آپ اسے کچھ دیر پانی میں بھگا کر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹکٹ تو کئی پرت کا تھا۔ ایک ٹکٹ میں ۱۴،۱۵ پشتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ یہ ٹکٹ بنیادی طور پر زردی مائل رنگ کا ہوتا ہے لیکن یہ اس کے رنگ کا صحیح نام نہیں ہے۔ اس کے رنگ کو ٹھیک طور پر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ٹکٹ کو دیکھ کر آپ معلوم کر سکیں گے کہ یہ کیسا رنگ ہے۔ نازک طبع خواتین کی نظر اس ٹکٹ پر نہیں پڑنی چاہیے۔ ان کی طبیعت بگڑ سکتی ہے (سفر میں بیمار ہونا مناسب نہیں ہے) اس ٹکٹ پر اور بہت سے مندرجات کے علاوہ اس کی قیمت بھی درج ہوتی ہے لیکن یہ منسوخ شدہ قیمت ہوتی ہے۔ اس کی اصل قیمت بکنگ کلرک اسی وقت لکھتا ہے جب آپ پیسے پیشگی ادا کریں۔ جس زمانے میں ہندوستان میں ریزگاری ہوا کرتی تھی اس وقت بھی باقی کی ریزگاری واپس نہیں کی جاتی تھی اور اب تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (محکمۂ ریلوے میں ایسی معمولی باتوں کا برا نہیں مانا جاتا) اگر آپ محکمۂ ریلوے کی مزید مالی مدد کرنا چاہیں تو اپنی نشست اور برتھ ریزرو کرا کے سفر کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ (مدد کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا کہ جب سے محکمہ وجود میں آیا ہے نقصان ہی چل رہا ہے) ریزرویشن کی صورت میں مسافروں کو ریل کے ٹکٹ کے علاوہ ایک ضمیمہ ٹکٹ دیا جاتا ہے جس پر بکنگ کلرک (جو اہلِ قلم ہوتا ہے) اپنا آٹو گراف قلم بند کرتا ہے۔ اس آٹو گراف میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اُسے آپ نہیں پڑھ سکتے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت جب کئی کئی لوگوں کی مدد حاصل کرنے کے بعد آپ ایک برتھ پر اپنا بستر کھول دیتے اور جوتے اتار دیتے ہیں (اور آپ کے موزوں سے نکلنے والی مہک پورے ڈبے میں پھیل جاتی ہے) تو کچھ ہی دیر میں غیب سے ایک اور مسافر اسی برتھ کا ریزرویشن کارڈ ہاتھ میں تھامے نمودار ہوتا ہے اور آپ کو حیرت سے دیکھتا ہے کہ آپ کس کرے کی مخلوق ہیں۔ آپ دونوں میں محبت کی گفتگو چھڑ جاتی ہے۔ یہ پُر لطف گفتگو اور دقت آمیز سفر دونوں ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے جاری رہتے ہیں اور کمپارٹمنٹ کے کئی مسافر اپنی اپنی عینکیں اور ضرورت ہو تو ٹارچ لے کر ان ٹکٹوں پر لکھے ہوئے رشحاتِ قلم پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسا کہ اس ملک میں قاعدہ ہے ہر شخص کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ جب حالات ایک خطرناک موڑ اختیار کر لیتے اور آپ دونوں فرطِ محبت میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں (جسے شاید دست و گریباں ہونا بھی کہا جاتا ہے) تو کہیں سے ایک وردی پوش شخص برآمد ہوتا ہے۔ آپ دونوں کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس شخص کے ہاتھوں میں کافی اسٹیشنری ہوتی ہے۔ ایک چارٹ بھی ہوتا ہے۔ اس شخص کو ریلوے کی مخصوص زبان میں ٹی ٹی آئی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس شخص کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ یہ شخص بھی بکنگ کلرک کا آٹو گراف پڑھنے کی سکت نہیں رکھتا اور اپنے پاس کے کاغذات اور دستاویزات کی مدد سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آپ کا اور آپ کے ہم جلیس کا نام اور پتہ پوچھتا ہے (اندھیرا زیادہ ہو تو جنس بھی دریافت کرتا ہے۔ دریافت کرنے سے مراد یہ ہے کہ صرف زبانی زبان سے استفسار کرتا ہے) اور اس کے بعد آپ کو (یاد رہے آپ بستر بچھا اور جوتے اتار چکے ہیں) اپنا بستر اٹھانے کا مشورہ دیتا ہے (مشورے کے لفظ پہ نہ جائیے۔ اصل میں حکم دیتا ہے)۔ ریزرویشن میں اس قسم کے واقعات پر ٹرین میں دو یا تین ہوتے ہی ہیں۔ اس لیے ان مسافروں کو عام مسافروں سے الگ رکھا جاتا ہے۔ (ریلوے کمپارٹمنٹ میں اصطبل کے ڈبے سے کچھ کم نہیں ہوتے) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریزرویشن کا کمپارٹمنٹ (اتنی ریزرویشن کا کمپارٹمنٹ دکھائی دیتا ہے

فرسٹ کلاس کے مسافروں کو ایک الگ رنگ کا ٹکٹ دیا جاتا ہے جو کئی رنگوں کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی نقل مشکل ہے۔ محکمہ فنانس کو بھی اپنی کرنسی کے لیے ایسے ہی نادر اور مشکل رنگ استعمال کرنا چاہیئے۔

ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھنے کے بعد ان پر کچھ لکیریں کھینچتا ہے۔ ان لکیروں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس محکمہ کا ہر کام کتنا پیچیدہ ہوتا ہے:

ہوائی جہاز کا ٹکٹ :۔ بعض اوقات اچھے خاصے شریف آدمی کو بھی ہوائی جہاز سے سفر کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اب تو نا وابستہ ملکوں کے ایک دوسرے سے وابستہ اور بغل گیر ہونے کے واقعات اتنے عام ہو گئے ہیں کہ ایسے لوگ بھی جنھوں نے سوائے پیدل چلنے کے اور کچھ کیا نہیں تھا، ہوائی جہاز سے سفر کرنے لگے ہیں۔ یہ لوگ سربراہان ملک کے عملے کے لوگ ہوتے ہیں۔ عملے کے لوگوں کے اعمال غیر ملکوں میں دیکھنے چاہئیں۔ کچھ لوگ تو اتنی عجلت میں ہوتے ہیں کہ ہوائی جہاز کے اُڑنے سے پہلے ہی اُڑنے لگتے ہیں اور ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد بھی کوئی سیفٹی بیلٹ انہیں اُچھلنے سے روک نہیں سکتی۔

ہوائی جہازوں میں بھی اب فرسٹ کلاس ہونے لگے ہیں۔ اس کلاس میں سفر کرنے والے معززین کو نسبتاً زیادہ مراعات دی جاتی ہیں مثلاً گلاس وغیرہ۔ (اس گلاس کا شاعرانہ نام جام یا ساغر ہوتا ہے) ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہایت خوبصورت، خوش نما اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ اسے تو کسی اکاڈمی سے طباعت کے انعام کا مستحق قرار دیا جانا چاہیئے۔ (لیکن ہمارے یہاں انگریزی زبان کی اکاڈمیاں ہی نہیں)

ہوائی جہاز کا ٹکٹ ۳ اوراق پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ۶ صفحات ہوتے (اچھی خاصی مثنوی ہو گئی) اس کا سرورق سہ رنگی ہوتا ہے اور یہ بے حد چکنے کاغذ پر جسے شاید گلیز پیپر کہتے ہیں پر چھاپا جاتا ہے) کاش ہمارے رسائل بھی ایسے ہی خوش نما ٹائیٹل پیج کے ساتھ شائع ہو سکتے لیکن رسائل اتنی اوپر کیسے اُڑ سکتے ہیں) ٹکٹ کی یہ کتاب بہت اونچے داموں فروخت ہوتی ہے اور جیسے جیسے سروس ناقص ہوتی جا رہی ہے ٹکٹ کے دام میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ایک زمانہ تھا (یہ بہت پہلے کی بات ہے) کہ ہوائی جہاز وقت پر اُڑا اور اترا کرتے تھے۔ جب ہوائی سروس کے ارباب مقتدر کو معلوم ہوا کہ ملک میں کوئی بھی کام وقت پر نہیں ہو رہا ہے تو پلین بھی دیر سے اُڑنے لگے اور بعض وقت تو دور دراز کے اندرون پردہ نگاہوں کی طرح منسوخ بھی ہونے لگے۔ جب کوئی ہوائی جہاز اُڑتا نہیں ہے تو اس کے مسافروں کو ایک اور ٹکٹ دیا جاتا ہے۔ یہ ایئرپورٹ کے ریستوران میں داخلے اور مُفت کھانے کا ٹکٹ ہوتا ہے اس ٹکٹ کی خوبی یہ ہے کہ ریستوران میں ملتا کچھ نہیں ہے۔ ریستوران کا منیجر اس ٹکٹ کو دیکھ کر ہنستا ہے یہ ٹکٹ دراصل تفریح طبع کے لیے ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر جتنا "مواد" چھپا ہوتا ہے اتنا تو تحقیقی مقالوں میں بھی نہیں ہوتا۔ بش اور مائکرو منی لباس کی طرح مائکرو منی طباعت بھی ایجاد ہو گئی ہے جس کا سہرا ایئر لائنس کے سر ہے۔ آپ ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ خریدیں تو سفر کرتے وقت کئی ٹکٹ سائڈ ڈش کی طرح چلے آتے ہیں۔ سامان کا ٹکٹ، سیٹ کا ٹکٹ، ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا ایک الگ ٹکٹ، یہ سب ٹکٹ بلا قیمت فراہم کئے جاتے ہیں۔ کافی اسٹیشنری جمع ہو جاتی ہے۔

ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی جامہ تلاشی یقینی ہو جاتی ہے۔ حاجیوں کی تلاشی کا انتظام حکومت کے خرچ پر کیا جاتا ہے لیکن ہوائی مسافروں کو اس کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ریل اور بس کے مسافر اس اعزاز کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہ تلاشی ایک علٰحدہ کمرے میں ہوتی ہے۔ کچھ آلات وظروف بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ پولیس کانسٹیبل بڑی محبت سے آپ کے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہے (اتنی محبت سے تو آپ کے والدین نے بھی آپ کو نہیں تھپکا تھا) اور اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ آپ کے جسم کا کوئی شعبہ چھوٹ نہ جائے۔ مسافروں کے بریف کیس اور خواتین کے منی پرس کا بھی ایکسرے کیا جاتا ہے۔ کاش ہمارے دواخانوں میں بھی مریضوں کے ایکسرے کا اتنا اچھا انتظام ہوگا۔ اس مفت ایکسرے کے علاوہ پیپر منٹ، سونف اور کان میں رکھنے کے لیے روئی کے پھاہے بھی مفت فراہم کئے جاتے ہیں (غالباً ان کا دہانہ لگا ہوا ہے) مسافر خوشی خوشی اس کشتی سے یہ چیزیں اٹھاتے ہیں جو ایک ایئر ہوسٹس ان کی خدمت میں پیش کرتی ہے لیکن ان کی نظریں چیزوں پر نہیں ہوتیں۔ (پتہ نہیں ہوائی جہازوں میں ایئر ہوسٹ کیوں نہیں ہوا کرتے)۔

کبھی کبھی مسافروں کو اشیائے خوردنی سے بھی نوازا جاتا ہے۔ کھانے کا اگر وقت نہ ہو تو لنچ بھی پیش کیا جاتا ہے (باسی چیزوں کو ٹھکانے لگانا بھی ضروری ہے) یہ دعوت بھی بلاقیمت ہوتی ہے۔ گو ٹکٹ کے اب اتنے دام ہو گئے ہیں کہ ہوائی سروس والوں کو کسی اور چیز کی قیمت وصول کرنے میں تکلف ہونے لگا ہے۔ اس ٹکٹ میں ان چیزوں کے علاوہ ایک مظاہرہ بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ حادثے کی صورت میں (اگر ہوش سلامت رہیں تو) کیا نہیں اور کیا کرنا چاہیئے۔ حادثے کا ذکر کرتے ہوئے ایئر ہوسٹس حسب معمول اپنی مسکراہٹ کو جاری رکھتی ہے۔ (مسافروں کی تو گھگھی بندھ جاتی ہے)۔

ہوائی مسافروں کے لیے اخبارات بھی فراہم کیے جاتے ہیں لیکن انھیں مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اخبار پڑھیں بھی۔

اگر آپ بیرون ملک جا رہے ہوں تو اس خوشی میں ہوائی سروس کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک اٹیچی کیس بھی حاضر کیا جاتا ہے اور ٹکٹ ایک خوبصورت لفافے میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے سرکاری دفاتر میں عہدیداروں کے تبادلے یا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے موقع پر سپاس نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر معمولی بات نہیں۔ صرف امام ضامن نہیں باندھا جاتا۔

ہوائی جہاز کا ٹکٹ ایک مرتبہ دیکھنا ضرور چاہیئے۔ اکثر لوگ پرانے ٹکٹ لے کر ایئرپورٹ چلے جاتے ہیں داخلے کا ٹکٹ خریدنا نہیں پڑتا۔ سیدھی سیدھی ۱۶ روپے کی بچت چائے کا خرچ نکل آیا۔

ہال ٹکٹ، زندگی کے سفر میں ضروری نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ کوئی سواری ہی استعمال کریں۔ یہ بغیر سواری ہی کے طے کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سیاست یا اس قسم کے کسی بیوپار میں حصہ نہیں لینا چاہتے تو آپ کو تعلیم حاصل کرنی ہوگی اور ہر سال اب ہال ٹکٹ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کی بھی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے کیوں کہ تعلیم کے نام پر جو رقم طالب علموں اور ان کے والدین سے حاصل کئے جاتے ہیں ان میں ہال ٹکٹ کے دام شامل نہیں ہوتے۔ تعلیم تو صرف کپڑا ہے۔ اس کی سلائی الگ سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ ٹکٹ اس ہال میں داخلے کا پروانہ ہوتا ہے جہاں آپ کی علمی قابلیت سے زیادہ آپ کی ہنرمندی کا امتحان ہوتا ہے۔ ہال ٹکٹ پر آپ کا نشان شناخت بھی درج ہوتا ہے (یہ ہمیشہ اس قسم کا لکھوانا چاہیئے کہ نگران کار کو اسے تلاش کرنے میں کافی دقت ہو یا زحمت ہو) اس پر آپ کی تصویر بھی ہوتی ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ آپ کے

ہال ٹکٹ پر کوئی دوسرا شخص بھی (جسے امتحانات دینے کا تجربہ ہوتا ہے) ہال میں داخل ہوسکتا ہے۔ تاہم اگر آپ امتحانات میں فیل بھی ہوجائیں تو ضروری نہیں کہ آپ "بے کار" رہیں۔ تعلیم پاکر لوگ اہلِ کار تو بن سکتے ہیں لیکن صاحبِ کار نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیئے۔ ضرور کرنی چاہیئے لیکن جو کچھ پڑھا ہے اسے فوراً بھول جانا چاہیئے۔ تعلیم آرائش کی چیز ہے آسایش کی نہیں۔

ڈاک کے ٹکٹ :۔ ڈاک کے ٹکٹ پر آپ نہیں آپ کا خط سفر کرتا ہے۔ جس خط پر ٹکٹ لگائے جائیں اس کا منزلِ مقصود پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے لیکن جس پر ٹکٹ نہ لگائے جائیں وہ خط بہر حال مکتوب الیہ کو پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ڈاک خانے کو دہری رقم ملتی ہے۔ ڈاک کے ٹکٹ کی پشت پر ایک قسم کی چکناہٹ ہوتی ہے جسے لوگ غلطی سے گوند سمجھتے ہیں۔ قطب نما کو کوئی شخص قطب سمجھنا شروع کردے تو اس میں محکمۂ ڈاک کا کوئی قصور نہیں۔

لاٹری کا ٹکٹ :۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اب ہر ہفتے دس بیس ہزار آدمی ضرور امیر ہوجاتے ہیں اور اس امیری میں نام پیدا کرسکتے ہیں۔ یہ سب لاٹری کے طفیل ہورہا ہے۔ لاٹری تجارت ہے یا سوشیل سروس۔ یہ بات ابھی طے نہیں ہوئی ہے لیکن یہ بات ضرور طے ہوچکی ہے کہ لاٹری کا کاروبار صرف حکومت کا حق ہے۔ اس وقت حکومت کے اسی محکمے کی کارکردگی سب سے اعلیٰ درجے کی ہے۔ لے دن۔ عوام جو کچھ نہیں خرید سکتے "لاٹری کا ٹکٹ" ضرور خریدتے ہیں۔ ایک صاحب کے پاس تو ہم نے ان ٹکٹوں کا ایک ضخیم البم دیکھا ہے جو ان کی شادی کی تصویروں کے البم کی طرح نہایت حفاظت سے رکھا ہے۔ جب بھی یہ صاحب اِن البموں کو دیکھتے ہیں ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ انھوں نے بہرحال ابھی ہمت نہیں ہاری ہے اور لاٹری کے ٹکٹ کے البم میں ہر ہفتہ تازہ کلام جمع ہوتا رہتا ہے۔

پرویز ید اللہ مہدی
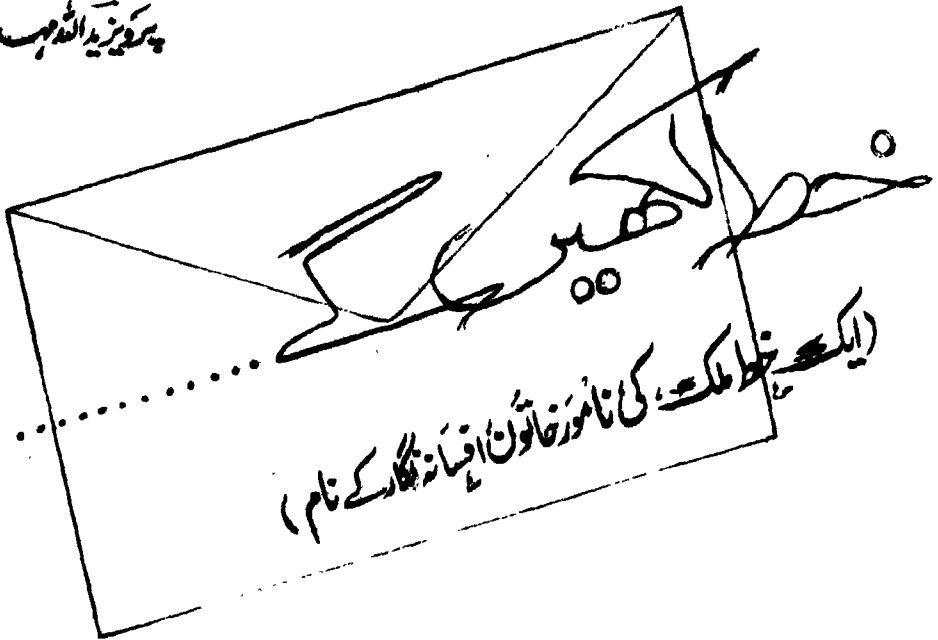
اُردو افسانے کی آبرو، لوح و قلم کی آرزو، محترمہ زائیدہ تکلم صاحبہ!

تسلیمات!

برصغیر کے مشہور فلمی ماہنامے "موم بتی" کے تازہ شمارے میں آپ کا تازہ ترین سرتا سر رنگین بلکہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۲ کی طرح سنگین افسانہ "چھپتن چھری" پہلے بہ نظرِ طائر پڑھا پھر بہ نظرِ غائر اور پھر ہر دو زاویۂ نگاہ سے لفظ بہ لفظ حرف بہ حرف، نقطہ بہ نقطہ پڑھا تب عقدہ کھلا کہ اتنے سارے شوشوں اور نقطوں کے باوجود "بے نقط" افسانے قلم بند کرنا صرف آپ ہی کا حصہ ہے (آخر اس قدر گرما گرم افسانے لکھنے کا راز کیا ہے؟) یقین جانیے "چھپتن چھری" پڑھ کر دل پر چھریاں چل گئیں، پوری چھپتن نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ پورا افسانہ اگرچہ کٹاری خانم، عرف چھپتن چھری کے گرد گھومتا ہے لیکن آپ کے طرزِ تحریر کی خوبی یہ ہے کہ آخر تک قاری کی سمجھ میں نہیں آتا کہ افسانہ کٹاری کے گرد گھوم رہا ہے یا کٹاری افسانے کے گرد۔ چنانچہ اس معمے کو حل کرنے کیلئے بیچارے قاری کو بار بار افسانہ پڑھنا پڑتا ہے (کبھی آپ نے اپنا کوئی افسانہ پڑھا؟)

آپ کے افسانے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ آپ نے اس کے مرکزی کردار کا نام تو رکھا ہے کٹاری مگر کام لیا ہے شمشیر کا۔ شمشیر بھی وہ جس کے تعلق سے کسی شاعر نے برسوں پہلے فرمایا تھا ؎ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔

آپ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ کرداروں کے ظاہری و باطنی عیوب و ہنر سے زیادہ زور آپ ان کے ناموں کی معنویت و مناسبت پر دیتی ہیں۔ مثلاً کٹاری کے نام کی مناسبت سے آپ نے اس کے عاشق کا نام رکھا "سیف یار جنگ"، اس کے والد کا نام توپ یار جنگ، اس

کے ملازمِ خاص کا نام بھالے راؤ، ہیرو کی منکوحہ کا نام عنبری بیگم، اور داشتہ کا نام چلینچہ جان۔ ان زوردار بلکہ ہتھیار بردار ناموں کی وجہ سے افسانہ کی فضا اور اس کا ماحول خاصا جنگجو، ہوگیا ہے۔ میری نظر میں آپ کا یہ شاہکار صرف افسانہ نہیں بلکہ کارخانۂ اسلحہ و گولہ بارود ہے۔ علاوہ ازیں کٹاری کے فتنہ انگیز حسن و شباب کا مکمل نقشہ کھینچنے کے لئے جزئیات نگاری کے بہانے آپ نے جس اسلحہ خیز تمثیلات و تشبیہ کے دریا بہائے ہیں وہ بھی حیرت انگیز بلکہ ہیجان انگیز ہیں ـــــ اتفاق سے ناچیز شہر کے مشہور و معروف کارخانہ اسلحہ و گولہ بارود میں پچھ دس برسوں سے "میر منشی" کے عہدے پر فائز ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آپ کی اسلحہ انگیز معلومات آگے خاکسار طفلِ مکتب سے بھی گیا گزرا ہے۔ (اگر آپ برا نہ مانیں تو راقم الحروف نہایت ادب کے ساتھ آپ کے آگے اپنے "زانوئے گولہ بارود" تہہ کرنا چاہتا ہے۔!)

اگرچہ آپ کا افسانہ پلاٹ کے اعتبار سے خاصا کمزور ہے لیکن آپ نے یہ کمزوری ہیروئین کے توبہ شکن شباب کی منہ زوری کے پس پشت ایسی چابکدستی سے چھپائی ہے کہ یہ چابک نظر آتا ہے نہ دستی، صرف مستی ہی مستی دکھائی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو عام قاری اس کمزوری پر ہاتھ ڈال سکتا ہے نہ نقاد کا چابک وہاں تک پہنچ سکتا ہے، دونوں ہی ہیروئین کے شباب کی بھول بھلیوں میں چکراتے رہ جاتے ہیں، ـــــ یوں بھی قاری ہو یا نقاد، بقول ناچیز ـــ ہر کسی کو شباب نے مارا ـــ!

اب آئیے افسانے کے ایک اور وصفِ خصوصی کی طرف ـــ عموماً کسی مخصوص جملے کی مسلسل اور متواتر تکرار، افسانے کے حسن اور تسلسل کو بری طرح مجروح کرتی ہے اس لئے ناقدانِ فن کی نظر میں یہ ایک ناقابلِ معافی، خامی ہے، لیکن آپ کے طرزِ نگارش کا جادو، کالا جادو کا بھی باپ ہے، جس کے توسط سے ہر ناقابلِ معافی خامی آپ کے ہاں قابلِ ستائش خوبی میں بدل جاتی ہے مثلاً آپ کے مذکورہ افسانے میں تقریباً چھتیس جگہ ہیروئین کے روبرو، ہیرو ایک ہی جملہ دہراتا ہے ـــــــــ "لیلیٰ مجنوں سے رومیو جولیٹ تک بلا لحاظِ مذہب و ملت محبت کے نام پر ہر قسم کے ظلم و ذلت کو سہتے ہوئے ہنستے ہنستے اپنی جان قربان کر دینے والی پاک روحوں کی قسم! پیاری کٹاری، محبت کی آری، میں تیرا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں ـــــــــ"

اس جملے کی تکرار پہلے پہل تو کھلتی ہے لیکن جب قاری پر اس کی تہیں کھلتی ہیں تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں (میری باچھیں تو ابھی تک کھلی ہوئی ہیں) دراصل اس جملے کے بین السطور ہیرو کا اصل مقصد پوشیدہ ہے یعنی وہ بظاہر تو ہیروئین سے کہتا ہے کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں، لیکن حقیقتاً کچھ اور پکڑنا چاہتا ہے۔ (کیا پکڑنا چاہتا ہے، یہ قاری کی اپنی "پکڑ" پر منحصر ہے)۔ آپ کے اس خوبصورت افسانے پر البتہ کہیں آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے تو کہیں جگ بیتی کا۔ (کیا واقعی یہ آپ بیتی ہے؟ اگر ہے تو پھر اس میں جگ بیتی کی آمیزش کی وجہ ـــ؟)

میں نے سنا ہے کہ بعض نابالغ قسم کے قارئین جو تحریر، تقریر، تشبیہ، تصویر، ہر جگہ عورت کو "پردے کی بوا" کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، آپ پر نعوذ باللہ، فحاشی کا الزام لگاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ آپ کے چٹخارے دار افسانوں کے آگے "بوتلیں" بھی شرم سے پیلی پڑ جاتی ہیں۔ (کیا آپ کے کسی افسانے پر کوئی "بلو فلم" بنی ہے؟)

... بہرحال اس قدر "گرما گرم" افسانے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ سچ پوچھئے تو میری نظر میں یہ صرف

نہیں بلکہ افسانے کی آڑ میں آپ نے — کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے۔ (بلکہ بہت کچھ نکال کے رکھ دیا ہے)

نوٹ :- ماہنامہ "موم بتی" کے تازہ شمارے میں آپ کے افسانے کے ساتھ ناچیز کی غزل بھی شائع ہوئی ہے، اپنی گراں قدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیے گا —!

مزید نوٹ :- جوابی لفافہ ساتھ میں منسلک ہے — !!

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گی — جواب کا بے چینی سے منتظر

فقط

ناچیز —— سرتاج گھائیل پوری

(ملک کی نامور خاتون افسانہ نگار کا جواب)

جناب ..... گھائیل پوری صاحب !

آداب و نیاز —!

یقیناً آپ حیران ہوں گے کہ میں نے آپ کو پورے نام سے مخاطب کیوں نہیں کیا۔ دراصل میں اپنے میاں کے علاوہ کسی اور
ج' نہیں کہہ سکتی۔ (حالانکہ ان کا نام "اتفاق شریف" ہے لیکن میاں چاہے شریف ہو یا ظریف، شریف بیبیاں اپنے شوہروں
ج' کے نام سے ہی بلاتی ہیں) بہرحال میاؤں، والی یہ عرفیت اگر آپ کے والدین کی بخشی ہوئی ہے تو پھر مجبوری ہے، البتہ اسے
،نے بطور تخلص کے اپنایا ہوا ہے تو پلیز میری خاطر اسے بدل دیجئے۔ 'سرتاج' کے ہم قافیہ لفظ آپ کو بہت مل جائیں گے
ماراج، 'سوراج'، 'صدر راج' وغیرہ وغیرہ ——!
آپ نے جس خلوص اور فرصت کے ساتھ تفصیل سے خط لکھا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں،
ماظ کا کوٹہ، میں زیادہ تر اپنے افسانوں میں کھپا دیتی ہوں —— آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے اس قدر گرما گرم
لکھنے کا راز کیا ہے، تو عرض ہے میں اپنا ہر افسانہ باورچی خانے میں بیٹھ کر لکھتی ہوں، اس سے ایک تو چولہے کی گرمی راست
یں در آتی ہے، دوسرے نوکروں چاکروں پر بھی نظر رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، آپ تو جانتے ہیں آج کل کے نوکر مالک کی
زمہ اڑا لیتے ہیں۔ دیگچی میں سے بوٹی اور چنگیری میں سے روٹی غائب کر دینا تو ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے —!
آپ نے آگے دریافت کیا ہے کہ میں نے اپنا کوئی افسانہ کبھی پڑھا، تو خدا نہ کرے کہ مجھ پر یہ برا وقت آئے کہ اپنے ہی لکھے
ا پڑے اور پھر آپ جیسے قارئین کو خدا سلامت رکھے، آپ لوگوں کے ہوتے مجھے اپنے افسانے پڑھنے کی کیا ضرورت؟ اس کے
نا وقت افسانہ پڑھنے میں ضائع ہوتا ہے، اتنے وقت میں، میں ایک اور افسانہ گھسیٹ لیتی ہوں۔ البتہ میرے افسانے پڑھنے

اور انھیں فیڈ کرنے کی ذمہ داری میرے سرتاج خوشی خوشی نبھاتے ہیں ۔ (خدا کرے ہر افسانہ نگار خاتون کو میرے سرتاج جیسا سرتاج نصیب ہو ۔ آمین —— !)

آپ نے میرے افسانے کی خوبیوں پر جس خوبی سے روشنی ڈالی ہے اور جس باریک بینی سے اس کا تجزیہ کیا ہے ۔ میں اس سے صد فی صد متفق ہوں —— اب رہی پلاٹ کی کمزوری کی شکایت ، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ افسانہ اگر پلاٹ کے اعتبار سے کمزور ہو تو ہیروئین کے منہ زور شباب کی منہ زوری دب جاتی ہے اور اس کے لئے میں پلاٹ تو کیا افسانے کو بھی قربان کر سکتی ہوں ۔

آپ نے میری اسلوب انگیز معلومات کو سراہتے ہوئے میرے آگے اپنے زانو ئے گولہ بارود ، تہہ کرنے کی اجازت طلب کی ہے ۔ اصل میں یہ آپ کی اسلوب نوازی ہے ۔ اس سلسلے میں میرے سرتاج کا کہنا ہے کہ ؎ جو اسلوب جس جگہ ہے وہیں ٹھیک ٹھاک ہے ۔ (غالب آپ نے اشارہ سمجھ لیا ہوگا ۔)

میرے مذکورہ افسانے کے تعلق سے آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا یہ واقعی آپ بیتی ہے ؟ تو حضور یہ ایک ایسا راز ہے جس سے میرے سرتاج بھی واقف نہیں تو پھر آپ کو کیوں کر بتاؤں ۔ آپ صرف آم کھانے سے مطلب رکھئے ، پیڑ گننے کا کام ناقدوں پر چھوڑ دیجیے ——

اب رہا ، بعض ناسمجھ ادبی حلقوں کی جانب سے مجھ پر عائد کردہ ' فحاشی کا الزام ' تو یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ بقول میرے سرتاج کے ؎ ۔ ریت آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں —— !

آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ابھی تک میرے کسی افسانے پر کوئی فلم نہیں بنی ، البتہ پچھلے کچھ عرصہ سے ایک پروڈیوسر صاحب میری ایک کہانی خریدنے کیلئے چکر کاٹ رہے ہیں ۔ اب پتہ نہیں وہ اس پر بلیک اینڈ وہائٹ فلم بنانا چاہتے ہیں ، ایسٹمین کلر یا نیو فلم —— ؟

جس طرح بقول آپ کے میں نے افسانے کی آڑ میں ؎ کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے ، اسی طرح تجزیئے کے بہانے آپ نے بھی تو ؎ کاغذ پہ رکھ دیا ہے اپنا بھیجہ نکال کے —— !

نوٹ :۔ آپکی درخواست پر ماہنامہ ' موم بتی ' کے تازہ شمارے میں آپکی شائع شدہ غزل پڑھی ، بہت خوب ہے ، خاص طور سے یہ شعر بیحد پسند آیا ؎

تیرے میرے اندر جنگ
تو ہے حیراں ، میں ہوں دنگ

مزید نوٹ :۔ ماہنامہ " موم بتی " کے اگلے شمارے میں میرا افسانہ " کبھی اوپر کبھی نیچے " شائع ہو رہا ہے ، ضرور پڑھئے گا اور پھر اسی طرح افسانے کی خوبیوں سے مطلع کیجئے گا ۔ ساتھ میں جوابی لفافہ منسلک نہیں ہے ، اس کے باوجود آپکی گراں قدر رائے جاننے کے لئے بے چین رہوں گی ۔

— آپکی دعا سے میں بالکل مع الخیر ہوں اور اُمید ہے آپ بھی مع الخیر ہوں گے ۔

فقط

اُردو افسانے کی خدمت گذار
زائیدہ نکمّی

--

• رؤف خوشتر
(بیدر)

بچپن کے دن بھی.....

آزادی ملتے ہی سعادت مند والد (بیچارے) اپنے اپنے بچوں کے متعلق بڑی آزادی سے سوچنے لگے تھے. کیوں کہ اب ان کے سوچنے پر کوئی پابندی نہیں تھی. ہر کوئی اپنے فرزند دلبند و عقلمند کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے پر تُلا ہوا تھا (شاید اُن کو علم ہو گیا تھا کہ آزاد ملک میں ڈاکٹر اور انجینئر ہی مزے سے رہ سکیں گے)

اُس زمانے میں ڈاکٹر یا انجینئر سازی کا مرض اتنا عام ہو گیا کہ ہمارے پسر ناشناس والد صاحب بھی اس مہلک بیماری کی لپیٹ میں آگئے. چنانچہ انھوں نے ایک دن ہم سے مشورہ کئے بغیر (باپ جو ٹھہرے) اعلان کر دیا کہ "اب ہم کالے کو بھی ڈاکٹر بنا کر ہی دم لیں گے". ان کو اس اعلان سے کون روک سکتا تھا. پہلی بار دستور میں اظہار خیال کی آزادی سے خطرہ محسوس ہوا تھا. پھر ہمیں ڈاکٹر بنانے کا مرض اب ان کی انتہا کو پہنچ گیا تھا. وہ ہمیں ممتاز و معروف (خانگی ٹیوشن اور غیر مدرسی کالجوں میں) اساتذہ کے پاس ایسے گھسیٹ کر لے جاتے جیسے کسی قصائی کے پاس بکرا. اساتذہ حضرات اپنی مصروفیت (وہی کوچنگ) میں سے کچھ وقت نکال کر ہمیں ٹھونک بجا کر (بلکہ ابا کی جیب بجا کر) مطمئن کر دیتے اور اپنے یہاں شریک کر لیتے. اس طرح ہم ٹیوشن بالجبر جھیلتے رہے اور دبے لفظوں کہہ دیا کہ ہم ڈاکٹر تو کیا مریض بھی نہیں بن سکتے. لیکن سنتا کون تھا. لہٰذا پوری ایمانداری اور تندہی سے ڈاکٹر نہ بننے کے لیے اپنی اہلیت و نا قابلیت کے ریکارڈ تابڑ توڑ خود ہی امتحانات کی اقساط اور ہر مارکس کارڈ پر لفظ فیل [illegible] کی صورت میں قائم کرتے رہے. بس یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر بننے سے بچنے کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہے تھے. لیکن والد صاحب کب ہار ماننے والے تھے ان کا استدلال کہ پہلا تو ڈاکٹر بن جائے کیوں کہ وہ ڈاکٹر بنتے بنتے رہ گئے تھے (کاش کہ بنتے) بقول ان کے اس وقت نہ مریض زیادہ تھے نہ مرض، نہ مواقع تھے. نہ میڈیکل کالجس. اس لیے ڈاکٹر بننے کی بجائے تحصیلدار بن گئے اور پوری نوکری 'حکیم الامت' کے مشورے کے پیش نظر رشوت کے بغیر گزاردی اس لیے تحصیلدار اور دوسرے فضیح عہدوں (صدر بلدیہ) پر فائز ہونے کے باوجود اُن کی زندگی ایک مکان ایک بیوی اور ایک سائیکل سے عبارت ہے. چنانچہ بعض لوگ صحت مند جسم کے علاوہ صحت مند ضمیر بھی رکھتے ہیں. وہ اسی

نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو حُبِّ وطن سے سرشار ہوتی تھی۔ اب تو ہم حُبِّ ذہن اور حُبِّ بدن میں سرشار ہیں۔

خیرو الدصاحب ہر روز ایک سیب نہ کھاتے ہوئے بھی ڈاکٹر سے دُور ہیں اور یوں عملی طور پر انہوں نے انگریزی کہاوت سیب روز کھایئے اور ڈاکٹر سے دُور رہیئے کو غلط ثابت کر دیا۔ پھر نہ جانے کیوں وہ ہمیں ڈاکٹر بنانے پر مُصر تھے۔ اور یوں ان کی ادھوری خواہش وراثت کے طور پر ہمارے نازک کاندھوں اور دماغ پر آ گری۔

جب ہم جیسے تیسے اور پیسے "تاک جھانک اور کئی مراکز کی خاک" پھانک کر بھی میٹرک درجۂ اول میں کامیاب نہیں ہو پائے تو محلہ کے لوگوں نے اطمینان کی سانس لی کہ وہ ہمارے ہاتھوں نہیں مریں گے۔ ہم بھی خوش ہوئے کہ انجکشن اور دوائیاں ہم سے دور رہیں گی۔ پھر ابا نے دوسرا اعلان کر دیا کہ ہم میں حیوانات کے ڈاکٹر بننے کے جراثیم زیادہ ہیں۔ ہم نے کہا "کہیں آپ اس لیے تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ بچپن سے ہمیں بندر، اُلّو، گدھے (بعض جانورں کے نام ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر ہیں) جیسے القاب سے نوازتے رہے ہیں؟ یا پھر ہماری گھوڑے اور بھینس دوڑ سے آپ ناراض تو نہیں؟ یا پھر ہماری طوطے اور کبوتر و مرغ بازی آپ کی نظروں میں کھٹک نہیں رہی ہے؟ دیکھئے خوشی اور کھیل کے چند لمحات ان معصوم اور بے مزہ بے زبان ساتھیوں کے ساتھ گزارنا اور بات ہے ڈاکٹر بن کر علاج کرنا اور بات ہے رہی عقلمندی کی بات تو ہم کو ڈارون کی تھیوری پر رتی برابر بھی ایمان نہیں" وہ ہمیں چمکارتے ہوئے کہنے لگے "مل بندر کہیں کے" پھر ہمیں تقریباً ہانکتے ہوئے اپنے دوست کے پاس لے گئے جو حیوانات کے ڈاکٹر تھے تاکہ ہم یہاں رہ کر حیوان شناس، حیوان مزاج اور حیوان علاج ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان ایوانِ حیوانات ثابت ہو رہا تھا۔ مکان میں فرنیچر پر ہرنوں کی کھالیں تھیں۔ باہر کا منظر صحن کے بغیر ہی صحنِ دادری لگ رہا تھا جہاں لاغر گھوڑے، بیمار بھینس، لاچار گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ ہمیں پہلی رات ہی جانوروں کی آوازوں سے بخار آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرغوں کی دوا دے کر ہمیں سلا دیا۔ نتیجہ میں ہم مرغ کے ساتھ ہی علی الصبح جاگ گئے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب کہنے لگے میاں انسانوں کے ڈاکٹر سے کہیں اچھا ہے کہ حیوانات کے ڈاکٹر بنیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیں تنگ نہیں کرتے۔ ہمارے علاج کی شکایت نہیں کرتے۔ اور یوں بھی اب ان دونوں میں کچھ فرق نہیں رہا۔ ایک شخص آیا، اور شکایت کی کہ اس کی بھینس کافی بدل گئی ہے۔ لات مار رہی ہے۔ عجیب عجیب آوازیں نکال رہی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں دیتے ہوئے کہا "کہیں بھابی کے لیے تو نہیں لے رہے ہو؟" آپ نے کیسے پہچانا۔ دراصل گھروالی کے لیے ہی لے رہا ہوں، بھینس تو علامت ہے۔"

تب ہمیں معلوم ہوا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس نہیں بلکہ جس کی گولی اس کی بھینس ہوا کرتی ہے۔ پھر ایک خاتون تشریف لائیں اور گویا ہوئیں۔ "ڈاکٹر صاحب میرا طوطا اب کافی بولنے لگا ہے۔ اب مجھے اس کی آواز سے چڑ ہو گئی ہے۔ اس کو چپ کرانے کی دوا دیجئے۔ اب وہ کھانے تک خاموش رہتا ہے پھر کاٹنے کو دوڑتا ہے"۔ وہ جب دوا لے کر چلی گئی تو ڈاکٹر نے کہا "میاں وہ اپنے شوہر کے لیے دوائی لے گئی ہے یہ خاتون ملازم پیشہ ہے شوہر اس کے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور پیسوں کے لیے جھگڑتا ہے۔ بلکہ بیوی کو مارتا ہے"۔ ایک دن ایک شخص کتّے کو گود میں لیے آیا اور رو رو کر کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب میرے لال کو دیکھئے کیسے پیلا پڑ گیا ہے۔ اس کے بغیر میں زندگی گزار نہیں سکتا میرا سب کچھ

یہی ہے "کیوں بھائی اس میں کیا بات ہے، یہ سگ تمہارا سگا تو نہیں؟"

"صاحب! سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی بچپن ہی کتوں سے چڑ تھی اور سگوں میں دوڑنے کے ہم نہیں قائل" والی بات پر کار بند تھا۔ لیکن یہ معمولی کتا نہیں ہے۔ اس کی رگوں میں شاہی خاندان کے کتوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ جارج ہفتم کے کتوں میں سے ایک اس کتے کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ کبھی میں آپ کو اس کا حسب نسب اور شجرہ بتاؤں گا۔ میں نے اس کو سنہری حرفوں میں لکھ کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجایا ہے"

پھر ایک صاحب بیمار گھوڑے کے ساتھ تشریف لائے اور انھیں ملال تھا کہ ان کا لال ریس سیزن میں بیمار ہو گیا انہوں نے بھی روتے ہوئے وہی کہا جو کتے والے صاحب نے کہا تھا۔ یہاں بھی حسب نسب اور شجرہ بیان کیا جا رہا تھا کہ کیسے اس کے آبا و اجداد ... جیک پاٹ حاصل کر کے ہزاروں کو لاکھوں روپے دلواچکے تو لوگ اپنے حسب و نسب اور شجرہ کو شجرِ ممنوع بنائے ہوئے ہیں اور اپنے جانوروں کا شجرہ سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔

پھر تو ہمیں اس سگ پرستی اسپ نوازی، گربہ و خر بہ ماحول سے گھن آنے لگی اور ہم وہاں سے فرار ہونے کے لیے ایسی غیر طبی حرکات کرتے رہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بیمار پڑ گئے۔ جب ہم نے ان کا علاج جانوروں کی دوا سے کرنا چاہا تو وہ جھلا کر بولے "کیا میری دوا کو میں نہیں جانتا۔ وہ تو بے زبان جانور دوا پی کر چپ چاپ ملکِ عدم کو پہنچتے ہیں۔ تو کیا تم مجھے بھی . . . . نہیں نہیں تم اس وقت اپنے گھر چلے جاؤ"

تو صاحبو! ہم یوں بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے نکلے، گنگناتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے مطب سے نکلے اور گھر پہنچے آبا سے کہا "نہ ہم ڈاکٹر بن سکتے ہیں اور نہ ہمیں بننا ہے" پھر آرٹس کالج میں شریک ہوئے۔ وہاں سے ڈگریاں لیکر پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اور مریضوں کے بجائے طلباء سے لو چپتے ہیں۔

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

پھر ان کی طرف سے جواب نہ پاکر خود ہی جواب دیتے ہیں۔

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

تو صاحبو! یوں تو اپنی زندگی میں سکھ ہے، چین ہے، سکون ہے، لیکن اُن دنوں کی یاد آتی ہے جب ۱۹۵۵ء میں ہمارا بچپن رخصت ہو رہا تھا اور ہم لڑکپن کے دور میں داخل ہو رہے تھے اور جب خالص گھی، خالص روپیہ، خالص خلوص کی طرح وہ ہمارا مسرت بھرا، ہنگاموں سے بھرپور، کھلنڈرا بچپن یاد آتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں

بچپن کے دن بھی کیا دن تھے ——!!

پبلک گارڈن میں ....

اسمٰعیل ظریف
حیدرآباد

○

اُڑا دیتا ہے چھت جو انجمن میں
وہ مجھ جیسا ہے کورانکر دفن میں

یہ مولانا بھی آنکھیں سینکنے کو
چلے جاتے ہیں پبلک گارڈن میں

ضعیفی اس طرح آئی ہے جیسے
"بہار بے خزاں آئے چمن میں"

بچا رے گھل رہے ہیں اپنے لیڈر
مٹاپہ بڑھ گیا فکرِ وطن میں

ہمارے بھائی بھی کچھ کم نہیں ہیں
کمال چار سو بیسی کے فن میں

ہے فطرت باپ کی بیٹے میں لیکن
وہ اماں پر گیا چال و چلن میں

وہ اپنی بات منواتے ہیں رو کر
جو ماہر ہیں اداکاری کے فن میں

مخاطب ہو رہے ہیں مسکرا کر
نجانے کیا بسی ہے اُن کے من میں

وہ اب ہر موڑ پر ہیں ہم سے آگے
نہیں ہے فرق کوئی مرد و زن میں

وہاں وہ چاند پر پہنچے یہاں ہم
اُلجھ کر رہ گئے دار و رسن میں

اُنھیں ملتی ہے خالص اور تازہ
جو جا کر بس گئے ہیں تاڑ بن میں

نہیں ہے قدر اپنے ہم وطن کی
ہیں نا قدرے کچھ ایسے بھی وطن میں

بٹھا لیتے ہیں جو غیروں کو سر پر
کچھ ایسے سر پھرے بھی ہیں دکن میں

جہاں بولے بھی قدر کو ناپتے ہیں
نہیں جاتے ظریفؔ اس انجمن میں

○

غزل

نسیم سحر (جدہ)

لوگ پلکوں کو بھی تلوار کہا کرتے ہیں
ہم سے گستاخ اُنھیں خار کہا کرتے ہیں

اُن کے انکار میں نخرے بھی ہیں انداز بھی ہیں
ایسے انکار کو اقرار کہا کرتے ہیں

ہو سکا ہم کو کہیں پر نہ کوئی گھر بھی الاٹ
ہم بھی اب دشت کو گھر دار کہا کرتے ہیں

اک زمانہ تھا کہ فرہاد نے کھودا تھا پہاڑ
اب تو اس کام کو بیگار کہا کرتے ہیں

ہوتی ہے عشق کی بیماری جنھیں ہم ان کو
ملک الموت سے دو چار کہا کرتے ہیں

اے نسیمؔ اُن کے دماغوں میں خلل ہے شاید
دردِ اُلفت کو جو آزار کہا کرتے ہیں

عابدہ محبوب
(حیدرآباد)

"دھجیاں"

(قارئین اکرام! یہ ساری مختصر کہانیاں سفرِ پاکستان کی دین ہیں ــــ!)

"روایت": ایک حیدرآبادی خاتون اپنے رشتے داروں سے ملنے پہلی بار کراچی گئیں۔ ایک بزرگ رشتے دار جو نظام سرکار کے دور میں حیدرآباد (دکن) آیا جایا کرتے تھے اُس زمانے کی کچھ باتیں یاد کرتے ہوئے بولے "اچھا یہ بتا! کیا وہاں کی سڑکیں اب بھی پانی سے دھلتی ہیں؟"

حیدرآبادی خاتون نے جواب دیا "جی ہاں! سڑکیں تو اب بھی دھلتی ہیں مگر بلدیہ کی موریوں کے پانی سے"!

"سوتیلا بھائی": ایک دن ہم اپنی پسندیدہ کتابیں خریدنے اردو بازار گئے۔ وہاں سنتروں سے بھرا ٹھیلا دیکھ کر ہم نے میزبان ساتھی سے کہا "دو منٹ ٹھہریئے! کچھ سنترے خریدلوں!"

"محترمہ! یہ سنترے نہیں ہیں" میزبان نے ہمیں بتایا "یہ تو کینو (KINO) ہیں کینو!"

"کینو؟ ہم کو تعجب تھا" مگر یہ تو بالکل سنتروں کی طرح؟" میزبان نے ہمارا جملہ کاٹ دیا اور بولے

"جی ہاں... جی ہاں... یہ سنترے کے سوتیلے بھائی ہیں!"

"آئے بھی وہ، گئے بھی وہ": (اطلاعاً عرض ہے کہ ستر فیصد پاکستانی رات کا کھانا کسی ہوٹل یا رسٹورنٹ میں کھاتے ہیں۔ کلفٹن کے قریب ایک مقام پر تقریباً ایک میل کی دوری تک لائن سے رسٹورنٹس بنے ہوئے ہیں۔ ھر رسٹورنٹ کا اپنا ویٹر ہوتا ہے جو آرڈر بک کرتا ہے)۔

ایک صاحب اپنے ہندوستانی مہمانوں کو رات کا کھانا کھلانے "شاورما رسٹورنٹ (SHAWAR M.9) لے گئے جیسے ہی ان کی کار رسٹورنٹ کے قریب رُکی، ہر طرف سے ویٹرز دوڑ پڑے۔ ہر ویٹر اپنے اپنے رسٹورنٹ کے لیے آرڈر بک کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کوشش میں "تو تو، میں میں" بڑھ کر ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ دو منٹ انتظار دیکھ کر میزبان صاحب نے اپنی کار اسٹارٹ کردی۔ ویٹرز چونک پڑے اور لڑائی بھول کر پھر کار کی طرف پلٹ آئے۔

"ٹھیرئیے نا بھائی جان! کہاں چلدیئے!"

میزبان صاحب نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم کھانا کھانے آئے تھے، کشتی دیکھنے نہیں!"

"چار اقساط میں": ہم کو ایک میوزک پارٹی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ جس وقت ہم ہال میں داخل ہوئے، گانے والی خاتون کو دیکھ کر "بے حال" ہوتے ہوتے رہ گئے! وہ خاتون اس قدر گول مٹول تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوکر کدھر ختم ہوئی ہیں۔ خیر ہم خدا کی قدرت کا نظارہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ وہ خاتون کوئی پنجابی گیت گا رہی تھیں جس کے بول تھے ؎

"مو ہے لے چل... تو مو ہے لے چل"!

اور ہر بند کے خاتمے پر وہی تو مو ہے لے چل کی تکرار تھی۔ ایک صاحب اس تکرار سے بیزار ہو کر چپکے سے اپنی بیگم سے بولے "یہ محترمہ گا رہی ہیں یا بور کر رہی ہیں؟"

بیگم بولیں "کیا کرے بے چاری! بار بار اپنے محبوب سے التجا کر رہی ہے کہ مجھے لے چلو... بے چارہ محبوب بھی حیران، پریشان سوچ رہا ہے کہ اس کو کیسے لے جائے؟"

ایک دبلی پتلی خاتون نے لقمہ دیا "چار اقساط میں لے جا سکتا ہے!"

"پرانی بات": ایک چھ سالہ شریر لڑکے کے بائیں بازو کی ہڈی سیڑھیوں پر سے گرنے کے سبب ٹوٹ گئی۔ اس ہڈی کو آپریشن کے ذریعہ بمشکل فٹ کیا گیا اور پھر تین ہفتوں کے لیے پلاسٹر چڑھا دیا گیا مگر اس حالت میں بھی لڑکے کی اُچھل کود اور شرارتیں بدستور تھیں۔ ماں باپ پریشان تھے اور بار بار لڑکے کو ٹوکتے تھے۔ ایک بار لڑکے کو غصہ آ گیا کہنے لگا۔

"آخر آپ لوگ کتنی بار مجھے ڈرائیں گے کہ ہڈی پھر ٹوٹ جائے گی! ہڈی ٹوٹنے کی بات تو بہت پرانی ہو چکی!"

"گھڑیاں": ایک پاکستانی میزبان خاتون نے اپنی حیدرآبادی مہمان دوست کو تین امریکن لیڈیز واچ بتا کر کہا "ان میں تم کو جو گھڑی پسند ہو۔ میری طرف سے یادگار سمجھ کر رکھ لو ــــ"

مہمان خاتون جو ان تکلفات سے بچنا چاہتی تھیں بولیں "مجھے تو یہ تینوں گھڑیاں بھی پسند نہیں ہیں"۔

"پھر تم کو کونسی گھڑی پسند ہے؟" میزبان خاتون مصر تھیں "مجھے تو اسلام آباد کی ایک گھڑی پسند آئی تھی!"

"اچھا! کونسی تھی وہ گھڑی؟" میزبان خاتون پسند جاننے کے لیے بے چین ہو گئیں۔

"وہ گھڑی، جب میں نے اپنے پسندیدہ ادیب سے ملاقات کی تھی ــ!"

"یونیفارم": ایک حیدرآبادی خاتون اپنے دوست احباب سے ملنے پاکستان گئیں۔ جن جن رشتے داروں اور دوستوں کے گھر ان کا قیام رہا یا آنا جانا رہا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ہر گھر میں چائے کی پیالیاں و طشتریاں ایک ہی رنگ و ڈیزائین کی ہیں! ایک شام وہ اپنی بے تکلف سہیلی کے گھر چائے پر مدعو تھیں۔ وہاں بھی ان کو اسی رنگ و ڈیزائین کی پیالیاں نظر آئیں۔ ان سے رہا نہ گیا سہیلی سے بولیں "یہ تو تمہارے ملک آ کر معلوم ہوا کہ پیالیاں طشتریاں بھی اپنا قومی یونیفارم رکھتی ہیں!"

"راہِ فرار": ہوائی جہاز کو فضاء میں اڑتے ہوئے صرف بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ پلین میں دباد یا سا شور ہونے لگا۔ مسافرین یہ سمجھ کر کہ پلین میں کچھ خرابی ہو گئی ہے پریشان ہو گئے۔ مگر دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ

ایک صاحب کا ہینڈ بیگ گم ہوگیا ہے۔ ان صاحب کا قصور اتنا ہی تھا کہ وہ کال بیل بجا کر ایئر ہوسٹس کو بلانے کے بجائے خود اس کے پاس (بغیر بل دیئے!) کولڈ ڈرنک لینے چلے گئے تھے۔ واپس آئے تو بیگ سیٹ پر نہ تھا۔ بس اسی کی تلاش ہو رہی تھی! اس بیگ کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ اس میں کچھ اہم سرکاری کاغذات اور نقدی بھی تھی۔

ساری رام کہانی سن کر ایک صاحب تشویش سے بولیں "بیگ اب کہاں ملے گا؟ چور موقع پا کر کبھی کا طیارے سے فرار ہو چکا ہوگا"

فالتو چیز: ایک حیدرآبادی صاحب اپنے قریبی و بے تکلف دوست سے ملنے کراچی گئے۔ ان کے یہ دوست بھی کبھی حیدرآبادی تھے بعد میں ترک وطن کر لیا تھا۔ دونوں دوست بیس سال بعد ملے تو باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حیدرآبادی صاحب اپنے دوست کے فلیٹ، اس کی بناوٹ، سجاوٹ اور سلیقے کی تعریف کرنے لگے۔ دوست خوش ہو کر فخریہ کہنے لگے "یہاں اسی فیصد گھر تمہیں ایسے ہی ملیں گے۔ لوگ پرانی اور بیکار چیزوں کا کباڑا نہیں رکھتے! معاف کرنا! حیدرآبادی لوگ اس کے عادی ہیں! اب مجھے ہی دیکھو میرے گھر میں تم کو پرانی اور فالتو چیز نہیں ملے گی۔ اللہ کے فضل سے سب نئی اور باہر کی ہیں!"

حیدرآبادی دوست جو خوش مزاج بھی تھے بولے

"مگر ایک اہم چیز تمہارے پاس پرانی اور فالتو ہے!"

"کونسی چیز؟"

"تمہاری بیوی!"

ب قطرۂ خون: ہل اسٹیشن کو جانے والی ایک وگین حادثے کا شکار ہو کر کھائی میں گر گئی۔ چند لوگ معجزانہ طور پر زندہ بچ گئے۔ چند زخمی ہوئے اور چند مقام واردات پر ہی ختم ہو گئے۔ پولیس نے فوراً ضابطہ کی کارروائی لاشوں اور لوگوں کو بمشکل نکالا۔ ایک لاش ایسی بھی تھی جس کے کپڑوں پر خون کے نشان تک نہ تھے۔ بس قمیص پر دل جگہ خون کا ایک چھوٹا سا دھبہ تھا۔ اس لاش کو دیکھ کر ایک نوجوان نے کہا

"یہ قطرۂ خون یقیناً وہی ہوگا جس کے بارے میں چچا غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

▭▭

ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ ایک پاگل خانے کے معائنے کے لیے گئے۔ معائنے کے دوران میں انھیں ایک ضروری کام یاد آگیا۔ وہ فون کرنے گئے، لیکن لائن ملنے میں دقت ہونے لگی۔ جب کافی دیر تک لائن نہیں ملی تو وہ غصے سے بھڑک اٹھے اور آپریٹر سے چیخ کر کہا:

"آخر میں کب تک یونہی کھڑا رہوں، تم جانتی ہو میں کون ہوں؟"

آپریٹر نے مسکرا کر کہا:

"یہ تو میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں، لیکن یہ بخوبی جانتی ہوں کہ آپ کہاں ہیں!"

ھزل

ادیبؔ سندیلوی

خلا میں چھلانگیں لگانے لگے ہیں
قلابازیاں لوگ کھانے لگے ہیں

نیا شعبدہ وہ دکھانے لگے ہیں
ہتھیلی پہ سرسوں جمانے لگے ہیں

سیاست میں جن کی کٹی عمر ساری
وہ لڑکوں سے اب مات کھانے لگے ہیں

جنھیں پارسائی پہ تھا ناز اپنی
وہ میخانوں میں جانے آنے لگے ہیں

کہاں تک کوئی عیب ان کے چھپائے
وہ روز اک نیا گل کھلانے لگے ہیں

ابھی تو مسیں بھی نہیں ان کی بھیگیں
ابھی سے قیامت اٹھانے لگے ہیں

خبردار ان سے نہ آنکھیں ملانا
یہ نظروں سے دل کو چرانے لگے ہیں

کٹوتی سے بجلی کی مجبور ہوکر
چراغوں کو پھر ہم جلانے لگے ہیں

عدالت میں انصاف ہو کس طرح اب
حلف لوگ جھوٹا اٹھانے لگے ہیں

غزلیں

بیلوسؔ نظام آبادی

کیا کچھ نہ زیر دام تھا ہم سوچتے رہے
دعوت کا اہتمام تھا ہم سوچتے رہے

مونچھوں پہ تاؤ دیتا تھا جو باوقار شخص
بیوی کا کیوں غلام تھا ہم سوچتے رہے

مرنے پہ ٹیکس ہو تو کوئی بات بھی ہوئی
جینا بھی کیوں حرام تھا ہم سوچتے رہے

مصرعے مڑے تڑے سے نظر آرہے تھے صاف
اُستاد کا کلام تھا ہم سوچتے رہے

یاشو میاں کے شہر میں سسرال چار تھے
ہوٹل میں کیوں قیام تھا ہم سوچتے رہے

کڑکی میں یار لوگوں کا اکثر ہمارے نام
کیوں دور سے سلام تھا ہم سوچتے رہے

پاپڑ تھے جتنے لوگوں میں تقسیم ہوگئے
بیلوسؔ ہمارا نام تھا ہم سوچتے رہے

فراغتوں میں گزرتی تھی کیا زمانہ تھا
یہ گھر سے نکلے تو وہ اپنا جیل خانہ تھا

مرا خلوص ترا پیار سب فسانہ تھا
تھی جیب گرم تو موسم بڑا سہانہ تھا

گلاب چہرہ، بدن پر مہین سے کپڑے
وہ سامنے تھے کہ قدرت کا کارخانہ تھا

تھا سر کڑھائی میں تھیں پانچوں اُنگلیاں گھی پر
ملازمت کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

کوئی لُٹے نہ ہماری طرح مروت میں
خُسر تھے چار عدد اور غریب خانہ تھا

پڑھی نماز تو سینڈل نئی اُٹھا لائے
جو کھو گیا تھا جوتا بہت پُرانا تھا

وہ گھر کی بات تھی، لیکن یہ برسرِ محفل
اُٹھائے ہاتھ میں بیلن تمہیں نہ آنا تھا

بازغ بہاری
(کلکتہ)

ضرورتِ رشتہ

اک کنوارہ ، ساٹھ سالہ لڑکا ہے اعلیٰ نسب
خوبصورت ، نیک خو ، اخلاق مند اور با ادب

یوں تو پورے شہر میں اس کا بڑا ہی نام ہے
صرف تھانہ اور پولس میں وہ ذرا بدنام ہے

دین و دنیا کے لئے اس کا عمل کچھ ویک ہے
ریس کا عادی ہے لیکن اور سب کچھ ٹھیک ہے

عشق ہے سٹّہ سے تھوڑا یعنی بالکل مختصر
منفرد ہے دوستوں میں جیسے تاروں میں قمر

پان اور سگریٹ سے کرتا ہے وہ نفرت مگر
شوق کر لیتا ہے گانجہ اور چرس سے مختصر

چائے اور کافی سے اب تک کر رہا ہے احتراز
صرف دارو پر گزارہ کرتا ہے وہ پاک باز

کھیل اور اسپورٹ سے اس کو نہیں رغبت ذرا
صرف ہیما مالنی پر ہے ہمیشہ سے فدا

پڑھ چکا ہے اپنے فن کا میتھ اور جیومٹری
جیب کتروں کی کمیٹی کا ہے وہ سکریٹری

رات دن مشغول رہتا ہے جوئے کے کھیل میں
ہر مہینے کاٹتا ہے دن وہ اکثر جیل میں

روپ ہے نکھرا ہوا اور رنگ مثلِ زاغ ہے
رُخ پہ اس کے استرے کا مختصر سا داغ ہے

رہ گئے ہیں منہ میں اس کے دانت شاید دو عدد
دیکھنے میں گرچہ وہ لگتا ہے اک ابنِ چند

ایک دُرِّ بے بہا ہے وہ زمینی سطح پر
جیسے بحرِ بیکراں کی تہہ میں ہوتا ہے گہر

ہے فقط یہ شرط اُس کی لڑکی کوٹھی والی ہو
باپ بھائی ، ماں بہن کے پیار سے گھر خالی ہو

المشتہر

معرفت ، گھسیٹا انصاری ۔ موضع اچھے پور
تھانہ نور سرائے ، ضلع نالندہ ۔ بہار

ماہنامہ شگوفہ کے تازہ شمارہ میں برادرم فاضل انصاری نے اپنے علاقے کی جس لڑکی کے منسوب کیلئے "ضرورتِ رشتہ" کا اشتہار دیا تھا اسے میں نے قبول کر لیا۔ اب میں اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کے لیے اشتہار دے رہا ہوں۔ اب فیصلے کا انحصار فاضل انصاری پر ہے۔ فاضل صاحب اپنے فیصلے سے مجھے جلد مطلع کریں تاکہ اگلی کارروائی کیلئے کچھ سوچا جائے۔ فقط بازغ بہاری۔ معرفت بھارتی برادرس۔ ۱۲۵ بی چترنجن ایونیو، کلکتہ ، ۷۰۰۰۰

مسٹر بھارتی

قطعات

عقدِ مسنون

کسی قاضی کی اب نہیں حاجت
پورا مضمون ہوگیا میرا
فون پر اس نے مجھ سے ہاں کرلی
عقدِ مسنون ہوگیا میرا

جوانی کا نشہ

سمجھ میں اب مری آنے لگا ہے
کیوں مغرور ہوتے جا رہے ہو
جوانی کا نشہ چھانے لگا ہے
نشے میں چور ہوتے جا رہے ہو

چیلنج

شاعروں کو ہے یہ مرا چیلنج
موڈ میں شعر کے میں رہتا ہوں
جس میں ہمت ہے سامنے آئے
میں ابھی فی البدیہہ کہتا ہوں

لنگوٹی اتار لو

دنیا سنور رہی ہے تو دنیا سنوار لو
گھر میں نہیں ہے زر تو کسی سے ادھار لو
اس دورِ انحطاط کا پیغام ہے یہی
جو ہو سکے تو بڑھ کے لنگوٹی اتار لو

٥

عورت کی عمر

رات میں شادی کی اک دعوت میں تھا
پاس ہی بیٹھی تھیں بیگم پارسا
آئی تھیں وہ کر کے سولہ سنگھار
ہر نظر ہوتی تھی دل کے آر پار
چل پڑی تھی ان کی گپ شپ بے لگام
ان کو آتا بھی نہیں کچھ اور کام
بیٹھے بیٹھے خوب سوجھی مجھ کو بھی
پوچھ بیٹھا عمر کیا ہے آپ کی؟
میں تو پچھتایا کہ بے ڈھب تھا سوال
تھا جواب ان کا "میاں ۲۹ سال"
پھر کہا میں نے اُدھر بھی اک نظر
آپ کی بیٹی جو ہیں اس میز پر
کہہ رہی تھیں وہ کہ ہیں ۲۲ کی
آپ ہیں ۲۶ کی اچھی کہی
یہ معمّہ کیا ہے سمجھا دیجئے
راز میں رکھوں گا وعدہ لیجئے
پھر تو وہ بولیں دبا کر میرا ہاتھ
آپ کو کیا عمر جس کی اس کے ساتھ

محمد عبدالکریم ماہر حیدرآبادی

★

لہو کی قیمت

اسرار جامعی

○

اسرار! یہ بتائیے فرقہ پرست کو
کام ایسا وہ کرے جو ذرا سود مند ہو

سڑکوں پہ گر بہے تو کسی دام کا نہیں
قیمت لہو کی جب ہے کہ بوتل میں بند ہو

○

جاوید کمال (ایم اے)
حیدرآباد

بس سے بے بس

اس دنیا کے وجود میں آتے ہی انسان کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سفر آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے سے شروع ہوا تھا اور قیامت تک جاری رہے گا۔ آدمؑ کی ذرا سی بھول نے انھیں دنیا تک سفر کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ اور بات ہے کہ آدمؑ سفر کی صعوبتیں برداشت کئے بغیر زمین تک پہنچ گئے۔ لیکن نسل آدمؑ کو قیامت تک سفر کی مشکلات برداشت کرنی پڑیں گی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا۔ لیکن ہر سفر میں انسان کو کچھ نہ کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پہلے لوگ پیدل سفر کرتے تھے پھر زمانے نے ترقی کی اور لوگ بیل گاڑی، سیکل، بس، ریل اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرنے لگے۔ مہینوں کا سفر دنوں، گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہونے لگا۔

لیکن ہم آپ کو اپنے اس سفر کا حال سنانا چاہتے ہیں جو روز ہی ہم آر ٹی سی بس کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں ہے کہ زمانہ ترقی کر چکا ہے اور لوگ اس ترقی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اب تو بس کے ذریعہ سفر کرتے طبیعت اُکتا گئی ہے۔

سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہم کس سفر کا ذکر کریں، ہمارے سبھی سفر تقریباً یادگار ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بس والوں کو ازل سے ہم سے دشمنی ہے۔ کبھی بھی ہم بس کے ذریعہ سفر کرکے مطمئن نہیں ہوئے یا پھر ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ ویسے ہماری قسمت دوسرے معاملات میں کافی اچھی ہے۔ دیکھئے نا ہم نے ٹرین کے ذریعہ دور دراز مقامات کا سفر ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ کیا کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ آپ کہیں گے کہ میں نے اپنی سیٹ پہلے ہی مخصوص کروالی ہوگی۔ اس سے ہمیں قطعی انکار نہیں۔ بس میں بھی اپنی سیٹ مخصوص کروانے کے لیے تیار ہیں لیکن ایسی گنجائش یا سہولت ہمارے بس ٹرانسپورٹ والوں کے ہاں نہیں ہے ہوسکتا ہے گاؤں وغیرہ کے لیے جو بسیں چلتی ہیں ان میں یہ سہولت رکھی گئی ہو۔ لیکن ہم تجربہ کے طور پر بھی یہ رسک نہیں لے سکتے کیونکہ جو تجربے ہمیں روزمرہ سفر کے دوران ہوتے ہیں اسی سے ہم بیزار ہیں اب مزید تجربہ کرنے کی ہم میں ہمت نہیں

ہے۔ وہ کیا تجربات ہیں جو ہمیں حاصل ہوئے اس سے آپ لوگوں کو بھی واقف کروادینا ضروری سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے ایسا ہی کوئی تجربہ آپ میں سے کسی کے ساتھ ہو چکا ہو اور اگر نہ ہوا ہو تو ہمیں پورا یقین ہے کہ بہت جلد ہونے والا ہوگا۔
ہم روز ہی اس اُمید پر گھر سے نکلتے ہیں کہ آج تو ہمیں بس میں جگہ ضرور ملے گی۔ (جس دن یہ اُمید ختم ہو جائے گی اس دن ہم گھر سے نکلنا چھوڑ دیں گے) بس اسٹاپ پر جہاں ہمیشہ ایک میلہ سا لگا رہتا ہے ہم کھڑے ہو کر (آپ کہہ سکتے ہیں بیٹھ کر کیوں نہیں، اجی جناب وہاں مسافروں کے لیے بیٹھنے کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے۔ ایک عدد بنچ جو کسی بس اسٹاپ پر ہوتی ہے اس پر یا تو کوئی فقیر ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہوگا یا پھر بے کاروں کی بیٹھک۔ اب بھلا بتلائیے ہمارے بیٹھنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے) ہاں تو ہم کھڑے ہو کر حسرت بھری نگاہوں سے اُس سمت دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے بس کے آنے کی تھوڑی بہت اُمید ہوتی ہے۔ پھر اس وقت ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی جب بس کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ ہمارا دل بُری طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ ہاتھوں پیروں میں رعشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہیں لیکن جب بس قریب آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ لیکن کئی لوگ بڑی مہارت سے اپنے لیے جگہ بنا لیتے ہیں، ہم اسی سوچ میں رہتے ہیں کہ آخر یہ جگہ بنی کیسے —؟ بس ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے پھر ہم دوسری بس کے انتظار میں بے لبس کھڑے رہتے ہیں۔ آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد ہماری نظر پھر آتی ہوئی بس پر پڑتی ہے اور ہم یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس میں ضرور اپنے لیے جگہ پیدا کر لیں گے اور پوری ہمت اور حوصلہ سے آگے بڑھتے ہیں لیکن بس ہمارے سامنے سے پوری رفتار سے گزر جاتی ہے اور ہم دوسرے مسافروں کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اس کے علاوہ اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ پھر وقت کا احساس کر کے ہمیں مجبوراً سیکل رکشا یا آٹو رکشا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو ہر وقت ہر بس اسٹاپ پر موجود ہوتے ہیں کیوں کہ ایسے اوقات میں مسافروں کو اُلّو بنانے کا انھیں پورا پورا موقعہ ملتا ہے۔

دوسرے دن ہمیں اپنے اُلّو ہونے کا ثبوت مل گیا۔ ہوا یوں کہ ہم نے اس دن یہ فیصلہ کر لیا کہ آج ضرور بس میں جگہ لے کر ہی رہیں گے چاہے اس کے لیے دو گھنٹے جلدی ہی گھر سے کیوں نہ نکلنا پڑے۔ گھر کے سبھی افراد نے ہمیں حیرت واستعجاب سے دیکھا کیوں کہ ہم ہر کام بڑی جلدی جلدی نپٹا رہے تھے۔ ہماری دادی اماں نے ٹوکا بھی۔ "ارے میاں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ذرا صبر سے کر بابا" ان کی باتوں کی پرواہ کیے بغیر ہم اپنے کام میں جٹے رہے۔ جب پوری طرح تیار ہو کر آئینہ پر الوداعی نگاہ ڈالی تو ہمیں احساس ہوا کہ واقعی جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ کیوں کہ تھوڑی کے نیچے کچھ بال بلیڈ (BLADE) کی زد میں آنے سے رہ گئے۔ وقت کم تھا اس لیے ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بس کی سیٹ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چھوٹنا ہی تھا پھر ہمیں ناشتہ بھی تو کرنا تھا۔ جلدی سے ناشتہ کر لینے کی کوشش میں دوبار اس زور کا ٹھسکہ لگا کہ دن میں تاروں کے ساتھ چاند بھی نظر آنے لگا (تارے تو سبھی کو نظر آتے ہیں) اور انہیں چاند تاروں کی روشنی میں ہم نے ناشتہ ختم کیا اور گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمارے پیچھے دادی اماں کے چیخنے چلّانے کی آواز آتی رہی۔ بس اسٹاپ

پر پہنچ کر ہمیں بڑی مسرت ہوئی کیوں کہ وہاں ابھی تک دوسرے مسافروں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی بس نہیں آئی تو ہمیں فکر ہوئی۔ اس سے زیادہ تشویش تو مسافروں کے نہ آنے کی تھی۔ بس اسٹاپ سے لگے پان کے ڈبّے کے مالک سے، جس سے ہم بس کے انتظار میں مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے اپنا وقت گزارتے، اس کے علاوہ پان اور سگریٹ کا کھاتہ بھی ہم نے کھول رکھا تھا۔ دریافت کیا "یار چاند بھائی یہ بس ابھی تک نہیں آئی اور نہ کوئی مسافر نظر آتا ہے؟" پہلے تو چاند بھائی نے ہمیں شک کی نظروں سے دیکھا، جیسے ہم نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ پھر ڈھیر سارا پیک تھوک کر بتایا کہ آج آر ٹی سی والے ہڑتال کر رہے ہیں۔ بسیں نہیں چلائی جائیں گی۔ اس خبر نے گویا ہماری سماعت ہی چھین لی۔ کچھ دیر تو ہمیں ہوش ہی نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو احساس ہوا کہ آج جلدی میں ہم نے اخبار ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ دنیا ویران نظر آنے لگی۔ ہم نے آفس جانے کا خیال ترک کر دیا اور واپس اپنے گھر لوٹ گئے۔ گھر والے ہمارے چہرے پر چھائی مُردنی دیکھ کر ایک بار پھر حیرت میں پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب جائیں ہم نے انھیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ آج بسوں کی ہڑتال ہے۔ ان کے چہروں پر اب حیرت کی جگہ مسکراہٹ لے لی تھی شاید وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

اس دن تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جب بس ہمارے سامنے سے رینگتے ہوئے گزر رہی تھی اور ہمیں کئی سیٹیں خالی نظر آئیں۔ ہم کچھ دور دوڑ لگا کر بس میں سوار ہو گئے اور خدا کا شکر ادا کر کے ابھی سیٹ پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ کہہ کر بس سے اتار دیا گیا کہ "یہ "اسٹاف بس" ہے"۔ اس وقت طبیعت چاہی کہ اسی اسٹاف بس کے نیچے آکر اپنی جان دے دیں لیکن ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا کیوں کہ پیچھے سے ایک بس مسکراتی چلی آرہی تھی۔ وہ رُکی تو ہم بھاگ کر اس میں سوار ہو گئے اور بس آگے بڑھ گئی۔ ٹکٹ خریدنے کی غرض سے جب ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سَو سَو کے نوٹ دیکھ کر ہمارے منہ سے کچھ بے ہنگم قسم کے الفاظ نکل گئے کیوں کہ ہمارے پاس اس وقت مشکل سے دس پانچ روپے ہی تھے جو ایک کلرک کی جیب میں ہو سکتے ہیں پھر یہ سو سو کے نوٹ ——؟ ابھی پوری طرح ہم خوشی و حیرت کا اظہار بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک مضبوط قسم کے ہاتھ نے ہمارا گریبان پکڑ لیا۔ "جیب کاٹتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" جی جی — وہ — اس سے آگے ہم کچھ نہ کہہ سکے۔ "جی کے بچے لوگوں کی جیب صاف کرتے ہو ——؟" اب ہمیں احساس ہوا کہ بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے ہم نے دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ ان صاحب سے معافی چاہی اور قسم کھا کر کہا کہ ہم نے یہ حرکت جان بوجھ کر نہیں کی۔ پولیس اور اپنی بے عزتی کے ڈر سے ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ موصوف بھی شریف آدمی لگتے تھے۔ ہمارے آنسو دیکھ کر معاف کر دیا۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کب بس سے اُتر گئے اور کتنی دور پیدل چلتے رہے۔ اس واقعہ کے بعد سے اکثر ہم ٹکٹ کے پیسے ہاتھ میں ہی رکھتے ہیں کیوں کہ اب اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے حالانکہ بعض "لوگوں" کے ہاتھ مستقلاً دوسروں کی جیب میں ہوتے ہیں۔

برسات کا موسم تھا۔ شدید بارش ہو رہی تھی اور ہم پیڑ کے نیچے بس کے انتظار میں کھڑے بھیگ رہے

کیونکہ وہاں کوئی سائبان نہیں تھا ویسے بھی جہاں ڈرائیور کی مرضی ہوتی ہے وہیں بس رُکتی ہے خاص کر جہاں بھی کوئی اچھی شکل وصورت کی خاتون نے ذرا مسکراکر ہاتھ دکھایا کہ بس ایک جھٹکے سے رک جاتی ہے اس کے برخلاف ہم کئی مرتبہ ہاتھ جوڑکر اسٹیج پرکھڑے رہے لیکن بس . . . . آگے جاکر رکتی ہے۔ اب بھلا کارپوریشن والے کہاں کہاں سائبان تعمیر کریں۔ غرض ہم بھیگ رہے تھے اور اتفاق سے صرف ہمارے کپڑے ہی بھیگنے پائے تھے کہ بس آگئی اور ہم سوار ہوگئے لیکن اندر بھی بارش اپنا زور دکھارہی تھی۔ ہم نے تعجب سے دیکھا۔ بس کی چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کھڑکیوں میں شیشے نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے بارش کا پانی آزادانہ طور پر اندر آرہا تھا۔ مسافرین ڈرے سہمے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ تمام سیٹیں خالی تھیں۔ لیکن ہماری بدبختی دیکھئے کہ آج کئی مہینوں بعد سیٹ ملی تھی لیکن ہم بیٹھنے سے مجبور تھے۔ پھر بھی ہمارا ظرف دیکھئے کہ ہم مسکرا رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ مسکراہٹ شدید سردی کی وجہ سے خود بخود چہرے پر نمودار ہوگئی تھی یا اپنی بےبسی پر

اس سفر کے بعد ہم نے بس کے سفر سے توبہ کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہماری قسمت ہی خراب ہے ورنہ ہزاروں آدمی انہی بسوں کے ذریعہ روزآنہ سفر کرتے ہیں۔ پھر ہم نے ایک چھوٹی سی موٹرسیکل اقساط پر خریدی یہ اور بات ہے کہ پہلی قسط سسرال والوں نے ادا کی۔ اب ہمیں بس کی کوئی فکر نہیں۔ لیکن جب بھی ہم خالی بس کو سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو خیال آتا ہے موٹرسیکل بیچ دیں اور پھر بس سے سفر شروع کردیں مگر اچانک ہی اسٹاف بس کا تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے اور ہم اپنی موٹرسیکل کی رفتار تیز کردیتے ہیں —!!

• عتیق عزیز صدیقی

مٹھو میاں سُسرالی

قدرت کے کار خانے میں عجوبۂ روزگار کی کمی نہیں۔ تاڑنے والی قیامت کی نظر چاہیئے جو ان عجائباتِ قدرت [illegible] نقاب کشائی کر سکے۔ انہیں عجائباتِ عالم میں ایک ہیں ہمارے مٹھو میاں سسرالی ولد بدھو میاں ننہالی، مسکونہ شکم پور [illegible] خانہ دعوت نگر، ضلع بھوجپور (بہار)

بعض شخصیتیں ہوتی ہی عجیب و غریب ہیں۔ ان کی خصلتیں ایسی عجیب اور حرکتیں ایسی غریب ہوتی ہیں کہ [illegible] سب ہمارے اذہان پر نقشِ دیرپا چھوڑ جاتی ہیں۔ بعض دفعہ معمولی آدمیوں کو بھی ان کی غیر معمولی حرکات و سکنات کی [illegible] دولت اتنی شہرت ملتی ہے کہ محاوروں کی طرح ان کا نام زبان زدِ خاص و عام ہو جاتا ہے مٹھو کو یہ مقام ان کی فطری [illegible] بیوں کی وجہ سے ملا ہے۔

مٹھو میاں سے ہماری ملاقات ایک کھانے کی دعوت پر ہوئی جہاں وہ ہمارے پہنچنے کے قبل ہی [illegible] ہاتھ کی صفائی دکھا کر صاحبِ خانہ کو محوِ حیرت اور خاتونِ خانہ کو چیں بہ جبیں کر چکے تھے۔ دستر خوان پر جیسے ہی سالن [illegible] رکابی آتی مٹھو میاں پوری رکابی اپنی پلیٹ میں انڈیل کر خالی رکابی چھوکرے کے حوالے کر دیتے کہ دوسرے [illegible] لیے سالن لے آئیں۔ تجھی تک رکابی کے جانے، سالن بھرنے اور چھوکرے کے واپس آنے تک مٹھو میاں [illegible] چکا ہوتا نتیجتاً مٹھو اپنی نشست کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، چھوکرے سے رکابی لے کر سارا سالن اپنی پلیٹ میں [illegible] نہ ج۔

سب جام بکف بیٹھے ہی رہے یہ کھا بھی گئے تڑپا بھی گئے

[illegible] خانہ جناب ساز [illegible] افسوس کر رہ گئے لیکن مٹھو میاں دنیا و مافیہا سے بے خبر لذتِ کام و دہن پر ملدفتہ [illegible] ساتھ ڈٹے رہے۔ سالن کی سات رکابیاں اور چاول کا ایک قاب صاف کرنے کے بعد مٹھو میاں [illegible]

شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف بھاگلپور (۲۲/۱۹ چار چک، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲)

صاحب خانہ نے عرض کیا "کیوں صاحب! کچھ اور منگواؤں؟" مٹھو میاں نے بڑی معصومیت سے فرمایا "نہیں صاحب! صرف میٹھے ٹکڑے ہوں تو منگوا دیجئے۔ مجھے میٹھے سے بے پناہ رغبت ہے۔ اسی کا فرادا کی بدولت تو مٹھو میاں کے مدنام زمان نام سے یاد کیا جاتا ہوں" ؏

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

صاحب خانہ نے چٹکی لیتے ہوئے فرمایا۔ خیر میٹھا تو بعد میں آئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ شکم سیر نہ ہو سکے۔ اچھا مرزا صاحب کی دعوت میں میٹھے کا کیا قصہ ہے"؟ ساز قادری نے تفتیش کی۔ مٹھو میاں نے جواب دیا۔ "صاحب! مرزا صاحب بڑے با وضع اور بلند اخلاق انسان ہیں۔ کھانا تو میں نے ان کی دعوت میں حسب معمول ہی کھایا دہی دس پھلکے، پانچ پراٹھے، تین باقرخانی اور دس رکابی سالن۔ لیکن کسی کی نظر بد لگ گئی اور میں کھانے کے فوراً بعد درد شکم میں مبتلا ہو گیا۔ مرزا نے جو میری یہ حالت دیکھی فوراً اپنی مسہری خالی کرا دی اور مجھے آرام کرنے کو کہا۔ لیکن مجھ سے نہ لیٹا جا رہا ہے نہ بیٹھتے ہوئے چین ہے۔ اتنے میں مرزا کے بیٹے لڈن میاں ایک ڈاکٹر صاحب کو بلا لائے۔ ڈاکٹر نے کھانے کو ایک گولی دی۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب! اگر گولی کی جگہ پیٹ میں ہوتی تو ایک رس گلہ اور نہ کھا لیتا"۔ اس طویل تقریر کے دوران میں بھی مٹھو میاں کی دست درازی برقرار تھی وہ باتیں بھی کرتے جاتے اور صفائی پلیٹ کے فرائض بھی ادا کرتے جاتے تھے کہ کسی شوخ نے انہیں ٹوکدیا اس گستاخ کی باتوں کا بُرا نہ مانتے ہوئے مٹھو میاں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "بھئی میں پلیٹ تھوڑے ہی چاٹ رہا ہوں میں تو مدینہ میں جھاڑو دے رہا ہوں"۔ مدینہ میں جھاڑو؟ اس نئی ضرب المثل پر سب سے بھونچکا رہ گئے لیکن خاتون خانہ جو بہت دیر سے مٹھو میاں کی بکواس سے ادب چکی تھیں کچن سے سالن کی خالی پتیلی لاکر مٹھو میاں کے سامنے پٹخ دیا۔ پتیلی کی جھنکار سے مٹھو میاں بھی چونکے کہ کون سی بلا نازل ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ خاتون خانہ کی طرف ملتفت ہو گئے جو کہہ رہی تھیں کہ اس میں بھی جھاڑو پھیر دو۔

خاتون خانہ کی اس بلائے ناگہانی پر دوسرے مہمان تو سٹپٹائے لیکن واہ رے مٹی کے شیر مٹھو میاں! ان پر خاتون خانہ کی اس حرکت بے جا کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے صفائی پیش کرتے ہوئے فرمایا بھابی جان میں تو مدینہ ہی کی گلیوں میں جھاڑو پھیر سکتا ہوں مکہ کی گلیوں میں جھاڑو پھیرنے کے فرائض تو آنجہانی خلد آشیانی جنت مکانی والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جناب بدھو میاں عنفوانی انجام دیتے رہے۔ بھلا میری یہ مجال کہ میں بزرگوں کے نقش قدم پر قدم رکھنے کی گستاخی کروں یہ تھوڑی دیر کے بعد پھر فرمایا والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ تو ایک ہی نشست میں پورا صاف صفایا کر دیتے تھے اور ڈکار تک نہیں لیتے اور اللہ رحم کرے حضرت جد امجد جناب مٹھو میاں دہیائی پر جو ایک بھینسے سے کم پر کسی کی دعوت قبول ہی نہیں کرتے تھے ؏

سات پشت سے ہے پیشہ آبا شکم پُری

اتنے میں صاحب خانہ جناب ساز قادری نے قادر دینؔ کی دھن شروع کر دی اور لگے مٹھو میاں کو دونوں ہاتھوں سے لینے فرمایا صاحبو! اس ناخواندہ گھس بیٹھئے کی وجہ سے آپ حضرات کو زحمت ہوئی مجھے اس کا تاسف ہے۔ لیکن مٹھو میاں نے جناب ساز قادری کی دھن کا اعتراف کا بُرا نہ مانتے ہوئے فرمایا "بھائیو! میں دعوتوں میں خواندہ اور ناخواندہ کا قائل نہیں

"جس نے کی شرم اس کا پھوٹا کرم" میں تو شہر کی ہر شادی اور غمی کی تقریبات میں بلاناغہ شرکت کرتا ہوں اور بن بلائے صرف انسانی ہمدردی کے ناطے جاتا ہوں کہ اگر آج نہ گیا تو کل کو جب ان کا سامنا ہوگا تو سبکی ہوگی۔ اور صاحب خانہ کے دل رکھنے کے لیے ماحضر بھی ضرور تناول کرتا کہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" اور "صاحب! کھانے پینے کے معاملہ میں "تکلف برطرف" کا قائل ہوں۔ اور دوستوں کے ساتھ تکلف! معاذ اللہ!! حضرت داغ نے کہا ہے "اے داغ تکلف میں ہے تکلیف سراسر"۔

"ددیہالی، ننھیالی اور سسرالی" کے عجیب و غریب ناموں پر ہم لوگ چونکے۔ ایک صاحب نے مٹھو میاں سے اس کی تشریح کی درخواست کی۔ بس مٹھو میاں کھل گئے اور ٹیپ ریکارڈر کی طرح شروع ہوگئے۔ "صاحبو! یہ ددیہالی، ننھیالی، سسرالی اور بنگالی، ہمارے نسبی القابات ہیں جن سے ہمارے افرادِ خاندان متلقب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ دراصل ہمارا شجرۂ نسب اٹھائیسویں پشت میں طارق بن زیاد کے اس عربی قافلے سے جاملتا ہے جو عبدالحلیم شررؔ کے "فتح اندلس" میں پیش پیش تھے۔ ہمارے آبا و اجداد میں سے ایک صاحب نے ایک پرتگالی خاتون سے مناکحت فرمائی اسی وجہ سے وہ عربی سے پرتگالی ہوگئے۔" ہم نے عرض کیا واہ صاحب عورتوں کی وجہ سے عربی سے پرتگالی کیسے ہوگئے؟ یہ الٹی گنگا کیسے بہنے لگی۔ نسل مردوں سے چلتی ہے کہ عورتوں سے"۔ اس دخل در معقولات پر مٹھو میاں برا مان گئے۔ کہنے لگے کسی دعوت میں شرکت کے لیے آیا کریں تو اپنی ہی نہیں تو کسی اور سے ہی عقل ادھار لے لیا کریں "نسل عورتوں سے چلتی ہے نہ کہ مردوں سے"۔ ایک صاحب نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کیا تو پھر کہنے لگے۔ "ہاں صاحب! ہم لوگ عربی سے پرتگالی ہوگئے اور ہندوستان میں ہم لوگ دراصل پرتگالیوں کے درآمد شدہ مال ہیں۔ درآمد مال نہ کہئے بلکہ اسمگل شدہ مال کہئے۔ ہمارے جدامجد میں سے کسی صاحب کو واسکوڈی گاما نے تاجدارانِ مغل کو رام کرنے کے لیے اپنے ساتھ درآمد کیا تھا۔ اور قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ انھوں نے مغل بادشاہ شاہجہاں کو ایسی پٹی پڑھائی کہ انہوں نے انہیں ایک گاؤں سیر حاصل بطور جاگیر اور خلعت فاخرہ عطا فرمائی۔ چوں کہ انہوں نے ایک بنگالی نژاد خاتون سے شادی کر لی اسی لیے وہ ننھیالی کہلائے اور والد صاحب ددیہالی کے نام سے مشہور ہوئے۔ کچھ عورتوں سے یہ نسبی روایت ایسی چل پڑی کہ یہ بندہ خاکسار چوں کہ سسرال میں بودو باش رکھتا ہے اسی لیے سسرالی کہلاتا ہوں۔ اور میرا چھوٹا بھائی جو ابھی غیر شادی شدہ ہے ابھی تک نکو میاں بنگالی ہیں"۔

اللہ مٹھو کو سلامت رکھے! ایسے دو چار افراد اگر دعوتوں میں مل جایا کریں تو خدا کی قسم نمک سلیمانی اور پھکی والی ضرورت نہیں ان کی باتوں ہی سے کھانا ہضم اور دعوت ختم ہوجائے۔ "یار زندہ صحبت باقی"۔

□□

جنت کا مقدمہ

جنت اور دوزخ کی دیواریں ایک ہوتی ہیں چنانچہ سارے دوزخی جنت کی دیواریں توڑ کر اندر آجاتے ہیں۔ جنت والے بہت پریشان ہوئے کہ بار بار دیوار بناتے ہیں اور دوزخی توڑ ڈالتے ہیں انھوں نے پریشان ہوکر کہا "ہم لوگ تم دوزخیوں پر مقدمہ کردیں گے"۔
سارے دوزخی ہنسنے لگے "ارے میاں تم مقدمہ جیتو گے کیسے؟ سارے جج اور وکیل تو ہمارے پاس ہیں"۔

پاکٹ

سید عباس متقی
(امید آباد)

جانے کس احمق دلال نے اڑائی پاکٹ جانے کس اُلو کے پٹھے نے چُرائی پاکٹ
چند مصرعوں کے سوا اس میں رکھا کیا تھا جس کو بس نوٹ سمجھتے تھے وہ اک پرزہ تھا
ہائے کس چاؤ سے اس کو میں لیے پھرتا تھا ایک دن کاش یہ بھر جائے دعا کرتا تھا
تھے کبھی اس کے مقدر میں بھی سو سو کے نوٹ آج بیلن تھا نصیب اس کے مرا مٹیا کوٹ
بار مل جاتی تھی کھو کھو کے وہ بیگم کی طرح چپکی رہتی تھی ہمیشہ کسی سیڈم کی طرح
خانے تھے اس کے سبھی خالی مرے سر کی طرح اور ویران سی رہتی تھی مرے گھر کی طرح
کیا بتاؤں مگر اک چیز تھی اس میں بھاری دیکھ جس کو ہو بڑھاپے پہ جوانی طاری
میرے محبوب کی تھی اس میں پرانی تصویر
ایک ہی ان کی نشانی تھی وہ ان کی تصویر

ہزل

جھاپڑ ناگپوری

نکھٹو ہونا ہے تو پہلے تو ٹیچر بن جا
دیکھ نٹ پاتھ نقیروں کا منسٹر بن جا

صبح سے شام تلک شرکھیا آفس میں
شام سے صبح تلک بیوی کا نوکر بن جا

پاس ہونا ہے اگر سیم پرکشا میں تجھے
وہ مداری جو نچاتے ہیں تو تو بندر بن جا

باپ کہتا ہے کہ چھوٹے نہ شرافت بیٹا
اور ماحول یہ کہتا ہے کہ لوفر بن جا

آسرا اس سے ترے پاس تو چندا بھی
گھس کسی ورگ میں اور آپ کا لیڈر بن جا

ایک دو دن کو رلانے میں مزا آئے گا
ڈیلی لیڈر ہی سہی قوم کا رہبر بن جا

غم کے ماروں کو ہنسانے کے لیے اے جھاپڑ
فلم کا مسخرا سرکس کا تو جوکر بن جا

غزل

نشتر سیوانی

یوں لگتا ہے وہ مولانا کا لڑکا
نئے ماڈل کی کوئی چھوکری ہے

ہوئی ہے جب سے سرکاری عنایت
بڑھاپے پر جوانی آ گئی ہے

ارے اس دور میں سب فن سے اچھا
منسٹر کی سدا چمچہ گری ہے

یہ دیکھا ہم نے میک اپ کا کرشمہ
کہ اب بڈھی بھی بن جاتی پری ہے

بڑھا کر بال بندر بن رہے ہیں
حقیقت "ڈاروِن" کی تھیوری ہے

پھنسا جو عشق کے چکر میں نشتر
رفو چکر سکون زندگی ہے

سلطان جمہوری
(بنگلور)

کلکتہ کی سیر

حکومتِ ہند کو چاہیئے کہ وہ اپنی رعایا پر زندگی میں کم از کم ایک بار کلکتہ کی سیر کو لازمی قرار دے دے تاکہ جو لوگ کسی دھرم یا مذہب کے پیرو ہیں اور اُن کے یہاں جنّت و جہنم کا عقیدہ موجود ہے تو وہ مرنے سے پہلے روئے زمین کے جہنّم کی سیر کر کے حقیقی جہنم کا اندازہ کر سکیں، اور مرنے سے پہلے ایسا کام کر جائیں جو جنّت کا جواز بن سکے!

اور جو لوگ دھارمک اور مذہبی ہونے کے بجائے ڈھیٹ اور بے غیرت بن کر جہنمی عمل کی تکرار پر ڈٹے رہتے ہیں وہ چند روز کلکتہ میں رہ کر اپنے آپ کو جہنم پروف بنا سکتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے نزدیک یہ دنیا ہی اول اور آخر ہے اور جن کے عقیدے کے بموجب اُن کے کئے کی سزا و جزا یہیں ملتی ہے، تو دوسرے صوبے اور ملکوں کے تمام ایسے لوگوں کو سزا بھگتنے کے لیے کلکتہ بھیج دیا جائے ـــــ پتہ نہیں اقوام متحدہ نے اب تک ایسا بین الاقوامی قانون بنانے پر کیوں غور نہیں کیا ہے ـــ؟

اس شہر کے آباد کرنے کا سہرا جاب چارنک نامی عیسائی کے سر ہے جس نے اسے ۱۶۹۰ء میں کالی گھاٹ کے قریب بسایا۔ اب یہ پھیل کر مغربی بنگال کی آدھی آبادی کے برابر ہوگیا ہے۔ اس کی رفتار پر بریک نہ لگایا گیا تو یہ پھیل کر ہندوستان کے برابر ہو جائے گا ـــ اس پر پابندی نہ لگانے کا مطلب پوری دنیا کو ہندوستان بنانا ہے!!

اس شہر میں جائز طور پر داخل ہونے کے دو راستے ہیں۔ ایک ہوڑہ اور دوسرا سیالدہ۔ یہ دونوں ریلوے اسٹیشن ہیں اور ان پر اُترتے ہی پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہم نواب سراج الدولہ کی اس کالی کوٹھری میں آگئے ہیں جسے انگریزوں نے اپنے تاریخی تخیل سے تعمیر کیا تھا، اور جہاں سانس لینے کے لیے ہوا کی کوئی گزرگاہ نہ تھی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی لوگ سانس لینے کے لیے بے تحاشہ گیٹ کی طرف بھاگتے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی اور نہ کوئی احساس ہوتا ہے۔ احساس والے دھکے کھاتے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے بے حس ہو جاتے ہیں ـــــ اور جب یہ کلکتہ میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں تو اُن کے پاس بھارت کے سیاسی لیڈروں کی طرح صرف اپنی غرض کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا! اس بھاگ دوڑ میں بہت سی غیر اخلاقی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں کیوں کہ تنا ـــ

کے مطابق آزاد ہندوستان میں خاص کر لوکل مسافر بلا ٹکٹ سفر کرنے کی آزادی رکھتے ہیں اور اس کارِ خیر میں ریلوے ٹی ٹی نصف نصف ثواب کماتے ہیں۔ مگر بھیڑ، گرمی اور پسینے سے پریشان ہو کر بعض مسافر ٹی ٹی کے کارواں سے الگ ہو جاتے ہیں اور انسانوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے گیٹ سے گزر جاتے ہیں۔ ثواب میں کمی ہو تو ہو مگر ٹی ٹی ان کی خدمت سے محروم رہ جاتا ہے۔ مسافروں کی تعداد جو اس کے کارواں کی ہوتی ہے، اُسے گِنا کر گیٹ کیپر کو اپنے نذرانے کا ایک مخصوص حصہ دیدیتا ہے اور مسافروں کو عزت و احترام سے اس پُل صراط سے پار کرا دیتا ہے۔

بعض باتوں میں کلکتے کے لوگ بڑے آرام طلب ہوتے ہیں۔ مثلاً دو قدم بھی جانا ہوا تو ٹرام یا بس پر سفر کریں گے یہاں بس، مِنی بس، ٹیکسی وغیرہ کی تعداد آدمیوں کی تعداد سے نمبر لینے کی فکر میں ہے۔ مگر اکثر و بیشتر ان کی رفتار دیکھ کر کچھوے اور خرگوش کی کہانی یاد آجاتی ہے، لکھنؤ سے ایک حضرت آئے اور مٹیا برج میں ٹھہرے۔ واپسی پر تین دفعہ ٹرین چھوٹ گئی۔ چوتھی مرتبہ وقتِ مقررہ سے ایک دن قبل ہی ہوڑہ اسٹیشن کے لیے نکل پڑے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا ہوڑہ سے لکھنؤ بیس گھنٹے کا سفر ہے، مگر مٹیا برج سے ہوڑہ پورے چوبیس گھنٹے کا!

یوں تو ٹرافک جام سے بسوں اور ٹراموں کو قدم قدم پر رُکنا پڑتا ہے، مگر "بڑا بازار" کے راستے میں وقفہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ لوگ خود اپنے پسینے سے اچھی طرح نہا دھو سکتے ہیں، خواہ کوئی موسم ہو کیوں کہ کلکتہ میں دو ہی موسم ہوتے ہیں، گرمی اور برسات!!

یہاں کی برسات کا تماشہ دیکھ کر لوگ نظیر اکبرآبادی کو بھول جاتے ہیں۔ ذرا سی بوندا بوندی ہوئی اور سارا شہر جل تھل ہو گیا! اور کچھ زوردار بارش ہوئی تو کلکتہ وینس بنجاتا ہے جس میں ٹرامیں اور بسیں تیرتی نظر آتی ہیں۔ پیدل چلنے والوں کا آدھا دھڑ ہی نظر آتا ہے اور اگر ان کے ساتھ بچے ہوں تو لا محالہ رکشا والوں کی خوشامد کر کے جیسے تیسے گھر پہنچتے ہیں۔

پیدل چلنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ مگر یہاں پیدل چلنا ایک آرٹ ہے جسے سیکھے بغیر منزل پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر آپ فٹ بال کے کھلاڑی (واضح ہو کہ فٹ بال اور کلکتہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے) ہیں تو بہتے ہوئے پانی کی طرح راستہ بناتے ہوئے چلے جائیں گے۔ اگر بدقسمتی سے نہیں ہیں تو منزل کی جانب رُخ کر کے انسانوں کے بہتے ہوئے دریا میں اپنے آپ کو چھوڑ دیجئے۔ لوگ خود ہی دھکے دے دے کر آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیں گے!

بسوں اور ٹراموں میں سوار ہونے کے لیے کُشتی، باکسنگ، جوڈو اور کراٹے وغیرہ کا جاننا بالکل ضروری ہے، اس کے لیے جنس کی کوئی قید نہیں۔ ورنہ خانہ بدوشوں کی طرح اپنے وجود کو کاندھے پر لیے جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے گھر پہنچنا ہوگا، کیوں کہ یہاں بس اور ٹرام کے آنے تک لوگ کیوؤں میں کھڑے رہتے ہیں۔ جہاں بس اور ٹرام آئی لوگ اس پر پل پڑتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کتنا کمزور اور بے بس مخلوق ہے!

یہاں کی بسوں اور ٹراموں کو چلتی پھرتی کال کوٹھریاں کہہ سکتے ہیں۔ اندر تو تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی اور باہر بھی جس کو جہاں سہارا ملتا ہے لٹک جاتا ہے۔ چڑھنا جتنا دشوار، نکلنا اس سے بھی مشکل۔ اگر کوئی ہستی جادوئی طور پر اندر اور باہر آجا سکتی ہے تو وہ ہے کنڈکٹر کی (پرائیویٹ بس)۔ گورنمنٹ اور سیمی گورنمنٹ کی سواریوں میں کنڈکٹر حضرات

ٹکٹ لینے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے، کیوں کہ اُن کی تنخواہیں ہر ماہ باضابطہ مل جایا کرتی ہیں!

ایک صاحب سے کنڈکٹر نے کرایہ مانگا تو جواب ملا پہلے یہ بتاؤ کہ میرے ہاتھ پاؤں اور جیب کہاں کہاں ہیں اور خود میں کہاں ہوں۔ کنڈکٹر کی تادیب پر جب اس نے بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو گتھم گتھا بھیڑ ہونے کی وجہ سے ہاتھ کسی دوسرے کی جیب میں چلا گیا۔ بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا!

ہنگامے یہاں کے معمول میں سے ہیں۔ دراصل یہ بہت ہی زیادہ غیور طبیعت کی احتجاجی کیفیت کے نتائج ہوتے ہیں۔ ان کی جھلکیاں سیاست اور کھیل کے میدان میں بھرپور دیکھی جاسکتی ہیں۔ موہن بگان، محمڈن اسپورٹنگ اور ایسٹ بنگال صرف فٹ بال ٹیمیں ہی نہیں بلکہ مذہبی، جغرافیائی اور کلچری علامتیں ہیں۔ ان کے شیدائی ان کے جرسیوں کے پرچم لہراتے ہیں اور مخالف ٹیموں کے شیدائیوں کو اپنے علاقوں سے گزرنے نہیں دیتے۔ ہر علاقہ کسی نہ کسی ٹیم کا شیدائی ہوتا ہے اور وہاں جرسی کا پھریرا ہر گھر کی چھت پر لہراتا نظر آتا ہے۔ یہ منظر فٹ بال کے سیزن میں نہ صرف کلکتہ کے اندر بلکہ اس کے اطراف میں بھی نظر آتا ہے۔

اپنے کلب کی جیت کے لیے مندر، مسجد دعا، تعویذ وغیرہ سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اس پر بھی جیت نہیں ہوئی تو ان کے شیدائیوں پر بھوت سوار ہوجاتا ہے اور اپنی ٹیموں کی پٹائی کرکے فاتح ٹیم کے شیدائیوں سے اُلجھ جاتے ہیں، جس سے شہر کی فضا مکدر ہوجاتی ہے۔

ٹیموں کی ہار جیت کا اثر رس گلّے، مچھلی اور کباب پر بھی پڑتا ہے، کیوں کہ یہ تینوں غذائیں مذکورہ تینوں ٹیموں سے متعلق ہیں۔ بعض جیوتشی یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ان غذاؤں کو روک دیا جائے تو فٹ بال آپ سے آپ رک جائے گا۔ اور فٹ بال ختم ہوگیا تو کلکتے کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ان غذاؤں کا جسم پر جو حیاتیاتی اثر ہوتا ہے اس سے آدمی کے اندر بندر کی سی چستی اور پھرتی پیدا ہوجاتی ہے ورنہ یہ ناممکن ہے کہ کلکتہ کی بھیڑ اور انسانوں کے رواں دواں سیلاب میں کوئی پیدل چل سکے۔ ایک صاحب کو لاٹری میں لاکھ روپے کا انعام ملا۔ کار خریدنے گئے تو ڈیلر نے پوچھا کہاں چلائیں گے ــــ؟ خریدنے والے نے جھنجھلا کر کہا۔ کلکتے کا ہوں کلکتہ میں چلاؤں گا، اور کہاں چلاؤں گا ــــ!؟

دکاندار نے بیچنے سے انکار کردیا اور جواب دیا کہ اگر آپ لوگوں کے سر پر چلائیں گے کار حاضر ہے ــــ ورنہ اب زمین پر ــــ اور خاص کر کلکتہ کی سرزمین پر کار چلانے کا لائسنس بند ہوچکا ہے ــــ!!

نوواردوں کو چاہیے کہ کلکتہ جانے سے پہلے وہاں کے رسم و رواج سے کماحقہ معلومات حاصل کرلیں تاکہ مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہاں کے رسم و رواج میں ایک رواج خاصا اہم ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی چور اُچکا یا پاکٹ مار جن کی کلکتے میں بہتات ہے رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو جائے واردات پر موجود لوگوں میں سے ہر ایک کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق لاتوں، جوتوں اور مکوں سے اس کی تواضع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا اُسے مجرم کا حمایتی سمجھا جاتا ہے اور اس کی بھی خاطر خواہ مرمت کی جاتی ہے۔ لہٰذا سیف سائیڈ یہی ہے کہ وہ بھی دکھاوے کے لیے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوجائے!

کلکتہ اپنی ہڑتالوں، جلسے جلوس اور لاک آؤٹ کی وجہ سے اتنا مشہور ہے کہ روس اور چین میں اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ بہت سے محقق اس پر مُصر ہیں کہ کارل مارکس اور لینن کو کلکتے کا باشندہ کیوں نہ کہا جائے —؟ یہ حقیقت ہے کہ ہڑتالوں اور جلسے جلوس کے نہ ہونے سے کسی چیز کے گُم ہو جانے کا احساس ہوتا ہے — اِن کی ی ی لاب جندہ باد (انقلاب زندہ باد) اپنے دیئے ہوئے — اوئی دیتے ہوئے — سنگرام چولیے — این — کی ی ی ی — لاب — جین — دا — باد —!! (انقلاب زندہ باد)

کلکتہ کی عمارتیں کچھ اس ڈھنگ کی بنی ہوئی ہیں کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ جدید اور آزاد نظمیں یاد آجاتی ہیں جن میں قافیہ و ردیف کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ یہاں کی نالیاں اپنی منزل ہُگلی ندی کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتیں، بلکہ گندگیوں کو اپنی گود میں سُکھا کر پپڑیاں بنا دیتی ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو یہ نرم اور گیلی ہو کر پورے کلکتہ کی سطح پر پھیل جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی اب تک اسے گندگی میں پہلا انعام نہیں مل سکا ہے۔ برصغیر میں پہلا انعام پانے والا شہر کراچی ہے جسے اقوام متحدہ نے عطا کیا ہے۔ اس پر کلکتہ کارپوریشن نے سخت احتجاج بھی کیا تھا۔ مگر اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ سُنا ہے دوسرے سال میں ہوڑہ اور مٹیا بُرج کی میونسپلٹیوں کو بھی پیش کیا جائے گا جنھیں ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہ خاص مقام وہاں کی میونسپلٹیوں اور باشندوں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ ہے جن کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں!

کلکتہ میں دیکھنے کی چیزیں جادوگھر، چڑیا خانہ، وکٹوریہ میموریل، بالی گنج لیک، برلا پلانیٹیریم، ہوڑہ برج، شہید مینار وغیرہ ہیں۔ مگر ان میں چند خاص اہمیت کے حامل اور دید کے قابل ہیں۔ مثلاً چڑیا خانہ جس میں دنیا کے تمام جانوروں کے نمونے ہیں۔ اور یہ سب کے سب بڑی حیرت سے اُن لوگوں کو دیکھتے ہیں جو انھیں دیکھنے آتے ہیں۔ گوریلا اور بندروں کا استعجاب کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ برسوں کے بچھڑے ہوئے ساتھی کے اچانک سامنے آجانے پر کہے "ارے یار! کہاں رہے اتنے دن! — (اور پھر پُشت کی طرف دیکھ کر) — آخر تم لوگ ڈارون کے تختۂ مشق بن ہی گئے —!!"

شہید مینار شہیدوں کی یاد میں قائم کیا ہوا مینارہ ہے، مگر اب اس کی وجۂ تسمیہ بدل گئی ہے۔ اس مہذب اور بھری پُری دُنیا سے، جو لوگ بے زار ہو جاتے ہیں یا جو محبت میں ناکام ہو جاتے ہیں، وہ اس پر چڑھ کر بڑی حقارت سے دنیا کو دیکھتے ہیں اور پھر قلا بازی لگا کر شہید ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے یہ شہید مینار کے نام سے مشہور ہے!

اس کے آس پاس کا علاقہ اپنی چہل پہل، خوانچے والوں، بندر ناچ اور سیاسی جلسے جلوس کے لیے لندن کے ہائیڈ پارک کے مشابہ ہے۔ کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کی تقریر یہاں روز ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو بیک وقت کئی کئی پارٹیاں اپنے اپنے جھنڈوں کو لیئے ہائے ہو، سے صور اسرافیل کو مات کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر بھی ہم اس مقدس جگہ کو سیاسی بدہضمی کی جائے رفع حاجت نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ یہیں سے ایک بھولا بھٹکا مسافر کلکتے کے اندر جہاں چاہے جا سکتا ہے!
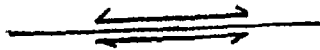
عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

قسط — ۴

ایک سفر، ہیومر اور ملیکس کے لیے

ضمیر صاحب بجائے اپنے کمرے میں جانے کے میرے کمرے ہی میں چلے آئے تھے اور اب سارے دن کے تھکے ہوئے میرے برابر والے بستر پر لیٹے خواب استراحت کے مزے لے رہے تھے۔ میں بھی بستر پر لیٹتے ہی سو گیا تھا لیکن ابھی ہمیں سوئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے چنانچہ میں نے ہڑبڑا کر اپنے بستر سے چھلانگ لگائی اور ضمیر صاحب کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "ضمیر صاحب! ضمیر صاحب!" ضمیر صاحب گھبرا کر اٹھ بیٹھے "کیا ہوا!"

"ہمیں حیدرآباد پہنچے ہوئے چوبیس گھنٹے ہونے کو ہیں" میں نے پھولی ہوئی سانس سے کہا "مگر ہم نے ابھی تک تھانے جا کر ارائیول نہیں لکھوائی۔"

اس دفعہ ضمیر صاحب نے بستر سے چھلانگ لگائی۔ میز پر پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں پڑی بتیسی اٹھا کر منہ میں رکھی سر پر ٹوپی دھری اور کہا "جلدی تھانے چلو پانچ سال قید ہے!"

یہ تھانہ تو نہیں انٹیلی جنس کا دفتر تھا جس کھڑکی سے ہم نے اپنی ارائیول لکھوائی تھی اس کے باہر ایک تختی پر "صیغہ جانب" لکھا تھا۔ حیدرآباد میں اردو کی یہ بالادستی اس سچوایشن میں بھی اچھی لگی۔ دہلی میں تو ہم پانچ منٹ میں اس "کارخیر" سے فارغ ہو گئے تھے مگر یہاں ہم سے اتنی درخواستیں لکھوائی گئیں اور اتنے فارم بھروائے گئے کہ پورے دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ گویا ادھرا پردیش میں قائم راما راؤ کی اپوزیشن حکومت نے مرکز کی مخالف حکومت کو جتلا دیا تھا کہ یہاں ہم سچ مچ کی اپوزیشن ہیں تم نے غیر ملکی مہمانوں کے لیے آسان پروسیجر اپنا یا ہے تو اپنائے رہو۔ ہم تمہاری پیروی بہر حال نہیں کریں گے۔ تاہم اس تکلیف دہ صورتحال کے دوران ایک واقعہ پر لطف بھی ہوا۔ کلرک نے ہماری اردو میں لکھی گئی درخواست کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کہا "یہ ذرا پڑھ کر بھی سنا دیں تاکہ پتہ تو چلے کہ آپ نے لکھا کیا ہے؟" اس پر مجھے اپنے ہاں کے ایک دفتر کے کلرک یاد آ گئے، موصوف لٹریری کے معاملے میں بالکل کورے تھے مگر اس کلرک کے برعکس وہ اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے پاس انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی درخواست جاتی تو وہ عینک لگاتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے وہ اس کا ایک ایک لفظ پورے غور سے پڑھ رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ عینک اتارتے، درخواست پر پیپر ویٹ رکھتے اور درخواست گزار کو مخاطب کر کے کہتے "تمہاری درخواست تو میں نے پڑھ لی ہے اب تم مختصراً مجھے بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

یہاں سے فراغت پاکر شام کو چھ بجے کے قریب ہوٹل پہنچے تو سات بجے تک نے کتنے ہی احباب کے رقعے ہمارے سپرد کئے۔ جو ہمیں ہوٹل میں نہ پاکر لوٹ گئے تھے تھوڑی دیر بعد ہمیں نواب شاہ عالم خاں کے ہاں عشا ئیے پر جانا تھا اور یہ عشائیہ عام طرح کا عشائیہ نہ تھا۔ بلکہ حیدرآباد دکن کی پرانی تہذیب کے رکھ رکھاؤ والا کھانا تھا۔ جسے "چوکی کھانا" کہا جاتا ہے۔ لفٹ میں بیٹھ کر اپنے کمروں کی طرف جاتے ہوئے بہت قریب سے قیں قیں قیں کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر لفٹ میں ادھر اُدھر دیکھا کہ یہاں بطخ کہاں سے آگئی ہے مگر یہ تو اپنے ضمیر جعفری تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو ان کا مخصوص سگنل تھا جو تھک جانے یا کسی بوریت سے دوچار ہونے کی صورت میں وہ کھلنڈر سنز کے لیے استعمال کرتے تھے یا بسا اوقات ایسی صورتِ حال میں کسی اجنبی سے سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے یکدم مضحکہ انداز اختیار کر لیتے تھے اور جان بوجھ کر اکمل بے جوڑ جملے بولنے لگتے تھے۔ ضمیر صاحب کی یہ دلچسپ ادائیں ان کے علاوہ میری تھکن بھی اتار دیتی تھیں۔

ضمیر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مجھے اپنے کمرے میں چارپائی پر دراز ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ٹرن ٹرن ٹرن ٹرن!

"میرے خیال میں مجھے "مچلا" بن جانا چاہیئے اور ٹیلیفون نہیں اٹھانا چاہیئے" میں نے سوچا

مگر گھنٹی مسلسل بجتی جارہی تھی . . . . . ٹرن ٹرن ٹرن!

ٹیلی فون کی گھنٹی بجے جارہی تھی میرے جسم میں سارے دن کی تھکن سرایت کئے ہوئے تھی مگر پھر اس خیال سے کہ سفر میں ہیں اور ممکن ہے دوسری طرف کوئی مسافر نواز ہو۔ میں نے فون اُٹھالیا۔

"صاحب! میں محمد نواز ڈرائیور بول رہا ہوں"

"ہت تیرے کی" میں نے اسے دل ہی دل میں کوستے ہوئے کہا "کیا بات ہے؟"

"صاحب! رویندر بھارتی میں اس وقت مائم شو ہے آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں" دوسری طرف سے "مسافر نواز" محمد نواز نے کہا "تم چلو ہم نے آنا ہوا خود پہنچ جائیں گے" اور پھر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا ـــــ "ٹرن . . . ٹرن . . . ٹرن" ٹیلی فون کی گھنٹی ایک دفعہ پھر بج رہی تھی ـــــ

"میں ضمیر بول رہا ہوں۔ فوراً میرے کمرے میں چلے آؤ۔ کچھ خوبصورت مہمان تم سے ملنا چاہتے ہیں"

میں نے "یا ہو" کا نعرہ لگایا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر سیدھا باتھ روم میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، بال سنوارے، کپڑوں پر کولون اسپرے کیا اور دوسری منزل پر واقع ضمیر صاحب کے کمرے کا دروازہ "ٹھک" کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ستر سالہ ضمیر جعفری کے بستر پر ساٹھ ساٹھ سال کے دو بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"ان سے ملو، یہ مینائی صاحب ہیں، حیدرآباد دکن ہی کے ہیں اور یہ پاکستان کے ممتاز آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کرمانی ہیں"

اس وقت خود مجھے آنکھوں کے معائنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ مجھے کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آرہا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" میں نے ان خوبصورت مہمانوں سے انداز سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ـــــ مگر کچھ ہی دیر کی گفتگو کے بعد ان واقعی خوبصورت مہمانوں سے جدا ہونے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر اس وقت رات کے آٹھ بجنے کو تھے اور بیگ احساس ہمیں نواب شاہ عالم خاں کے عشائیے میں لینے کے لیے ہمارے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

نواب شاہ عالم خاں کی پرانی طرز کی وسیع و عریض کوٹھی کے لان میں شہر بھر کی "ایلیٹ" جمع تھی۔ اپنی عمر سے بہت کم نظر آنے والے گورے چٹے نواب صاحب شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ نواب شاہ عالم خاں ایک سگریٹ ساز کمپنی کے مالک ہیں اور حیدرآباد دکن کی وضعدار تہذیب کے نمائندہ افراد میں سے ہیں۔ چنانچہ مشروبات کے بعد جب کھانے کے لیے ہم لان کے دوسرے حصے میں گئے تو یہ دیکھ کر بے پناہ فرحت ہوئی کہ لان میں چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان چاندنیوں کے درمیان میں چوکیاں رکھی تھیں جن پر کھانا دھرا جارہا تھا۔ یہ حیدرآباد کے "چوکی کھانے" کا مخصوص انداز تھا۔ چنانچہ مہمان چھ چھ آٹھ آٹھ کی ٹولیوں میں ان چوکیوں کے گرد بیٹھ گئے۔ بریانی اور شیروانی حیدرآباد کے "قومی نشانات" میں سے ہیں اور اس دعوت میں بریانی اور شیروانی دونوں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ نواب صاحب کے گھر کی خواتین اور بعض دوسری مہمان خواتین بھی اس ضیافت میں شریک ہوگئیں۔ مگر وہ مردوں سے ذرا فاصلے پر علیحدہ چوکیوں کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں اور یوں یہاں بھی ایک اعتدال کی روش اپنائی گئی تھی۔ مجھے یہ "چوکی کھانا" اس قدر "ہانٹ" کر رہا تھا کہ میں کھانے سے زیادہ چوکیوں کے گرد "چوکی" ڈال کر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی تصویریں بنانے میں مشغول تھا۔ بیگ احساس نے مجھے کھانے سے غافل پایا تو انہوں نے کیمرہ مجھ سے لیا اور کہا "قاسمی بھائی آپ آرام سے کھانا کھائیں آپ کے لیے تصویریں میں بناتا ہوں"۔

کھانے کے بعد محفل مشاعرہ سخن تھی اور یہ بھی فرشی نشست پر مشتمل تھی جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر نے مسند صدارت سنبھالی اور ایک بار پھر بہت مزا آیا کیونکہ یہ محفل شعر و سخن بھی بہت منفرد تھی۔ حیدرآباد والوں کے لیے ہنس کر اس شہر کا تو اوڑھنا بچھونا ہی طنز و مزاح ہے۔ یہ انفرادیت ہم لوگوں کے لیے تھی کہ یہاں سب شاعر مزاحیہ کلام سنانے والے تھے۔ اور مزاحیہ کلام بھی کوئی ایسا ویسا نہیں بلکہ عام انداز سے بہت ہٹ کر مثلاً طالب خوندمیری کی نظم عام ڈگر سے بالکل ہٹ کر تھی۔ مصطفیٰ علی بیگ شاعر ہی نہیں۔ بڑے منجھے ہوئے کامیڈین بھی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی "اینگلو اردو غزل" سنائی اور کچھ اس طرح سے کہ ترنم بھی مزاحیہ تھا۔ حمایت اللہ کا قہقہہ آور کلام دکنی لہجے کی اردو میں تھا۔ ایک شاعر سید ساجد علی تھے جو سجنی تخلص کرتے ہیں انھوں نے ریختی سنائی۔ ریختی سنانے کی روایت تو یہ ہے کہ شاعر دوپٹہ اوڑھ کر اور دیگر زنانہ لوازمات کے ساتھ سامعین کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور عورتوں کی زبان اور زنانہ کیفیات کے حوالے سے شعر کہتا ہے مگر سجنی نے پینٹ اور قمیض پہنی ہوئی تھی گویا یہ ماڈرن سجنی تھی۔ سجنی کی ریختی کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔

یہ راز میں نہ سمجھ پائی آج تک بھائی   کہ تم سے آتی ہے کیوں بھائی جان کی خوشبو

چمٹ کے سو گئی کل رات ان کے سینے سے   بھلی کچھ ایسی لگی امی جان کی خوشبو

مصطفیٰ علی بیگ نے جو "اینگلو اردو غزل سنائی اس کا ایک شعر:

گھاکیہ لیجئے آئی ڈونٹ مائنڈ   مگر ظاہر ہے پھینی پاک ریلیشن

اس شعر پر کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری رہی اور پھر بہت زوردار قہقہہ لگا۔ ہمارے ہاں کی مزاحیہ شاعری اور سامعین کی خوش ذوقی ابھی یہاں تک نہیں پہنچی۔ سید ضمیر جعفری نے یہاں نظم پڑھی وہ ان کے اپنے رنگ میں ہوتے ہوئے اپنے رنگ سے قدرے ہٹی ہوئی تھی۔ اس پہ قہقہوں کی بجائے زیر لب مسکراہٹیں تھیں اور یہ ایک فکری لہر بھی جو پوری نظم میں رواں دواں تھی سو مصطفیٰ علی بیگ کی اینگلو اردو غزل اور سجنی دہلوی کی ریختی کے درمیان اس "نظم" کا سواد کچھ اور ہی طرح کا تھا۔

کھانے اور محفل شعروسخن سے فارغ ہوکر رات کو ساڑھے گیارہ بجے واپس ہوٹل پہنچے تو ضمیر جعفری نے کار میں سے اترتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "اب تم سیدھے گھر جانا۔ ہاں دیکھ لو کہہ دیا ہے اگر اِدھر اُدھر گئے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ بریانی کیسی لگتی ہے۔ شیر دانی بھی کبھی پہنتے ہو کہ بس بریانی ہی کھاتے رہتے ہو؟" ڈرائیور بچارا ہکا بکا ہوکر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ مگر میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ کیوں کہ گذشتہ چند دنوں کی رفاقت سے میں جان گیا تھا کہ ضمیر صاحب جب بہت بُری طرح تھک جائیں اور یوں اکتاہٹ کا شکار ہوں تو یا تو وہ لطیفے کی آوازیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں اور یا کسی اجنبی سے اس طرح کی بے ربط گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کا ایک یا تھ میرا بھی "کتھارسز" ہو جاتا ہے۔ ضمیر صاحب اس وقت واقعی تھکے ہوئے تھے خود میں بھی تھکا ہوا تھا۔ مگر ضمیر صاحب کے اس "کتھارسز" سے میں اور وہ دونوں ایک دفعہ پھر تازہ دم ہو گئے تھے۔

میں اور ضمیر صاحب کاؤنٹر سے اپنے کمروں کی چابیاں لے کر لفٹ کی طرف جانے لگے تو لابی میں سامنے صوفوں پر غیاث متین بیٹھے نظر آئے ان کے ساتھ تین چار دوست اور بھی تھے اور یہ بجانے کب سے یہاں میرے اور ضمیر صاحب کے انتظار میں بیٹھے تھے ضمیر صاحب کے چاہنے والے پاکستان کے علاوہ انڈیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور مزاح کے شہر حیدرآباد دکن میں تو ان کے مُرید خصوصاً بہت بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ غیاث متین کے ساتھ مضطر مجاز، رؤف خیر، قدیر زماں اور یوسف اعظمی تھے۔ مضطر بہت قادر الکلام اور پختہ فکر شاعر ہیں۔ اقبال کے بیشتر فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "موسم سنگ" کے نام سے ان کا طبع زاد کلام کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ رؤف خیر جواں ہی نہیں جواں فکر شاعر بھی ہیں۔ نئی حسیت کے حامل اس شاعر کا مجموعہ "ایلاف" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ("ایلاف" کا مطلب پوچھنا ان سے یاد نہیں رہا) قدیر زماں جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ اس کے علاوہ وہ ڈرامہ نگار اور مترجم ہیں۔ یوسف اعظمی شاعر نقاد اور دانشور ہیں۔ انگریزی اد کے آدمی ہیں۔ اور باقاعدہ انٹیلکچوئل ہیں۔ ضمیر صاحب نے کچھ دیر ان دوستوں سے گپ شپ کی۔ وہ شاید کچھ دیر اور بیٹھتے مگر مجھے خدشہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد اگر ان دوستوں کو اچانک کسی کونے سے لطیفے کی آواز سنائی دی لطیفہ نظر نہ آئی تو یہ کہیں پریشان نہ ہو جائیں چنانچہ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ضمیر صاحب سے کہا کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آپ کمرے میں چل کر آرام کریں یہ سن کر ضمیر صاحب کی آنکھوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پھر وہ ان دوستوں سے ہاتھ ملا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں غیاث متین اور قدیر زماں، رؤف خیر اور یوسف اعظمی رات کے دو بجے تک پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گپ شپ کرتے رہے اور جب اٹھے تو پتہ چلا کہ غیاث متین نے اس شہر میں مجھے تین اور دوست ایسے دیئے ہیں جن سے دوبارہ ملاقات اگر کبھی کبھی ہوئی تو بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔

تقریباً ڈھائی بجے بستر پر دراز ہوتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یاسر، عمر اور علی میرے ساتھ آکر لیٹ گئے اور کہہ رہے ہیں "ابو ہمیں کہانی سناؤ" علی میرے پیٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ یاسر اور عمر میرے دائیں اور بائیں ہیں اور میں ان کے ننھے ننھے بازوؤں کے حلقے میں ہوں۔ اور پھر میں انہیں کہانی سناتے سناتے سو جاتا ہوں۔

صبح سات بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ضمیر صاحب ناشتے کے لیے بلا رہے ہیں۔ میں ضمیر صاحب اور حسن عسکری ناشتے کے لیے نیچے ریستوران میں پہنچتے ہیں۔

"جنوبی ہند میں ہیں تو آج ناشتہ بھی خالص جنوبی ہند کا کرنا چاہیئے" حسن عسکری کہتے ہیں۔

"اور اس کے بعد کانٹینٹل ناشتہ" ضمیر صاحب لقمہ دیتے ہیں۔
"ویٹر" (حسن عسکری)
"ویٹر" (ضمیر جعفری)
"ویٹر" (عطاء الحق قاسمی)
ہم تینوں باری باری ویٹر کو آوازیں دیتے ہیں۔ مگر ویٹر تو وہ ہوتا ہے جس کے لیے آپ کو "ویٹ" کرنا پڑے چنانچہ تھوڑی دیر "ویٹ" کرانے کے بعد بالآخر ویٹر آتا ہے۔
"اگر آپ کو ساؤتھ انڈیا ناشتہ کرنا ہے۔ تو ہوٹل کے ویجیٹیرین رلیستوران جائیں۔ یہاں صرف نان ویجیٹیرین ناشتہ ملتا ہے"۔۔۔ ویجیٹیرین رلیستوران میں ہم دوسہ منگواتے ہیں۔ یہ چاول کو پیس کر چپاتی سے بھی پتلا بنایا جاتا ہے اور پھر سے رول کر کے اس میں سبزی بھری جاتی ہے۔ مزیدار چیز ہے۔
"اب کوئی سویٹ ڈش بھی ہونی چاہیئے" ضمیر صاحب کہتے ہیں۔
اور پھر غالباً ہم پنگل کا آرڈر دیتے ہیں جو چاول، دالوں، دودھ، چینی، کاجو، اور پستے کے "اجزائے ترکیبی" پر مشتمل ہے "کیسا ہے؟" میں ضمیر صاحب سے پوچھتا ہوں۔۔ "اچھا ہے" ضمیر صاحب کہتے ہیں "مگر میٹھا، میٹھا ہی ہے"۔
تھوڑی دیر بعد رائل تھا کیز سلطان بازار میں مزاحیہ فلم فیسٹیول کا افتتاح بھارت کے مرکزی وزیر اطلاعات وی این اڈگل کرنے والے ہیں۔ مگر میرا ارادہ لنچ کے وقت کے لیے راما راؤ سے انٹرویو کرنے کا ہے چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران ان سے رابطے کی کوشش کی جائے۔ البتہ ڈھائی بجے "اردو مزاح" کے موضوع پر سیمینار ہے۔ شام کو ساڑھے چھ بجے اردو کے مزاحیہ مضامین کا سیشن ہے (جس میں ہم نے "کام" دکھانا ہے) اور رات کو پنجابی سیشن ہے۔ جس میں شرکت بھی ہمیں رعال کرنی ہے۔ ان کے علاوہ بنگالی، گجراتی، کنڑی، ملیالم، مرہٹی، تلگو اور تامل زبانوں میں مزاح کے موضوع پر متوازی سیشن ہو رہے ہیں۔ چنانچہ میں ضمیر صاحب سے مشورہ کرتا ہوں وہ میرے ساتھ اتفاق کرتے ہیں اور پھر ہم یہاں سے اٹھ کر واپس کمرے میں آجاتے ہیں۔
"میں کمرہ نمبر ۱۰۶ سے بول رہا ہوں"۔
"بولو" آپریٹر کہتا ہے۔
"راما راؤ صاحب کے سیکرٹری کا فون نمبر چاہیئے اور اگر مل جائے تو ان سے بات بھی کرا دیں"
"بہت اچھا صاحب"
"تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجتی ہے" یہ لو صاحب شری راما راؤ سے بات کرو!"

بیوی: ۔ کہاں جا رہے ہو؟ خاوند: ۔ خودکشی کرنے۔
بیوی: ۔ تو پھر زیورات اور نقدی کا بکس کیوں لے جا رہے ہو؟
خاوند: ۔ میں کوئی سکندر اعظم کی طرح پاگل نہیں جو دنیا سے خالی ہاتھ چلا جاؤں۔

اوتار کرشن رہبر
مترجم: منصور احمد منصور

کشمیری سے ترجمہ

شاعروں کا بھی کوئی جواب نہیں. ذرّے کو آفتاب اور آفتاب کو ذرّہ بنانا کوئی ان سے سیکھے. یہ بے رنگی میں رنگینی اور رنگینی میں بے رنگی کے نقش ابھارتے ہیں. یہ جب بادشاہوں کی مدح میں قصیدے لکھتے ہیں تو نیل گگن پر جھلملاتے تارے ان کی دستار اور شلوار میں چمکتے ہوئے دکھاتے ہیں. جب محبوب کے حسن و جمال کی بات چھیڑتے ہیں تو گل لالہ ہی کیا" آفتاب عالم تاب کو بھی حسنِ معشوق کے سامنے ماند پڑتا دکھاتے ہیں. جب محبوب کے گلفام اور نازک اندام بدن کا ذکر کرتے ہیں اس کی جھیل سی گہری غزالہ آنکھوں اور ان میں پھیلے کاجل کی لکیروں اور سُرخی و مستی کے ڈوروں کا ذکر کرتے ہیں تو واللہ عقل کا بھی 'دل' ڈوبنے لگتا ہے. عقل بھی دل ہار بیٹھتی ہے. لیکن زیادہ حیرانی اس وقت ہوتی ہے جب یہ محبوب کی موہوم کمر کی بات چھیڑتے ہیں. یہ محبوب کی کمر کے پتلے پن کو کچھ اس طرح سے کھوجتے اور تلاش کرتے ہیں کہ خود عقل کی کمر ٹوٹ جائے ـــــ

یارہ ژیتہ پتہ بوزاں کمر چھُے یاوتَم
کمہ سیتھو، کیتھہ ہیوٗ، کیتن چھُے یاوتَم

ترجمہ: (میرے محبوب! تمہاری کمر کے بارے میں کیا کیا نہ سُنا ہے. لیکن یہ کہاں اور کیسی ہے، کچھ تو بتا، کچھ تو دکھا)

کیوں کہ محبوب کی اس کمر کی کوئی لمبائی ہے نہ کوئی گہرائی. اس لیئے عقل سرگشتگی و حیرانی کے صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ مجھے نہ تو بے بات کی بات بنانی آتی ہے اور نہ ہی لفظوں سے کوئی ایسا طلسم گھر بنانا آتا ہے کہ عقل محو حیرت ہو ـــــ میں صرف اتنا کہوں گا کہ چائے تو آخر چائے ہے ـــ چائے کے ساتھ ہمارا اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا سالن اور ترکاری میں گشتابے[1] کے ساتھ ہے. اگر میں کوئی قصیدہ گو ہوتا تو میں صرف اور صرف در مدح چائے کیا کیا قصیدے لکھ ڈالتا ـــ اس لیئے

---

[1] گشتابہ: کشمیری دازہ وان میں سب سے عمدہ سالن سمجھا جاتا ہے.

کہ چائے میں زندگی کی حرکت اور حرارت ہے۔ اسی سے زندگی کا سوز و ساز اور تب و تاب ہے۔ شاید اسی لئے چائے کے کسی شیدائی نے لکھا ہے —

موغلی نے آسی شیری چَے تو تہ چَمِے چائے
شیری نے آسی ٹیٹھ چَمِے تو تہ چَمِے چائے

(چائے نمکین ہو یا چائے شیریں یا کڑوی ہو، جو کچھ بھی ہو ہم چائے کے بغیر نہیں رہ سکتا)

القصہ ہم چائے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چاہے وہ قہوہ کی صورت میں ملے، لپٹن چائے ہو یا کافی یا کچھ اور۔ کچھ تو ہونا چاہیئے۔ نہیں تو زکام ہو جائے — غمی ہو یا خوشی ہاتھ میں رکھی ہوئی ہر چیز بھاری لگتی ہے۔ بیکار لگتی ہے لیکن چائے کی پیالی پہروں ہاتھ میں رہے، یہ کوئی بوجھ اور بیکار نہیں لگتی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب بزم احباب پوری طرح جمی ہوئی ہو، ہمکلامی اور قہقہے کھنک رہے ہوں اور مے ناو نوش یعنی چائے کا دور چل رہا ہو، تو ایسے وقت میں چائے کا لطف کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہی ذہن و شعور کے مقفل دروازے کھل جاتے ہیں اور فکر و خیال کی کیسی کیسی پریاں رقص کناں ہونے لگتی ہیں —!

چائے کی طلب ہندوستان سے لیکر لندن تک بڑھتی ہی جاتی ہے لیکن ہم کشمیریوں کو چائے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہے۔ اسے جانِ من اور جانِ جہاں کا خطاب ملا ہے اور جب الائچی بھی اس میں ڈالی جائے تو گویا لیلیٰ اور مجنوں کا سمبندھ ہو گیا۔ چنانچہ کشمیری ضرب المثل ہے کہ بغیر الائچی کے چائے مجنوں کا لیلیٰ کے بغیر ہونا ہے — چائے ہمارے لئے ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے چنانچہ کسی جگہ اطمینان سے بیٹھنے اور بات کرنے کو تب تک جی نہیں چاہتا جب تک کہ چائے کا انتظام نہ ہو یہی وجہ ہے کہ دعوت ناموں میں دوسری چیزوں کے علاوہ کارڈ کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے

"A cup Of Tea Will be Also Served."

یعنی چائے بھی پلائی جائے گی۔ اگر دعوتی کارڈ پر یہ نہیں لکھا ہوگا تو مجلس میں زیادہ لوگوں کی شرکت کی اُمید عبث ہے۔ اس سے نہ صرف چائے کی ضرورت واضح ہوتی ہے بلکہ یہ بھی کھلتا ہے کہ چائے کے بہانے بہت سے کام بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ ہمارے کچھ شاعر اس بات کے رمز آشنا ہیں۔ اسی لئے تو انہوں نے چائے کے پس منظر میں نہایت ہی دلنشین شعر کہے ہیں۔ ایک نغز منش شاعر نے کہا ہے —

چھُم ہیہ تمناہ بالہ ہُند ے ہیتہ یور ہیر نائے
کمہ نیا مشر کھیا دوہ مادن چائہ ہ نادن چائے

(میری تمنا ہے کہ کاش وہ دلبر باہر آئے کہ میں اس جانِ تمنا کو چائے پلاؤں)

٭ کڑوی سے مطلب بغیر دودھ کے ہے۔

اور پھر چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے قصے کہانیاں سننے سنانے میں بڑا ہی لطف آتا ہے بالخصوص سرما کی سرد راتوں میں۔ چائے سے جب جسم میں گرمی آتی ہے تو باتوں اور قصے کہانیوں کے دائرے نٹ پاتھ کی زندگی سے پھیل کر ماورائے نٹ پاتھ تک پھیلتے بڑھتے ہیں۔ افلاس، بے روزگاری، سیاست، پاگل پن، تنہائی، نفاست غرض ڈھیر سارے مضامین اور موضوعات چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اترتے چلے جاتے ہیں — ! ○○

پاکستان میں طنز و مزاح اور انشائیہ — (۱۹۸۴ء میں)

اس مد میں کوئی خاص کام نظر نہیں آتا تاہم اعتبار ساجد کے مضامین کا مجموعۂ قصہ پانچویں درویش کا خاصے کی چیز ہے اعتبار ساجد نے اس مجموعے میں اپنا اور اپنے ماحول کا کارٹون پیش کیا ہے ادھر ڈاکٹر محمد سرشار خاں کے مضامین کا مجموعۂ کھول کے دیکھو آیا ہے کتاب کے انداز مزاح کا اندازہ اس انتساب سے لگایا جا سکتا ہے "اُن سرکاری مرغوں کے نام جو میری مسیحائی کی زد میں آ چکے ہیں یا آنے والے ہیں" اس برس عطاء الحق قاسمی کی مقبول کتاب خندِ مکرر کا بھی نیا ایڈیشن منظر عام پر آیا اگرچہ انشائیے جرائد میں طبع ہو رہے ہیں لیکن اس برس انشائیوں کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی البتہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ۱۹۶۱ء میں مطبوعہ خیال پارے بالآخر ۱۹۸۴ میں دوسری مرتبہ شائع ہو ہی گئی۔ ۲۳ برس کے بعد خیال پارے کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ واقعی ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے ملک کے مقبول ترین انشائیہ نگار ہیں !

ڈاکٹر سلیم اختر

طاہر مسعود (پاکستان)

بات چیت

کرنل محمد خاں سے

(کرنل) محمد خاں ۵۴ برس کی عمر میں راتوں رات ادیب بنے۔ ان کی پہلی کتاب "بجنگ آمد" ۱۹۶۵ء میں چھپی اور فوراً ہی مقبول ہو گئی۔ پھر انھوں نے "بسلامت روی" لکھی اور ۱۹۸۲ء میں ان کے مضامین و افسانوں کا مجموعہ "بزم آرائیاں" منظرِ عام پر آیا۔ انھوں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے دیگر ادیبوں کی طرح نہ پاپڑ بیلے، نہ چلّہ کھینچا نہ ہی کوئی طول طویل منصوبہ بندی کی۔ وہ آئے انھوں نے لکھا اور وہ تسلیم کر لیے گئے۔

مسلّح افواج نے ہمیں مارشل لا، کے علاوہ جو چند اچھے ادیب دیئے ہیں' ان میں محمد خاں کا نام نمایاں ہے۔ کرنل ان کا عہدہ تھا لیکن یہ ان کے اسم کا لازمی جزو بن گیا۔ تاہم انھیں اپنے دو حرفی نام ہی پر اصرار ہے۔ اس سے ان کی بے نیازی اور اس سے زیادہ مستقبل شناسی کی نشاندہی ہوتی ہے۔

محمد خاں میں جو ۵ اگست ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے بظاہر ادیبوں والی کوئی علت نہیں پائی جاتی۔ ان سے مل کر ایک ایسے خوش طبع آدمی کا تاثر ابھرتا ہے جو سخت جاڑے میں آتشدان کے سامنے کرسی ڈالے حالاتِ حاضرہ پر ہلکی پھلکی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا عادی ہو۔ وہ ہر شام چھڑی سنبھالے (جو ان کے ریٹائرڈ کرنل ہونے کا اکلوتا ظاہری ثبوت ہے) سیر کو نکلتے ہیں تو دور سے لگتا ہے وہ اپنے شریر بچے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ قدیم طرز کے سجے سجائے گھر میں تنہا رہتے ہیں اور ایک خدمت گار ان کے ہمراہ رہتا ہے۔ وہاں اکثر شاموں کو شفیق الرحمٰن اور سید ضمیر جعفری جیسے ہم مزاج دوستوں کی پُرجوش محفلیں جمتی ہیں اور خوب قہقہے لگتے ہیں یوں وہ شگفتہ شگفتہ سی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی تحریروں سے قارئین کو شگفتہ مزاج بنا رہے ہیں۔

سوال : "بجنگ آمد" کا شمار اردو کے شاہکار مزاحیہ ادب میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کے بعد آپ کی دو تصنیفات "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" منظرِ عام پر آئیں لیکن ان کتابوں کے متعلق ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ان میں آپ تحریر کا وہ معیار برقرار نہ رکھ سکے جس نے "بجنگ آمد" کو مقبولیت بخشی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

کرنل محمد خاں : میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ "بجنگ آمد" کو اچھا کہنا اور میری دوسری کتابوں کو اچھا نہ کہنا لوگوں کا کام ہے یہ کام انھوں نے کر دیا ہے۔

سوال : یعنی دوسری کتابیں لکھتے وقت آپ جس تخلیقی عمل سے گزرے۔ اس وقت آپ کا اپنا تاثر کیا تھا کہ آپ کس پایے کی تصنیف پیش کرنے جا رہے ہیں۔ کیا آپ نے ان کتابوں کو بھی لکھتے وقت "بجنگ آمد" کی طرح انجوائے کیا تھا؟

کرنل محمد خاں : مجھے ان کتابوں میں کوئی خاص فرق کبھی نظر نہیں آیا۔ "بجنگ آمد" لکھتے وقت بھی مجھے قطعاً احساس نہ تھا کہ یہ اس قدر

مقبول ہوگی لیکن ظاہر ہے جب کوئی چیز تیار ہوتی ہے تو لوگوں کو اُسے پسند اور ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے
اور آپ نے یہ بجا فرمایا کہ لوگوں نے "بجنگ آمد" کو میری دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ پسندیدگی بخشی۔ صرف ایک
یہ کہ جن لوگوں نے "بسلامت روی" کا مطالعہ پہلے کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ "بجنگ آمد" میں نے اچھی نہیں لکھی جنھوں
نے "بزم آرائیاں" کو سب سے پہلے ہاتھ لگایا ہے۔ ان کی رائے "بسلامت روی" کے متعلق بہت اچھی نہیں ہے۔
اتفاق کہئے کہ "بجنگ آمد" لوگوں کو اِس قدر پسند آگئی ہے کہ وہ اس کے اثر سے نہیں نکل پائے ہیں۔ حالاں کہ میری دو
کتابیں اتنی بُری بھی نہیں ہیں۔ "بجنگ آمد" کا اپنا اسٹائل اور اپنا ماحول ہے۔ ظاہر ہے وہی اسٹائل اور وہی ماحول
میں اپنی دوسری کتابوں میں پیدا کرنے سے تو رہا

سوال : جی ہاں یہ تو ہے مثلاً مشتاق احمد یوسفی صاحب کی کتابوں پر بھی لوگوں کے تبصرے اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ جناب
جو بات "چراغ تلے" میں ہے، وہ "زرگزشت" میں نہیں ہے۔ بحیثیت مصنف کے قارئین کے ان تبصروں پر آپ کا کیا رد

کرنل محمد خاں: میں تو یہ قاری پر چھوڑ دوں گا اور ضد نہیں کروں گا کہ نہیں میری دوسری کتاب زیادہ اچھی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا انہی کو زیب دیتا

سوال : ذاتی طور پر آپ کو اپنی کون سی کتاب زیادہ عزیز ہے؟

کرنل محمد خاں: (ٹھنڈی سانس لے کر) میرے خیال میں تو میری تینوں کتابیں اچھی ہیں۔

سوال : ماں کو اپنے سارے بچے عزیز ہوتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی بچہ سب سے پیارا ہوتا ہے؟

کرنل محمد خاں: کس بچے کو کہوں؟ میری رائے میں بیچ والی کتاب یعنی "بسلامت روی" میں فکر کا عنصر زیادہ ہے جبکہ پہلی کتاب میں
واقعات ہی واقعات ہیں۔ یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ "بسلامت روی" فکری سطح کے اعتبار سے بہتر ہے اور "بجنگ آمد"
بیان کے لحاظ سے "بسلامت روی" میں زبان کو بنا سنوار کر پیش کیا گیا ہے۔ ویسے آپ کوئی بھی مصنف لے لیں
کوئی بڑا مصنف مثلاً سعدیؒ انھوں نے ۱۹ کتابیں لکھی ہیں لیکن ہم صرف "گلستاں بوستاں" سے واقف ہیں۔ کہنے
مطلب یہ ہے کہ ایک مصنف سینکڑوں کتابیں لکھتا ہے لیکن ہم اُسے صرف ایک کتاب کے حوالے سے پہچانیں گے
کتاب اس کی شناخت ہوگی۔

سوال : تو آپ "بسلامت روی" کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ اس میں فکر یا انٹیلیکٹ کا پہلو بھی موجود ہے؟

کرنل محمد خاں: جی ہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس لحاظ سے بہتر ہے۔

سوال : آپ کا ادیب بننا ایک حادثہ ہے۔ آپ اچانک ادیب بنے ورنہ ہمارے ہاں کے ادیبوں کو تو زمانۂ طالب علمی ہی
ادیب بننے کا شوق لاحق ہو جاتا ہے اور وہ لکھتے لکھتے قلم کی نب گھس گھس کر بیس پچیس سال بعد جا کر کوئی ایسی کتا
لکھتے ہیں جسے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور وہ بحیثیت ادیب شہرت حاصل کرتے ہیں۔

کرنل محمد خاں: یہ بالکل ٹھیک ہے مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔ میں نے "بجنگ آمد" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہما
ایک دوست تھے "الہلال" کے ایڈیٹر، انہوں نے اتفاق سے ایک ملاقات میں مجھے لکھنے کے لیے کہا اور میں
انھیں جواب دیا کہ میں تو نہیں لکھ سکتا۔ ان کے اصرار پر میں نے "بجنگ آمد" کا پہلا باب لکھا۔ اسے پڑھ کر انھوں
پسندیدگی کا اظہار کیا اور زور دیا کہ "اور لکھو" لہٰذا میں لکھتا رہا۔ اس اثناء میں شفیق الرحمٰن صاحب کی نظر

تحریروں پر پڑگئی۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ یہ تو کتاب بن سکتی ہے اس لیے لکھتے رہو لہٰذا میں لکھتا رہا اور مصنف بن گیا۔

سوال : پڑھنے کا سلسلہ تو آپ کا شروع سے جاری رہا ہوگا؟

زل محمد خاں: پڑھنے کا شوق تو تھا نا! خاص طور پر کلاسیکل ادب بہت پڑھا ہے جو لکھتے میں میرا مددگار ثابت ہوا۔

سوال : اس سے پہلے کبھی آپ نے سوچا بھی نہیں کہ آپ میں ادیب بننے کی صلاحیت موجود ہے؟

زل محمد خاں: کبھی نہیں! میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔ وہ تو اتفاق سے میں نے لکھنا شروع کیا تو دوست احباب کو میری تحریریں بھا گئیں اور وہ کہنے لگے کہ "یار تم تو بہت اچھا لکھتے ہو" لہٰذا میں لکھتا چلا گیا۔

سوال : ہم نے پرانی کہانیوں میں ایسے واقعات پڑھے ہیں کہ حویلی کے تہہ خانے سے اچانک خزانہ برآمد ہوگیا اور حویلی کے مالکان راتوں رات سونے جواہرات میں کھیلنے لگے۔ آپ کو بھی ایسا ہی خزانہ یکایک ہاتھ لگ گیا جو آپ کے اندر موجود تھا اور آپ اس سے لاعلم تھے؟

زل محمد خاں: آپ چاہیں تو اسے خزانہ کہہ لیں لیکن بہرحال یہ سب کچھ ایسے ہی ہوا۔ سوائے اس کے کہ میں جو دوستوں کو خطوط لکھتا تھا تو وہ بے حد پسند کرتے تھے کہ بھئی تمہارا خط بڑا اچھا تھا۔ اسی بنا پر میرے ذہن میں کہیں یہ احساس موجود تھا کہ شاید میں کبھی لکھوں تو اچھا لکھ لوں گا لیکن ایک حد تک، اس سے زیادہ نہیں لیکن میری لکھی ہوئی تحریروں کو اتنا پسند کیا جائے گا یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

سوال : آپ نے مصنف بننے سے پہلے یقیناً اردو کے مزاح نگاروں کا بھی مطالعہ کیا ہوگا؟

زل محمد خاں: سب کا نہیں صرف ایک مزاح نگار کو میں نے بے تحاشہ پڑھا پطرس بخاری، جنھیں آج بھی میں اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ انھیں میں نے ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ اپنے کالج کے زمانہ میں پڑھا ان کی کتاب "پطرس کے مضامین" میرے ہاتھ لگی۔ جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے اور میں سوچنے لگا کہ کوئی ایسا فارمولا دریافت ہو کہ میں بھی ایسا ہی لکھنے لگوں۔ اسی زمانے میں، میں اپنے کالج کے رسالے میں لکھنے لگا لیکن ان کی تعداد صرف چند ایک مضامین تک محدود تھی میں نے لکھتے وقت پطرس کے اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے پطرس بننا میرے لیے ممکن تو نہیں تھا البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرا اپنا ایک اسلوب بن گیا جس نے بعد میں کتاب لکھتے وقت میری کافی مدد کی۔

سوال : کہا جاتا ہے کہ ہر ہنسی کے پیچھے کسی نہ کسی غم اور یاس کا سایہ ہوتا ہے اور ہر طنز میں ایک دانائی چھپی ہوتی ہے آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

زل محمد خاں: میں نے کتابوں میں اسی قسم کی باتیں پڑھی ہیں لیکن میں اس نظریے سے متفق نہیں ہوں۔ جن دنوں ہم بے حد خوش تھے ان دنوں بھی لکھتے رہے ہیں اور جب ہم پر کوئی آفت ٹوٹی ہے اس لمحہ بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن یہ کہنا کہ مزاح آنسوؤں کی پیداوار ہے۔ محض دانشوری ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

سوال : اچھا یہ کیا بات ہے کہ ہمارے جتنے بڑے مزاح نگار ہیں مثلاً مشتاق احمد یوسفی۔ ابن انشاء، شفیق الرحمٰن یا ابن صفی۔ ان کے بارے میں تاثر ایک غیر دلچسپ اور خشک مزاج آدمی کا ہے یعنی عام قارئین اُن کی تحریروں سے ان کے متعلق جو توقعات قائم کرتے ہیں وہ ان کے بالکل برعکس نکلتے ہیں؟

یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ میرے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ یہاں میرے پاس کئی اجنبی آجاتے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح اپنی تحریروں میں، میں انھیں ہنساتا ہوں تو باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا کہ جسے سنتے ہی ہنس ہنس کر اُن کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مزاح نگاری اور کامیڈین میں فرق ہے۔ کامیڈین کا پیشہ تو باتیں بنانا ہے، ان کی باتوں پر تو ہنسی آہی جاتی ہے لیکن مزاح نگار سے ایسی توقعات باندھنا بے سود ہے۔ دلچسپ اور مزاحیہ گفتگو کرنا ایک بالکل علاحدہ فن ہے۔ اس کا مزاح نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کئی ایسے ادیب جو مزاح نہیں لکھتے لیکن نہایت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ اب آپ اسے کیا کہیے گا۔

سوال: جی ہاں جیسے شفیق الرحمٰن صاحب ہیں، بے حد شگفتہ تحریر لکھتے ہیں لیکن ذاتی زندگی میں سنا ہے روکھے پھیکے واقع ہوئے ہیں۔

یوسفی: آپ شفیق الرحمٰن سے باتیں کریں آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کے منہ سے بات نکلتی ہی نہیں ہے۔ . . . شفیق الرحمٰن اور میں اور سارے مزاح نگار بھی دوستوں کے مخصوص حلقے میں چہک سکتے ہیں۔ ایک خاتون میرے گھر تشریف لائیں تھوڑی دیر بعد وہ سخت ناراض ہوئیں اور بولیں کہ صاحب ہم تو خدا جانے آپ سے کیا توقع لے کر آئے تھے۔ آپ تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں کیا کہوں؟ ظاہر ہے میں آپ سے مذاق تو نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ لوگ سنجیدہ رہنے کی شعوری کوشش تو یقیناً نہیں کرتے ہوں گے؟

یوسفی: جی ہاں شعوری کوشش سے ہم سنجیدہ نہیں ہوتے۔ بس یوں کہہ لیجیے کہ شکل ہی ایسی ہے (قہقہہ) پچھلے دنوں الزمقصود صاحب نے "سلور جوبلی" میں ہمیں مدعو کیا تو میں نے انھیں جواب دیا کہ بمبئی میں وہاں آ کر کیا کروں گا۔ وہاں منی بیگم گانا گاتی ہیں۔ معین اختر لطیفہ سناتے ہیں۔ زیبا، نور جہاں قسم کی چیزیں آتی ہیں۔ ہماری وہاں کہاں گنجائش ہے۔ بعض لوگ اسٹیج کے ہوتے ہیں۔ حاضر جواب اور مزے مزے کی باتیں کرنے والے ہم جو لکھنے والے ہیں۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ کتنی محنت سے ایک تحریر لکھتے ہیں۔ اس میں ردّوبدل کرتے ہیں، اسے دوبارہ لکھتے ہیں تب جا کر کچھ مزاح پیدا ہوتا ہے۔ میں نے سوائے ابن انشاء کے کسی کو قلم برداشتہ مزاح لکھتے ہوئے نہیں دیکھا وہ لکھتا تھا اور اسے دوبارہ پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اٹھا کر اخبار کو بھجوا دیتا تھا لیکن یوسفی، ہم یا شفیق الرحمٰن خصوصاً یوسفی ان کی کوئی سطر ایسی نہیں ہوتی جسے وہ دس بار کاٹتے اور پھر سے نہ لکھتے ہوں۔ ہم سب لکھنے پر بے حد محنت کرتے ہیں۔

سوال: ایک مضمون لکھنے پر آپ اندازاً کتنا وقت صرف کرتے ہیں؟

یوسفی: میں تو واقعات بیان کرتا چلوں۔ میرا انداز یہی ہے۔ قلم اٹھایا اور واقعات لکھنا شروع کر دیے۔ جب تک الفاظ تو پھوٹتی سے ساتھ دیتے ہیں۔ دل کہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، لکھتے رہو لیکن بعض دفعہ قلم اٹک جاتا ہے۔ اس کے سوال ہونے میں ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے، ایک ہفتہ بھی اور ایک مہینہ بھی۔ میں اپنی تحریر مکمل کرنے کے بعد اسے دوبارہ پڑھتا ہوں اور اس میں جہاں جہاں تبدیلیوں کی گنجائش پاتا ہوں ردّوبدل کرتا ہوں اور اس طرح جب مضمون مکمل حالت میں قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ قطعی اندازہ نہیں کر پاتا کہ اس میں لکھنے والے کا کتنا خون جلا ہے۔ وہ سوچتا ہے کتنی بے ساختہ تحریر ہے۔ یہ لکھنے والے کا کمال ہے کہ اس کی ساختہ تحریر بے ساختہ محسوس ہو

"بجنگ آمد کی خوبی اس کا بے ساختہ پن بتایا جاتا ہے لیکن یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس کی زبان کتنی بے ساختہ ہے"۔

سوال: آپ نے اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے اردو میں شگفتہ مزاحیہ ادب کی کثرت ہے یا ایسے ادب کی جسے ہم خالص طنزیہ کہہ سکتے ہیں؟

کرنل محمد خاں: میرے خیال میں طنز زیادہ ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کو شکایت زیادہ رہتی ہے۔ ظاہر ہے شکوہ شکایت کی زیادتی ہوگی تو تحریر میں طنز کا عنصر نمایاں ہوگا۔ میں مزاح لکھتا ہوں اور مزاح وہ لوگ لکھتے ہیں جنھیں کسی سے تکلیف نہیں پہنچی یا کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ آسودہ حال ادیب مزاح کی طرف مائل ہیں اور جنھیں زندگی کی تلخیوں کا سامنا ہوتا ہے وہ طنز کا ہتھیار اُٹھا لیتے ہیں؟

کرنل محمد خاں: میں یہ نہیں کہوں گا مثلاً یوسفی صاحب ہیں بے حد آسودہ حال ہیں لیکن ان کی تحریروں میں طنز نمایاں ہے۔ اصل میں اس میں زیادہ دخل افتادِ طبع کا ہوتا ہے۔

سوال: مگر یوسفی صاحب کو آسودہ حالی بڑی مشقتوں کے بعد نصیب ہوئی ہے۔ اُنہوں نے نہایت تلخ ایام گزارے ہیں۔ وہ تو ایک سیلف میڈ آدمی ہیں؟

کرنل محمد خاں: ہاں لیکن جب اُنہوں نے پہلی کتاب لکھی تھی۔ اس وقت وہ آسودہ حال اور بینک میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ بنیادی طور پر اس میں مزاج کا دخل ہوتا ہے۔ میرا مزاج طنز کا ہے ہی نہیں۔ میں کسی پہ طنز نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ طنز اور مزاح میں زیادہ بڑا درجہ کسے دیتے ہیں؟

کرنل محمد خاں: اگر طنز لطیف ہو تو یہ مزاح سے بڑی چیز ہے لیکن ایسا طنز کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ ابن انشاء جیسا طنز لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے ہاں بیشتر طنز نگار اس طرح کرتے ہیں جیسے کلہاڑا چلا رہے ہوں۔ اعلیٰ درجے کے طنز کے لیے مخصوص دماغی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے جو کم از کم میرے پاس ناپید ہے۔

سوال: مزاح کا مقصد صرف مزاح ہی ہوتا ہے جب کہ طنز کا مقصد مزاح کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے مثلاً معاشرے کی مختلف ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرنا، چوں کہ طنز ایک طرح کے سماجی مقصد سے وابستہ ہے اس لیے اس کی اہمیت مزاح سے بڑھ کر ہے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟

کرنل محمد خاں: طنز میں ایک زاید خوبی اصلاح کا پہلو ہے۔ مزاح کی اپنی ایک اہمیت ہے جو چیز کسی انسان کو خوش کرتی ہے، اس کی یہ خوبی کہ وہ کسی کو خوش کرتی ہے۔ یہ بجائے خود ایک بڑی قدر ہے۔ مقصد کیا ہے؟ کیا انسان کو مسرت بہم پہنچانا ایک مقصد نہیں ہے؟ آپ کسی کو میٹھا بول بولتے ہیں، کسی کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان سب کے پس منظر میں ایک مقصد کار فرما ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب کوئی خط آتا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی اور بے حد مسرور ہوا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے ایک خدمت انجام دی ہے۔

سوال: میں نے عموماً مزاح نگاروں میں ایک عادت شدت سے محسوس کی ہے کہ وہ سنجیدہ اور انٹلیکچول لوگوں کا بری طرح مذاق اڑاتے ہیں۔ انھیں خاصا ہدف کرتے ہیں۔ آخر سنجیدہ اور فکر مند اصحاب سے آپ لوگوں کی کیا لڑائی ہے

جو آپ ایسا کہتے ہیں ؟

کرنل محمد خاں: ایک لفظ ہے دانشور۔ ویسے مجھ کو دانشور کہا گیا ہے اور میں نے اپنے آپ کو بڑے غور سے دیکھا ہے لیکن مجھے تو اپنے آپ میں کہیں سے دانشوری نظر نہیں آئی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ کیا کوالٹی ہے جو آدمی کو دانشور بنا دیتی ہے۔ یہ بات میری آج تک سمجھ میں نہیں آسکی۔ بہت سے دانشوروں کو میں نے بولتے ہوئے بھی سنا ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ بول کیا رہے ہیں؟ ان کی دانشوری کا ایک عالم یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اور ہم سمجھتے نہیں۔ آپ نے کئی تنقید نگاروں کے مضامین پڑھے ہوں گے۔ پلّے ہی نہیں پڑتا کہ کیا لکھنا چاہ رہے ہیں۔ بہت کم نقاد ایسے ہیں جن کے خیالات سمجھ میں آجاتے ہیں بلاشبہ وہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن ان کی تحریریں فہم سے بالاتر ہوتی ہیں۔ بھلا یہ کیا دانشوری ہوئی ہاں لیکن جو واقعی نقاد ہیں ہم انھیں سلام کرتے ہیں۔

سوال: یعنی آپ دانش کے نہیں، دانشور کے خلاف ہیں ؟

کرنل محمد خاں: میں اصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ بہت کم اصلی دانشور ہیں۔ ہر شخص جو چار مضامین لکھ کر خود کو دانشور تصور کر لیتا ہے۔ ہم بحیثیت مزاح نگار ان کے خلاف ہیں اور انہی کو ہوٹ کرتے ہیں۔

سوال: غالباً آپ مزاح نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب لفظ دانشور مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکا ہے اور کسی کا مذاق اُڑانا مقصود ہو تو اسے دانشور کہہ دیا جاتا ہے ؟

کرنل محمد خاں: اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی دانشوروں کی تعداد کم ہے اور جعلی دانشور ان کی جگہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ عجیب و غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تناظر، تفاعل، کونیات اور پتہ نہیں کیا کیا۔ ان کی جعلی دانشوری یہیں تک محدود ہے۔

سوال: کوئی ایسی تحریر جو عام قاری تک اپنا ابلاغ نہیں کرتی، کیا آپ اسے ادب تصور کرتے ہیں ؟

کرنل محمد خاں: ہرگز نہیں، میں اسے ادب میں شامل سمجھنے کو قطعی طور پر تیار نہیں ہوں۔

سوال: کیا آپ اسے مزاحیہ ادب میں بھی جگہ نہیں دیں گے ؟

کرنل محمد خاں: جی نہیں (چونک کر) یہ آپ نے اچھا کہا (قہقہہ لگا کر) ہم اسے مزاحیہ ادب میں ضرور جگہ دیں گے۔

سوال: کرنل صاحب! ایک زمانہ تھا ہمارے ہاں افسانے کی صنف کو مقبولیت کا عروج حاصل تھا۔ اُن دنوں ہمارا مزاحیہ یا طنزیہ ادب اتنا پاپولر نہیں تھا لیکن اب گزشتہ دس پندرہ برسوں میں معاملہ اُلٹ گیا ہے۔ افسانے کی صنف تیزی سے غیر مقبول ہوئی ہے اور اس پر زوال آیا ہے جبکہ طنزیہ اور مزاحیہ ادب نے مقبولیت اور قارئین کی پسندیدگی کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آپ اس صورتِ حال کا کیا تجزیہ کرتے ہیں، کیا افسانے اچھے نہیں لکھے جا رہے ہیں یا زندگی میں سنجیدگی کم ہو چکی ہے۔ اصل میں قصّہ کیا ہے ؟

کرنل محمد خاں: میں نے افسانے بیحد کم پڑھے ہیں لیکن جتنے پڑھے ہیں۔ اس سے میرا اندازہ ہے کہ افسانے میں علامت کی آمد اور کہانی کی رخصتی نئے افسانے کے زوال کا بنیادی سبب ہے اور ایک چیز جب غیر مقبول ہوتی ہے تو اس کے مقابلے میں دوسری چیز خواہ وہ کم مقبول ہو لیکن اس کی اہمیت خود بڑھ جاتی ہے مثلاً مزاح۔ مزاح ہر دور میں مقبول

کیوں کہ آدمی ہنسنے کے لیے ترستا رہتا ہے۔

سوال: ایک وجہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ زندگی میں سنجیدگی، بوریت اور اس قدر بوجھل پن آگیا ہے کہ لوگ شگفتہ تحریروں کو ترجیح دینے لگے ہیں؟

زلں محمد خاں: جی ہاں! لیکن شگفتہ چیزیں تو ہر دور میں پسند کی گئی ہیں۔

سوال: ہمارے عہد کو طنز کا عہد کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے ادیبوں کو مقبولیت حاصل ہے جو طنزیہ تحریریں لکھتے ہیں خصوصاً اخبارات کے کالم نویس حضرات جو اپنے کالموں میں وہائٹ ہاؤس سے لیکر ماسکو تک کو لتے لیتے ہیں، بے حد ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خالص مزاح میں لوگ وہ لطف نہیں لے پاتے۔ آپ کے نزدیک طنز کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں؟

زلں محمد خاں: بات تو آپ کی معقول ہے (ہنس کر) لیکن یہ کسی بڑے عالم سے پوچھئے۔ میں آپ کو کیا بتا سکوں گا۔ ویسے واقعہ یہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے (سوچ کر) میرا خیال ہے آدمی میں آگاہی زیادہ آگئی ہے۔ اخبارات اور ٹیلیویژن سے تربیت پاکر ہر آدمی ہر معاملے میں اپنی ایک رائے رکھنے لگا ہے۔ خواہ وہ پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ، اس پسندیدگی یا ناپسند کو ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے اور جو جتنا کامیاب ایکسپلائٹیشن کرتا ہے، وہ اتنا ہی کامیاب طنز نگار تصور کیا جاتا ہے۔

سوال: آج تو آپ بھی دانشور ہو گئے؟

زلں محمد خاں: (قہقہہ)

سوال: آپ پر ایک الزام ہے کہ خواتین لکھاریوں کے لیے آپ کے دل میں، بے حد نرم گوشے پائے جاتے ہیں اور آپ نے بعض خواتین لکھاریوں کی تحریروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں حالاں کہ ان کی تحریریں اس پائے کی نہیں تھیں جتنی آپ نے تعریف کی؟

زلں محمد خاں: کوئی مثال دیجئے!

سوال: مثلاً نسیمہ بنت سراج۔

زلں محمد خاں: (قہقہہ لگا کر) ہاں اس میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے اور غلطی کی ایک خاص وجہ تھی۔ بہت سی کتابوں پر مجبوراً لکھنا پڑتا ہے۔ آپ جس کتاب کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ اور اس جیسی دیگر کتابوں پر میں نے جو تعریفی ریمارکس دیئے ہیں اس میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ مصنف یا مصنفہ کا شوہر میرے پاس آکر بیٹھ گئے ہیں اور کہا ہے کہ ہم اس وقت یہاں سے اٹھیں گے جب آپ کتاب پر لکھنے کا وعدہ کریں۔ میں انھیں ٹالنے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ دیتا ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ایسا کر کے گنہگار ہوا ہوں۔ آپ مجھ پر فرد جرم لگانا چاہتے ہیں؟ ضرور لگائیں۔

سوال: آپ کو اس کا افسوس ہے؟

زلں محمد خاں: افسوس تو ہے!

سوال: لیکن آپ کی تحریر پڑھ کر لگتا ہے کہ آپ نے بڑے خلوص سے لکھا ہے!

کرنل محمد خاں: جی ہاں! بڑے خلوص سے جھوٹ بولا ہے (قہقہہ) ہاں لیکن مجھے اس کا افسوس ہے کہ میری رائے پڑھ کر کسی نے کتاب خریدی اور اس کے پیسے ضائع ہوئے۔

سوال: پھر تو آپ کو اعلان کرا دینا چاہیے کہ جن لوگوں نے آپ کی رائے پڑھ کر کتاب خریدی ہے۔ آپ اس کا ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہیں؟

کرنل محمد خاں: بھئی ایسا نہ کریں۔ آپ کیوں میرا جھگڑا کرائیں گے۔

سوال: کسی مضمون کا خیال آپ کو کیسے سوجھتا ہے، کیا آپ یادداشت سے کردار ڈھونڈتے ہیں یا کوئی فوری واقعہ آپ کے لکھنے کا سبب بنتا ہے؟

کرنل محمد خاں: میں نے خیالیہ یا ایسے مضامین تو لکھے نہیں ہیں جیسے یوسفی صاحب لکھتے ہیں۔ میں واقعات لکھتا ہوں اور واقعات فرضی کم ہوتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ چھوٹا سا واقعہ ہے اور آپ نے اس میں رنگ آمیزی کر دی۔ میں نے فرضی واقعہ اب تک صرف ایک ہی لکھا ہے جو "اردو پنچ" میں چھپا ہے۔ اس میں میں نے ایک فرضی کردار تراشا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

سوال: آپ کی زندگی میں بیحد دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں؟

کرنل محمد خاں: دوسروں کی زندگی میں مجھ سے زیادہ دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کاش یہ واقعات میری زندگی میں پیش آئے ہوتے اور یہ کہ یہ لوگ انھیں لکھتے کیوں نہیں۔ اب تو میرے پاس لکھنے کے لیے واقعات ہی ختم ہو گئے ہیں۔ بعض افراد "بجنگ آمد" پر اعتراض کرتے ہیں کہ مجھے اتنے پرانے واقعات یاد کس طرح رہ گئے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ عام زندگی کی مثال سیدھے خط کی طرح ہے جس میں کبھی کبھار کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش آ جاتا ہے لیکن جنگ کے دنوں میں زندگی ابنارمل ہو جاتی ہے اور اس کی مثال سیدھی لکیر کے بجائے (ہاتھ کے اشارے سے) 〰〰〰 اس طرح کی لکیر سے دینا مناسب ہوگا کیوں کہ اس میں بڑے بڑے واقعات کا گراف اسی نوعیت کا بنتا ہے۔ انھیں آپ بھول نہیں سکتے لہٰذا "بجنگ آمد" میں اتنے واقعات جمع ہو گئے تھے کہ مجھے ان گنت واقعات کو حذف کرنا پڑا۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ آپ کی زندگی میں پیش آنے والے سارے واقعات آپ نے قلم بند کر دیئے تو آئندہ آپ کیا لکھیں گے

کرنل محمد خاں: خیر یہ تو کہنے کی بات ہے۔ واقعات تو پیش آتے رہیں گے۔

سوال: کیا آپ شیڈول بنا کر ایسے شب و روز گزاریں گے جس میں قابلِ ذکر واقعات پیش آنے کا امکان ہو، تاکہ آپ انھیں موضوع بنا سکیں؟

کرنل محمد خاں: (ہنس کر) جی نہیں! کوشش تو نہیں کی جاتی، ایسے واقعات خود بہ خود نکل آئیں تو ٹھیک ہے۔ میں ۔۔۔ نہیں لکھتا کیوں کہ اسے لکھنے کے لیے بہت قابلیت اور بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال: شفیق الرحمٰن صاحب کے دو تین کرداروں نے بیحد مقبولیت حاصل کی ہے مثلاً شیطان، روفی، مقصود گھوڑا وغیرہ۔ آپ شفیق الرحمٰن صاحب کے عزیز دوست ہیں۔ اس لیے آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کردار حقیقی ہیں؟

کرنل محمد خاں: جی ہاں! یہ حقیقی کردار ہیں اور یہ سب شفیق الرحمٰن کے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔ شیطان ایک ڈاکٹر صاحب ہیں روفی اور مقصود گھوڑا بھی حقیقی وجود رکھتے ہیں اور ان سب کو معلوم ہے کہ وہ شفیق الرحمٰن کے افسانوں کے کردار ہیں۔ میں شیطان سے ملا ہوں۔ ان لوگوں کی اب بھی محفلیں جمتی ہیں اور خوب گپ شپ ہوتی ہے۔ افسانوں میں "میں" کا کردار خود شفیق الرحمٰن کا ہے۔

سوال: آپ نے انگریزی کے مزاحیہ ادب کا مطالعہ کیا ہوگا۔ آپ کی رائے میں کیا اردو میں لکھا جانے والا طنزیہ و مزاحیہ ادب اس پائے کا ہے جسے ہم انگریزی ادب کے سامنے اعتماد سے پیش کر سکیں؟

کرنل محمد خاں: میں نے اردو کے جن بڑے ادیبوں کے نام لئے ہیں۔ ان کی بیشتر تصنیفات شاہکار ہیں اور ہم اسے نہایت فخر کے ساتھ انگریزی ادب کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں۔

سوال: نئے لکھنے والوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

کرنل محمد خاں: نئے لکھنے والوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اردو کے کلاسیکل ادب سے بالکل کورے ہیں۔ حالانکہ تحریر میں گہرائی کلاسیکل ادب سے واقفیت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں ہمارے استاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ہم لوگوں میں مطالعے کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھے امیر مینائی سے لیکر سارے کلاسیکی شعراء کا کلام پڑھایا۔ آج تو لوگوں کو امیر مینائی کا کلام یاد بھی نہ ہوگا لیکن مجھے ان کے اشعار اب تک یاد ہیں۔

سوال: کیا مزاحیہ ادب کا ترجمہ ممکن ہے؟

کرنل محمد خاں: مزاحیہ ادب کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر وہ ادب جس میں کلاسیکی حوالے موجود ہوں۔ تین آدمیوں نے "بجنگ آمد" کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک تو اشفاق نقوی، دوسرے این ایم حسن اور تیسری ایک خاتون۔ میرے ایک انگریز دوست تھے جنہیں اردو پر بھی عبور حاصل ہے۔ میں نے انہیں یہ تراجم دکھائے، انہوں نے پڑھ کر رائے دی کہ اردو میں تو مزاح موجود ہے لیکن انگریزی میں مزاح غائب ہو جاتا ہے انہوں نے ان تراجم کو انگلستان بھیجا۔ وہاں سے بھی ہو بہو ایسا ہی تبصرہ آیا۔ گویا خیالات تو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو جاتے ہیں، مزاح منتقل نہیں ہوپاتا اور ہو بھی کیسے آپ خسرو کا ایک شعر کوٹ کرتے ہیں۔ اس شعر کا ترجمہ کیسے ہو؟ دوسرا مسئلہ خود مترجم کا ہے، اگر ترجمہ کرنے والے کو انگریزی پر غیر معمولی عبور حاصل نہ ہو تو یہ کام اس کے بس کا نہیں ہوتا۔

سوال: یعنی مزاحیہ ادب کا ترجمہ اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا شاعری کا ترجمہ کرنا؟

کرنل محمد خاں: بالکل ٹھیک بات ہے۔

سوال: مغرب اور مشرق کے مزاج کی طرح ان کا تصورِ مزاح بھی مختلف ہے۔ جن باتوں پر ہمیں ہنسی آجاتی ہے ممکن ہے ایک مغربی آدمی کو نہ آئے؟

کرنل محمد خاں: یہ بھی کسی حد تک درست ہے لیکن اصل فرق محاوروں کا ہے۔ ہمارے محاوروں میں یکسانیت آجائے پھر تو مزاحیہ مضامین کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

سوال: "بجنگ آمد" کا ترجمہ شائع ہوگا؟

کرنل محمد خاں: جی نہیں میں نے وہ آئیڈیا ہی ڈراپ کر دیا ہے۔ لاہور سے ایک اور صاحب نے مجھے انگریزی میں خط لکھا کہ انھوں نے بجنگ آمد کا ترجمہ کیا ہے۔ اس خط میں انگریزی کی اتنی غلطیاں تھیں کہ مجھے ان کے ترجمے کے بارے میں اندازہ ہو گیا —!

سوال: ان صاحب کا ترجمہ آپ شائع کر دیں تو انگریزوں کو ہنسی تو بے پناہ آئے گی لیکن زبان کی غلطیوں پر؟

کرنل محمد خاں: (قہقہہ لگا کر) جی ہاں زبان کے غلط استعمال پر۔

سوال: مزاح نگاروں میں میں نے ایک بڑی زبردست خوبی دیکھی ہے وہ یہ کہ وہ ایک دوسرے کی بے تحاشا تعریفیں کرتے ہیں مثلاً آپ یوسفی صاحب کا گن گاتے ہیں۔ محمد خالد اختر، شفیق الرحمن کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ غرضیکہ آپ سب دوسروں کو خود سے اچھا اور بڑا لکھنے والا بتاتے ہیں۔ یہ فراخدلانہ رویّہ مجھے افسانہ نگاروں اور شاعروں میں بالکل نظر نہیں آیا۔ وہ عموماً معاصرانہ چشمک کا شکار رہتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی شاعر کو یہ کہتے نہیں سنا کہ فلاں شاعر مجھ سے اچھے شعر کہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

کرنل محمد خاں: آپ کا تاثر بالکل درست ہے لیکن اب میں اس بارے میں کیا کہوں!

سوال: ظاہر ہے اس میں آپ لوگوں کا کیا قصور؟

کرنل محمد خاں: جی ہاں! ہم لوگوں کا کیا قصور ہے لیکن ہم لوگ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایک دوسرے کی تعریفیں نہیں کرتے۔

سوال: یعنی انجمن ستائش باہمی کی صورتِ حال نہیں ہے؟

کرنل محمد خاں: قطعی نہیں، اور فراخدلی سے ایک دوسرے کی تعریف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مزاح لکھنے والے بہت تھوڑے ہیں شاعروں اور افسانہ نگاروں کی بہتات ہے اور ان میں مقابلہ بھی سخت ہے۔ اس لیے وہ خود کو دوسرے سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ مزاح نگاروں کی باہمی دوستی سے بھی بہت سے لوگ خوش نہیں ہیں اور وہ انھیں یہ کہہ کر لڑانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ فلاں، فلاں سے اچھا ہے۔

سوال: بہر حال آپ لوگ آپس میں لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

کرنل محمد خاں: ہرگز نہیں۔

سوال: کیا اس کی ایک وجہ یہ تو نہیں کہ ہمارے شعراء کرام کی اکثریت مختلف نوعیت کی جن محرومیوں سے دوچار ہے۔ وہ محرومیاں مزاح نگاروں کے حصے میں کم آئی ہیں یا بالکل نہیں آئیں؟

کرنل محمد خاں: جی ہاں! یہ وجہ بھی ممکن ہے۔ خوش قسمتی سے تقریباً سارے مزاح نگار آسودہ حال لوگ ہیں۔ انھیں عزت اور سماجی مرتبے کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس لیے انھیں "کون بڑا" اور "کون چھوٹا" جیسے مسائل پریشان نہیں کرتے۔ جب کہ شاعروں کو تسلیم کیے جانے کی بھوک ستاتی رہتی ہے!!

[کتاب "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" میں شریک ایک انٹرویو]

خرافات (مراسلے)

برادرِ عزیز، سلام مسنون۔

زندگی میں کئی دفعہ اچھی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے، مگر انتہائی خواہش کے باوجود میں ان تحریروں پر اپنا ردِ عمل مصنف یا ایڈیٹر کو ارسال نہیں کر پاتا۔ اس کی ایک وجہ میری کاہلی بھی ہے اور دوسری وجہ تھوڑی بہت مصروفیت! مگر "شگوفہ" کے اپریل ۸۵ء کے شمارے میں "شہر آشوب" (جہاں قدر چغتائی) اور "نہیں رنگ گر پھر رنگ گیا" (عابد معز) پڑھتے ہی یہ سطور لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ اول الذکر تحریر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سانحۂ بھوپال کو موضوع بنایا گیا ہے مگر کچھ اس طرح کہ غم کی لہریں کہیں نیچے رہ جاتی ہیں اور ان کی جگہ ایکتا اور بھائی چارے کے جذبات بہت موثر طریقے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ مضمون نہیں بلکہ اس میں محبت کی بات تخلیقی سطح پر کی گئی ہے، شاید اسی لیے اس میں تاثیر بہت زیادہ ہے۔ دوسرا مضمون ان پُرامن شہریوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے جو آپس میں پوری محبت سے رہنا چاہتے ہیں اور اس مضمون کی نمایاں خوبی بھی یہی ہے کہ مضمون نگار نے اپنے کرب کو مسکراہٹوں میں چھپا لیا ہے۔ اول الذکر مضمون گو مزاح کی ذیل میں نہیں آتا مگر شگفتہ نگاری اور مقصدیت کی بہت عمدہ مثال ہے جب کہ دوسرے مضمون میں بھی شگفتگی کی لہر ساتھ چلتی ہے اور اس کے متن میں سے محبت اور بھائی چارے کی خواہش ابھر کر سامنے آتی ہے۔ میری طرف سے جہاں قدر چغتائی صاحب اور عابد معز صاحب کو مبارک دیجئے۔ ان دونوں حضرات کو میں نے پہلی دفعہ پڑھا ہے اور آئندہ ان کی تحریروں کا انتظار رہے گا۔

آپ اور حیدرآباد کے دوسرے دوست بہت شدت سے یاد آتے ہیں، آپ کی محبتیں میرے لیے قابلِ فراموش نہیں ہیں۔ خدا کرے آپ سدا خوش رہیں۔ والسلام

مخلص

عطاء الحق قاسمی (لاہور)

مکرمی سلام مسنون۔

آج ایک پاکستانی اخبار میں "شگوفہ" انڈیا کے اجراء کی بابت معلوم ہوا۔ اور دلی خوشی حاصل ہوئی۔ پاکستان میں تو ادبی جرائد و رسائل کسمپرسی کا شکار ہو چکے ہیں۔ بڑا سے شائع ہونے والا "غالب" اور "ادبی دنیا" اور دیگر ادبی جرائد مر چکے ہیں۔ جو رسائل شائع ہو رہے ہیں وہ بھی گوناگوں مسائل کا شکار ہیں۔

ادبی رسائل و جرائد خاموش تخلیق ادب کے نمائندے اور خاموش سفیر ہوتے ہیں۔ بھارت سے "شگوفہ" کے اجراء کی خبر بہت خوش کن خبر ہے۔ اُمید ہے برصغیر کے ادبی و شعری حلقوں میں "شگوفہ" کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں شگوفہ کی کامیابی کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ پاکستان میں بھارت کے ادبی و شعری جرائد دستیاب نہیں ہو سکتے اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہاں کیسا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اور رفتارِ ادب کیا ہے۔ مجلسِ ادارت "شگوفہ" کو سلام و آداب

خلوص مند

سعید شیدائی

ممبر پاکستان رائیٹرز گلڈ۔ پنجاب

جناب ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

حیدرآباد دکن؛ بھارت کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور اس شہر کو یہ مقام حاصل ہے کہ یہاں ہر قسم کی ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور اردو ادب کو سنوارا اور نکھارا جاتا ہے ___ ڈاکٹر صاحب وقت کی پہچان بہت مشکل ہے اور جس شخص نے اس کی پہچان کی اور اس کا صحیح

استعمال کیا اِس نے اس دنیا میں سب کچھ حاصل کرلیا۔
اور آپ نے بھی وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مزاحیہ
ادب پر مشتمل ماہ نامہ "شگوفہ" شائع کردیا جو یقیناً مزاحیہ
ادب میں ایک احسن اقدام ہے۔

مزاح اداس اور غم زدہ دل کے کنول کو کھلا کر دلفریب
بنا دیتا ہے۔ جس سے جوان چہروں کے گلاب اور بھی
شگفتہ ہوجاتے ہیں مزاح روح کو تر و تازہ اور باغ و
بہار بنا دیتا ہے رنج و الم کی تپش دور کر کے دل کو
راحت پہنچاتا ہے۔ آپ کے مارچ کے شمارہ کا
مطالعہ کیا جس میں حال ہی میں حیدرآباد دکن میں منعقد
ہونے والی عالمی طنز و مزاح کانفرنس کی تفصیلی روداد
کے علاوہ بھارت کے معروف مزاح نگاروں کی تحریریں
شائع کی گئی ہیں۔

اس شمارے کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ
کم ہے اور میں تو یہی کہوں گا کہ "شگوفہ" روح کی زندہ
دلی کا نام ہے۔ اور اس سے زیادہ میرے پاس الفاظ
نہیں۔ میں خط لکھنے پر مجبور تھا۔ آپ کا ماہنامہ یہاں
پاکستان میں باقاعدگی سے نہیں ملتا آپ سے گزارش
ہے کہ آپ اس کے متعلق پوری معلومات فراہم کریں!
میں آپ کا مستقل قاری بننا چاہتا ہوں آپ
مجھے بتائیں کہ اس کا طریقہ کار کیا ہے۔

چودھری محمد شعیب گھمن، گوجرانوالہ
(پاکستان)

محترمی!

اللہ بھلا کرے جناب جنوں اشرفی کا جنھوں نے
مجھے ماہنامہ "شگوفہ" سے روشناس کروایا اور اس
کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔
حصہ نثر خوب اور بہت خوب ہے۔
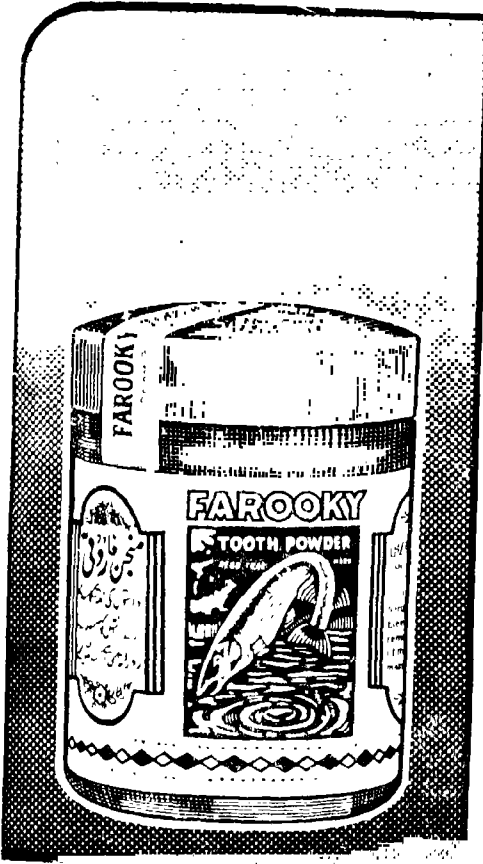
مولانا دِقّت صاحب کا یہ شعر بہت پسند آیا ؎

بھیگی بلی کی طرح بیٹھے ہیں بیوی کے قریب
شہر کے نامی پہلوان، خدا خیر کرے

مذکورہ شعر میں طنز و مزاح کے علاوہ بھرپور شعریت
ہے عالم تاجپوری صاحب کا یہ شعر خوب ہے ؎

زباں بندی، نشہ بندی و چکبندی کی نس بندی
اگر بندے کو بندی سے چھڑا دیتے تو اچھا تھا۔

یقیناً شعر میں فکر و فن ہے۔ شہزاد [illegible] اور رشید عارف
کی غزلیں پہلے صفحہ پر ہونی چاہیے تھیں۔

باز غ بہاری، کلکتہ۔

عید ملن

قارئین شگوفہ کی خدمت میں

عید مبارک

(ادارہ)

عید کا دن ہے
گلے آج تو مل لے ظالم

Vol. 18 Copy 6
SHUGOOFA-Hyderabad-1
Postal Regd. No. H/HD 6
June 1985 Phone : 557716

شگوفہ
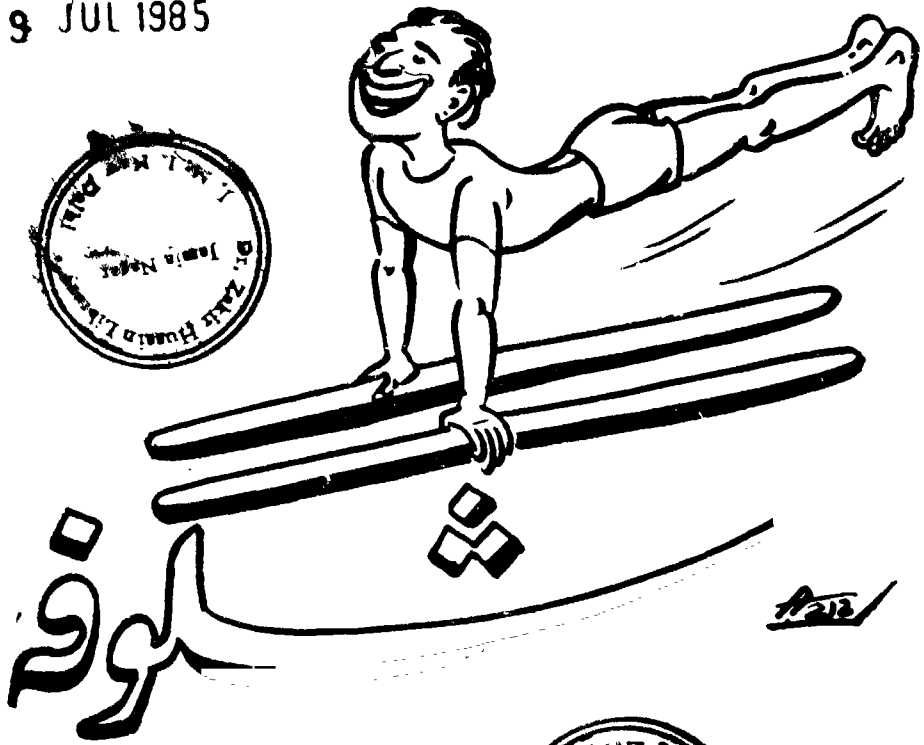
JULY 1985

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد (۱۸) شمارہ (۷) جولائی ۱۹۸۵ء
ایڈیٹر: ـــــــــ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

★

قیمت: ۳ روپے * زرِ سالانہ: ۳۰ روپے * بیرونِ ہند سے ۱۰۰ روپے
کتابت: محمد عبدالرؤف خوشنویس * طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ بیچلر کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

★

فون: آفس ۵۵۷۲۱۶، رہائش: ۵۲۱۰۶۴

اِس تھیلی کے چٹے بٹّے

فہرست

مالِ مفت (انشائیے)

وظیفہ یاب گھوس ؛ بھارت چند کھنہ ۷
فوارۂ نور ؛ محمد خورشید نادر ۱۹
داستان بیوی کی ؛ حیدر بیابانی ۲۵
ماڈرن لال بجھکڑ ؛ جہانگیر انس ۲۹
اور آمد بہاری ریڈیو پر ؛ مظفر الحسنین حیدری ۳۳
ضرورت ہے ؛ غافل انصاری ۳۷

مرا شہر لوگاں سوں ... (شہر حیدرآباد)

پاشو باہر سے آیا ؛ عابد معز ۱۳

حق تو یہ ہے ... (ترجمہ)

جب میں نے پہلی کتاب چھپوائی ؛ ڈاکٹر زماں آزردہ / منصور احمد منصور ۳۹

آدھا تیتر آدھا بٹیر

قصہ ایک سڑک لوٹنے کا ؛ فرحت قمر ۴۲

پیچ و خم کا پیچ و خم ... (مباحثہ)

موسم تیغ و تبر آیا ہے پھر ... ؛ وجاہت علی سندیلوی ۴۴

اڑیں گے پرزے ... (تعارف)

اسمٰعیل آذر ؛ پروفیسر کرامت علی کرامت ۵۲
تیکھے اشعار ؛ اسمٰعیل آذر ۵۱

قاضی جی دبلے ... (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومر او ولپکس کے لیے ؛ عطاء الحق قاسمی ۵۴

چوُرَن ۔ (منظومات)

پاگل عادل آبادی ۱۲ یوسف یکتا ۱۲ قمر الزماں ۱۸
صغیر احمد ۲۸ مصطفیٰ اجمل ۲۸ دلکش آتریدی ۳۲
کرپک بیتیادی ۳۲ جگموہن پرشاد ۳۶
مرزا اٹکل ۳۶

خرافات ۔ مراسلے ۔ ۵۸

کاغذ کی قیمت میں مسلسل اضافہ اور دیگر بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیشِ نظر
ماہِ اگست ۱۹۸۵ء سے ماہنامہ "شگوفہ" کی قیمت میں
حسبِ ذیل اضافہ کیا جارہا ہے — !

قیمت عام شمارہ ——— ۴ روپے
سالانہ خریداری ——— ۳۵ روپے
سالانہ خریداری بذریعہ وی پی ——— ۴۲ روپے
سالانہ خریداری عرب ممالک سے ——— ۱۲۵ روپے

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات سے تعاون کی درخواست ہے !

(ادارہ)

ماہنامہ شگوفہ کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مُدیر : ——— یوسف ناظم

★ ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں کی تخلیقات کے تراجم۔
★ ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ۔
★ اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :— ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم۔
★ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء۔ ★ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں کے منتخب مضامین اور خود نوشت سوانح۔
★ پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیا گیا ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا انٹرویو ★ مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی۔
★ تخلیق کاروں کی تصویریں اور دوسری کئی دلچسپیاں
★ خوبصورت دورنگی سرورق — سعادت علیخان
★ ضخامت : ——— ۳۸۶ صفحات
★ قیمت : ——— ۵۰ روپے

★ سالانہ خریداروں سے ۲۰ روپے ؛ ۵ روپے زائد بھجوانے پر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا !

بھارت چند کھنہ

وظیفہ یاب گھونس

۱۔ منجانب شعبہ وظیفہ ۔ صدر دفتر نئی دلی ۔
موسومہ: شعبہ یافت ۔ دفتر محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد

مقدمہ: وظیفہ شری نگنا ئیک نائیر

آپ کی یادداشت ملازم مندرجہ بالا کی ۱۵/ اپریل ۱۹۸۳ء کو وظیفہ پر سبکدوشی کے بارے میں وصول ہوئی ۔
ں بارے میں ملازم زیربحث کی "ملازمت" اور "یافت" کی امثلہ فوراً اس محکمہ کو بھجوا دی جائیں تاکہ اس کی گریجوٹی اور پنشن کا
ین کرکے رقوم مستحقہ کی ادائی کا انتظام کیا جاسکے ۔

سینیر عہدہ دار شعبہ وظیفہ

---

۲ منجانب سکشن آفیسر شعبہ یافت ۔ دفتر محاسب علاقائی سکندرآباد
موسومہ: سپرنٹنڈنٹ محکمہ ہذا

مقدمہ: شری رنگنا ئیک نائر وظیفہ یابی

آپ کی یہ شکایت کہ ملازم زیربحث کی ملازمت اور یافت کی امثلہ غائب ہوگئی ہیں، مجھے وصول ہوئی ۔ چونکہ ملازم
علقہ کی وظیفہ پر سبکدوشی پر ان کی مستحقہ الیصال شدنی رقومات کا فوری تعین تصفیہ طلب ہے اس لیے آپ کو ہدایت دی
اتی ہے کہ ملازم کی مثل اور متعلقہ کاغذات فوراً تلاش کرکے بھجوائے جائیں تاکہ وظیفہ کی کارروائی کی یکسوئی ہوسکے ۔

سکشن آفیسر

---

۳ منجانب سکشن آفیسر شعبہ یافت ۔ دفتر محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد
موسومہ: شعبہ وظیفہ ۔ صدر دفتر ۔ نئی دہلی ۔

مقدمہ: شری رنگنا ئیک نائیر وظیفہ یابی

بحوالہ جواب طلب مرقوم ہے کہ امثلہ متعلقہ کی تلاش جاری ہے ۔ اس سلسلہ میں جناب کی اطلاع کے لیے عرض
ہے کہ اس دفتر کے ایک مددگار کو تلاش مثل کے لیے متعین کیا گیا تھا ۔ محترمہ نے مطلع کیا کہ ریکارڈ آفس کے مشرقی پہلو میں بہت
ں امثلہ و دیگر داخل دفتر کردہ کاغذات کو ایک چوہا ہڑپ کرچکا ہے ۔
جب متذکرہ مددگار دفتر، متعلقہ مثل کی تلاش میں ریکارڈ آفس میں منہمک تھیں تو ایک گھونس ان کے جسم پر سے دوڑ تی

ہوئی نکل گئی۔ مددگار زیرِ بحث اس واقعہ سے اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ چیخ مار کر بھاگی تو اس کی نزدیک رکھی ہوئی کرسی سے ٹکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کے داہنے بازو کی ہڈی میں شگاف آگیا ہے۔ اسی ہنگامہ میں ہمارے سابق ڈائرکٹر صاحب کا مجسمہ بھی جس کو حال حال ہی میں لان میں سے ریکارڈ میں منتقل کیا گیا تھا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس سانحہ کے واقع ہونے کے باعث مندرجہ ذیل اخراجات کیے گئے:

(i) فوری امداد : چھ روپے

(ii) اسپتال کو منتقلی : (مددگار محکمہ کی — مجسمہ کی نہیں) ساڑھے چار روپے۔

(iii) ہڈی کی پلاسٹرنگ : چھ روپے

جملہ اخراجات : سولہ روپے اکاون پیسے۔

براہ کرم مندرجہ بالا اخراجات کی منظوری عطا فرمائی جائے۔

سیکشن آفیسر

مراسلہ ہذا کی کاپی محکمہ اسٹیبلشمنٹ کو مرسل و ترقیم ہے کہ مجسمہ شکستہ اور ثابت و سالم و دہشت ناک گھونس کو پکڑ کر ریکارڈ آفس سے نکالنے کا فوری انتظام کیا جائے۔

---

۴ منجانب شعبہ پنشن۔ صدر دفتر۔ دہلی
موسومہ شعبہ یافت۔ دفتر محاسب علاقائی۔ سکندرآباد

مقدمہ: وظیفہ نثری رنگنا ٹیک نائیر۔
دہشت ناک گھونس

آپ کی یادداشت مورخہ ——— سولہ روپے اکاون پیسوں کے اخراجات کی منظوری کے لیے وصول ہوئی جبکہ آپ کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ محکمہ ہذا کے بجٹ میں ایسے اخراجات کی پابجائی کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے تو ایسے اخراجات کرنے سے احتراز کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال اس بارے میں مزید غور کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل معلومات محکمہ کو فراہم کی جائیں:

(i) کونسے ریکارڈ، چوہا / چوہے / گھونس کھا گئے ہیں؟

(ii) اس مصیبت / خطرہ سے نجات پانے کے لیے کیا کارروائی کی گئی ہے۔

(iii) مددگار کو فوری امداد فراہم کرنے کے بعد اگر کسی ڈاکٹر کو بلالیا جاتا تو مددگار محکمہ کی اسپتال کو منتقلی پر کیے گئے اخراجات بچائے جاسکتے تھے۔ براہ کرم مطلع کیجیے کہ یہ خرچ کرنے سے گریز کیوں نہیں کیا گیا؟

(iv) مددگار محکمہ سے اس کے وجود اور اس پر کیے گئے اخراجات کی تصدیق اور اخراجات کی پابجائی کا مطالبہ بھجوایا جائے

(v) آپ نے یادداشتِ زیرِ جواب میں لکھا ہے کہ مددگار محکمہ کے جسم پر سے ایک چوہا گزر گیا جبکہ ریکارڈ چیٹ کرنے والی ایک گھونس بتلائی گئی ہے۔ تنقیح کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ آیا چوہا اور / یا گھونس

ہردو ایک ہی جان دار ہیں یا خدا کی دو مختلف تخلیقات ہیں ؟ (

(vii) اس بات کی وضاحت بھی مطلوب ہے کہ آیا شری رنگنا ٹیک نائر کی فائل اب آپ کے قبضہ میں آ چکی ہے ۔

(viii) بالآخر یہ بھی بتلایا جائے کہ جملہ اخراجات کو جو سولہ روپیے پچاس پیسے ہوتے ہیں کیوں بڑھا چڑھا کر بتلایا جا رہا ہے ؟ ایک معمولی سے حساب میں یہ فاش غلطی حیرت ناک ہے ۔

سینیر افسر

---

۵ { منجانب محکمہ اسٹابلش منٹ ۔ سکندرآباد
موسومہ یافت سکشن ۔ محکمہ محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد }

{ شری رنگنا ٹیک نائر
چوہے کا معاملہ

آپ کے دفتر کی یادداشت مورخہ اور صدر دفتر کی یادداشت کی کاپی مورخہ ـــــــــ موسومہ محکمہ زیر جواب وصول ہوئیں ۔ اسی ضمن میں آپ کی توجہ ہمارے قواعد کے قاعدہ (۸۷) (ل) (ii) کی جانب معطوف کرائی جاتی ہے ، جس کو براہ کرم گشتی کے ۔ نری (iii) مورخہ یکم ڈسمبر ۱۹۴۹ء کے ساتھ پڑھا جائے ۔ ان قواعد کی رو سے یہ امر روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ جگہ اور فرنیچر وغیرہ کی دیکھ بھال اور ان پر اقتدار اور اختیار محکمہ متعلقہ ہی کے تفویض ہے ۔ اس لیے یہ محکمہ متاسف ہے کہ وہ زیر بحث چوہے / گھونس / چوہوں کو پکڑنے سے قاصر ہے کیونکہ معاملہ بالکلیہ اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے ۔

ڈپٹی اسٹابلش منٹ آفیسر

---

۶ { منجانب شعبہ یافت ، محکمہ محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد
موسومہ : ڈپٹی اسٹابلش منٹ افسر علاقائی سکندرآباد }

مقدمہ
شری رنگنا ٹیک نائر ۔ معاملہ موشی

آپ کی یادداشت مورخہ ـــــــ وصول ہوی ۔ یہ تسلیم کرتے ہوے کہ جگہ اور فرنیچر کی دیکھ بھال قواعد متعلقہ کے تحت ہمارے ذمہ ہے لیکن چوہوں کی دیکھ بھال کا ذکر قواعد میں کہیں نہیں ہے ۔ اور اس لیے ان کا تعلق ہمارے محکمہ سے نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے ازراہ کرم زیر بحث چوہا / چوہے / گھونس کو دام میں لانے کا انتظام فوری کیا جائے ۔

سیکشن افسر

---

۷ { منجانب : صیغہ یافت ۔ محکمہ محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد
موسومہ : وظیفہ سیکشن ۔ صدر دفتر ۔ نئی دہلی }

مقدمہ
شری رنگنا ٹیک نائر ۔ وظیفہ یاب چوہا ۔

خوف کی لہر

براہ کرم ملاحظہ فرمایئے ۔ ملفوفہ ہمارے خط کی نقل جو ہمارے محکمہ اسٹابلش منٹ کو بھجوادی گئی تھی ۔ عرض خدمت ہے کہ ہمارے

محکمہ کا کوئی بھی ملازم ریکارڈ کے کمرہ میں داخل ہو کر ریکارڈ کے اشتہر یا خطرناک گھونس / چوہا / چوہے / چوہیوں کی تلاش کرنے پر راضی نہیں۔ اس لیے یعنی ان حالات میں ہم اس موقف میں نہیں ہیں کہ آپ کو مطلع کر سکیں کہ کون سے ریکارڈ غائب ہیں یا چوہیوں / گھونسوں نے صفا چٹ کر دیئے ہیں۔ ہمکو یہ بھی معلوم نہیں کہ شری رنگنا ٹیک نائر کی فائیل بھی ریکارڈ میں ہے یا نہیں۔ جیسے ہی محکمہ اسٹابلش منٹ چوہا / چوہے / گھونس / گھونسوں کو پکڑنے کی کارروائی مکمل کر دے گا، مزید ضروری کارروائی فوری کر دی جائے گی۔

آپ کے مراسلہ زیر جواب میں جو نکات اٹھائے گئے تھے اُن کو نوٹ کر لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ جن حالات سے ہمیں سابقہ پڑا اُن میں سواری کی فراہمی پر خرچ کرنے سے بہتر ہوتا کہ کسی ڈاکٹر کو بلوا لیا جاتا۔ چونکہ ڈاکٹر بلوانے پر بھی وہ یقیناً فیس طلب کرتا ـــــــ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی فیس کیا ہوتی اور آیا ایسا کرنے سے اخراجات بڑھ جاتے یا اُن میں کفایت ہوتی۔ بہر حال اس صراحت کی روشنی میں درخواست ہے کہ اخراجات کی منظوری بطور خاص عنایت فرمائی جائے۔

ذریعہ ہذا جناب کے ملاحظہ کیلئے مددگار دفتر کے وجود کی موجودگی کا صداقت نامہ مرسل خدمت ہے۔ مددگار زیر بحث نے ساٹھ دن کی رخصت بیماری (کہنی کا فریکچر) کی درخواست (پوری یافت پر) پیش کی ہے۔ براہِ کرم اس کی جگہ کوئی متبادل ملازم عنایت فرمایا جائے۔

ایک اور استفسار کہ ریکارڈ کی عمارت میں خوف اور دہشت پیدا کرنے والا چوہا ہے یا گھونس، افسوس ہے کہ اس کا سو فیصد صحیح جواب اس نوبت پر دینا ممکن نہیں۔ البتہ مددگار دفتر کے بری طرح سے زخمی ہونے سے یہ اندازہ لگانا کہ خوف پیدا کرنے والی شے گھونس ہی ہوگی نامناسب نہ ہوگا۔

حساب میں ایک پیسے کی زیادتی کا اندراج یقیناً افسوس ناک ہے، مگر کیا کیا جائے کہ اس محکمہ میں خوف، وحشت اور دہشت کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے کہ ہر شخص سراسیمگی کا شکار ہو چکا ہے۔ بہر حال میں غلطی کے لیے شرمندہ ہوں۔ کیا بتاؤں حالات ہی کچھ عجیب ہیں۔

سیکشن افسر

۸

منجانب محکمہ اسٹابلش منٹ۔ ریجنل آفس۔ سکندرآباد
موسومہ۔ یافت سیکشن۔ محکمہ محاسب علاقائی۔ سکندرآباد

مقدمہ: شری رنگنا ٹیک نیر۔ وظیفہ یابی چوہا

آپ کی یادداشت مورخہ ـــــ وصول ہوئی۔ مجھ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہے کہ اس محکمہ نے بطور خاص یہ فیصلہ کیا ہے کہ چوہوں اور گھونسوں سے پیدا ہونے والے خطرات اور دہشت ناکیوں کی روک تھام اور انسداد کی خاطر یہ محکمہ ضروری کارروائی کرے۔ چنانچہ ہم اس کام کی تکمیل کے لیے دو یا تین ٹنڈر طلب کر رہے ہیں۔ اس کارروائی کی یکسوئی یقیناً کئی

جائے گی۔

ڈپٹی اسٹابلش منٹ افسر

---

۹ { منجانب صیغہ یافت ۔ محکمہ محاسب علاقائی ۔ سکندرآباد
موسومہ: صیغہ وظیفہ ۔ صدر دفتر ۔ نئی دلی }

مقدمہ: شری رنگنائیک نائر ۔ وظیفہ یابی ۔۔ دہشت گھونساں

آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کل متذکرہ بالا سابق ملازم میرے دفتر میں مجھ سے ملا اور وظیفہ پر سبکدوش ہونے پر وظیفہ اور دیگر رقومات کی اجرائی میں غیر معمولی تاخیر اور تعویق کے خلاف بہت شکوہ و شکایت کی ۔ جب اس کو اس کے وظیفے کی کارروائی کے بارے میں خط و کتابت بتلائی، تو وہ فوراً دفتر سے چلا گیا اور بہت جلد اپنے ساتھ دو مددگار اور معاون لے کر واپس آیا ۔ دفتر سے سیدھا ریکارڈ کی عمارت میں گیا ۔ وہاں گھونس کو پکڑ کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ۔ پھر اپنی ملازمت او ریافت کی فائل نکال کر لے آیا اور مجھے دے دی ۔ یہ مثل ذریعہ ہذا مرسلِ خدمت ہے ۔ اس ضمن میں اس بات کی دریافت بھی ہو چکی ہے کہ جن امثلہ کو گھونس نے نقصان پہنچایا ہے ۔ اس کا تعلق ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء عرصے سے ہے، جن کو بہت پہلے ہی ریکارڈ آفس سے نکال کر تلف کر دینا چاہیے تھا! اس کارروائی میں سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ شری نائر نے صرف ۴۵ منٹ میں نہ صرف اپنی فائیل تلاش کر لی بلکہ ریکارڈ میں گھونسوں کو ختم کر دیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ گھونسوں نے جن ریکارڈز کو کھایا تھا وہ سرے سے تلف کیے جانے کے قابل تھے!

اس ضمن میں شری رنگنا ئنگ نائر کو سخت اعتراض ہے کہ مراسلت میں ان کا ذکر بطور وظیفہ یاب گھونس کیا جا رہا ہے ۔ اس اعتراض کو براہ کرم نوٹ فرمالیجیے ۔

سیکشن آفیسر

---

۱۰ { منجانب شعبہ وظیفہ صدر دفتر نئی دہلی
موسومہ صیغہ یافت علاقائی ۔ محکمہ محاسب ۔ سکندرآباد }

مقدمہ: { شری رنگنا ئیک نیر ۔۔ گھونس کی وظیفہ یابی ۔ دہشت

اگرچہ ہمیں اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ جس مثل کی ہمیں تلاش تھی وہ بالآخر حاصل کر لی گئی ہے مگر یہ ہرگز ہرگز مناسب نہیں تھا کہ کسی سابق ملازم کو ریکارڈ کی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ شری نائر نے جن دو مددگاروں کو مثل کی تلاش اور گھونس کو لاش بنا دینے کے لیے حاصل کیا تھا، ان کے لیے اخراجات کا کوئی بار برداشت نہ کیا جائے ۔ ہم نے یہ بھی نوٹ کر لیا ہے کہ آئندہ سے موصوف کو وظیفہ یاب گھونس نہیں کہا جائے گا ۔

باقی رہا ان کے وظیفہ کی اجرائی اور ۔ یگر مستحقہ رقومات کی ادائی ۔۔۔ تو ان کا تصفیہ جیسے ہی ان کی یافت کی مثل، جو بدقسمتی سے عارضی طور پر پھر کھو گئی ہے، مل جاتی ہے، کر دیا جائے گا ۔

سینیئر عہدہ دار

پاگل عادل آبادی

غزل

ناکامیوں کے گھونٹ حلق سے اُتار کے
وہ جا رہا ہے کوئی الیکشن میں ہار کے
پہنائے پھول چمچوں نے سولہ سنگھار کے
تھے اِن میں نقد تین تو تیرہ اُدھار کے
تھا گھر کا لکھ پتی وہ مگر روزِ انتخاب
لٹکائے جھولی پھرتا تھا دامن پسار کے
چمچے تھے اس کے گرد کہ تھیں گویا یہ مکھیاں
جاتا تھا صدقے ہر کوئی اُمیدوار کے
چمچوں کے ہاتھ گھی میں تو سر تھے کڑھائی میں
دروازے کھل گئے تھے کئی روزگار کے
اُترا نہ پھر بھی قرض الیکشن کے قرض کا
جورو نے اپنے دیدیئے زیور اتار کے
اب راتوں رات ہائے یہ کیا ہو گیا غضب
حلیے بگڑ گئے ہیں ہر اک تیس مار کے
منہ دیکھتے ہی رہ گیا ہے حزبِ اختلاف
میداں کسی نے مار لیا ہاتھ مار کے
کاشی کا اس نے سُنتے ہیں پاگل لیا ٹکٹ
پھر کیا کرے غریب ضمانت بھی ہار کے

"میں کہاں اب غزل کے شیدائی"

یوسف یکتا
حیدرآباد

آپ بھی آ کے دیکھ ہی لیجئے
کیا نہیں ہے غریب خانے میں
سب میں گھس پٹ کے ہم نے دیکھ لیا
کوئی اپنا نہیں زمانے میں
فیسٹول لون لیکے ماموں میاں
گھس گئے پھر شراب خانے میں
مار کھا لیجئے حسینوں کے
رنگ آ جائیگا فسانے میں
ہیں کہاں اب غزل کے شیدائی
فائدہ کیا ہے پھر سنانے میں
ہم نے یکتا وہ دور دیکھا ہے
پھول جھڑتے تھے مسکرانے میں

"اب تو بچنا محال ہے...."

صبح دم وہ برس پڑے مجھ پہ
اب طبیعت بحال ہے پیارے
لب کشائی کی کیا ضرورت ہے
میری صورت سوال ہے پیارے
ناچتے گاتے بن گئے سی ایم
واقعی یہ کمال ہے پیارے
ہاتھ میں ان کے آ گیا بیلن
اب تو بچنا محال ہے پیارے
دیکھ ہی لیں گے آج سیکنڈ شو
آپ کا کیا خیال ہے پیارے
ساٹھ بھی پار کر گیا یکتا
اب تو گاڑی اولال ہے پیارے

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

پاشو باہر سے آیا

انسان روزگار کی تلاش میں دربدر بھٹکتا ہے۔ دُور دراز مقامات کا سفر کرتا ہے۔ مصیبتیں اٹھاتا ہے اور خطرات سے کھیلتا ہے۔ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں جا بستا ہے۔ بھلا ہو سائنسی ترقی کا جس نے کئی مسئلے حل کر دیئے۔ ہزارہا میلوں کے فاصلے کو گھنٹوں میں طے کر دیا۔ سات سمندر پار رشتہ داروں سے گھر بیٹھے بات کر لیجیے۔ ضرورت اور سہولت کے زیر اثر حیدرآبادی شہری روزگار کی تلاش میں جہاں بھی سینگ سمائے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں حیدرآبادی شہری شیروانی پہن کر آپ کی تواضع بریانی سے کرتے ہوئے ملیں گے۔ حیدرآبادی شہریوں کے غول کے غول مشرق وسطیٰ کوچ کر گئے۔ ادنیٰ مزدور سے لیکر دانش ور اور سخن ور تک نے مشرق وسطیٰ کا رخ کیا۔ اب آپ سے کیا بتلائیں ہمارے شہر سے اتنے فن داں اور کاریگر باہر گئے کہ انہیں کے شہر میں ان کا کال پڑا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک بڑھئی کی ضرورت در پیش تھی۔ بہت تلاش کی لیکن کوئی بڑھئی ہاتھ نہ آیا تب ہمارے ایک بزرگ نے ہمیں پر خلوص مشورہ دیا "میاں دُوبئی چلے جاؤ وہاں تمہیں کئی حیدرآبادی بڑھئی مل جائیں گے۔"

باہر کی ہوا کھا کر آنے والا حیدرآبادی شہری آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ دور ہی سے وہ اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر آپ کی ناک سینٹ کی تیز خوشبو سونگھنے لگے تو یقین کر لیجیے کہ باہر سے آنے والا شہری کہیں آس پاس ہی ہے۔ اپنے شہر میں ہم سینٹ کی خوشبو کو "اپنائیت کی بو" قرار دیتے ہیں۔ دُور سے سینٹ کی خوشبو سے اپنی آمد کا پتہ دینے کے علاوہ باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری کا منفرد حلیہ ہوتا ہے جو چیخ چیخ کر اعلان کرتا ہے، "میں باہر سے آیا ہوں" سفاری سوٹ جو موٹے جسم پر منڈھا جاتا ہے۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے جس میں سے سونے کی زنجیر جھانکتی رہتی ہے۔ کلائی پر ڈھیلی ڈھالی جھولتی ہوئی گھڑی، انگلیوں میں انگوٹھیاں، ایک ہاتھ میں باہر کی سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر دوسرے ہاتھ میں سینٹ میں تربتر دستی اور پیروں میں اونچی ایڑی کی چپل یا جوتا ــــــ اس حلیہ میں کوئی آپ کو نظر آئے تو ایمان لے آیئے کہ یہ شخص یقیناً باہر سے آیا ہے۔

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری کا استقبال دھوم دھام سے کیا جاتا ہے۔ دوست احباب اور

رشتہ دار جمع ہوتے ہیں۔ ایرپورٹ جاتے ہیں۔ بینڈ باجے کا انتظام ہوتا ہے۔ آنے والے شہری سے گلے ملتے ہیں۔ لیکن لیکن نظریں بیگیج کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ خیریت دریافت کرنا چھوڑ کر سوالات کرتے ہیں۔ "جی! میرے لیے سونے کا بسکٹ لائے ہو نا؟"۔ "بیٹا میرے لیے بلڈ پریشر کا پیٹہ لائے ہو؟" "بھیا! میرا میک اَپ کا سامان" "بھائی جان میری 'سیکو گھڑی'" "ڈیڈی بولتی گڑیا کہاں ہے" "انکل! اسکوٹر بک کرنے کے لیے ڈرافٹ اس بار تو نہیں بھولے" "یار میرا ویزا"۔ آنے والا حیدرآبادی شہری ان سوالوں کے جواب دیتا ہے اور جب اسے سانس لینے کی فرصت ملتی ہے تو وہ اپنے لوگوں کی خیریت دریافت کرنے لگتا ہے۔ "ماموں کا انتقال کیوں کر ہوا" "ابو آپ دوائیں پابندی سے کھا رہے ہیں یا نہیں" "دادی ماں آپ کے لیے زیتون کا تیل بھجوایا تھا۔ اور اب بادام لایا ہوں، ہریرہ بنا کر استعمال کیجیے" "اچھا منی کا یہ جو چھالڑ کا ہے"۔ "بڑی بی ابھی اقید؟ ہیں"۔ اور یہ سوال کرنا کوئی حیدرآبادی شہری بھولتا ہی نہیں کہ "شہر کے حالات کیسے ہیں؟"

باہر کے آب ودانہ میں معلوم نہیں کیا تاثیر ہے۔ جو شہری باہر جانے سے پہلے سوکھے ساکھے تھے واپس تر و تازہ بن کر آتے ہیں جو موٹے تھے وہ مزید پھول جاتے ہیں۔ ایسے کہ جسم جگہ جگہ سے پھول کر غبارہ ہو جاتا ہے۔ رنگ نکھر جاتا ہے۔ چہرہ پُرکشش ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے حیدرآباد میں خزاں تھی اور باہر بہار آئی ہوئی ہے ہیئت بدل جانے کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک باہر رہنے کی وجہ سے پہچان مشکل ہوتی ہے۔ گھر واپس آنے کے بعد رشتہ داری کی تجدید کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات دلچسپ واقعات بھی ہوتے ہیں۔ ایک کمسن لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتلایا "پرانے ڈیڈی میرے لیے کار لائے تھے اور اب نئے ڈیڈی اڑنے والا جہاز لائے ہیں۔"

باہر سے آنے والوں کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ ہم وطنوں کے لیے کچھ نہ کچھ تبرک لائیں۔ رشتہ دار سامان کھلنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ بیگیج کے اطراف گھر والے بیٹھ جاتے ہیں اور باہر سے آنے والا شہری اپنے سامان میں سے ایک ایک چیز نکال کر تقسیم کرنے لگتا ہے۔ "تمہارے لیے ٹو اِن وَن" "آپ کے لیے شیروانی کا کپڑا" "بیٹی آپ کے لیے بات کرنے والی گڑیا" یہ منظر ہمیں اسکول میں دکھائے جانے والے "میجک شو" کی یاد دلاتا ہے۔ جادوگر اپنے تھیلے میں سے مطلوبہ اشیاء نکال کر بچوں کو دیتا ہے اور بچے تالیاں بجاتے ہیں۔ باہر سے آنے والا جادوگر عام طور پر سینٹ اور سگریٹ اندر والوں کے لیے تحفتاً پیش کرتا ہے۔ باہر سے کم از کم سینٹ اور سگریٹ نہ لانا بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں "باہر سے اپنوں کے لیے سینٹ اور سگریٹ بھی نہ لاسکے تو باہر گئے ہی کیوں؟ یہیں رہتے اچھا تھا"۔ خلوص سینٹ اور سگریٹ سے آگے بڑھتا ہے تو ملبوسات، دستی گھڑی، کیمرہ، ٹو اِن وَن سے نوازا جاتا ہے۔ اکثر بھائیوں کو اپنی بہنوں کے لیے باہر سے جہیز لانا اور دولہا بھائی کو باہر لے جانا پڑتا ہے۔ لیکن جناب بعض نوجوان ایسے بھی ہیں جو باہر سے ہمارے شہری کمسن لڑکیوں کے لیے عرب کا بُڈھا تحفہ میں لے آتے ہیں ــــ باہر سے لائے ہوئے ایک حیدرآبادی نوجوان نے ایک بڈھے کھوسٹ عرب کا ہم سے تعارف کروایا۔ "آپ میرے آجر ہیں۔ حیدرآباد کا نمکین حسن انہیں یہاں کھینچ لایا ہے۔"

اب آپ سے کیا بتلائیں صاحب باہر سے لائے ہوئے اس بوڑھے جوان کو کئی حضرات فرزندی میں لینے کے لیے دوڑ پڑے۔

باہر جا کر آنے والے شہریوں کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے ٹھہر ٹھہر کر سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔ دنیا دیکھنے کے بعد ان پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خاموشی بہتر ہے اکثر سوالات کے جوابات میں صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ دھونس جمانے کے لیے چند عربی اور انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عربی دانی کیف حالک" مبروک اور شکراً" پر مشتمل ہوتی ہے۔ انگریزی میں قابلیت "سوری" اور "پلیز" تک محدود رہتی ہے۔ عربی دانی مبروک اور شکراً سے بڑھ کر "حبیبی" پر ختم ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی باہر سے آئے ہوئے صاحب کی مڈبھیڑ ایک ٹھیٹھ حیدرآبادی سے ہوئی تو انھوں نے کہا "اوے حیدرآبادی عرب! ہمیں شکراً اور مبروک سے آگے بھی عربی آتی ہے۔ لاحول اور آیت الکرسی پڑھواں گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔

باہر جا کر آنے والے شہری عربی سیکھ لیتے ہیں یا نہیں، لیکن ان کی اردو بہتر ضرور ہو جاتی ہے۔ اردو شعر سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اردو کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھتے ہیں۔ ہمارے شہر سے اردو اخبار منگوا کر خلیجی ممالک میں پڑھتے ہیں اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ غزلوں کے کیسٹ خرید کر سر دھنتے ہیں۔ ایک صاحب نے ہم سے کہا بے چارے کریں بھی کیا۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجرّد زندگی گذار رہے ہیں۔ ایسے میں اردو شاعری ہی ان کا واحد سہارا ہے۔ جو عشق و عاشقی کے افسانوں سے بھری پڑی ہے۔

ان کی باتوں سے ہمیں وصل و فراق کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اردو بہتر ہونے کے علاوہ بعض اصحاب خلیجی ممالک پہنچ کر شاعر اور افسانہ نگار بھی بن جاتے ہیں جن کی تخلیقات یہاں اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں۔

باہر رہنے والے شہری اپنے ہم وطن فن کاروں کی دیار غیر میں ہمت افزائی کرتے ہیں۔ مقامی فن کاروں کو باہر بلا کر نوازتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں جلسے کرتے ہیں گلپوشی کی جاتی ہے۔ اور ان کے فن کی تشہیر کی جاتی ہے اور اپنے وطن میں وہ ان ہی فن کاروں سے کترا کر نکل جاتے ہیں باہر سے واپس ہوتے وقت حیدرآبادی شہری اپنے ساتھ ڈھیر سارے کیسٹ اور اسٹریوفونک اور ہمہ قسم کے باجے لاتے ہیں۔ گھر میں دن تمام باجہ بجتا رہتا ہے۔ قوالیاں، عربی، فلمی گانے ڈرامے، مشاعرے، مزاحیہ پروگرام وغیرہ وغیرہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر آپ کو کسی گھر سے شہنشاہ غزل مہدی حسن کی غزلیں سنائی دیں تو یقین کیجئے اس گھر کا کوئی نہ کوئی فرد باہر ہے۔

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہریوں سے دوست احباب مخصوص قسم کے سوالات کرتے ہیں " ہم وطنوں کو آج تک بھی اتنے لوگوں کے باہر کوچ کرنے کے باوجود تشفی بخش جوابات نہ مل سکے کہتے ہیں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی نہیں پوچھنا چاہیے۔ باہر سے آنے والے شہریوں سے ان کی آمدنی پوچھی جا سکتی ہے انھیں آمدنی بتلانے پر کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن خدارا ان سے پیشہ اور کام کی نوعیت کے بارے میں دریافت مت کیجیے۔ شاید ہی صحیح جواب ملے۔ باہر جانے والے حیدرآبادی شہری کوئی بھی کام کو عیب نہیں سمجھتے۔ سنتے ہیں وہاں انجینیر معمار کا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کمپونڈر بن جاتے ہیں۔ میٹرک کامیاب لوگ وہاں انجینیر بنے بیٹھے ہیں۔ یہاں باہر سے آنے والے ایک صاحب نے ہم سے کہا "وہ یہاں کام کرنے سے کتراتا تھا گھر بیٹھے نوکروں پر حکم چلاتا تھا۔ محنت کرنا خلاف شان سمجھتا تھا۔ لیکن وہاں شیخ کے اشاروں پر ناچتا ہے۔

ہمارے شہر میں ہر دم آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مہنگائی کے لیے باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہریوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ گوشت ترکاری کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے لے کر منہ مانگے گھوڑے جوڑے کی رقم تک کے لیے باہر کا پیسہ ذمہ دار ہے۔ زمین اور مکانوں کے دام تو نہ پوچھیے مت ہمارے ایک ساتھی کا خیال ہے کہ وطن میں ایمان داری سے رہتے ہوئے کوئی مکان تو کجا آخری آرام گاہ کے لیے دو گز زمین کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ ہم ایک گزیٹڈ آفیسر سے واقف ہیں جو وظیفہ کے قریب بھی کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن انہیں کی سرکاری کار کا ڈرائیور باہر جا کر صاحب جائیداد بن گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے آج ہر حیدرآبادی شہری باہر جانے کا خواہشمند ہے۔ باہر سے حیدرآبادی شہری گھر لوٹتے ہی اس کے اطراف باہر جانے کے خواہشمند نوجوان بھنبھنانے لگتے ہیں۔ اس کی دلجوئی اور خدمت کرتے ہیں بڑے بوڑھے لوگ اپنے بچوں کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ "بیٹا اسے کہیں ملازمت دلوا دو۔ تمہارا احسان ہوگا یہاں پر تو یہ کسی قابل نہیں ہے۔ گھر پر پڑا روٹیاں توڑتا ہے۔ باہر جائے گا تو چار پیسے کما کر لائے گا بہنوں کی شادیاں کرے گا۔ باہر والے صاحب ہر کسی سے فوٹو کاپیاں، "کوشش کروں گا" کی طمانیت کے ساتھ وصول کرتے ہیں۔ فوٹو کاپیاں موصوف کے جانے کے بعد ردّی کی نذر ہو جاتی ہیں۔

خلیجی ممالک میں ملازمت کرنے والے حیدرآبادی شہریوں اور ان کے اہل و عیال کی طرز زندگی میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ پرانے گھر کی جگہ نیا گھر بنتا ہے۔ آرام و آسائش کی چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ بیمار ماں باپ ڈاکٹر سے کہتے ہیں "ڈاکٹر صاحب آپ باہر کی دوائیں لکھیے ہمارا بچہ باہر ہے وہ بھجوائے گا"۔ بچوں کو شہرت یافتہ انگلش میڈیم اسکول میں منہ مانگی رقم بہ شکل چندہ دے کر داخل کیا جاتا ہے۔ اسکول جانے آنے کے لیے سواری مقرر ہوتی ہے آیا ساتھ جاتی ہے۔ گھر پر ٹیوشن رکھے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بچہ کی قابلیت ممی، ڈیڈی، گڈ مارننگ اور ٹاٹا سے آگے نہیں بڑھ پاتی!

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری دوسرے سامان کے ساتھ بچوں کیلئے ہمہ اقسام کے الکٹرانک کھلونے لاتے ہیں۔ ریموٹ کنٹرول، کھلونا کہیں ہے اور صاحب کھلونا کہیں بیٹھا اسے کنٹرول کر رہا ہے۔ کھلونوں کو دیکھ کر بچوں سے زیادہ بڑے خوش ہوتے ہیں۔ دل للچاتا ہے اور ان کھلونوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔ ہم نے ایک گھر میں دیکھا، ماں باپ کھلونوں کی موٹر گاڑی ریس میں محو تھے جبکہ بچے اصلی ٹیپ ریکارڈر اور کیمرہ سے کھیلنے سے زیادہ ان کی تربیت بنا رہے تھے۔

باہر مقیم حیدرآبادی شہری سال یا دو سال میں ایک مرتبہ پندرہ دن یا مہینہ بھر اپنے وطن میں قیام کرنے آتے

ہیں۔ یہاں پر انھیں ڈھیر سارے کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ ساتھ لائے ہوئے خطوط اور پیامات کو پہنچانا، ساتھیوں کا خیریت کی اطلاع دینا، رشتہ داروں سے ملاقات کرنا، ان کی دعوتیں قبول کرنا، اپنا پیٹ خراب کرلینا، جائیداد خریدنا، اپنی یا بھائی بہن کی شادی کرنا یا خود اپنی طرف سے دوست احباب کی شاندار دعوت کرنا۔ غیر مقیم حیدرآبادیوں کی وجہ سے ہی ہمارے شہر کی دعوتوں کا معیار اتنا بلند ہوا ہے کہ ہم جیسے شہری صرف دعوتوں میں شریک ہوسکتے ہیں۔ لیکن کسی دعوت کا اہتمام نہیں کرسکتے۔ باہر سے آنے والے شہریوں کو اس تھوڑے سے وقفہ میں پھر واپس جانے کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ساتھیوں کے گھروں سے خطوط، اچار اور کباب کے ڈبے جمع کرنا پڑتا ہے۔ گھر والوں کے مسئلے حل کرنا، باہر جانے کے خواہشمند نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا پڑتا ہے۔ دوست احباب کی فرمائشوں کی فہرست بھی ساتھ رکھنا اہم کام ہوتا ہے۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد باہر سے آنے والے شہری کے واپس جانے کا دن آجاتا ہے۔ پھر ایکبار تمام دوست احباب جمع ہوجاتے ہیں۔ پھول پہنائے جاتے ہیں ایکدوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سہی کے مصداق کوئی گھڑی اتار لیتا ہے ——— تو کوئی انگوٹھیاں چھین لیتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے صرف ایک، دو جوڑے اور اچار اور کباب سے پُر ایر بیگ کے ساتھ مگر مچھ کے آنسو آنکھوں سے بہاتے وداع کیا جاتا ہے۔ واپسی کے دوسرے دن سے ڈرافٹ، کیسٹ، لیٹر اور خود موصوف کے واپس آنے کا انتظار شروع ہوجاتا ہے ——— غرض مایا جال کا یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

قمرالنساں قمر (رانچی)

اُردو لکچرر (آپ بیتی)

سر پہ جھبرا بال، ٹیڈی سوٹ ٹائی زیب تن ۔۔۔ آپ اردو لکچرر ہیں زندہ دل شیریں سخن
آپ کو ہے اس لیے محبوب یہ انگلش لباس ۔۔۔ تاکہ کم سے کم رہے ماحولِ مغرب آس پاس
آپ ہیں اردو زباں کے ایک باعظمت نشاں ۔۔۔ درجنوں رکھتے ہیں اپنے آگے پیچھے ڈگریاں
آپ سے استاد پر اردو زباں کو ناز ہے ۔۔۔ بے وفا عاشق سہی پر حیثیت ممتاز ہے
ہو گئے تھے فیل یہ جب دوسرے میدان میں ۔۔۔ ان کو چمکایا اسی اردو نے ہندوستان میں
خدمتِ اردو کو رکھتے ہیں مگر بالائے طاق ۔۔۔ ذیل کے اس شعر سے بالکل ہے ان کو اتفاق

"سرخرو ہوتا ہے انساں پیر سہلانے کے بعد
شوخ ہوتی ہے حنا ہاتھوں میں لگ جانے کے بعد

آیئے حضرت کا اب کچھ جائزہ لیتے چلیں ۔۔۔ داد ان کے کارناموں کی ذرا دیتے چلیں
گرچہ کالج اور لڑکوں پہ سراپا بار ہیں ۔۔۔ کچھ بھی ہو اردو زباں کے بس یہی حقدار ہیں
ایک ہفتہ میں پڑھاتے ہیں فقط دو ایک بار ۔۔۔ پھر بھی اردو کے ہی خواہوں میں ہے ان کا شمار
فلسفہ ان کے ادب کا ہے برائے زندگی ۔۔۔ زندگی بھی وقف ہے ان کی برائے بندگی
ہے ڈرائنگ روم کہ جنت نشاں کہئے جسے ۔۔۔ فرش، پردہ، چاندنی ہے کہکشاں کہئے جسے
بحث لا حاصل جہاں ہوتی ہے بے فکر دلوں کے ساتھ ۔۔۔ تاش کے بھی چلتے رہتے ہیں جہاں دو چار ہاتھ
گاہ ہوتا ہے سیاست پر بھی اظہار خیال ۔۔۔ گاہ زیر بحث آتی ہے ادب کی چال ڈھال
رو ڈپیمائش میں کوئی آپ کا ثانی نہیں ۔۔۔ کیوں کہ گھر کی آپ کے ذمہ نگہبانی نہیں
گھر سے اپنے بیشتر رہتے ہیں یہ دن کو تھری ۔۔۔ ہاں بچوں کے لیے میدان ہے بالکل فری
کوئی بچہ ہے کسی کتے کے پیچھے شام سے ۔۔۔ کوئی پتے گن رہا ہے تاش کے آرام سے
آپ لیکن شہر کی سڑکوں پہ ہیں محوِ خرام ۔۔۔ ہر قدم پر اپنے شاگردوں کا لیتے ہیں سلام
قہقہوں سے آپ کے ساری کتابوں کی دکاں ۔۔۔ بن گئی ہے اے قمر لاریب کشتِ زعفراں

آپ کا اردو زباں سے بس ہے اتنا تال میل
لے لیے ملنے کالج سے اور چلتی ہے جیون کی ریل

PAY

محمد خورشید نادر (کامٹی)

فوارۂ نور

ہماری اقامت گاہ شہر کے جنوب میں ایک قصبہ میں واقع ہے۔ جگر مرادآبادی مرحوم کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ کا محلِ وقوع اور حجم شہر کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا ہندوستان کے جنوب میں سیلون۔ کچھ عرصہ قبل تک یہ بلدۂ ویراں بے آب و گیاہ تھا، اور ویرانی کا یہ عالم تھا کہ دن میں الو بولتے تھے، مگر اب شادابی، آبادی اور بیماریاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ نشتر و مرہم کی دوکانیں ساتھ ساتھ لگی ہیں اور عطائیوں کے مطب کے مقابل کفن فروشوں نے مورچے سنبھال لیے ہیں۔ کچھ قدیم یادگاروں کو آسیائے روزگار نے پیس ڈالا، کچھ کی قلبِ ماہیت ہو گئی، مگر آثارِ قدیمہ کی دو یادگاریں اب بھی بدستور باقی ہیں۔ ایک برگد کا بہت پرانا درخت معہ ریش و بروت، دوسرے باقیات الصالحات میں ایک سالخوردہ حکیم حاذق جن کی ذاتِ بابرکات اس وادیٔ ظلمات میں فوارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

سابقون الاولون کے زمرہ میں شمار ہونے والے یہی حکیم صاحب اس وقت ہماری توجہ کا مرکز و محور ہیں۔ اگلے وقتوں کے یہ بزرگِ جہاندیدہ بڑی دلچسپ اور گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ موصوف جن اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ عجیبہ کے جامع ہیں، ان تمام کا ذکر تو ریگِ صحرا شمار کرنے کے مترادف ہوگا لہٰذا ان کی بعض چیدہ چیدہ اور نمایاں خصوصیات کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ آپ بھی ان سے غائبانہ متعارف ہو سکیں۔

حکیم صاحب کی ایک منفرد اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفرد ادویات سے پیچیدہ امراض کے معالجہ میں طولیٰ رکھتے ہیں، اور اس بارۂ خاص میں یگانۂ روزگار ہیں۔ یہ ان کا اصولِ اساسی ہے کہ وہ کسی بھی مرض کے لیے ایک وقت میں صرف ایک مفرد دوا سے علاج کرتے ہیں۔ مرکب دوائیں تیار کرنا ان کی خاندانی روایات کے یکسر منافی ہے۔ دواؤں کی باہمی آمیزش ان کے نزدیک بمنزلہ شرک ہے۔ ایک دوا میں دوسری دوا شامل کی جائے تو وہ اسے شرکِ خفی سے تعبیر کرتے ہیں، تیسری دوا ملائی جائے تو شرکِ جلی اور کثیر الاجزاء ہوئی تو یہ فعل ان کے نزدیک کفرِ صریح کا درجہ رکھتا ہے۔

اس دانائے راز کا منطقی استدلال یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے اور وہ وحدت اور یک رنگی

تو پسند فرماتا ہے۔ اس نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے ہر دوا کو علیحدہ ایک مکمل یونٹ کی شکل میں پیدا فرما کر اس میں شفا رکھی ہے۔ ایسی صورت میں انسان ضعیف البنیان کے دخل در معقولات کا کیا جواز ہے؟ اور اس ناقص العقل کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اکائی کو دہائی میں تبدیل کرے۔

حکیم صاحب بظاہر کم گو اور کم آمیز واقع ہوئے ہیں اور غیر ضروری گفتگو سے ہمیشہ محترز رہتے ہیں مگر جب ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز کے درمیان ہوں تو پھر انداز عمل افشانی گفتار و بدنی ہوتا ہے۔ بعض کم سواد ان کے اس طرزِ عمل کو کبر و نخوت پر محمول کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قفلِ ابجد کی طرح بند رہتے ہیں، کوئی حرف شناس مل جائے تو فوراً کھل جاتے ہیں۔

وہ ڈاکٹروں کی طرح مریضوں سے ان کے امراض کی تفصیل اور ذرائع آمدنی دریافت نہیں کرتے۔ مرض کی تشخیص خود کرتے اور اپنی صوابدید کے مطابق دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ مشینی رپورٹوں پر تکیہ کر کے مریض کی باقیات کا صبر نہیں سمیٹتے۔ شہر کے تمام حکیم، عطائی اور نو آموز معالج ان سے بغض و عناد رکھنے کے باوجود ان کی تشخیص اور مسیحا نفسی کے قائل ہیں اور اپنے خاندان کے ان افراد کو جن کی زندگی انہیں واقعی عزیز ہوتی ہے، حکیم صاحب ہی کے پاس بغرضِ علاج بھیجتے ہیں، بقیہ کا علاج وہ خود کرتے ہیں۔ سول سرجن تو ان کا بندۂ بے دام اور مریدِ خاص ہے۔ فرطِ عقیدت سے ان کے گرد لٹو کی طرح گھومتا ہے۔ کیوں کہ جملہ امراضِ خبیثہ جو اسے عہدِ نابالغی سے لاحق تھے، حکیم صاحب ہی کی توجہ و عنایت سے رفع ہوئے۔

موصوف انتہائی شفیق و مہربان ہیں اور اس سے زیادہ سادہ لوح۔ مزید یہ کہ عصری رجحانات اور جدید پیشہ ورانہ تیکنک سے قطعی بے خبر۔ حکیم ہونے کے باوجود نہ عطاروں سے کوئی خفیہ ساز باز ہے نہ غسال و گورکن سے کوئی کمیشن طے ہے۔ ایک دفعہ غسال، گورکن اور کفن فروش پر مشتمل ایک سہ رکنی وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تعاونِ باہمی کی تجویز پیش کی۔ حکیم صاحب نے اس تجویز کو سنتے ہی بڑی ناگواری سے مسترد کر دیا۔ اور پھر بڑے گمبھیر لہجہ میں کہا،

"حضرات! تشریف آوری کا شکریہ۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد، لیکن تکلف برطرف! میں درویشانہ خیالات کا آدمی ہوں حریصِ سیم و زر نہیں، اور نہ مادی آسائشوں کی فراہمی اور لذت کوشی میرا شعارِ حیات ہے۔ میں دنیا بقدرِ ضرورت کا قائل ہوں۔ قوتِ لایموت کے لیے ایک پارۂ نان اور آبِ سرد کافی ہے، اور سر چھپانے کے لیے یہ کلبۂ احزاں موجود ہے۔ اس سے زیادہ کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ خواہش۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میرے پاس آپ کی دعا سے اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ کرم ہے اس ربِّ دو جہاں کا جس نے زن، زمین، زر تینوں عطا کیا اور کرم بالائے کرم یہ کہ ان کے اثراتِ بد سے محفوظ و مامون بھی رکھا۔ میرا خاندانی پیشہ فیض رسانی اور خدمتِ خلق ہے نہ کہ جلبِ منفعت۔ مزید برآں میں ہر لحظہ خوفِ آخرت اور پرسشِ اعمال کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہوں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میں ان مزخرفات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

وفد کے سب سے برگزیدہ اور ہوشمند رکن کفن فروش نے یہ جوابِ صاف سنا تو قدرے ترشروئی سے کہا، "لیکن، قبلہ! آپ کی حذاقت اور طبابت نے تو ہماری معیشت کا بیڑہ غرق کر دیا ہے، اور ہم نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے ہیں۔ بال بچوں کا ساتھ ہے، اگر لب گور مریض بھی جانبر ہوتے رہے تو ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔"

حکیم صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا،

"میرے عزیز! آپ کی خام خیالی ہے کہ یہ بندۂ عاجز اس معاملہ میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہے۔ موت و حیات میرے قبضۂ قدرت

ملا ہیں۔ میں تو محض ایک کمزور وسیلہ ہوں، شفاء و نفع سب شافئ مطلق کے ہاتھ ہے؟

کفن فروش کو اگرچہ اس "جوابِ ناصواب" سے مایوسی ہوئی تاہم اس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"حضور! آپ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے، یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا اور آپ ہیں کہ ابھی تک پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔ اس دور میں آپ ایک صدی قبل کے خیالات رکھتے ہیں، اور اپنی اس ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر محوِ عبادت ہیں۔ بخدا! اس دور میں آپ قطعی! اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ خدارا! بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیجئے، اپنے آؤٹ آف ڈیٹ خاندانی موقف پر نظرِ ثانی کیجئے، وقت کے ساتھ چلئے، جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر تعاونِ باہمی کے زریں اصولوں پر عمل کیجئے ورنہ وقت کا تیز دھارا آپ کو خس و خاشاک کی طرح ساحل پر پھینک دے گا۔"

حکیم صاحب نے ان دلائل کو بڑے تحمل سے سنا اور اپنے لہجہ کی متانت کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"برخوردار! ہم ایسے افراد کو تبدیلی کی ترغیب و تحریص فعلِ عبث ہے۔ تپتے ہوئے صحراؤں میں نخلستان کا وجود ضروری ہے۔ اگر ہم ایسے افراد درمیان سے اٹھ گئے تو تمہارا معاشرہ استحصال اور خود غرضی کی آگ سے جھلس کر رہ جائے گا۔ ہم جن اقدار کہن کے امین ہیں، وہ ازلی و ابدی ہیں اور فلاحِ دارین کی ضامن اور پہلے سے زیادہ آج معاشرہ میں ان کی ضرورت ہے۔ اگر تم ہمیں رستہ کا پتھر سمجھتے ہو تو یہ تمہاری کوتاہ بینی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ ہم سنگِ راہ نہیں، چراغِ راہ ہیں . . . . ."

گورکن جاہلِ مطلق تھا۔ وہ حکیم صاحب کے افکارِ عالیہ اور ان کے تصورِ حیات کے باریک نکات کو کیا سمجھتا۔ اس نے ان کی وضعداری، توکل و استغناء اور فقرِ غیور کو ان کے غرورِ بے جا پر محمول کیا۔ یوں بھی وہ اہالیانِ شہر کی سخت جانی سے سخت نالاں تھا۔ حکیم صاحب کے انکارِ مسلسل سے مشتعل ہو کر "ہتھے" سے اکھڑ گیا اور بے نقطہ و دشنام طرازی شروع کر دی۔ مگر حکیم صاحب بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے، نہ مشتعل ہوئے نہ برہم۔ ان مرصّع مغلظات کو دشنام مے فروش سمجھ کر پی گئے اور کوہِ وقار کی صورت بیٹھے رہے۔ سخن کوتاہ! مباحثہ تا دیر جاری رہا مگر حکیم صاحب اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے۔ فریقین میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور وفد بے نیل و مرام واپس ہوا۔

انھیں اس علاقہ کی معمر ترین شخصیت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے خدا جانے کب سے جی رہے ہیں، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا انھیں اسی عالم میں دیکھا ہے۔ ان کے حواسِ خمسہ آج بھی پوری طرح بیدار ہیں۔ ان کے ایک مقرب نے ان پیرِ صد سالہ سے ان کی طول العمری کا راز دریافت کیا تو ایک دل آویز تبسم کے بعد فرمایا:

"برخوردار! ہم وٹامنز اس وقت سے استعمال کر رہے ہیں، جب وہ دریافت نہ ہوئے تھے۔ خدا جانے لاعلمی اور جہالت کے طفیل کون کون سے صحت بخش وٹامنز حلق سے اتر کر جزوِ بدن ہو گئے۔ تم ان وٹامنز کے استعمال تک محدود ہو جو سائنسدانوں نے اتفاقاً دریافت کر لیے ہیں۔ بقیہ کا نہ انہیں علم ہے اور نہ تمہیں ان کے استعمال کی توفیق۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی ہدایات پر عمل کیا اور ہر وہ چیز فرد کر گئے جو انہوں نے اپنی نگرانی میں ہمیں کھلا دیں، خواہ برضا و رغبت یا بجبر و اکراہ۔ اور ان افعال شنیعہ اور اشغالِ قبیحہ سے باز رہے جن سے انہوں نے روک دیا۔ یہ سب فرمانبرداری اور سعادت مندی کا ثمرہ ہے۔

برخوردار! سب معاملات میں تو نہیں مگر بعض خاص معاملات میں تقلیدِ شیوۂ بزرگاں سود مند ثابت ہوتی ہے۔ تم نہ مانو گے

مگر یہ حقیقت ہے کہ غیر متوازن تعلیم سے انسان کی ترقی محدود ہو جاتی ہے۔ اور وہ صرف معلوم و مشہور چیزوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ بقیہ کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر ترک کر دیتا ہے، کیوں کہ وہ عقل و سائنس کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں لیکن تمہیں اس تلخ حقیقت کا علم نہیں کہ عقلِ انسانی محدود ہے وہ ہر شئے کی حقیقت کا صحیح ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ اس لیے کبھی کبھی عقل و خرد اور ڈگری و ڈپلومہ کو بالائے طاق رکھ کر تقلید کورانہ بھی کر لیا کیجیئے۔ ہمارے اسلاف لکیر کے فقیر ضرور تھے مگر اتنے احمق بھی نہیں تھے جتنا کہ آج کے عقلمند انہیں سمجھتے ہیں۔"

حکیم صاحب معاشی معاملات میں بھی مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔ ایک دن حسبِ معمول اپنے مقربین کے حلقہ میں بیٹھے علم و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے۔ اثنائے گفتگو ایک ہم جلیس نے پوچھا،

"آپ نے طبابت کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ کیوں نہ اختیار کیا؟"

جواب میں فرمایا "اولاً اس لیے کہ یہ میرا آبائی پیشہ ہے، ثانیاً یہ کہ معزز بھی ہے اور منفعت بخش بھی، ثالثاً شخصی آزادی اور عزت نفس برقرار رہتی ہے۔ رابعاً میری افتادِ طبع سے مناسبت رکھتا ہے اور حتماً یہ کہ دوسرا متبادل پسندِ خاطر نہ ہوا۔ اس دورِ پُر فتن میں شرفاء کے لیے پیشہ کا انتخاب ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ ایسے پیشے کم ہیں جو منفعت بخش بھی ہوں اور عزت سادات بھی معرضِ خطر میں نہ پڑے۔ میرے نزدیک پاسِ نفس اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ شکم پروری۔ لیکن محض شکم پری کے لیے خود فروشی اور اغیار کی تن خوانی و کفش برداری میرے مسلک میں حرام ہے۔ بلاشبہ دورِ حاضر کے مقبولِ عام پیشوں میں چند پیشے ایسے ہیں جن سے معیارِ حیات دفعتاً بلند ہو جاتا ہے، دولت بڑھ جاتی ہے مگر وقعت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً پیری مریدی کی باقاعدہ دوکانداری اور پیشہ ورانہ سیاسی لیڈری۔ لیکن آپ اسے میری ضعیف الاعتقادی تصور فرمائیے یا قدامت پسندی کہ میری طبعِ حزیں ان پیشوں سے ابا کرتی ہے کیوں کہ میں روزِ جزا کا صدقِ دل سے قائل ہوں۔ ہاں! جن افراد میں یہ ضعف دسقم نہ ہو ان کے لیے یہ پیشے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ دورِ جدید میں فحش نگاری یا فحش تخلیقات پر مقدمے لکھنا بھی خاصہ منفعت بخش کاروبار ہے۔ اس ضمن میں تو اہلیہ بے حد لچکدار ہیں اور ناشرین بھی غالباً خدا کو منہ دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے . . . "

پھر کچھ دیر تک اپنی ریشِ دراز میں انگلیوں سے خلال کرنے کے بعد فرمایا،

". . . اور اگر ذرا ہٹ کر دوکان لگانا مقصود ہو تو پھر اور بھی پیشے ہیں مگر یہ سب استحصالی نوعیت کے ہیں مثلاً اسکول کالج میں بچے پڑھانا اور اپنے چند بچوں کی پرورش کی خاطر قوم کے نونہالوں کے مستقبل سے کھیلنا اور ان کے والدین کا صبر سمیٹنا۔ ادبی رسالہ کے اجراء کا اعلان کر کے زرِ سالانہ پیشگی وصول کر لینا اور چند شماروں کی اشاعت کے بعد اسے یک لخت بند کر دینا وغیرہ۔ رہ گئی ملازمت اور کاروبار تو ہم ایسے آزاد رو اور پراگندہ طبع لوگ ان کی بندشوں کے کب متحمل ہو سکتے ہیں..."

ان کے ایک یارِ غار نے ہمیں رازدارانہ طور پر کہا کہ اگر موقعہ ملے تو حکیم صاحب سے اردو ادب اور تنقید کے متعلق ان کے خیالات ضرور معلوم کریں۔ ہم کچھ تو قرابت اور کچھ قربِ مکانی کے باعث ان کی خدمت میں گستاخ و بے باک تھے ایک دن موقعہ ملا تو ان سے تفریحاً پوچھ بیٹھے۔

"آپ کو کچھ ادبیات سے بھی دلچسپی ہے؟"

سوال سُن کر کچھ دیر ہماری صورت تکتے رہے۔ غالباً متانت یا شیطنت کا عنصر تلاش کر رہے تھے ہمیں اپنے چہرہ پر حماقت آمیز معصومیت طاری کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ قدرت نے صورت کچھ ایسی معصوم اور بھولی بھالی بنائی ہے انتہائی مشاق قیافہ شناس بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ سُسرال والے تو اب تک اپنا سر پیٹ رہے ہیں۔ اور درجنوں قرض خواہ جو اب تک ہماری جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں۔ جب انھیں ہمارے خلوصِ نیت کا یقین ہوگیا تو بکمال لطف و شفقت سے فرمایا "میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن کاملینِ وقت کی آنکھیں دیکھی ہیں، اکابرینِ فن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، ان کی صحبتیں اٹھائی ہیں اور یہ انہیں برگزیدہ ہستیوں کا فیضِ تربیت ہے کہ میں آج چار آدمیوں کے درمیان اُٹھنے بیٹھنے کے لائق ہوں۔ لیکن مجھے اس تلخ نوائی میں معاف رکھنا کیوں کہ اردو ادب کا نام سُنتے ہی دردِ دل سوا ہو جاتا ہے۔ میرا دل تو پکے ہوئے پھوڑے کی طرح پہلے ہی دُکھ رہا تھا تم نے ادب کا ذکر چھیڑ کر اسے اور ٹھیس پہنچا دی۔ مگر چوں کہ آئینِ جوانمردی حق گوئی و بے باکی ہے اور روباہی میری سرشت میں داخل نہیں اس لیے مجھے یہ کہتے ہیں باک و تامل نہیں کہ موجودہ ادب کے مطالعہ سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو روح کو تڑپا دے، قلب کو گرما دے اور اعمالِ صالحہ کی طرف راغب کرے۔ نہ شعور کی پختگی کا سامان ہے نہ روح کی بالیدگی کا، نہ اخلاق کی آراستگی کا اہتمام ہے نہ کردار کی تعمیر و تشکیل کا التزام حتیٰ کہ نیک و بد اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوتی جو علم و ادب کی غایتِ اولیٰ ہے۔ ادب محض نظریاتی پروپیگنڈہ کا وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اساتذہ کے دواوین ادھ کچے دانشوروں کی مشقِ ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ بعض تحقیقات و تجزیات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا بھینس کے انڈے سے روغن گل کشید کیا جا رہا ہے۔ میر و غالب کے اشعار کی بعض تشریحات تو ایسی دھماکہ خیز ہیں کہ اگر ان مرحومین کے مزارات کے سرہانے کھڑے ہو کر با آوازِ بلند پڑھ دی جائیں تو ان کے مزارات شق ہو جائیں گے۔ بعض دانشوروں نے نقد و احتساب کی آڑ میں اپنے خبثِ باطنی کو کاغذ پر انڈیل دیا ہے۔"

میں حکیم صاحب کے ریمارکس سُن کر دم بخود اور مہر بلب تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہ تھا کہ موصوف اپنی آستین میں ایسا بیٹھے ہیں۔ میں نے تو یونہی ازراہِ تفنن ادب کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا، مگر معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے بھرے بیٹھے تھے اور پھٹ پڑنے کے منتظر۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اُنھوں نے کہا:

"شعری و نثری تخلیقات سے بیزار اور دل برداشتہ ہو کر تنقید پر نظر ڈالی تو وہ بھی "ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کا مصداق ثابت ہوئی۔ اس کا مطالعہ کرنا دلدل میں تیرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید ابھی بالغ نہیں ہوئی ہے بلکہ باوجود اپنی عمر ... ہے، کیوں کہ اس میں خشونت، کرختگی، درشتی اور حقارت کا عنصر غالب ہے۔ لب و لہجہ بھی جارحانہ ہے اور نقادوں کے دلوں میں بغض و عناد اور پرخاش کا جذبہ موجزن ہے۔ بعض نقاد تنقید کے دوران اکثر طنز کی طرح بار بار طنز کر کے فنکاروں کے دلوں کو چھلنی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ تنقید میں طنز کا استعمال ایسا ہے جیسا حلوۂ بادام میں ریزۂ بلور بھر دینا۔ تنقید خردہ گیری، دل آزاری اور پگڑی اچھالنے کا فن نہیں۔ تنقید ایسی ہونی چاہیئے جس سے فنکاروں کے جگر ٹھنڈک ہو، نہ ایسی کہ ان کے دل دہل جائیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جس کے دل میں گداز، آنکھوں میں نمی اور لب و لہجہ میں شبنم کی سی خنکی اور لطافت نہ ہو اسے تنقید نگاری نہیں کرنی چاہیئے۔"

یہ حقائق و معارف بیان کرنے کے بعد وہ اُٹھنے کے لیے پر تولنے لگے۔ میں نے اس خیال سے کہ یہ موقعہ

ملے نہ ملے، ان سے مزید سوال کیا:

"تو کیا آپ واقعی ادبیات کے مطالعہ سے یکسر دست کش ہو چکے ہیں؟"

"سوائے غزل کے سب کی طرف سے دل سرد ہو چکا ہے۔"

"غزل کے ساتھ یہ خصوصی التفات کیوں؟"

میرے اس سوال پر انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بڑی بیچارگی سے کہا

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اس سحر حلال سے بچنا بہت مشکل ہے نہ جانے کس دل جلے نے اسے کس عالم میں ایجاد کیا تھا۔ آج بھی کوئی قادر الکلام استاد چند موزوں الفاظ کو سلیقے، قرینے سے سجا دے تو دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ اور اقلیم جاں میں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔"

"اچھے شعر کی کیا پہچان ہے؟"

"اچھا شعر وہ ہے کہ اُدھر شاعر کی زبان سے ادا ہو اور اِدھر سننے والا دل پکڑ کر بیٹھ جائے۔"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے جلدی سے کہا،

"میرے لیے کوئی نصیحت فرمایئے۔"

"نصیحت اس وقت تک طلب نہ کرنی چاہیئے جب تک کہ اندر کا آدمی اس کے لیے شدید تقاضہ نہ کرے۔"

"اندر کے آدمی کی فرمائش پر ہی تو میں نے نصیحت کی خواہش ظاہر کی ہے اور میں ہی نہیں آج کل تو ہر فرد کے اندر کا آدمی مضطرب و منتشر، ضرب ضمیر سے نڈھال اور رہاں طلب ہے۔"

"اس وقت تو میں عجلت میں ہوں۔ خیر... سردست اس پند سود مند کو گرہ میں باندھ لو۔ اقبال نے کہا ہے، پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ... کیوں کہ... شاخ بُریدہ را نظرے بر بہار نیست"

ذرا کھل کر اور کھول کر بیان کیجیے۔ میں تو یونہی یتیم العقل واقع ہوا ہوں"

"برخوردار! اوٹ پٹانگ نظریات اور نت نئے "ازم" کے پیچھے دیوانہ وار مت دوڑو۔ یہ جھاگ کے خوشرنگ بلبلے ہیں۔ کچھ دیر تک اڑنے کے بعد فضا میں تحلیل ہو جائیں گے لیکن ان کے تعاقب میں تم اتنی دور نکل جاؤ گے کہ واپسی محال ہوگی اور پھر تم نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے۔ لہٰذا پیوستہ رہ شجر سے ...."

اور پھر وہ مجھے بیٹھک میں چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ مجھے دفعتہً الہام ہوا کہ حکیم صاحب اب کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں کیوں کہ جب وہ جانے کے لیے اُٹھے تو ان کے کپڑوں سے غالباً کافور کی بو آرہی تھی!! ◻■

حیدر بیابانی

داستان بیوی کی

یہ داستانِ جادو بیان نہ تو داستانِ الف لیلیٰ ہے نہ داستانِ طوطا مینا، یہ وہ زبان زدِ خاص و عام ہے جو گھر گھر صبح و شام کہی سنی جاتی ہے اور اپنی رنگا رنگی سے کسی کو گدگداتی ہے اور کسی کو خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ آدم و حوّا سے لیکر ہم اور ہماری بیویوں تک شیطان کی آنت جیسی اس داستان میں تو، تو، میں میں، گالی گلوج اور دھول دھپّہ سبھی کچھ بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن اس داستان کو باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لانے کا بیڑا آج تک کوئی سر پھرا شوہر نہیں اٹھا سکا یعنی اپنے آپ کو قابلِ گردن زدنی نہیں ٹھہرا سکا مگر آج ہم نے اوکھلی میں سر دینے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ گویا خود اپنا سامانِ قتل مہیا کر لیا ہے۔

داستانِ بیوی کا داستان گو کوئی پرانا زن مُرید کسی جلّاد و بیوی کا میاں ہونا چاہیئے تھا۔ ہم ٹھہرے شوہر نئے نویلے اور تھوڑے بہت رنگ رنگیلے اور کٹیلے بھی اس لیے بیان اگر زیادہ رِقّت آمیز نہ ہو کر تلخ یا مزاحیہ ہو جائے تو ہم پیشگی روئے زمین کے سارے ستم رسیدہ، بیوی گزیدہ، شوہروں سے معافی کے خواستگار ہیں اور اُن کی ہمدردیوں کے طلب گار ہیں۔

ذکرِ بیوی کے ساتھ شوہر کا ذکر بھی لازم و ملزوم ہے اس لیے اس بے چارے ستم کے مارے کا عبرت ناک ذکر جا بجا آئے گا اور ہر کسی کو آٹھ آٹھ آنسو رُلائے گا۔ دنیا کے سروے پر نکلا جائے تو لاکھوں مَردوں میں ایک آدھ مَرد تیس مار خاں نکلے گا۔ لیکن ہر عورت ایک بار بیگم کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ بیوی کے معاملے میں مرد ازلی سرد مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کے برخلاف بیگم اپنے شوہر کے لیے انتہائی گرم مزاج ہوتی ہے۔

غالبؔ کی زبان میں دھول دھپّہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہوتا ہے شامتِ اعمال ہی سے کسی نہ کسی وجہ سے پیش دستی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بیوی زبان چلانے کے ساتھ ساتھ بیلن چلانے کا فن سیکھ کر سکۂ رائج الخاندان بن جاتی ہے اس طرح شوہر بیوی میں ٹھن جاتی ہے۔ بیوی بیلن اُٹھائے شوہر کے پیچھے دوڑتی ہے اور شوہر بھاگ کر پلنگ کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ وہ للکارتی ہے "اب نکلو باہر" شوہر وہیں دبکے دبکے دہاڑتا ہے "نہیں نکلوں گا میرا اپنا گھر ہے جہاں چاہوں رہوں" کبھی کبھی وہ غصّہ میں باورچی خانے کے برتن اُٹھا اُٹھا کر کھینچ مارتی ہے اور میاں بیوی دونوں خوش ہوتے ہیں تاک نہ ٹھیک لگا تو بیوی خوش ہو جاتی ہے وہ

طا ہوگیا تو شوہر بغلیں بجاتا ہے اس طرح ہنسی خوشی دو پہیوں والی گرہستی کی یہ گاڑی چلتی رہتی ہے۔

دوستوں کی محفل میں ہر شوہر بیوی کو باندی اور خود کو شہنشاہ پوز کرتا ہے۔ دوسری طرف سہیلیوں کی انجمن میں بیوی اپنے آپ کو بیگم پاشا اور شوہر کو شاگردِ پیشہ سے متعلق گردانتی ہے۔ دونوں باتوں میں ایک ہی بات سچ ہوسکتی ہے اور سارے ووٹ بیوی کے حق میں جاتے ہیں ویسے بھی بیوی اپنے شوہر کا نصف بہتر کہلاتی ہے اور بچا ہوا نصف بدتر شوہر رہ جاتا ہے۔

عورتیں فطرتاً باتونی ہوتی ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کا سب سے تعجب خیز واقعہ وہ ہوگا جب کچھ عورتیں کہیں مل بیٹھی ہوں اور وہاں مکمل خاموشی چھائی رہے کسی شخص نے اپنے ساتھی سے سوال کیا کہ عورت زیادہ بول سکتی ہے یا لیڈر؟ تو اس جہاندیدہ کا جواب تھا "عورت" اگر یہ موضوع بولنے کا مقابلہ ہو!

شادی سے پہلے اگر کسی لڑکی کی کم سخنی کے چرچے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہ یہ کسر کسی نہ کسی کی بیوی بننے کے بعد نکال لے گی سلسل بول کر۔ بیوی کی ایسی ہی فطرت سے عاجز آئے ایک شوہر کو ڈاکٹر نے خبردار کیا "اگر آپ نے شراب نوشی جاری رکھی تو آپ بالکل بہرے ہوسکتے ہیں" شوہر صاحب نے جواب دیا "دیکھئے ڈاکٹر جو کچھ میں پیتا ہوں وہ اس سے یقیناً بہتر ہے جو میں سنتا ہوں"

بیوی کو رام کرنے کا آسان اور موثر حربہ اس کی کوئی فرمائش پوری کر دینا یا پوری کر دینے کا محض وعدہ کر لینا ہوتا ہے۔ نئی ساڑیاں اور زیورات بیوی کی کمزوری ہوتے ہیں اپنی آرائشی چیزوں کے سامنے اُسے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی ہے حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بھی نہیں ایک عورت سے گھبرائی ہوئی ملازمہ نے بتلایا "صاحب دروازے کے پاس بے ہوش پڑے ہیں اُن کے نزدیک ایک بڑا سا پیکیٹ بھی پڑا ہے" عورت چہک کر بولی "خوب میری نئی ساڑیاں آگئی ہیں" ایک عورت نے قیمتی جڑاؤ ہار خریدتے وقت جوہری سے کہا "اگر خدانخواستہ یہ ہار میرے شوہر کو پسند نہ آیا تو وعدہ کیجئے آپ اِسے واپس لینے سے انکار کردیں گے"

دوسری طرف اپنے شوہر کے لیے بے حد کنجوس ہوجاتی ہے پوری تنخواہ ہتھیا لیتی ہے اور پائی پائی کا حساب لیکر غریب شوہر کو پسینہ پسینہ کر دیتی ہے۔ ایک عورت اپنے شوہر کو روزانہ بس کے ٹکٹ کے لیے ایک روپیہ دیتی تھی۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر شوہر خوشی سے پاگل بنا گھر میں داخل ہوا اور بیوی کو پکار کر کہنے لگا "بیگم سنو تو سہی بہت بڑی خوشخبری ہے میں نے لاٹری میں ایک لاکھ کا انعام حاصل کیا ہے" بیوی نے سرد لہجے میں دریافت کیا "پہلے یہ بتاؤ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے لیے تمہارے پاس دو روپے کہاں سے آئے"

بیوی انسان کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ روٹی، کپڑا، اور مکان کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے۔ لیکن بیویوں کی ایسی مردم آزادیاں دیکھ کر آج کل بیوی سے بیزاری کی لہر زوروں پر ہے۔ ایک شخص نے بات چیت کے دوران اپنے دوست سے کہا "بار سگریٹ کی عادت تو چھوٹ گئی لیکن شراب نہیں چھوٹ پا رہی ہے" دوست نے پوچھا "ایسی کونسی بات ہے" جواب ملا "سگریٹ کے لیے تو بیوی نے پینے کی قسم دی تھی لیکن شراب کے لیے اس نے"

ایک اور بیوی بیزار شوہر سے ڈاکٹر نے کہا "آپ کی بیوی کی حالت بہت نازک ہے بہ مشکل وہ دس پندرہ دن ہی جی پائیں گی"... شوہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "جہاں اتنے برس سال کاٹ لیے وہاں دس پندرہ دن اور سہی"

لیکن کبھی کبھی شوہر بڑے خطرناک قدم اُٹھا لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی بیوی کی سالگرہ پر اُسے دفتر سے اپنے چپراسی کے ہاتھوں ایک تحفہ بھجوایا خوش قسمتی سے بیوی اُس وقت گھر میں موجود نہ تھی جب پیکیٹ دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑا۔!

بہت ساری بیویاں ایسی ہوتی ہیں جن سے شیطان نما شوہر بھی پناہ مانگتے نظر آتے ہیں۔ خدا اُس کام کا جی بیوی سے بچائے جو سوئے ہوئے شوہر کو نیند کی گولی کھلانے کے لیے گہری نیند سے جگاتی ہے۔ یا پھر اُس جاہل بیوی سے ہر خاص و عام محفوظ رہے جس نے اپنے لیڈر شوہر کی زبانی جب کسی بھاشن میں سن لیا تھا کہ "ہمیں امیر اور غریب کے بیچ کی کھائی کو بھرنا ہے" تو وہ بیگم نواز بضد ہوگئی کہ کھائی بھرنے کا ٹھیکہ اس کے بھائی کو ہی ملنا چاہیئے۔

بیوی اور پڑوسن کا رشتہ (ساس بہو کے رشتہ کے بعد) بڑا خطرناک ہوتا ہے اگر خدا کا کرنا دونوں دوست بن جائیں تو "گھڑی گھڑی آؤ پڑوسن باتیں کریں بیٹھے سے بیگار بھلی" والی سچویشن بنی رہتی ہے۔ یا خدا نخواستہ دونوں دشمن بن جائیں تو ہر دم "آؤ پڑوسن جھگڑا کریں بیٹھے سے بیگار بھلی" والا کلائمکس اسکرین پر لہراتا رہتا ہے اور دونوں ہی حالتوں میں غریب شوہر کا دَم ناک میں آتا جاتا رہتا ہے۔

پُرانے وقتوں میں بیوی پیر کی جوتی اور خاوند خداوند ہوتا تھا لیکن آج کل خاوند کی قیمت دو کوڑی کی رہ گئی ہے بیوی کے نزدیک گھر کی مُرغی دال برابر رہ گئی ہے۔ مرد بے چارہ بیوی کے حُسن جہاں سوز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ چہرے کو چاند، زُلفوں کو گھٹا اور جسم کو تاج محل تک کہہ اُٹھتا ہے لیکن بیوی "چلو ہٹو جھوٹے کہیں کے" کہہ کر تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ایک شوہر نامدار نئی نویلی بیوی کی زلفوں کی تعریفیں کرتے کرتے کہہ اُٹھے "تم نے مجھے اپنی زلفوں میں گرفتار کر لیا ہے" مگر بیوی نے جھٹ اپنی وِگ اتار کر یہ کہتے ہوئے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دی "جاؤ تمہیں آزاد کیا"۔

زمانے کے ساتھ ساتھ بیوی کے رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے حتیٰ کہ سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ پرانے زمانے میں اگر شوہر پردیس گیا ہوتا تو بے چاری بیوی برہن بنی دن رین برہ کی آگ میں جلتی رہتی تھی۔ اس کی راہوں میں آنکھیں بچھائے رہتی تھی۔ لیکن آج کی بیوی ایسی کچھ نہیں ہے۔ شوہر دورے پر گئے ہیں بیوی سوچتی ہے۔ اُدھر بنارسی ساڑیاں اچھی ہیں، دیکھیں انھیں لانا یاد رہ پاتا بھی ہے یا نہیں ۔۔ یا پھر پہلی تاریخ ہے تنخواہ کا دن بیوی راہ میں آنکھیں بچھائے راہ نہارتے نہارتے گھبرا اٹھتی ہے "ہائے اللہ شام ہوگئی نہ جانے کب آئیں گے، کب بازار جائیں گے اور کب سودا سلف آئے گا۔ کہیں پیسہ اِدھر اُدھر نہ کردیں مہینہ بھر تنگی رہے گی۔

موجودہ دور ملاوٹ کا دور ہے۔ بیوی بھی خالص نہیں ملتی۔ اب نہ شیام کی جوگنیں ہیں نہ پردیس کی برہنیں، نہ ہجر کا لطف نہ وصل کی لذتیں، زمانے کی اُلٹ پھیر نے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی: سبک قد تھے لیکن ان کے کرم فرما ڈاکٹر ڈی ڈی کیشپ بہت دراز قد تھے۔ ایک بار دن کے وقت دونوں سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ کیشپ صاحب پسینے میں شرابور تھے لیکن بیدی صاحب کو پسینہ نہیں آرہا تھا۔

ایک جگہ کیشپ صاحب رُک کر بولے "بیدی صاحب! کیا وجہ ہے کہ مجھ کو پسینہ آرہا ہے آپ کو نہیں؟"
بیدی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "وجہ ظاہر ہے آپ سورج سے زیادہ قریب ہیں!"

صغیر احمد سندیلوی

کل رات کو

جوش پر اس شوخ کی تھیں شوخیاں کل رات کو
مئے کے دھوکے میں پلا دیں کانیاں کل رات کو
بیٹھ کر کرسی پہ جج کی لڑکیاں کل رات کو
عاشقوں کو اپنے دے دیں پھانسیاں کل رات کو
جوش و سرمستی کے عالم میں جناب شیخ نے
اپنی پگڑی کی اڑا دیں دھجیاں کل رات کو
چاند تارے آ رہے ہیں دن میں اب ان کو نظر
ان کے جو سر پر پڑی تھیں جوتیاں کل رات کو
جھونک میں نشے کے ممبران پہ مدنی صدر نے
جانچ ڈالی تھیں جو سادی کاپیاں کل رات کو
پیٹ میں آئی ہے شاید ان کے شہکار غزل
آ رہی تھیں ان کو جو ابکائیاں کل رات کو

مصطفیٰ جمیل

مظلوم

میری زبان کا شاعر میری زبان کا ادیب
ملے گا آپ کو افلاس کے نگر میں غریب
ہم اس کی سمت کسی وقت دیکھتے بھی نہیں
ہم اس کا حال کبھی اس سے پوچھتے بھی نہیں

لباس اس کا پھٹا ہے تو بال بکھرے ہیں
مریض بیوی ہے اس کی تو بچے بھوکے ہیں
جو اس نے لکھا ہے اسکی متاع ہستی ہے
اسے سنبھال کے رکھتا ہے گھر میں یہ اپنے

میری زبان کا شاعر میری زبان کا ادیب

صغیر احمد سحر سندیلوی

حلوہ

نہ کھائیں روس کا ہم چین کا جاپان کا حلوہ
تمنا ہے کھلاتا اپنی بیگم شاہین باجی کو
کھلایا تھا جسے اک روز اپنے دست نازک سے
ذرا اک روز سندیلے کے بھی لڈو کھاکے
اگر مل جائے سندھو کی ہمیں دوکان کا حلوہ
بڑی ہی آرزوؤں کا بڑے ارمان کا حلوہ
مسلسل یاد آتا ہے مجھے شعبان کا حلوہ
یقیں ہے بھول جاؤ گے انگلستان کا حلوہ

غضب ہے چار ہی دن میں ستم ڈھایا گیا ان پہ
مرے لفظوں کو ہائے پیس کر تنقید کی سل پر
بنا کر رکھ دیا بھابی نے بھائی جان کا حلوہ
بنا ڈالا ہے ظالم نے مرے دیوان کا حلوہ

جہانگیر انس (رانی پور، بہار)

ماڈرن لال بجھکڑ

ایک دن اچانک ایک کافی ہاؤس میں لال بجھکڑ سے ملاقات ہوگئی۔ نماز عید کے بعد مقتدی جس طرح پیش امام سے بغلگیر ہونے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے ایک ساتھ نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ یلغار کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی نہایت ہی بیتابی کے ساتھ لال بجھکڑ سے بغل گیر ہونے کے لیے ان کی طرف بڑھے۔ ہمیں خوف تھا کہیں انھیں کوئی اور نہ پہچان لے اور ان سے بغلگیر ہونے میں ہمیں مات دے دے۔ ہمارے اس اچانک حملے سے پہلے تو وہ سٹپٹائے لیکن ہمارے بیکراں خلوص کے پیشِ نظر جلد ہی سنگ سے موم ہوگئے اور بے سہارا ستون کی طرح سینے سے آلگے۔ ہم نے ان کے سینہ پر اپنے خلوص کا اظہار اس شدت سے کیا کہ ان کی ہڈیاں چرمرا اٹھیں۔ ہڈیوں کی چرمراہٹ کی آواز سن کر ہمیں خوف ہوا کہ کہیں ان کے سینہ کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کی گستاخی نہ کر بیٹھے اور ہم خواہ مخواہ قتلِ ناحق کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے چلے جائیں اس لیے اس پُر جوش ملن کو بغیر انٹرول کے ہی "The end" کر دیا۔ چند منٹوں تک وہ ہونق بنے لمبی لمبی سانس لیتے رہے اور ہمیں پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ جب ان کی سانس نارمل ہوئی تو انھوں نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتے ہوئے کہا "میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا "یہ کوئی خلافِ اُمید بات نہیں ہے"

انھوں نے تعجب سے پوچھا "کون سی بات خلافِ اُمید نہیں ہے، میں سمجھا نہیں؟"

ہم نے ہنستے ہوئے "یہی کہ بڑے لوگ" عام لوگوں کو تھوڑے ہی پہچانتے ہیں۔ یہ تو عام لوگوں کا کام ہے کہ وہ بڑے لوگوں کو پہچانیں۔ ہم بھی ایک عام آدمی ہیں اس لیے پہلی نظر میں ہی ہم نے آپ کو پہچان لیا۔ آپ لال بجھکڑ ہیں۔ آپ کے بیش بہا کارنامے طشت از بام ہیں۔ ایک وہ بھی دور تھا کہ عقلمندی و سوجھ بوجھ میں آپ یکتائے زمانہ تھے۔ اکثر لوگ اپنی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے کے لیے آپ ہی سے رجوع کرتے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ آپ چٹکیوں میں حل کر دیتے۔ ایسے ایسے نکات پیش کرتے کہ بڑے بڑے تیس مار خانوں کی عقل بھی دنگ رہ جاتی۔ جہاں سوئی سمانے کی گنجائش نہ ہوتی

وہاں آپ بے دھڑک نکل جاتے. سچ پوچھا جائے تو آپ اس دور کے مشکل کشا تھے"۔

جیسا کہ ہر بڑے آدمی کی عادت ہوتی ہے کہ اپنی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتا لال بجھکڑ بھی اپنی تعریف سن کر کُپا ہوتے ہوئے بولے "مجھے آج بھی اکثر لوگ مشکل کشا ہی سمجھتے ہیں"

ہم نے ازراہ تمسخر پوچھا "آپ خود کو کیا سمجھتے ہیں؟"

انھوں نے شرماتے ہوئے کہا "وہی جو بعض لوگ مجھے سمجھتے ہیں یعنی میں زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھتا ہوں"۔

اپنے منہ میاں مٹھو بنتے دیکھ کر ہم نے انھیں مکھن لگایا آپ نے کئی معرکتہ لآرا کارنامے تو ہمیں آج بھی ازبر ہیں مثلاً وہ کارنامہ کہ جب بادل کی زوردار گرج سن کر رانی صاحبہ بے ہوش ہو گئی تھیں اور راجا صاحب سخت الجھن میں پھنس گئے تھے کہ رانی صاحبہ کی بے ہوشی کی سزا کس کو دی جائے۔ اگر کسی کو سزا نہ دی جاتی تو راجا صاحب کا انصاف مجروح ہوتا. لوگ کہتے کہ یہ کیسا راجا ہے جو مجرموں کی شناخت نہیں کر پاتا۔ رانی صاحبہ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تو عوام کے ساتھ کیا انصاف کرے گا؟ جب راجا صاحب اور ان کے وزراء اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے تو آپ کو زحمت دی گئی۔ آپ نے کس دانش مندی کے ساتھ اس مسئلے کو حل کر دیا کہ کمہار نے برتن پکانے کے لیے آوے میں آگ جلائی. آگ سے دھواں نکلا. دھویں سے بادل بنے. بادلوں کے آپس میں ٹکرانے سے گرج پیدا ہوئی جسے سن کر رانی صاحبہ بیہوش ہو گئیں. غرض کہ تمام مصیبت کی جڑ کمہار ہے اس کی گردن مار دینا چاہیئے"۔

آپ کے فیصلے کے مطابق کمہار کو گرفتار کر لیا گیا مگر وہ اتنا دُبلا پتلا تھا کہ پھانسی کا پھندہ اس کی گردن میں فِٹ نہ ہو رہا تھا، آپ کو پھر زحمت دی گئی۔ آپ نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال دیا کسی نہ کسی کو سزا ملنی چاہیئے کمہار نہ سہی کوئی اور سہی جس کی گردن میں پھندہ فٹ ہو" اس طرح ایک موٹا تازہ آدمی تلاش کر کے اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔۔۔ آپ کا یہ بیش قیمت فیصلہ سن کر اپوزیشن کے ممبران یعنی آپ کے مخالفین نے دل ہی دل میں اپنا سینہ پیٹ لیا کہ یہ بیش بہا فیصلہ ان کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔

اپنی بات ختم کر کے ہم نے داد طلب نگاہوں سے لال بجھکڑ کی طرف دیکھا کہ پانچویں سوار ہم ہی ہیں لیکن ان کی نگاہوں میں غصّے کے شعلے دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس وقت ہم نے جانا کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا کسے کہتے ہیں۔ انھوں نے نہایت ہی خشمگیں لہجے میں کہا "آپ کی بے سروپا باتیں بہت دیر سے سن رہا ہوں، کان کھول کر سن لیجئے کہ میں لال بجھکڑ نہیں ہوں"۔

ہم نے ڈھٹائی بلکہ بے حیائی کا دامن تھامتے ہوئے کہا "تو کیا آپ نیتا ہیں؟ اُنھوں نے آنکھوں کے علاوہ منہ سے بھی شعلے برساتے ہوئے کہا "ایک شریف آدمی کو نیتا کہتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی، نیتا ہوں گے ہمارے آپ کے دشمن"۔

اب تو ہمیں چکر آنے کے ساتھ اپنی مردم شناسی پر بھی شبہہ ہونے لگا۔ ہم نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا "اگر آپ نیتا نہیں تو جدید شاعر ضرور ہیں؟"

ان کا پارہ اور بھی زیادہ چڑھ گیا "لاحول ولا قوۃ، تاڑ سے گرا کہ آپ نے مجھے کھجور پر لٹکا دیا. ارے بھائی میں شاعر یا افسانہ نویس بھی نہیں ہوں"۔

اب تو ہمیں اپنی مردم شناسی کے ساتھ اپنے آپ پر بھی شبہ ہونے لگا کہ ہم ہم ہی یا نہیں۔ چلے تھے لال بجھکڑ کو پہچاننے اور اپنی بھی پہچان کھو بیٹھے۔ عاجز آکر ہم نے اپنے ——— دونوں کانوں کو مڑوڑا ذہن پہ کافی زور دیا لیکن منزل ہنوز دور کی دور ہی رہی۔

انھیں ہماری اس بے بسی پر رحم آگیا۔ اپنے غصّہ کو ولایتی شراب کی طرح پی گئے اور فرمایا "میں ڈاکٹر گھوڑ پڑاس ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی ڈی ٹی ہوں۔"

موصوف کی تعریف سن کر ہماری رگ ظرافت ایک بار پھر پھڑک اٹھی، ہم نے کہا "یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ جانوروں کے ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں آپ ہی جیسے ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے جو ہمارے کتے کی پیدائشی ٹیڑھی دُم کو سیدھا کر دے۔ اگر آپ نے یہ کارنامہ انجام دیا تو ہم آپ کو فیس کے علاوہ منہ مانگا انعام بھی دیں گے۔

موصوف نے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "کیا میں شکل سے جانوروں کا ڈاکٹر نظر آرہا ہوں"؟

ہم نے کہا "شکل سے تو آپ لال بجھکڑ نظر آرہے ہیں لیکن آپ کا نام آپ کو جانوروں کا ڈاکٹر ثابت کر رہا ہے۔"

موصوف نے پہلے ہی کی طرح ناراضگی کے ساتھ کہا "کسی کے نام سے کبھی کہیں اس کا پیشہ ظاہر ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "اچھا، آپ جانوروں کے ڈاکٹر نہیں تو اپنی ڈگری ڈی، ڈی، ٹی کے مطابق مچھر مار ہیں۔ یعنی آپ کا تعلق ملیریا ڈپارٹمنٹ سے ہے۔"

موصوف نے بے بسی کے ساتھ کہا "ارے بھائی میں نے ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔"

ہم نے موصوف کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "تو کیا اب ادب بھی مریض ہوگیا ہے کہ اس کے لیے باضابطہ طور پہ ڈاکٹر کی ضرورت پڑگئی۔"

موصوف نے صفائی پیش کی "ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری غیر معمولی تحقیقی کارنامے پر بطور اعزاز پیش کی جاتی ہے۔"

ہم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا "غرضیکہ ادب میں کوئی غیر معمولی تحقیقی کارنامہ انجام دینے کے سزاوار آپ بھی ہیں، براہ کرم اس غیر معمولی تحقیقی کارنامے کے متعلق کچھ ہمیں بھی بتائیے۔"

موصوف نے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا "ہم نے اردو کے نثری ادب کی بنیاد کی عقدہ کشائی کی ہے۔"

اچانک مجھے موصوف کی تھیسس یاد آگئی حال ہی میں ایک اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے جس میں موصوف نے لال بجھکڑ کی طرح گل بوٹے کھلائے ہیں اور فیصلے صادر کیے ہیں۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا "ہپ ہپ ہرّا" یعنی آپ ہاڈرن لال بجھکڑ ہیں۔ ہم نے آپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی ——— اور اس سے قبل کہ موصوف ہاتھا پائی پر اتر آئیں سر پر پیر رکھ کر ہم وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئے۔

■■

مضامین صاف اور خوش خط، صفحہ کے ایک جانب لکھے ہوئے موصول ہونا چاہئیں!

ادارہ

یک بتیاوی

ہزل

پ. پ پیار کرنا ہی کام ہے، ڈ. ڈ ڈرنے والا نہیں ہوں میں
ن. ن نام میرا کریک ہے، چ. چ چاقو بھالا نہیں ہوں میں

غ. غ غیر کہتے ہیں کیوں مجھے، خ. خ خاص رشتہ ہے آپ سے
ب. ب بات میری نہ ٹالئے، د. د دل کا کالا نہیں ہوں میں

کھ. کھ کھانسی نزلہ بخار کیا، ج. ج جاڑا گرمی کا بار کیا
س. س سوئی گولی کو پھینکئے، م. م مرنے والا نہیں ہوں میں

ج. ج جب کہو مجھے جانِ من، س. س سیر تم کو کراؤں گا
پ. پ پائلٹ ہوں جہاز کا، ت. ت تانگہ والا نہیں ہوں میں

غ. غ غور کرنے کی بات ہے، ب. ب بات میری نبات ہے
ن. ن ناز تیرا اٹھاؤں کیوں، س. س ساٹھ سالا نہیں ہوں میں

ل. ل لین دین کی بات کیا، م. م مرحلہ ہے یہ عشق کا
س. س سود مود سے کیا غرض، ا. آ آنہ لالہ نہیں ہوں میں

گانٹھ کا پورا ہے آنکھوں کا اندھا چاہیئے
آج کل کی لڑکیوں کو ایسا دولہا چاہیئے

تم تو بس اکونا منز ہو میں ہوں شکچھا منسٹری
اینی ہاؤ میرا سالا پاس ہونا چاہیئے

ANY HOW

دَورِ ہے چمچہ گری کا، جب کبھی سے کام لیں
آپ کو چمچہ گری سے کام لینا چاہیئے

ہم حکومت میں رہیں تو آپ کو کردینگے خوش
اس الکشن کی گھڑی میں، ہم کو پیسا چاہیئے

جب سنانا چاہی ہم نے اپنے دل کی بات بھی
وہ مچل کر ہم سے بولے ہم کو جھمکا چاہیئے

یہ ترنم، یہ غزل، یہ شعر پڑھنے کی ادا
آپ کو شاعر نہیں قوال ہونا چاہیئے

زندگی اک فن ہے روشن اور یہ معراجِ فن
دوستوں سے قرض لیکر بھول جانا چاہیئے

قطعہ

دلکش آفریدی (یوپی)
مرادآباد

ہوتے ہوتے ہوتا ہے انساں ترقی یافتہ
پہلے صوفی پھر قلندر پھر ولی ہو جائے گا
رفتہ رفتہ آگئے ہو شاعری کی ٹاپ پر
آج اگر ہے جشن تو کل عرس بھی ہو جائے گا

مظفرالحسنین حیدری
(ناگپور۔ مہاراشٹر)

"اور آمد ہماری ریڈیو پر"

جب سے ہمارا انٹرویو مع ایک عدد پرانی تصویر کے شائع ہوا ہے۔ ڈاکیہ بلا ناغہ ہمارے گھر آنے لگا ہے۔ گویا ہم نے یہ تصویر "اسم نویسی" کے طور پر شائع کی ہو۔ روزانہ ہمارے نام جو خطوط آتے ہیں ان میں ہماری شاعری کی تعریف ہی تعریف ہوتی ہے۔ کسی کو ہم پر غالب کا گمان گزرتا ہے۔ تو کوئی ہمیں جوش سے ملا دیتا ہے۔ جبکہ آپ اگر ہم سے ان حضرات کی تخلیقات کے نام دریافت کریں گے تو ہم دیوانِ غالب اور دیوانِ جوش سے آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ ہمارے دوستوں کو ہمارا انٹرویو شائع ہونا اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا جب کبھی وہ ہماری تعریف سنتے یا پڑھتے ہیں۔ تو اپنا منہ یوں لٹکا لیتے ہیں جیسے نئے سال کے خسارے کا بجٹ دیکھ لیا ہو۔ ہمارے چند دوستوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ انٹرویو اخبار کے ایڈیٹر کو کچھ رقم دے کر شائع کروایا ہے۔ اور اس شمارے کی پچاس کاپیاں خرید کر شہر کی لائبریریوں اور ایسے باذوق حضرات جو اردو اخبار و رسائل خرید کر پڑھنے کا شوق نہیں فرماتے ان میں مفت تقسیم کی گئی ہیں اور جان بوجھ کر پرانی تصویر شائع کروائی گئی ہے۔ چلو مان لیتے ہیں کہ ہم نے ایڈیٹر کو رقم دی۔ تو کیا ہمارے دوست ہمیں اتنا بھی گیا گزرا سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی مادری زبان کی بقا کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ اور پھر کہاں ایسا موقع بار بار ملتا ہے کہ سو، پچاس کاپیاں خرید کر تقسیم کی جائیں۔ رہا پرانی تصویر والا معاملہ تو یہ مجبوری مزاج کی ہے۔ ہم کیا کوئی بھی صاحب عقل یہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس کی نئی تصویر کا استعمال لوگ اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے کیا کریں۔ اور پھر شعراء و ادباء کی پہچان کی یہ بھی تو ایک علامت ہے کہ بچپن کی تصویر پچپن سال کی عمر تک جواں سال شاعر و ادیب کے نام سے چھپتی رہتی ہے۔

آج کی ڈاک سے ہمیں وہ خط ملا جس کے لیے ہم پچھلے ایک برس سے کوشاں تھے۔ یہ خط ریڈیو اسٹیشن سے موصول ہوا ہے۔ جس میں ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ ہم مع اپنی غزلوں کے ریڈیو اسٹیشن ریکارڈنگ کے لیے حاضر ہوں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی بس یوں سمجھ لیجئے کہ مہینوں کی انتھک کوشش کے بعد جیسے بنک سے ہمارا لون منظور ہو گیا ہو۔ ہم نے سوچا کہ اس خط کی تشہیر ضرور ہونی چاہیئے۔ لہٰذا خط کو ہاتھ میں دبائے شہر کے مخصوص علاقوں کی طرف گشت کرنے نکل پڑے ابھی صدر بازار کے نکڑ پر پہنچے ہی تھے کہ ہمارے کچھ دوستوں کی نظر ہمارے شگفتہ چہرے پر پڑ گئی۔ انھوں نے پاس بلا کر ما تڑ لادیا

کیا ہم نے بھی لاپرواہی کا خاص خیال رکھتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں یار . . . . بس . . . یہ آکاش وانی والوں نے ہمیں بلایا ہے۔ ان کی ضد ہے کہ ہم اپنی غزلیں ریکارڈ کرا دیں۔

" کے . . . کے" "کیا . . . کیا۔ آپ کو آکاش وانی والوں نے بلایا ہے" . . . ایک دوست نے حیرت سے پوچھا دوسرے نے کہا "تو پھر یار آج تو ہو جائے کچھ" ہم نے کہا! "دیکھو بھئی . . . ار . . . فی الحال چائے پینی ہو؟" . . . اک اچانک ایک دوست نے درمیان میں بات کاٹتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے یار . . . فی الحال چائے چل جائے گی"۔ چائے پلوانے کے لیے ہم نے بھی ایسی ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں گاہک کم اور مبصرین زیادہ تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ان مبصرین کا کام دن بھر ہر موضوع پر تبصرہ کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ ان کے اپنے گھروں کی حالت کسی قحط زدہ علاقے سے کم نہیں ہوتی۔ چائے کی چسکیوں کے دوران ایک دوست نے ہم سے پوچھا (جس کے ہم خود منتظر تھے) "کب جا رہے ہیں آپ ریکارڈنگ کے لیے"۔ ہم بھی موقع شناس ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھایا اور ذرا بلند آواز میں انھیں جواب دیا۔ ہوٹل میں بیٹھے مبصرین ہمارا منہ یوں تکنے لگے۔ گویا ہم نے کہہ دیا ہو کہ ایک خاص قوم کا آپس میں اتحاد ہو گیا ہے۔

اب ہمارے سامنے مسئلہ تھا غزل کا کہ آیا پرانی غزل پڑھیں یا نئی۔ سوچا ریڈیو کا معاملہ ہے کیوں نہ نئی غزل پڑھی جائے۔ پھر دل کہتا نئی غزل لائیں گے کہاں سے بہت دیر تک ہم اپنے دل سے متفق نہیں ہو پائے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے علماء چاند کی تاریخوں پر متفق نہیں ہوتے۔ آخر کار ہمارے دل نے اعلان کر دیا کہ "کل غزل ہو گئی"۔ اور غزل لکھنے کا وہی پرانا طریقہ کار عمل میں لایا۔ ابا جان کی الماری سے ایک بوسیدہ کتاب نکالی۔ ایک غزل کا انتخاب کیا۔ اور پھر متروک اراضی کی طرح اسے اپنے نام کر لیا۔ اور اس میں لفظوں کے اسپیر پارٹس لگائے۔ اس طرح غزل تیار ہو گئی۔ اسے حفظ کیا۔ اور روایت کے مطابق سب سے پہلے ہم نے یہ غزل بیگم کو سنائی۔ غزل سننے کے بعد انھوں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا "لگتا ہے میں نے . . . یہ غزل کہیں تو بھی پڑھی ہے . . . یا پھر سنی ہے"۔ ہم نے تیور بدلتے ہوئے کہا "بیگم! . . . کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ . . . یہ غزل تو ہماری اون پراپرٹی ہے۔ اور پھر سارے گھر میں ہماری شاعری کے کاغذات چیدہ چیدہ حالت میں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ . . ہو سکتا ہے . . . تم نے کہیں پڑھ لیا ہو"۔ بیگم نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کیا . . . یہ چیدہ چیدہ کاغذات یکجا نہیں ہو سکتے۔ انہیں کتابی شکل کیوں نہیں دے دیتے"۔ ہم نے کہا "بیگم . . . اکیڈمی والے خود نہیں چاہتے کہ ہمارے یہ کاغذات اتفاق و اتحاد سے مجلد ہو جائیں۔ لیکن . . . تم فکر نہ کرو . . . اکیڈمیوں میں سدھار پیدا ہو رہا ہے۔

ریکارڈنگ کی مقررہ تاریخ کو ہم صبح دس بجے ہی اپنی شاعرانہ شان و شوکت کے ساتھ گھر سے نکل پڑے۔ حالانکہ ریکارڈنگ دوپہر دو بجے ہونا قرار پائی تھی۔ جاتے وقت ہم نے بیگم سے کہہ دیا "بیگم . . . ہم اپنی غزلوں کی صدابندی کے لیے ریڈیو اسٹیشن جا رہے ہیں۔ آپ سے بتانا ضروری تھا اس لیے کہہ رہے ہیں آپ کسی سے کہنا مت"۔ یہ جملہ ہم نے خاص طور سے کہا کیوں کہ اگر آپ کسی بات کی تشہیر چاہتے ہیں تو وہ بات کسی عورت سے کہہ دیں اور آخر میں یہ جملہ کہنا نہ بھولیں کہ "دیکھو ہم نے آپ سے کہا ہے آپ کسی سے کہنا مت" بس شام تک۔ وہ بات عام ہو جائے گی۔

گھر سے نکل کر سب سے پہلے ہم محلے کی قریب ترین ہوٹل میں گئے۔ خود چائے پی اور ایک صاحب کو چائے پلائی۔ چائے پیٹ میں جاتے ہی ان کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ مسکرا کے پوچھا "کہاں کی تیاری ہے"۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ جواباً عرض کیا "ایسے ہی . . . ذرا ریڈیو اسٹیشن جا رہے ہیں۔ آج ہماری غزلوں کی ریکارڈنگ ہے"۔ یہ بات ہم نے اس طرح

کی اہوٹل میں بیٹھے دوسرے افراد بھی سن سکیں۔ اس کے بعد مختلف ہوٹلوں میں یہی عمل دہراتے ہوئے ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ اور جب وہاں ریکارڈنگ شروع ہوئی تو ہمارے گلے سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بہرحال مختلف سُروں میں ہماری غزل کی ریکارڈنگ ہوگئی۔

جس رات ہمارا پروگرام نشر ہونے والا تھا۔ قرب و جوار کے تمام پان فروشوں سے ہم نے کئی پیکٹ اونچا قسم کے سگریٹ صرف اس شرط پہ خریدے کہ وہ اپنے ڈبل اسپیکر اسٹیریو ساؤنڈ میں ریڈیو آن رکھیں گے۔ اور جب ہم غزل سرا ہوں تو آواز فل پہ رکھیں گے۔ وہ بے چارے مان گئے۔ اسی رات ہم نے دوستوں کو گھر پہ کھانے کے لیے مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ اور ساتھ ہی پروگرام سنیں گے۔ نہ جانے کیوں ہمارے دوستوں نے پروگرام سے ایک گھنٹہ قبل ہی کھانا کھانا مناسب سمجھا۔ ہم سے تو کچھ کھایا نہ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہم سب وقت کا انتظار کررہے تھے۔ پورے کمرے میں سگریٹ کا دھواں تھا ــــ ہماری نظر بار بار گھڑی کی طرف جارہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوگئے تب ہمارا سینہ تیری سے پھول پچک رہا تھا۔ سب کی نظریں ریڈیو پر جمی ہوئی ہیں۔ نو بجنے کو جب دو منٹ باقی بچے تھے کہ علاقائی زبان میں اعلان ہوا۔ جس کا مفہوم تھا "اب آپ ہمارا اگلا پروگرام سماعت فرمائیں"۔ اور دھیرے دھیرے موسیقی بجنے لگی۔ ہماری سانس اور تیز تیز چلنے لگی۔ موسیقی کیا تھی۔ ہمیں تو لگ رہا تھا کہ ہمارے کانوں میں صور اسرافیل پھونکا جارہا ہو۔ سبھی کا دھیان ریڈیو کی طرف تھا۔ ۔۔۔کہ ۔۔۔کہ ۔۔۔اچانک بجلی گل ہوگئی ــــ ہم نے ایک زوردار اپیل کی۔ ہمارے دوستوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر نکل کے دیکھا تو پورا شہر بلیک آؤٹ تھا۔ ہم نے ہر طرح کی کوشش کی۔ اندھیرے میں ٹرانزسٹر کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن سب ناکام ــــ بجلی آئی بھی تو کب۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح جائے واردات پر پولس سب کچھ ہوجانے کے بعد پہنچتی ہے۔

اس عظیم سانحہ کے بعد ہم نے شعر گوئی ترک کردی۔

ہمارے دوستوں کا خیال ہے کہ یہ بھی ہمارا اردو پر ایک احسانِ عظیم ہے۔

OO

میرزا اٹکلی بلولی کر (نامہ نگار)

اپنا قصیدہ

میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

دستِ کاتب میں ہوں میں بر دکا قلم
ہر طرم خاں سے بڑھ کر ہے جاہ و حشم
میرے دم سے ہے ہر ایک ہیٹھے میں دم
بڑی سپاریوں میں ہے چکنی ڈلی
میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

میں نے جھوٹے بگو نے کہ چاٹا نہیں
راستے میں میرے کوئی جھپاٹا نہیں
کتنا مشہور ہوں پھر بھی نتھاٹا نہیں
یا علی کہہ کے دشمن کی توڑا نلی
میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

وقف کردہ میں ویران سی لاج ہوں
مال و زر کچھ نہیں اتنا تاراج ہوں
ننگے سر شاعروں کا میں سرتاج ہوں
میری خدمت میں کوئی نہیں اردلی
میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

عقد میں ان کے بیٹے کے جا نا سکے
راگ سے سب کو سہرا سنانا سکے
مختانے میں بریانی کھانا سکے
ان کی شادی ہوئی اپنی حسرت بی گلی
میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

گھر میں غلہ اگر ہے تو لکڑی نہیں
تحفہ بو نتا ملا ہے تو سردی نہیں
مالی حالت سدا اپنی اچھی نہیں
اردو شاعر سے تو ایک بیوہ بھلی
میرزا اٹکلی میرزا اٹکلی

جگموہن پرشاد مگیش
(نظام آباد)

غزل

کتی بھی پٹی پڑھاؤ فائدہ کوئی نہیں
ہوندے سیدھے کاماں کرتیں بولتا کوئی نہیں

کوئی تو آواز اٹھے کوئی تو نعرہ لگائے
منڈیاں ہل رہیں اگرچہ سر پھرا کوئی نہیں

منہ چھپائے گھپ اندھیرے میں نکل جاتے ہیں آپ
شیخ صاحب آپ جیسا پارسا کوئی نہیں

اب جو کڑکی آئی تو ہم کو یہ اندازہ ہوا
نام کے ہیں دوست سارے کام کا کوئی نہیں

رہبری نے آپ کی یہ دن بھی دکھلا ہی دیا
جیل جانے کے سوا اب راستہ کوئی نہیں

دُم دبائے سب کے سب جو چل پڑے پیچھے مگیش
چول ایسے لیڈروں کی کھولتا کوئی نہیں

غافل انصاری
(سنسارپوری)

ضرورت ہے

نئے تعلیمی سال سے شروع ہونے والے برسرپیکار رہائشر سیکنڈری اسکول ٹلسی گھور ضلع جھونڈا کے لیے مندرجۂ ذیل اسٹاف کی فوری ضرورت ہے اسکول میں ہوسٹل کی جملہ سہولتیں موجود ہیں۔ اسٹاف کو معقول تنخواہ کے علاوہ فوڈ الاونس گرانی بھتہ، رہائش، بجلی، پانی، کوئلہ، شکر اور مطبخ سے مفت کھانا دیا جائے گا۔ صدر اور نگران کی خدمات اعزازی ہوں گی۔ بقیہ تمام سہولتیں اسٹاف سے دوگنی حاصل ہونگی۔

۱۔ ہیڈ ماسٹر۔ ایک : اردو میں بیسک ریڈر، عربی میں قاعدہ بغدادی، ہندی میں بال پوتھی، فارسی میں آمد نامہ، سنسکرت میں پردیپکا اور انگلش پرائمر کا معتق فرفر پڑھنا جانتا ہو۔ ڈرپوک، کاہل اور کند ذہن کو ترجیح دی جائے گی۔

۲۔ اسسٹنٹ ٹیچر۔ نصف درجن : اردو، ہندی، انگریزی کتابوں تک رسائی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ حساب، جمل علم رمل اور پچاس تک گنتی جانتا ہو۔ ساٹھ تک پہاڑے رٹنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ انتظامیہ کے بچوں کی جگہ خود امتحان دینے دلانے کے بندوبست میں ڈپلومہ رکھنے والے حضرات قابل ترجیح سمجھے جائیں گے۔ عمر اٹھارہ سے اسی برس۔

۳۔ اُستانیاں ـــ پاؤ درجن : شعبہ نسواں کے لیے نوکم بارہ استانیوں کی ضرورت ہے۔ لیاقت : قبول صورت، سلائی کڑھائی میں ماہر، امور خانہ داری میں ید طولیٰ رکھتی ہوں۔ سرکٹ چھاپ اراکین انتظامیہ سے ہنسی مذاق کا عملی تجربہ رکھتی ہوں۔ مدرسہ کے اندر بلا برقعہ آنا ضروری ہے۔ مدرسہ کے باہر نصف سر سے ناک کی ٹپ تک برقعہ کا بند رکھنا نوکری پانے کے بعد لازمی ہوگا۔ بیوہ اور بغیر بچوں والی مستورات کو ترجیح دی جائے گی۔ عمر ۱۵ سے ۲۷ سال۔

۴۔ کلرک ـــ ایک عدد : ہاتھ پاؤں سے کاہل، علم سے جاہل۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور بستری

مرمت کرنا جانتا ہو۔ انتظامیہ کے نجی خرچ میں آئی رقم کے فرضی واؤچر بنانے میں ڈگری رکھتا ہو۔ عمر کی کوئی قید نہیں۔

۵- چپراسی - دو : جو پاؤں دبانا، تیل مالش، چائے پان، انڈے پراٹھے خریدنا جانتا ہو، جھڑکیاں، ڈانٹ ڈپٹ سننے اور مغلظات کھا کر چپ رہنے کا عملی تجربہ رکھتا ہو۔ عمر ۱۴ سے ۱۷ برس۔

۶- چوکیدار - ایک : دن کو اراکین کی خوشامد اور چاپلوسی، رات کو ان کی آرام و آسائش کا معقول بندوبست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ آدھی رات کے بعد ٹانگ پسار کر سونے کی اجازت ہوگی۔

۷- باورچی — ایک (مرد یا عورت) امور خانہ داری میں ماہر، نان، اسٹو، قورمہ، آملیٹ، زردہ، پلاؤ، بریانی، کباب، اراکین اور اسٹاف کے لیے، نیز زیادہ نمک آلودہ، پتلی دال، بے چھلکے آلو، کچی روٹی/چاول بچوں کے لیے پکانا جانتا/جانتی ہو۔

۸- صدر - ایک (قریب المرگ) صدر کی حیثیت ضابطہ اسکول کے مطابق اعزازی ہوگی۔ تعلیمی لیاقت - زیادہ سے زیادہ اردو یا ہندی میں اپنے دستخط کرنا جانتا ہو۔ نرے جاہل کو ترجیح دی جائے گی۔ سکریٹری کی انگلی پر ناچنے اور بلا حیل و حجت بینک کے چیکوں پر دستخط ثبت کرنے کی اہلیت انتخاب میں معاون ہوگی۔

۹- نگراں — ایک (اعزازی) نگرانی کے جملہ اختیارات کے استعمال میں ڈپلومہ یا ڈگری، لچھے دار باتیں کرنے والا باتونی اور عیال بچوں کی کفالت کے بار عظیم سے آزاد، بے فکرا لاابالی شخص کو ترجیح دی جائے گی۔

دیگر قواعد و ضوابط : تقرری کے خواہاں حضرات کے لیے امور ذیل کی پابندی لازمی ہوگی۔

۱- تقریر، تحریر، بحث مباحثہ، جواب دہی اور زباں درازی کا مظاہرہ کرنے والے ملازم کو بغیر نوٹس کسی بھی وقت برطرف کیا جاسکتا ہے

۲- انتظامیہ کے جیب خرچ کے لیے آمدنی کا چالیس فیصدی حصہ محفوظ رکھنا ہوگا۔

۳- بیڑی، تمباکو، چرس، بھانگ یا افیم صرف اسکول کے اندر استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ اسکول کے باہر منشیات کا استعمال ممنوع ہوگا۔ ۴- انتظامیہ کا ہر رکن حاکم اعلیٰ ہوگا اس لیے صبح شام ان کے گھر کی حاضری اور سلام بجا لانا ہر ملازم کا فرض ہوگا۔

۵- ملازم کا تمام (ضروری) ریکارڈ سکریٹری یا ہیڈ ماسٹر اپنی جیب میں رکھے گا تاکہ ملازم ہر وقت اپنی برخاستگی کا خطرہ محسوس کرتا رہے۔

تفصیلات اور نقول اسناد فرضی یا الحاقی سمیت اندرون دو دن اپلائی کریں۔ بعد میں موصول ہونے والی عرضیوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ قابل اور معتبر نہ پائے جانے کی شکل میں بھائی بھتیجوں بیٹیوں [illegible] کو ملازمت میں رکھ لیا جائے گا۔

سکریٹری : برسر بیکار [illegible] اسکول ہلسی گھور ضلع بھونڈا

ڈاکٹر مرزا محمد زمان آزردہ
مترجم: منصور احمد منصور

(کشمیری سے ترجمہ)

جب میں نے پہلی کتاب چھپوائی

میں کیا کہوں کتنا کہوں! لیکن جب یہ قصہ یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ہر ایک کو سناؤں۔ یہ قصہ بڑا ہی پُر لطف ہے اپنی کتاب چھپوانے کا وہ میری زندگی کا ایک اہم دن تھا جب میں نے اپنی پہلی کتاب چھپوائی۔ بچپن میں جب میں دوسروں کی کتابیں پڑھتا تھا تو اس کے سرورق کو بہ نظر غائر دیکھتے ہوئے مصنف کے نام کی جگہ دل ہی دل میں اپنا نام محسوس کرتا تھا اس وقت دل پر جو کیفیت گزرتی تھی وہ کم و بیش اسی نوعیت کی ہوتی جو کسی امیدوار کے دل پر دوسروں کا ٹکٹ دیکھتے ہوئے گزرتی ہے اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ اچھا آدمی بننے کے لئے انسان پر کیا کچھ گزرتی ہے۔ اس کے سامنے صرف زلزلہ ہوتا ہے لیکن جب خود پہ گزرتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور انسان کس قدر کمزور ——!

بات ہو رہی تھی میری پہلی کتاب کی۔ میرے بہت سے دوستوں کو یہ خیال ہوگا کہ میں کھیتی بنا ہوں گا۔ ارے کیوں نہیں۔ کتاب کی قیمت جو تین روپے تھی اور پھر کوئی بارہ سو کتابیں چھپوائی تھیں —— آپ کے خیال کو کون جھٹلائے۔ لیکن اگر میرے حال دل سے واقف ہو جائیں گے تو یہ بات بخوبی سمجھ لیں گے کہ کتاب چھپوانی کتنی مشکل اور لکھنی کس قدر آسان ہے۔ میرے نزدیک اس کے تین اسٹیج ہیں —— کتاب کا لکھنا —— کتاب کا چھپوانا —— اور کتاب کا بیچنا۔ اگر ان کے جزئیات پر بھی نگاہ رکھی جائے تو بات دور تک پہنچ جاتی ہے۔ کتاب لکھنا مصنف کا ذاتی کام ہے۔ چاہے وہ راتوں کو بلب کی روشنی کے بجائے خون جگر سے چراغ روشن کر کے لکھے یا کسی کنج تنہائی میں اپنے ذہن اور احساں کے اوراق سیاہ کرے۔ یہ مصنف جانے اور اس کا جسم و جاں۔ اس کے بعد یہ کتاب کاتب کے ہاتھوں میں پڑ جاتی ہے۔ یہ کاتب کے ہاتھوں میں مصنف کی تقدیر ہونے کے مترادف ہے۔ جو کچھ اور جیسا کچھ کاتب لکھے لوگ وہی پڑھیں گے۔ ادھر ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہر طرف مصنفوں کا جال اور کاتبوں کا کال پڑا ہے۔ مصنف بیشمار ملیں گے لیکن کاتب آٹا میں نمک کے برابر ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہر مصنف کو تصنیف و تالیف سے پہلے کتابت سیکھنی چاہیئے۔ جب آپ کاتب سے

ملتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔ آپ بس اڈوانس دیجئے۔ کوئی مہینہ بھر میں کتابت ہوگی۔ پھر اس کے بعد مصنف گردش میں رہتا ہے۔ چونکہ کتاب مصنف کے لئے اولاد سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس لئے یہی مرشد بھی ہے اور مرید بھی اس لئے کاتب کا گھر اس کے لئے زیارت گاہ بن جاتا ہے لیکن کاتب کے گھر کا دروازہ آپ کبھی کھلا نہیں پائیں گے۔ آپ اُسے پکار پکار کر خجل ہو جائیں گلہ بیٹھ جائے لیکن دروازہ کھلنے کا نہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید وہ کام میں منہمک ہوگا۔ یہ بات نہیں۔ اصل میں اسے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے آستانے پر کونسا سوالی ___ مصنف ___ آیا ہے۔ اور وہ جلدی جلدی اسی کا مسوّدہ اور قلم کاغذ سامنے پھیلا کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر جب وہ دروازہ کھولتا ہے تو مصنف یہ دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے کہ اسی کا کام ہو رہا ہے۔ اگر کاتب نے سارے پیسے لئے ہوں تو یہ بجھا بجھا سا چہرہ بنا کر اپنی بیماری کا قصّہ چھیڑتا ہے۔ لیکن اگر نووار دانِ شوق میں سے کوئی آگیا ہو تو یہ خود کو بڑا ہی چاق و چوبند اور ہشاش بشاش ظاہر کرتا ہے۔ میں ایسے ہی ایک کاتب کے ہتھے چڑھ گیا۔ جو بے شمار کاموں میں گھرا ہوا تھا۔ ان ہی کاموں میں گھرے ایک دن مجھ سے کہتا ہے۔ میں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں۔ اور مسودہ سامنے رکھ دیا میں اسے بالکل نہیں پہچان رہا تھا ___ بھئی یہ میرا مسوّدہ نہیں ہے۔ میں پریشان ہو گیا وہ بڑی ہی لاپرواہی سے کہتا ہے ___ آپ لوگوں کو اپنا لکھا یاد ہی کب رہتا ہے ___ اور پھر آپ لوگ لکھتے بھی کیا ہیں کتنے ہی مسوّدے مجھے خود ہی درست کرنے پڑتے ہیں۔ اچھا اگر کچھ اُدھر کا اِدھر اور اِدھر کا اُدھر بھی ہو جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کتاب کا وزن ہی بڑھ جائے گا۔" بھلا بتائیے ایسے کاتب کو کوئی کیا بتائے۔ کیسے سمجھائے ___ آپ نے سُنا ہوگا۔ ایک دن حکیم نے کاتب کو نسخہ لکھنے کے لئے دیا۔ جب کاتب نسخہ لکھ کر لایا تو بڑے تمسخرانہ انداز سے بولا۔ آپ جیسے عالموں سے بھی جب غلطی ہو جائے تو ہم جاہلوں کا پوچھنا ہی کیا ___ حکیم شرمندہ ہو۔ سوچ رہا تھا کہ ہو نہ ہو کہیں غلطی ہوئی ہو۔ جب نسخہ ہاتھ میں پکڑا تو دیکھا "تخم لہسن کمی عدد" لکھا پایا۔ کاتب "لہسن" کی طرف اشارہ کر کے بولا ___ کیا یہ آج تک کسی نے "س" سے لکھا ہے؟ ___ حکیم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رہ گیا ___ بھئی یہ میں نے نسخے کے نیچے اپنا نام لکھا تھا ___ نجم الحسن عفی عنہ ___

یہ تو ابتدائی منزل ہے۔ جب کاتب کی دست درازیوں سے بچ نکلے تو پریس والوں کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ ان کی باتیں اتنی میٹھی ہوتی ہیں کہ کاتب کی ساری تلخی ختم ہو جاتی ہے لیکن ان کا رویہ بھی کاتب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اِن کے وعدے ہمارے لیڈروں [illegible] ہوتے ہیں۔ کبھی ان کی بجلی فیل ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کاریگر بیمار پڑتے ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ گاہک کا کیا سے کیا ہو جائے لیکن الزام ان کے سر نہیں آتا۔ کام خراب ہو جائے تو کاتب کے سر منڈھیں گے کہ ناقص سیاہی استعمال کی ہے۔ یا مسطر ٹھیک نہیں تھا۔ غرض ستیاناس کر کے یہ گاہک سے کہتے ہیں۔ دیکھئے جناب اگر آپ جلدی میں نہ ہوتے تو کتاب کیا شاندار چھپتی۔ آپ کی جلدی سے ہی کام خراب ہوا ___ اگر گاہک ذرا سا تگڑا ہو تو یہ موسم کو مورد الزام ٹھہرائیں۔ موسم پر نہ تو پریس والوں کا ہی بس ہے اور نہ کاتب کا۔ اس لئے بات مصنف کی قسمت پر ہی پہنچ کر دم لیتی ہے ___ اگر وہ خوش قسمت ہوتا تو کتاب کی کیوں [illegible] ساون میں کھو [illegible] گرمی زیادہ ہے اس لئے سیاہی بہت جلد کا [illegible]

ہو جاتی ہے۔ سرمایہ کہیں گے کہ مشین جام ہوجاتی ہے، سیاہی خشک نہیں ہوتی۔ وغیرہ۔ غرض جو کوئی بہانہ بنانا آئے بناتے ہیں۔ آخر تو یہ سارے ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں۔

لیکن اس سے آگے معاملہ اور بھی زیادہ گھمبیر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کتاب پڑھوانی سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کتاب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ مصنف کے دام تحریر میں لانے کے بعد یہ کوئی سات آٹھ برسوں میں چھپتا ہے اور کوئی دس سال اسے بیچنے میں لگتے ہیں۔ اور پھر برسوں بعد اسے پڑھنے والا ملتا ہے۔ جب تک مصنف کا خیال بدل گیا ہوتا ہے۔ اب کتب فروش کے پاس بیچنے چلا جائے۔ اس کا انٹرویو زیادہ ہی سخت اور باعث آزردگی ہوتا ہے وہ کاروباری انداز میں پوچھتا ہے۔ کتاب کیوں لکھی۔ اس پر کیا لاگت آئی۔ اس کا کیا فائدہ؟ اور پھر اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہے۔ بھئی پریس والوں نے آپ کو لوٹا ہے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں تین روپے کی کتاب کون خریدتا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ آپ چوتھی جماعت کی سائنس کا خلاصہ لکھتے۔ لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا اور ہمیں بھی۔ اور پھر کہتا ہے — خیر آپ کتابیں رکھیئے۔ سال دو سال بعد آکر دیکھئے کہ کوئی کتاب بک گئی ہو — اگر مصنف کا یہ پہلا تجربہ ہو تو وہ پھنستا ہے لیکن جو تجربہ کار ہو وہ بہتر ہی جانتا ہے کہ اسے ردّی میں ہی بیچ ڈالے —! ○

فرحت قمر (نئی دہلی)

"قصہ ایک سڑک ٹوٹنے کا"

ہماری بستی میں ایک سڑک تھی!
انجینئر صاحب کی ماہرانہ رائے کے مطابق
اس پر صرف ایک انچ بچھائی گئی تھی
اور وہ بھی جگہ جگہ صرف آدھا انچ پائی گئی تھی!
اب نہ جانے سڑک کمزور تھی
یا بستی والوں کے پاؤں بھاری تھے
سڑک کو بہت جلد، بلد کی بیماری ہوگئی!

راہگیروں کو چلنے میں واقعی دقت ہونے لگی
اور اس تکلیف دہ پہلو سے
کچھ نرم دلوں میں رقت ہونے لگی!
لوگ شکایتاً صرف ذکر کرتے
کچھ لوگ محض اس بات کی فکر کرتے
اکثر لوگ بس ذکر و فکر ہی کرتے ہیں نا؟

ایک صاحب نے کہا "کارپوریشن کو درخواست بھیجی جائے"
دوسرے نے کہا "ردی کی ٹوکری کے علاوہ اس کی قسمت؟"
دوسرے نے کہا "زونل انجینئر صاحب اعلیٰ منصوبہ بندی میں
مصروف ہیں" ان کو اتنی چھوٹی باتوں کے لیے فرصت
نہیں ـــــ!"
منفی، منفی مل کر حساب میں 'جمع' بن جاتے ہیں لیکن عملی زندگی میں
تو منفی اور منفی مل کر دوہری منفی بن جاتے ہیں!
اس لیے نہ کوئی درخواست گزری
نہ کوئی وفد ملا
اور سڑک ٹوٹتی رہی!
ایک سوشل ورکر نے ایک عام میٹنگ بلانی چاہی،
گھر گھر بلاوا دیا،
سیاست داں نے کہا:۔
"مجھے دیش کی ایکتا پر ایک میٹنگ میں جانا ہے"
دانشور صاحب بولے:۔
"اس دن سماجی پہلو دیہہ پر مجھے ایک سیمینار میں جانا ہے"
شری ش جی نے کہا:۔
"اس دن تو ایک دھارمک اتسو ہے"
شری د کو بیوی کے ساتھ دال بنانی تھی
اور مسٹر ب کو اپنے بال رنگنے تھے
جلسہ ہوا ـــــ مگر
چالیس ہزار کی بستی سے صرف چالیس لوگ آئے اس سے
ثابت ہوا ہم ہزاروں میں ایک تھے!

ایک تجویز آئی "الکشن کے بعد یہ مسئلہ اٹھایا جائے"
ایک مشورہ ملا "چندہ کرکے خود سڑک ٹھیک کرالی جائے"
ایک صاحب سوٹ پہنے، سگار پیئے ہوئے گرجے:۔
"اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چل کر
اس بستی کے عوام کی طاقت کے بل پر
سرخ سویرا لائیے
سارے ملک کی سڑکیں ٹھیک ہو جائیں گی"
ایک شیروانی بولی:۔
"پہلے ہم ایک نئے نظام کی راہ ہموار کریں
یہ راہ بھی ہموار ہو جائے گی"
اس پُرجوش تجویز سے مجھے میں گرمی آئی
لیکن ایک "اندیشہ ہائے دور دراز" قسم کے شخص نے بغاوت

اور جیل کا ذکر کر کے جوش ٹھنڈا کر دیا!

بہرحال ــــ عقل و جہل، علم و فضل،
جوش و ہوش، دیدہ و گوش
سبھی گڈمڈ ہو گئے ــــ اور
جلسہ بہ خواست ہو گیا!

اُدھر سڑک میں گڑھے بڑھے
اور ایک دن میں نے دیکھا
ایک دانشور اور ایک مزدور
یعنی ایک نمائندہ خواص اور ایک نمائندۂ جمہور
سڑک کے ایک ہی گڑھے میں گرے پڑے تھے!

میں نے سوچا
صحیح معنوں میں مساوات لانے کے لیے
سڑکوں کا ٹوٹنا ضروری ہے!

وجاہت علی سندیلوی

موسمِ تیغ و تبر آیا ہے پھر، ہم بھی آئے سر کا نذرانہ لیے

["شگوفہ" کا ہندوستانی مزاح نمبر گذشتہ جمعہ کو ملا۔ آپ کی محبت اور یادآوری کے لیے میرے پاس شکریے کے الفاظ نہیں۔ نامساعد حالات میں یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہوسکتا تھا پھر بھی آپ اور برادرم یوسف ناظم صاحب اور دیگر رفقا لائق تحسین اور مبارک باد ہیں۔ آندھی میں تم چراغ جلائے ہوئے تو ہو ___ بعض نقادوں نے بغض للہی میں موجودہ مزاح نگاروں کے خلاف بڑی دل شکن اور حقیقت کے خلاف باتیں کہی ہیں۔ یہ لوگ مزاح کی حالیہ تخلیقات سے بے خبر، کچھ پرانی گھسی پٹی باتیں ہی دہرائے جاتے ہیں۔ تعریف میں یہ بڑا بخل کرتے ہیں اور جگہ جگہ خود اپنی کم علمی کی وجہ سے بہت ہلکے ہیں لہٰذا سمجھتے ہیں کہ اگر کسی کیلئے کوئی کلمۂ خیر کو کہدیا تو اپنا وزن اور بھی گھٹ جائیگا۔ رشید حسن خاں صاحب نے شگوفے کیلئے (۳۵۲) پر جو لکھا ہے وہ تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ کچھ کس قدر تحقیر آمیز ہے ع شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور ___ و ع س]

شگوفہ، کا ہندوستانی مزاح نمبر دیکھا۔ اس کے متعلق مصطفےٰ کمال صاحب اور یوسف ناظم صاحب کی کاوشوں اور دیدہ ریزیوں کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ یہ آلو کا بھرتا، خوش ذائقہ، مزیدار اور بڑا اشتہا انگیز ہے لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ ہے آلو کا بھرتا ہی۔ مرغ مسلم، شاہی قورمہ، بریانی نہیں ہے ___ واقعی اعتراض کرنا کتنا آسان ہے۔ جو ماں بچہ جنتی ہے وہی بے چاری تخلیق کی صعوبتیں جانتی ہے۔ تماشائیوں کو یہ کہتے کیا دیر لگتی ہے کہ بچے کی ناک چپٹی، دہانہ بڑا یا رنگ ذرا دھیما ہے۔ میرے خیال میں خواہ مخواہی کے معترضین کو خاموش کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ ان کو دعوت دی جائے کہ

ع " دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

آپ کو ہمارا نمبر پسند نہیں، تو آپ کا ہاتھ کون پکڑے ہے، آپ اس سے جامع اور بہتر نمبر نکال دیجئے۔ "اللہ اللہ خیر صلا"۔ امید تو یہی ہے کہ معترضین نمبر نکالتے دیکھے جانے کے بجائے بغلیں بجاتے نظر آئیں گے۔

موجودہ دور کے اردو ادب کے طنز و مزاح کے متعلق ہمارے بعض بہت معتبر اور موقر نقادوں نے، ہندوستانی مزاح نمبر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جو پُر خلوص مشورے دیئے ہیں اُن پر ہمارے مزاح نگاروں کو چاہیئے کہ نہ صرف اپنے (دوسروں کے نہیں) گریبانوں میں سر ڈالیں بلکہ سنجیدگی سے غور و فکر بھی کریں۔ اُن سے کچھ سیکھیں، سمجھیں اور کچھ نہیں تو عبرت ہی پکڑیں۔ اسی سلسلے میں اپنے مزاح نگار دوستوں اور ساتھیوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ صرف باتیں کیوں اور جم کر بحث کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ باتوں میں صرف اپنے ذاتی تاثرات بیان کئے جاتے ہیں، ہر بات کے متعلق فوراً جیب سے نکال کر سند یا دلیل پیش کرنا ضروری نہیں ہوتا، اور ان کے دوران اپنی نالائقی اور کم علمی کو چھپانے کی زیادہ گنجائش رہتی ہے۔ بحث میں بقراط بننا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر غیر ملکی مفکرین کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔ مقولے بیان کرنا پڑتے ہیں۔ بات بات پر حریف کی زبان پکڑنا پڑتی ہے اور کسی کو جنت یا جہنم بھیج دینے کا دو ٹوک فیصلہ بھی صادر کر دینا پڑتا ہے۔ باتیں دوستوں سے اور بحثیں حریفوں سے کی جاتی ہیں اگرچہ بدقسمتی سے

دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ اب باتوں کے دوران بحثیں اور بحثوں کے دوران باتیں ہوتی ہیں — بہرکیف میں خلوص نیت سے صرف باتیں ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلی ستم ظریفی جو اردو ادب کے طنز و مزاح کے ساتھ کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اُسے زبردستی ایک جداگانہ صنف ادب قرار دے دیا گیا اور خواہ مخواہ ہی ~ خشت اول چوں نہد معمار کج :: تا ثریا می رود دیوار کج — والا مضمون پیدا ہوگیا ہے۔ خواہ طنز ہو یا مزاح کسی ادب پارے کی خصوصیت یا تاثیر ہو سکتی ہے اُس کی قسم یا ذات نہیں۔ طنز و مزاح تو ایک اسلوب نگارش، ایک زاویۂ فکر اور ایک انداز بیان ہے اور بس۔ اس ایک غلط قدر کو قائم کر دینے سے بیچارے نوآموز مزاح نگار کو یہ نقصان پہنچا کہ وہ جب کوئی نئی چیز لکھنے بیٹھتا ہے تو کچھ اس طرح کی نیت کرتا ہے "نیت کرتا ہوں میں لکھنے مزاح کی — مزاح کے سوا کچھ نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جان بوجھ کر کوئی سنجیدہ یا غیر مزاحیہ بات میں اپنے قلم سے ہرگز نہیں نکلنے دوں گا۔ مسکراہٹیں اور قہقہے میری مدد کریں۔ منہ میرا پیچھے مسٹر پطرس بخاری یا مولانا رشید احمد صدیقی کے۔"

اپنے اوپر یہ 'یک رنگی' طاری کر لینے سے تخلیق کار ضرورت سے زیادہ مزاح تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مزاح کی یہ کثرت اکثر بیشتر حسرت بلکہ عبرت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ مزاح بادل کی طرح گھر کر نہیں آتا وہ صرف کوندے کی طرح لپکتا ہے۔ وہ غلّے کے مانند سیروں اور منوں میں نہیں تولا جاتا بلکہ سچے موتیوں کی طرح رتی اور ماشوں سے وزن کیا جاتا ہے۔ مزاح کی زیادتی یقیناً آورد کا نمونہ ہوتی ہے۔ مزاح نگار کے لیے جہاں بیان کی قدرت، مشاہدے کی باریکی، بصیرت کی تازگی، عصری حسیت کی تہہ داری، انسان دوستی وغیرہ وغیرہ ضروری ہیں وہاں یہ شعور تناسب کہ مزاح کب تک مزاح رہتا ہے اور کب مسخرا پن بن جاتا ہے۔ ازبس ضروری ہے کیوں کہ دوسرے عناصر کو پیش کرنے کی یہ چھلنی ثابت ہوتی ہے۔

ذرا سی بات کہ میٹھے چاولوں میں گڑ کو چاولوں ہی کی مناسبت سے ڈالنا چاہیئے، خواہ مخواہ طویل ہوتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بس ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ایک صاحب نے چار مضحک کرداروں پر ایک کہانی لکھی۔ ان کرداروں نے ایک سے بڑھ کر ایک حماقتیں کی تھیں۔ ایک قاری کہانی پڑھنے کے دوران بالکل سنجیدہ رہا لیکن اس کو ختم کرکے وہ خوب ہنسا۔ پوچھا گیا کہ چاروں مسخرے کرداروں میں سے کس پر ہنس رہے ہو۔ بولا "پانچویں بد کردار پر — جس نے ایسی کہانی لکھی ہے"۔

بدقسمتی سے خود میرا شمار مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اس غلطی میں ہرگز مُبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ دوسروں کی آنکھوں کے تنکے کی نشان دہی کرتے وقت میں اپنی آنکھ کا شہتیر نکال چکا ہوں۔ حتی الوسع دوسروں کو نیک ہدایت کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ وہ مجھ سے عبرت کہ "خود را فضیحت دیگراں را نصیحت" تو ہر وقت حاصل ہی کر سکتے ہیں۔ اس کی عام اجازت ہے۔

شعور تناسب یا حسن تناسب کی بات ہے تو کہتا چلوں اس سلسلے میں ابن انشاء اور پطرس کا کوئی جواب نہیں۔ وہ کبھی زبردستی ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اکثر تو یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ ایک طرح سے ہنسنے سے روک رہے ہیں لیکن آپ خود ہنسنے پر مجبور ہوئے جا رہے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی یقیناً نہ صرف اس دور کے بلکہ میری نظر میں اب تک کے اردو ادب کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں اور ان کی اس جگہ کے لیے اگر کوئی حریف ہو سکتا ہے تو صرف ابن انشاء لیکن جیسے کہا گیا کہ "ہومر بھی کبھی اونگھنے لگتا ہے" ایسے ہی یوسفی بھی اکثر اپنے بیان کی لطافت کے بہاؤ میں پھول اور پتیوں پر بھی بیل بوٹے بناتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ کرنل محمد خاں بڑے تابناک اور سجیلے مزاح نگار ہیں لیکن اُنہوں نے اب چاول پر قل ہو اللہ لکھنا یعنی جہاں پر مزاح کی کوئی گنجائش نہ ہو وہاں بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرنا اپنا کچھ معمول سا بنا لیا ہے۔ اس کوشش میں کبھی تو گوہر آبدار اُن کے ہاتھ آجاتا ہے

اور کبھی کرنل کے بجائے وہ لفٹننٹ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں کوئی نقاد تو ہوں نہیں جو یہ سمجھوں کہ اگر کسی کی تعریف کر دوں گا تو لوگ مجھے ہلکا سمجھنے لگیں گے لہٰذا دوست نوازی کے الزام کی آوازوں کے درمیان یہ کہنے میں باک نہیں رکھتا کہ اپنے دیسی یعنی ہندوستانی مجتبیٰ حسین کی طرف سے بھی بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ؎ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد۔ مجتبیٰ افراط و تفریط سے نہ صرف گریز کرتے ہیں بلکہ سیدھی بات کو ایسے پُر لطف سیدھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اُن کے خلوص نیت پر شبہ کرنے اور انہیں صفِ اول کا مزاح نگار نہ تسلیم کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ وہ ہنسانے سے زیادہ گدگداتے ہیں اور بعض لطیف مزاجوں کو اِس قسم کا مزاح سب سے زیادہ دل نشین معلوم ہوتا ہے۔

معاف کیا جاؤں تو عرض کردوں کہ مجھے ہندوستانی مزاح نمبر کا سوال نامہ کچھ حاجی بغلول کے خواب پریشاں قسم کی چیز لگا۔ ہمارے ایک دوست نے اُسے کسی بگڑے دل آزاد امیدوار کا الکشن مینی فسٹو کہا تو ہم اس کی بھی تردید نہیں کرسکے۔

اب پہلے ہی سوال کو لیجئے۔ آپ کی رائے میں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد کے دور میں ہندوستان میں طنز و مزاح کی کیا کیفیت رہی ہے۔ حسبِ حال۔ مائل بہ زوال۔ رو بہ کمال۔؟

غالباً سوال میں ہندوستان کے آئین میں درج پوری پندرہ زبانوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اپنی کم علمی سے میں اسے صرف اردو ادب تک محدود رکھنے پر مجبور ہوں۔

پطرس نے تیسری دہائی میں مزاح نگاری ختم کردی تھی۔ رشید احمد صدیقی صاحب ساتویں دہائی تک لکھتے رہے۔ ان دونوں کے بیچ چالیس سال کا وقفہ تھا۔ اس طویل درمیانی زمانے کا کیا کیا جائے۔ اب تک نو مینس لینڈ NO MAN'S LAND کی بابت سنا تھا یہ نو ہسٹری پیریڈ NO HISTORY PERIOD آج سن رہا ہوں ـــ لیکن خیر ان لفظی تکلفات کو چھوڑیئے، سوال کا غالباً مطلب صرف اس قدر ہے کہ پطرس اور رشید احمد صدیقی کے نہ رہنے کے بعد اردو کے نثری مزاحیہ ادب نے ترقی کی یا نہیں؟ اب یہاں پر ایک لمبی بحث "تاریخ میں افراد" کے کردار پر ہوسکتی ہے۔ سوال زیر بحث میں صرف پطرس اور رشید احمد صدیقی کے اسمائے گرامی کیوں لیے گئے؟ یقیناً یہ دو حضرات اپنے دور کا احاطہ نہیں کیے ہوئے تھے۔ یہ دونوں بڑے اور بہت بڑے تھے لیکن بلا شبہ اپنا زمانہ صرف یہی لوگ نہیں تھے۔ انہیں کے وقت میں فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، مضحک دہلوی، فلک پیما، ملا نشتر (نانی عشو کے خالق)، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج (چچا چھکن کے مصنف)، فضل حق قریشی، تمکین کاظمی وغیرہ وغیرہ بہت سے لوگ اور تھے ـــ اور صرف تھے نہیں بلکہ مزاح اور طنز کے علیحدہ علیحدہ اسلوب اور انداز کے علمبردار بھی تھے۔ دو نام لے کر باقی سب پر جھاڑو پھیر دینا نہ انصاف کا تقاضا ہے نہ اس میں مزاح کا کوئی نکتہ مضمر ہے۔ مجھے آپ دقیانوس کہہ لیجئے لیکن میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے مزاحیہ ادب میں خواجہ حسن نظامی صاحب کے (جو باقاعدہ مزاح نگار بھی نہیں تھے) مزاحیہ خطوط اور فکاہیہ نگارشات کی بھی گنجائش نکالی جانی چاہیئے کیوں کہ وہ اپنے طرزِ بیان کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اور ایک اُن پر کیا! ایسے ایسے بہت سے گوہر آبدار ہیں جن کو یا تو ہم پرکھ نہیں پائے یا محض اپنی تنگ دامانی یا سہل انگاری سے نظر انداز کرتے چلے آئے ہیں ـــ سوال میں دو ناموں کی قید کے بجائے کسی زمانے یا اُن ہی کے زمانے کا تعین ہونا چاہیئے تھا۔

خیر چھوڑیئے اس داستان کو۔ اگر کسی کو صرف پطرس اور رشید احمد صدیقی ہی پسند ہیں تو یہی سہی۔ مجھے بھی یہ دونوں بہت زیادہ پسند ہیں لیکن وائے بر حال ما اگر ہم ان ہی دونوں کو اپنا آئیڈیل مان کر انہیں فیتے کی طرح استعمال کریں اور انہیں سے دوسروں کے قد ناپنے لگیں۔

پطرس کے گیارہ مضامین میں سے کم از کم تین تو براہ راست انگریزی سے لیے گئے ہیں (لیکن اُن کو اس طور سے اردو میں منتقل
فوش جادواں : اہنیا، پطرس ہی کا کام تھا) دو تین قدر اول کی چیزیں نہیں ہیں۔ باقی میں اُنہوں نے بیشتر ایک کھلنڈرے
سٹی کے طالب علم یا ایک خوش باش رئیس نادے کے مزاحیہ تجربے اور واقعات بیان کیے ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اچھا
اچھا لکھا ہے۔ لاہور کا جغرافیہ تو ایسا لکھ دیا ہے کہ اس کو جتنی بار پڑھیے اُتنا ہی لُطف بڑھتا جائے گا اور اس مضمون کا صرف یہ
"جہاں بجلی، پانی، بھاپ کا بڑا ہسپتال، لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں" تنقید کی بہت سی کتابوں پر بھاری ہے ۔ لیکن
سب کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ وہ محدود اور بہت محدود تھے۔ اُن کے متعلق ظ انصاری صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے "اتنے
عالم اور مرد دانا صرف چند شوخ مضامین پر قناعت کر کے اتنا بڑا نام کمانے والے وہ تنہا اہلِ قلم ہیں۔ اُن کی شخصیت بڑی نہ ہوتی
نے تھوڑے سے کام پر اتنا بڑا نام نہ پاتے۔" میں پطرس کی ٹانگ نہیں گھسیٹنا چاہتا، اور گھسیٹ بھی کیسے سکتا ہوں جب کہ جہاں
ٹانگ ہے وہاں تک کسی سیڑھی پر چڑھ کر بھی میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا البتہ یہ ضرور عرض کروں گا انھیں سنگ میل ضرور بنائیے لیکن
منزل نہ سمجھ بیٹھیے۔

کم و بیش یہی رشید احمد صدیقی کے لیے عرض کروں گا۔ ادب کی تاریخ میں اُن کا مقام بہت اُونچا ہے لیکن وہ پہلے انشا پرداز تھے
بعد میں طنز اور مزاح نگار۔ علی گڑھ سے باہر انھوں نے مشکل ہی سے قدم اُٹھایا۔ وہ زمانے کے مسائل سے اس شدت اور تلخی کے ساتھ
دوچار نہیں تھے جیسے کہ ہم لوگ اس زمانے میں ہیں۔ پہلے ہی اُنھوں نے ریڈیو کی فرمائش پر "اگر میں چور ہوتا" یا "اگر میں فاونٹین پن ہوتا"
کے مضامین لکھے ہوں لیکن عام طور سے وہ خواص کے لیے مضامین لکھتے رہے چاہے وہ ارہر کا کھیت ہو یا "گواہ" یا "مرشد"۔ زبان اور
بلکہ حسنِ بیان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی لیکن اُن کے موضوعات میں وہ ہمہ رنگی اور بوقلمونی نہیں تھی جو ہمہ وقت
رواں دواں زندگی کے تقاضے ہیں۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ غضب کی تھی لیکن بس۔ ؎ ایک چھیڑ ہے مُراد اس سے امتحاں نہیں۔ پطرس
نے اُنھوں نے بڑی پیاری بات کہی ہے "وہ سر ہو جائیں یا جیل چلے جائیں تو غالباً وہ صحیح اردو لکھنے لگیں گے۔" یقیناً مزاح کی جان
بیان، رمز و کنایہ، اشاریت اور طرزِ ادا ہے ۔ لیکن سب کچھ یہی نہیں ہے۔ ؎ ماورائے سخن بھی ہے اک بات ۔ اردو کے ہر
نگار کے لیے مزاح نگاری یا اپنا قص مذبوحی شروع کرنے سے پہلے رشید احمد صدیقی کو پڑھنا لازمی قرار دے دیجیے لیکن خدا
ان ایک معلم ہی رہنے دیجیے۔ اُن کا بُت تراش کر ادب کے سومنات میں نہ رکھیے۔ یہ خود اُن کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔ کم سے کم میں
ساتھ یہ رویہ ترا شیدیم، پرستیدیم، شکستیم برداشت نہیں کر سکتا۔

پطرس اور رشید احمد صدیقی کے بعد سے (ہم خواہ کوئی بھی زمانہ لیں) ہندوستان میں اردو کا نثری مزاحیہ ادب آگے ہی بڑھا
پیچھے نہیں ہٹا ہے اور کسی حیثیت سے اسے روبہ زوال نہیں کہا جا سکتا۔ کمال اور زوال کی تاریخی اقدار سمجھنے میں بہت کچھ اپنی ذہنی
اور شعور کا بھی دخل ہوتا ہے ۔ ہم ظلمتوں میں نورِ سحر دیکھتے رہے، نورِ سحر کی ظلمتیں تیری نظر میں تھیں۔

کیا یہ لحاظ آفاقیت اور عصری حسیت اور کیا بہ لحاظ ہمہ جہتی اور وسعت اور کیا بہ لحاظ موضوعات اور اصناف ہم کسی طرح
بھی اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو ارتقا اور ترقی سے گریزاں ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ مجھے تو اس میں سے ایسی جہتیں
اور نمایاں ہوتی دکھائی دے رہی ہیں جو اکثر طرب کی حدوں کو پار کر کے کرب کو چھو لیتی ہیں۔ زمانے کے پیچ و خم اور وقت کے
سے ہمارے بیشتر مزاح نگار آگاہ اور آشنا ہیں۔ سیاسی شعبدہ بازیاں، نیتاؤں کی قلابازیاں، رشوت، چور بازاری،
رشتہ ناشی، خود غرضی اور مکاری کی بیماریوں اور سیاسی، سماجی اور ادبی اجارہ داریوں کو ہدف بنا کر جیسا اب لکھا جا رہا ہے

یقیناً اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ آپ چاہیں تو کہہ لیں کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود میں بلا کسی جھجک کے کہوں گا کہ مجھے تو اردو ادب میں (اگر یہ خود ہندوستان میں باقی رہا) طنز و مزاح کا مستقبل شاندار اور تابناک ہی نظر آتا ہے۔ ـــــ کسی کے لقمہ دیے بغیر میں خود تسلیم کرلوں گا کہ ہر چیز جو لکھی جارہی ہے وہ قدر اول کی نہیں، بسیار نویسی کی وجہ سے اکثر مزاح میں پھکڑ پن شریک غالب ہوگیا ہے، اعلیٰ ادبی انشاپردازی کا اکثر کیا بیشتر فقدان دیکھا گیا ہے۔ بہت سے مضامین نوک پلک سے درست نہیں ہوتے اور ان میں حسن تناسب کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے، بہت سے نقوش خون جگر کے پیاسے نظر آتے ہیں، کچھ لکھنے والے کاتا اور لے دوڑی، کے قائل ہیں اور اور اپنے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کرنا کسر شان سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود اچھی، دلکش اور غور و فکر کو دعوت دینے والی اور پائندہ رہنے والی چیزیں بھی تخلیق کی جارہی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ہمارا یہ قافلہ نہ پیچھے جارہا ہے نہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے بلکہ آگے ہی بڑھ رہا ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ قافلہ اتنی تیزی سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے جتنی کہ آپ کو اس سے توقع تھی لیکن یہ کہنا صرف ایک دل شکن بلکہ حقیقت کے خلاف بات ہوگی کہ یہ پورا قافلہ منزل کی طرف سے منہ موڑے اور پیر توڑے صرف اپنے خلاف لکھی ہوئی تنقیص پڑھ رہا ہے۔ ؎

زندگی ہر رنگ میں دیکھی جوان و کامراں　　　پھول کملایا کیے، تازہ رہیں کھلتے رہے

انگریزی کو چھوڑ کر کیوں کہ اس کے رشتے بین اقوامی ہیں، ہندوستان کی دوسری سب زبانوں کے مزاحیہ ادب میں (میں نے صرف ترجمے پڑھے ہیں) اردو کے مزاحیہ ادب کا پلہ بھاری ہے۔ یہ کسی عمل یا تعویذ یا دعا کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ جنبش قلم ہی کی کرامت ہوسکتی ہے۔

بلا شبہ پطرس اور رشید احمد صدیقی جیسی قدآور اور یگانۂ روزگار ہستیاں روز روز نہیں پیدا ہوتیں لیکن اس سے اردو کے مزاحیہ ادب کی صحت پر کوئی مضر اثر نہیں پڑ سکتا۔ دوسرا غالب اب یقیناً نہیں پیدا ہوگا لیکن وہ اقبال، جوش اور فیض کو پیدا ہونے سے روک بھی نہیں سکتا۔ اگر میں کسی انگریزی ادیب کے واقف کار انگریز سے کہوں کہ شیکسپیر انگریزی ادب کی سب سے گراں قدر شخصیت سترھویں صدی میں بھی تھی، بیسویں صدی میں بھی ہے اور شاید اکیسویں صدی میں بھی ہو لہٰذا اس کے کھلے ہوئے یہ معنی ہیں کہ انگریزی ادب ساکت، جامد اور مردہ ہوچکا ہے اور شیکسپیر کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف حرف غلط یا دوسرے درجے کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ وہ (ہاتھوں کو چھوڑ دیئے) منہ سے کیا جواب دے گا؟ ـــــ غالباً یہی کہ میں اپنے ملک کا سب سے بڑا مزاح نگار ہوں۔ ادب کی تول اور پرکھ میں محض شخصیتوں پر انحصار نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ اکثر بہت گمراہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ پھر شخصیتیں بھی تو بند بوتلوں کی طرح نہیں ہوا کرتیں جن پر اپنے من پسند لیبل لگائے جاسکیں۔ ان کی مثال درختوں سے دی جاسکتی ہے جس کی ہر کونپل ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور جس کی شاخیں مختلف انداز سے مختلف سمتوں کو پھیلتی ہیں ـــــ خیر یہ ایک طویل داستان ہے اس میں کیا پڑوں۔ تھوڑے ہی لکھے کو بہت جانیے۔

آپ چاہے اسے چھوٹا منہ بڑی بات کہہ لیجیے لیکن میں ایک ایسی بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو بہ ظاہر ایک عجیب سی بات معلوم ہوگی لیکن ہے وہ حقیقت پر مبنی۔ اردو کے طنز و مزاح کے متعلق سب سے کمزور ترین روایت پرست اور گھٹیا ادب اس کی تنقید ہے۔ اس سلسلے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی طرف نہیں ہے جو دانند و بدانند کہ دانند کی تعریف میں آتے ہیں بلکہ ان لوگوں کی طرف ہے (اور جن کی تعداد بہت کثیر ہے) جو ندانند و بداند کہ دانند کے زمرے میں شامل ہیں۔ جیسے کسی زمانے میں بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا اسی طرح آج کے زمانے میں اکثر بگڑے ادیب اور شاعر نقاد بن بیٹھتے ہیں اور کسی موضوع یا مضمون کے متعلق اچھی یا

کم سے کم کلام جیلاؤ واقفیت کے بغیر اُس کے متعلق دو ٹوک فیصلے بلکہ فتوے صادر کرنے لگتے ہیں۔

نکاح کی طرح مزاح میں بھی ایجاب و قبول کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح پیش کرنے والے اور اس کے مخاطب کے درمیان۔ اگر ان دونوں کے بیچ مزاح کے شعور، معیار یا سطح کے متعلق تال میل نہیں ہے تو بات نہیں بنتی۔ اس سلسلے میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ اپنے اوپر بیتے ہوئے صرف دو واقعات بیان کرنے سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔ میرے ایک عزیز جو ایک کالج کے پرنسپل تھے بہت بحث مباحثے کے بعد بھی غالب کے اس شعر کے متعلق اپنی اس رائے پر قائم رہے کہ واعظ میخانے میں وعظ کہنے جارہا تھا، شعر میں کوئی بات نہیں ہے اور غالب نے خواہ مخواہ ہی اس کو کہا ہے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ ؛ پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے !!

اسی طرح طالب علمی کے زمانے میں میرے ایک ایسے دوست تھے جو کبھی کسی بات پر ہنستے ہی نہ تھے چنانچہ ان کا نام 'میاں غمگین' رکھ دیا گیا تھا۔ ایک روز ان کے ساتھ میں اور کچھ دوسرے دوست ٹیلر پارک ٹہلنے گئے۔ دفعتاً میاں غمگین پر قہقہوں کا دورہ پڑا، اتنا شدید کہ وہ دہرے ہوئے جا رہے تھے، منہ سے بول نہیں پھوٹ رہے تھے لیکن قہقہوں پر قہقہے لگائے چلے جاتے۔ ہم لوگ واقعی پریشان ہو گئے تھے کہ یہ کسی بہت شدید بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کافی دیر کے بعد میاں غمگین نے پارک میں سر ہارٹ کورٹ ٹیلر سابق گورنر یوپی کے لگے ہوئے اسٹیچو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "ٹیلر کے گھوڑے کی تین ہی ٹانگیں!" اور پھر اپنے قہقہوں میں ڈوب گئے۔ اسٹیچو میں گھوڑے کو چلتا ہوا دکھانے کی کوشش میں اس کی ایک ٹانگ اٹھی ہوئی تھی۔

کہنے کا مطلب یہ کہ مزاح کے متعلق تبصرہ کرنے کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں بلکہ صرف اس شخص کو پہنچتا ہے جس کا شعورِ مزاح نہ صرف فطری بلکہ پختہ اور تربیت یافتہ بھی ہو۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی کے اس دور میں، یہ سعادت طنز و مزاح پر تبصرہ کرنے والوں میں سے کتنوں کے حصے میں آئی ہے؟ ہے ادب شرط لبس منہ نہ کھلوائیے۔ صرف طنز و مزاح کی تعریف اور چند مزاح نگاروں کی سابقہ مضامین میں درج فہرست کو یاد کر لینے سے کوئی طنز و مزاح پر قلم اٹھانے کا اہل نہیں بن جاتا۔ بہتوں کے چہرے اس آئینہ خانے میں ٹیڑھے نظر آ چکے ہیں۔ لیکن 'چرا توبہ فرمایاں توبہ کم تر می کنند' کی یہ داستان پھر کبھی۔

طنز و مزاح کے بیسیوں اسلوب، انداز اور اقسام ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے بہت سے نقادوں نے اپنے سینکڑوں مضامین میں کہیں ان کی نشان دہی اور تجزیہ کیا ہے۔ یہ ذرا محنت اور دیدہ ریزی کا کام ہے لہٰذا اسے آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دینا ہی زیادہ مناسب ہے۔ رتن ناتھ سرشار، ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی اور یوسف ناظم کیا مزاح نگاروں کی ایک ہی تعریف میں آتے ہیں؟ اگر کوئی اپنے آپ کو ماہر انبہ کہے لیکن آموں کے ڈھیر میں سے دسہری، چونسہ، رٹول، خاص الخاص، انگین، اور برما کے سرخے وغیرہ کی نشان دہی نہ کر پائے تو کیا آپ اس کی مہارت کے قائل ہو جائیں گے؟

انگریزی طنز و مزاح کے متعلق مقولے اور خیالات یاد کر لینا اور پھر اُن کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی بھٹی پر چڑھائے بغیر حقیقت مسلمہ مان لینا ہمارے بہت سے خود ساختہ نقادوں نے اپنی عادت سی بنا لی ہے یوں تو یہ مقولے اور خیالات کچھ ایسے غلط بھی نہیں ہوتے لیکن بلا استثنا ان کا استعمال لکیر کے فقیر کی تعریف میں آ جاتا ہے۔ اُن کو صحیح طور سے ان کے سیاق و سباق میں سمجھنا بھی لازم دارد ہوتا ہے۔ اکثر علماء اپنی ہی پیش کی ہوئی نظیر سے مقصد موہار بھی جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا گیا ہے کہ معنی واقعات سے پیدا کیا ہوا مزاح مقابلتاً اونچے درجے کا نہیں ہوتا۔ اب خود اس مقولے کے بموجب بھی اس کا اطلاق مزاحیہ افسانے پر نہیں ہوتا۔ انگریزی ادب میں مزاحیہ ڈرامے اور افسانے کا مقام بہت اونچا ہے بلکہ اس کا تقریباً نوے فی صدی مزاحیہ ادب اسی

پر منحصر ہے مارک ٹوین، لی کاک، وُڈ ہاؤس، پریسٹلے وغیرہ وغیرہ سب انسانوی ادب ہی سے متعلق تھے۔ یہ مقولہ وہاں بھی منطبق نہیں ہوتا جہاں واقعات کا تذکرہ لطف بیان پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ اُسی کا ایک حصّہ بطور جزو لاینفک بن جاتا ہے ـــــ لیکن جی نہیں، ہمارے بہت سے تنقید نگار بڑی ذہانت اور ندرت سے تراشے ہوئے مزاحیہ افسانوں کے متعلق اکثر یہی کہتے رہتے ہیں کہ چونکہ اس کے تانے بانے میں واقعات ہیں لہٰذا یہ اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔

عظیم بیگ چغتائی غالباً اردو ادب کے پہلا مزاحیہ افسانہ نگار تھے۔ ان کے کردار اور پلاٹ تراش خراش سے ندرت ذہانت کا نمونہ اور اُن کے مکالمے بڑے برجستہ اور دلنشین ہوتے۔ وہ انگریزی میں لکھتے تو اُن کا پلّا انگریزی کے نامور مزاحیہ افسانہ نگاروں سے کم نہ ہوتا ـــ لیکن اُن غریب کو نہ کوئی حالی ملا نہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ـــ اب ان کے انتقال کے چالیس سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد انہیں پڑھنے کی زحمت کون گوارا کرے ـــــ ہندوستانی مزاح نمبر کی فہرست کتب میں جو غالباً مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی آزاد لائبریری کی فہرست سے تیار کی گئی ہے ان کی صرف ایک کتاب درج ہے (حالاں کہ قدوائی لائبریری سندیلہ میں ان کی پچیس سے زیادہ کتابیں موجود ہیں) ـــ اُن کی بہت سی کتابوں کے چھ چھ سات سات ایڈیشن بھی شائع ہوئے تھے لیکن آج بازار میں انکی ایک کتاب کا بھی پتا نہیں ـــ قبول عام کا اندازہ تو شاید اسی سے لگایا جا سکتا ہے لیکن آج ہمارے مزاحیہ ادب کی تاریخ میں عظیم بیگ چغتائی کا نام اور مقام کہاں ہے؟ ان کے افسانوں وغیرہ پر آج تک کوئی قابل لحاظ اعتراض بھی نہیں کیا گیا۔ ان کی ہزاروں صفحات پر مشتمل تصنیفات کی ورق گردانی سے کہیں زیادہ آسان اُن پر بسیار نویسی کا الزام لگا دینا تھا۔ اور پھر اسی بسیار نویسی کے ڈنڈے سے ان کی گردن داب کر انہیں ٹاٹ باہر کر دیا گیا۔

کم و بیش یہی برتاؤ شوکت تھانوی کے ساتھ کیا گیا۔ بسیار نویسی کے سنگین جرم میں اُنھیں بھی شہر مزاح سے بے دخل کر دیا گیا اور اب وہ اسٹیشن پر کھڑی اپنی سودیشی ریل کے ایک ڈبّے سے صرف جھانکتے نظر آتے ہیں۔ شوکت تھانوی جیسا فطری بیباختہ اور حاضر دماغ مزاحیہ افسانہ، ناول، ڈرامہ، انشا، خطوط، پیروڈی نگار مشکل ہی سے ڈھونڈھے ملے گا۔ وہ اپنے انداز بیان کی شوخی اور ظرافت سے ایک لہے کی چھڑ کو بھی شاخ گلفشاں بنا سکتے اور آپ کو بڑی تلاش کے باوجود ان کے اس مضمون میں آورد یا بھرتی کا ایک جملہ بھی نہیں ملتا۔ شوکت تھانوی کی خامی اُن کے علم کی کمی، ان کی حکومت وقت کی جی حضوری اور بنیادی عصری تقاضوں سے بیگانگی تھی ـــ لیکن کسی پھول کے گرد کانٹوں کی موجودگی سے آپ اس کے حسن اور خوشبو کو کیوں نظر انداز کر دیجئے بہتر کو کم تر میں کیوں غرق کر دیجئے کم تر سے بہتر کو نکالنے کی کوشش کیوں نہ کیجئے۔

اعتراض کرنے والے کی خبیث مسکراہٹ کے ساتھ نہیں بلکہ ہمدردی کرنے والے کی دردمندی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ طنز و مزاح پر تنقید کرنے والوں اور رائے دینے والوں میں سے بیشتر کا خود اپنا بنیادی مطالعہ بہت ہی سرسری نامکمل اور صد درجہ محدود ہوتا ہے۔ لائبریری کون جائے، کتابیں خرید کر پڑھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، مختلف رسالوں میں مزاحیہ نگارشات کو کون تلاش کرتا پھرے، غور و فکر کر کے اپنی کوئی بے لاگ رائے قائم کرنے میں جس لگن اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے اسکا مقدور نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ لکھنا بھی ضرور ہے ورنہ اپنی ہمہ دانی میں بٹا لگتا ہے۔ کسی کی تعریف کر دیں گے تو ہلکے ہو جائنگے۔ سب سے بڑا نقادوہی ہو سکتا ہے جسے کچھ پسند ہی نہیں آتا اور بات بات پہ ناک بھوئیں چڑھاتا ہے۔ پرانے کچھ مضمون دیکھ ہی چکے ہیں نیا راستہ تلاش نہیں کرنا، کچھ سکّہ بند نام تو یاد ہی ہیں لہٰذا بس چل رہے خامہ بسم اللہ۔ حضور والا اس طرح خلیل خاں فاختہ اڑا سکتے تھے لیکن آپ تنقید اور تبصرہ نگاری نہیں کر سکتے۔ آج دوسروں کو ڈنڈی مار کر تولنے والوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ خود بھی

سی ترازو کی میں بیٹھے ہیں ۔ ؎

گو سب حسرتیں جو دل میں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل طلب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

اتنی ہی باتیں خیالات کی آتشیں ہو چکی ہیں ۔۔۔ لہٰذا باقی پھر کبھی اگر توفیق ہوئی ۔۔!

اسمٰعیل آذر (اٹک)

تکیئے کے چند خوبصورت اشعار

⊙

تری زلف سیہ تکیئے پہ جیسے ہی مچلتی ہے
تو اس سے کھٹملوں کے خون جیسی بو نکلتی ہے

گداز و نرم بدن ہے کہ فوم کا تکیہ ہے
خدا کرے نہ اٹھیں ہم کبھی بچھونے سے

گال کو اپنی ہتھیلی پر وہ رکھ کر سو گیا
رال کا تکیے پہ اب بہنے کا ڈر جاتا رہا

کہاں ہے مجھ کو خواب نہ تکیے کی مرمر
سونے والا لاکھ کئے جائے خرخر

نیند بھرنے لگے گی فرّاٹے
تکیہ ہونے لگے جو خرّاٹے

آنے میں سر پہ تیل کا پیپا انڈیل کر
سو جائیں وہ تو چکنے سے تکیہ نچوڑ لو

ڈاکٹر کرامت علی کرامت (کٹک)

★

اسمٰعیل آذر — ایک تعارف

اسمٰعیل آذر ایک اچھوت پریوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ پریوار ہے طنز و مزاح کا پریوار۔ نہ جانے ہر دور میں لوگوں نے مزاح نگاروں کے ساتھ وہی برتاؤ کیوں روا رکھا جو کسی سرکس میں مسخرے کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ یوں تو ہمارے اساتذہ نے ہجو کی شکل میں طنز و مزاح پر کسی نہ کسی حد تک طبع آزمائی ضرور کی ہے لیکن خود ان کی نظر میں طنز و مزاح کا وہ مقام ہرگز نہیں رہا جو سنجیدہ ادب کا تھا۔ تقریباً ہر مشاعرے میں سامعین کرام مزاحیہ شاعروں کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں بھی مزاحیہ شاعروں کی عموماً وہ قدر و منزلت نہیں ہوتی جو سنجیدہ شاعروں کی ہوا کرتی ہے۔ نثر میں تو حال اور بھی افسوس ناک ہے، نثر میں ظرافت نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ ادب پر نقادوں کی نظر عنایت بھی بڑی دیر سے پہنچتی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ادب میں اس کے ساتھ اچھوت کا سا برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے؟ میری رائے میں اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ ظرافت نگاری سنجیدہ ادب کی تخلیق سے نسبتاً زیادہ مشکل ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ طنزیہ اور ظریفانہ ادب پر تنقید نگاری سنجیدہ ادب کی تنقید سے زیادہ مشکل ہے۔ اب تک طنزیہ اور مزاحیہ ادب پر جتنے مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر حصہ محض تجزیاتی نوعیت کا ہے۔ تخلیق کے نفسیاتی تحلیلی اسلوبی اور فنی عوامل پر بہت کم توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ظریفانہ نثر ہو یا نظم، اس کی تخلیق کے لیے ایک مخصوص قسم کی افتاد طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیقی عوامل کی سطح پر سنجیدہ اور ظریفانہ کاوشوں میں جو بنیادی فرق ہے یا پھر مزاحیہ نگار اپنے سینے پر نشتر چبھو کر ہنستے ہنساتے وقت جس کرب و اضطراب سے دوچار ہوتا ہے اس کی جانب بہت ہی کم نقادوں کی نظر گئی ہے۔ ادب میں نئی نئی تحریکیں معرض وجود میں آئی ہیں، لیکن مزاحیہ نگار ہے کہ ان سب سے الگ تھلگ تنہا کھڑا مسکراتا نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان تحریکوں کے قائدین کی بارگاہ میں اس کی رسائی نہیں ہو پائی۔ ترقی پسندی کے دور میں بھی یہی ہوا اور جدیدیت کے دور میں بھی۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں بہت سے ایسے مزاح نگار پیدا ہوئے جنھوں نے اس تحریک سے اپنی ذہنی وابستگی کا ثبوت دیا لیکن ترقی پسند نقادوں نے انھیں کبھی قابل اعتنا تصور نہیں کیا۔ یوں تو جدید

کے دور میں طنز کو "جدیدیت" کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا، لیکن اس میں مزاح کے عنصر کو ابھرنے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا گیا۔ بعض جدید شعراء اپنا ذائقہ بدلنے کی خاطر ظرافت نگاری پر اتر آئے لیکن ان کی تخلیقات پھکڑ بازی سے آگے نہ بڑھ سکیں کیوں کہ ان کا مزاج بنیادی طور پر مزاح سے کوسوں دور تھا۔ ایسے دور میں جن نئے شعراء نے طنز و مزاح پر سنجیدگی سے اپنے فن کی اساس رکھی، ان میں اسمٰعیل آذر کا نام خاصا اہم ہے۔ ان کے یہاں محض ہنسوڑپن نہیں ہوتا بلکہ سماج کے ناسور پر ان کی نشتر زنی بہت گہری ہوتی ہے جو جراحی کا کام کرتی ہے۔ یوں تو انہوں نے راجہ مہدی علی خاں، رضا نقوی واہی، دلاور فگار، مجید لاہوری، شوکت تھانوی اور سید ضمیر جعفری کی شاعری سے کسی نہ کسی حد تک اثرات قبول کئے ہیں لیکن انھوں نے ان سب سے الگ تھلگ اپنے لیے ایک ایسی نئی راہ دریافت کی ہے جس کی شناخت ایک باشعور قاری کے لیے مشکل نہیں۔ موصوف اس وقت اپنی عمر کی اکتالیس، بیالیس بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ ابتدائی دور میں انھوں نے سنجیدہ روایتی شاعری بھی کی اور جدید شاعری بھی۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنی شاعری کا رُخ طنز و مزاح کی جانب یہ سوچ کر موڑ دیا کہ ہمارے ادب میں طنز و مزاح کا میدان ہنوز کافی وسیع ہے اور کم ہی لوگ پورے استقلال کے ساتھ اس راہ میں گامزن ہیں۔ علاوہ ازیں بچپن ہی سے آذر کی افتادِ طبع طنز و مزاح کی جانب مائل ہے۔ اس لیے میری دانست میں انھوں نے جو یہ نیا قدم اٹھایا وہ نہایت مناسب و برمحل تھا۔ اب طنز و مزاح ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں اردو اور اڑیا کے طنزیہ ادب کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ایک اور اہم کام جو انھوں نے اپنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اڑیا والوں کو اردو کے طنز و مزاح کے مزاج اور اردو والوں کو اڑیا کے طنز و مزاح کے مزاج سے متعارف کرانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے اڑیا کے مشہور مزاحیہ نگار فتورانند کے ساتھ مل کر مجتبیٰ حسین کا اور شیام سندر مصرا کے ساتھ مل کر نریندر لوتھر کے مزاحیہ مضامین کا اڑیا میں ترجمہ کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین کا اڑیا ترجمہ کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ نریندر لوتھر کے مضامین کا ترجمہ ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ خواجہ عبدالغفور کی تصنیف "شگوفہ زار" جس میں خواجہ صاحب طنز و مزاح کے ایک مستند اور معتبر نظریہ ساز کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں، اس کا بھی اڑیا میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اشاعت کے بعد طنز و مزاح سے متعلق اڑیا کی اصولی تنقید کو ایک نئی سمت ملے گی۔ علاوہ ازیں موصوف فتورانند کے اور اڑیا کے دیگر مزاح نگاروں کے مضامین کا بھی اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس طرح اسمٰعیل آذر ثقافتی سطح پر ہماری قومی یکجہتی کے سلسلے میں بڑی گراں قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اُمید قوی ہے کہ آج نہیں تو کل سرزمین اڑیسہ سے ابھرتے ہوئے اس نوجوان مزاح نگار پر اہل نظر کی توجہ ضرور مرکوز ہوگی اور اس کا فن اپنے ہمعصر نقادوں سے ایک نہ ایک دن ضرور خراج تحسین وصول کر لے گا!

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

قسط — ۵

ایک سفر ہیومر او پلکس کے لیے

لنچ کے بعد اب قیلولہ کے لیے ہوٹل واپس جانا ضروری ہوگیا تھا۔ جو قارئین قیلولہ کے بارے میں نہیں جانتے، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ قیلولہ بس قیلولہ ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شرفاء کرسی پر بیٹھے بیٹھے قیلولہ کر لیتے ہیں، جب کہ بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا چارپائی پر منگواتے ہیں تاکہ قیلولہ میں دیر نہ ہو اور پھر وہیں لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ "گھوڑے بیچ کر سونا" جیسے محاورے اس قسم کے قیلولہ ہی کے حوالے سے ایجاد ہوئے ہیں۔ لفظ قیلولہ اگرچہ مشکل ہے مگر چیز اچھی ہے اور میرا جی اس وقت اسی چیز کو چاہ رہا تھا! مگر ہوٹل میں "تلگو زبان کے روزنامہ آندھرا پربھا" کے پی این سوامی میرے منتظر تھے۔ اس روز میں نے قیلولہ انھیں انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔ اگلے روز ہوٹل میں میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے ملازمین اس روز پہلے سے زیادہ ادب و احترام کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسا کہ قارئین جانتے ہیں راقم کو نام و نمود سے کوئی غرض نہیں، چنانچہ سوامی جی اگلے روز اخبار کے جو دو پرچے میرے ریکارڈ کے لیے دے گئے تھے انھیں کاؤنٹر پر پہچاننے کے لیے اپنی بغل میں داب کر ہوٹل کی لابی میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا مثلاً منیجر صاحب کو میں نے وہ اخبار دکھایا اور کہا میں تلگو نہیں جانتا، مگر چوں کہ اس کے ساتھ میری بڑی ساری تصویر (یہ دیکھیں) چھپی ہوئی ہے، لہٰذا لگتا ہے کہ اخبار نے کچھ میرے بارے میں لکھا ہے، بلکہ میں نے بلغاریہ کی مس کیبلینا کو ریسپشن پر اپنے کمرے کی چابیاں وصول کرتے دیکھا تو احتیاطاً اس سے بھی پوچھ لیا کہ بی بی ذرا دیکھو تو اخبار میں کیا چھپا ہے اس قتالہ نے ایک نظر اخبار پر ڈالی اور کہا "اوہ! آپ تصویر میں تو خوبصورت لگتے ہیں (لاحول ولا قوۃ!)

پی این سوامی کے جانے کے بعد ابھی میں "باقاعدہ" قیلولہ کے لیے تیاریاں پکڑ ہی رہا تھا کہ روزنامہ "سیاست" کے نوجوان اور دلکش شخصیت کے حامل ذہانت بیگ آ گئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لیے مجھ سے اردو ادب اور خصوصاً طنز و مزاح کے حوالے سے گفتگو شروع کر دی۔ میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہر جائیں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دوں گا۔ پہلے آپ میرے دو سوالوں کے جواب دیں"

کہنے لگے "فرمائیں"

میں نے کہا "پہلی بات یہ ہے کہ یہ حیدرآباد دکن والے مجھے "قاسمی صاحب" کی بجائے "قاسمی صاحب" کیوں کہتے ہیں!

ہنس کر کہنے لگے "آپ بھی تو خود کو "قاسمی" کی بجائے "کاسمی" کہتے ہیں۔ اصل میں حیدرآبادیوں اور پنجابیوں دونوں کا "قاف" درست نہیں ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں تو جتنے دن بھی آپ رہیں گے، آپ کو "عطاء الحق خاسمی" ہی بن کر رہنا پڑے گا!"

یہ عزیز ٹھیک کہتا تھا چنانچہ میں نے حیدرآباد دکن میں ایک ہفتہ "عطاء الحق قاسمی" کی بجائے عطاء الحق خاسمی" کے طور پہ گزارا۔ مجھے اپنے نام کے سلسلے میں امریکہ اور یورپ میں بھی اسی قسم کے پرابلم کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے، چنانچہ جدھر سے گزرتا تھا "قاسمی" کی بجائے "کسی می" "کسی می" کی آوازیں آتی تھیں۔ ذہانت بیگ سے گفتگو کے دوران ایک دلچسپ صورتِ حال ذہن میں آئی اور وہ یہ کہ دنیا میں زبان کا یہ مسئلہ موجود ہے۔ مثلاً ہندی والے "غ" کو "گ" اور "ز" کو "ج" بولتے ہیں چنانچہ وہاں "غالب کی غزلیں" "گالب کی گجلیں" کہی جاتی ہیں۔ مصری لوگ "ج" ادا نہیں کر سکتے، وہ اس کی جگہ "گ" کی آواز نکالتے ہیں چنانچہ وہ "جمال عبدالناصر" کو "گمال عبدالناصر" کہتے ہیں! اسی طرح ترکی میں "ک" کی جگہ "چ" کی آواز نکالی جاتی ہے چنانچہ وہ "اتاترک" کو "اتاترچ" کہتے ہیں بلکہ وہ استنبول کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گیا تو وہاں امام صاحب نے جب "انا اعطینا چل چوثر" اور "اللہ اچبر" کہا، تو نماز کے دوران بھی مجھے گدگدی سی محسوس ہوئی۔ یہ باتیں سوچ کر مجھے اتنا اطمینان ہوا کہ جب اگلے روز ایک تقریب میں اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ خواتین و حضرات! یہ "تخریب" سید ضمیر جعفری اور عطاء الحق خاسمی" کے اعزاز میں "منعقد" ہو رہی ہے تو دل کو کچھ صبر سا آ گیا!

"دوسرا؟" ذہانت بیگ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دوسرا سوال یہ کہ حیدرآباد میں نسوانی نام کچھ مردانہ سے ہیں، مثلاً اشرف رفیع ہیں، ہماری بھابی رشید موسوی ہیں، ڈاکٹر جعفر بشیر قربان علی ہیں، رفیع روٗف ہیں، کیا خیال ہے مردوں کو "جواب آں غزل" کے طور پر نسوانی نام نہیں رکھنے چاہئیں؟"

مگر پھر مجھے خود ہی خیال آیا کہ حیدرآباد والوں کے ناموں کا جواب ہمارے پنجاب کے مرد پہلے ہی سے دے رہے ہیں مثلاً ہمارے ہاں نوجوان شاعر ناہید شاہد ہیں، جن کے پاس کتنے ہی مدیران رسائل کے عاشقانہ خطوط جمع ہیں، بزرگ شاعر زیبا ناردی ہیں جن کی وجہ سے ایک بار گوجرانوالہ یہ سمجھے کر شاید اداکارہ زیبا آئی ہیں، چنانچہ وہ زیبا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جوق در جوق مشاعرہ گاہ میں پہنچے وہاں جب زیبا ناردی کے نام کا اعلان ہوا تو لوگ جگر تھام کر بیٹھ گئے اور جب حضرت زیبا ناردی اپنی سیاہ رنگت اور سفید لمبی داڑھی کے ساتھ مائک پر آئے تو ہنگامہ ہو گیا۔ اسی طرح کشور ناہید شاعرہ ہیں اور کشور مراد کشور نام کے ایک شاعر بھی موجود ہیں۔ ایک اداکارہ شمیم آرا ہیں اور ایک شمیم میرا دوست ہے۔ اداکارہ ردمی بالا ظاہر ہے خاتون ہیں جبکہ ردمی کنجاہی ماشاء اللہ مرد ہیں! ایک سرفراز اقبال صاحبہ ہیں، ایک سرفراز شاہد ہیں جو مزاحیہ شاعر ہیں غرض یہ کہ یہ فہرست کافی طویل ہے چنانچہ میں نے دوسرا سوال بھی از خود رضاکارانہ طور پر واپس لے لیا!

اس "مرحلے" سے فارغ ہونے کے بعد کافی دیر تک اردو کے مزاحیہ ادب کے حوالے سے ذہانت بیگ کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ دوران گفتگو ایک مرحلے پر مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اور یہ مرحلہ وہ تھا جب ذہانت بیگ نے بھارت میں لکھے جانے والے مزاحیہ ادب کے حوالے سے ایک سوال کیا۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ پاکستان کا قاری رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی اور کنہیا لال کپور کے نام اور کام سے تو واقف ہے، مگر اس کے آگے اس کی معلومات صفر ہیں، جبکہ اس وقت بھارت میں جن مزاح نگاروں کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، ان میں احمد جمال پاشا، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین بطور خاص بہت اہم ہیں۔ بزرگ مزاح نگار احمد جمال پاشا کے کچھ قارئین تو پاکستان میں موجود ہیں۔ لیکن میں نے ان میں سے صرف مجتبیٰ حسین کو پڑھا ہے کیونکہ ان

کی کتابیں دستیاب ہوگئی تھیں، باقیوں کے صرف نام سے واقف ہوں، کام کی خبر نہیں ہے۔ صرف حیدرآباد شہر میں مزاح نگاروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے مگر ان کی رسائی تاحال پاکستان کے جینوئن قاری تک بھی نہیں ہوسکی۔

ذہانت بیگ ادھر سے فارغ ہوکر اب ضمیر جعفری صاحب کے کمرے میں چلے گئے تھے، میں نے اس دوران کپڑے تبدیل کئے اور بستر میں دراز ہوگیا، مگر تھوڑی دیر بعد لانڈری والا لڑکا کپڑے لے کر آگیا، یہ وہی نوجوان تھا جس سے پہلے روز میں نے پوچھا تھا کہ ہوٹل میں استری کا بندوبست ہوسکتا ہے، تو وہ مائنڈ کر گیا تھا، مگر اب وہ میرے کپڑے استری کرواکر لایا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میری طرح غالباً اس نے بھی اس روز لفظ "استری" سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو بعد میں "انجوائے" کیا تھا!
تھوڑی دیر بعد بیگ احساس آگئے مجھے یہ نوجوان بہت اچھا لگتا ہے، بلکہ مجھے تو یہ چھوٹے بھائی کی طرح محسوس ہونے لگا ہے وہ حیدرآباد میں ہے، میں لاہور میں ہوں، شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، مگر شاید یہ فرق پڑتا ہے، اس کی ایک بہن پاکستان میں تھی، اور وہ بھائی کو دیکھے بغیر مر گئی ہے۔ گھنگھریالے بالوں والا "بے بی کلیکسو" جیسا بیگ احساس اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور "معاصر" کی ورق گردانی کر رہا ہے۔

"یار یہ ایک ہی پرچہ رہ گیا ہے، میں نے سوچا تھا جامعہ عثمانیہ کی لائبریری کو دے دوں گا، مگر یہ آپ رکھ لیں، جامعہ کو پرچہ پھر بھجوا دوں گا۔"

"نہیں جامعہ عثمانیہ کا حق فائق ہے" بیگ احساس کہتے ہیں "میں یہ پرچہ لے جاتا ہوں مگر پڑھنے کے بعد آپ کو لوٹا دوں گا تاکہ آپ جامعہ کو ڈونیٹ کر سکیں!"

پھر ہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں، اپنے بارے میں، اپنے عزیزوں کے بارے میں اپنے جذبوں کے بارے میں اتنے میں ضمیر جعفری "نہائے دھوئے" کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اس بزرگ کا "پرانا" نیاز مند ہوں، مگر اس سے قبل میں ان کا احترام ان کی خوبصورت شاعری کی وجہ سے کرتا تھا، مگر وہ جس طرح ہر شخص سے "محبت" سے ملتے تھے، ان کے بارے میں اندر ہی اندر میری رائے یہ تھی کہ ان کی یہ محبت "آمد" ہی نہیں "آورد" کی ذیل میں بھی آتی ہے۔ لیکن گزشتہ چند دنوں میں چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے کے نتیجے میں میری رائے ان کے بارے میں یکسر بدل گئی ہے۔ پہلے میں ان کے تخلیق کردہ ادب کے حوالے سے ان کا احترام کرتا تھا، اب میں ان کی سچی محبت سے لبریز شخصیت کا بھی اسیر ہوگیا ہوں۔ میں نے دوران سفر کسی ایک شخص کے بارے میں بھی ان کی زبان سے منفی بات نہیں سنی، میں نے ان کے سامنے بڑے لوگوں کی غیبت کی تاکہ ان کا "جذبہ غیبت" بیدار ہو، مگر انسانوں کے بارے میں ان کا رویہ ایک صوفی کا رویہ ہے، انھیں ہر شخص میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں، برائیاں وہ صرف اپنی ذات میں "تلاش" کرتے ہیں، پھر ان دنوں میں نے یہ بھی دیکھا کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ "سترے بہترے" نہیں گئے بلکہ نوجوانوں سے زیادہ چاق و چوبند اور حاضر دماغ ہیں۔ اسی طرح بذلہ سنجی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ورنہ بہت سے مزاح نگار اسی جوہر سے صرف اپنی تحریروں کی حد تک "مستفید" ہوتے ہیں۔ اس سفر کے دوران ضمیر صاحب نے اپنی بزرگی لپیٹ لپاٹ کر پرے رکھی اور وہ میرے ساتھ اس طرح شیر و شکر رہے کہ لگتا ہے میرے ہم زاد اور ہم عمر دوست ہیں چنانچہ کئی دفعہ جی چاہا کہ ان کے "پٹوں" پر ہاتھ مار کر کہوں "ہور سنا یار کی حال اے" مگر پھر یوں لگا جیسے میری "بزرگی" مجھ پر غالب آگئی ہے!

ضمیر صاحب خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور اس بیگ احساس سے محوِ گفتگو ہیں۔ ضمیر صاحب کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس پر وہ کچھ لکھ کر بیگ احساس کو تحفتاً دے رہے ہیں، مگر انھیں لکھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے کیوں کہ ان کی عینک سفر کے دوران گم ہو گئی تھی۔ بیگ احساس کہتے ہیں آپ کے پاس حسن عسکری صاحب کی عینک ہے، وہ کیوں نہیں لگا لیتے اسی پر ضمیر صاحب جیب میں ہاتھ ڈالے ہیں اور کہتے ہیں" پہلے چشمے کے بغیر دشواری ہو رہی تھی، اب چشمہ لگانا یاد نہیں رہتا۔"

میں بیگ احساس سے کہتا ہوں" یار میں خط و کتابت اور کتابیں وغیرہ بھیجنے کے معاملے میں بہت سست ہوں اگر مجھے کوئی رضا کار مل جائے جو بنڈل بنا کر پوسٹ کر دیا کرے تو میں آپ کو اکثر کتابیں وغیرہ بھیجتا رہوں۔"

ضمیر صاحب یہ سن کر کہتے ہیں" رضا کار تو اس شہر میں بہت تھے، مگر وہ سب کے سب کام آ گئے۔"

اب ہم رویندر بھارتی کے لیے" رختِ سفر" باندھ رہے ہیں، جہاں اس وقت عالمی مزاح کانفرنس کا ایک لحاظ سے مرکزی سیشن ہے کیوں کہ یہاں تخلیقی مزاحیہ مضامین پڑھے جاتے ہیں اور سچ پوچھیں تو اس کانفرنس میں بنیادی طور پر ہم اسی سیشن کے لیے بلائے گئے ہیں کیوں کہ اس کانفرنس کو پھیلایا تو صرف اس دفعہ گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا دائرہ کار اردو کے نثری اور شعری مزاحیہ ادب تک محدود تھا! یہاں صدارت سید ضمیر جعفری کی ہے، لیکن لگتا ہے ہم خاصے لیٹ ہو گئے ہیں کیوں کہ شام ڈھلے کافی دیر گزر چکی ہے۔ ہماری کار بوڑھے اور مریل سائیکل رکشا چلانے والے کے ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی رویندر بھارتی پہنچی ہے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ جلسہ کب کا شروع ہو چکا ہے، ہال لوگوں سے لبالب بھرا ہوا ہے میں انہیں چٹ بھیجتا ہوں کہ مجھے اور فکر تونسوی کو جلد فارغ کر دیا جائے، کیوں کہ پنجابی سیشن والے ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچے ہوئے ہیں جن کا متوازی اجلاس اس وقت ایک اور جگہ پر منعقد ہو رہا ہے۔ ضمیر صاحب صدارت کر کے وہاں پہنچیں گے! یہاں سید ضمیر جعفری، فکر تونسوی، یوسف ناظم، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شفیقہ فرحت، پرویز یداللہ مہدی، جہاں قدر چغتائی، رشید قریشی اور مسیح انجم اپنے قہقہہ بکھیر مضامین سناتے ہیں۔ ایک مضمون میں بھی سناتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ حیدرآباد والے مجھ جیسے مبتدی کی بھی کتنی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔۔۔ !

اب فکر تونسوی اور میں پبلک گارڈن کے اندر ایریہ درشنی ہال میں ہیں جہاں پنجابی سبھا حیدرآباد کے زیرِ اہتمام عالمی مزاح کانفرنس کے سلسلے میں نثر، نظم اور اسٹیج کامیڈی پر مشتمل ایک ملا جلا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔ پنجابی سبھا کے صدر سردار رگھبیر سنگھ محفل کو ڈسٹربنس سے بچانے کے لیے اسٹیج پر گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ادھر سے ادھر جاتے ہیں جب کہ انہوں نے پتلون بیلٹ کے بغیر پہنی ہوئی ہے یہاں فکر تونسوی اور میرے علاوہ سردار دلیپ سنگھ، سردار تارا سنگھ کامل اور مسٹر اینڈ مسز سبروال اپنے اپنے آئٹم پیش کرتے ہیں صدارت سردار عجیب سنگھ کی ہے اور مہمان خصوصی ایڈیٹر" ملاپ" ہیں دیر ہی محفل اختتام کو پہنچنے کو ہی ہے کہ منتظمین اور سامعین کے چہرے اچانک کھل اٹھتے۔ سید ضمیر جعفری اور نریندر لوتھر اردو سیشن سے فارغ ہو کر اسٹیج کی طرف آ رہے ہیں!! ۔۔۔ (جاری)

خرافات (مراسلے)

مکرمی! تسلیم: "ہندوستانی مزاح نمبر" ابھی سرسری طور پر پڑھ سکا۔ لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ نے وہ کام کیا جو حکومت کے محکمۂ السنہ کو انجام دینا چاہیئے۔ یا پھر ساہتیہ اکیڈمی کو یہ کام کرنا چاہیئے تھا۔ "شگوفہ" نے اردو کے ذریعہ ملک کی تمام ہندوستانی اہم زبانوں کی خدمت کی ہے۔ اس نمبر کے لیے جو محنت آپ کو اور یوسف ناظم صاحب کو کرنی پڑی ہوگی اس کا ہمیں اندازہ ہے۔ شاید اسی لیے اس نمبر کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ کاش کہ آپ لوگوں کی محنت کا ہم صحیح اعتراف کر سکتے۔ اردو والے اب محسوس کاموں سے زیادہ سنسنی اور تشہیری کاموں کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد (دہلی)

مکرمی! سلام مسنون:

شاندار عالمی مزاح کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ یہاں کے انگریزی اخبار میں اس کانفرنس کے تعلق سے خبر چھپی تھی۔ اس کا تراشہ منسلک ہے۔

حمید الماس (بنگلور)

مکرمی و مشفقی جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال تسلیم و نیاز:

عالمی مزاح کانفرنس کا خمار میرے دل و ذہن پر اب تک چڑھا ہوا ہے۔ پھر جب اس پروگرام کے اقتباسات دیکھے تو ان پانچ دنوں کی خوشگوار یادیں پھر سے مہک اٹھیں۔ جشن مزاح کی لا مثال کامیابی کا سہرا خصوصاً "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے ممبران کے سر ہے۔ جس ایثار و خلوص و جانفشانی و حسن تدبر کا ثبوت آپ لوگوں نے پیش کیا ہے، اس کی مثالیں زمانے میں کم ملیں گی۔ تو عنقا ہی ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کا کارنامہ دراصل لائق صد تحسین و آفریں ہے! میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا یہ کارنامہ صفحاتِ تاریخِ عالمی ادب میں حروفِ زریں سے لکھا جائے گا اور تا قیامت تابندہ رہے گا۔

پی ایس سری واستو، جودھپور

مکرمی! تسلیم!

امید ہے آپ کی تھکان دور ہو گئی ہوگی (ہندوستانی مزاح نمبر) کی طباعت کے بعد۔ اب آپ کی مجلس مشاورت اور مجلس ادارت سے ایک گذارش ہے کہ نثر کے بعد نظم کی طرف آنکھ اٹھائیں اور مارچ ۱۹۸۶ء میں ایک اور نمبر (نظم) ہم لوگوں کے سر پر دے ٹپکیں۔ حساب کتاب برابر۔ پتہ نہیں کیوں مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کے متعلق آپ کا سر پہلے سے ہی کھجلا رہا ہوگا۔ شاید آپ نے اپنے گیگک کو دو غلا کر یلغار کرنے کی سوچ لی ہو۔ باقی فساد جو ٹھہرے!

مرزا کھونچ بیتیا

جناب ایڈیٹر صاحب (شگوفہ) سلام مسنون۔

آج یکایک ایک لائبریری کے کاؤنٹر پر پڑے "شگوفہ" پر میری نظر جا کر مرکوز ہو گئی اور نام ہی سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً ہی اپنی گرفت میں لے لیا۔ رسالے کے صفحۂ اول پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اس رسالے کو پابندی کے ساتھ خریدتا ہے!

محمد عزیز، مشتاقہ بھنجن۔

محترم ایڈیٹر صاحب سلام مسنون

مالیگاؤں کے آل انڈیا مزاحیہ مشاعرے میں حضرت پاگل عادل آبادی، اسمٰعیل آذر صاحب اور ... صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آذر صاحب کے ذریعہ آپ کا رسالہ شگوفہ دیکھنے کا ... پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا!

واحد انصاری، برہانپور (ایم پی)

FAROOKY
FAROOKY
TOOTH POWDER
Zakir Husain Library
Jamia Nagar

AUGUS

1985

Rs. 4·0

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد
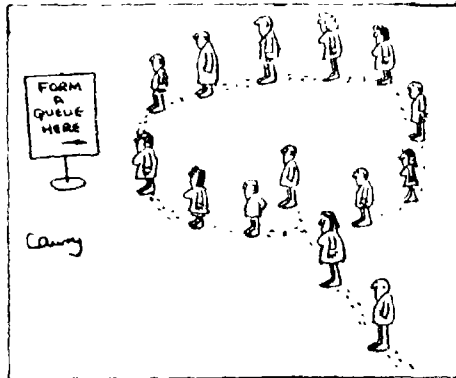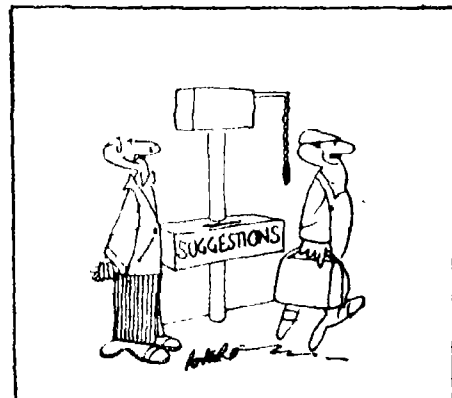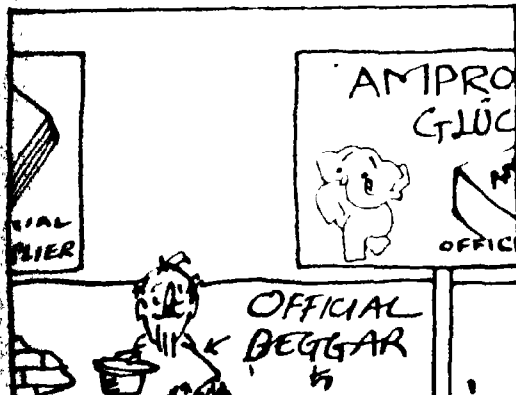
جلد (۱۸) ★ شمارہ (۸)
اگست ★ ۱۹۸۵ء
ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

قیمت فی پرچہ :	4 روپے
زرِ سالانہ :	35 روپے
بیرونِ ہند سے :	125 روپے

فون: آفس ۵۵۷۷۱۶، رہائش ۵۲۱۰۶۴

کتابت: محمد عبدالرؤف ★ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد۔

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ ۱

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

قاضی جی دبلے ..... (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومرا ولمپکس کے لیے ـــــ عطاء الحق قاسمی ـــــ ۲۳

مالِ مفت (انشائیے)

نام بڑا دور درشن چھوٹے ـــــ پرویز یداللہ مہدی ـــــ ۷
لانا جوئے شیر کا ـــــ بانو سرتاج ـــــ ۱۷
چیلنج ـــــ سں جمہوری ـــــ ۳۵
نام رکھنا ـــــ علی حمّاد عباسی ـــــ ۴۱
ظہیر الدین بابر ـــــ منظور دتار ـــــ ۴۵
چھوٹا قد ـــــ کاشی ناتھ ـــــ ۴۹

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

پچ‌فقتہ ـــــ عابد مُعِز ـــــ ۱۳

دھل درنا معقولات (ڈرامہ)

ذرا دم ہو تو ـــــ رؤف خوشتر ـــــ ۵۲

پیچ و خم سا پیچ و خم

ذکر ہندوستانی مزاح نمبر کا ـــــ {راز سنتوکھ سری، خالدا گاسکر / شنکر سریواستو، رحمٰن اکولوی} ۵۶

چُورن (منظومات)

نیاز سواتی ـــــ ۱۲
اسمٰعیل ظریف ـــــ ۳۴
سمیع جلیل ـــــ ۳۹
روشن بناری ـــــ ۴۰
نظر برنی ـــــ ۴۰
دتت ـــــ ۴۷
غافل انصاری ـــــ ۴۸
سرپٹ حیدرآبادی ـــــ ۲۲
اقبال ہاشمی ـــــ ۳۴
منصور عمر ـــــ ۴۰
افروز عالم ـــــ ۴۰
سراج نیرلی ـــــ ۴۷
دوست محمد ـــــ ۴۷
چٹکی ـــــ ۴۸

ماہنامہ شگوفہ کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر : ———— یوسف ناظم

★ ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں :
گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی)، کُٹی کی (ٹامل)، دلو دبھٹ اور گن بہاری لال مہتا (گجراتی)، فتور آنند (اڑیا)، راوی کونڈل راؤ (تلگو)
بی (کنڑا)، ایپا پانی کر (ملیالم)، نارائن گنگو پادھیائے (بنگلہ)، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری)، شرن پورن شرما (راجستھانی)
شرد جوشی (ہندی)، رتی لال شاہین (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم—!

★ ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ :-
شرے ویش ٹھاکر (ہندی)، ہمانیش گوسوامی (بنگالی)، عزیز تمنائی (ٹامل)، این دی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ (تلگو)
شیام سندر مصرا (اڑیا)، ڈاکٹر سکنیا جوہری (گجراتی)، حمید الماس (کنڑی)، ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی)، ڈاکٹر امداد مدنی (مراٹھی)
پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم)، کرت بابانی (سندھی)، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی)، ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی) اور بشیر عارف (کشمیری)

★ اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :— ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم :-
★ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی،
رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبد المغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مناظر عاشق
ہرگانوی اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء ★ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ
مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور
پروفیسر یداللہ مہدی کے مضامین اور خود نوشت سوانح ★ ڈاکٹر عبد المغنی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیے گئے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
کے انٹرویو ★ مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی ★ تخلیق کاروں کی تصویریں ★ اور دوسری کئی دلچسپیاں

★ خوبصورت دو رنگی سرورق — سعادت علیخان

★ ضخامت : ۳۸٦ صفحات ★ قیمت : ۵۰ روپے

★ سالانہ خریداروں سے ۱۲ روپے، ۵ روپے زائد بھجوانے پر یہ پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا!

پروفیسر یزید اللہ مہدی

نام بڑے دُور درشن چھوٹے

جب تک "دُور درشن" کی زد سے دور دور تھے، مطمئن تھے محفوظ تھے، مسرور تھے۔ لیکن فلکِ کج رفتار اور دُور درشن کے اربابِ اقتدار سے یہ دیکھا نہ گیا لہٰذا ایک دن دور درشن والے اپنے طلسماتی ڈبّے عرف ٹی۔وی کے توسط سے ہمارے گوشۂ عافیت میں زبردستی داخل ہو گئے اور یوں ہماری عافیت، اور عاقبت دونوں کو مسلسل اور مستقل خطرہ لاحق ہو گیا ـــــ!

ویسے یہاں اس بات کی وضاحت کر دیں کہ ہم نے اتنی آسانی سے پسپائی قبول کر کے اربابِ دُور درشن کے آگے ہتیار نہیں ڈالے بلکہ ایک عرصہ تک گھر کی چار دیواری میں ٹی۔وی مخالف آندولن بڑے زور شور سے چلاتے رہے حالاں کہ جواب میں ہماری نصف بہتر صاحبہ ٹی۔وی لاؤ "غریبی ہٹاؤ" کے چھت شگاف نعرے لگا کر ہمارے موقف کو کمزور کرنے کی خاصی کوشش کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ محترمہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "آخر آپ، ٹی۔وی کے اس قدر مخالف کیوں ہیں ـــ؟!"

عرض کیا ـــ "جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، اسی طرح ایک ہی چھت کے نیچے بیوی اور ٹی۔وی کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہے ـــ!" اس طنز کے جواب میں اس سے پہلے کہ بیوی صاحبہ کوئی جوابی کارروائی کریں ہم نے آگے کہا۔ اس بات پر ایک لطیفہ سنو، ایک کنوارے نوجوان سے کسی نے پوچھا اگر آپ کو ٹی۔وی اور بیوی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو آپ کس کا انتخاب کریں گے ـــ؟ نوجوان نے فی الفور جواب دیا میں بلا جھجک ٹی۔وی کا انتخاب کروں گا۔ سوال کرنے والے نے حیرت سے کہا۔ ایک جیتی جاگتی عورت کے مقابلے میں آپ ایک مشین کا انتخاب کریں گے! نوجوان بولا ـ جی ہاں بیوی کے مقابلے میں ٹی وی کو میں اس لیے ترجیح دوں گا کہ اپنی مرضی سے جب چاہے کم از کم ٹی۔وی کا سوئچ تو آف کر سکتا ہوں"۔ لطیفہ سن کر محترمہ نے بجائے بُرا ماننے کے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ مذاق مذاق میں اس نوجوان نے بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اب آپ بھی سمجھداری کا ثبوت دیجئے اور فوراً ٹی۔وی لے آیئے۔ ہم نے فوراً پینترا بدل کر کہا۔ بیگم بھول رہی ہو کہ وہ معاملہ ٹی۔وی اور بیوی میں سے کسی ایک کے انتخاب کا تھا اور یہ بدقسمتی سے انتخاب کی منزل سے

ت آگے نکل آیا ہوں ۔؟" کوئی اور موقعہ ہوتا تو اس براہ راست طنز پر محترمہ سارا گھر سر پر اٹھالیتیں لیکن اس وقت چونکہ اپنی
ت منوانے کا جذبہ پوری شدت سے کار فرما تھا اس لیے طنز کے کڑوے گھونٹ پی کر فلسفیانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔ ٹی وی
سے سماج میں انسان کا رتبہ بلند ہوجاتا ہے ۔!

ہم نے پوچھا "کتنا بلند ہوجاتا ہے ۔؟"

بولیں "کافی بلند ہوجاتا ہے ۔!"

ہم نے مزید چھیڑ خوانی کی "ایسے نہیں ہاتھ کے اشارہ سے بتاؤ ۔!"

ہماری اس دانستہ چھیڑ پر بجائے خفا ہونے کے کھڑکی سے باہر ہماری توجہ مبذول کرواتے ہوئے بولیں۔

"وہ سامنے والی عمارت کی چھت پر لگے ٹی وی. ایریل جتنی اونچائی پر نظر آرہے ہیں نا، اتنا بلند ہوجاتا ہے ۔!"

اب پانی سر سے بلکہ "چھت" سے بھی اونچا ہوچکا تھا ہم نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ٹی. وی سے جہاں سماج میں انسان کا درجہ
بلند ہوجاتا ہے وہیں اس کے اخلاق کا درجۂ حرارت کافی نیچے گرجاتا ہے۔"

جھنجھلا کر بولیں ۔ آپ کو تو کج بحثی کی عادت پڑگئی ہے، پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں آپ، ذرا اپنے آس پاس کی دنیا
دیکھئے ٹی وی آج روز مرہ کی اہم ترین ضرورت بن گیا ہے گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیاسی سماجی معاشی اور پتہ نہیں کیسی کیسی صورتحال
کے سامنے پیش کرکے آپ کی معلومات میں چار چاند لگادیتا ہے، دور کیوں جائیں اپنے پڑوسی صمصام الدین سرنام صاحب کو دیکھئے
زمانے میں ان کی جنرل نالج کا یہ عالم تھا کہ فلسطین کو "فل آستین" اور "مارشل لا" کو ماشاء اللہ کہا کرتے تھے، لیکن جب سے ان
یہاں ٹی. وی آیا ہے ان کی معلومات ماشاء اللہ بین الاقوامی معیار سے بھی آگے نکل گئی ہیں۔ خیر یہ تو دور درشن کا ایک ادنیٰ
کرشمہ ہے۔ اس کے علاوہ ٹی. وی پر بے شمار تفریحی پروگرام بھی پیش کیئے جاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر ہر اتوار کی شام کوئی
نئی ہندی فلم ٹیلی کاسٹ کی جاتی ہے وہ بھی مکمل ۔!

اتوار کی فلم کے ذکر پر یک لخت اس دوست کی یاد آگئی جس کے ہاں کئی بار فلم دیکھنے کا اتفاق ہوچکا تھا۔ اتوار کی شام
اس غریب کا "غریب خانہ" پاس پڑوس کے تمام غریبوں سے "ہاؤز فل" ہوجایا کرتا تھا۔ اس بھیڑ میں بفضل ٹی. وی، ہر عمر، ہر
سائز ہر رنگ اور ہر ڈھنگ کے بچے بوڑھے جوان مرد عورت سبھی تھوک کے بھاؤ دستیاب ہوا کرتے، یوں سمجھئے میلے کا سماں
ہوتا بچے اپنے دامن میں مونگ پھلیوں کے ڈھیر اور ہاتھوں میں قلفی کے دونے سنبھالے فلم ختم ہونے تک ہاتھ اور منہ دونوں ایک
ساتھ چلاتے رہتے اور ماؤں کے سینے سے چمٹے ہوئے نونہالان وطن اپنی "بن بادل برسات" سے ماؤں کا کلیجہ اور صاحب خانہ
کا فرش اس قدر "ٹھنڈا" کرتے کہ بالآخر ہر طرف "جل تھل" ہوجاتا ۔ اور پھر واپس لوٹتے ہوئے یہ جم غفیر نشانی کے طور پر کوڑا کرکٹ
کا زبردست ڈھیر چھوڑ جاتا جس کے نتیجے میں اچھا خاصا گھر میونسپلٹی کی کچرا گاڑی کا نقشہ پیش کرنے لگتا ۔ خیر یہ تو کلائمکس تھا
دوران شو بھی صاحب خانہ کو چین کم ہی نصیب ہوتا کیوں کہ جس کبھی "سین" میں ہیرو اور ہیروئین اچانک کسی مخرب اخلاق حرکت
کا مظاہرہ کرتے کو پر تولتے صاحب خانہ فوراً اٹھ کر ٹی. وی کی جانب جھپٹتے اور پھر اس طرح سینہ پھُلا کر کھڑے ہوجاتے کہ ٹی. وی
کا اسکرین ان کے پیچھے پوری طرح چھپ جاتا اور یوں "وہ سین" سنسر کی قینچی کی زد سے غلطی سے محفوظ رہ جاتے وہ ان کی
پشت کی زد میں آجاتے، اس طرح صاحب خانہ یقیناً ناظرین کی بھیڑ میں موجود نابالغ معصومین کو فلم کے ایسے تہ بستر مناظر کے

...سط سے قبل از وقت بالغ ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ موصوف ایسے ہی کسی گرما گرم سین کو اپنی پیٹھ
...لا دکر کمسن ناظرین کی نظر سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک معمر تماش بین نے جھلا کر کہا۔ عجیب بدذوق آدمی ہو
...یاں! جن مناظر کو "بچشم خود" دیکھنے کے لیے میں خاص طور سے "بہ قلم خود" آتا ہوں تم انہی مناظر کے وقت کباب میں ہڈی اور
...ین فیصلے کے وقت نا اہل جج صاحب کے روبرو نوٹوں کی گڈی ہی کی طرح ٹی. وی کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہو۔! اس
...تراض کے جواب میں ایک کمسن برخوردار کی آواز سنائی دی۔ "چچا بھتّے سے مت اکھڑیئے، اس سین میں ہیروئن اس وقت اپنی سہیلیوں
...ساتھ کم سے کم کپڑے پہن کر تالاب میں نہا رہی ہے، اس سین کی خاطر میں یہ فلم تھیٹر میں کئی بار دیکھ چکا ہوں، فی الحال آپ
...پ چاپ بیٹھئے میں اس سین کا خلاصہ آپ کو بعد میں سنا دوں گا۔!"

اتوار کی فلم کے حوالے سے یہ سارا منظر کسی فلم ہی کی طرح ہماری آنکھوں کے آگے پھر گیا ہم نے غصہ سے کہا۔ بیگم تم نے ابھی کچھ
...ر پہلے پوچھا تھا کہ میں ٹی. وی کا اس قدر مخالف کیوں ہوں تو اس کا واحد سبب یہی اتوار والی فلم ہے، دوردرشن والے عموماً
...ار کی شام ایسی فلمیں دکھاتے ہیں جنھیں سنسر بورڈ خاص طور سے "بالغوں والا سرٹیفکیٹ عطا کرتا ہے"۔

محترمہ نے فوراً لقمہ دیا۔ ٹھیک ہے جب ٹی. وی پر بالغوں والی فلم دکھائی جا رہی ہو تو آپ کوئی نابالغوں والا کام کیجئے"۔
...رمہ کے اس کرارے جواب نے بحث کا بھی کلائمکس کر دیا اور ہماری مخالفتوں کا بھی چنانچہ اگلے روز جب ہم گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ
...غیر معمولی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا جو ہونٹ آٹھ بج کر بیس منٹ والی سوئیوں کی طرح لٹکے رہتے تھے وہ
...س وقت دس بج کر دس منٹ والے مسکراتے پوز میں تھے۔ ہم نے لرزتے ہوئے ڈرائینگ روم کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ جس
...شے میں ہمارے لکھنے پڑھنے کی میز مستقل لگی رہتی تھی اب اس کی جگہ مہاشے ٹی. وی اپنا آسن جمائے ہوئے ہیں. اس سے
...ہلے کہ ہم منہ سے کچھ پھوٹتے محترمہ نے مطلع فرمایا۔ اب آپ کو دنیا بھر کی خبریں جاننے کے لیے اخبارات چاٹ کر اپنی بینائی
...ستیاناس کرنے کی ضرورت نہیں ٹی. وی کے ذریعہ ساری تازہ ترین خبریں گھر بیٹھے مل جایا کریں گی"۔ بیگم نے اپنے ذہنی
...جوڑ کی مدد سے ہمارے ایک عدم پسندیدہ موضوع کو بالآخر ٹی. وی سے جوڑ ہی دیا، لیکن جب خبریں سنیں تو معلوم ہوا کہ
...ر درشن والے خبریں کم اور سماچار زیادہ ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں اور ان سماچاروں کا مطلب و مفہوم سمجھنے کے لیے اگلے دن
...ں اور بھی خشوع و خضوع کے ساتھ اخبارات سے رجوع کرنا پڑا۔ اور پھر یہ سلسلہ ہمارے روزمرہ کے معمولات کا لازمی جز
...گیا ٹی. وی سے سماچار سننا اور ان کی افہام و تفہیم کے لیے اخبارات کے آگے زانوئے نیوز تہہ کرنا۔!!

ٹی. وی کے ذریعہ دوردرشن والے جہاں داخلی اور خارجی کوائف کو اپنے روشن اسکرین پر پیش کرکے "ڈمسکے ڈھول اور
...بھکاڈ فلی" کو ایک ہی آرکسٹرا میں کھپا دیتے ہیں، وہیں آپ کے رشتہ داروں، دوستوں، شناساؤں اور لاڈسیوں پڑوسیوں
...سور بچہ" کی جادوئی چھڑی سے ہانک کر دھڑ دھڑ سے لے آتے ہیں اور پھر آپ کے "دس ضرب دس فیٹ" کے مختصر سے ڈرائنگ
...میں گھسا دیتے ہیں تاکہ آپ کے غریب خانے اور پبلسٹی کے کانجی ہاؤز میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس
...کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کیوں کہ ہم ایک کالونی میں رہتے ہیں اور کالونی کے باشندے خدا کے فضل سے ایک دوسرے کے نجی
...لات میں براہ راست مخل ہونے کے بجائے پس پردہ کارروائیوں کو ترجیح دیتے ہیں یعنی دیواروں سے کان لگا کر اس
...ن کی سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پڑوس میں جو جوڑا رہتا ہے وہ واقعی میاں بیوی ہے یا بیوی میاں۔!!

اب رہا ٹی وی کا معاملہ تو یہاں پر اہلِ خانہ چاہے صاحبِ بیوی ہو یا نہیں، صاحبِ ٹی وی ضرور ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے ٹی وی کی اس ریکارڈ توڑ بہتات کے تعلق سے کالونی کی مشہور شخصیت اور ناکام وکیل جناب نمک مرچ والا سے دریافت کیا تو مسکرا کر بولے "قسم ہے انصاف کے ترازو کی! بھائی جان ٹی وی بھی کیا بیوی ہے جس پر سرکار یہ قانونی روک لگا سکتی ہے کہ پہلا ٹی وی ابھی نہیں، دوسرا ٹی وی کبھی نہیں ہے، آپ چاہے جتنے ٹی وی جہیز میں لے آئیے اگر کسی مائی کے لال نے روکنے یا ٹوکنے کی کوشش کی تو بندہ حاضر ہے مقدمہ لڑنے کے لیے ——!!"

قصہ مختصر یہ کہ کالونی میں موجود ٹی وی سٹیس (ی ہ ہ ی) کی زاید از نصاب، تعداد ہمارے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ لیکن ایک شام ہمارا اطمینان غارت ہوگیا، اُدھر "کال بیل" نے اپنی مخصوص دھن سنائی اِدھر دماغ میں خطرے کی گھنٹی ٹنٹنائی دروازہ کھول کر دیکھا تو ہمارے پڑوسی جناب صمصام الدین سرسام صاحب ہونقوں کی شکل بنائے کھڑے تھے گھبرا کے پوچھا۔ "کیا بات ہے سرسام صاحب، سب خیریت ہے نا؟" روہانسے لہجے میں بولے "خیریت کہاں بھائی صاحب! آج مرزا غالب کی برسی ہے"! اس بے تکے جواب پر ہم نے سٹپٹا کر پوچھا "مرزا غالب کی برسی کا آپ کی خیریت سے کیا تعلق ؟" بولے "ہے، بڑا گہرا تعلق بالکل ویسا ہی جیسا کہ مرزا غالب کے شعروں کا اُن کے "ازار بند" سے تھا" کیا عرض کروں ابھی تھوڑی دیر میں مرزا غالب پر ایک ٹی وی رپورٹ پیش کی جانے والی ہے اور اتفاق دیکھئے کہ آج ہی گھر والی کو میرا تخلص ہو گیا ہے!" "تخلص ہوگیا ہے ؟" ہماری حیرت قابلِ دید تھی، بولے "نہیں سمجھے۔ سرشام سے اُسے سرسام ہوگیا ہے ٹی وی کو ہاتھ لگانے نہیں دے رہی ہے" "کیا بتاؤں بھائی صاحب، مرزا غالب میری کمزوری ہیں آپ کے اخلاق کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ اس لیے بڑی اُمیدوں کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں!" موصوف نے کچھ اس طرح ہمیں اخلاق کے قطب مینار پر چڑھایا کہ ہم نے صرف گھر کا ہی نہیں دل کا دروازہ بھی ان کے لیے کھول دیا لیکن جواب میں سرسام صاحب نے بجائے ہمارا شکریہ ادا کرنے کے سیڑھیوں کی طرف پلٹ کر ایک زوردار ہانک لگائی۔ "اماں مغلوب صاحب، اپنے شاگردوں سمیت اوپر آجائیے بھائی صاحب نے میری درخواست قبول فرمالی"۔ اس سے پہلے کہ ہم معاملہ کی نزاکت کو پوری طرح سمجھتے، مغلوب صاحب معہ شاگردوں کے نمودار ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا مختصر سا ڈرائنگ روم، مشاعرے کے پنڈال میں تبدیل ہوگیا۔ اُدھر ٹی وی پر پروگرام شروع ہوا اِدھر ڈرائنگ روم میں طوفانِ بدتمیزی کی شروعات ہوگئی ٹی وی کے اسکرین پر جیسے ہی مرزا غالب کے مزار کا "کلوز اپ" دکھایا گیا، سرسام صاحب چلائے "اماں مغلوب صاحب! فوراً چادر گل چڑھائیے مرزا کے مزار پر" مغلوب صاحب نے تعمیل حکم میں جھولے میں سے چادر گل نکالی اور پھر بڑی عقیدت کے ساتھ اسے ہمارے ٹی وی پر چڑھا دیا۔ غالب کے ایک اور طرفدار نے جھولے میں سے وسکی کی بوتل اور دوسرے نے آم نکال کر فرش پر ڈھیر لگا دیا۔ ہم نے یہ تماشا دیکھ کر جھنجلا کے پوچھا "یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟" جواب میں سرسام صاحب حقارت سے بولے "آپ اردو والے ہو کر یہ نہیں جانتے ؟ مرزا کو شراب کے علاوہ لنگڑے آم کس قدر مرغوب تھے، ان لوازمات کے بغیر یہ خراجِ عقیدت، ادھورا ہے تشنہ ہے نامکمل ہے!" اس عجیب و غریب دلیل کے ساتھ ہمارا منہ بند کر کے غالب نوازوں کی چنڈال چوکڑی "باجماعت" خراجِ عقیدت پیش کرنے میں مصروف ہوگئی اور تھوڑی ہی دیر میں "جوشِ عقیدت" میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ خراجِ عقیدت کے دریا بہا دیئے چنانچہ جس وقت پروگرام ختم ہوا، سب کو خاصی مقدار

میں "خراجِ عقیدت" چڑھ چکی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصت کرتے وقت ہمیں ایک ایک غالب کے طرفدار کے سا "دھینگا مشتی" کرنی پڑی۔ البتہ سرسام صاحب کے تعلق سے۔ بعد میں یہ بھید کھلا کہ وہ اپنے "الکٹرک بل" کو ایک حا عد میں رکھنے کے لیے کالونی میں جس کے ہاں بھی نیا نیا ٹی وی آتا ہے اسی طرح مختلف بہانوں سے اپنے احباب سمیت نازل ہو جاتے ہیں۔ غالب کے طرفداروں کو بھگتنے کے بعد ہم پڑوس میں پائے جانے والے "سرسامیوں" سے ضرور چوکنا ہو گئے ہیں لیکن دوردرشن کے پروگراموں میں آئے دن حصہ لے کر بور کرنے والے "سرسامیوں" سے فرار حاصل کرنا اب تک نہیں آیا، حالاں کہ ٹی وی کو غریب خانے میں "دخل درنا معقولات" فرمائے کافی عرصہ ہو چکا ہے لیکن سچ پوچھیے روز اول سے لے کر آج کی تاریخ تک ہمیں اپنے ٹی وی پر صرف اسی وقت پیار آتا ہے جب وہ خاموش ہوتا ہے یعنی ہوتا ہے یا پھر کوئی بور پروگرام چلتے چلتے اچانک غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ اسکرین پر یہ دل خوش کن تحریر نمودار ہوتی ہے "SORRY FOR INTERUPTION"۔ رکاوٹ کے لیے کھید ہے۔!!! ■

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں!

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵ روپے
دھرگھیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	9 "
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷ "
بالآخر	مجتبیٰ حسین	"	۱۲ "
تکلف برطرف	مجتبیٰ حسین	"	۱۴ "
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	مضامین	۱۲ روپے
سیکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعہ کلام	۱۲ "

غزلیں

نیاز سواتی ۔ پاکستان

○

کس دیدہ دلیری سے چرائیں مری غزلیں
خود منہ پہ مرے اس نے سنائیں مری غزلیں

یوں اس نے بھری بزم میں گائیں مری غزلیں
ہر شخص کی نظروں سے گرائیں مری غزلیں

ہر چند میں رکھتا ہوں بیاض اپنی چھپا کر
حیران ہوں پھر کیسے چرائیں مری غزلیں

اس کو بھی نظر عیب نہ آیا کوئی ان میں
استاد نے گو ٹھونکیں بجائیں مری غزلیں

غزلیں تھیں مری داد مگر اس کو ملی ہے
اچھا ہوا کام اس کے تو آئیں مری غزلیں

شادی سے وہ چیک لے کے روانہ ہوا گھر کو
حالاں کہ وہاں جا کے سنائیں مری غزلیں

قطعات کا اب ان پہ گماں ہونے لگا ہے
یوں قد میں ستمگر نے گھٹائیں مری غزلیں

اس نے مرے مقطعوں سے مٹا ڈالے تخلص
یوں مقطعوں کی جان سے گھسائیں مری غزلیں

○

یہ مت سمجھ وہ ترے سارے گھر کو بھر دے گا
سسر جہیز میں سامان مختصر دے گا

نہ فیس جا کے کلینک میں تو اگر دے گا
کوئی بھی تجھ پہ توجہ نہ ڈاکٹر دے گا

نہ لب ہلائے گا اور لب اگر ہلائے بھی
جواب تجھ کو سوالوں کے مختصر دے گا

گواہی دے تو رہا ہے خلاف قاتل کے
رہا ہوا تو تجھے بھی وہ قتل کر دے گا

نہ اس کے واسطے چھوڑے گا جائداد اگر
تمام عمر تجھے گالیاں پسر دے گا

پسر کے واسطے چھوڑے گا گر حرام کا مال
نیاز! تجھ کو دعائیں وہ عمر بھر دے گا

○

ارادہ جب بھی کرتا ہوں میں اسکے پاس جانے کا
جو میرے سر پہ برسے تھے وہ پتھر یاد آتے ہیں

پڑا ہے جب سے پالا سخت خوفاوند سے میڈم کو
گزشتہ اسکو سب مظلوم شوہر یاد آتے ہیں

بقائے کا تقاضا جو نہ کرتے تھے کنڈیکٹر سے
کنڈیکٹر کو سبھی ایسے پسنجر یاد آتے ہیں

ذرا سا بھی اگر رکھتے ہیں پاؤں ایکسی لیٹر پر
ہمیں فی الفور سب ٹائر کے پنکچر یاد آتے ہیں

وہ روتی ہے کہ چیک شوہر نے فادر سے نہیں بھیجا
غلط سمجھے ہو تم میڈم کو مسٹر یاد آتے ہیں

دیا کرتے تھے پٹواری کو جو ان کو تحفتاً لاکر
وہ افسر مال کو گھی کے کنستر یاد آتے ہیں

بدست خود جو ہم کو امتحاں میں نقل دیتے تھے
نیاز! اب بھی ہمیں اپنے وہ ٹیچر یاد آتے ہیں

○

کرنسی نوٹوں کی جیب میں جب تلک ہماری کمی رہیگی
ہمیشہ لوگوں سے قرض لو گے ہمیشہ مقروض تم رہو گے

نہ پورے ہوں گے جب اس کے سپنے سنو گے تم اہلیہ کے طعنے
اگر تم اوورسیئر بنو گے تو پانچوں ہونگی تمہاری گھی میں

اگر ترقی کی ہے طلب تو دعا کرو ان کی موت آئے
نیاز! ہوتی ہیں مشکلیں حل فقط سفارش کے چیک ہی سے

کھنچے کھنچے وہ رہیں گے ہم سے اسی طرح بے رخی رہیگی
تمہاری انکم کا گر ذریعہ فقط پروفیسری رہے گی

تمہاری اور اہلیہ کی آپس میں یونہی سرد ٹھنی رہے گی
تمہارے گھر میں کسی بھی شے کی تمہیں کوئی بھی کمی رہے گی

نہ جب تلک سینئر مریں گے تری ترقی رکی رہے گی
نہیں سفارش تو قابلیت تری دھری کی دھری رہے گی

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدر آباد پر مضامین کا سلسلہ)

قدرت نے انسانی صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے وقت کو دن اور رات میں تقسیم کیا تاکہ انسان دن میں کام اور رات میں
ام کرے لیکن انسان کی سہل پسند فطرت نے چھٹیاں ایجاد کیں ہر روز کام کرنے کے بجائے ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کی بنیاد
الی۔ ایک دن آرام کے لیے مختص کر لیا۔ اس تعطیل کے علاوہ وقتاً فوقتاً چھٹیاں بھی منانے لگا۔ جب انسان کو ہفتہ میں ایک چھٹی
سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے اپنے تساہل کو زندہ رکھنے کے لیے ہفتہ میں دو چھٹیاں لینی شروع کیں اب ہمارے شہر میں بھی یہی طریقہ رائج
ہوگیا۔ پانچ دن کام کے بعد دو دن کی چھٹی جس کے لیے ہم نے "پنجفتہ" کی اصطلاح وضع کی ہے۔

ہمارا ملک زیادہ تعطیلات کی وجہ سے مشہور ہے۔ شاید ہی دنیا کے کسی اور حصہ میں اتنی تعطیلات ملتی ہوں گی بسال
۳۶۵، دن میں ۵۲ اتوار کی چھٹیاں، ۲۴ دن عام تعطیلات، اتنے ہی اختیاری تعطیلات، ۱۵ دن رخصت اتفاقی اور ۳۰ دن رخصت
اص کا حق اور اب مزید ۵۲ دن ہفتہ کی چھٹیاں، ان چھٹیوں کے علاوہ کسی لیڈر کے مرنے، کرکٹ یا ہاکی میچ جیتنے کی خوشی،
فساد پھوٹ پڑنے پر الگ سے تعطیلات! اس حساب سے ہم سال کے دو تہائی دن چھٹیوں میں گزارتے ہیں اور بقیہ ایک
ئی دن کام کرتے ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ کام سے زائد چھٹیوں کی تھکن اتارتے ہیں۔ ایک سیاسی قائد کو موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے اپنی
اریر میں اس کو موضوع بنایا۔ سال میں اتنے کم دن کام کرنے سے ہم کیا ترقی کریں گے؟ ہمیں ترقی کرنا ہے تو دن رات محنت
ی ہوگی۔ پنجفتہ سے ملک کی ترقی رک جائے گی۔ آج وقت ایسا ہے کہ عوام کو بغیر کوئی چھٹی لئے ہفتہ کے سات دن مہینے کے
ں دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن صرف کام ہی کام کرنا ہے۔

ہمارا ملک دنیا کی دوسری سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے فیملی پروگرام زور شور سے چلائے جا رہے ہیں۔ دو یا تین
سے آج کل نعرہ ہم دو ہمارے دو اور دوسرا بچہ ابھی نہیں کبھی نہیں پر آکر ٹکا ہے آگے کیا ہو۔ قیاس مضحکہ خیز لگتا ہے فیملی پروگرام
، خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے اور آبادی میں مسلسل اضافہ کی وجہ اب ہمارے سمجھ میں یہ آئی ہے کہ ہمارے یہاں چھٹیاں
ملتی ہیں جب کہ دیگر تفریح کے مواقع کم سے کم ہیں۔ ہفتہ میں ایک چھٹی تھی تو آبادی دوسرے نمبر پہ تھی اب ہفتہ میں دو چھٹیاں
ں تو وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب ہمارا ملک نمبر ایک مقام حاصل کر لے گا۔

پنجفتہ کے نفاذ سے اکثر شہریوں کو خوشی بلکہ بے حد خوشی ہوئی ہے۔ پانچ دن کام کرو اور دو دن آرام کرو۔ ہمارے ایک دوست نے کہا "پانچ دن کے بعد دو دن کا آرام بہت اچھا لگتا ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی منانے کے بعد پیر کو کام پر جانے کے لیے طبیعت نہیں چاہتی دل چاہتا ہے کہ پیر کو بھی چھٹی ہو"۔ لیکن جناب بات صرف خواہش تک محدود نہیں ہے۔ بعض لوگ پیر کی صبح بیمار رہنے لگے ہیں کبھی بخار ہے تو کبھی پیٹ کا درد ہو رہا ہے۔ کبھی اجابتیں تو کبھی قئے ہو رہی ہے۔ پیر کے دن چھٹی منانے پر یہ شکایتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ایک ڈاکٹر دوست نے اس مرض کا نام MONDAY FEVER بتلایا ہے۔

وہ زمانہ بیت گیا جب صدر خاندان گھریلو ذمہ داریوں کے سبب گھر پر مقید رہتا تھا۔ آج صدر خاندان اپنے محدود وسائل کے باعث گھریلو معاشی مسئلوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔ وہ کم سے کم وقت گھر پر گزارتا ہے۔ ہماری مثال لیجئے۔ صبح نو بجے تک بستر پر دراز رہتے ہیں۔ بچے اسکول جانے کے بعد اٹھ کر دفتر کا رخ کرتے ہیں۔ دفتر ختم ہونے کے بعد اِدھر اُدھر سرگشت کے بعد رات دیر گئے گھر واپس ہوتے ہیں۔ اس وقت تک بچے سو جاتے ہیں۔ بیوی سمجھتی ہے کہ ہم صبح سے محنت کر کے شام گھر آتے ہیں۔ بیچاری گھر کا دکھڑا رونے کے بجائے ہماری خدمت میں لگ جاتی ہے۔ چھٹی کے دن ہم کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر گھر سے چلے جاتے ہیں تاکہ بچے اپنی ضروریات کی فہرست ہمارے حضور میں نہ پیش کریں مثلاً یہ کہ "پاپا میرا اسکول یونیفارم پھٹ گیا ہے نیا سلوا دیجئے" "میرا جوتا پھٹ گیا ہے" "دو ماہ سے اسکول کی فیس باقی ہے نام خارج کرنے کے لیے نوٹس دیا گیا ہے"۔ بیوی قریب آکر آہستہ سے کہتی ہے "بچی پہاڑ چڑھ رہی ہے"! اب جناب ہفتہ میں ایک دن اور گھر پر رہنے کے لیے عنایت کیا گیا ہے۔ صدر خاندان کیا کرے؟ کہاں کہاں کی خاک بٹورے؟ ہم نے اپنے ساتھیوں سے اس مسئلہ پر بات چیت کی اتفاق رائے سے چھٹیوں میں کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا گیا وقت بھی گزر جائے گا اور معاشی حالت میں سدھار ہوگا چنانچہ ایک ساتھی ہر کسی کو موت سے ڈرا کر بیمہ پالیسی قبول کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ایک اور ساتھی کرانہ دکان پر ہفتہ بھر کے حساب کتاب میں الٹ پھیر کرتے ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہم گلی کوچے گھوم پھر کر پرانا پلاسٹک کا سامان جمع کرتے اور پھر اُسے بیچتے ہیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان ترقی کرتا ہے تو اُسے چھٹیاں منانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ انسان کام کرتا رہتا ہے۔ وہ چھٹیوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ ترقی کے ساتھ چھٹیاں منانے کا تصور بھی آتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں پنجفتہ لاگو ہے وہاں پر ویک اینڈ شاندار طریقہ سے منایا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے جو امریکہ میں رہتے ہیں ہمیں بتلایا تھا ہمارے یہاں ویک اینڈ تقاریب میں بہت ENJOYMENT ہوتا ہے۔ لوگ گھر چھوڑ کر OUTING کرتے ہیں۔ خوب کھاتے پیتے اور DANCE کرتے ہیں۔ ویک اینڈ پر DATING اہم پروگرام رہتا ہے" پھر اپنی ایک آنکھ بند کر کے کہا "ہر ویک اینڈ ایک نئی DATING کرتے ہیں اس وقت ہمیں ان کی باتیں سن کر امریکہ جانے کے لیے دل للچایا تھا۔ اب یہی ویک اینڈ ہمیں ملا ہے تو سوچتے ہیں کہ کیا کریں۔ ہماری اتنی حیثیت کہاں کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں تفریح کے لیے جائیں۔ کہیں جائیں تو کیسے جائیں۔ بائیسکل پر صرف ایک آدمی سفر کر سکتا ہے۔ بیوی بچوں کا بار کیسے لادیں گے۔ اگر تفریحاً فلمیں دیکھیں تو ٹکٹ کے پیسے کہاں سے لائیں۔ سنتے ہیں پچھلے زمانے میں راجہ مہاراجہ جب کسی غریب پر مہربان ہوتے تو اسے اپنا ہاتھی تحفتہً پیش کرتے تھے جسے نہ وہ بیچ سکتا تھا نہ پال سکتا تھا۔ آج ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہفتہ میں دو تعطیلات ہمارے اسی ہاتھی کی طرح ہیں۔ ہمارے ایک دوست اس خیال سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہمیں ویک اینڈ اس لیے دیا گیا ہے کہ لائن میں کھڑا ہو کر جھگڑا

کے لیے کیروسین حاصل کیا جائے، راشن کی لائن میں کھڑے رہ کر کیلو دو کیلو اناج خریدا جائے۔ دودھ کے لیے قطاریں کھڑے ہوں اور جب نمبر آئے تو پتہ چلے کہ دودھ ختم ہوچکا ہے اور تفریح کے نام پر صبح قطاریں کھڑے ہوکر شام فلم کا ٹکٹ نہ ملنے پر گھر واپس آئیں اور تھک کر سو جائیں۔

پنچفتہ کے نفاذ سے زندگی کے روزمرہ کے معمولات میں گو فرق ضرور آیا ہے۔ پنچفتہ کے نفاذ سے پہلے صبح دیر سے ہوتی، تفصیل سے اخبار پڑھتے، بازار سے سودا سلف لاتے، ناشتہ کے نام پر شکم سیر ہوکر کھاتے، بچوں کو اسکول چھوڑ کر دفتر جاتے، دوپہر لنچ کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتے، دفتر ختم ہونے کے بعد دوستوں سے گپ شپ کرتے، کبھی کبھار، شاپنگ کرتے، گھر پہنچ کر گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کرتے، کھانا کھاتے اور سو جاتے تھے لیکن جب سے پنچفتہ کا نفاذ ہوا لگتا ہے زندگی کی ریل گاڑی جو پاسنجر تھی اب سوپر فاسٹ ٹرین بن گئی ہے۔ دفتر جلد شروع اور دیر سے بند ہوتا ہے۔ صبح اٹھ کر رات کا بچا کچا ناشتہ کیا، اخبار شام کے لیے اٹھا رکھا، بچوں سے کہدیا کہ اپنا انتظام آپ کریں، بغیر ٹفن دفتر کا رخ کیا باوجود کوشش اکثر دیر ہوہی جاتی ہے۔ لنچ پر کینٹین میں جو بھی ملا زہر مار کیا۔ شام بلکہ رات ہوئی دفتر سے نکلے اور سیدھے گھر پہنچے کھانا کھایا اور اخبار ہاتھ میں لیئے بستر پر دراز ہوئے۔ چند لمحوں میں اِدھر اخبار ہاتھ سے چھوٹا اور اُدھر منہ سے خراٹے بلند ہوتے لگے۔ گھر والوں کی خیر خیریت بھی دریافت نہ کرسکے۔ ہر ضروری اور غیر ضروری کام ہفتہ کے دن انجام دینے کے لیے ملتوی ہوا اور جب ہفتہ کا دن آتا ہے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ راشن لائیں، بچوں کی تعلیم و تربیت دیکھیں، شاپنگ کریں، کروسین لائیں، تفریح کے لیے جائیں، دوست احباب سے ملیں یا پانچ مصروف دنوں کی تھکن اتاریں۔ تھکن اتارنے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ چادر تان کر سو رہتے ہیں۔ ہر کام خود بخود آئندہ کے لیے ملتوی ہوجاتا ہے نتیجتاً چند ہفتوں بعد کام اور کام انجام نہ دینے کی شکایتوں کا انبار لگ جاتا ہے" اسکول یونیفارم اور کتابوں کے لیے چار ہفتوں سے وعدہ ہورہا ہے"۔ "راشن ختم ہوچکا ہے" "ڈاکٹر سے ملاقات کرنی ہے" "عرصہ سے کوئی فلم نہیں دیکھی گئی" وغیرہ وغیرہ!

چھٹی کے دن کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بازار بند رہتا ہے دفاتر اور بینک بند رہتے ہیں۔ سواریاں نہیں ملتیں۔ سڑکوں پر چہل پہل نہیں رہتی حتیٰ کہ دواخانے بھی بند رہتے ہیں۔ چھٹی کے دن کوئی کام نہیں ہوتا۔ لوگ گھر بیٹھے پلنگ توڑتے رہتے ہیں۔ بہت تھوڑے لوگ جو چھٹی کے دن کام کرتے ہیں حقیقتاً وہ کام نہیں کرتے بلکہ چھٹی منانے والوں پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اب آپ سے کیا چھپائیں ہم چھٹی کے دن بیمار پڑتے سے بھی تکلف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جو نہیں ملتے۔ ہمارے چھ سالہ لڑکے کو اس کے دوست کی پیدائش پر اعتراض ہے۔ وہ کہتا ہے" اتوار کو وہ کیسے پیدا ہوا، اتوار کو تو چھٹی رہتی ہے"۔

پنچفتہ کے نفاذ سے لگتا ہے گھریلو خواتین کی دعائیں بر آئی ہیں۔ شوہر اور بچے زائد وقت کے لیے گھر سے باہر رہیں گے گھر میں سکون رہے گا۔ ہفتہ اور اتوار شوہر گھر کا کام کاج کرے گا۔ ہمارے ایک ساتھی ویک اینڈ پر بچوں کو نہلاتے اور گھر کی صفائی کرتے ہیں ایک اور ساتھی چھٹیوں کے دن گھر کا پکوان کرتے ہیں انھیں اندیشہ ہے کہ اگر شوہر گھریلو کام کاج انجام نہ دے تو بیوی تفریح جانے اور فلم دیکھنے کے لیے اصرار کرے گی جس کے لیے پیسے چاہئیں جب کہ ماہانہ بجٹ میں تفریح طبع کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ پنچفتہ سے خواتین کو حاصل شدہ مراعات سے ہمیں یہ خیال آیا کہ پنچفتہ کا نفاذ خواتین کے سال میں ہونا چاہیئے تھا۔ خیر دیر آید درست آید۔

یہ ایک تلخ حقیقت لیکن سچی بات ہے کہ دفاتر میں میسّر آرام گھر پر نہیں ملتا۔ دفتر میں آرام دہ پش بیک کرسی، سر پر پنکھا دستاً فوقتاً چائے اور دوستوں کی صحبت جبکہ گھر میں ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ ایک بچہ کاندھے پر بیٹھا ہے دوسرے کا گھٹنا پیٹ میں چبھ رہا ہے ایک پنکھے کی ہوا سارا خاندان کھا رہا ہے۔ تیوریاں چڑھائے ہمیشہ منہ کھولے بیوی کھڑی ہے بچوں کی خواہشات کی تکرار، قرض خواہوں کا اصرار، آڑوس پڑوس سے بچوں کی چیخ و پکار، ان تمام مصیبتوں کا واحد حل دفتر ہے۔ گھر پر رہنے کی سزا ہفتہ میں ایک دن بھگت لیا کرتے تھے۔ لیکن اب پنچفنتہ کے نفاذ سے دو دن گھر پہ کیسے گزاریں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا "گھر پہ خیال آتا ہے کہ پنچفنتہ کے خلاف جہاد کر دوں یا پھر جنگل کی راہ لوں"۔

پنچفنتہ کا نفاذ ہمارے شہر کے لیے نیا نہیں ہے چند برس قبل بھی نافذ کیا گیا تھا۔ تجربہ ناکام رہا۔ ہمیں کام کرنے کا طریقہ تو خیر آتا نہ تھا چھٹیاں منانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ سبھی مسائل سے دو چار ہوئے اور چار دناچار چھ دن کا ہفتہ رائج ہوا۔ اب پھر وہی پرانی شراب نئی بوتل میں حاضر ہے ہماری دعا ہے کہ کم از کم اب ہمیں کام کرنے کا طریقہ اور چھٹیاں منانے کا سلیقہ آئے!! آمین ثم آمین۔

■■

بانو سرتاج (چندرا پور)

لانا جوئے شیر کا.....

طلباء میں ڈسپلن کے مسائل' اس موضوع پر ہم مقالہ لکھ رہے تھے جس کی تکمیل میں ہم نے کالج سے وابستہ جونیر کالج کے طلبا کو لیا تھا۔ آپ پوچھیں گے ہم نے جان بوجھ کر اوکھلی میں سر کیوں ڈالا؟ اسکولوں میں بھی گیارھویں جماعت ہوتی ہے اُن طلباء کو کیوں نہیں لیا؟ تو جناب آپ جانتے ہیں وقت آنے پر گدھے کو باپ کہنا پڑتا ہے ..... اسی طرح مقالہ مکمل ہونے تک گائیڈ یعنی سپروائزر یعنی ناخدا کی ہر جائز اور ناجائز بات ماننی ہوتی ہے۔ ہمارے گائیڈ (صرف مقالے کے) نے کہا کہ کالج کے طلباء کو... حکم حاکم مرگ مفاجات... ہم نے یہی طلباء لیے۔

کالجوں میں جاکر معلومات اکٹھا کرنا' آبیل مجھے مار والی بات تھی۔ آج جائیں گے' کل جائیں گے' کہہ کر ہم نے دو تین ماہ نکال دیئے۔ اس دوران درپردہ مختلف تیاریوں میں مصروف رہے۔ باقاعدگی سے یوگا کر کے بدن کو چست درست بنایا کہ خدانخواستہ کہیں طلباء گھیراؤ پر آمادہ ہو جائیں تو مار کھا کر ہی سہی مگر اپنے کاغذ پتر سمیت خیر سے (بدھو) گھر لوٹ سکیں۔ سوالنامے کا بنڈل پریس سے آکر گھر میں پڑا تھا اور ہم نجومیوں، جیوتشیوں کے پاس دوڑ رہے تھے کہ جایا۔ کوئی ایسا دن ایسا مہورت بتاؤ جس پر ح۔پ۔ ٹ۔ الف کا یوگ نہ ہو۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کا محاورہ ہمارے اردو ادب کی خوشحالی کے لیے کافی ہے۔ کالج میں قدم رکھتے ہی جوتے' چپل' ٹماٹر' انڈے برسنے کا محاورہ ایجاد کر کے اردو ادب پر احسان کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا۔

بہرحال نکلا دسمبر کی ایک سہانی صبح کا۔ ہم نے اپنے آپ کو عیار غیر میں چلنے کے لیے تیار کیا۔ . . اور کمر کس کر نکل پڑے۔ راہ میں خیال آیا اپنے جگری دوست کو ساتھ لے لیں۔ ایسے مشکل وقت بھی اگر دوست ساتھ نہ دے تو کس کام کا؟ امیر کے کالج پہنچے۔ اُسے صورت حال سے واقف کرایا۔ یقین دلایا کہ کبھی ہم بھی تمہارے کام آئیں گے' آج ہماری نیا پار لگا دو۔ امیر رضامند ہو گیا۔ ... پرنسپل سے یہ کہہ کر اس نے چھٹی لی کہ .

قیس جنگل میں اکیلا ہے' مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

سب سے پہلے ہم ایک کالج میں پہنچے جہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ ٹھیک ساڑھے دس بج رہے تھے۔

پر ہم پرنسپال کے آفس میں قریب آدھا گھنٹہ تشریف فرما رہے تب کہیں جا کر چپراسی نے توجہ فرمائی۔ اطلاع دی کہ پرنسپال صاحب بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ آج نہیں آئیں گے۔"

ہم وائس پرنسپال کے دفتر میں پہنچے۔ پندرہ منٹ کی لایعنی گفتگو کے بعد آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ "میں سینئر ونگ کا وائس پرنسپال ہوں۔ آپ جونیر کالج کے وائس پرنسپال سے ملیں۔"

ہم دوبارہ وہیں پہنچے جہاں سے چلے تھے۔ یعنی پرنسپال آفس کے بغل ہی میں وائس پرنسپال کا آفس تھا۔ اتفاق سے وہ پہلے ہی پانچ منٹ میں دستیاب ہو گئے۔ دوسرے پانچ منٹ میں ہماری آمد کا مدعا جان لیا اور تیسرے پانچ منٹ میں ایک نہایت طویل سانس کھینچ کر کرسی کی پشت سے ٹک گئے۔

"ہوں! تو آپ طلباء کو سوالنامہ دینا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ایسا کیجئے ہمیں دے دیجئے۔ ہم دے دیں گے۔" انہوں نے کرسی کی پشت سے سر اٹھا کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

"مگر ہمیں سوالنامے واپس بھی لینا ہیں۔" ہم نے پھرتی سے کہا۔

"وہ بھی طلباء کے ذریعہ پُر کئے ہوئے"... امیر نے ٹکڑا لگایا۔

"گویا مطلب یہ ہوا کہ آپ حضرات کلاس میں جا کر خود ہی سوالنامے دینا اور پُر کروانا چاہتے ہیں۔ آپ نے نتائج پر غور کر لیا ہے؟"

"جی ہاں... جی کیا مطلب؟" ہم دونوں ساتھ بولے۔

"آپ ہمیں اس مضمون کا ایک سرٹیفکٹ لکھ کر دے دیں کہ آپ اپنی ذمہ داری پر یہ کام کر رہے ہیں۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟" ہم نے دل ہی دل میں سہمتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ٹوٹ پھوٹ کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔"

ہمارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا... امیر نے ہمیں سمجھایا۔ "سبھی طلباء شرارتی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ شرافت سے پیش آئیں۔ پھر ہم ان کے کالج کے لکچرر تو ہیں نہیں۔ اگر ہم نے انہیں پڑھایا ہوتا تو وہ ہم سے بدلہ لیتے۔"

امیر کے کافی سمجھانے پر ہم نے تحریر وائس پرنسپال کے حوالے کر دی۔ انھوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو کسی خاص چپراسی کا نام لے کر اسے بلانے کی ہدایت دی۔ مذکورہ شخص بیس منٹ بعد آیا کیوں کہ چائے پانی کے لیے گیا ہوا تھا۔ وائس پرنسپال نے ہمارے آنے کی غرض و غایت بتا کر کہا کہ گیارھویں A پر کس کس کا کلاس ہے اور کون انھیں اپنا پیریڈ دینے کو تیار ہے پوچھ کر آؤ۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" آپ نے فلسفیانہ انداز میں کہا "ہر کوئی اپنا پیریڈ دینے کو تیار ہو جائے گا۔"

"تم سے جتنا کہا ہے کرو۔ ابھی تم معاملے کی نزاکت سے واقف نہیں ہو۔"

کمان سے چھوٹے تیر کی طرح وہ آفس سے نکلا تو ٹھیک اٹھائیس منٹ بعد یہ اطلاع لے کر لوٹا کہ سوا دو بجے کا مس کھانڈیکر کا پیریڈ ہم اپنے مشن کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس دوران ہم وائس پرنسپال کے آفس میں لگے ہوئے بورڈس کی ہر تحریر

ازبر کر چکے تھے۔ اخبار کی ہر اہم خبر تین بار اور ہر اڈیٹوریل تین منٹ چار مرتبہ پڑھ چکے تھے۔ وائس پرنسپال کا حلیہ۔ اُن کے کپڑوں کی رنگت بالوں کے اسٹائل یہاں تک کہ اُن کی کچھ خاص عادتوں کا گہرائی سے مطالعہ کر چکے تھے جیسے۔۔۔ ہر چالیس سکنڈ کے بعد وہ اپنے نتھنے پھلاتے تھے۔۔۔ ہر پندرہ سکنڈ کے بعد دانت کٹکٹاتے تھے۔۔۔ ہر آٹھویں منٹ پر چشمہ، خواہ اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی ہو نہ کی ہو، ناک پر جماتے تھے وغیرہ وغیرہ۔۔۔

چپراسی سے باادب دریافت کیا کہ حضور تشریف آوری میں تاخیر کس لیے ہوئی تو بولا "اسٹاف روم میں ایک بھی لکچرر موجود نہیں تھا۔ کینٹین میں، گیمس روم میں، پیڑوں کے نیچے انھیں تلاش کرنے میں وقت لگ گیا" حیرت کی بات تھی کہ کلاس پر کوئی نہیں تھا پھر بھی کوئی اپنا پیریڈ دینے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی جہانگیر نہ تھا کہ ٹامس رو کی باتوں میں آجاتا۔ عین اسی وقت مس کھانڈے کر تشریف لے آئیں۔ وہ ابھی ابھی ایک سیمینار سے بن بلائے مہمان کی حیثیت سے شرکت کر کے واپس لوٹی تھیں اور اپنے تجربات و مشاہدات سنانے کو از حد بے چین تھیں۔ انھوں نے نہایت فراخدلی سے اپنا پیریڈ علم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

ہم دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کلاس روم میں پہنچے تو دیکھا کلاس خالی! مس کھانڈے کر نے اطلاع بھیج دی تھی کہ وہ کلاس نہیں لیں گی۔ کلاس نہ چھوڑنے کی ہدایت انھوں نے نہیں دی تھی۔ ویسے بھی اُن کی کلاس میں پندرہ بیس سے زیادہ طلباء کبھی موجود نہ ہوتے تھے۔ اطلاع ملنے پر وہ بھی کلاس خالی کر گئے۔ ہم نے دیکھا کلاسوں کے علاوہ ہر جگہ طلباء نظر آرہے تھے۔ امیر نے چپراسی کو قریب بلا کر کہا۔ "گرو۔ یہ رہے تمہاری چائے کے دام، کسی طرح طلباء کو کلاس میں لاؤ"

چپراسی گیا اور پتہ نہیں کیا فسوں پھونکا کہ دم بھر میں پچاس ساٹھ لڑکے لڑکیاں کلاس میں آکر بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک منٹ کی تاخیر کئے بغیر تمہید شروع کر دی۔ سب سے پہلے اُن کے کلاس میں قدم رنجہ فرماتے پر مشکور ہوئے۔ پھر مختصراً اپنے مقالے کے بارے میں بتا کر اُن سے سوالنامے کے جوابات دینے کی درخواست کی۔

"بس اتنی سی بات تھی جناب!" ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "خواہ مخواہ تکلیف کی آپ نے؟ ہمیں اطلاع بھجوا دیتے۔ آپ کے گھر آکر سوالنامہ بھر جاتے"

"بس ذرا دعوت نامے چھپوانے پڑتے آپ کو" دوسری آواز آئی۔

"شکریہ آپ کا!" ہم نے تھوک نگل کر کہا۔ "اب ہم آگئے ہیں تو بغیر کسی گڑبڑ کے یہ کام یہیں ہو جاتے دیجئے"

"بغیر کسی گڑبڑ کے کیا معنی؟" ایک لڑکا بگڑ کر بولا۔ "کیا ہم اجڈ گنوار، غنڈے ہیں؟"

"نہیں۔ آپ لوگ غلط نہ سمجھیں۔ میرے دوست کا مطلب ہے آپ لوگ ابھی کمسن اور ناسمجھ ہیں"۔ امیر نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"سر!" ایک دوسرے طالب علم نے ہمیں مخاطب کیا "آپ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں؟"

"ہاں" "کیوں؟" ہمیں یہ سوال کچھ بے تکا۔ کچھ خطرناک لگا۔

"اس سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟" تپاک سے پوچھا گیا۔

ہم بے چین ہو گئے۔ کیا جواب دیں کچھ نہ سوجھا۔ امیر نے حالت نازک دیکھ کر فوراً سوالنامے تقسیم کرنے شروع کر دیے۔

"سر! یہاں کالم کے کالم میں کس کا نام لکھیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"آپ کا۔ ہر ایک اپنا اپنا نام لکھے۔"
"کالج کا کیا نام لکھنا ہے؟"
"اُف فوہ!" ہم نے ذرا تیزی سے کہا۔ جس کالج میں آپ بیٹھے ہیں اُس کالج کا نام لکھئے۔ اپنی عمر، اپنی کلاس جس میں آپ پڑھتے ہیں وہ لکھئے۔ پھر سوالات کے آگے دیئے ہوئے ہاں۔نہیں پر نشان لگا دیجئے۔"
سبھی طلباء قلم نکال کر مصروف ہو گئے۔ ہم نے چین کی سانس لی۔ ابھی سانس پوری طرح آزاد نہیں ہوئی تھی کہ طلباء نے سوالنامے واپس کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں سوالنامے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہم بار بار کہہ رہے تھے۔ دوستو۔ ساتھیو۔ ذرا اطمینان سے دیکھئے۔ کسی سوال کا جواب نہ رہ جائے۔ کوئی سوالنامہ ساتھ نہ لے جائے۔ مگر وہاں سننے کی کسے فرصت تھی؟ پانچ منٹ میں کلاس خالی ہو گیا۔
ہم دونوں جان بچا کر اپنے لاکھوں کے سوالنامے سنبھال کر باہر نکلے۔ قاعدے سے تو وائس پرنسپال سے مل کر جانا چاہئے تھا مگر ہم نے کسی اور دن پر اسے ملتوی کر دیا۔ گیٹ کے باہر کولڈ ڈرنک کے اسٹال پر چند طلباء کھڑے تھے۔ سوالنامہ کی کچھ بات تھی۔ ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔
"کیا لکھا تمہارے اس سوالنامے میں"؟ ایک پوچھ رہا تھا۔
"پڑھنے کی فرصت کسے تھی؟ اپن تو ایک ہاں پر۔ ایک نہیں پر ٹِک کرتے چلے گئے۔" دوسرے نے قہقہہ لگا کر کہا۔
"میں نے گن گن کر پہلے پانچ نشان ہاں پر اور دوسرے پانچ نشان نہیں پر لگائے۔"
ایک اور لڑکے نے اپنی کارگزاری کی اطلاع دی۔
چوتھے نے فوراً کہا۔ تجھے گننے کی فرصت مل گئی۔ واہ! واہ! میں نے تو پورا ایک صفحہ ہاں کا اور دوسرا پورا صفحہ نہیں نشان زدہ کر دیا۔"
سب قہقہے لگانے لگے پھر ایک اپنی ہنسی بمشکل ضبط کرتا ہوا بولا۔ "یہ اپنا بنٹو تو آنکھ بند کر کے نشان لگا رہا تھا۔"
"کون سا آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان تھا کہ آنکھیں کھول کر جواب دیتا۔" بنٹو نے لاپرواہی سے کہا۔ "پھر مجھے بچپن سے عادت ہے اس کام کی۔ میرے پتاجی کالج میں پروفیسر ہیں ان کے پاس آئے دن ایسے سوالنامے آتے رہتے ہیں۔ وہ ہم بچوں کو دے کر کہتے ہیں کہ بیٹا جہاں جی چاہے نشان لگا کر دے دو۔۔ میں ذرا مصروف ہوں۔"
ہم بدحواس گھر پہنچے۔ طلباء کی گفتگو کے بعد سوالنامے کھول کر دیکھنا ہی فضول تھا۔ مگر دیکھنا ضروری تھا۔ سو میں سات کاپیاں بھی صحیح طریقے سے پُر کی ہوئی نہیں تھیں۔ تقریباً ۷۰ کاپیاں واپس ہی نہیں آئی تھیں۔
دوسرے روز ہم پھر وائس پرنسپل کے آفس میں موجود تھے۔ وہ لہک کر بولے "مجھے کل اطلاع مل گئی تھی کہ آپ کا کام بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ آپ طلباء میں ڈسپلن کے موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ہمارے طلباء نے کیسی اچھی مثال پیش کی۔ ذرا بھی تو نہیں ستایا آپ کو۔"
"خاک مثال پیش کی؟" ہم نے جلے بھنے لہجے میں کہا اور حقیقت سے انھیں واقف کرایا۔ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچتے رہے پھر بولے "تو اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

دوبارہ سوالنامے پُر کروائیں گے اُن ہی طلباء سے۔ آپ ہمارے ساتھ کلاس میں چلیں۔ لیکن طلباء کو پہلے سے اطلاع دیں۔"

ہم دونوں کلاس پر پہنچے۔ انگریزی کے لکچرر کو کلاس چھوڑ دینے کی درخواست کر کے وائس پرنسپال ہمیں لیے ہوئے اس میں داخل ہوئے۔ ماحول کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ایک بھی طالب علم صورت آشنا نظر آ رہا تھا۔ ہم نے سوالنامے اول کر نام پکارنا شروع کیا۔ صرف گیارہ طالب علموں نے حاضری دی۔

ہم نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کل جو ستر بہتر طلباء یہاں موجود تھے کہاں ہیں؟"

سب کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔

ایک اپنی ہنسی روک کر بولا "وہ اس کالج کے نہیں تھے۔"

"کہاں کے تھے پھر؟ یہاں کیسے آئے تھے؟" ہماری پیشانی بوندوں سے بھر گئی۔

دوسرے کالجوں کے تھے۔ ہمارے کالج میں میچ دیکھنے آئے تھے۔"

"یہاں کلاس میں کس لیے آئے تھے؟"

"چپراسی نے کہا تھا کہ کلاس میں چلو دو آدمی کچھ کھیل دکھانے آئے ہیں۔"

ہم نے سر پیٹ لیا۔ "مگر انہوں نے اس کالج کا نام کیوں لکھا؟"

ایک لڑکا جو کل بھی موجود تھا فوراً بولا "آپ ہی نے تو کہا تھا جس کالج میں بیٹھے ہیں اُس کالج کا نام لکھو۔ اُنہوں نے لکھ دیا۔۔"

طلباء قہقہے لگا رہے تھے۔ پرنسپال ہماری طرف ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ کسی نے غلط نہیں کہا۔ سوالنامہ پُر کروانا جوئے شیر لانے سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ کیا ایک بار پھر جرأت کی جائے؟ ○○

دو غزلیں

سرپٹ حیدرآبادی

اک روز اتفاق سے موقع جو پاگئے
ہم خود ہی گھس کے اُن کی نظر میں سما گئے

ہم جن کے منتظر تھے وہ کیا آئے کیا گئے
آکر ہمیں ہتھیلی میں جنت دکھا گئے

وعدہ شکن سمجھ کے انہیں مطمئن تھا دل
پھر وعدہ کرکے ہم کو وہ اُلّو بنا گئے

یہ فائدہ ضرور ہوا اُن کے عشق سے
دھوکے، دھڑی کا فن، وہ ہمیں بھی سکھا گئے

رسّی تمام جل کے بنی ڈھیر راکھ کا
دیکھا بغور ہم نے تو وہ حُپ مُرا گئے

پیچھا چھڑانا چاہا تو وہ پیچھے پڑ گئے
میں ان سے دور بھاگا وہ نزدیک آگئے

تاریکیاں تھیں اُن کے مقدر میں غالباً
وہ میری موم بتی تک آکر بجھا گئے

بکواس کر رہے تھے بعنوانِ میکشی
رندوں کے آج شیخ جی بھیجے ہی کھا گئے

رونا بھی فن ہے سمجھو نہ بچوں کا کھیل اسے
باضابطہ جو رو نہ سکے، ہنہنا گئے

آئے تھے میرے دفن میں شرکت کے واسطے
لیکن وہ مُسکرا کے کفن میں سما گئے

سرپٹ بدل کے روپ نکالے ہمیشہ کام
پوچھا کسی نے نام تو ہم سٹ پٹا گئے

ہم آج تک اکیلے کہیں بھی نہیں گئے
ساتھ اپنے اُن کو لے گئے جب بھی کہیں گئے

مجبور سب تھے جانے پہ، زیرِ زمیں گئے
سارے بساطِ دھر کے مسند نشین گئے

جن کی نظر نظر تھی وہ سب دُوربین گئے
نکتہ شناس و نکتہ رس و نکتہ چین گئے

تنہا پسندی لے گئی، وہ خود نہیں گئے
کُنجِ لحد میں سونے جو گوشہ نشین گئے

جس جا ہم ایسوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی
اچھا ہوا کہ اس جگہ ہم خود نہیں گئے

کچھ ایسے لوگ جن کا تھا تحت الثریٰ مقام
دیکھے گئے وہ جانبِ عرشِ بریں گئے

ہم کو پسند آیا نہ کوئی بھی آستاں
ہم ہر جگہ لئے ہوئے اپنی جبیں گئے

ناراض ہو کے آگئے ہم جس مقام سے
بھولے سے بھی دوبارہ وہاں ہم نہیں گئے

ساقی کی بزم میں نہ رہے اُن کے راز، راز
لے کر جو اپنے جامِ تہہ آستین گئے

یوں تو اِدھر اُدھر گئے لیکن بوقتِ مرگ
گڑنا جہاں تھا کھنچ کے ہم آخر وہیں گئے

سرپٹ بطورِ خاص بلایا گیا ہمیں
سونی رہی وہ بزم جہاں ہم نہیں گئے

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

(قسط - ٦)

ایک سفر ہیومر اولمپکس کے لیے

سید ضمیر جعفری اور نریندر لوتھر کے پہنچنے سے محفل میں رونق سی آگئی نریندر لوتھر نے یہاں جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ کوٹیشن کی ذیل میں آتا ہے۔ اس جملے میں وہ ظرافت اور طنز موجود تھی، جو اس طرح کے جملے کے جملہ حقوق محفوظ نہیں رہنے دیتی اور یوں یہ جملہ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ اور نریندر لوتھر کا وہ جملہ کچھ یوں تھا کہ "خواتین و حضرات! پنجابی میری مادری زبان ہے۔ چنانچہ یہ زبان میری ماں کو آتی ہے، مجھے نہیں" نریندر لوتھر نے یہاں ایک اور مزیدار بات کہی اور وہ یہ کہ "اس وقت چھ زبانوں کے متوازی اجلاس ہو رہے ہیں میں کبھی ادھر جاتا ہوں کبھی اُدھر جاتا ہوں چنانچہ ساری زبانیں بھول گیا ہوں" پنجابی پر ہیلے کے اس اجلاس میں مزا مجھے اسٹیج سیکرٹری تارا سنگھ کامل کے ان تعارفی کلمات نے بھی دیا، جو انہوں نے میرے بارے میں ادا کئے یہ بزرگ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، چنانچہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نظم کہتا ہوں کہ نثر لکھتا ہوں، سنجیدہ لکھتا ہوں یا طنز و مزاح کو ذریعہ اظہار بناتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اسٹیج پر بلانے کے لیے جو محفوظ ٹائٹل کہا کی وہ اس طرح کی تھی "بہنو تے بھراؤ! اب جو شخصیت آپ کے سامنے آرہی ہے اس کے بارے میں مجھے آپ کو کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں، پاکستان اور ہندوستان کی منی تنی شخصیت ہیں میں ان کے بارے میں کچھ بتلانا اچھا نہیں لگتا، چنانچہ جب یہ مائک پر آئیں گے تو آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ یہ کیا چیز ہیں۔ اب میں قاسمی صاحب اور آپ کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا، چنانچہ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور اظہار خیال کریں؟" ان کی اناؤنسمنٹ پر مجھے ظہور نظر مرحوم یاد آ گئے۔ بہاولپور کے ایک مشاعرے میں اسٹیج سیکرٹری نے شاعر کا نام پکارنے سے پہلے کہا کہ اب میں جس شاعر کو دعوت سخن دے رہا ہوں، وہ جب اسٹیج پر آتے ہیں تو دلوں میں بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں ہر سمت ایک اجالا سا ہو جاتا ہے . . . . ابھی انھوں نے شاعر کا نام بھی نہیں پکارا تھا کہ ظہور نظر مرحوم اُٹھ کر مائک کی طرف جانے لگے اس پر اسٹیج سیکرٹری نے کہا ظہور صاحب یہ اناؤنسمنٹ آپ کے لیے نہیں تھی، آپ اپنے مقام پر تشریف رکھیں گے۔ اس پر ظہور نظر نے کہا اچھا! مگر پچھلے برس تو آپ نے یہ اناؤنسمنٹ میرے بارے میں کی تھی! سردار تارا سنگھ کامل کی اناؤنسمنٹ بھی اسی زمرے میں شامل تھی، جس کے بارے میں TO WHOM IT MAY CONCERN کے الفاظ بلا خوف و خطر کہے جا سکتے ہیں۔ بہرحال مجھے سوائے اپنی ایک پنجابی غزل کے کچھ یاد نہ تھا۔ سو میں نے وہ غزل یہاں سُنا دی

تیرے میرے سپنے سبھے نکلن گے
آدھی رات نوں سورج پورے نکلن گے

گھپ ہنیریاں غاراں دے دروازیاں چوں
پیلے ہتھ شالاں لے کے نکلن گے

ہتھاں دی دستک تے اک دن ویکھیں توں
بند گلی دے وچوں رستے نکلن گے

رانجھیاں دلاں دے خواب دی پورا ہووے گا
ہیراں دی بستی چوں کھیڑے نکلن گے!

سید ضمیر جعفری نے یہاں اپنی ایک پنجابی نظم سنائی اور محفل لوٹ لی۔ پنجاب سے سینکڑوں میل دور حیدرآباد دکن میں پنجابی کی اس محفل نے دل کو ایک عجیب طرح کی مسرت سے بھر دیا اور ان لمحوں میں میں نے سوچا کہ مادری زبان سے جو ایک والہانہ محبت اور لگاؤ ہوتا ہے اور اسے بولتے ہوئے جس طرح سچ بولنے کا احساس ہوتا ہے، وہ کس قدر فطری ہے۔ اردو میری قومی اور ثقافتی زبان ہے، مجھے اس

سے عشق ہے، لیکن پنجابی پنجابی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک لاہوریئے نے حج بیت اللہ سے واپسی پر اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "بھولے! میں قربان جاؤں اوس شہر توں پر لہور، لہور اے!" (بھولے! میں اس شہر پر قربان جاؤں، مگر لاہور، لاہور ہے) تقریب سے فراغت کے بعد نظام کلب پہنچے تو سردار رگھبیر سنگھ نے ہمارے لیے بڑی مخصوص کروائی ہوئی تھیں یہاں عشائیے میں ہم پاکستانی مہمانوں کے علاوہ اوم پرکاش بادل امریک سنگھ دلیپ سنگھ تاراسنگھ کامل لکشمن بہاٹیہ راج نارائن راز سیرال اور بیگم سیرال کے علاوہ دوسرے دوست مدعو تھے نظام کلب کے برآمدے میں دکن کے نظاموں کی تصویروں کے ساتھ فاتح حیدرآباد جنرل چودھری کی تصویر بھی آویزاں تھی گویا یہ تصویریں نہیں تھیں، تاریخ کا ایک ورق ہمارے سامنے کھلا پڑا تھا۔ یہ ورق میں نے غور سے پڑھا اور اس کے ساتھ میر نیازی کی نظم "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" میرے ذہن کے دریچوں میں در آئی! مگر میں نے یہ دریچے بند کرائے کیوں کہ یہ دریچے کھولنے میں بھی میں نے دیر کر دی تھی! ـــــ

رات کو ڈیڑھ بجے واپس ہوٹل پہنچے!

صبح دس فروری تھی اور آج بین الاقوامی لطیفوں کا سیشن تھا! زندہ دلان حیدرآباد کے طالب خوندمیری حمایت اللہ مصطفیٰ علی بیگ ڈاکٹر آنند راما اور "شگوفہ" کے ایڈیٹر سید مصطفیٰ کمال کمرے میں آئے "پے بہ پے" تقریبات نے ان کی "مت" ماری ہوئی تھی، وہ اس بات پر معذرت کر رہے تھے کہ وہ مہمانوں کی صحیح طور پر نگہداشت نہیں کر سکے حالاں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس شہر نے مہمانوں کو کتنی محبت دی ہے اور یہ کہ مہمان اس طرح کی تقریبات میں منتظمین کی بے پناہ مصروفیات اور ان کی مجبوریوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ پھر انہوں نے ہماری دیکھ بھال کے لیے جن دوستوں کو مامور کیا تھا، وہ ہماری دیکھ بھال ضرورت سے زیادہ کر رہے تھے۔ عالمی مزاح کانفرنس سے وابستہ یہ دوست جو اس وقت میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کئی دنوں کی تھکن سے بے حال ہو رہے تھے"۔ ان کی آنکھیں رتجگوں کی وجہ سے بند ہوئی جا رہی تھیں یہ لوگ گزشتہ ایک ماہ سے "شگوفہ" کے ایک چھوٹے سے دفتر میں صبح آٹھ بجے سے رات کے دو دو بجے تک کانفرنس کے انتظامات میں مشغول رہے تھے گویا وہ گزشتہ ایک ماہ سے بیویوں کی جھاڑیں بھی کھا رہے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔!

لطیفوں کے بین الاقوامی سیشن میں مشہور ٹی وی سٹار بے بی تبسم کیمپئر تھیں۔ یہاں ملک ملک کے لوگوں نے جو لطیفے سنائے سو سنائے مگر جو لطیفے بے بی تبسم نے سنائے ان میں سے کچھ "حدود آرڈیننس" کی حدود کو چھو رہے تھے! مثلاً مکمل تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا "اگر میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں تو؟" محبوبہ نے کہا "تو تم اس چور کی طرح بے وقوف سمجھے جاؤ گے جسے پوری کار چرانے کا موقع ملا، مگر اس نے صرف اسٹپنی چوری کرنے پر اکتفا کیا!" کمشنر لینڈ ریونیو ودورے سوامی نے یہاں "لوک سبھا" کو "جوک سبھا" کہہ کر محفل کو کشت زعفران بنا دیا! اس جشن قہقہہ میں کئی گھنٹے تک لوگ اتنا ہنسے کہ میں اداس ہو گیا!

لنچ کے دوران میری نظر ایک گٹھے ہوئے بدن کے شخص پر پڑی جس کے چہرے پر ایک باوقار سی مسکراہٹ تھی اور وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا انہوں نے مجھے گلے لگا لیا، یہ پروفیسر مغنی تبسم تھے۔ پاکستان اور بھارت میں یکساں طور پر مانے جانے والے نقاد اور محقق۔ مجھے انتظار حسین کا ایک خط اور ان کا سفرنامہ بھارت "زمین اور فلک اور" بھی ان کے سپرد کرنا تھا اور آج میں احتیاطاً یہ دونوں چیزیں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا ... میں نے یہ امانت ان کے سپرد کی۔ مجھے غیاث متین نے بتایا کہ مغنی تبسم اپنی اہلیہ کے اچانک انتقال کے بعد سے کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے غم کا سایہ ہم پر نہیں پڑنے دیا۔ انہوں نے سید ضمیر جعفری اور مجھے اگلے روز جامعہ عثمانیہ میں مدعو کیا تاکہ طلبہ وطالبات سے تبادلہ خیال ہو سکے۔

اور اب کھانے کے بعد ہم نے دور درشن (ٹیلی ویژن) والوں کو انٹرویو دینا تھا، اس کے بعد ثریا بیگم نے ریڈیو کے لیے انٹرویو کرنا تھا پھر صنعتی نمائش میں اردو کتابوں کے اسٹال پر جانا تھا۔ اور اس کے بعد رات کو حسن الدین احمد کے ہاں عشائیے میں شرکت کرنا تھی، گویا ان سارے پروگراموں میں "قیلولہ" کا پروگرام "مس" ہو رہا تھا!

جس ریسٹ ہاؤس میں لنچ کا اہتمام تھا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی یہیں ٹھہرے ہوئے تھے ٹیلیویژن والوں نے اس ریسٹ ہاؤس کے

ڈرائنگ روم کو "اسٹوڈیو" میں بدل دیا سید ضمیر جعفری کو پروفیسر مغنی تبسم اور مجھے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انٹرویو کرنا تھا انٹرویو میں تو جو باتیں ہوئیں
سو ہوئیں اس سے اچھی باتیں تو انٹرویو سے قبل ڈاکٹر نارنگ کے کمرے میں پروڈیوسر اور اسسٹنٹ پروڈیوسر سے ہوئیں پروڈیوسر جن کا اچھا سا نام
میں بھول گیا ہوں انٹرویو سے قبل پوری طرح "موڈ" میں تھے دوستانہ ماحول میں گپ شپ لگاتے ہوئے دفور محبت میں کہنے لگے "یار یہ کیا آپ
لوگوں نے الگ پاکستان بنالیا ہے آپ لوگ دوبارہ ہندوستان میں شامل ہوجائیں چاہے پورے ہندوستان کا نام پاکستان رکھ دیں!" میں
نے کہا "آپ نے یہ تجویز غالباً شیکسپیئر کو پڑھ کر پیش کی ہے جس نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے؟" ہنس کر کہنے لگے "نہیں میں سیریس ہوں!" میں نے
کہا "اگر آپ سیریس ہیں تو چلئے پھر میں بھی سیریس ہوجاتا ہوں" اور پھر میں واقعی سیریس ہوگیا "آپ کو پتہ ہے پاکستان بنانے میں آپ لوگوں کا کتنا
ہاتھ ہے؟ ہم لوگ اگر آپ کے برتن چھو لیتے تھے تو یہ برتن پلید ہوجاتے تھے ہم ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے کاروبار
ملازمت تعلیم کسی شعبے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں تھا ہمارے ساتھ آپ کا سلوک وہی تھا جو آج جنوبی آفریقہ کے سفید فام آقاؤں کا اپنی
سیاہ فام رعایا سے ہے" میرے دوست یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے "وہ نسل تو ختم ہوگئی!
اب تو آپ کا معاملہ ہماری نسل سے ہوگا جو یقین کریں پرانی نسل سے بہتر ہے"! میں نے کہا "ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں لیکن آج بھی یونیورسٹیوں
اور کالجوں کے انتخابات میں آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) جیت رہی ہے" کہنے لگے "ایسا ہرگز نہیں ہے انہیں کئی جگہ شکست بھی
ہوئی ہے" میں نے کہا انہیں شکست دینے والوں کے نعرے ممکن ہے مختلف ہوں مگر اس سے صورت حال میں معیاری تبدیلی واقع نہیں ہوئی"
اور گو کچھ مناظرے کی شکل اختیار کر رہی تھی جس کا احساس میرے علاوہ میرے اس دوست کو بھی ہوا چنانچہ وہ ہنس کر کہنے لگے "چلو ٹھیک ہے
لیکن یہ دو ملکوں کے درمیان جو اتنی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں انہیں کچھ تو نیچا کریں"! میں نے کہا "یہ دیواریں نیچی ہی نہیں ہونی چاہئیں
بلکہ ان میں جگہ جگہ کھڑکیاں بھی ہونا ضروری ہیں" اس پر سید ضمیر جعفری جو نیم غنودگی کے عالم میں آنکھیں بند کئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بستر
پر لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "یہ کھڑکی کی بات عطا نے اس لئے بھی کی ہے کہ یہ تو کالم بھی "روزن دیوار" ہی کے عنوان
سے لکھتا ہے"! اس دوران ایک خوبصورت غیر ملکی لڑکی معطر ہوا کے جھونکے کی طرح خراماں خراماں کمرے میں چلی آئی اس نے اتنے سارے
شکروں کو بیک وقت کمرے میں دیکھا تو کچھ دیر کے لئے ٹھٹھکی پھر اس نے کسی شخص کا نام لیا اور پوچھا کہ کیا وہ اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جنہوں نے آج ہی واپس دہلی جانا تھا کمرے میں بکھرا ہوا اپنا سامان یکجا کرنے میں مشغول تھے انہوں نے ایک نظر پہلے
سب کو دیکھا اور پھر اس حسینہ سے مخاطب ہو کر شائستگی سے کہنے لگے "نہیں محترمہ اس کمرے میں میں مقیم ہوں میرا نام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ہے فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں"۔ اس نے جواب میں کوئی خدمت بتانے کی بجائے "آئی ایم سوری" کہا جس کا اردو میں مطلب
گویا یہ ہے کہ مجھے افسوس ہے میں غلط کمرے میں آگئی حالانکہ کمرہ صحیح تھا کمرے میں موجود لوگ بھی کوئی اتنے غلط نہیں تھے مگر جب انسان
کی تلاش میں ہو تو پھر نظروں میں شان سکندری بھی نہیں جچتی!

اس اثناء میں میرے پروڈیوسر دوست ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے جہاں وہ کیمرہ مینوں کو ہدایات دے رہے تھے اسسٹنٹ
پروڈیوسر کشمیری پنڈت مسٹر منٹو تھے سرخ و سفید خوبصورت نوجوان چہرے پر فیشنی داڑھی جس سے ان کی وجاہت میں اور اضافہ ہوگیا
تھا انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا "میں بہت دیر سے آپ کی گفتگو سن رہا تھا مجھے آپ کی باتوں سے اتفاق ہے لیکن کیا مذہب کی بنیاد پر
کسی ریاست کا قیام کوئی مناسب بات ہے"؟ میں نے کہا "برادر عزیز اگر رنگ نسل زبان کی بنیاد پر ریاستیں وجود میں آسکتی ہیں تو مذہب
کی بنیاد پر کیوں نہیں؟ اور پھر دنیا میں تو بہت سے ایسے ملک ہیں اور بالکل برابر برابر میں واقع ہیں جو ایک ہی رنگ نسل زبان اور مذہب سے
تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی علیحدہ اور خود مختار حیثیت قائم ہے جب آپس میں نہیں بنتی مفادات کا تصادم ہوتا ہے گھر کی
دیواریں تنگ ہوجاتی ہیں تو دو بھائی بھی علیحدہ علیحدہ مکانوں میں منتقل ہوجاتے ہیں لہذا قیام پاکستان کو اگر خوش دلی سے تسلیم کرلیا جائے
تو علیحدہ علیحدہ گھروں میں رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہوسکتے ہیں یوں بھی موجودہ پاکستان صدیوں سے جغرافیائی
اور تاریخی لحاظ سے ایک علیحدہ یونٹ رہا ہے"! مجھے یہ نوجوان ہندوستان میں موجود اس گروہ کا فرد محسوس ہو رہا تھا جو کھلے دل و دماغ

سے چیزوں کو پرکھتے اور پھر انہیں قبول یا مسترد کرتے ہیں اور میرے نزدیک اس گروہ کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ مجھے اس نوجوان سے مکالمہ کرتے ہوئے دوری کی بجائے یگانگت کا احساس ہو رہا تھا۔

"ایک بات اور" ! میں نے ایک نہایت نازک مسئلے کی طرف آتے ہوئے کہا "ہندوستان میں اس وقت آٹھ دس کروڑ مسلمان موجود ہیں اور وہ اکثریت کے ہاتھوں خود کو محفوظ تصور نہیں کرتے حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۴۷ء میں پاکستان آنے کی بجائے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور یوں انہوں نے انڈین نیشنلزم کے تصور کو عملی طور پر قبول کیا آپ نے انہیں اس کا کیا اجر دیا سکھ آپ کا دست و بازو تھے۔ میں ۷۷ء میں ہندوستان آیا تو میں نے انہیں ہندوؤں سے زیادہ نیشنلسٹ پایا انھیں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا مگر آج ۱۹۸۵ء میں انھیں بھی اکثریت کے رویے سے شکایت ہے"!

گفتگو بہت سنجیدہ ہو گئی تھی چنانچہ میں نے اس کی گھمبیرتا کو کم کرنے کے لیے کہا "اب تو سکھوں کا مسئلہ اس شعر کی تفسیر بن گیا ہے۔"

کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں کھڑکیوں کے کھڑکنے سے کھڑکتا ہے کھڑک سنگھ اس پر منٹو نے ہنستے ہوئے کہا "چلیں چھوڑیں ان باتوں کو آپ یہ بتائیں کہ اگر ہندوستانی سماج سے فرقہ واریت کا زہر ختم ہو جائے تو؟" میں نے کہا "وہ دن ہندوستان کے لیے روز سعید سے کم نہیں ہو گا مگر اس کے باوجود پاکستان کی ضرورت اسی طرح قائم رہے گی ہمارا روحانی ثقافتی اور معاشی تحفظ اس خطے سے وابستہ ہے ہمیں ملازمتوں میں کاروبار میں تعلیم میں کسی اکثریت کے ساتھ کمپیٹ نہیں کرنا پڑتا چنانچہ پاکستان میں جو کچھ ہے وہ بلا شرکت غیرے ہمارا ہے اگر آپ کو ہم سے محبت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہم سے محبت ہے تو محبت میں اگر جدائی بھی محبت قائم رکھنے کا تقاضہ ہو تو وہ برداشت کر لینی چاہیئے"! منٹو میری بات کے آخری جملے پر مسکرائے اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد سنجیدہ انداز میں بولے "آپ کی بات اس لیے بھی میرے دل کو لگتی ہے کہ ہمارے کشمیر میں ایک خصوصی قانون کے تحت ہندوستان کے دوسرے علاقہ کے لوگوں پر یہاں آباد ہونے پر پابندی ہے اور یوں ہمیں بھی اکثریت کے دباؤ سے نجات ملی ہوئی ہے اور اس طرح ہمیں معاشی تحفظ کا خاصا احساس ہوتا ہے بہرحال آپ سے گفتگو کر کے دلی مسرت ہوئی مجھے آج بہت سی باتیں سمجھنے میں مدد ملی ہے" میں نے خلوص دل سے اس خوبصورت ہندو نوجوان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا "آپ یقین کریں مجھے آپ سے کئی گناہ زیادہ مسرت ہوئی ہے خدا کرے آپ خوش رہیں آباد رہیں پھلیں پھولیں ہمارے اور آپ کے درمیان موجود سب مسئلے خوش اسلوبی سے طے ہوں اور پھر ہم مل کر ہندوستان اور پاکستان کو خطہ جنت نشان بنا دیں"!

اس دوران کیمرہ مین ہمیں ڈرائنگ روم میں آنے کے لیے کہہ گیا تھا ڈاکٹر نارنگ پہلے ہی سے ڈرائنگ روم میں موجود تھے سید ضمیر جعفری تھے منٹو ہمیں ریکارڈنگ کے لیے ڈرائنگ روم میں آنے کا کہہ کر کمرے سے جا چکے تھے میں نے ضمیر صاحب کو ہولے سے جگاتے ہوئے کہا "آپ نے قیلولہ تو کر لیا اب ریکارڈنگ بھی کروائیں"! ضمیر صاحب نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں اور کہا "قیلولہ کس کم بخت نے کیا ہے میں جاگ رہا تھا اور تمہاری سب باتیں سن رہا تھا میں نے سوچا نوجوانوں کی اس گفتگو میں بزرگوں کی مداخلت کو کہیں "غیر ملکی مداخلت" سمجھ کر دونوں فریق میرے پیچھے نہ پڑ جائیں۔

ٹی وی کے لیے انٹرویو کی ریکارڈنگ کے بعد میں اور ضمیر جعفری ریڈیو اسٹیشن جانے کے لیے ڈاکٹر نارنگ پروفیسر مغنی تبسم اور بیگ احساس کے ساتھ دو کاروں میں بیٹھ گئے ریڈیو اسٹیشن پر ایگزیکٹو پروڈیوسر ثریا بیگم پہلے سے ہماری منتظر تھیں یہاں ڈاکٹر نارنگ پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر سلیمان اطہر نے ضمیر صاحب اور مجھ سے اردو کے مزاحیہ ادب کے حوالے سے گفتگو کی آخر میں پروفیسر سلیمان اطہر نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجود "دیواریں" ڈھانے کی بات کی تو ڈاکٹر نارنگ نے انہیں وہیں ٹوک دیا اور بعد میں ثریا بیگم سے کہا کہ وہ یہ حصہ گفتگو سے حذف کر دیں۔!

اور اب ہمارا یہ حال تھا کہ ہم تھک کر چور ہو چکے تھے مگر ابھی ہمیں صنعتی نمائش پر روزنامہ "سیاست" کا اردو کتابوں کا اسٹال دیکھنے کے لیے جانا تھا ہم جلدی جلدی ہوٹل پہنچے کہ چھ بجے "سیاست" والوں نے ہمیں لینے کے لیے آنا تھا مگر اس وقت شام کے سات بج رہے تھے پتہ چلا کہ "سیاست" کے جائنٹ ایڈیٹر ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بھائی اور اردو کے نہایت سینئر صحافی اور ادیب محبوب حسین جگر ہمیں لینے کے لیے بنفس نفیس وقت مقررہ پر ہوٹل پہنچے تھے ہمیں اس بات پر بہت ندامت ہوئی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس دوران خواجہ معین الدین اور ذہانت بیگ ہمیں بک اسٹال پر لے جانے کے لیے ہوٹل پہنچ گئے نمائش گاہ میں داخل ہوئے تو یوں لگا میلے میں آ گئے ہیں چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ اسپیکر اور لوگوں کا وہ اژدہام

خدا کی پناہ! بک اسٹال کے قریب کیسٹ پر مزاحیہ مشاعرہ بھی چلایا جا رہا تھا میں نے سوچا کہ ہنسنا حیدرآباد والوں کی جبلت کا حصہ بن چکا ہے یہاں اردو کی بعض بہت قیمتی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

عابد علی خاں ایک فرد نہیں ایک تحریک کا نام: روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر جناب عابد علی خان صرف ایک اخبار کے مدیر اور مالک ہی نہیں بلکہ سیاسی ادبی اور سماجی سطح پر فعال ترین شخصیت ہیں انہوں نے صحافت کو مشن بنایا ہے عابد علی خان حیدرآباد میں سال بہ سال مشاعرہ بھی منعقد کراتے ہیں جس کی آمدنی فلاحی کاموں پر صرف ہوتی ہے اردو صحافت اور اردو ادب کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں عابد علی خان بطور ایک ہندوستانی شہری کے جہاں قوم کے مختلف طبقوں کے حقوق کے لیے سرگرم عمل ہیں وہاں بطور مسلمان انہوں نے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے بہت اہم اور دور رس اقدامات کیے ہیں صنعتی نمائش کے اس اسٹال پر ادارہ "سیاست" کی طرف سے ہمیں نہایت اہم موضوعات پر شائع شدہ کتابوں کا ایک ایک سیٹ دیا گیا یہ کتابیں ادارہ "سیاست" ہی نے شائع کی تھیں ہم نے مہمانوں کی کتاب پر اپنے "تاثرات لکھے اور بہت "مسرت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمائش میں سے نکلے کیونکہ اب ہمیں یہاں سے سابق سول سروینٹ اور حیدرآباد کی ممتاز علمی شخصیت جناب حسن الدین احمد کے ہاں عشائیے میں شرکت کے لیے جانا تھا!

اور جناب حسن الدین احمد کے پرانی وضع کے حویلی نما گھر میں داخل ہوتے ہی دل خوش ہو گیا ایک رئیسانہ انداز نفاست اور خوش ذوقی اس گھر کے در و دیوار سے ٹپک رہی تھی یہ خاندان نظام حیدرآباد کے مقربین میں سے رہا ہے چنانچہ اندر کمرے میں حضور نظام کی تصویریں اور تحریریں دیواروں پر آویزاں تھیں اہل خانہ خالص حیدرآبادی کلچر کا منہ بولتا نمونہ! اور کھانا اس کا مزید منہ بولتا نمونہ! نواب دین یار جنگ کے فرزند ڈاکٹر حسن الدین احمد انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس سے منسلک رہے ہیں آپ ولا اکیڈمی کے بانی اور صدر ہیں ان کی کتابیں) اردو الفاظ شماری ساز مغرب (دس حصے) انگریزی سے کئے گئے منظوم اردو ترجموں کا مجموعہ اور انجمن اور محفل (سوانحی مضامین کے مجموعے) ولا اکیڈمی کے تحت شائع ہوئے ہیں ان کے سوانحی مضامین کا ایک مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے یہاں سے واپسی پر سید ضمیر جعفری اور میں نے حسن عسکری صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ ان کے طفیل ہمیں اس گھر میں آنے اور اس گھر کے خوبصورت مکینوں سے ملنے کی "پریویلیج" حاصل ہوئی!

حسن الدین احمد کا ڈرائیور ہمیں ہوٹل چھوڑ کر گیا تھا اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے ضمیر جعفری حسن عسکری اور میں لفٹ میں داخل ہوئے تو وہ حسب معمول نہایت پھرتی سے بند ہو گئی! اور یوں ہم میں سے ایک آدھ "گراؤنڈ" ہوتے ہوتے رہ گیا ہم نے بھارت میں وقت کی قدر کنشکا ہوٹل کے بعد حیدرآباد کے اس نیمپورنا ہوٹل کی لفٹ سے سیکھی!

میں فرسٹ فلور پر پہنچ کر لفٹ سے نکلنے لگا تو ضمیر صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا "میرے کمرے میں چلو گپ لگاتے ہیں!"

اب ضمیر صاحب اور میں آلتی پالتی مارے اپنے اپنے بستروں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے ضمیر صاحب نے اپنی نئی نکور بتیسی پانی بھرے گلاس میں سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی اور یوں میں ان کی اس مسکراہٹ سے محروم ہو گیا تھا جس پر انہیں ایک ٹوتھ پیسٹ بنانے والے ادارے کی طرف سے بہترین مسکراہٹ کا انعام بھی مل چکا ہے ضمیر صاحب آج صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مسلسل مصروف رہنے کے باوجود نہ تھکے تھے نہ بور ہوئے تھے کیونکہ اس دوران بوریت کے مخصوص سگنل کے طور پر نہ انہوں نے بطخ کی آواز نکالی اور نہ کسی اجنبی سے انمل بے جوڑ قسم کی گفتگو کی جس پر وہ بے چارا حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگتا اور اس وقت بھی وہ ماشاء اللہ پوری طرح "فارم" میں تھے برصغیر کے اس مایہ ناز مزاح نگار میں بڑھاپے کا نہ چڑچڑاپن ہے نہ کہولت کے کوئی آثار ہیں اور نہ زندگی سے بیزاری کا کوئی رویہ ہے بلکہ انہیں دیکھ کر تو مایوس نوجوانوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے نظر بد دور وہ بھرپور زندگی گزارتے ہیں اور وہ خدا کی دی ہوئی اس خوبصورت زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے اور دوسروں کے لیے مزید خوشگوار بنانا چاہتے ہیں چنانچہ یہ بلبل رات گئے بھی چہک رہا تھا بتیسی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے منہ سے نکلنے والی ہوا اور آواز کے تناسب میں کچھ گڑبڑ سی ہو رہی تھی یوں بھی پوپلے منہ کی وجہ سے اس وقت وہ ضمیر صاحب کی بجائے ضمیر صاحب کے بڑے بھائی لگ رہے تھے ضمیر صاحب کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال ہیں اور وہ بالکل سیدھے تنے رہتے ہیں جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو میں سمجھا کہ شاید کسی بات پر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں مگر یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اگر یہ رونگٹے ہیں تو پھر مستقل کھڑے رہتے ہیں اور اس وقت بھی ان کے یہ رونگٹے کھڑے تھے۔

"ضمیر صاحب میرا آگرہ دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے اس دفعہ دہلی سے آگرہ ضرور چلیں گے" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہے" ضمیر صاحب نے کہا "آگرے ضرور چلیں گے وہاں کا پیٹھا بڑا مشہور ہے!"

میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی مگر میرے حلق سے نکلنے والے قہقہے نے میری نیند کو سلا دیا ایک مزاح نگار ہی آگرے کی پہچان تاج محل کی بجائے پیٹھا قرار دے سکتا تھا اور یوں ایک مضحک صورت حال سے مزاح کو جنم دے سکتا تھا۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "جی بول رہا ہوں" ضمیر صاحب نے ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے کہا۔

مگر بھارت کا ٹیلیفون سسٹم ٹھیک نہیں تھی تو پاک بھارت مذاکرات میں بھی ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دیتی شاید اسی لیے ضمیر صاحب نے ایک بار پھر اپنا فقرہ آواز کے پورے والیم سے دہرایا "جی جی بول رہا ہوں" مگر دوسری طرف آواز غالباً اب بھی نہیں پہنچی تھی چنانچہ اس دفعہ ضمیر صاحب نے دھاڑتے ہوئے کہا "بول رہا ہوں جی بول رہا ہوں" تیسری دفعہ ضمیر صاحب نے ریسیور مجھے تھما دیا ضمیر صاحب کو کم از کم دوسری طرف سے تو آواز سنائی دی تھی جبکہ میں اس سے بھی محروم رہا تاہم پانچ منٹ تک پیشہ ور واعظوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر میں نے گفتگو کی اور ٹیلیفون بند کر دیا میں نے ضمیر صاحب کو بتایا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ کال چنڈی گڑھ سے تھی اور آپ کے لیے تھی دوسری طرف گورنر ہریانہ جناب مظفر برنی کے سیکرٹری تھے جو گورنر صاحب کی طرف سے آپ کی بھارت آمد پر مسرت کا اظہار کر رہے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ آپ پاکستان واپسی سے قبل چنڈی گڑھ ضرور آئیں جہاں وہ آپ کے اعزاز میں کوئی تقریب رکھنا چاہتے ہیں چونکہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں چنانچہ ان کی وضعداری کے طفیل اس پیغام کا مخاطب میں بھی تھا تاہم میں نے انہیں بتایا ہے کہ ہم لوگ یہاں سے پرسوں بمبئی جا رہے ہیں وہاں تین چار روز قیام کے بعد دہلی جائیں گے آپ وہاں ضمیر صاحب سے رابطہ قائم کریں اس پر سیکرٹری نے کہا کہ گورنر صاحب بھی ان دنوں میں بمبئی جانے والے ہیں چنانچہ وہ بمبئی میں رابطہ قائم کریں گے اس کے بعد آواز چونکہ بالکل ہی سنائی نہیں دے رہی تھی اس لیے میں نے فون بند کر دیا اور انہیں یہ بھی نہ بتا سکا کہ بمبئی میں ہم نے جہاں قیام کرنا ہے اس کا ملحق الحال خود ہمیں بھی نہیں ہے آپ کو کیسے ہوگا؟

"بھئی سبحان اللہ کیا سمری پیش کی ہے!" ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ویسے برنی صاحب بہت صاحب علم آدمی ہیں اور مجھ سے پرانے محبت کرنے والے ہیں ان سے ملے بغیر جانے کو میرا اپنا جی نہیں چاہتا!"

ضمیر صاحب کی بات غالباً ابھی ادھوری تھی مگر میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا "ضمیر صاحب ایک شعر سنیئے!"

"ارشاد!" ۔۔۔ اس پر میں نے پوری سنجیدگی سے انہیں یہ شعر سنایا

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہا زنباق تریہا لکا زنباق تریہا

ضمیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "اس کا مطلب کیا ہے؟" میں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے بستر کی چادر بطور دھوتی کمر کے گرد باندھی اور کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے نیند آ رہی ہے!"

صبح جب آنکھ کھلی تو سابقہ تجربوں کی طرح اس دفعہ بھی دھوتی میں نے اوپر لی ہوئی تھی میں نے گھبرا کر ضمیر صاحب کے بستر پر نظر ڈالی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھے مگر وہ اتنی صبح کہاں چلے گئے میں یہ سوچ کر دوسرے ہی لمحے میں کچھ گھبرا سا گیا مگر کمرے میں موجود بلکہ بالکنی میں اچانک میری نظر سامنے کھڑکی کی طرف پڑی تو دیکھا ضمیر صاحب سجدے میں گرے تھے انہوں نے سلام پھیر کر دعا مانگی اور اٹھ کر اپنے بستر کی طرف آنے لگے تو مجھے جاگتا دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے مجھے یوں لگا جیسے رب اور اس کے بندے کے درمیان ہونے والے مکالمے سے کسی تیسرے شخص کی آگاہی نے انہیں پریشان سا کر دیا ہے!

شیو وغیرہ سے فراغت کے بعد ضمیر صاحب اور میں ناشتے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر ہلکا سا "ناک" کیا میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک نوجوان سامنے کھڑا تھا میں اس نوجوان کو گذشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے یا ضمیر صاحب سے اس دوران کبھی بات نہیں کی بس محبت سے دیکھتا رہتا تھا یا ہمہ وقت ہمیں کوئی سہولت بہم پہنچانے کے لیے مستعد رہتا تھا میں نے اسے صبح صبح اپنے سامنے کھڑے پایا تو دل خوش ہوا کہ صبح کا آغاز اچھا ہوا ہے اس نے ایک ہاتھ میں بڑا سا ٹفن کیریر پکڑا ہوا تھا میں دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا اور کہا

ہیں، اندر تشریف لائیں" مگر اس نے ٹفن کیریر مجھے تھماتے ہوئے کہا "میں آپ کے کمرے میں گیا تو دروازہ "لاک" تھا میں نے سوچا آپ یہاں ہوں گے میں ضمیر صاحب اور آپ کے لیے ناشتہ لایا ہوں"۔ اور پھر وہ کچھ کہے بغیر واپس لوٹ گیا میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا اندر آکر میں نے ٹفن کیریر کھولا تو اس میں پراٹھے آملیٹ بھنا ہوا قیمہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا گزشتہ روز میں اپنے دوستوں میں سے کسی سے کہہ رہا تھا کہ یار ہوٹل کے روٹین کے ناشتے سے بیزار ہوگیا ہوں اس وقت یہ نوجوان کہیں قریب کھڑا سن رہا تھا اور اب تھوڑی دیر پہلے وہ چپکے سے ٹفن کیریر پکڑا کر چلا گیا ہے مجھے اس غریب سے شخص کا نام بھی یاد نہیں غالباً اس کا نام منظور ہے مگر میں اسے ساری عمر نہیں بھول سکتا اس غریب شخص کا یہ خلوص بڑی بڑی ضیافتوں پر بھاری تھا! میں بہت کم آبدیدہ ہوتا ہوں مگر اس وقت میری آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے! میرے دوست! خدا تمہیں خوش رکھے اور خدا کرے تم اور تمہارا محبت بھرا شہر جملہ آفتوں سے محفوظ رہے!

کچھ دیر بعد کنور مہندر سنگھ بیدی، مجتبیٰ حسین، غیاث متین، مسیح انجم اور بیگ احساس آگئے کنور مہندر سنگھ بیدی آج رات عالمی مزاح کانفرنس کے سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدر آباد پہنچے تھے اور اس وقت ہم سب ان کی گل افشانی گفتار دیکھ رہے تھے حالانکہ اس وقت ان کے سامنے ساغر و مینا بھی نہیں تھے میرے جہازی سائز کے "اٹیچی کیس" کا تالا بیکار ہوگیا تھا اور کیمرے میں فلم پھنس گئی تھی مزاح نگار مسیح انجم نے اپنی مخصوص ہنسی ہنستے ہوئے کہا "عطا بھائی! کوئی کام ہو تو بتائیں"! اگر مسیح انجم کو پتہ ہوتا کہ میں انہیں کیا کام بتاؤں گا تو وہ شاید مجھ سے کبھی کام نہ پوچھتے مگر اب تو صیاد اپنے دام میں خود آگیا تھا چنانچہ میں نے اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسیح انجم سے کہا "اگر اس سلسلے میں کوئی "مسیحائی" ہو سکتی ہو تو اسے خالی کرکے لے جائیں" کیمرہ بیگ احساس نے مجھ سے لے لیا کہ یہ میں راستے میں ٹھیک کرا لاؤں گا! مہمانوں کی خوش قسمتی کہ انہیں ایسے میزبان ملے اور میزبان بے چارے تو ایسے مواقع پر مروت میں بہت کچھ کیا ہی کرتے ہیں پیارے میزبانو! ہمارا کہا سنا معاف کرنا ——! دوپہر کو جناب عابد علی خاں کے خوش ذوق صاحبزادے ڈاکٹر شاہد علی خان کے ساتھ ہم خان صاحب کے ظہرانے میں شرکت کے لیے ان کے گھر پہنچے تو وہاں کنور مہندر سنگھ بیدی، سید مکرم شاہ، صدر نشین قانون ساز کونسل آندھرا پردیش، محبوب حسین جگر، مجتبیٰ حسین، بہاء الدین بابر، خواجہ معین الدین اور ہلال سیوہاروی پہلے سے موجود تھے آندھرا پردیش کی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر سید مکرم شاہ سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی مگر وہ کچھ اس طرح ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں کھانے سے پہلے مختلف موضوعات پر گپ شپ کے دوران میں نے عابد علی خان سے پوچھا کہ ایڈیٹر "سیاست" ہونے کے حوالے سے آپ کو بھارت میں آزادی صحافت کے راستے میں کوئی دشواری محسوس ہوتی ہو گی یا نہیں یہ سوال میں نے ایسے پوچھا جیسے میرا دورہ بھارت یہ دشواریاں دور کرنے ہی کے سلسلے میں ہے خدا کا شکر ہے کہ اس کے جواب میں خان صاحب نے یہی کہا کہ بھارت میں صحافت پوری طرح آزاد ہے اسی طرح میرے اس سوال کے جواب میں کہ سچ لکھنے کی پاداش میں اخباری کاغذ کا کوٹہ یا اشتہارات تو کم نہیں ہو جاتے وہ کچھ حیران سے ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک بھارت میں اخبارات کے ضمن میں اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے جاتے غالباً دوسرے قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہوں گے کیوں کہ دنیا میں کوئی حکومت بھی فی الحال اتنی شریف نہیں ہے میر عابد علی خان دھیمے لہجے میں اور ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے ہیں اور ان کی پیروی میں مجھے بھی اس میر کا انداز اپنانا پڑ رہا تھا سو ان لمحوں میں "برادرم" ولی دکنی کا یہ مصرع یاد آیا

سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

تاہم پہلا مصرعہ دانستہ ذہن سے محو کر دیا کہ پردیس میں ایسے مصرعے یاد رکھنے سے اخلاق خراب ہوتا ہے!

کھانا کھاتے کھاتے دوپہر کے دو بج گئے تھے، اب یہ اچھا تو نہیں لگتا تھا کہ اس کے فوراً بعد میزبانوں سے اجازت مانگیں اور رفو چکر ہو جائیں مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ ڈھائی بجے ہمیں جامعہ عثمانیہ پہنچنا تھا جہاں شعبہ اردو کے اساتذہ نے طلبہ و طالبات سے ہماری ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ ڈاکٹر بیگ احساس جو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہیں گاڑی لیکر پہنچ چکے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کی پرشکوہ عمارت دیکھی اور اس کا ماضی یاد کیا تو دل پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی کیسے کیسے لوگ اس عظیم الشان یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں اور فروغ تعلیم کے علاوہ اردو کے سلسلے میں اس یونیورسٹی نے کتنی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں مجھے علم نہیں کہ آج یہ یونیورسٹی اپنی عظیم روایات سے کس حد تک وابستہ ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بڑی روایتیں اگر کمزور بھی ہو جائیں تو ان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت پھر بھی موجود رہتی ہے۔ اور کسی بھی وقت یہ چیز ان کے احیاء کا باعث بن جاتی ہے آرٹس فیکلٹی کی پرشکوہ اور وسیع و عریض بلند

سے ہوتے ہوئے جب ہم سیڑھیاں طے کر کے شعبہ اردو میں پہنچے تو وہاں پروفیسر مغنی تبسم صدر شعبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ، ریڈر غیاث متین اور دیگر اساتذہ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کمرے میں تھے جہاں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا اور جہاں طلبہ وطالبات کافی دیر سے ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر جعفر صاحبہ کے ابتدائی ۔ ارتی کلمات کے بعد غیاث متین نے سید ضمیر جعفری اور راقم کے حوالے سے کچھ گفتگو کی سید ضمیر جعفری نے جامعہ عثمانیہ کی خدمات کو بھر پور خراج تحسین ادا کیا بعد ازاں میں نے اپنے سفرنامہ امریکہ کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا، ضمیر صاحب سے ایک ایک کر کے ان کی کتنی ہی نظمیں سنی گئیں جامعہ عثمانیہ کی صورت میں حیدرآباد کی علمی وادبی اور تہذیبی عظمت کا ایک اور چشم دید نقش ہمارے دلوں پر ثبت ہو چکا تھا —— سیڑھیاں اتر کر کار کی طرف جاتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم نے کہا "ابھی آپ کو چھٹی نہیں ملے گی ابھی تو ہم آپ کو لائبریری اور اس کے ایک حصے میں موجود انتہائی نادر مخطوطے دکھائیں گے" فاطمی صاحب کی رہنمائی میں مخطوطے کیا دیکھے، پردیس میں ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ یاد آ گئے اگر ہمارے یہ مایہ ناز محققین یہاں ہوتے تو "پتھلا" مار کر یہیں بیٹھ جاتے اور ہلنے کا نام نہ لیتے مگر ضمیر صاحب نے کچھ دیر بعد بلغم کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں، شاید اس دفعہ یہ تھکاوٹ کا سگنل ہو!

پروفیسر مغنی تبسم، غیاث متین اور بیگ احساس یہاں سے ہمیں برابر والے بلاک میں لے گئے جہاں "ہفتمین کنگرۂ انجمن استادان فارسی ہند" یعنی فارسی اساتذہ کی ساتویں کل ہند کانفرنس منعقد ہو رہی تھی منتظمین کو یونیورسٹی میں ہماری آمد کی پیشگی اطلاع تھی چنانچہ انہوں نے پروفیسر مغنی تبسم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے سہی مگر اس کانفرنس میں ضرور شرکت کریں! یہاں فلسفہ کے نامی گرامی استاد پروفیسر نارائن کرن ریڈی صدارت کر رہے تھے۔ اس کانفرنس کا اہتمام کرنے والی انجمن کے صدر پروفیسر سید امیر حسن عابدی (استاد دلی یونیورسٹی) مقامی صدر پروفیسر (خانم) شریف النساء انصاری (استاد عثمانیہ یونیورسٹی) اور ناظم انجمن پروفیسر نور الحسن انصاری (دلی یونیورسٹی) ہیں مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ بھارت کی ۱۲۰ یونیورسٹیوں میں ۵۶ یونیورسٹیوں میں فارسی تعلیم کا انتظام ہے البتہ جس علم کے ساتھ رزق وابستہ نہ ہو وہ علم نافع تو ضرور رہتا ہے مگر اس علم کے حصول کی خواہش مند آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور فارسی کے سلسلے میں تو یہ دشواری اور بھی زیادہ ہے کیوں کہ "پڑھو فارسی بیچو تیل" والی "سلوگن" تو یوں بھی کافی عرصے سے چلا آ رہا ہے بھارت میں اردو سے محبت رکھنے والے لوگ تو اردو کو "ڈرپ" لگا کر زندہ رکھے ہوئے ہیں جو ہیں جی بی اور بڑھی، فارسی تو پھر بدیسی زبان ہے!

اب ساڑھے پانچ ہو چکے تھے ہم سات بجے جیلانی بانو اور انور معظم کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ چنانچہ بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، کپڑے تبدیل کئے اور پھر سیح انجم کے ساتھ اپنے خوبصورت میزبانوں کے ہاں پہنچے یہاں طنز ومزاح کانفرنس کے منتظمین نے پہلے سے ٹیلی فون پر جیلانی بانو سے کہہ رکھا تھا کہ مہمانوں کو ہر صورت میں آٹھ بجے تک مشاعرہ گاہ میں پہنچا دیا جائے طنز ومزاح پر مشتمل اس مشاعرے کے مہمان خصوصی سید ضمیر جعفری تھے اور صدارت گورنر آندھرا پردیش شری کمار شرما کر رہے تھے، چنانچہ جب ہم جیلانی بانو اور انور معظم کے ہاں پہنچے تو جیلانی بانو نے کھانا پہلے سے میز پر سجایا ہوا تھا میں جیلانی بانو کے افسانے کا تو پہلے سے قائل تھا اب ان کے کھانے کا بھی قائل ہو گیا۔ ان کا افسانہ اور کھانا ایک بار شروع کر دیں تو ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیلانی بانو آج بھی بہت گریس فل دکھائی دیتی ہیں وہ پاکستان آ چکی ہیں اور یہاں کے احباب کو بہت یاد کرتی ہیں فیض صاحب کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ جب وہ حیدرآباد آئے تو اسی گھر میں ان سے گھنٹوں باتیں ہوئیں وہ اندر سے البم اٹھا لائیں، جس میں فیض صاحب کے ساتھ اتری تصویروں کے علاوہ ان کی پاکستان یاترا کی تصویریں بھی سجی ہوئی تھیں۔ یہ تو میں آپ کو بتلانا بھول ہی گیا کہ یہاں ہماری ملاقات احمد جلیس سے بھی ہوئی۔ احمد جلیس جیلانی بانو کے بھائی ہیں اور ریڈیو میں پروگرام ایگزیکٹو رہے ہیں ادب سے ان کی وابستگی بہت گہری ہے جیلانی بانو کے میاں انور معظم پی ایچ ڈی ہیں اور اہل علم حلقوں میں اپنے علم اور شرافت سے پہچانے جاتے ہیں مجھے یہ چھوٹا سا گھر بہت خوبصورت لگا آپ کو بتانے کی ایک بات یہ تھی رہ گئی کہ جیلانی بانو نے فیض صاحب کے ساتھ اتری ہوئی تصویروں کے علاوہ فیض صاحب کا ایک خط بھی ہمیں پڑھایا جو انہوں نے آج سے تئیس (۲۳) برس پیشتر (۱۹۵۵ء) جیلانی بانو کو لکھا تھا چلئے یہ غیر مطبوعہ خط آپ بھی پڑھ لیں۔

"۴۱ ایمپریس روڈ لاہور، ۲۸ جون۔ جیلانی بانو صاحبہ تسلیم! آپ کی عمر کا اندازہ معلوم ہوتی ہے، جیل میں آپ کی تحریریں اکثر نظر سے گزریں۔

تعارف کی خواہش تھی لیکن معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں اس لیے آپ کے خط سے بہت مسرت ہوئی۔

میرے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو خیر مبالغہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کی دوستی اور خلوص مبالغہ نہیں حقیقت ہے اور جو مبالغہ بھی ہے تو کم وجہ مسرت نہیں اس کا شکریہ ادا کرنا تو تکلیف ہوگا لیکن اس کی وجہ سے کنج قفس میں جو فراغ اور آسودگی نصیب رہی ہے بیان نہیں کر سکتا۔

ادبی تحریکوں کے موجودہ حالات مجھے تفصیل سے معلوم نہیں اگرچہ ان کا کچھ اندازہ ضرور ہے ان کی تنظیم اور اصلاح اصل میں تو آپ نئے لکھنے والوں کا کام ہے اور آپ ہی اسے پورا بھی کریں گے۔ ادیب کا بنیادی کام تو لکھنا ہے تحریکیں اور انجمنیں اہم سہی لیکن ان کی اہمیت تو ادبی تخلیق ہی کے واسطے سے ہے یوں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے دونوں پر توجہ ہونا چاہیئے لیکن زیادہ اہمیت پھر بھی تخلیق ہی کی ہے جو تحریک کا مقصود ہوتی ہے اس لیے آپ لوگ جو لکھتے ہیں بہرصورت محض داد دینے والوں سے زیادہ اہم ہے بشرطیکہ وہ زندگی اور حقائق کے متعلق اپنے فکر کی تربیت میں کوتاہی نہ برتیں۔ میدان حشر کی طرح اس میدان میں بھی اپنا بوجھ ہر کسی کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے لیکن یہ تو میں نے وعظ شروع کر دیا خیر ہٹائیے یوں بھی خط کافی لمبا ہو گیا ہے اس لیے رخصت چاہتا ہوں ہمارا قضیہ ابھی طے نہیں ہونے پایا فی الحال ضمانت پر ہی نجات ہو گئی تو پھر کبھی گفتگو ہوگی ——"

اور اب یہاں سے ہمیں "سوئے دار" جانا تھا سو کچھ دیر بعد ہم مشاعرہ گاہ میں تھے فٹ بال گراؤنڈ میں منعقد ہونے والے اردو ہندی کے اس مخلوط مشاعرے میں پندرہ ہزار کے قریب سامعین موجود تھے خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں موجود تھی جن کے لیے پردے کا خصوصی اہتمام تھا مگر شاعروں سے کیا پردہ؟ چنانچہ اسٹیج اور "زنان خانے" کے درمیان کوئی قنات حائل نہیں تھی۔ صدارت گورنر صاحب کی تھی مہمان خصوصی سید ضمیر جعفری کے علاوہ سید مکرم شاہ اسپیکر قانون ساز اسمبلی تھے۔ ان کے برابر میں نواب شاہ عالم خاں بیٹھے ہوئے تھے مشاعرے کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کے سپرد تھی اور مشاعرہ گاہ کا انتظام پولیس اور فوج کے سپرد تھا۔!

اسٹیج پر میرے ساتھ ڈاکٹر رام پرشاد بیٹھے تھے۔ پھر سید مکرم شاہ تھے۔ ان کے ساتھ گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما، نواب شاہ عالم خان اور سید ضمیر جعفری تشریف فرما تھے مشاعرے میں خواتین کے لیے پردے کا معقول انتظام تو تھا ہی لیکن چوں کہ یہ اردو ہندی مشاعرہ تھا لہٰذا اس کی نظامت بھی دو حصوں میں "بٹ" گئی۔ اردو شعراء کا تعارف کنور مہندر سنگھ بیدی کر رہے تھے جب کہ ہندی شعراء کا تعارف مرلیدھر شرما کے ذمے تھا تاہم یہ جوڑ برابر کا نہیں تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ایک مجلسی آدمی ہیں اور ان کی ذات میں تہذیب رچاؤ اس قدر ہے کہ مخاطب ان کے سحر میں مبتلا ہے ان کی ساری عمر شاعروں اور مشاعروں میں بسر ہوئی ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مائک سنبھالا تو پھر ایک بلبل تھا جس کی چہکار کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ مشاعرے کے آغاز میں انہوں نے ہندو، سکھ، مسلم بھائی چارے کے حوالے سے کچھ باتیں کیں۔ مگر گفتگو کا یہ حصہ وہ تھا جس میں تاثیر کی کمی محسوس ہوئی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی انڈین نیشنلزم پر یقین رکھنے والے سکھ ہیں۔ وہ لاکھ فراخدل سہی مذہب سے ان کا تعلق بالکل ذاتی نوعیت کا سہی لیکن بڑے سے بڑا سیکولر شخص بھی اپنی کمیونٹی کے دکھ سکھ سے الگ نہیں رہ سکتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سکھوں پر ہونے والی زیادتیوں نے ان کا دل دکھایا ہوا ہے ان کے سارے خواب بکھر گئے ہیں۔ مگر یہ بکھرا بکھرا شخص خود کو مجتمع کر کے لوگوں کو ایک بار پھر پیار اور محبت کا درس دے رہا تھا۔ لیکن لگتا تھا جیسے اسے خود بھی اپنے بھاشن کی تاثیر کے بارے میں شبہ ہے۔ تاہم اس سے قطع نظر انہوں نے مشاعرے کی نظامت کے دوران ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑیں کہ محفل کشت زعفران بنی گئی اور یوں انہوں نے مشاعرے میں سامعین کی دلچسپی کسی بھی مرحلے پر کم نہیں ہونے دی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی جب تھک جاتے تو تھوڑی دیر کے لیے قنات کے پیچھے چلے جاتے اور بذریعہ گرائپ واٹر "دوبارہ چارج" ہو کر واپس آتے۔ ٹھیک رات کو بارہ بجے نظامت کے دوران انہوں نے اسٹیج پر کھانا بھی کھایا۔ بیدی صاحب کی عمر اس وقت اسی برس کے لگ بھگ ہے۔ مگر ان کی زندہ دلی انہیں عمر کے بیس بائیس برس کے عرصے میں رکھے ہوئے ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے اعلان کیا "حضرات! مجھے خواتین کی طرف سے ایک چٹ موصول ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسٹیج پر موجود شعراء تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ جائیں کیوں کہ خواتین میری شکل دیکھنا چاہتی ہیں" آندھرا پردیش کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما گاندھی ٹوپی، شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے بھاری تن و توش اور قد

نگر آدمی باذوق اور مزے کے تھے انہوں نے مزاحیہ مشاعرے کی مناسبت سے یہاں تقریر بھی شگفتہ کی۔ انہوں نے کہا "دکن کے فرسٹ سٹیزن ہونے کے ناطے سے میرا حق بنتا ہے کہ میں دکنی زبان میں تقریر کروں" چنانچہ انہوں نے اپنی مختصر سی تقریر پرانے دکنی لہجے میں کی۔ جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے ـــــ انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا "اب آپ لوگاں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ کیونکہ آپ شعراء کی "باتاں" سننے کے لیے یہاں آئے ہیں" ڈاکٹر وشرما مشاعرے کے دوران سرگوشی کے انداز میں بعض شاعروں پر دلچسپ جملے بھی کستے رہے۔ ایک دو بار تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے انہیں اپنی گورنری پر بہت غصہ آ رہا ہے جس کے پروٹوکول نے انہیں باندھ کر اسٹیج پر بٹھا رکھا ہے۔ ورنہ ان کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ بھی سامعین میں بیٹھے ہوتے اور جی کھول کو ہوٹنگ کرتے! بلکہ سپاہیوں پر سنگترے کے چھلکے بھی مارتے۔

اور اب اگر مشاعرے کے بارے میں آپ میری رائے پوچھیں تو سچی بات یہ ہے کہ اتنے وسیع و عریض پیمانے پر منعقد ہونے والے اس اردو ہندی مشاعرے کا مجھے اتنا مزا نہیں آیا۔ جتنا آنا چاہیئے تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مزاح لکھنا یا مزاح کہنا اتنا آسان نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دوسری اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے والے تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں مگر مزاح لکھنے والے ادیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اب چونکہ یہ مشاعرہ طنز و مزاح کے حوالے سے تھا اور اسے کم از کم رات کے دو بجے تک چلنا بھی چاہیئے تھا۔ چنانچہ شاعروں کی ایک کھیپ یہاں اپنا سنجیدہ کلام بھی مزاح کے نام پر سنا گئی۔ اردو کے شعراء نے تو پھر بھی اپنے خیالات کو منظوم کر کے پیش کیا اور ان میں بہت اچھے شاعر بھی تھے بگر ہندی کے شاعروں نے تو کمال کر دیا۔ انہوں نے بجائے کلام سنانے کے اسٹیج پر آ کر تند و تیز سیاسی تقریریں شائع کر دیں۔ پہلے میں سمجھا کہ آزاد نظمیں پڑھ رہے ہیں۔ پھر میں نے قیاس کیا کہ آزاد نہیں نثری نظمیں ہیں۔ مگر مزید غور کیا تو معلوم ہوا کہ نہ آزاد نظمیں ہیں نہ نثری نظمیں ہیں بلکہ تقریروں میں لطیفوں کا پیوند لگا کر سیاست پر اظہار خیال فرمایا جا رہا ہے۔ ایک شاعر نے تو کمال کر دیا۔ اس نے ایک مشہور معاشرتی لطیفے میں ترمیم کر کے اسے سیاسی بنایا اور پھر اس میں پورا زہر بھر کر سنا دیا۔ اس کی متذکرہ "نظم" کا خلاصہ یہ تھا کہ لوگ ایک ارتھی اٹھائے جا رہے تھے اس ارتھی کے ساتھ ایک کتا تھا اور اس کتے کے پیچھے ہزاروں لوگ قطار اندر قطار چلے جا رہے تھے ایک راہگیر نے ارتھی کے ساتھ ساتھ چلنے والے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا میرے کتے نے ایک سیاسی لیڈر کو کاٹ لیا ہے جس کے نتیجے میں وہ لیڈر مر گیا۔ یہ ارتھی اسی لیڈر کی ہے۔ اس پر راہگیر نے کہا کیا تم یہ کتا مجھے ایک دن کیلئے نہیں دے سکتے؟ میں یہ کتا دہلی لیجانا چاہتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے کہا تم بھی اس قطار میں لگ جاؤ۔ یہ سب لوگ یہ کتا "دہلی" لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ جرأت اظہار غالباً اشتعال انگیز بھی تھی مگر اس سے قطع نظر اس مشاعرے میں مجموعی طور پر مجھے جس چیز نے چونکایا۔ وہ سامعین اور شعراء کی سیاسی بیداری، مسائل کے بارے میں ان کا شدید ردِ عمل اور ان مسائل پر اظہارِ خیال کے حوالے سے انکا بے باکانہ رویہ تھا۔ یہاں اردو اور ہندی کے شعراء نے جن مسائل پر پوری جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں رہنماؤں کی منافقت، فرقہ وارانہ فسادات، غربت اور افلاس کے مسائل سرِ فہرست تھے۔ اردو کے ایک شاعر طلال سیوہاری کا قطعہ تو مجھے یاد نہیں رہا البتہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایک لیڈر نے مجھ سے کہا کہ بیروت میں قتل عام ہو رہا ہے اسے روکنا چاہیئے! میں نے اسے کہا اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے قتل عام دیکھنا ہے اور اسے روکنے کی خواہش ہے تو آسام میں ہو آؤ۔!

تھوڑی دیر بعد میں اسٹیج سے اٹھ کر پیچھے مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر اور ڈاکٹر بیگ احساس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا تھا۔ کیوں کہ اب میں شاعر گاہ سے کھسکنا چاہتا تھا۔ مجتبیٰ حسین نے کہا "تم اپنا کلام نہیں سناؤ گے" میں نے کہا "میں مزاحیہ شعر نہیں کہتا"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" مجتبیٰ حسین نے کہا "تم اپنی سنجیدہ غزل پڑھ دو لوگ اسے مزاحیہ ہی سمجھیں گے"۔

مگر میں نے اس ستم ظریف کی بات پر کان نہ دھرا اور کھسکتے کھسکتے قناتوں کے پیچھے چلا گیا وہاں غیاث متین پر نظر پڑی تو میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے ہوٹل چھوڑ آئیں اور جب میں اور غیاث متین پنڈال سے باہر نکل رہے تھے۔ میں تھوڑا آگے آگے چل رہا تھا میں نے احتیاطاً پیچھے مڑ کر دیکھا تو غیاث متین نظر نہ آئے۔ میں واپس آیا اور میں نے دیکھا کہ غالباً مجسٹریٹ یا سفید کپڑوں میں ملبوس کوئی پولیس آفیسر چیخ چیخ کر غیاث متین سے کہہ رہا ہے "میں کہہ رہا ہوں تم نیچے بیٹھ جاؤ"

"آپ تمیز سے بات کریں۔ میں اسی طرح نیچے نہیں بیٹھوں گا"

"تمہیں بیٹھنا پڑے گا" ـــ "میں نہیں بیٹھوں گا" ـــ غیاث متین کے ساتھ ایک اور صاحب تھے بعد میں پتہ چلا یہ ایڈوکیٹ ہیں۔

غیاث متین سے زیادہ ان صاحب کے توہین آمیز رویہ پر مشتعل تھے۔ چنانچہ غیاث متین تو تھوڑی دیر میں پیچھے ہٹ گئے۔ مگر یہ ایڈوکیٹ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکے بلکہ غیاث متین اور یہ ایڈوکیٹ دونوں حق پر تھے ہوا یوں کہ جب غیاث اور یہ ایڈوکیٹ پنڈال میں سے گزر رہے تھے تو کچھ سامعین کو ان کی وجہ سے شعراء کو دیکھنے میں رکاوٹ محسوس ہوئی جس پر "لاء اینڈ آرڈر" کے یہ محافظ فوراً جائے واردات پر پہنچے اور نہایت توہین آمیز انداز میں انہیں زمین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جس پر انہوں نے احتجاج کیا۔ ایک تو مجھے ان کا یہ احتجاج اچھا لگا اور دوسرے اس افسر کی معاملہ فہمی بھی کیونکہ کچھ دیر بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے خود ہی دوسری طرف چلا گیا حالاں کہ وہ اسے انا کا مسئلہ بھی بنا سکتا تھا۔

میں سارے دن کا تھکا ہوا تھا چنانچہ ہوٹل پہنچتے ہی سو گیا۔ ضمیر صاحب کہیں رات کو لیٹ مشاعرے سے لوٹے تھے چنانچہ وہ ابھی سو رہے تھے میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور ناشتے کے لیے اکیلا نیچے ریستوران میں آ گیا۔

وہاں ایک میز پر "ہاؤس آف ہیومر" بلغاریہ کی مس گیلینا اور مسٹر اسٹیفن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ان کے ساتھ ہی "ٹکی" ہو گیا ـــــ "مسٹر اسٹیفن آپ کے حال کیسے ہیں؟" میں نے گیلینا کی بجائے اسٹیفن کو مخاطب کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ اسٹیفن انگریزی نہیں جانتے چنانچہ گفتگو مس گیلینا ہی کے توسط سے ہوگی۔ حالاں کہ میرا ارادہ مسٹر اسٹیفن کے توسط سے مس گیلینا سے بات کرنے کا تھا ـــــ گیلینا نے بلغارین میں میری بات اسٹیفن تک پہنچائی۔ ان لمحوں میں مجھے یوں لگا جیسے کسی بڑے بوڑھے کو جسے نہ نظر آتا ہو اور نہ سنائی دیتا ہو اس کا کوئی عزیز کاندھے سے ہلا کر کہے "تہاڈا حال پچھدے پئے نیں" (آپ کا حال پوچھ رہے ہیں)

تاہم کچھ دیر بعد مسٹر اسٹیفن سے مزید حال احوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ اب "ڈائریکٹ ڈائیلنگ" سسٹم کے تحت براہ راست گفتگو ہو رہی تھی مس گیلینا سے بہت ساری دوسری باتوں کے علاوہ ایک بات میں نے یہ بھی پوچھی کہ سوشلسٹ معاشرے میں مزاح نگار کن چیزوں کو اپنے مزاح کا ہدف بناتا ہے۔ نیز یہ کہ اسے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے معلوم ہوا کہ سوشلسٹ معاشرے میں مزاح نگاروں کو اظہار کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ ٹرانسپورٹ کے ناقص انتظام پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ صحت و صفائی کے موضوعات پر پوری بے باکی سے لکھ سکتے ہیں۔ دفتروں کی ناقص کارکردگی پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ اور یوں ان معاشروں میں "صحت مند" تنقید پر کوئی قدغن نہیں ـــ گفتگو اور ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مس گیلینا سے کہا "مسٹر اسٹیفن سے میری طرف سے معذرت کیجئے کہ ان سے زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی۔ نیز انھیں میرا سلام بھی کہیں!"

مس گیلینا نے بلغارین زبان میں میرے جذبات ان تک پہنچائے مگر مجھے اس دفعہ پھر یہی لگا جیسے وہ انہیں کاندھوں سے جھنجھوڑ کر کہہ رہی ہو "تہانوں سلام کہہ رہے نیں" (آپ کو سلام کہہ رہے ہیں!)۔

■■

گیسو بکھر گئے ___ اسمٰعیل ظریفؔ

وہ سو رہے تھے تکیہ پہ گیسو بکھر گئے
بیدار ہو کے بچوں نے دیکھا تو ڈر گئے

احمد نگر گئے نہ تو آصف نگر گئے
مولانا پیٹ پالنے شاید قطر گئے

خود ساختہ کچھ ایسے بھی شاعر نکل پڑے
چربے چرا کے غیروں کا جھوٹا ہی چر گئے

نٹ پاتھ پر لڑھک گئے دروازہ بند تھا
بھائی جورات دو بجے محفل سے گھر گئے

صاحب وہاں بھی جا کے کوئی سکھ نہ پا سکے
اپنے محل کو چھوڑ کے دل سکھ نگر گئے

بھائی کو گپ لوازی کی عادت سی ہوگئی
ملنے کو آج آئے تھے گپ ہانک کر گئے

ایسی ہی تربیت کی ضرورت ہے آج کل
پکچر بھی ساتھ باوا کے لوز نظر گئے

ہم کو پرانے پل سے کوئی بس نہ مل سکی
پیدل ہی ٹاپتے ہوئے آصف نگر گئے

مجھ جیسے بے ضمیر ہی زندہ ہیں آج کل
خوددار اس زمانے میں بے موت مر گئے

اب بھوک کا سوال ہے دنیا کے سامنے
کچھ لوگ روٹیوں کے لیے چاند پر گئے

چوتھی میں دیر سے گئے جب ابلی بن ظریف
بریانی کھانے آئے تھے کھا کر چپکر گئے

○

غزل

اقبال ہاشمی

ہر سمت اک فساد ہے جاؤں کدھر کو میں
"معذور ہو تو ساتھ رکھوں" "ڈاکٹر" کو میں"

پتھر بکف کھڑے ہیں مرے قرضخواہ سب
بچنے کو سنگ باری سے بھاگوں کدھر کو میں

کتوں سے خوف آتا ہے یہ اور بات ہے
ورنہ پچھاڑ سکتا ہوں شیر و ببر کو میں

اخبار چاٹتا ہوں بڑے شوق سے مگر
سچی کو جانتا ہوں نہ جھوٹی خبر کو میں

دفتر میں بھاڑ جھونک کے جب لوٹتا ہوں گھر
مصروف تاش پاتا ہوں لختِ جگر کو میں

دستر سے خود کو دور میں رکھتا ہوں اسلئے
پہچانتا ہوں خود میں چھپے جانور کو میں

اپنے پروپگنڈے کے بل بوتے ہاشمی
یکتائے روزگار بنا دوں صفر کو میں

سلطان جمہوری
(بنگلور)

چلّر کی قلت

چلّر کا لفظ آج کل چھوٹے سکّوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ لفظ اُن خورد بینی کیڑوں کے لیے استعما
ہوتا تھا جو غریبوں کے لباس کے بخیوں میں رہا کرتے تھے اور ان کے خون پر گزر بسر کرتے تھے۔ جب جمہوریت کی غریبی ہٹا
تحریک نے غریبوں کے رہے سہے کپڑوں کے بخیے اُدھیڑ دیئے تو چلّروں نے غریبوں کا خون سیاست دانوں کے لیے حلال
کر دیا اور خود راہی ملک عدم ہونے لگے۔

اب اس نوع کے کیڑے اتنے نایاب ہو گئے ہیں کہ ماہرینِ حیوانات و حشرات چلّروں کی جسمانی ساخت اور
عادات و اطوار کے مطالعے کے لیے غریبوں کو ڈھونڈھتے پھر رہے ہیں۔ غریب تو بہت ملتے ہیں، مگر سب ننگ دھڑ
ایسے میں بخیئے اور اُن میں چلّر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں وہ چاہیں تو چلّروں کی عادات و اطوار کا مطالعہ سیاسی
لیڈروں میں بخوبی کر سکتے ہیں۔ ان کے اعلیٰ ظرف کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ اُنھوں نے چلّروں کے احسان کے اعتراف میں
چھوٹی ہستی اور چھوٹی چیز کو لفظ چلّر کا خطاب دے کر چلّروں کو امر کر دیا ہے!

اور اب اس کی قلت پیدا کر کے اس کی اہمیت اور ضرورت کو اور بھی دوبالا کر رہے ہیں۔ فقیر سے لے کر امیر تک سب
کو چلّر کی پڑی ہے۔ خرید و فروخت، لین دین، صدقہ و خیرات، بس اور ریل کے سفر میں چلّر کی قلت کے دلچسپ سبق آموز
اور عبرتناک واقعے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

قلت کا سبب کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔ مگر ظاہری سبب یہی ہے کہ پیسوں
کی قیمت گھٹتی جا رہی ہے۔ چیزوں کی مانگ اور مانگ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے جمہوریت کو
"تعداد" کی ضرورت ہو، مگر قدرت اپنے دفینوں کا منہ کھولنے کے لیے قلت کی کثرت پیدا کرتی ہے تاکہ بندے مجبور ہو کر ہاتھ
پاؤں ماریں اور آب زمزم جاری ہو جائے! ان دو اقسام کی قلت کہاں تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہے اس
بحث سے الحاد کے دروازے تک جانا دانشمندی نہیں۔ ہم تو مشاہدہ سے یہی پاتے ہیں کہ ہر شئے اپنی منزل کی طرف
رواں دواں ہے۔ چھوٹے سکّے منزل پر پہنچ کر معدوم ہو گئے۔ نوٹوں میں ایک روپے کے نوٹوں کا جنازہ ریزرو بنک کیط

لیجایا جارہا ہے۔ اس کی تجہیز تکفین کے بعد اس کی یاد اور اس کے کارنامے اُسی طرح باقی رہ جائیں گے جس طرح ایک سے تین پیسے والے سکوں کے باقی ہیں۔ ان کو معدوم ہوئے ابھی اتنا زمانہ بھی نہیں گزرا کہ تاریخ داں اس پر تحقیق کا کام شروع کردیں ـــ !

مگر زمانہ کی تیز رفتاری کے سبب کل کا واقعہ برسوں کا معلوم ہوتا ہے۔ جب تانبے کے ایک پیسے والے سکّے رائج ہوئے تھے تو اسکول کے بچّوں نے کمپاس سے دائرہ بنانا چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب تانبے کی قیمت بڑھنے لگی تو ہم ہندوستانیوں نے اس کی قدر پہچانی اور اُس کا ذخیرہ کرکے تجارت شروع کردی۔ دیکھتے دیکھتے تمام سکّے مارکٹ سے غائب ہوگئے۔ بچوں نے پھر کمپاس سنبھال لیا، اور جب ایک پیسے کا ہلکا پھلکا مربع نما سکّہ رائج ہوا تو اس سے اپنی کاپیوں پر رنگ برنگے پتنگ بنانے لگے۔ دو اور تین پیسے والے سکّے اتنی جلدی ایک دو تین ہوئے کہ پیچھے تو کیا ہم بھی ابھی تک اسے خواب ہی سمجھ رہے ہیں۔ مگر ایک بزرگ کی وصیت دیکھ کر اس کی دھندلی تعبیر نظر آئی، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا ـــ !

" میرے پر پوتوں کے پر پوتو ! میں تمہارے پر داداؤں کا پر دادا تم سے مخاطب ہوں۔ میری خواہش تھی کہ حضرت نوحؑ کی عمر مجھے نصیب ہوتی تاکہ تم میرا دیدار کرسکتے اور میں تمہیں پیار کرسکتا۔ مگر اب اتنی لمبی عمر کا رواج شاید تیسری عالمگیر جنگ کے بعد ہی ہوسکے۔ اس لیے میں اس وصیت پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ میں تمہارے لیے اپنے دور کی جمہوریت کا ایک گرانقدر تحفہ اس تھیلی میں چھوڑے جارہا ہوں جو تمہیں مالا مال کردے گا۔ اس میں سینکڑوں چھوٹے سکّے ہیں جن کی موجودہ قیمت ان کی اپنی قیمت سے دس گنا ہے۔ مگر سات پشتوں بعد جب یہ تمہارے ہاتھوں تک پہنچے گا تو اس کی قیمت اتنی ہوجائے گی کہ تم لوگ پورے ہندوستان کو مع اس کی جمہوریت کے خرید سکنے کے قابل ہوجاؤ گے !

تمہارے اور ہمارے بیچ کی نسلوں کو شاید میری اس رائے پر تعجب ہو کہ یہ چھوٹے سکّے اتنے قیمتی کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان سے مملکت کے علاوہ اس کے کرتا دھرتا عوامی نکروں کے خریداروں کو بھی خریدا جاسکتا ہے ؟ شاید انہیں اس تحریر کے مطالعہ کے دوران سائنسی ترقیات کا بخوبی علم ہوجائے کہ مستقبل نہیں تو ماضی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات سائنسی آلات کے ذریعہ بخوبی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ سکّے ٹکسال سے نکل کر شاہ و گدا کے ہاتھوں سفر کرکے پھر ٹکسال واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس سفر میں اسے جتنے ہاتھوں کا لمس حاصل ہوتا ہے وہ لہروں کی صورت میں اس سے چمٹ جاتے ہیں۔ سائنسی آلات ان لہروں کا تجزیہ کرکے فرد و قوم کی خصوصیت' اپنے زمانے کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی پوری تفصیل بتا سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس تھیلے کے سکّوں سے اس عہد کی پوری تاریخ کا پتہ نہ لگایا جاسکے ـ؟

تم جب یہ اعلان کروگے کہ تمہارے پاس قدیم زمانے کے سکّے موجود ہیں تو ماہرین علم التواریخ جو گڑے مُردے اکھاڑنے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں منہ مانگے داموں پر خرید لیں گے ـ مگر خبردار بیچنا نہیں بلکہ نیلام کرنا تاکہ اس کی اچھی خاصی قیمت وصول کرسکو !

نوٹ :ـ اس وصیت کی زیروکس کاپیاں میرے بیٹوں میں تقسیم کردی جائیں اور انہیں تاکید کردی جائے کہ وہ اپنی نسلوں میں اسے منتقل کرتے جائیں۔ اصل وصیت اور تھیلا تحفظ کے خیال سے اقوام متحدہ کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں۔ صرف

ر صرف میری ساتویں پشت کو لینے کا اختیار ہے !"

دستخط . . . .

اس عجیب وغریب وصیت سے میرے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور ایک دُھن سوار ہوگئی چلّر اندوزی کی مگر باہر
کل کر جہاں دیکھتا ہوں سب کو اسی بیماری میں مُبتلا پاتا ہوں۔ ہر دکان، مکان، بس، ٹرام، اور بنک آفسوں پہ "مہربانی
کے چلّر دیں" کے بورڈ آویزاں ہیں۔ یہاں تک کہ ریلوے چائے بیچنے والے وینڈروں کے گلے میں "چلّر دیجئے صاحب" کی تختیاں
ٹکی ہوئی ہیں۔

اب میں بھی ایک روپے کے لوٹ خواہ وہ کتنے ہی نحیف ونزار کیوں نہ ہوں لے لیتا ہوں اور ان ادھ موئے نوٹوں کا اس
خیال سے ذخیرہ کر رہا ہوں کہ جب یہ سو فیصدی منافع پر بکنے لگیں گے تو نکالوں گا۔ فی الحال مارکٹ ریٹ پچیس فیصد ہے۔
یعنی ایک روپے والے چار درگور نوٹوں کی قیمت پانچ روپے ہے۔

ہندوستانی ماحول میں بزنس کو اولیت حاصل ہے۔ بیٹا باپ سے اور باپ پوتے سے تجارت کرتا ہے۔ موجودہ نظام
میں چلّر کا جمع کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ میں نے ریل کے ایک سفر میں کافی پی کر کافی والے کو دو روپے کا لوٹ دیا
اس نے کلاک کر کہا چلّر دو صاحب! دوسرے صاحب جو میرے مقابل بیٹھے ہوئے تھے ان کے ہاتھ میں بھی دو کے لوٹ
تھے۔ کافی والا لوگوں کو بڑی پھرتی سے کافی بھی پلا رہا تھا اور چلّر دینے کی وارننگ بھی دیتا جا رہا تھا۔ مگر کسی کے پاس چلّر
نہیں تھا۔ کوئی دو، کوئی پانچ اور کوئی دس کا لوٹ لیے بیٹھا تھا۔

کافی والا آریہ بھٹ اور البیرونی کے خاندان سے معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح ایڈجسٹ کیا کہ دس والے کو پانچ اور پانچ
والے کو دو کے لوٹ تھما کر مسافروں کو آپس میں لے دے کر فیصلہ کرنے کے لیے کہا اور چلا گیا۔ میرے دو کے لوٹ میں دو پیالیاں
میرے اور سامنے والے مسافر کے حصّے میں آئیں، یعنی اُن صاحب کو مجھے ایک روپیہ دینا تھا۔

ہم میں سے کسی کو کافی والے سے تکرار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم سب سفید پوش ہونے کے علاوہ وینڈروں
کی تگڑی یونین سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک روپیہ پھنس جانے پر مجھے اندر ہی اندر غم ہو رہا تھا۔ مگر بظاہر میں اپنے
پارٹنر سے پہلے سے بھی زیادہ گھل مل کر باتیں کرنے لگا کہ اگر ان کی جیب میں ایک کا لوٹ ہو تو نکال دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔
باتوں باتوں میں ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب سے کافی کے دام باری باری سے دیں گے۔ دوسرے مسافروں نے بھی
غالباً ایسا ہی فیصلہ کیا تھا کیوں کہ کافی کے آتے ہی سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس طرح اس کی خوب چل
رہی تھی۔ اس چل چلاؤ کو تا دیر قائم رکھنے کے لیے وہ گاہے گاہے چلّر لوٹانے کے بجائے ایک چٹ پر بقیہ رقم لکھ کر دے
دیا کرتا تا کہ آئندہ راؤنڈ میں حساب کتاب برابر ہو جائے۔

جب میرے پارٹنر کی منزل آگئی تو اُترتے وقت بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے، اپنا مختصر سامان اُٹھایا اور چل پڑے۔
میں بھی پیچھے پیچھے گیٹ تک آیا اور جوں ہی گاڑی کے چلنے میں دیر تھی پلیٹ فارم پر اُتر کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا کیوں نا کافی
پی لی جائے۔ انھوں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا مجھے ذرا جلدی ہے ورنہ ضرور ساتھ دیتا۔ میں نے فوراً کہا
خیریت کا خط ضرور لکھیں ۔۔ اور ہاں! یاد آیا، میں نے تو آپ کا پتہ لیا ہی نہیں۔ انھوں نے طوطا وکر پتہ لوٹ کرا دیا۔

چند روز بعد میں نے انھیں لکھا " . . . اُمید کہ بخیریت گھر پہنچ گئے ہوں گے۔ ہماری حکومت نے چلر کی قلت پیدا کر کے کتنے مدبرانہ انداز میں محبت، بھائی چارگی اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کا بندوبست کیا ہے . . . . . اُترتے وقت آپ کچھ خفیف سے ہو گئے تھے۔ میں چونکہ بڑا حساس واقع ہوا ہوں، سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ کافی پلانے کی آخری باری آپ کی تھی اور پلیٹ فارم پر میری تجویز کو آپ نے تقاضا سمجھ لیا ہو — ؟ . . . . . لاحول ولا قوۃ ! محض ایک روپیہ کے لیے ہندوستانی جمہوریہ کے بخشے ہوئے دوست کو کھو سکتا ہوں — ! صرف دوستی کی خاطر خط لکھ رہا ہوں، خواہ مطلب کچھ نہ ہو . . . . . ! "

دو چار روز بعد ڈاکیہ ایک روپے کا منی آرڈر لیکر آیا۔ اور میرے دستخط لیکر دو روپے کے نوٹ تھماتے ہوئے کہا "صاحب ایک روپیہ واپس کیجئے !" میں نے کہا چلر نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہا "جب آپ کے پاس ایک کا نوٹ ہو جائے ڈاک خانہ آکر اپنا منی آرڈر لے لیں !"

وہ چلا گیا اور میں منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ گورنمنٹ ملازموں سے جب وہ ڈیوٹی پر ہوں الجھنا جھگڑنا بن بلائے آفت بلانا ہے۔ میں کفِ افسوس ملنے لگا۔ محسوس ہوا ہاتھ میں کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ وہ منی آرڈر کا تراشہ تھا جسے ڈاکیہ دے گیا تھا۔ اس پر لکھا تھا،

" . . . . . آداب ! آپ کا محبت نامہ ملا۔ فرصت سے لکھوں گا۔ فی الحال ایک روپے کا منی آرڈر کر رہا ہوں۔ دو روپے کے نوٹ دینے پر ڈاک خانے نے کوئی بھی چلر واپس نہیں کیا۔ میرے ساٹھ پیسے جو ڈاک خانے پر نکلتے ہیں اُن کو میں ڈاک خانہ اور اس کے عملے پر صدقہ کرتا ہوں خواہ کسی کی تحویل میں جائے۔ دونوں ہمارے ملازم ہیں اور جمہوری نظام عوام کے صدقے ہی پر چلتا ہے . . . . عوام چاہے طوعاً دکرہاً دیں یا حکومت اُن سے جبراً وصول کرے، بہرحال ان کو ادا ہونا ہی ہے . . . ! "

یہ پڑھ کر ڈاکخانہ سے اپنا روپیہ لانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کو صدقہ تصور کر کے دل پر پتھر رکھ لیا۔

۵

ے سی. ایم وہ سنبھالے جو ہوا ہیں اقتدار اپنا
جمائے رعب کرسی کا جتائے اختیار اپنا
ہراک اخبار میں چھپوائے اکثر اشتہار اپنا
لوئی تقریب ہو کروائے تھوڑا انتظار اپنا
انگوٹھا چھاپ ڈگری ہولڈر ہو یا کہ فلمسٹار
نکالے جب جلوس اپنا مچے ہر سمت جئے جئے کار

رہے محکوم بیوی کا بنے اسٹیٹ کا حاکم
لہے جو بات کبھی منہ سے عمل اُس پر نہ ہو لازم
ور نرسا وہ تابع ہو رعایا کا ہو اک خادم
ملط ہوں فیصلے پھر بھی نہ ہو جس پر کبھی نادم
ملے ہر کام پر اُس کو سدا مرکز سے شاباشی
سفر دلی کا جس کے واسطے ہو دورۂ کاشی

کھے اک فوج چمچوں کی جسے کہتے ہیں کابینہ
قرر ہو رعایا کی طرف سے جس کا روزینہ
رے جو پیش سالانہ برائے خرچ تخمینہ
لی بابا ہے گر سی. ایم تو یہ ہے اُس کی مرجینہ
اگر دورہ پہ ہو سی. ایم چراغاں گھر میں کروائے
بجائے ڈھول خود اپنا مگر سی. ایم کے گن گائے
ہنگاموں پہ بل کھائے نہ ہڑتالوں سے گھبرائے
نری اسٹائیل فائٹنگ پر وہ جب چاہے اُتر آئے
راسیبح دینی ہو نیا پنڈال بنوائے
بھی مجمعے ہوئے قابو تو پولس ڈھال بن جائے
قلمدان آشیانے کا رکھے خود اپنے قبضے میں
پرندے زیر دام آئیں تو کر دے بند پنجرے میں

رشید عبدالسمیع جلیل

چیف منسٹر

وزارت یوں چلائے وہ کہ بس منگل ہے جنگل میں
اکھاڑے ہر جگہ کھولے اُتارے سب کو دنگل میں
خصوصاً پارٹی ورکر کو پھانسے اپنے چنگل میں
کرے اعلان ڈی. اے کا الیکشن اور مینگل میں
رکھے بس اپنی مٹھی میں ہمیشہ پارٹی کا فنڈ
حسابوں میں ہو جب گھپلا تو یاروں سے بھرائے ڈنڈ

سیاست اور اداکاری میں پریکٹس ضروری ہے
سپوتوں اور داما دوں کو کنفکشن ضروری ہے
سیاسی پاگلوں کو روز انجکشن ضروری ہے
وفاداران کرسی کو پروٹیکشن ضروری ہے
پڑے بیمار تو کروائے نارن میں علاج اپنا
مرض کچھ بھی ہو لیکن جان سے پیارا ہو مزاج اپنا
نکالے آرڈی ننس ایسا کہ تغلق جس پہ لہرائے
پُرانے دور کی تاریخ فلمی دھن میں دہرائے
عنایت ساری سرکاری ملازم ہی پہ فرمائے
نہ ہو پروا حکومت کا اگر تختہ اُلٹ جائے
ریسگنیشن لیٹر ہرگز نہ لکھے آخری دم تک
گروہ در گروہ طرف کر دے تو پہنچے صدر اعظم تک

منصور عمر (دربھنگہ)

تلاش

○

اِدھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے
وہ شاید کوئی ہمسفر ڈھونڈتی ہے
وہ جاتی ہے علمی اداروں میں بے شک
مگر کب وہ علم و ہنر ڈھونڈتی ہے
نہ دے گی وہ اب گارجین کو زحمت
کلب اور کالج میں بَر ڈھونڈتی ہے
کرے لیڈری، گلچھرے وہ اُڑائے
کھلائے جو بچہ وہ بَر ڈھونڈتی ہے
کمی عیش میں کچھ بھی ہونے نہ پائے
مگر فیملی مختصر ڈھونڈتی ہے
خود اس کی نہ ہو پر اسی کا رہے وہ
وہ شوہر کوئی معتبر ڈھونڈتی ہے

○

افروز عالم

قطعہ

زمینی خداؤں کا بندہ ہوں میں
طبیعت کا بالکل ہی گندہ ہوں میں
فقیروں کے کشکول کی بھیک ہوں
وصولا ہوا کوئی چندہ ہوں میں

روشن بنارسی

○

گانٹھ [illegible] سے آنکھوں کا اندھا چاہیئے
آج کل کی لڑکیوں کو ایسا دولہا چاہیئے
تم تو بس اکزامنر ہو میں ہوں شکچھا منتری
اِنی ہاؤ ANYHOW میرا سالا پاس ہونا چاہیئے
دَھ دے چمچہ گری کا، جب کسی سے کام لیں
آپ کو چمچہ گری سے کام لینا چاہیئے
ہم حکومت [illegible] تو آپ کو کردیں گے خوش
اس [illegible] کی [illegible] میں ہم کو پیسہ چاہیئے
جب سُنانا چاہا ہم نے اپنے دل کی بات بھی
وہ مچل کر ہم سے [illegible] ہم کو [illegible] چاہیئے
یہ [illegible] شعر پڑھنے کی ادا
آپ کو [illegible] شعر نہیں قوّال ہونا چاہیئے
زندگی اک فن ہے روشن اور یہ معراجِ فن
دوست [illegible] بھول جانا چاہیئے

○

نظر [illegible]

قطعہ ۔ "سپر لولیس"

[illegible] بھی ہوگئی ناکام حفظِ امن میں
[illegible] سے اک شاعرِ ہشیار نے
[illegible] سب پولیس کو بھی سپر پولیس کی
[illegible] کی جیب پاکٹ مار نے

علی حماد عباسی
(اعظم گڑھ)

نام رکھنا

نام رکھنا — لغوی اعتبار سے اس لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں ۱. برا کہنا ۲. بچے کا نام تجویز کرنا۔
ہمیں اس لفظ کے پہلے معنی سے کوئی سروکار نہیں. نام رکھنا بہ معنی بُرا کہنا اردو گرامر کے لحاظ سے تو نہ جانے کونسا
ل ہے لیکن ملک کی موجودہ گرامر کے حساب سے تو یہ بیک وقت فعل ناقص، فعل لازم اور فعل متعدی ہو کر رہ گیا ہے
ی فرد یا جماعت کو بُرا کہنا یعنی نام رکھنا کوئی ناقص فعل نہیں —— بلکہ ایک لازمی فعل ہو گیا ہے اور جو فعل لازم ہو
ل کے متعدی ہونے سے بھلا کون روک سکتا ہے. چنانچہ اپنے دیس میں یہ کام سیاسی نیتا، پارٹیاں اور اخبار اس زور شور
سے کر رہے ہیں کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم ٹھہرے ایک غیر سیاسی آدمی اس لیے اس لفظ کے پہلے والے معنی سے ہمارا کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ہاں
ں کے دوسرے معنی یعنی بچے کا نام رکھنے پر ہم کچھ اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور سب سے پہلے یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ بچوں
ا نام رکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے. ہم کو تو یہ کام خاصا دشوار نظر آتا ہے. اور اس دشواری کو ایک اکیلے ہم ہی نہیں محسوس
ر رہے ہیں بلکہ ہم سے پہلے بھی بچے کے نام رکھنے کا مسئلہ تو کرشن چندر کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن گیا تھا جس کا
عتراف انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کھل کر کیا ہے. انھیں تین نام پسند تھے. ہنری. رنجن اور اسلم. لیکن بات کچھ ایسی آن
پڑی کہ ان تینوں ناموں میں سے ایک نام پر بھی وہ اپنے بچے کا نام نہ رکھ سکتے تھے اور یہ سوچ کر انھوں نے اپنے آپ کو تسلی دے
لی تھی کہ وہ بچے سے کہہ دیں گے کہ بڑے ہو کر وہ جو نام بھی چاہے رکھ سکتا ہے۔

لیکن ہمارے ساتھ تو معاملہ اس کے برعکس ہوا. آج سے برسوں پہلے جب ہماری بیگم نے اپنے ابّا جان کے گھر سے ہمیں
یہ خوشخبری سنائی کہ ہماری ولی عہد اب اس دنیا میں وارد ہو چکی ہے اس لیے ایک ذمّہ دار باپ کی حیثیت ہمارا یہ فرض ہوتا ہے
کہ ہم اپنی پہلی فرصت میں اس کا کوئی نیا اور اچھا سا نام تجویز کریں۔

ذاتی طور پر تو ہم کو شہناز نام پسند تھا. سبب اس کا یہ ہے کہ جب ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور پوری [illegible] کی زندگی گزارا
کرتے تھے اس وقت مجاز ہمارا محبوب شاعر تھا اور اس کی شاہکار نظم "آوارہ" کا سب سے خوبصورت بند واقعوں کو ہم اور ہمارے

آوارہ گرد دوست اکثر کورس کے طور پر گایا کرتے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اس بند میں رات ہنس ہنس کر جو تین ترغیبات دیتی ہے ان میں سے ہم ایک پر بھی عمل نہ کر پائے یعنی ہم نہ کسی مے خانہ تک جا پائے اور نہ کسی "شہناز لالہ رخ" کے کاشانے تک ہی پہنچ پائے۔ اور رہی کسی ویرانے میں چلنے کی بات تو ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ یونیورسٹی کے جس ہوسٹل میں ہم رہتے تھے وہ ویرانے سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ اس کو عرف عام میں "قبرستان" کہتے تھے۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد ہماری یادوں کی جھولی میں بس یہی نام رہ گیا۔ شہناز۔ اور ہم یہ خیالی پلاؤ پکاتے یونیورسٹی سے گھر لوٹ آئے جب ہم نوکری چاکری کریں گے اور ہماری شادی ہوگی اور جب شادی ہوگی تو اولاد بھی ہوگی اور اگر پہلی اولاد لڑکی ہوئی تو اس کا نام شہناز رکھیں گے۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اپنی بیٹی کا نام شہناز نہیں رکھ پائے کیوں کہ اس زمانے میں یہ نام کچھ ضرورت سے زیادہ پاپلر تھا۔ جس کو دیکھئے وہی اپنی لڑکی کا نام شہناز رکھے ہوئے تھا۔ خود ہمارے خاندان میں دو بچیوں کا نام شہناز تھا۔ ایک بہو بھی اس نام کی موجود تھی۔ محلے میں کئی لوگوں نے اپنی بچیوں کے نام شہناز رکھ چھوڑے تھے۔ ایک خاں صاحب جن کو کوئی اولاد نہ تھی اپنی بکری کو پیار سے شہناز پکارتے تھے۔ لیکن تب ایک بات ہماری سمجھ میں نہ آپاتی تھی کہ آخر لڑکیوں ہی کے نام شہناز کیوں ہوتے ہیں، لڑکوں کو اس نام سے سرفراز کیوں نہیں کیا جاتا۔ ادھر کچھ سال پہلے ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شہناز نام پر لڑکیوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی کیوں کہ اس نام کے ایک کھلاڑی پاکستان کی اولمپک ہاکی ٹیم میں شامل تھے۔

لیکن جو بات ہم اب بھی سمجھنے سے قاصر ہیں وہ یہ ہے کہ آخر اس زمانے میں یہ نام اتنا پاپولر کیوں تھا (شاید اب بھی ہو!) اس کی ایک وجہ یہ تو نہیں کہ مجاز نے اپنی نظم میں "شہناز" کو "لالہ رخ" کہہ کر اس کو پاپولرائز یا یوں کہیے اسکینڈلائز کر دیا تھا۔ اس کا دوسرا سبب یہ تو نہیں کہ چوں کہ شہناز شاہ ناز کا مرکب ہے اور چوں کہ مسلمانوں کو اپنے تمام چھوٹے بڑے، اچھے برے شاہوں پر ناز ہے اور اسی مناسبت سے اکثر مسلمانوں کا مزاج شاہانہ ہوتا ہے اس لیے انھیں شہناز نام پسند ہونا لازمی ہے۔ لیکن ایک بات پھر بھی رہ جاتی ہے۔ مجاز نے شہناز کو لالہ رخ کیوں کہا؟ کیا شہناز ہمیشہ لالہ رخ ہی ہوتی ہے۔ وہ "لالہ رخ" کے بجائے "لیلیٰ رخ" بھی تو ہو سکتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے طامس مور نے اپنی مثنوی "لالہ رخ" میں لالہ رخ کے ساتھ شہناز کا نام نہیں جوڑا تھا۔ اور ہاں شہناز کے معنی دلہن کے بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک بار کسی لڑکی کا نام شہناز پڑ گیا تو وہ اپنے آپ کو ہمیشہ دلہن سمجھتی رہے گی یا جب بھی ممکن ہو سکے وہ بار بار دلہن بنتی رہے گی۔!

بہر حال ہماری بیٹی شہناز کے نام سے محروم رہ گئی کیوں کہ ہماری بیگم کے خیال میں یہ نام کثرتِ استعمال کی وجہ سے نیا پن اور تازگی کھو چکا تھا اس لیے ناقابلِ قبول تھا۔ ہم اچھی خاصی الجھن میں پڑ گئے۔ کہاں سے کوئی نیا نام تلاش کریں۔ چوں کہ ہماری اردو کی لیاقت بس واجبی سی ہے اس لیے ہم اپنی بیگم سے معذرت خواہ ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ کیوں نہ ہم کبھی کرشن چندر والا نسخہ استعمال کریں اور اپنی بچی سے کہہ دیں کہ بڑی ہو کر وہ جو بھی چاہے نام رکھ لے۔ لیکن ہماری بیگم نے (جو خیر سے ایم اے اردو ہیں بھلا کب ماننے والی تھیں) فرمایا کہ بچی کا نام ہم رکھیں گے۔!

ایک دن وہ نہ جانے کیوں (شاید اپنی اردو دانی کا رعب جمانے کے لیے) علامہ اقبال کا مصرع "اک شوخ کرن مشوخ مثالِ نگہہ حور" بار بار گنگنا رہی تھیں یکایک بول اٹھیں: "مل گیا، مل گیا"۔ ہم تو سمجھے کہ بیگم کو نیوٹن کی طرح فطرت کے کسی سربستہ راز کا سراغ مل گیا۔ پوچھنے پر فرمایا کہ بچی کا نام مل گیا۔ ہم اس کا نام کرن رکھیں گے۔ ہم نے کہا کرن کیوں؟ شوخ کیوں نہیں؟ کہنے لگیں شوخ

نام رکھنے میں ویسے تو کوئی خاص قباحت نہیں ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح کہیں اس کا بھی وہی حال نہ ہو جو غزالہ اور زیبا کے ناموں کا ہو رہا ہے۔ وہ ہر روز کلاس میں اپنے نام "گجالہ" اور "جیبا" سن کر رو پڑتی ہیں (خود ہمارا [illegible] والی کا ملاقاتی اسٹیشن غزل کو "گجل" اور زیب غوری کو "جیب گوری" کہتا ہے) چنانچہ شوخ کو ہم "سوکھ" بننا پسند نہیں کرتے۔ تو اس طرح ہماری بیٹی کا نام [illegible] کرنا پڑ گیا۔ ہم نے بھی یہ نام پسند کیا۔ چھوٹا اور خوبصورت۔ اور چونکہ یہ ہندی الاصل ہے اس لیے کوئی ہماری [illegible] والا اس نام کو اپنانے سے رہا۔ ہماری دیکھا دیکھی ہمارے ایک دوست نے اپنی بیٹی کا نام شیلا رکھ لیا۔ اب تک ان ناموں کی نقل تو ہمارے بارے میں کسی نے کی نہیں ہے!

نام رکھنے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ چاہے جتنی جدت پسندی سے کام لیا جائے نئے نام کی نقل اس تیزی سے کی جاتی ہے کہ نئے پن پر پرانے پن کا زنگ لگتے دیر نہیں لگتی۔ اب دیکھیے نا علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند کا نام جاوید رکھا اور اسی نسبت سے اپنی ایک تصنیف کا نام "جاوید نامہ" رکھا۔ کوئی اور باپ "جاوید نامہ" تو نہ لکھ سکا لیکن جاوید کے نام کو لوگ لے اڑے۔ تب سے آج تک جاوید نام رکھنا ایک طرح کا کریز (CRAZE) بن گیا ہے۔ ہمارے محلے میں اس وقت کم سے کم ایک تین جاوید ہوں گے۔ شہر میں دو تین سو اور اگر ہند و پاک کے کل جاویدوں کی گنتی کی جائے تو ان کی تعداد انگلیوں پر تو ہرگز گنی نہیں جا سکتی ہے!

خیر علامہ اقبال کی بات ہی اور ہے۔ وہ اب شاعر اور فلسفی سے بڑھ کر [illegible] ہستی ہو گئے ہیں ان کے رکھے ہوئے نام کی نقل کرنا اسوۂ حسنہ کا درجہ رکھتا ہے ہم تو بہت ہی معمولی آدمی ہیں۔ ہم نے تو بہت چھان بین کر اپنے صاحبزادے کا نام منظر سعید رکھا۔ اب آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ منظر کے ساتھ یہ سعید کیوں لگا ہے تو اس کی بھی ایک کہانی ہے ہوا یہ کہ ہماری بیگم اور ان کی بہنوں کے پہلے بچوں میں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوئیں تو ان سب کے ایک بھائی جن کا نام سعید ہے بگڑ کر کہنے لگے کہ کیا ان کی ڈیوڑھی پر سب کی سب بھانجیاں ہی جنم لیں گی؟ چنانچہ جب [illegible] بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام منظر رکھا گیا اور ان کے غصے کو فرو کرنے کے لیے ان کا بھی نام منظر کے نام میں جوڑ دیا گیا!

شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اپنے بچوں کے نئے اور اچھے نام رکھنے کی زحمت مول نہ لے کر [illegible] کے نام [illegible] پر رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک پڑوسی ہیں کرپا شنکر جی۔ انھوں نے اپنے بچوں کے نام رکھنے میں ہمیشہ بڑی آسانی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی پہلی بچی کا نام گنگا رکھا۔ دوسری کا گومتی، تیسری کا نربدا۔ اور چوتھی کا کرشنا۔ ہم نے ان سے کہا کہ اگر وہ اپنی بیٹیوں کے نام اسی طرح ہمارے ندیوں کے نام پر رکھتے رہے تو ان کے گھر میں لڑکیوں کا سیلاب آجائے گا [illegible] بیرونی ملک کی ندیوں کے نام پر رکھیں مثلاً مصر کی ندی نیل [illegible] ان سے نیلا یا نیلو [illegible]۔ وہ [illegible] کرنا [illegible] ہوا۔ جس کھیون ہار کی تلاش میں وہ چاروں بہنیں گنگا، گومتی، نربدا، اور کرشنا۔ ندیوں کے ناموں میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں وہ مل گیا۔ اس بار ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام انھوں نے بڑی شان سے ساگر یعنی بحر الکاہل رکھ دیا۔ ندیوں اور ساگر کا یہ سنگم بھی خوب رہا۔

اس سے زیادہ دلچسپ معاملہ تو ہمارے ایک دوسرے [illegible] کا ہے۔ ان کے یہاں پہلا بچہ ہوا تو [illegible]۔ انھوں نے [illegible] رکھ دیا۔ دوسرے کا نام [illegible] رکھا [illegible] کے بعد [illegible]

اس طرح وہ پیری واریو جنا (خاندانی منصوبہ بندی) کرنے پر آسانی سے تیار نہ ہوتے۔

نام رکھنے کی بات ہو اور سکھ ناموں کا ذکر نہ آئے، یہ ایک ناممکن امر ہے۔ ہمارے ایک نہایت ہی عزیز سکھ دوست ہیں سادھو سنگھ۔ بڑے ہی تیز طرار، ہنس مکھ اور حاضر جواب۔ ان سے ایک دن سکھ ناموں پر بات چلی تو کہنے لگے کہ سکھوں کے زیادہ تر ناموں سے ان کا نسلی کردار جھلکتا ہے۔ ان کے نام گویا جیت کی ٹرافی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر دوسرے سکھ کا نام رن جیت، بل جیت، دل جیت یا چرن جیت کے وزن پر ہوگا۔ کچھ ناموں کے ساتھ بیر یعنی بہادر لازمی طور پر جڑا ہوگا جیسے جگ بیر، سکھ بیر، بل بیر، دھرم بیر۔ کچھ تو بہادری دکھانے کے شوق میں اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے نام تلوار سنگھ، ڈھال سنگھ، کٹارا سنگھ، اور رد ہتھڑ سنگھ رکھ لیتے ہیں۔ ہم نے کہا مگر سادھو سنگھ تمہارا نام کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا نام تو شیطان سنگھ ہونا چاہئے۔ فوراً بول اٹھے واہ واہ یہ بھی کوئی ضروری ہے کہ سب نام ٹھیک ہی ہوں اپنے معنی کے لحاظ سے۔ تم نے گول میز کانفرنس کا نام سنا ہے۔ اس کا نام تو لمبی میز کانفرنس ہونا چاہئے تھا کیوں کہ اس میں گول میز نہیں لمبی میز استعمال ہوتی تھی۔ ہمارے والد سردار ہزارا سنگھ کافی عقلمند انسان تھے۔ انھوں نے ہمارے ایک بھائی کا نام شیطان سنگھ رکھا تھا صرف یہ دکھانے کے لیے کہ شیطان اور سادھو ساتھ رہنے سے گھر کی فضا کبھی نہیں بگڑتی۔

یہ تو رہیں اصل نام رکھنے کی مشکلیں۔ چھوٹے اور پیار کے نام رکھنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ پہلے لوگ بچوں کو پیار سے منّا، جمّو، گھورہو، کنو اور پکارا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ پیار کے نام پرانے ہو گئے اور ان کی جگہ چنو، منّو، پنّے اور نھنے نے لے لی۔ لیکن لوگوں نے جلدی ہی یہ محسوس کر لیا کہ ان پیار کے ناموں میں کوئی تازگی باقی نہیں رہ گئی تو "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کو حقیقت مان کر کچھ اور نئے نام ایجاد کیے مثلاً لڑکے پپّو، گڈّو اور ببلو پکارے جانے لگے۔ لڑکیوں کے پیار کے نام ببلی، بمّی، اور گڈی ہو گئے۔ راج کپور نے "بابی" فلم کیا بنائی کہ دیکھتے دیکھتے سینکڑوں لڑکے لڑکیوں کے نام بابی پڑ گئے۔ ہمارے ایک دوست نے دیکھا کہ بابی بھی اپنی چمک دمک کھو چلا ہے انھوں نے بابی میں الف کی ٹانگ کاٹ کر اس کی جگہ واو لگا دیا اور بابی کو بوبی کر دیا۔ بڑا ہو کر یہ بچہ اپنے قبلہ والد صاحب کو خوب کوسے گا کیوں کہ BOOBY کا انگریزی میں مطلب گاؤدی ہوتا ہے۔

اگر پیار کے نام رکھنے میں لوگ قوت اختراع سے اسی طرح کام لیتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے کان بھالو، کھالو، غولو، مولو، ڈنڈا، بنڈا، کوکا کولا، ٹوماٹولا وغیرہ وغیرہ ناموں سے ناآشنا نہیں رہیں گے۔ ○○

قلمی معاونین سے التماس

◉ تخلیقات صفحہ کے ایک جانب صاف اور واضح لکھیں۔!

◉ تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور تحریر کریں۔!

منظور وقار (اکبرؔ)

ظہیر الدین بابر

میٹرک کا سالانہ امتحان چل رہا تھا اور ہم کاپی کر کے پاس ہونے کی نیت سے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے کچھ لکھ کر پاس ہونے کا عزم لئے اس امتحان میں شریک تھے۔ تمام پرچے تو خیریت سے گزر گئے مگر جس دن تاریخ کا پرچہ ہمارے سامنے آیا اس دن ہماری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے کیوں کہ ہم تاریخ کے مضمون میں نہایت کمزور تھے (ویسے بھی آج ہم ایم اے پاس ہو کر بھی تاریخ میں کمزور ہی ہیں ورنہ قدیم شعراء کی تاریخ پیدائش اور حالاتِ زندگی پر مقالا نما تاریخی کتاب لکھ کر مزے سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لیتے) خیر اس دن امتحان ہال میں ہمارے سامنے تاریخ کا پرچہ تھا اسی لیے اس میں کئی تاریخی سوالات اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے جواب کے لیے ہمارا منہ تک رہے تھے۔ ان تاریخی سوالات میں ایک سوال تھا۔" ظہیر الدین بابر کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے"؟ یقین مانئے اگر یہ سوال اس پرچہ میں نہ ہوتا تو ہم جوابی پرچے پر صرف آنند بخشی کا کوئی مشہور (غیر معیاری) اور مقبول (بے سرا) گیت لکھ کر واپس آجاتے (کیوں کہ اکثر ایسے موقعوں پر فلمی گیت ہی لکھے جاتے ہیں) اتفاق سے ہم کو ظہیر الدین بابر کے حالاتِ زندگی کا بھرپور علم تھا اس لیے ہم نے بھی ظہیر الدین بابر کی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس امتحان کا جب نتیجہ نکلا تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سوائے تاریخ کے مضمون کے ہم تمام مضامین میں فیل ہو چکے ہیں۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ تاریخ کے اس پرچہ کو جانچنے والے پروفیسر ایک مقبول طنز و مزاح نگار تھے!! ہم نے اس دن ظہیر الدین بابر کے حالاتِ زندگی پر کس طرح روشنی ڈالی تھی اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے!!

ظہیر الدین بابر امیر تیمور لنگ کی چھٹی پشت میں پیدا ہوا (اور باقی کی پانچ پشتوں میں کون کون پیدا ہوئے تھے اس کا پتہ ہمیں ابھی نہیں لگا کوشش جاری ہے) بچپن سے اس کو حکومت کرنے کا بڑی طرح شوق تھا۔ اسی طرح جیسے کہ ہندوستانی لیڈروں کو منسٹر بننے کا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ماں کا دودھ چھوڑتے ہی امیر تیمور کی سلطنت کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کے خواب دیکھنے لگا۔ بچپن سے اس کا دل لبکٹ کھانے یا پتنگ اڑانے کی طرف مائل نہیں تھا بلکہ اس کی خواہش سمرقند کی وسیع سلطنت پر حکمرانی کرنے کی تھی۔ بابر کی رگوں میں ترک اور مغل دونوں

نسلوں کا خون برقی رو کی طرح دوڑ رہا تھا اس لیے وہ نہایت اولوالعزم اور بہادر تھا۔ وہ اکثر اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لیے بغل میں دو آدمیوں کو دبا کر فصیل پر دوڑ لگاتا تھا (بغل میں دبے ہوئے آدمی مردہ ہوتے تھے یا زندہ۔ تاریخ میں اس جانب کوئی اشارہ نہیں تھا) ابتداء میں بابر کی حیثیت صرف ایک ہندوستانی ریاست کے چیف منسٹر جیسی تھی کیوں کہ اس وقت بابر صرف ایک ہی ریاست کا حکمران تھا اس کے اطراف کئی چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتیں تھیں جن کو دیکھ کر بابر کے منہ میں پانی آیا کرتا تھا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے اپنے اطراف کی ریاستوں کو اس طرح دیکھتا تھا جس طرح آج کل روسی حکمران اپنے اطراف واکناف کی چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتوں کو ہضم کرنے کی نیت سے دیکھا کرتے ہیں (اور چند حکومتوں کو ہضم بھی کر چکے ہیں) لیکن بابر کے لیے سمرقند اور اس کے وسیع علاقے کو فتح کرنا مشکل تھا۔ وہ بار بار سمرقند پر حملہ کرتا اور ہر دفعہ ناکام لوٹ آتا۔ بابر کے سینے میں بھی شاید ہندوستانی لیڈروں جیسا دل تھا (جو بار بار الکشن ہار کر بھی مایوس نہیں ہوتے) اس لیے اس نے ایک بار پھر سمرقند پر حملہ کیا تو کامیاب ہو گیا۔ بابر کے فوجی ہمارے ملک کے دل بدلو لیڈروں کی خصلت کے تھے۔ جس طرح ہمارے ملک ہندوستان کے لیڈر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہی فوراً پارٹی بدل دیتے ہیں اسی طرح بابر کے فوجی کبھی کبھی بابر کے ساتھ ہوتے تو کبھی دشمنوں سے جا ملتے جب بابر کو فتح نصیب ہوتی تو وہ بابر کے وفادار بن جاتے۔ جب شکست ہوتی تو فوراً دشمن کے ساتھ مل جاتے تھے۔ مگر بابر بڑے ہی دل گردے کا مالک تھا اس لیے وہ ہمت ہارنے کے بجائے اپنے اطراف واکناف کے تمام علاقوں کو فتح کر کے ہندوستان پر نظریں دوڑانے لگا۔ کیوں کہ اس دور کے ہر بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ ہندوستان پر حملہ ضرور کرے۔ بابر نے بھی اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان پر کئی حملے کئے۔ وہ ہندوستان فتح کرنے کے چکر میں تھا تو ادھر اس کے دشمن موقع کو غنیمت جان کر کابل پر حملہ کرنے لگے۔ تب بابر کو احساس ہوا کہ پرایا مال حاصل کرنے کے چکر میں اپنا مال ہاتھ سے نکل جا رہا ہے وہ فوراً کابل پہنچ گیا۔ جب کابل پر اس کو مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا تو پھر اس نے ہندوستان پر پانچویں بار حملہ کیا۔ دہلی کے نزدیک پانی پت کے مقام پر ایک پٹھان بادشاہ ابراہیم لودھی اور بابر کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس کو پانی پت کی جنگ کہتے ہیں۔ اس جنگ کو پانی پت کی جنگ شاید اس لیے بھی کہتے ہیں کہ اس جنگ میں کئی فوجی میدان جنگ کی خشک اور خاردار زمین پر پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترس ترس کر مر گئے تھے۔ بابر بڑا ہی ذہین حکمران تھا (یوں بھی ہر دور میں حکمراں ذہین اور عوام بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں ورنہ عوام اور حکمران دونوں ذہین ہوں تو حکومت ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ٹکتی) بابر کی فوجیں گولے بارود کے کمالات سے بھی آگاہ تھیں (شاید آج کل روس اور امریکہ کی فوجیں بابر کے فوجی جوانوں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں) اس لیے ابراہیم لودھی کثیر تعداد میں فوج رکھنے کے باوجود بابر سے جیت نہیں سکا لڑائی جیتنے کے صرف چھ دن بعد بابر نے دہلی کی مسجد کے پیش امام صاحب کو حکم دیا کہ وہ جمعہ کے دن مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھیں ورنہ ..... اس طرح پہلی بار دہلی کی مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی دن بابر کو بادشاہ کا خطاب بھی مل گیا جس خطاب کو پانے کیلئے وہ بچپن سے بے چین تھا۔

ہم نے بابر کے حالات زندگی پر کس طرح کی روشنی ڈالی تھی اس کی ایک جھلک تو آپ نے دیکھ ہی لی۔ اب آپ لوگ خود ہی فیصلہ کریں ہم نے صرف ایک ہی سوال کا جواب لکھ کر امتحان میں جو کامیابی حاصل کی تھی اس کامیابی کے ہم حقدار تھے یا نہیں!؟ ■■

نما فیل انصاری (سنارپوری)

جوابِ ضرورتِ رشتہ

بھائی باز آغ آپ نے بھیجے ہیں جس کے خد و خال
ہے شبہ وہ چھوکرا ہے خوبصورت خوش خصال

ہے وہ فتنہ بے بہا شل قمر جنسِ لطیف
در ایں چہ شک قابلِ صد رشک ہے حلیہ شریف

اس کو کرنا ہے ابھی کچھ اور تھوڑا انتظار
تاکہ دونوں دانت بھی ہو جائیں جبڑے سے فرار

صرف حلوہ اور فرنی پر ہو بس اس کا گزر
پوپلے منہ سے وہ نکلے بس ملائم ماحضر

اس کو ہیما مالنی کا ہے جو اک سودائے خام
ہے وہ شتر بے مہار و مثل اسپِ بے لگام

جیل میں اس کو میسر ہے چرس گانجہ دھنگ
اس سے ظاہر ہے کہ ہے وہ غل پیری میں دبنگ

قید خانے میں بھی وہ رکھتا ہے کوٹھی کی ہوس
یہ بتائیں جیل میں رہنا ہے اب سے کے برس؟

بیٹھ اور جیومیٹری کے پار رستے جب گڑھے
اس سے کہیے کیلکولس کے ساتھ الجبرا پڑھے

استرے کا منتہر سادا غ ہو یا ہو گڑھا
یہ تو لکھا ہی نہیں لڑکا ہے کل کتنا پڑھا؟

اس سے کیا حاصل کہ وہ ہے باادب اعلیٰ نسب
مڈل تک تو پڑھ ہی لیتا کم سے کم انگلش ادب

اس کو بھجوا دیجئے عربی مدرسہ کا سفیر
ففٹی ففٹی سے بھی پا سکتا ہے وہ دولت کثیر

جوتے اور [illegible] سے اچھا ہے دھوئے وہ زکوٰۃ
عیش کر سکتا ہے قطرہ پر وہ بچہ تاحیات

ابنِ افلاطون ہوتا گر نہیں ابنِ بغداد
عین ممکن ہے کہ ملتی اس سے شادی میں مدد

جب ہے وہ جیب کتروں کی کمیٹی کا امام
ہے مناسب یہ کہ [illegible] بھجوائیں شادی کا پیام

جب تلک پیدا نہیں کرتا وہ اوصافِ رزیل
مشتہر رشتہ سے رشتہ کی نہیں کوئی سبیل

○

ہزل

ایم وائی چٹکی

شرارتوں پہ میری معترض زمانہ ہے
مزاج میرا لڑکپن سے عاشقانہ ہے

تمہارے دامِ جفا سے نکل گیا میں تو
تمہارے عشق کا انجام جیل خانہ ہے

ہر ایک حسین میں یہ خوبیاں نہیں ہوتیں
گٹھیلا جسم ہے اور قد بھی درمیانہ ہے

پلک جھپکتے ہی آنکھوں سے ہو گیا اوجھل
کہاں تلاش ہو اس کا کہاں ٹھکانہ ہے

گزر رہی جاتی ہے مفلس کی زندگی چٹکی
زمیں بچھونا ہے اور چرخ شامیانہ ہے

کاشی ناتھ، ایم اے۔ ایل ایل۔ بی، ایڈوکیٹ
حیدرآباد

چھوٹا قد

چھوٹا قد بھی دنیا کی ایک بڑی مصیبت ہے۔ اگر آدمی دُبلا پتلا ہو تو اُسے موٹا بنایا جا سکتا ہے، غریب ہو تو دولت مند ہو سکتا ہے جاہل ہو تو عالم بھی بن سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ بیوقوف ہو تو کوشش کرنے پر عقلمند بھی بن جاتا ہے لیکن چھوٹے قد کا کیا علاج ہے؟ چھوٹے قد کا آدمی ویسے خود ہی اس بات پر مغموم رہتا ہے کہ قدرت نے اس کے ساتھ ایسی زبردست ناانصافی کی جیسے کسی کو زندگی بھر کے لیے آدھے پیٹ کا راشن کارڈ لکھ دیا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ چھوٹے قد کا آدمی ایک مظلوم ہندوستانی بیوی سے بھی زیادہ مظلوم ہوتا ہے۔ اس کے لیے تو کوئی چارہ ہی نہیں سوائے اس کے کہ زندگی بھر اپنی قسمت کو کوسے یا مرتے دم تک صبر سے کام لے۔ لیکن اس پر خدا کی مار کہ دنیا والے بھی اسے چین نہیں لینے دیتے۔ چھوٹے قد کے آدمی پر ہر ایک ہنستا ہے کوئی اُسے چھوٹو، گڈو یا ٹنگو کے نام سے مخاطب کرتا ہے اور اپنے منہ کے بتیس دانت باہر پھینک دیتا ہے تو کوئی اُسے فتنہ یا جھگڑے کا گھر کہہ کر یا اس طرح کا ایک محاورہ کہتا ہوا اپنی ناک بھوں سکیڑ دیتا ہے اور منہ بچکا لیتا ہے۔

قدرت نے مجھے بھی چھوٹے قد کا بنایا ہے لیکن سچ کہتا ہوں اور آپ بھی یقین مانیئے کہ میں مندرجہ بالا بہت سی مصیبتوں سے مستثنیٰ ہوں ایک تو طبیعت کچھ سنجیدہ پایا ہوں جس سے لوگوں کے دانت منہ میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور ان کا منہ ٹیڑھا نہیں ہونے پاتا۔ دوسرے اگر کبھی ایسی کوئی بات ہو بھی جائے تو ذرا صبر سے کام لیتا ہوں۔ اس لیے مجھے کبھی محسوس ہی نہ ہوا کہ میں قدرت سے چھوٹا قد پانے کا گنہگار ہوں لہٰذا میں نہایت ہی خوش و خرم تھا میرے بہت سے دوست وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سنجیدہ بن گئے تھے جبکہ میں ہنستا کھیلتا زندگی کے دن گزار رہا تھا ــــ لیکن ایک منحوس دن ایسا آیا کہ اچانک میری نظر بخت نامی کسی صاحب کے ایک مضمون پر پڑی۔ مضمون کیا تھا ایک طوفان تھا۔ مضمون نگار نے گویا میری عرصہ دراز سے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھدیا یا اس پر ہاتھ رکھ کر درد کو جگا دیا۔ اس کا بیان کچھ ایسا جادو بھرا تھا۔ مانو خاص کر مجھ ہی سے مخاطب ہو کر بلکہ گھور کر پوچھ رہا ہو کہ :- "کیا آپ نے کبھی اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ آخر حسینان جہاں آپ سے کیوں کتراتی ہیں؟ یہ صرف اس لیے کہ آپ کا قد ان کے قد کے برابر نہیں اور وہ آپ کی مخاطبت پر آپ سے نفرت آمیز معذرت کر کے کسی اور نوجوان کی طرف راغب ہو جاتی ہیں اور آپ منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔"

مضمون نگار کے اس کھرے نجومیانہ بیان کو پڑھ کر مجھے بہت ہی افسوس بلکہ صد افسوس ہوا کہ واقعی کوئی لڑکی مجھے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی اور نہ ہی مجھ پر ایک مرتبہ مسکرا دیتی ہے چاہے وہ مسکراہٹ نقلی ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے ملی تو در کجا نقلی محبت

اور مسکراہٹ تک نصیب نہیں اور اس کی ایک ہی اور صرف ایک ہی وجہ ہے میرے چھوٹے قد کا ہونا۔ میرے آفس میں ایک شخص کام کرتا ہے جس کا بیان ہے کہ روزآنہ دفتر سے نکلتے ہی دو تین حسینائیں اس کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر وہ مل کر گھومنے یا سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ شخص بھی کوئی خاص نہیں ہے اور رنگ بھی اس کا کالا ہے لیکن قد اس کا چھ فیٹ سے اوپر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آدمی کو محض اپنے دراز قد کی وجہ سے ان حسینوں کی دوستی کا فخر حاصل ہے اور مجھے دیکھئے کتنا اچھا ہوں، کتنا پڑھا لکھا ہوں، شریف اور خوبصورت بھی ہوں لیکن ان تمام صفات کے باوجود محض اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے میں ایک عدد گرل فرینڈ کا بھی حقدار نہیں۔

لیکن یہ حقدار کی بات بھی ایک ہی رہی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ شخصیت کے مضمون کو پڑھ کر ہی مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میں کسی بات کا حقدار ہوں اس سے پہلے اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے لوگ تو مجھے بچہ سمجھتے ہی تھے، بعد میں خود بھی اپنے کو بچہ سمجھتا تھا، یہاں تک کہ میرے تمام ہم عمر دوست جوانی کی منزلیں طے کر کے کافی سنجیدہ ہو گئے اور میں اب بھی بچوں کی طرح کھیل کود کھانا پینا اور [illegible] ہوں۔ [illegible] پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ [illegible] ہو مجھے بھی جوان ہونا ہی چاہئے۔ چنانچہ میں نے ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ نکال کر اپنی عمر دیکھا تو پایا کہ واقعی میں تو جوان ہو گیا ہوں، حالانکہ مجھے پتہ تک نہیں۔ کتنی افسوس کی بات ہے کہ کسی نوجوان کو محبت بھی نہ ملے اور وہ بھی محض اس لیے کہ اس کا قد چھوٹا ہے اور وہ بچہ نظر آتا ہے۔ حسینائیں جب میری طرف دیکھتی ہیں تو حیا سے ان کے چہرے سرخ نہیں ہو جاتے اور وہ اپنا آنچل یا دوپٹہ ٹھیک سے نہیں کرتی ہیں بلکہ وہ اسے کچھ اس طرح دیکھتی ہیں مانو کوئی خوبصورت سا بچہ ہو۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ قدرت نے مجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔

چھوٹے قد کی ستم ظریفی یہیں تک محدود ہوتی تو بات نہیں۔ شخصیت کو پڑھ کر ہی مجھے پتہ چلا کہ اس کمبخت نے مجھے زندگی کے تقریباً ایک شعبہ میں نیچا دکھایا ہے۔ جس آفس میں میں کام کرتا ہوں اس کے باس (صدر) تقریباً میرے ہم عمر تھے (یہ بھی مجھے بعد میں پتہ چلا) ہم کے معنی یہ نہیں کہ تاریخ پیدائش ایک ہو۔ [illegible] سال دو سال ادھر ادھر ہو سکتا ہے لیکن قد ان کا مجھ سے تین یا چار انچ بڑا تھا۔ ایک دن میں کسی اہم مسئلہ پر اپنی رائے [illegible] اور فائل صاحب کے سامنے رکھ دی میں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بلکہ اپنے [illegible] سے بھی زیادہ [illegible] بیان کی۔ صاحب نے میری رائے پر کوئی رائے زنی تو نہیں کی اور نہ اسے غلط ٹھہرایا لیکن اس کا [illegible] مسکرائے اور مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر نہایت شفقت سے فرمایا: "ابھی بچے ہو"۔ ... واللہ بھگوان کی کیا عرض کروں کہ کتنا غصہ آیا صاحب پر یا اپنے آپ پر اپنی محنت و مطالعہ کے باوجود میں بچہ ہوں یعنی میری رائے کی کوئی قیمت نہیں۔ صاحب نے اس سے پہلے [illegible] کو اسی طرح نظر انداز کر دیا تھا لیکن مجھے آج ہی پتہ لگا کہ اصل وجہ کیا ہے اب آپ ہی کہ کہ میں زندگی سے کیا امید کروں۔ چھوٹے قد کی اس ستم ظریفی نے مجھے صحیح معنوں میں فکرمند بنا دیا ہے۔

میرے ایک دوست [illegible] صاحب [illegible] اور لیڈر دونوں ہیں وہ بھی میری طرح بلکہ مجھ سے بھی ایک انچ چھوٹے قد کے ہیں اسی پریشانی کی حالت میں ایک روز ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے تا حال سفاچٹ چہرے پر کالی کالی مونچھیں نمودار ہیں تعجب سے پوچھا کہ [illegible] آپ نے اپنے چہرے پر یہ مکھیاں کیا بٹھا رکھی ہیں؟ جواب میں میرے دوست نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غصہ سے کہا "بتاؤں [illegible] بتاؤں گا" میں گھبرایا کہ کہیں مجھ سے ہی کوئی غلطی تو نہیں ہوئی لیکن پھر سوچا کہ اگر ہو بھی گئی تو یہ صاحب اپنی مونچھوں سے مجھ پر کیوں کر حملہ کر سکتے ہیں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ صاحب بھڑک اٹھے "آپ فلاں صاحب کو جانتے ہیں نا، [illegible] جو حال ہی میں وکیل بنے ہیں اور ساتھ ہی ایڈیٹر بھی ہیں" "جی ہاں، جی ہاں" میں نے عرض کیا۔ "ہاں تو وہ صاحب

لیڈری میں میرے ہم برابر ہو سکتے ہیں لیکن بہ حیثیت وکیل میں ان سے چار سال سینیئر ہوں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے فلاں میٹنگ میں سب کے سامنے مجھے یہ گستاخانہ بات کہی کہ "ابھی تم بچے ہو" پھر میرے عزیز دوست نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا "کیوں صاحب! کیا میں بچہ دکھائی دیتا ہوں؟" میں نے عرض کیا "جی نہیں، ہرگز نہیں، اب کون کہہ سکتا ہے آپ بچہ ہیں"۔

انہیں خیالات میں غرق میں ایک کتب خانے میں جا بیٹھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں لہذا ایک رسالہ ہاتھ میں لیکر یونہی ورق گردانی کرنے لگا کہ ایک اشتہار پر نظر پڑی۔ اشتہار کیا تھا گویا نجات کا پیغام تھا۔ لکھا تھا: "بغیر کسی دوائی کے اپنا قد دو سے چار انچ بڑھا لیجئے۔ تفصیلات کیلئے ہمیں لکھئے"۔ واہ اندھا کیا چاہتا ہے صرف دو آنکھیں چنانچہ فوراً ضروری فیس پوسٹ کے ذریعہ بھیجدی گئی اور پھر ایک ہفتہ بعد ایک چھوٹا سا کتابچہ ہاتھ لگا جس میں درج ہدایتوں کا حاصل یہ تھا کہ ان کی کمپنی کی بنی ہوئی ایک عجیب و غریب مشین کو خریدا جائے اور اس پہ ورزش کی جائے بہرحال ورزش شروع ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاتھ پیر بن گئے اور پیر ہاتھ۔ یعنی ہاتھ تو سوٹے ہوئے اور پیر ایکدم پتلے۔ ہم نے فوراً ورزش بند کردی کیونکہ اس کے جاری رہنے پر ہم کارٹون بن جاتے۔ اس کے بعد ایک صاحب نے رائے دی کہ لانبے آدمی کے ہاتھ نہیں بلکہ پیر لانبے ہوتے ہیں۔ لہذا قد بڑھانے کے لیے پیروں کے بل اُلٹا لٹکنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ ورزش بھی شروع ہوئی۔ یعنی ہم روزانہ ایک گھنٹہ الٹے چمگاڈر کی طرح لٹکتے رہے لیکن یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ اس کے بعد دوائیوں کی باری آئی اور اس میں سو دو سو روپیہ برباد کیا، لیکن قد بڑھنا نہ تھا نہیں بڑھا۔ لیکن ستارے ابھی ہمارے چکر میں تھے چنانچہ ہم نے ایک اور اشتہار "جوانگوٹھی ملے گا" پڑھا اور اس سے اُمید لگائے بیٹھے پانچ روپے کی وی۔ پی پارسل پر ایک انگوٹھی جو شاید تانبے اور پیتل کے ملاوٹ سے بنی تھی اسے انگلی میں پہن ہم نے اس کا منتر جپنا شروع کردیا لیکن اس انگوٹھی نے بھی ہمارا قد نہیں بدلا اور ہمارا قد جیسا تھا ویسا ہی رہا۔

بخت کا مضمون اب بھی میری آنکھوں میں گھومتا ہے اور اس کا چیلنج میرا گلا دبائے دیتا ہے اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے اپنی قابل رحم حالت پر سوچنا اب معمول سا بن گیا ہے۔ ایک دن اسی طرح بیٹھا سوتی آنکھوں سے کمرے کی دیواروں کو گھور رہا تھا کہ انقلاب روس کی ایک تصویر پر نظر پڑی جس میں عظیم انسان لینن روس کے اشتراکی جمہوریہ ہونے کا اعلان کر رہا تھا اور اس کے قریب اسٹالن کھڑا تھا۔ اس منظر کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کو بنانے والی شخصیتیں ایک کے بعد ایک ذہن کے اُفق پر اُبھرتے لگیں اور لینن سب کے آخر میں صبح کے تارے کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن یہ کیا ۔۔۔ لینن کا قد تو چھوٹا ہے لیکن وہ کس تیزی کے ساتھ تاریخ کے ۔۔۔ پردے کو ہلا رہا ہے اور کس شان کے ساتھ ایک نئی دنیا کے نمودار ہونے کا اعلان کر رہا ہے اس کے بعد تخیل کے پردے پر ایک اور تاریخی شخصیت نمودار ہوئی۔ یہ نپولین تھا۔ اپنے زمانے میں سارے یورپ کو ہلا دینے والا یہ مرد میدان بھی چھوٹے قد کا مالک تھا۔ سقراط کے مجسموں کی جتنی بھی تصویریں دیکھتے ہیں ان میں بھی وہ چھوٹے قد کا دکھائی دیتا ہے۔ فلسفیوں میں کانٹ بھی چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ ونسٹن چرچل کی تصویر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے اوسط قد سے کافی چھوٹے ہیں۔

بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گریجویشن کرتے ہوئے میں نے "تاریخ" کو بہ حیثیت ایک مضمون لیا تھا جس کا مطالعہ اب تک اخبار کی شکل میں جاری ہے، ورنہ آپ ہی بتایئے کہ قدرت کی اس زبردست ناانصافی اور ظلم کے شکار مجھ غریب کو جینے کی کیا اُمید تھی ۔۔۔؟

رؤف خوشتر (گلبرگہ)

ذرا دم ہو تو.......

(کالونی کے ایک مکان کا منظر ڈرائنگ روم میں میاں بیوی محو گفتگو ہیں)

شریف : بیگم غضب ہوگیا۔ نہیں نہیں میرا مطلب ہے غضب ہونے والا ہے.....

بیگم :- اجی کیا ہوا؟ اتنے بدحواس تو تم شادی کے دن بھی نہیں تھے۔ آخر بات کیا ہے؟

شریف : دستک دینے کی آواز آرہی ہے۔ لو اماں پھر جان کھانے کو آگئے۔ کہیں سے حضرت عیسیٰ کا قول "پڑوسیوں سے محبت کرو" پڑھ لیا ہے۔ زندگی بھر اسی قول کو فعل میں بدلنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔ حمیدہ اب میں کیا کروں۔؟

حمیدہ (غصہ سے) اجی تم نے تو ڈرائنگ روم کو کالونی کی لائبریری بنا ڈالا ہے۔ دنیا بھر کے اخبارات اور پرچے اور رسالے بھی خرید کر لاتے ہو تو ہر کوئی منہ اٹھائے بلکہ آنکھ اٹھائے یہاں چلا آتا ہے۔ اِدھر کوئی گھر میں قدم رکھا اور اُدھر چائے کا برتن گیس پر رکھنے کو کہتے ہو۔ لیکن سنو جی آج تو میں گھر میں رہنے والی نہیں۔ پچھلے دروازہ سے پڑوسن کے پاس جا رہی ہوں۔

شریف : دیکھو حمیدہ اگر تم اس طرح چلی جاؤ گی تو کچن کا کام کون سنبھالے گا۔ برتن تو جوں توں کر کے دھو لیا۔ لہسن اور ادرک بھی ناخنوں سے چھیل لیا اب تو مرد بھی ناخن لمبے رکھ رہے ہیں۔ عورتیں تو مردوں کو نوچنے کے لیے ناخن بڑھاتی ہیں۔ اچھا چھوڑو تمہارے اوصاف حمیدہ۔ میرا مطلب ہے بچے کہاں ہیں؟

حمیدہ : وہ تو کب کے باہر کھیلنے گئے۔ لو اب میں جاتی ہوں، سنبھالو اپنا گھر اور اپنے دوستوں کو۔

(حمیدہ چلی جاتی ہے۔ دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

شریف : (بڑبڑاتے ہوئے) اُف ہو۔ یہ وبال جان اماں بھی عجیب بور آدمی ہے۔ بیوی تو مرگئی مرتی نہیں تو اور کیا کرتی۔ اب دوسروں کی بیویوں کو مارنا چاہتے ہو۔ بیگم تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں۔

(شریف دروازہ کھولتا ہے، ایک شخص داخل

ہوتا ہے)

امان : ذرا دم ہو تو ..... کیوں بھئی کیا کر رہے تھے؟
کب سے آواز دے رہا ہوں۔ کیا بھابی صاحبہ
تشریف رکھتی ہیں۔ اگر ہیں تو میرا آداب کہنا۔

شریف : آئیے آئیے امان بھائی۔ بات دراصل یہ ہے
کہ آپ کی بھابی پڑوسن کے یہاں گئی ہیں۔

امان : یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ خوب گذرے گی جو مل
بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اچھا تو یہ دیکھو اخبار کی
سرخی کہ اسرائیل نے پھر حملہ کر دیا۔ میاں میری
سنو، قابیل کا جارحانہ قتل ہو یا اسرائیل
کا بہیمانہ قتلِ عام۔ دنیا کے ہر واقعہ اور
حادثہ کی تہہ میں یہی قول نظر آتا ہے۔
یعنی ذرا دم ہو تو ..... یہاں طاقتور
کے پاس دم اور کمزور کے پاس غم ہوتا ہے۔
طاقتور ملک بم اور غریب ملک پرابلم رکھتے
ہیں۔ اسی دم کے خم نے جم کے دنیا کے
سارے کاروبار پر قبضہ کر رکھا ہے۔

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے اور دو افراد
داخل ہوتے ہیں)

شریف : ارے بابر اور شاکر بھائی اچھا ہوا آپ
آ گئے ورنہ امان بھائی کی پُر مغز باتوں سے
محروم ہو جاتے۔ بیٹھئے آج تو عید کا سماں لگ
رہا ہے۔

امان - ذرا دم ہو تو ..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ
اب بابر میاں کی مثال ان کی طرح ہمارے
سامنے ہے۔ چوں کہ یہ شریف النفس خاموش
طبیعت کے آدمی ہیں۔ اس لیے ان کی بیگم
لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی ہیں اور یہ بے چارے۔

. . . . .

بابر : ع ہم بیاہ کر کے بھی تنہا رہ گئے

امان : ایک وہ بابر تھا جو حریفِ حیات بغل میں
دبائے قلعہ کی فصیل پر چڑھتا تھا اور ایک
یہ بابر ہیں جو اپنی شریکِ حیات کو رکشہ میں
بٹھا کر اپنے گھر نہیں لا سکتے۔ اس لیے کہ
ان کی شرافت کو کمزوری سمجھتے ہوئے بیگم کے
رشتہ دار کہتے ہیں کہ ذرا دم ہو تو بیگم کو لے جاؤ۔

شاکر : امان بھائی۔ آپ ان کے خسر اور سالے کو
شاید نہیں جانتے۔ خسر جلاد ہے تو سالا
غنڈہ ہے وہ بابر بھائی کو محلہ میں قدم رکھنے
نہیں دیتے۔ گھر پر سخت پہرہ ہے۔

شریف : خسر اور سالے سے کیا ڈرنا۔ جب کہ ان کو
اپنی صد فی صد منکوحہ بیوی لانا ہے۔ لوگ
تو اب دوسروں کی بیویاں لے اڑتے ہیں۔
بس ان کو بیوی لانے کے لیے ذرا سا رسک
RISK لینا ہے۔

بابر : ع یہ رسک نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک ناگ کا پہرہ ہے اور وائف کو لانا ہے

امان : بس تو پھر آپ کا نام بابر نہیں لاغر ہونا چاہیے۔
میاں میری شادی کے بعد ایسا ہی معاملہ
پیش آیا تھا۔ میں نے خسر صاحب کو ایسی

دھمکی دی کہ وہ اپنی بیوی کو خود لاکر چھوڑ گئے۔

نصف بہتر کیلئے نصف بدتر بھی بننا پڑتا ہے۔ ذرا دم ہو تو۔۔۔

شاکر: اچھا امان بھائی آخر آپ نے کس بات کی
دھمکی دی تھی کہ وہ بے چارے اپنی بیوی کے
مستقبل کا خیال کیے بغیر آپ کے پاس
چھوڑ گئے؟

امان: ذرا دم ہو تو۔۔۔۔ بھئی تم شاکر نہیں شاطر
ہو۔ دراصل ہمارے سالے صاحب کا ایک
خاتون ٹیچر سے معاشقہ چل رہا تھا۔ اتفاق سے
سالے صاحب کا تحریر کردہ عشقیہ خط میرے
دوست باقی میاں کے ہاتھ لگا۔ انھوں نے
وہ خط مجھے دیا۔ میں نے باقی کا شکریہ ادا کرتے
ہوئے کہا۔۔۔

بابر: ذرا دم ہو تو یہ چٹھی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

امان: واہ بابر میاں تم نے تو میرے منہ کی بات
چھین لی۔ بس پھر کیا تھا۔ ساری خدائی ایک
طرف رکھتے ہوئے جورو کے بھائی نے اپنی
بہن کو ہمارے گھر پہنچا دیا۔ بیوی کے رشتہ
داروں کو رام کرنے کے لیے راون بننا پڑتا
ہے۔ یعنی کہ ــــــــــ۔۔۔۔۔

بابر: ع وجود زن سے ہے کائنات میں جنگ

شریف: اچھا امان بھائی ادھر کچھ دنوں سے ایک
عجیب خواہش ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟

شاکر: آخر ہم بھی سنیں۔ آپ کے دل میں کون سی
خواہش انگڑائی لے رہی ہے؟

شریف: میں غریب بننا چاہتا ہوں۔

امان: بھئی اب تک تو ہم عجیب و غریب کی اصطلاح
سنتے آئے تھے۔ اب تم شریف و غریب کی
اصطلاح کا سبب بننا چاہتے ہو۔ یہ خواہش
تو کسی عرب شیخ کی ہونی چاہتے تھی۔ عرب
کھرب پتی ہیں سب [illegible] اور ہم
غریب پتی ہیں۔ ذرا غم ہو تو آدمی کئی سطحوں
اور حیثیتوں سے غریب بن سکتا ہے۔

شریف: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟

امان: مالی حیثیت سے غریب ہونے کے لیے
دروازے شب و روز کھول دو، سماجی
طور پر ہونا چاہتے ہو تو لوگوں کو سچے کڑوے
کسیلے بول دو، اخلاقی اعتبار سے چاہتے ہو تو
شب و روز جام و ساغر میں گھول دو، سیاسی
سطح پر ہونے کے لیے ناکارہ اور نااہل امیدوار
کو پسندیدہ ووٹ کی ترازو میں تول دو۔ ادبی
مقام حاصل کرنے کے لیے امٹ پٹانگ تنقید
لکھ دو۔ ہر ایک سے تصادم کر لو اور ایک
ہنگامہ کھڑا کر دو تیغ قلم سے کوئی شاعر اور
ادیب نہ بچ پائے۔ ہر شاعر و ادیب کی
تخلیقات کا پوسٹ مارٹم کرو شعروں کو توڑ
مروڑ کر پیش کرو۔

شاکر: مثلاً؟

بابر: ع چمک رہا ہے در و دیوار پر مرزا غالب

امان: اچھا میاں کیا صرف باتیں ہی ہوں گی یا پھر کچھ

ٹھنڈا گرم بھی ملے گا۔

شریف : یہ لیجیے جوڑوا اور بسکٹ میں ابھی چائے لاتا ہوں

شاگرد : اچھا اماں صاحب۔ آپ تو بابر بھائی کو بیگم میکہ سے لانے کی تدبیر بتلا رہے تھے۔ اب کچھ ایسا گر بتایئے کہ ہماری بیگم اپنے گھر سے میکے چلی جائے اور ہم مزے کریں کیونکہ.....

بابر : ع جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرقت کے رات دن

اماں : یار یہ بابر ہے یا سہراب مودی۔ جو کہتا ہے منظوم ہی کہتا ہے۔ ذرا دم ہو تو...... میرا مطلب ہے کہ بیوی کو میکے بھگانے کے کئی نسخے ہیں۔ اپنے بش شرٹ پر لمبے لمبے بال لگوانا، آفس سے دیر گئے آنا۔ جیب میں دو چار فالتو فون نمبر رکھنا۔ زیادہ بن سنور کر نکلنا۔ پھر دیکھنا تمہاری بیگم لڑ جھگڑ کر کیسے میکے نہیں جاتی اور تم آزاد ہو جاؤ گے اور....

(اندر سے زنانی آواز ابھرتی ہے)

زنانی آواز : اجی بھائی صاحب آپ نے تو اپنی بیگم کو اللہ میاں کے یہاں بھیج دیا۔ اب کیا کالونی کی دیگر عورتوں کو ان کے ماں باپ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ آپ جیسے کاہل، چرب زبان اور غلط مشورہ دینے والے لوگوں سے ہی معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ آپ کیوں دوسروں کے ہنستے کھیلتے گھروں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ فوراً نکل جائیے۔ ورنہ اپنے ابا اور بھائی کو بلوا کر مرمت کرا دوں گی۔

اماں : ارے بھائی بھاگ نکلو۔ اب ادھر کا رخ نہیں کرنا۔ (تینوں چلے جاتے ہیں۔ حمیدہ کمرے میں داخل ہوتی ہے)

شریف : بیگم یہ تو کمال ہو گیا۔ جو کام میں کئی برسوں میں نہ کرسکا اس کو تم نے منٹوں میں کر دیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

حمیدہ۔ اجی اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ بقول تمہارے مفرور اماں گلی کے ذرا دم ہو تو.....

(دونوں ہنستے ہیں، پردہ گرتا ہے۔)

●●

موسم تیغ و تبر

راز سنو کھ سری

خالدا گاسکر
پریم شنکر سرلو استو
رحمٰن اکولوی

ذکر ہندوستانی مزاح نمبر کا

کچھ عرصہ پیشتر "سووینر" اور اس کے بعد "شگوفہ" کا ہندوستانی مزاح نمبر ملا۔ ہر دو کے لیے بے حد شکریہ قبول فرمائیے "شگوفہ" کا ہندوستانی مزاح نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق موزوں دیدہ زیب معنی خیز اور سرور آمیز ہے طنز و مزاح سے متعلق مختلف اور متنوع تخلیقات شاملِ اشاعت کرکے آپ نے اِسے مذکورہ اصناف کا چمنستان بلکہ زعفران زار بنا دیا ہے یہ آپ سب کی شبانہ روز تگ و دو اور لگاتار کاوش و کوشش کا ثمرہ ہے۔ میری طرف سے اس عدیم المثال ارمغان ادب کی پیش کاری پر مہمان مدیر جناب یوسف ناظم اور مدیر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو مبارکباد! زندہ دلانِ حیدرآباد زندہ باد، ماہنامہ "شگوفہ" پائندہ باد!!

اردو طنز و مزاح کی نسبت مقالات کا جہاں تک تعلق ہے ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون مختصر ہی ہے اور قاری کے دل میں شگفتگی بھی پیدا نہیں کرتا جو شمارہ ہٰذا کا تقاضا ہے۔ ان کا جائزہ درست سہی لیکن ایسی بھی کیا قنوطیت کہ دامانِ امید ایقان ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔ ڈاکٹر ظ. انصاری کا مقالہ بھرپور ہے۔ اتھاہ اور گہرا ساگر کی مانند۔ انھوں نے بہت نپے تلے انداز میں گذشتہ دو دہائیوں کے اردو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا تجزیہ نہایت خوشگوار موڈ میں بے حد دلنشین اور فکر انگیز اسلوب میں پیش کیا ہے۔ طنز و مزاح نگاروں کی صلاحیتوں اور تخلیقی سرگرمیوں کا فرداً فرداً جائزہ بھی بے حد دلچسپ، پُرلطف اور معنی خیز ہے۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی بلاشبہ اردو کے سب ادوار کے بہترین اور سربرآوردہ طنز و مزاح نگار ہیں۔ اور آگے بھی شاید کوئی ان کی ہمسری نہ کر سکے۔ دورِ حاضر کے اس رنگ اور آہنگ میں لکھنے والوں میں مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خان ہیں۔ یوسفی اور خاص طور پر کرنل محمد خاں کی تحریروں میں تو پطرس کی سی بے ساختگی اور اندازِ بیان کی سادگی پائی جاتی ہے۔ یوسفی اور اس سے بڑھکر کرنل محمد خاں نے اپنی تخلیقات میں برمحل اشعار کے جو نگینے جڑے ہیں ان کی مثال کہیں نہیں ملتی ماسوائے ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" کے۔ صحافتی فکاہیہ کالم لکھنے میں چراغ حسن حسرت مرحوم اور فکر تونسوی بے مثیل ہیں۔ ذہانت، طباعی اور بات میں سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ اور فن دونوں کے ہاں ایسا ہے کہ داد دیتے ہی بنتی ہے۔ اس کے علاوہ حال اور پندرہ بیس سال ادھر کے اس صنف کے سبھی لکھنے والوں کا اس مضمون میں ذکر آیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقالہ اپنے موضوع پر جامع اور بھرپور ہے اور ان سب پر طرفہ یہ کہ اس مقالے میں از آغاز تا انجام ظ. انصاری

انداز بیان شگفتہ دلوں کو لبھا لینے والا اور رواں دواں ہے جو اس خصوصی شمارے کے شایانِ شان ہے۔
یوسف ناظم کے مقالے میں وہ سب گُن ہیں، جو اس نوع کے ادب پارے کے لیے ضروری ہیں۔ مقالہ نگار نے ہر مزاح نگار پر الگ عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ تخلیقات کے جائزے اور تجزیئے کے علاوہ ہر ایک کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں چوں کہ مقالہ نگار کے بیان کے مطابق یہ مضمون آج سے چالیس سال قبل معرض تحریر میں لایا گیا تھا اس لیے اس میں دورِ حاضر کے مزاح نگاروں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ تشنگی ضرور قارئین کو کھٹکتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ ناظم صاحب مقالہ ہٰذا کو "تا این روز" تکمیل تک پہنچا کر خصوصی شمارے میں شامل کرتے کیوں کہ یہ کام انہیں آج نہیں تو کل بہر حال کرنا ہے!
ہندوستان کی تقریباً سب زبانوں کے نثری طنزیہ مزاحیہ ادب کا جائزہ شاملِ اشاعت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مہمان مدیر نے خاصی تگ و دو کے بعد مختلف زبانوں کے مقتدر تنقید نگاروں اور ادیبوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ان سے خاص طور پر شمارہ ہٰذا کے لیے مبسوط مقالے حاصل کیے ہیں۔ پھر انہی زبانوں کے بعض مصنفین کی تخلیقات کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔
عصرِ حاضر کے مقتدر طنز و مزاح نگاروں کے مختصر سوانح اور طبعزاد تخلیقات شامل کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے" انتخاب اور بقلم خود" عنوان کے تحت یہ سلسلہ بہت دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سلسلے میں احمد جمال پاشا، برق آشیانوی، بھارت چند کھنہ، پرویز ید اللہ مہدی، شفیقہ فرحت، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، وجاہت سندیلوی، مسیح انجم، رشید قریشی کو شامل کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ دورِ حاضر کے ممتاز مزاح نگاروں اور ان کے مضامین کا نمائندہ انتخاب ہے۔
سوال نامہ اور جواب نامہ میں نقادین، مصنفین اور علماء و ادباء کے تاثرات بھی خیال افروز اور معلومات افزا ہیں۔ بلاشبہ پطرس اور رشید احمد صدیقی کا کوئی جواب نہیں ان تاثرات کا لب لباب بھی یہی ہے۔ اردو طنز و مزاح سے متعلق منتخب کتابیات کی تفصیلات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ الغرض یہ خصوصی شمارہ اردو طنز و مزاح کے متعلق ایک ایسی جامع اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو محققین کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا اور اردو ادب کی تاریخ کے لیے ایک مستقل ماخذ کا حامل ہوگا۔
بہت سے قلمی معاونین کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔ جو اس خصوصی شمارے کے حسن میں اضافہ کا باعث ہیں ــــــ راز سنتوکھ سری۔ (چنڈی گڑھ)

محترم! سلام مسنون!
مہمان مدیر تو بمبئی میں ہیں اس لیے یہ خط میزبان مدیر کے نام ہی لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (ویسے بھی میزبان کے بغیر مہمان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)۔ شگوفہ کا "عالمی مزاح نمبر" تقریباً پورا پڑھ ڈالا۔ یقیناً آپ دونوں صاحبان کی محنت کا اعتراف ہر قاری کرے گا۔ میرے کیے گئے تین تراجم اس پرچے میں شامل ہیں۔ تراجم کے اچھے ہونے کی ذمہ داری تو میں قبول کر بھی لوں لیکن آپ نے ایک غضب یہ کیا کہ مراٹھی کے ادیب گنگادھر گاڈگل کی تمام تصنیفات کو ہندی کے مزاح نگار شرد جوشی سے منسوب کر دیا۔ یہ خط محض اس لیے چھاپ دیجئے کہ پڑھنے والے کو زیادہ دنوں تک الجھن نہ ہو۔ شکریہ۔ خالد اکا اسکر۔ بمبئی۔

مکرمی جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب۔ تسلیمات و نیاز!

جولائی کے پہلے ہفتے میں آپ کا خط پاکر دل کو بڑی تسکین ہوئی۔ خط گو مختصر ہی تھا لیکن اس کے ہر جملے پر آپکے بے پایاں خلوص کی مہر ثبت تھی۔ ایک بار پھر سے احساس ہوا کہ ؎

بوئے اخلاص سے مہکے ہوئے دو چار خطوط ؛ تلخی گردشِ ایام بھلا دیتے ہیں!

" شگوفہ کا خصوصی شمارہ "ہندوستانی مزاح نمبر" (نثر) ملا اس خصوصی شمارے کو ابھی تو میں نے صرف "چکھا" ہے۔ تاہم اتنا تاثر ضرور ہوا کہ یوسف ناظم صاحب اور آپ نے کس طرح رات دن ایک کر کے اپنے ملک کی پندرہ زبانوں کا نمائندہ مزاحیہ ادب فراہم کر کے اسے ترتیب دیکر منزلِ اشاعت تک پہنچایا ہوگا! آپ کی یہ نایاب پیش کش تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مہمان مدیر اور مستقل مدیر دونوں کو میری دلی مبارکباد!

یوں "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر ۱۹۵۹ بھی مواد اور ضخامت اور انتخاب کے لحاظ سے بہت ہی خوب تھا۔ لیکن اس وقت کی ضرورت کے مطابق اس کا دائرہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب تک ہی محدود تھا۔ 'شگوفہ' کے اس شمارہ کا کینوس کافی وسیع اور رنگارنگ ہے۔ البتہ اس کا کچھ مواد (گو مفید اور کارآمد تو وہ بھی ہے قارئین کے لیے) بھرتی کا شائبہ ہوتا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر اس خصوصی شمارہ کی خوبیاں لائقِ تحسین و احترام ہیں، اور اس کی تھوڑی سی خامیاں قابلِ درگزر سمجھی جانی چاہئیں۔

مرزا کھونچ کے مراسلے (شگوفہ۔ جولائی ۸۵ء) میں کی گئی تجویز کہ شگوفہ کا اگلا خصوصی شمارہ مزاحیہ شعری تخلیقات کا احاطہ کرے، اس سے میں پوری طرح متفق ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ یہ شمارہ صرف اردو کے ہی طنزیہ اور مزاحیہ شعری ادب پر مشتمل ہو۔ اور اس سے اگلا جو شمارہ خصوصی نکالیں اس میں یا تو 'عالمی مزاحیہ ادب' یا پھر صرف "انگریزی ادب" کے طنز و مزاح کا احاطہ کیا جائے۔

پریم شنکر سری واستو، جودھپور

محترمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب! السلام علیکم!

" ہندوستانی مزاح نمبر" ایک تاریخی دستاویز ہے جسے نسل در نسل سنبھال کر رکھا جائے گا۔ آپ سب قابل مبارکباد ہیں کہ بڑی کاوش سے اسے شائع کیا۔ رحمٰن اکولوی

SHUGOOFA Hyderabad-1

Vol. 18 Copy 8 | Postal Regd. No. H/HD 6

August 1985 Phone : 557716

SEPTEMBER 1985

Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد (۱۸) ★ ستمبر ۱۹۸۵ء ★ شمارہ (۹)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

★ قیمت فی پرچہ : ۴ روپے
★ زرِ سالانہ : ۳۵ روپے
★ بیرونِ ہند سے : ۱۲۵ روپے

★ کتابت : محمد عبدالرؤف، مسعود انور
★ طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ / بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون : آفس : ۵۵۷۱۶ ، رہائش : ۵۲۱۰۶۴

★

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ہاگے پرزے .... (خاکہ)

فکر تونسوی — ایک چیتکار ——— بلونت کارگی ——— ۹

رشاذ و ناظم انصاری

شاذ کی یاد میں ... ——— مجتبیٰ حسین ——— ۳۴
ناظم انصاری۔ شخصیت اور شاعری ——— ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل ——— ۵۱
انتخاب کلام ——— ناظم انصاری ——— ۵۵

ــر لوگاں سوں معمور کر .. (شہر حیدرآباد)

ججججلوس .... ——— عابد معز ——— ۲۱

ی جی ڈیلے ... (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومر اولمپکس کے لئے ——— عطاء الحق قاسمی ——— ۲۵

مفت (انشائیے)

بچی جان اور پاندان ——— حلیمہ فردوس ——— ۱۷
تالی ——— بابو آر کے ——— ۳۱
ردِ عمل ——— راز ستو کھسری ——— ۴۰
خواب ——— ممتاز مہدی ——— ۴۲
ہم تو اس کرکٹ کے ہاتھوں ... ——— حفیظ الکبیر پرواز ——— ۴۵

(افسانچے)

— دھجیاں ——— عابدہ محبوب ——— ۴۸
— دے کے خط ... ——— (مراسلے) ——— ۵۸

چھوہارے

برق آشیانوی ۱۵
ضیاء الحق قاسمی ۱۶
سمیع جلیل ۱۵
اعجاز وارثی ۱۶
ظفر چکر یتوی ۲۴
منصور عمر ۲۴
یوسف یکتا ۳۰
لاغر نرملی ۳۰
فردوس ۳۰

اِدارِیہ

شاذؔ کیوں چپ ہو، یہ آشفتہ سری کیسی ہے؟
اُردو کا نامور شاعر شاذؔ تمکنت آج ہمیشہ کے لئے خاموش ہے ——

شاذ تمکنت —— جس نے آزادی کے بعد بڑے چاؤ کے ساتھ شاعری شروع کی اور اپنی نظموں کے ذریعہ دنیائے ادب کو چونکا دیا — جو ترقی پسند بھی تھا اور جدید بھی، لیکن جس کا خمیر کلاسیکیت سے اٹھا تھا۔ اور جس کی رومان پرست طبیعت نے غزلوں کے دامن میں پناہ لے رکھی تھی۔ منفرد نظم گو شاعر شاذؔ تمکنت کو اس کی غزلوں نے برصغیر کا مقبول عام شاعر بنا دیا تھا۔ شاعری کے تین مجموعے تراشیدہ، بیاضِ شام اور نیم خواب، شاذ کی طبیعت کی نفاست اور شعری سفر کے غماز ہیں۔ پاکستان سے ایک انتخاب "ورقِ انتخاب" کے نام سے شائع ہوا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی نسل کے ہندوستانی شعراء میں شاذ کو پاکستان میں سب سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔ شاذ کوئی تین سال سے بیمار رہنے لگے تھے۔ زندگی کے کڑوے گھونٹ انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ حلق سے اتار لئے۔ ۵۳ سال کی عمر بھی کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے؟ — لیکن اس کا گلہ کس سے کریں؟

دامن ہے دور اور گلے نارسا کے ہیں
یعنی ہمارے ہاتھ فقط اب دعا کے ہیں　　(شاذؔ)

- طنز و مزاح کے ممتاز شاعر ناظم انصاری کا دلی تا ناگپور سفر کے دوران ریل ہی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ ناظم صاحب مشاعروں کی جان تھے۔ اپنے خاص ترنم سے وہ شعر سناتے اور داد حاصل کرتے تھے زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعروں میں وہ اکثر شریک رہے۔ ماہنامہ 'شگوفہ' سے انھیں خاص اُنسیت تھی۔ ان کے انتقال سے مزاحیہ شاعری کی روایات کو سخت دھکا پہنچا۔

خدا سے دعا ہے کہ مرحومین کو اپنی اعلیٰ رحمتوں سے نوازے۔　　••

شگوفہ کی مجلسِ مشاورت میں جناب یوسف ناظم کی شمولیت

قارئینِ شگوفہ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ نامور مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے شگوفہ کی مجلسِ مشاورت میں شرکت سے اتفاق کر لیا ہے۔ اس کے لیے ادارہ ناظم صاحب کا ممنون ہے

شاذ تمکنت

اور

ناظم انصاری

کیری کیچر

از

طالب خوندمیری

ماہنامہ شگوفہ کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر ——— یوسف ناظم

* ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں

گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی)، کل کی (ٹامل)، ونود بھٹ اور لگن بہاری لال مہتا (گجراتی) [illegible] (اڑیا)، راوی کونڈل راؤ (تلگو)، بیچی (کنڑا) اینیا پانی کر (ملیالم)، نارائن گنگوپادھیائے (بنگلہ) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری) شرن بہاری شرما (راجستھانی) شرد جوشی (ہندی)، رمی لال شاہین (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم —!

* ہندوستان کی چند اہم زبانوں کے مزاحیہ [illegible]

دیوش ٹھاکر (ہندی)، ہرائیش گوسوامی (بنگالی)، عزیز تمنائی (ٹامل)، ایلادی گوپال [illegible]، ڈاکٹر بھگتا وتسل راؤ (تلگو)، تمام سندر مصرا (اڑیا)، [illegible] سکیا جوہری (گجراتی)، حمید الماس (کنڑی)، ڈاکٹر پریتم سنگھ شی (پنجابی)، ڈاکٹر اعجاز مدنی (مراٹھی)، پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم)، کرت بابانی (سندھی)، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی)، ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی) اور بشیر عارف (کشمیری)

* اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ بقلم ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم

* عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبد المغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مناظر عاشق ہرگانوی اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء * اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں، فکر تونسوی، کنھیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پروفیسر یداللہ مہدی کے مضامین اور خود نوشت سوانح * ڈاکٹر عبد المغنی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے لئے گئے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے انٹرویو * مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی * تخلیق کاروں کی تصویریں * اور دوسری کئی دلچسپیاں

* خوبصورت دو رنگی سرورق — سعادت علی خان

* ضخامت: ۳۸۶ صفحات * قیمت: ۵۰ روپے

* سالانہ خریداروں سے ۴۰ روپے، ۵ روپے زائد بھجوانے پر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا۔

بلونت گارگی

فکر تونسوی ۔ ایک چمتکار

میں نے فکر تونسوی کو ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف سے، باریک سی، کمزور سی آواز آئی ۔ "چارپائی میں مُبتلا، پڑا ہوں۔ بخار میں جسم پھنک رہا ہے۔ دفتر نے دس دن کی رخصت ازراہِ عنایت دے دی ہے۔ بس، یوں سمجھو، قبر میں سے بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا: "تم چور ہو"

"میں؟ یعنی کیا قبر میں پڑا ہوا چوری کر رہا ہوں؟ مگر کس کی؟"

"میری۔ تم میری چوری کرنے کے عادی ہو گئے ہو۔ ہر صبح تم میری جیب سے ساٹھ پیسے چوری کر کے لے جاتے ہو۔"

"یعنی، کیا مطلب؟"

"یعنی ہر صبح مجھے روزانہ اخبار "ملاپ" خریدنا پڑتا ہے۔ صرف اس میں تیرا طنزیہ کالم "پیاز کے چھلکے" پڑھنے کے لیے۔ نہ معلوم وہ کیا پیاز مل گیا ہے۔ جس کے چھلکے تم گذشتہ تیس برس سے ہر روز اتارتے جا رہے ہو۔ تیکھے مگر مزیدار۔ دیدار فکر! میں تیرا FAN (دلدادہ) ہوں۔ جیسے کسی زمانے میں فلم ہیروئن مس سلوچنا کا تھا۔"

"آہ! مس سلوچنا؟ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اور میں اب قبر میں پڑا ہوا سوچتا ہوں کہ اگر میں جہنم میں گیا تو شاید وہاں اس حسین ہیروئن سلوچنا سے ملاقات ہو جائے۔ میرے لیے تو جہنم میں وہی واحد جنت ہوگی۔"

"ارے ایسی بک بک مت کر۔ کہیں زیادہ تو نہیں پی گیا!"

"آج کل میگساری بند ہے۔ جگر برباد ہو گیا ہے۔ دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ سبھی دانت اِنّا لِلّٰہ و انا علیہ راجعون ہو گئے اور اب نقلی پلیٹ لگوالی ہے۔ مارے خوف کے ہنستا بھی نہیں کہ کہیں نقلی دانت نیچے نہ گر پڑیں۔ عجیب زندگی ہے سالی! انقلاب کا جھنڈا اٹھا کر چلا تھا مگر اب چارپائی پر پڑا ہوا، جیسے دور مزدوروں کے نعرے سنتے ہوئے ہنسی آتی ہے۔ نہیں نہیں، ہنسی آتی ہے نہ موت آتی ہے۔"

میں نے کہا "کیوں بار بار موت کی دھمکی دیتے ہو۔ میں تو تمہارا مداح ہوں۔ ہر روز تمہارا کالم پڑھتا ہوں۔ افیون کی سی گولی ہے تمہاری تحریر ۔۔ چسکا پڑ جائے تو اس سے چھٹکارا مشکل!"

فکر تونسوی نے آہ بھری اور پھر اپنی قبر اور کفن اور خستہ حالی کی اشک فشانی شروع کر دی۔ میں نے کہا "بہر کیف تو مجھے

لوٹ رہا ہے، مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ میرا استحصال کر رہا ہے"۔

وہ بڑی کبریائی سے بولنے لگا۔ "میں خوش ہوں کہ میں نے کبھی کسی کا تو استحصال کیا؟ ورنہ اس کم بخت "ملاپ" کی ملازمت بس کا سفر، اردو میں مضمون لکھنا، یوں لگتا ہے، جیسے یہ کچھ یتیموں کو دی جانے والی گالیاں میرے اردگرد لپٹ گئی ہیں"۔

میں نے کہا۔ "تمہارے ہزاروں لاکھوں مداح ہیں۔ سامنے سردار کیکر سنگھ کا ڈھابہ ہے۔ وہاں چائے پیتے ہوئے کئی بزرگ "ملاپ" پڑھ رہے ہیں۔ ایک آدمی ہمارا کالم پڑھ رہا ہے اور دس آدمی سن رہے ہیں۔ جیسے ہنومان چالیسا کا پاٹھ ہو رہا ہو۔ اور پھر سامنے مادھو حجام کی دکان ہے وہاں بھی پیاز کے چھلکے سا شاک آتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے سرکاری دفتروں کے چپراسی اور کلرک بھی یہ کے چھلکے پڑھنے کی رسیلی کڑواہٹ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ درزی مولا رام کی دکان پر آنے والے گاہک بھی . . . .

وہ کہنے لگا۔ "وہ تو ہوگا ہی۔ میرے سبھی پڑھنے والے بوڑھے ہیں۔ یا "ملاپ" پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں بھی بوڑھا ہو رہا ہوں۔ آخر بوڑھوں کے کوئی سینگ تو نہیں ہوتے۔ تم پنجابی زبان میں لکھتے ہو۔ جسے جوان لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ میں اردو زبان میں لکھے؟ میرا دور ختم ہو رہا ہے۔ اور اردو والوں کے ہاتھوں ہی . . . .

فکر تونسوی کے نقش و نگار میں یتیمی، مگر ذہن و قلم میں چاشنی اور آہنگ ہے۔ اس کے قلم میں لاہور کے ممتاز ادیبوں کا رنگ جھ اس کا نام میرے ذہن میں آتے ہی، میرے سامنے سعادت حسن منٹو کا چہرہ اُبھر آتا ہے۔ کیونکہ میں نے پہلی مرتبہ فکر تونسوی ک مکتبۂ اردو لاہور میں بیٹھے کاغذ پر کچھ لکھتے دیکھا تھا، وہ لکھ رہا تھا اور میں سعادت حسن منٹو سے گفتگو کر رہا تھا۔

فکر تونسوی نے گھٹنوں تک کی پنجابی دیہاتی شلوار اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے کان میں ایک چھوٹی سی طلائی مرکی بھی تھ رخساروں پر گاؤں کی سادگی، چہرہ ملبوس تھا۔ سر سے پاؤں تک ایک سادہ اور سہما ہوا دیہاتی۔

چوہدری نذیر احمد (اب مرحوم) جو مکتبہ اردو کا مالک تھا، اردو ادیبوں کا بہت بڑا جوہری تھا۔ اس کے محبوب ادیب، منٹو، کرش بیدی اور عصمت چغتائی تھے۔ وہاں ہندوستان بھر کے ادیب، شاعر اور نقاد آتے۔ یہ دکان اردو ادب کا بہت بڑا مرکز بلکہ عبادت گ تھی۔ یہاں ادبی مباحثے ہوتے۔ ادبی تفکر اور پھر تفکر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لطیف اور نکتہ رس گالیاں۔

فکر تونسوی اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ان دانشوروں ادیبوں کے درمیان خط و کتابت میں مصروف رہتا۔ وہ شاید لاہور میں شاعر بننے کی نیت سے آیا تھا۔ مگر وہ وہاں کے بڑے بڑے عظیم دانشوروں کے سامنے مارے شرم کے اتنا بھی نہیں کہہ سکا اس کے اپنے اندر بھی ادبی عظمت براجمان ہے۔ جو کرسی پر خاموشی سے خط و کتابت والا منشی بنی بیٹھی ہے۔

اُس کی شخصیت اتنی کھلی کھلی سی تھی۔ کہ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ کان کی مرکی، دیہاتی شلوار، چہرے کی سادگی اور نہ نکھر آنے والی خاموشی۔ اُسے دیکھ کر تو مجھے یوں لگا، جیسے کوئی غریب مسلمان کسی ٹوٹی ہوئی مسجد میں عظیم نماز پڑھنے کے لیے بیٹھا آگیا ہو۔

جب ملک کی تقسیم ہوئی۔ تو وہ جالندھر میں آگیا۔ اور کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہو گیا۔ بقول اس کے یہ تقسیم اس کے لیے بہت بڑا اعصابی صدمہ ثابت ہوئی۔ اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے روزنامہ "نیا زمانہ" میں روزانہ ایک طنزیہ کالم "آج کی خبر" لکھتا رہا۔ جب کبھی جالندھر جاتا۔ تو اسی سے ملاقات کی آرزو نجانے کیوں مجھے اس اخبار کے دفتر میں لے جاتی۔ ہم اکٹھے بیٹھ کر قریب کی کرم دکان پر گرم چائے پیتے۔ وہ وہاں اکثر یہ دہائی دیتا۔ کہ پارٹی کی محدود تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ کہاں جائے، کدھر جائے۔ کونسے کنو

جا کر گر جائے۔ تاکہ وہاں کم سے کم پینے کے لیے پانی تو ملے۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ جب پارٹی اخبار بند ہونے کو آیا تو وہ دہلی کے روزنامہ "ملاپ" میں روزانہ کالم رائٹر کے طور پر ملازم ہو گیا ہے۔ "ملاپ" کو آریہ سماجی مہاشوں کا اخبار کہا جاتا تھا۔ کئی حضرات تو اسے جن سنگھی اخبار بھی سمجھتے تھے۔ کم از کم ترقی پسند ادیبوں کی تو یہی متفقہ رائے تھی۔

ترقی پسندوں نے فکر تونسوی کو گالیوں وغیرہ سے بھی نوازا۔ کہ آخر فکر تونسوی سالا بورژوا اخبار کی چھاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ اور انقلاب کا ساتھ چھوڑ گیا۔ لیکن دراصل فکر تونسوی میدانِ کارزار میں ڈٹ گیا تھا۔ ایک سرمایہ دار اخبار میں ترقی پسندی کا ایک اپنا بڑا سا کھمبا گاڑ دیا تھا۔ چونکہ اس کا کالم قارئین "ملاپ" میں بہت مقبول ہو گیا تھا وہ جو کچھ لکھتا اپنی مرضی سے لکھتا۔ دبے کچلے عوام کے بارے میں لکھتا۔ اور عوام اس وقت تک "ملاپ" نہیں خریدتے تھے۔ جب تک اس میں "پیاز کے چھلکے" کا کالم نہ دیکھ لیتے۔

عوام نے مجبور کیا۔ اور سرمایہ دار اخبار کے مالک فکر تونسوی سے اتنا کہنے کی جرأت بھی نہ کر سکے کہ تم اپنی رضا سے مت لکھا کرو۔ ہماری رضا سے لکھا کرو۔ وہ آج عوام کا مقبول ترین ادیب بن گیا ہے۔ اور یہی مقبولیت ہی اس کا سب سے بڑا انقلاب ہے۔ جو بہت کم ترقی پسند ادیبوں کو نصیب ہوا۔

فکر تونسوی، تقسیم ہند کے فسادات میں بھی لاہور میں ہی قیام پذیر رہا۔ سبھی ہندو سکھ باشندے ہندوستان میں آ گئے مگر فکر تونسوی مکتبۂ اردو کے دفتر میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ کہتا تھا "لاہور میرا شہر ہے یہیں میری ادبی پرداخت اور پہچان ہوئی۔ میرا کوئی مذہب نہیں بھاگنے والوں کے مذہب ہوں گے، ہندو، مسلمان۔ مگر میں انسان ہوں اور انسان کا مذہب کوئی نہیں ہوتا، سوائے انسان بنے رہنے کے ___!

مگر انسان ہونے کے باوجود فکر تونسوی کا چہرہ مہرہ اسلامی اسلوب کا سا تھا۔ اُسے لاہور سے عشق تھا۔ اور چہرے مہرے کے اسلامی ڈھنگ نے اُس کے عشق کو دوبالا کر دیا تھا ___ ایک بے نیاز سا عشق۔

ایک دن وہ دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے فن کار دوست بھی بیٹھے تھے۔ ساحر لدھیانوی، ممتاز مفتی اور قتیل شفائی، احمد راہی ___ کہ اچانک تین غنڈے اندر آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں چھرے تھے۔

ایک غنڈے نے فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تو ذرا باہر آجا"

فکر قدرے گھبرا گیا۔ بولا "کیوں؟"

غنڈے نے کہا۔ "تو ہندو ہے، ہم تمہیں قتل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہندو کا ہمارے ملک میں کوئی کام نہیں"

ساحر نے ایک غنڈے سے کہا "مگر یہ تو مسلمان ہے"

غنڈے نے کہا "ہم جانتے ہیں اسے۔ اس کا نام رام لال ہے"

ساحر بولا۔ "مگر اب یہ محمد اسلم ہو گیا ہے اس نے اسلام قبول کر لیا ہے"

ممتاز مفتی اور قتیل شفائی نے بھی ساحر کی بات کی پُر زور تائید کر دی۔

غنڈہ گرجا "ہم نہیں مانتے۔ ہم تو اسے مسلمان مانتے ہیں جسے شاہی مسجد کا امام مسلمان کہہ دے"

ساحر نے کہا۔ "مگر یہ تم سے بہتر مسلمان ہے۔ اسے تو قرآن کی کئی آیتیں زبانی حفظ ہیں۔ کیا تمہیں قرآن کی کوئی آیت

آتی ہے؟

فکر کا حوصلہ جیسے بڑھ گیا۔ اکڑ کر بولا "میں حدیث شریف کا عالم ہوں۔ کیا تم حدیث کے متعلق کچھ جانتے ہو، یا صرف ہاتھ میں لیکر مسلمان بنے پھرتے ہو!

یہ کہہ کر اس نے چار پانچ آیتیں فوراً سنا دیں، کلمۂ شریف خالص عربی لہجے میں بول دیا۔

اس پر غنڈے تھوڑا گھبرائے مگر بولے۔ اور ساحر سے بولے "ٹھیک ہے، لیکن امام صاحب کا سرٹیفکیٹ بہت ضروری ہے اور دیکھ بے! (وہ ساحر لدھیانوی سے مخاطب ہو کر بولے) ہم کل پھر آئیں گے۔ سرٹیفکٹ اس کا تم دکھاؤ گے نہ دکھایا تو تم قتل کر دیں گے۔"

اور پھر اسی رات کو فکر تونسوی، ممتاز مفتی کے گھر سے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں کامریڈوں نے اُسے ڈی اے وی کالج کے رفیوجی کیمپ میں پہنچا دیا۔ جہاں سے فکر تونسوی، جو رفیوجی کہلانا پسند نہیں کرتا تھا، ایک رفیوجی قافلے کے ساتھ ہندوستان آ گیا ـــــ!

فکر تونسوی دراصل شاعر تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ ایک بڑا شاعر بنے۔ اس کی نظمیں بڑے بڑے عظیم ادبی میگزینوں لطیف، ادبی دنیا، ہمایوں وغیرہ میں بڑے افتخار سے شائع کی جاتیں۔ فسادوں میں ہی اس کی نظموں کا ایک مجموعہ "ہیولے" نام شائع بھی ہو گیا۔ مگر یہ نظمیں اتنی عمیق گہرائیاں رکھتی تھیں کہ عام شعور رکھنے والے قاری کی فہم سے بالاتر تھیں۔ اس لیے نہ نقادوں نے اُسے پرکھا نہ قارئین نے۔ بلکہ یہاں تک مشہور ہو گیا تھا کہ لکھنے کے بعد خود فکر تونسوی کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں ـــ آج چھبیس برس بعد لوگ کبھی کبھی اُس کی نظمیں سناتے ہیں تو کہتے ہیں "طنز تو اس کی نظموں میں بھی موجود تھا۔ مگر گہرا۔ مگر وہ طنز جب اس کی نثر میں آیا تو لوگوں میں اس کی ادبی شخصیت کا اعتراف کر لیا گیا۔

اس نے شاعری ترک کر دی۔ نثر میں طنز لکھنے لگا۔ وہ کہتا ہے "میں عوام کا فنکار تھا، عوام اگر شاعری کی بجائے نثر میں تو عوام کا رائٹر نثر لکھے گا۔ ادب وہی عظیم ہوتا ہے جو عوام کے جذبات کا ترجمان بن جائے۔"

۱۹۵۱ء میں وہ عالمی امن کا علمبردار بن کر میدان میں کھلے بندوں آ گیا تھا۔ پنجاب کے گاؤں گاؤں میں وہ بڑا بن مانگے والا طنز نگار ادیب، کندھے پر امن کا جھنڈا لٹکائے بغل میں لاؤڈ اسپیکر لیے ہزاروں میل کے چکر لگاتا رہا، امن کے لیے! امن کے لیے بالکل جنونیوں کی طرح۔ آج کل کبھی کبھی فکر تونسوی سے بات ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے "کیا دن تھے وہ بھی۔ پارٹی کا ہول ٹائمر تھا مگر کتنا خوش! کتنے خوشگوار خواب۔ اخبار کے لیے روزانہ کالم، امن کا جھنڈا، جلسے، نعرے۔ جو روٹی نہیں دیتے۔ مگر پیٹ تو کو چاہنے والے کسان میرے گھر میں کبھی گڑ لے آتے، کبھی گوبھیاں، گاجریں، مکئی کا آٹا، بھینس کا دودھ۔ عوام کی اس محبت میں میں پاگل ہو جاتا۔ ایسے پاگل پن میں جو خوشی ہوتی ہے بلونت! وہ اور کہیں نہیں ملتی۔"

فکر کئی بار مجھے ملنے کے لیے میرے گھر میں آ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ کہنے لگا "بلونت! تیرا یہ ائرکنڈیشنر بڑی ٹھنڈی ہوا پھینکتا ہے۔"

میں نے جواب دیا "کیوں کہ اٹھارہ برس پرانا ہے۔"

وہ بولا "مضبوط ہڈی کا ہے۔ پنجاب کے جاٹ کی طرح۔ اس نے ضرور بادام اور مکھن کھائے ہوں گے۔ میری ماں کہا کرتی

گونگا پہلوان بھی تو بادام اور مکھن کھاتا ہے۔ جبھی تو بڑے بڑوں کو چت گرا دیتا ہے۔ گارگی! تیرا یہ کنڈکٹر گونگا پہلوان ہے۔ اگر تو بادام نہیں کھلا سکتا تو پکوڑے ہی کھلا دے۔ آج کل تو تیل کے پکوڑوں میں بھی طاقت ہے۔ دیکھ لے، مزدور، تیل کے پکوڑے کھاتا ہے تو بڑے بڑے وزیروں کے سر کو جھکا دیتا ہے۔ چاہے وہ چودھری چرن سنگھ ہو چاہے ایران کا شہنشاہ ہو یہ سب پکوڑوں کی کرامت ہے۔ اگر وہ پیرس میں صرف شراب پیتا. تو ایران میں آکر مغربی غاصبوں کو اکھاڑ نہ سکتا۔ سمجھے یہ سب پکوڑوں کا کمال ہے تو پھر منگواؤ پکوڑے!

فکر تونسوی کی اوٹ پٹانگ باتوں میں بھی گہری جڑیں اور سیاسی شعور ہوتا ہے۔

فکر تونسوی کے اخباری کالم میں ادبی اسلوب اور گہرائی ہوتی ہے اور یہ اس کے لیے خداداد نعمت ہے۔ کہ وہ پڑھنے والوں پر جیسے جادو ٹونا کر دیتا ہے۔ اُسے اپنے قلم پر ایک ایسا انوکھا یقین ہے کہ وہ جو کچھ لکھے، جیسے بھی لکھے، چاہے اوٹ پٹانگ لکھے۔ مگر وہ قاری کو اپنی ساحرانہ گرفت میں لے لیتا ہے۔ فقرے کو اُلٹا ٹانگ دے۔ ٹیبل لیمپ کو اندھکار کی علامت کہہ دے۔ سفید کو سُرخ اور دھوپ کو کالا لکھ دے۔ لوگ اُسے قبول کر لیں گے یہ ایک تخلیقی طاقت ہے۔ ایک ایسا چمتکار، جس میں کوئی چالاکی نہیں۔ صاف صفائی ماہرانہ قلابازیاں ہیں۔

ایک مرتبہ فکر تونسوی لکھنے بیٹھا تو اُسے یوں لگا دماغ خالی ہے۔ کچھ سوجھ نہیں رہا۔ اچانک اپنے آپ سے کہنے لگا "فکر تونسوی کچھ نہیں تو صفر ہے۔"

تو ایک دم خیال آیا "کیوں نہ آج صفر پر لکھا جائے۔ کتنی بدصورت چیز ہے یہ صفر۔ صفر کے پیچھے ہندسے لگاتے جاؤ، تو کوئی قیمت نہیں۔ لیکن ہندسے کے آگے صفر لگاتے جاؤ تو سینکڑے، ہزار اور لاکھ بن جاتے ہیں۔ صفر تو موجود ہے مگر سوال یہ ہے کہ کس انسان کے آگے لگائی جائے کہ امیر کو فقیر اور فقیر کو امیر بن جانا پڑے۔

وہ دنیا کی ہر چیز پر لکھ سکتا ہے، کلرک پر، کتے پر، لوفر پر، گدھے پر، افسر پر، برات پر، چاندنی پر، اور رندھیر سنگھ حلوائی پر مگر جس چیز پر بھی لکھے، اُس میں نجانے کس حسین ہیر پھیر سے اپنے معاشرے کو ضرور لے آتا ہے۔ جو استحصال کرنے اور ہونے والوں کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا معاشرہ بن گیا ہے۔

فکر میں اپنے اوپر ہنسنے اور اس طرح سماج پر ہنسنے کا سلیقہ ہے۔ اُسے اس ادبی گُر کا علم ہے۔ جس سے ہمارے بہت سے فن کار محروم ہیں۔

اس کے قلم کا محبوب کردار اس کی بیوی ہے۔ یہ بیوی فکر تونسوی کی بیوی نہیں، وہ سماج کی نمائندہ بیوی ہے جو ہر گھر میں ملتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کی آڑ لے کر ہر گھر میں داخل ہو جاتا ہے وہ کسی بھی کلرک یا افسر کی بیوی کی کھلی اڑاتا ہوا اسے اپنی بیوی کا روپ دے دیتا ہے۔

فکر موت سے بہت ڈرتا ہے اس ڈر سے بچنے کے لیے وہ موت کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ اس لیے اپنے طنزیوں میں موت سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اللہ کے دربار میں پہنچ جاتا ہے قبر میں جا کر لیٹ جاتا ہے۔ جنت اور جہنم کے ٹرپ کر چکا ہے میں نے ایک بار کہا۔ تو موت سے اتنا مذاق کیوں؟ وہ بولا "موت سے کون نہیں ڈرتا۔ لوگ اس ڈر کو اپنے اندر چھپا کر رکھتے ہیں۔ مگر موت بڑی عیار ہے وہ اشارتاً بھی نہیں بتاتی کہ وہ کب تشریف لائے گی۔ لوگ انتہائی غمگین ہوں تو موت کا انتظار کرتے ہیں، انتہائی خوش ہوں تو انتظار معمول جاتے ہیں اچانک اسی بھول میں موت انھیں آدبوچتی ہے۔ یہی زندگی کا مزا ہے اور یہی موت کا۔ ورنہ میرے ایسے کئی آدمی تو خواہ مخواہ خودکشی

کر لیے ہیں۔ اگر مجھے علم ہو کہ میں اڑسٹھ برس ختم ہوتے ہی مر جاؤں گا۔ تو میں شاید اس سے پہلے ہی مر جاؤں۔ کیوں کہ میں موت کا مذاق اڑانے سے محروم کر دیا جاؤں گا۔ تو کیوں نہ زندگی میں موت کا مذاق اڑاؤں، یہ مذاق نہیں ایک نشہ ہے زندگی کا مذاق کرتے کرتے چاہے پھر میں پانچ سال جیوں، پانچ مہینے، پانچ دن یا پانچ گھنٹے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ کچھ دیر رک کر بولا۔" میری بیوی کہتی ہے، آپ کی اپنی عمر لمبی ہو۔ علی الصبح سیر پر جایا کیجئے پورے ایک سو سال زندہ رہیں گے آپ — اس نے مرغ سحر کی بانگ پر مجھے جگا دیا۔ ہاتھ میں چابک دے دیا۔ میں سیر پر نکل گیا۔ اس سے پہلے میں نے صبح کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں خوش خوش جا رہا تھا۔ تو کیا دیکھا تین آدمی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے سیر پہ جا رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی میری طرح ہی سوچتے ہوں گے۔ بلکہ میری بیوی کی طرح ہی سوچتے ہوں گے۔ ان میں ایک بنگالی تھا۔ جو میرا پڑوسی تھا۔ اور سولہ زبانیں جانتا تھا۔ وہ ہر زبان کے محاورے اکٹھے کرتا پھرتا تھا۔ اس نے مجھے پوچھا۔" جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" کا کیا مطلب ہے؟ میرے ہاتھ میں لاٹھی تھی مگر بھینس کہاں گئی؟ کیا ہم سبھی بھینس کی تلاش میں نہیں نکلے تھے۔ یہ مجلس دراصل ڈیموکریسی ہے، جسے ہم لاٹھی لیکر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر فکر بلند آواز میں قہقہے لگانے لگا۔

فکر، گزشتہ تیس برس سے دہلی میں رہ رہا ہے۔ اُس نے گل مہر پارک میں امیتابھ بچن کے بنگلے کے قریب اپنا مکان بنا لیا ہے اس کی دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، اکلوتا بیٹا بارروزگار ہے۔ مگر فکر اب بھی بس میں سفر کرتا ہے۔ ملاپ کے چیف ایڈیٹر رنبیر جی کے انتقال کے بعد فکر نے بھی ملاپ میں روزانہ کالم لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر ملاپ اُسے نہیں چھوڑتا۔

وہ اب بھی ہر اتوار کو اپنا کالم لکھتا ہے — پیاز کے چھلکے ۔ اُسے اب بھی روزی، ڈھابے والے، گراج والا، چپراسی اور نائی پڑھتے ہیں۔ وہ اب بھی عوام کا محبوب کلاکار ہے۔

اگر اسے کسی بس اسٹاپ پر کھڑے دیکھا جائے تو کوئی نہیں کہے گا کہ یہ یہ ادبی چمتکار، ہر دلعزیز، فکر تونسوی کھڑا ہے وہ اردو ادیبوں کی اس قطار میں سے ہے جو آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہے، منٹو چلا گیا، کرشن چندر چلا گیا، ساحر لدھیانوی بھی روانہ ہو گیا، راجندر سنگھ بیدی بھی اُٹھ گیا۔ فکر جب بیماری میں مبتلا ہوتا ہے یا کسی اتوار کو پیاز کے چھلکے نہیں آتے تو دل میں جھٹکا سا لگتا ہے۔ کہ کہیں فکر تونسوی بھی چلا تو نہیں گیا۔ میرے لیے فکر سبھی ادیبوں اور لاہور کے اجتماعات کی جیتی جاگتی یادگار ہے —!!

برقؔ آشیانوی

دس فی صد

رہ گئے خاکسار دس فی صد　　آپ کے جاں نثار دس فی صد

رخِ بے نور پر بھی میک اَپ سے　　آ گیا ہے نکھار دس فی صد

انتظامِ اُمورِ خانہ میں　　مرد کا اختیار دس فی صد

اب صفر بھی نہیں ہے، پہلے تھا　　وعدے پر اعتبار دس فی صد

ہنسنے والوں کی ہم پہ کثرت ہے　　اور ہیں غم گسار دس فی صد

دیس کی ساختہ تمئی اشیائ　　ہوتی ہیں پائیدار دس فی صد

شاعروں کا کوئی شمار نہیں　　ہیں فسانہ نگار دس فی صد

ملک میں ہر طرف خزاں ہے برقؔ
رہ گئی ہے بہار دس فی صد

رشید عبدالسمیع جلیلؔ

جدید ساقی نامہ

سیب، انگور، آم لے ساقی　　موز بھی صبح و شام لے ساقی

گرنے والی ہے حُسن کی دیوار　　ابتدا ہی میں تھام لے ساقی

ہم کو مت چھوڑ بھیڑ میں تنہا　　نان نفقہ دوام لے ساقی

اک رباعی پہ وار دے بوتل　　صرف تازہ کلام لے ساقی

ہم ہیں شاعر قری بلا ہم کو　　کچھ رعایت سے کام لے ساقی

پی کے بے ہوش ہے اگر کوئی　　ہوش میں لا کے دام لے ساقی

مفت خوری کی جس کو عادت ہے　　اُس کے ہاتھوں سے جام لے ساقی

وہ جو کرتا ہے میکدہ ناپاک　　اُس سے تو انتقام لے ساقی

رخشِ میکش اگر ہو بے قابو　　تو ہی بڑھ کر لگام لے ساقی

آج کل چوریاں ہیں زوروں پر　　سب کی جھڑتی مدام لے ساقی

تجھ سے چلتا نہیں جو تمباکو　　پان ہی کھا قوام لے ساقی

کوئی پیچہ کبھی نہ رکھ اپنا　　ہاتھ میں انتظام لے ساقی

عود ڈال اُس پہ جو مرے تجھ پر　　فاتحہ میں بھی نام لے ساقی

ہو حلالہ اگر تجھے منظور　　اپنے طالب سے کام لے ساقی

[illegible]

ضیاء الحق قاسمی
(پاکستان)

ٹیلیفونیات ...

میرے تان سیٹڈی فون کا ڈیکوبل یہ آیا ہے — مجھ معصوم کے اوپر کیسی ایک قیامت لایا ہے
میں حساس طبیعت شاعر آہیں تو بھر سکتا ہوں — مجھ کو بتاؤ میرے یارو اور میں کیا کر سکتا ہوں
میرے فون کی حالت یہ ہے اس کے لبوں پہ تالا ہے — میری گواہی کیسے دے گا یہ تو فقط اک آلہ ہے
میں محتاط ہوں اتنا اس میں لوکل کال سے ڈرتا ہوں — لوکل کال بھی کرنا ہو تو اور کہیں سے کرتا ہوں
میرے ہاں سے چند ایک کالیں پورے ماہ میں بنتی ہیں — ایسا صارف فون کا مائیں مشکل ہی سے جنتی ہیں
میں تو فقط اس فون پہ یارو کال ریسیو[1] ہی کرتا ہوں — قسمت کا جو ہونا ہو پھر اس پہ بیلیو[2] بھی کرتا ہوں
ٹیلیفون ایکسچینج کا میٹر شاید مجھ سے برہم ہے — اس کو سنا کر رام کروں میں کون سا ایسا سرگم ہے

میٹر جھوٹ نہ بولے گا وہ سب کچھ سچ بتلائے گا
پھر تم دیکھنا انشاء اللہ بل بھی ٹھیک ہی آئے گا

[1]: Recieve　　[2]: Believe

-۰-　-۰-　-۰-

اعجاز وارثی　سنبھل (یو۔پی)

احساسِ کمتری

شیطان نے فساد کی نیت سے ایک دن — حضرت کے کان میں کہا "ہشیار بے خبر"
اپنا سمجھ کے تجھ سے یہی کہنے آیا ہوں — پڑنے لگی ہے شمع پہ پروانوں کی نظر
سمجھا ہے کس نے طائرِ خوش رنگ کا مزاج — اور ایک تو کہ عاجز و محروم بال و پر
شیطان تو فوراً آگ لگا کر چلا گیا — اور آپ پہنچے غصہ میں سیدھے مکان پر
احساسِ کمتری نے رقابت کو دی ہوا — خفت کی شہ پہ وہم و گمان نے اٹھایا سر
ہر کمرہ، باتھ روم، کچن دیکھنے کے بعد — تیزی سے چھت پہ چڑھ گئے، جھانکا اِدھر اُدھر
وہ نیک بخت سہمی ہوئی کانپتی رہی — عہدِ وفا کو تہمتِ بے جا کی کیا خبر
لیکن دلِ سیاہ کی تسکین نہ ہو سکی — حالانکہ پارسائی کے شاہد تھے بام و در
دیواریں اور اونچی کرا دیں مکان کی — شیشے کے ٹکڑے بچھ گئے ساری منڈیروں پر
دروازہ کی ہر ایک جھری بند ہو گئی — دستِ ستم دراز ہوا "کال بیل" پر
جاری ہے آج تک وہ حماقت کا سلسلہ — تالا لگا کے جاتے ہیں روز اپنے کام پر

-۰-　-۰-　-۰-

حلیمہ فردوس (بنگلور)

چچی جان اور پاندان

ہم چچی جان کے بغیر پاندان کا اور پاندان کے بغیر چچی جان کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ انہیں پاندان
ؤ عشق ہے اس کے چرچے سارے محلے اور سارے شہر میں ہیں۔
ڈان کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس کے متعلق جو کچھ ہماری
ماتے ہیں بس اس کا سہرا چچی جان کے سر جاتا ہے۔ چچی جان
ہ کہا کرتیں کہ آگ لگے اس تہذیب کو جس نے ہم سے ہمارے
رچھین لئے، ہماری روایتوں کا ستیاناس کر دیا۔ آج لڑکیوں
ل کڑے امتحان سے تو گذرنا نہیں پڑتا۔ بس لڑکے کا جی جس
جائے اُسے بیاہ لے آیا۔ چاہے اُس نگوڑی کو پان بنانا آئے یا
ئے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب بر دکھاوے کے موقع پر گھر کی بڑی
عیاں جاتیں تو لڑکی ہر ایک کے لئے پان پیش کرتی۔ اگر پان
نے میں ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو جاتی تو سمجھ لو کہ لڑکی کی قسمت
ٹ گئی۔" چچی کی تقریر یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ ہانپتے
ہتے بات کو آگے بڑھاتیں کہ ہائے غضب کیا زمانہ آگیا، اب تو
بل کے، پلاسٹک کے بھی پاندان بننے لگے ہیں۔ ارے تو یہ بھلی
ابھدے ڈبوں کو پاندان کون کہے گا۔ وہ بھی کیا دن تھے جب
دان کی امارت تو صرف پاندان سے ظاہر ہوتی تھی۔ چچی جان کو
ن سمجھائے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔

پاندان جاگیردارانہ خاندان کی علامت ہے۔ اب نہ کوئی امیر ہے اور نہ کوئی رئیس۔ بھلا اس جنتا دور میں پاندان کا پُرسان حال کون۔ جس کے گھر میں بھی پاندان ہوگا وہ اپنی ناقدری پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے الماری کے کسی کونے میں پڑا ہوگا۔ بادشاہوں نے جس شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی گذار دی اس کا کچھ حصہ جاگیرداروں اور امیروں کے حصے میں آیا۔ امیروں نے جو کچھ کیا آج کے فقیر (یعنی عوام) اُس سے بھی محروم رہے۔ بادشاہوں کے شبستان، نوابوں کی محفلوں کا نور اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ماحول کو رنگین بنانے کیلئے نہ وہ گلاب کا چھڑکاؤ باقی ہے نہ خس کی ٹٹیاں اور نہ موگرا، چنبیلی کے دونے، نہ وہ پان کی گلوریاں اور نہ ہی حقّے کی نئے سے نکلتا ہوا دھواں۔

اب بھی چند گھرانے ایسے موجود ہیں، جہاں پان کھانا شریفوں کا وطیرہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چھوٹوں کا بڑوں کے سامنے پان کھا کر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایسی گستاخی کسی نے کی بھی تو بس سمجھئے کہ شامت آگئی۔ مُنّے میاں کا منہ دیکھتے ہی معزز حضرات فقرہ کستے ہیں کہ "مِٹھو میاں کی چونچ آج لال ہو گئی" اور منے میاں ہیں کہ لال چونچ کے ذکر سے پیلے پیلے ہو جاتے ہیں۔ دراصل پان صرف شوقیہ کھایا نہیں جاتا۔ یہ تو مہمان

…زی کا تتمہ ہوتا ہے۔ پان پیش کرنے والا مہمانوں کو ایک عدد …ری اور ایک عدد سلام سے نوازتا ہے۔ جو اس کے مہذب، شائستہ …ر مہمان نواز ہونے کی دلیل ہے۔ یہ پان کھانے اور کھلانے …کے آداب تھے، پر دورِ حاضر میں سگریٹ پینے کے کوئی آداب …یں۔ اس میں چھوٹے، بڑے، آفیسر، چپراسی کی کوئی قید نہیں …ں جب جی چاہا، جہاں جی چاہا منہ سے لگا لیا۔ سگریٹ نوشی …بس اٹھائی گیروں کو زیب دیتی ہے۔ پان تو راہ چلتے بھی کھایا سکتا ہے کیونکہ پان بنانے میں ایک آن اور کھانے میں ایک شان ہے۔

پاندان کا خاندان بہت بڑا ہے۔ پان کے سارے لوازمات …ں میں رکھے جاتے ہیں وہ پاندان کہلاتا ہے اور پان رکھنے کے …ے جو ڈبہ ہوتا ہے اُسے ناگردان یا خاصدان کہتے ہیں۔ پاندان …ے خاندان کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں اُگالدان بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوشہ بھی ہوتا ہے، انگور …، وہ خوشہ نہیں جسے لومڑی نے کھٹا قرار دیا تھا بلکہ یہ خوشہ تو …ہ کڑوا، کچھ میٹھا ہوتا ہے۔ چاندی کے بنے خوشہ میں سلیقہ مند بیبیاں پان کی گلوریاں سجا کر طبق میں رکھتی ہیں۔ پان، بنانے …الے کی نفاست سے لے کر کھانے والے کی نزاکت سب کا پول …ول دیتا ہے۔ پاندان میں رکھی چیزوں کا استعمال برابر برابر ہونا …اہیئے ورنہ بی بی کا سگھڑاپا بھی پاندان کے آگے پانی بھرتا نظر …تا ہے۔ اگر کسی بی بی نے چونے کی مقدار زائد کردی تو بس آپ کے منہ میں چھالے پڑجاتے ہیں، کسی نے کتھہ زائد لگا دیا تو منہ …ڑوا کسیلا ہوجاتا ہے یا پھر کم کر دیا تو پان کھانے کا لطف …ی نہیں آتا۔ پان بنانا بھی ایک آرٹ اور کھانا سب سے بڑا …رٹ ہے۔ پان کھاتے وقت آپ کے ہونٹ زیادہ سرخ نہیں …ہونے چاہئیں۔ پان منہ کے قید خانے میں ایسے بند رہے کہ بات …کرتے وقت کوئی چھینٹ کسی کے منہ پر نہ پڑے۔ اس کے بعد اُگالدان میں آپ پیک اُگالتے وقت اس سلیقے سے منہ کھولیں …ہ اُگالدان کا منقش سہرا داغدار ہونے نہ پائے۔ پان کھانے کے ان سارے مراحل کو طے کرنے کے بعد آپ کو خوش سلیقگی کا صداقت نامہ مل سکتا ہے۔

پان ترقی کے منازل طے کرکے بی بی کے ہاتھوں سے پنواڑی کے ہاتھ پہنچ گیا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بیبیاں اپنے شوہر کو گھر سے نکلنے سے پہلے ایک عدد گلوری دیتیں، بھولیں اُس گلوری میں چونا، کتھا، سپاری تو کیا ان کی سلیقہ شعاری وفا شعاری سب کچھ موجود رہتی تھی۔ اللہ اللہ اب یہ بھی زمانہ ہے جبکہ بیوی شوہر کو صرف ایک عدد مسکراہٹ سے نوازتی ہے۔ جو محبت سے عاری، وفا شعاری سے مُبرا ہوتی ہے جس میں بس تصنع کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آج بھی کسی بیٹی کا جہیز پاندان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اکثر مائیں اس وقت تک منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہیں جب تک کہ ان کی قرۃ العین کے جہیز میں مترجم قرآن شریف اور پاندان نہ آجائے۔ یہ اور بات ہے کہ بیٹی صاحبہ ان میں سے کسی کا بھی صحیح مصرف نہیں جانتیں شادی کے بعد سیر سپاٹوں میں بھول ہی جاتی ہیں کہ قرآن پڑھنا ہے، پڑھ کر سمجھنا ہے اور سمجھ کر عمل کرنا بھی ہے۔ قرآن اور پاندان دونوں منقش غلافوں میں اماں بی کے خوابوں کی طرح بند رہتے ہیں۔ بڑی آرزوؤں سے گوٹے، کناری ٹکے مخملی غلاف ہر وقت دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔

ہندوستانی روایت کے مطابق بیٹیوں کے جہیز میں پاندان خالی نہیں دیا جاتا۔ سارے لوازمات بھی مائیکے سے سسرال جاتے ہیں۔ چھالیہ، الائچی، کتھہ، لونگ سبھی چیزیں ماہ و سال کی قید و بند سے آزاد اس میں پڑی رہتی ہیں۔ نادان اماں بی یہ نہیں جانتیں کہ یہ سارے دان اب بیکار ہیں۔ پاندان نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہر گلی ہر نکڑ پر پان کی دکان اپنی بہار دیتی نظر آتی ہے۔ پاندان نہ ہو تو اگالدان کا کیا سوال چلمچی میں ہاتھ دھونا تو آج کی تہذیب کے خلاف ہے۔ واش بیسن آخر کس لئے۔ عطردان بھی فضولیات کے سوا کچھ نہیں۔

کوئی اسپرے یا سینٹ دو تو کوئی بات بنے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ یہ چیزیں آؤٹ آف ڈیٹ ہوچکی ہیں لیکن کوئی ماں اسے ماننے تیار نہیں۔ ہر فیشن پرست ماں بھی بڑی مشکلوں سے ان آؤٹ آف ڈیٹ چیزوں سے اپنی بیٹی کا جہیز مکمل کرنا چاہتی ہے

یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ پاندان وراثتاً بیٹی کے جہیز میں سونپا جاتا ہے۔ بعض ایسی بھی مائیں ہیں جو بیٹی جیسی نعمت سے محروم ہوتی ہیں۔ انہیں غم یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاندان کا سلسلہ آگے نہیں بڑھے گا۔ جن کا پاندان اپنی نانی اماں سے اماں کے جہیز میں آیا تھا اور اماں سے اپنے جہیز میں۔ بیچاری وہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہ جاتی ہیں۔ اکثر گھرانوں میں یوں بھی ہوتا ہے کہ تین چار بیٹیاں ہوئیں تو صرف بڑی بیٹی ہی اماں کے پاندان کی وارث قرار دی جاتی ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک تاریخی پاندان موجود تھا۔ اگر واقعی اس کا علم نواب سالار جنگ کو ہوتا تو وہ پاندان بجائے گھر کے میوزیم کی زینت بنتا۔ ہم نے کئی بار چچی جان کو یہ مشورہ بھی دیا لیکن وہ اپنے عزیز پاندان کو اپنے سے جدا کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں تھیں۔ یہ پاندان ان کی جان تھا۔ چچی جان ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ "ایسا پاندان تو اب نایاب ہے۔ یہ تو بس مغلیہ دور کی نشانی ہے۔ اس سلطنت کے زوال سے شہزادیوں تو کیا ان کے پاندانوں پر بھی آفت آپڑی تھی۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ یہ شہزادی کلثوم زمانی کا پاندان ہے، جنھیں لٹیروں نے یوسف کنعاں کی طرح اونے پونے دام فروخت کیا تھا۔ اماں میرے جہیز میں کچھ اور نہ سہی اگر یہی پاندان دیتیں تب بھی میں بڑی خوش نصیب کہلاتی۔ ان کا خیال تھا کہ اس پاندان کی بدولت ان پر دنیا کی بیٹیاں تو کیا فرشتے بھی رشک کرتے ہوں گے۔ چچی جان کے پاندان کا شہرہ گلی، محلے اور شہروں ہوا کرتا تھا۔ جو بھی رشتہ دار ان کے محلے میں آتے وہ چچی سے ملاقات اور پاندان کی زیارت کرنے کے لیے ضرور پہنچ جاتے چچی کا پاندان آفاق گیر شہرت کا مالک تھا۔ چچی جان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس کا وارث کوئی نہیں تھا۔ چچی جان کے پاندان سے عشق کے چرچے فرش سے کیا عرش تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس لئے اللہ میاں چچی جان کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے یا پھر فرشتوں نے چچی جان کی سفارش ضرور کی ہوگی۔ پاندان سے پاندان کا مقابلہ تو اس وقت ہوا جب کہ ان کی اکلوتی بہو ان کے پاندان سے بھی خوبصورت پاندان سے بھی خوبصورت پاندان جہیز میں لائی۔ پتہ نہیں وہ کون سی شہزادی کا تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ کسی بی بی نے جب چچی جان کا پاندان اس کی شان میں قصیدے پڑھتے سنا تو ان کی ناک نیچی کرنے کے لئے اپنی بیٹی کو ایسا پاندان دیا جو پتہ نہیں نانی، پڑنانی کا تھا یا پھر کسی شہزادی کا تھا یا چچی جان کا منہ بند کرنے کے لئے سیدھے آسمان سے ہی نازل ہوا تھا۔ بھلا چچی جان کہاں مات کھانے والی تھیں اُس پاندان پر انہوں نے نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔ اُسے بجائے اپنے سرہانے رکھنے کے مودی خانے میں ڈال دیا۔ بہو بیچاری کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ چچی جان بہو اور پاندان دونوں کو منحوس تصور کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب سے بہو نے قدم رکھے ان کی صحت گرنے لگی اور جیسے ہی بہو کے پاندان کو دیکھا پان کھانے سے دل اوب گیا۔ کوئی بھی یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ واقعی یہ شگون صحیح تھا یا پھر چچی جان کی ڈھلتی ہوئی عمر کا تقاضہ آخر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون۔

چچی جان دادی ماں بن گئیں اور چاند سا پوتا پالنے میں جھولنے لگا۔ وہ اپنے پوتے کا چاند سا چہرہ دیکھ کر خوش نہ ہوئیں بلکہ بہو کو طعنہ دیا کہ "ہائے کمبخت تو نے پاندان کا وارث پیدا نہ کیا۔ وہ منحوس پاندان کیا میرے ہی گھر میں پڑا رہے گا" چچی جان نے یہ نہیں سوچا کہ ان کا اپنا پاندان بھی تو اسی گھر میں موجود ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس پاندان کی نحوست تھی جو ان کی صحت کو کھائے جا رہی تھی۔

پالنے میں جھولتے جھولتے پوتے کے قدم اتنے بڑھے

کہ چچی جان کے پاندان کی خیریت نہیں رہی۔ ننھے میاں کبھی پاندان کو در بدر بھٹکنے کے لئے پھینک آتے تو کبھی سرے سے غائب کر دیتے اور چچی جان اس کے لئے گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ بیچاری بہو بیگم ڈھونڈ ڈھانڈ کر تھک جاتیں تو مودی خانے سے اپنا پاندان اٹھا لاتیں اور ساس جی کے حوالے کرتیں۔ چچی جان بھلا جیتے جی اسے کیسے ہاتھ لگاتیں، اس پر نگاہ پڑتے ہی ان کا پارہ اور چڑھ جاتا۔ گھر میں ایک اور مہابھارت چھڑ جاتی منے میاں یہ سارا تماشہ دیکھنے کے بعد دادی ماں کا پاندان ان کے حوالے کر دیتے۔ تب چچی جان خوش ہو کر پوتے کو گلے لگاتیں اور اپنے خاندان کی شان میں قصیدے پڑھنے لگتیں۔ منے میاں کو ذہن نشین کراتیں کہ بیٹا یہ پاندان تمہاری امی کے پاندان سے بہت قیمتی، بہت خوبصورت ہے۔ کہو، دادی ماں کا پاندان زندہ باد، امی کا پاندان مردہ معصوم منّا دادی ماں کے ساتھ اس کے پاندان کی سدا جیئے کا ذکر کرتا اور چچی جان کا متعصب ذہن خوش و مطمئن ہو جاتا۔

—

-۰- -۰- -۰- -۰- -۰-

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

جُ جُ جُلوس

ڈر اور خوف انسانی فطرت کا ایک جز ہے۔ بچے کو ماں مختلف طریقوں سے ڈراتی ہے تاکہ بچہ شرارت سے باز رہے۔ ہمیں خوب یاد ہے ہماری والدہ گرامی ہمیں "لال بیگ" سے ڈرایا کرتی تھیں جس کا خوف ہمارے حواسوں پر اتنا چھا گیا ہے کہ آج بھی اندھیرے میں کبھی کبھار لال بیگ نظر آجاتا ہے۔ جوانی میں بوڑھوں کی نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے ڈر ہوتا ہے اور بوڑھاپے میں موت کا خوف خدا ترس بنا دیتا ہے لیکن جناب ہر حیدرآبادی شہری خواہ بچہ ہو کہ بڑا، جوان ہو کہ بوڑھا، عورت ہو کہ مرد، تگڑا ہو کہ مریل جلوس سے ڈرتا ہے۔ یہ ایک مشترکہ خوف ہے جو ہر عمر کے حیدرآبادی شہری پر طاری رہتا ہے۔ پچھلے چند سال میں جلوسوں نے وہ تباہی اور غارت گری مچائی ہے کہ آج جلوس کا نام لیتے ہوئے زبان لڑکھڑانے لگتی ہے لکونت زبان سے جلوس کے بجائے "جُ جُ جلوس" ادا ہوتا ہے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں۔ سینہ میں دل مرغ بسمل کی طرح پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں مضمون لکھتے ہوئے بھی ہماری حالت غیر ہونے لگی ہے ہاتھ کپکپاتا اور قلم تھرتھراتا ہے بار بار پسینہ پونچھتے اور حلق تر کرنے کے لیے دو گھونٹ پانی پیتے ہیں۔

ہمارے شہر میں کئی قسم کے جلوس نکلتے ہیں۔ مذہبی، احتجاجی، سیاسی اور سماجی پیدائش پہ جھولے کا جلوس نکالا جاتا ہے شادی کے موقع پر بارات کا جلوس اور پھر مرنے کے بعد آخری سفر کے جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیڈر کا استقبال جلوس نکال کر کیا جاتا ہے تو تہنیت بھی جلوس نکال کر پیش کی جاتی ہے آج کے دور میں ہر مسئلہ کا حل احتجاج ہے اور احتجاج جلوس کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ احتجاجی جلوس دلچسپ ہوتے ہیں کبھی کبھار طنزاً کسی گدھے کو جلوس کی قیادت دی جاتی ہے تو کسی جلوس میں جلوسی ڈھاٹے باندھ کر چلتے ہیں۔ جلوس کی وجوہات کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح لانبی ہے ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ جلوسوں کی بہتات کے لیے ہمارے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی بے کاری اور بے روزگاری ذمہ دار ہے۔ لوگوں کو اکٹھا کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کہیں دو چار آدمی جمع ہوں تو خود بخود یہ اجتماع بھیڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہمارے شہر میں مختلف قسم کے جلوسوں کا اختتام یا انجام ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہر جلوس تباہی مچاتا ہے جس کی وجہ سے شہریوں کے دل و دماغ پر جلوس کی دھاک مچی ہوئی ہے! کسی بھی وقت کہیں بھی چار اشخاص زندہ باد مردہ باد کا نعرہ لگاتے سڑک پر آجائیں تو قیامت آجاتی ہے۔ آناً فاناً دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ گھر میں گھس

اور اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ خود بخود کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔

جلوس یوں ہی نہیں نکل پڑتا۔ اس کے لیے ایک باضابطہ پروگرام بنتا ہے۔ جلوس نکالنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ جلوس نکلنے کا ایک دن مقرر ہوتا ہے پولیس باضابطہ اجازت دیتی ہے امن پسند شہریوں کی پریشانی شروع ہو جاتی ہے دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں "مولا تو اپنی رحمت سے جلوس کا دن پُرامن گزار دے"۔ راشن اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ جلوس گزرنے کے راستہ سے لوگ اپنا سامان ہٹا لیتے اور محفوظ مقام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ کمیٹی کی جانب سے جلوس کے راستے کا تعین کیا جاتا ہے۔ راستہ کے دونوں جانب جھنڈیاں لگتی ہیں برقی قمقمے لگائے جاتے ہیں (اس کے لیے اسٹریٹ لائٹ کے کھمبوں سے کنکشن لیا جاتا ہے)۔ جلوس کے خیر مقدم کے لیے کمانیں اور اسٹیج بنائے جاتے ہیں۔ نئے نعرے ایجاد کئے جاتے ہیں پلے کارڈس اور بیانرس تیار کئے جاتے ہیں۔ جلوس کے راستے میں کئی مقامات پر تازہ دم ہونے کے لیے پانی اور ناشتہ کا انتظام کیا جاتا ہے دھوپ سے بچنے کے لیے ٹوپیاں دی جاتی ہیں۔ جلوس کے لیے ان تیاریوں کو دیکھ ہمارا بلڈ پریشر بڑھنے اور اختلاج ہونے لگتا ہے۔ خدا توفیق دے تو بعض لوگ کسی پُرفضا مقام کو چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے ایک ہل اسٹیشن سے واپس آکر کہا تھا "ہر جگہ کی فضا مکدر ہو چکی ہے کہیں بھی جائے سکون نہیں ہے"۔

جلوس کے دن موت آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔ شام کے عوض زندگی کا چراغ بجھتا نظر آتا ہے۔ اثاثہ کی تباہی کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ کرفیو نافذ ہونے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ مائیں بچوں کو سینہ سے لگائے رکھتی ہیں۔ بیوی شوہر کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے گھر سے باہر نہ جانے کے لیے منت سماجت کرتی ہے۔ ہماری بیوی سال تمام حکم چلاتی ہے لیکن جلوس کے دن وہ ہماری خوشامد کرتی، دامن پھیلا کر سہاگ کی بھیک مانگتی ہے۔

مقررہ دن شہر کے مختلف گلی کوچوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس نکلتے ہیں جو ایک مرکزی جلوس میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اکثر جلوسوں کی قیادت بیانڈ پارٹیاں کرتی ہیں یہ بھی ہمارے شہر کے جلوسوں کی انفرادیت ہے۔ پلے کارڈس لئے بیانرس اٹھائے اور نعرے لگاتے جلوس رینگنے لگتا ہے۔ کبھی باجہ بجانے پر اعتراض ہوتا ہے تو کبھی کسی سمت سے پتھراؤ کی شکایت کی جاتی ہے۔ اور پھر فساد برپا ہوتا ہے، جلوسی بپھر جاتے ہیں۔ جانے کہاں سے جلوسیوں کے ہاتھ لاٹھی، پتھر، ہتھیار، پیٹرول لگ جاتا ہے۔ چاقو زنی، لوٹ مار، پتھراؤ، آتشزنی کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ حالات کو قابو میں لانے کے لیے کرفیو نافذ کر دیا جاتا ہے۔

جلوس اور جلوسیوں کے راستے میں جو بھی آتا ہے اس کی خیر نہیں رہتی۔ دکانوں کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ سواریوں کو جلایا اور لوگوں کو مارا پیٹا جاتا ہے۔ ان حادثات سے محفوظ رہنے کے لیے دکاندار اپنی دکان کو مضبوط بنا لیتے ہیں عوام جلوس کے راستے سے نہیں گزرتے حکام بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ راستے کے اطراف پولیس رہتی ہے جلوسیوں کی حرکت پر نظر رکھنے کے لیے چھتوں پر پولیس موجود رہتی ہے تو جلوس پر نظر رکھنے کے لیے فضا میں ہیلی کاپٹر چکر لگاتا رہتا ہے طبی امداد مہیا کرنے اور آگ فرو کرنے کے لیے عملہ تیار رہتا ہے جلوس سے پُرامن واپس ہونے کے لیے جلوسیوں کو سواریاں مہیا کی جاتی ہیں۔ شہر کے دوسرے مقامات پر بھی زبردست بندوبست کیا جاتا ہے۔ تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود گڑبڑ ہوتی ہے فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے امن پسند شہری جلوس پر پابندی عاید کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ جلوس نکالنے کے لیے شہر سے باہر ایک راستہ مقرر کیا جائے اس راستہ کے اطراف انسانی آبادی کو ممنوع قرار دیا جائے اس سڑک پر صرف

جلوس نکالے جائیں اور اس کا نام "جلوس روڈ" رکھا جائے جلوس روڈ کا اختتام "جلسہ میدان" پر ہو جہاں پر جلسے منعقد کئے جا سکیں۔

جلوس اور جلسے میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ دو قسم کا ہے "جلوس برائے جلسہ" پہلے جلوس نکلتا ہے پھر جلسہ منعقد کیا جاتا ہے تاکہ لوگ جلوس میں دھوم مچا کر تھک کر جلسہ میں آرام کریں۔ "جلسہ برائے جلوس" یعنی جلسہ کے بعد جلوس نکلتا ہے۔ اس جلوس میں جلوسی تازہ دم نہیں رہتے آدھے سے زائد لوگ جلسہ کے بعد گھر چلے جاتے ہیں۔ اور آدھے لوگ تھکے ماندے بوجھل قدموں سے جلوس نکالتے ہیں۔ اسی لیے "جلوس برائے جلسہ" کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ہمارے شہر میں جلوس اور جلسے جشن کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ کئی دن ایک مقام پر کیمپ لگا دیا جاتا ہے۔ جہاں مختلف مقامات سے جلوس پہنچتے اور مختلف اوقات میں جلسے منعقد ہوتے ہیں گھنٹوں کے حساب سے لوگ بھوکے بھی رہتے ہیں۔ اس طرح کے کیمپ ہمارے شہر میں ہر موسم میں اور ہر وقت نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں شیر کو پکڑنا آسان ہے لیکن اُسے پالنا بہت مشکل امر ہے۔ یہی کہاوت جلوس پر بھی صادق آتی ہے۔ لوگوں کو جمع کرنا اور جلوس نکالنا سہل ہے لیکن اس پر کنٹرول رکھنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ جب یہی بات ہم نے اپنے ایک دوست سے کہی تو انھوں نے ناگواری سے کہا کون کم بخت جلوس پر کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ جلوس نکالا اسی لیے جاتا ہے کہ شیر نہیں اور ہمیں چیر پھاڑ کر کھا جائے اور چو طرف تباہی مچائے اور تو اور ہمارے شہر میں آج کل لیڈر اپنی طاقت کا مظاہرہ جلوس نکال کر تے ہیں۔ مقابلہ کے لیے نت نئے جلوس نکالتے ہیں۔ اب آپ سے کیا بتلائیں ہمارے شہر میں بعض ایسے لیڈر ہیں جو صرف جلوس نکالنے کے اکسپرٹ ہیں"۔

پہلے جب جلوس نکلتا تھا لوگ جوق در جوق سڑک کے کنارے جمع ہو کر نظارہ کرتے تھے۔ جلوس کے ساتھ چلتی پھرتی دکانیں ہوتی تھیں۔ تماشائی جلوس سے محظوظ ہوتے ہوئے خرید و فروخت کرتے تھے لیکن آج جلوسوں کا تماشہ صرف پولیس دیکھتی ہے۔ عوام جلوس کے دن گھر سے باہر آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ پولیس کے لوگ بہتر تماشائی ثابت ہوئے ہیں ان کے سامنے جلوسی توڑ پھوڑ مچاتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں ع

شب و روز ہوتا ہے تماشہ میرے آگے

بعض وقت تماشہ سے بے زار ہو کر پولیس موقع سے غائب بھی ہو جاتی ہے پتہ نہیں اس طرح جلوسوں سے اتفاق کا مظاہرہ کیا جاتا ہے یا پھر اپنی بے بسی کا یہ بانگ دہل اعتراف!؟

منصور عمر - دربھنگا

سیاسی نسخہ

اثاثہ جو گھر کا ہو نیلام کر
کہیں صبح کر اور کہیں شام کر

منسٹر کے بیٹے کو پیرِ نام کر
جو بیوی کہے اُن کی وہ کام کر

لگا رہ تو دن رات اس تاک میں
منسٹر سے پہلے انھیں رام کر

اگر ہو سکے گھر کا دربان بن
ذرا بے چمچہ گیری میں بھی نام کر

جہالت کا ان کی نہ کر ذکر تو
سخاوت کو ان کی سدا عام کر

پڑھائی لکھائی کی حاجت نہیں
مگر غنڈہ گردی میں کچھ نام کر

فریب و دغا کا سبق یاد رکھ
ہر ایک قیمتی شئے کو بے دام کر

تو بھائیوں کو ملا خاک میں
دبا کے بغل میں چُھری رام کر

شریفوں کے منھ پر تو کالک لگا
شرافت کو ان کی یوں بد نام کر

غریبوں کا نعرہ لگا رات دن
مگر دور سے ان کو پرنام کر

تو پبلک کو وعدے کی وادی میں رکھ
خبردار! اس کا نہ اک کام کر

کہاں کی شرافت کہاں کا اصول
ہو جس میں بھلا اپنا وہ کام کر

کسی کو لڑا اور کسی کو ملا
اسی طرح سے خود کو گلفام کر

منسٹر تو ہو جائے گا ایک دن
سیاسی محل میں پھر آرام کر

ظفر چکدینوی

غزل

کرنے کو نئی شادی بڈھا جو چلا ہوگا
کٹوا کے وہ سینگوں کو بچھڑا بھی بنا ہوگا

مسجد کی طرف زاہد ظاہر ہے گیا ہوگا
رستے میں ہے میخانہ کچھ دیر رکا ہوگا

ناکامی سے رسوائی ہاتھ آتی تو ہے لیکن
میدان سے ہٹ جانا تو اور بُرا ہوگا

تم حسنِ مجسّم ہو، پیکر ہو جوانی کے
مالک نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہوگا

رومان لڑانا بھی اچھا تو نہیں لیکن
کر لوگے اگر شادی اس سے بھی برا ہوگا

دلہن دمِ رخصت یوں روئی تو بہت ہوگی
اک آنسو بھی پلکوں سے لیکن نہ گرا ہوگا

لڑکے کی رضا تنہا لازم نہیں شادی میں
ٹھکراتی ہے لڑکی بھی لڑکے کو، سنا ہوگا

وہ بیٹی کے جل مرنے کا رسک ہی کیوں لیتا
دینے کو جہیز اس نے گھر بیچ دیا ہوگا

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

(قسط — ۷)

ایک سفر ہیومرولمپکس کے لیے

میں ریستوران سے نکل کر واپس اپنے کمرے میں جانے ہی کو تھا کہ سید ضمیر جعفری راستے ہی میں مل گئے میں سمجھا تھا کہ وہ رات کو دیر سے مشاعرے سے لوٹے ہیں تو صبح اٹھنے بھی دیر سے ہوں گے ایک سردار جی سے اس کے باس نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم روزانہ لیٹ دفتر آتے ہو؟" سردار جی نے جواب میں کہا "سر آپ کو صحیح اطلاع ملی ہے کہ میں دفتر لیٹ آتا ہوں مگر جناب میں جاتا بھی تو سب سے پہلے ہوں" ضمیر صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ اگرچہ رات کو دیر سے آئے تھے مگر صبح وہ مجھ سے بھی پہلے بیدار ہو گئے تھے چنانچہ نماز پڑھ کر اور ڈائری لکھ کر اب میری تلاش میں نکلے تھے تاکہ اکٹھے ناشتہ کر سکیں!

"تم نے ناشتہ کر لیا ہے؟" ضمیر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے کر لیا ہے؟"

"نہیں!"

"تو بس پھر یہی سمجھیں کہ میں نے بھی نہیں کیا" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"تو چلو پھر پہلے ناشتہ کرتے ہیں" یہ کہ کر ضمیر صاحب نے اس ریستوران کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جہاں عزیزہ گیلینا اور بزرگوار اسٹیفن خلق خدا کا کلیجہ "ساڑنے" کے لیے بیٹھے ہوئے تھے!

میں نے ضمیر صاحب کو روک لیا "اس ریستوران میں ناشتہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میں ادھر ہی سے آرہا ہوں دیسی ناشتے والے ریستوران میں چلتے ہیں!"

دیسی ناشتے والے ریستوران میں مسز پردھان ماتھے پر بندیا لگائے ساڑھی میں ملبوس اپنی سدا بہار مسکراہٹ کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں انہوں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا اس دفعہ میں نے بھی انہیں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا ہاتھ جوڑنے کا ایک مطلب سلام کرنا اور ہاتھ جوڑنے کا دوسرا مطلب سلامی دینا بھی تو ہو سکتا ہے۔

ناشتے سے فراغت کے بعد اب ہمارا پروگرام تاریخی مقامات کی سیاحت کا تھا چنانچہ غیاث متین، قدیر زماں اور علی الدین نوید بھی گھمانے پھرانے کے لیے گاڑی لے کر پہنچ چکے تھے!

اور یہ گولکنڈے کا قلعہ ہے کار ایک مین گیٹ سے داخل ہوتی ہے اور ایک لمبی مسافت طے کرکے کہیں بہت آگے جا کر قلعہ آتا ہے اس درمیانی راستے میں دونوں طرف قطب شاہی بادشاہوں نے اصطبل بنائے ہوئے ہیں شہنشاہیت کے دور میں یہاں گھوڑے بندھے ہوتے تھے جمہوریت کے دور میں یہاں انسان رہتے ہیں قلعے کے دروازے میں داخل ہوکر اگر اس کے گنبد کے عین نیچے کھڑے ہوکر تالی بجائیں تو اس کی آواز آٹھ سو فٹ بلندی پر واقع بالا حصار میں جاتی ہے وطن سے آئے ہوئے کئی روزگزر چکے تھے چنانچہ میں گنبد کے نیچے کھڑے ہوکر کافی دیر تک تالیاں بجاتا رہا کیوں کہ آوٹ آف پریکٹس ہوجانے سے انسان بہت پیچھے رہ جاتا ہے! یہ قلعہ اپنی ساخت میں ملتان کے قلعے سے شباہت رکھتا ہے بلکہ ملتان کے قلعے کو بھی غالباً بالا حصار ہی کہتے ہیں! قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے اور کھنڈرات بھی دیکھے قلی قطب شاہ تو ہمارا اپنا آدمی ہے سو اس کا مقبرہ زیادہ محبت سے دیکھا۔

اور اب ہم سالار جنگ میوزیم میں ہیں یہ میوزیم دیکھ کر زبان سے بے ساختہ "اللہ اکبر" نکل جاتا ہے نہایت قیمتی ہزاروں نوادرات پر مشتمل یہ میوزیم صرف ایک شخص یعنی نواب سالار جنگ کے ذاتی ذوق کا مرہون منت ہے میوزیم کا تقریباً چوتھائی حصہ ایسا ہے جو نواب صاحب کو خاندانی میراث کے طور پر ترکہ میں ملا ہے اس کے قطع نظر باقی سب سامان نواب صاحب کی ذاتی خرید ہے نواب صاحب نے کروڑوں روپے ان نوادرات پر خرچ کیے تاہم یہ میوزیم نری دولت کا کھیل نہیں نواب سالار جنگ کی خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے

مکہ مسجد کئی لحاظ سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے ماضی قریب یعنی تقریباً نوے برس قبل یہاں ایک معرکہ بھی ہو چکا ہے جب سلطان نواز جنگ کی سرکوبی کے لیے مسجد کی چھت پر توپ نصب کی گئی جہاں سے سلطان نواز جنگ کا پورا گھرانہ تباہ کیا جاسکتا تھا وہ تو خیر ہوئی کہ سلطان نواز جنگ صاحب جنگ سے باز رہے ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے مکہ مسجد میں ایک پتھر ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ اس پر بیٹھنے والا شخص دوسری بار حیدرآباد ضرور آتا ہے میرا ارادہ اس پتھر پر بیٹھنے کا تھا مگر پھر سوچا کہ کہیں محض میری وجہ سے یہ روایت مشکوک نہ ہو جائے کیوں کہ قسمت کا بہت "دھنی" ہوں!

مکہ مسجد کے گردو نواح میں واقع "چارمینار" بالکل لاہور کی چوبرجی جیسا ہے صدیوں پرانے اس "چارمینار" کے قرب وجوار میں طوائفیں بھی آباد رہی ہیں ان میں سے ایک ماہ لقابائی چندا بھی تھی جو حیدرآباد کی ایک ممتاز مغنیہ ہی نہیں عمدہ شاعرہ حاضر جواب اور بہت بذلہ سنج بھی تھی اس کا ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس کی نگرانی کیلئے ایک بزرگ ملازم تھے جنھوں نے اسی کتب خانے سے استفادہ کرکے ایک تاریخ "ماہ نامہ" لکھی جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

اس اثناء میں بھوک چمک اٹھی چنانچہ غیاث متین کی "قیادت" میں ضمیر صاحب میں اور علی الدین نوید ان تمام مقامات کی قید سے آزاد ہوکر "نیاگرا ہوٹل" میں کھانا کھانے داخل ہوگئے قدیر زماں اجازت لیکر پہلے سے رخصت ہو چکے تھے سامنے والی میز پر بیٹھی تین بیبیاں بہت خواہشمند تھیں کہ ہم ان کی میز پر کھانا کھائیں یا انہیں اپنی میز پر بلالیں اور اس کا اظہار انہوں نے پہلے آنکھوں کے جلی اشاروں اور اس کے بعد ہاتھوں کے خفی اشاروں سے بھی کیا مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان مہربان "مہمانوں" کی "میزبانی" قبول نہ کرسکے چنانچہ بار مجبوری انہوں نے ریستوران میں موجود کچھ دوسرے شرفاء کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہم نے تو حاتم طائی کے بارے میں سنا تھا کہ اس کے دسترخوان پر جب تک تین چار مہمان جمع نہیں ہوتے تھے وہ کھانا نہیں کھاتا تھا مگر یہ خوش خلق بیبیاں تو مہمانوں کا انتظار کیے بغیر مسلسل کھانے ہی میں مشغول تھیں تاآنکہ کوئی بل ادا کرنے والا مہمان انہیں میسر نہیں آگیا!

"اب کیا کیا جائے؟" ضمیر صاحب نے کھانے سے فراغت کے بعد سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیٹھا کھایا جائے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تے فیر کھواؤ نا!" (تو پھر کھلائیں نا!) ضمیر صاحب نے ایسے مواقع کے لیے مخصوص باریک سی آواز نکالتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں کہا بالکل اسی طرح جیسے کوئی معصوم سا بچہ کھلونا ملنے کے وعدے پر مچل جائے اور لاڈ کے انداز میں کہے "پھر لے کر دیں نا!"

"پیٹھا کھا کر ہم نے تھوڑی سی شاپنگ کی اس دوران ضمیر صاحب کی آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی میں نے کہا "ضمیر صاحب! لگتا ہے آپ کو نیند آرہی ہے"۔

کہنے لگے "ہاں آتو رہی ہے"

میں نے کہا "آپ نے سونا ہے یا تھانے جانا ہے؟"

"کیا مطلب؟" ضمیر صاحب نے لوکھلا کر کہا "یعنی تم کہنا کیا چاہتے ہو" ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی اور اب وہ میری طرف سوالیہ لفظوں سے دیکھ رہے تھے۔

"صبح ہم نے دہلی جانا ہے قواعد وضوابط کے مطابق ہمیں چوبیس گھنٹے پہلے تھانے جا کر اپنا ڈیپارچر لکھوانا چاہیئے بصورت دیگر پانچ سال قید ہوسکتی ہے نیز یہ کہ۔۔۔۔"

اور اب ہم معزز مہمان اپنے میزبانوں کے ساتھ تھانے میں حاضر تھے مگر اس دفعہ جلدی جاں بخشی ہوگئی اب شام کے چھ بجنے کو تھے یہاں سے ہم نے سیدھا "حلف" (حیدرآباد لٹریری فورم) کی تقریب میں شرکت کے لیے جانا تھا مگر سوچا ہوٹل سے ہوتے جائیں تاکہ سند رہے کہ یہ سند بوقت ضرورت بھی کام آنے والی نہیں تھی!

"حلف" (حیدرآباد لٹریری فورم) غالباً حیدرآباد کی سب سے موثر ادبی تنظیم ہے جو پروفیسر مغنی تبسم کی سرکردگی میں جدیدیت (ماڈرن سینسبلٹی) کے حامل لکھنے والوں کے گروہ پر مشتمل ہے اس کے سرکردہ ارکان اور عہدیداروں میں غیاث متین، یوسف اعظمی، قدیر زمان اور دوسرے دوست شامل ہیں، سو اس وقت ہم "حلف" کی طرف سے دیئے گئے استقبالیے میں شریک ہیں۔ تقریب ایک کالج کی عمارت میں منعقد ہورہی ہے، ادب سے لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ کرسیاں تو بھری ہوئی ہیں ہی، بہت سے لوگ دیواروں کے ساتھ بھی لگے کھڑے ہیں، صدارت مجتبیٰ حسین کر رہے ہیں، غیاث متین مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں، ضمیر جعفری کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا کم کہا کہ وہ تو ہمارے مزاحیہ ادب کے ستونوں میں سے ہیں مگر اپنے بارے میں غیاث متین کی زبان سے جو سُنا، اس سے ایک بار پھر حیدرآباد والوں کی مہمان نوازی کا قائل ہونا پڑا۔ میں نے یہاں نثر کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جب کہ ضمیر صاحب نے "مالا شعر من بشنو" کہا اور لوگوں کی فرمائش پر پے در پے کئی نظمیں سنائیں بلکہ وہ اسی چکر میں اپنی ایک دو سنجیدہ غزلیں بھی سنا گئے اور ان کی یہ سنجیدہ غزلیں بھی۔۔۔۔ یہاں چل گئیں۔ ادب کے عام قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ضمیر صاحب غزل کے انتہائی خوبصورت شاعر ہیں۔ مگر ان کی مزاحیہ شاعری نے ان کے فن کا یہ پہلو دبا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ضمیر صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ان کی سنجیدہ چیزیں بھی سنیں مگر یار لوگ ادھر آتے ہی نہیں۔ حیدرآباد میں ضمیر صاحب نے موقع غنیمت جانا اور جب تک سامعین سنبھلتے، ضمیر صاحب اپنا کام دکھا چکے تھے، آخر میں مجتبیٰ حسین نے اپنی صدارتی تقریر کی۔ موصوف کیا لیکا سامنہ بنا کر سنجیدہ سنجیدہ سی باتیں کرتے رہے۔ میں جب کسی مزاح نگار کو اس سچویشن میں پھنسا دیکھتا ہوں، تو اس پر اس کی تحریروں سے زیادہ ہنسی آتی ہے۔ اس وقت میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا

استقبالیے کے بعد نریندر لوتھر کی طرف سے دیئے گئے عشائیے میں شریک ہونا تھا، مگر میری طبیعت شام ہی سے

کچھ بوجھل سی تھی اور اب رفتہ رفتہ گرانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اتنی محبت سے ترتیب دی گئی محفل میں شرکت سے محروم رہوں" مگر میں نے محسوس کیا کہ میری ملالت اس محفل کو بدمزہ کر دے گی، چنانچہ میں نے ضمیر صاحب سے کہا کہ وہ نریندر لوتھر تک میری دلی معذرت پہنچا دیں اور پھر حمایت اللہ، مصطفیٰ کمال اور طالب خوندمیری ہوٹل تک چھوڑنے کیلئے میرے ساتھ چلے آئے۔ یہ دوست کچھ دیر کمرے میں رہے اور پھر دعوت میں شریک ہونے کے لیے نریندر لوتھر کی طرف چلے گئے۔

یہ حیدرآباد میں میری آخری رات تھی۔ میں ایک گہری اداسی کی زد میں آگیا، کیسے کیسے خوب صورت شہروں سے جدا ہوا ہوں، واشنگٹن، شکاگو، دہلی، ایمسٹرڈیم، تہران، لکھنؤ، میونخ، نیویارک، شارجہ، پیرس، کابل لیکن جدائی کی کیفیت" صرف تین شہروں سے وداع ہوتے ہوئے محسوس کی، امرتسر جو میرا جنم بھومی ہے اور جب میں چار سال کا تھا، تو اس شہر سے جدا ہوا تھا مگر یہ شہر اب بھی میرے اندر زندہ ہے، استنبول جس کے ظاہری حسن سے زیادہ باطنی حسن کے سحر سے میں اب تک نہیں نکل سکا اور اب میں پھر نصیب حیدرآباد سے وداع ہو رہا تھا، ایک بار پھر وداع ہو رہا تھا . . . .

میری طبیعت خاصی مضمحل تھی، مگر میں اپنے بستر سے اٹھا اور رخت سفر باندھنا شروع کر دیا کہ علی الصبح اٹھ کر بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اچانک میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے ضمیر صاحب کا پتہ کرنے کے لیے ان کے کمرے میں فون کیا، مگر کسی نے فون نہ اٹھایا گویا وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نے استقبالیے پر فون کیا، تو مزید تصدیق ہوئی، خدا جانے مجھے ان لمحوں میں ضمیر صاحب کے بارے میں اتنی تشویش کیوں محسوس ہوئی کہ میں نے روزنامہ "سیاست" فون کر کے نریندر لوتھر کے گھر کا فون نمبر لیا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی بجتی رہی، حتیٰ کہ ایک بوڑھی عورت نے فون اٹھایا اور آگے سے کہا تو یہ کہا کہ یہاں کوئی ضمیر صاحب نہیں ہیں اور نہ یہاں کوئی دعوت ہے۔ اب میری پریشانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، ان لمحوں میں مجھے یوں لگا، جیسے مجھ میں میرے اباجی کی روح حلول کر گئی ہے۔ جو میرے ذرا سے لیٹ گھر پہنچنے پر شدید مضطرب ہو جاتے ہیں، چنانچہ میں اس وقت ضمیر صاحب کی طرف سے اس طرح پریشان تھا جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر "سیاست" کو فون کیا اور ڈیوٹی پر موجود سب ایڈیٹر کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بس آتے ہی ہوں گے، مگر ایسے مواقع پر بھلا طفل تسلیوں سے بھی کچھ ہوتا ہے، چنانچہ میں نے پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ اب مجھ میں انتظار کی مزید تاب نہیں تھی۔ میں نے لباس تبدیل کیا، بوٹ پہنے اور اتنے بڑے شہر میں آدھی رات کو ضمیر صاحب کو تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا، ابھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا، کہ ضمیر صاحب مسکراتے ہوئے سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میرے اندر کا جاگا ہوا "والد صاحب" اس وقت سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ان صاحب زادے کی سرزنش کو چاہ رہا تھا، مگر انہیں سامنے پاکر تھوڑی ہی دیر میں غصہ فرو ہو گیا، معلوم ہوا کہ دعوت نریندر لوتھر کے گھر پر نہیں تھی، ایک ہوٹل میں تھی، جہاں بیسیوں معززین شہر مدعو تھے، سو ان سے رخصت ہوتے ہوتے دیر ہو گئی۔ بعد میں ضمیر صاحب میری اس پریشانی پر بہت ہنسے، خود میں بھی ان کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا۔ زندگی میں بہت ساری پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں، جن پر بعد میں اسی طرح ہنسی آتی ہے اور اسی طرح زندگی میں بہت ساری خوشیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جن پہ باقی ساری عمر نوحہ کرتے گزر جاتی ہے . . . .

صبح چھ بجے بیدار ہو کر ناشتہ کیا، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ہمیں ائرپورٹ تک لے جانے کے لیے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ ساڑھے سات بجے ہم ائرپورٹ پہنچے، وہاں نریندر لوتھر، غیاث متین، یوسف اعظمی اور علی الدین نوید پہلے سے موجود تھے۔ آٹھ آٹھ پچاس پر جہاز

نے بمبئی کے لیے ٹیک آف کیا۔ میں کھڑکی میں سے اس شہر کو اور اس شہر میں آباد خوب صورت دوستوں کو رخصت ہوتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سید ضمیر جعفری نے میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھی تو بولے "یار تم اداس بھی ہوتے ہو؟" میں نے ضمیر صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ تو خود مجھ سے زیادہ اداس تھے۔ یہ اداسی اس شہر سے رخصت ہونے کی تھی، جو ابھی تک اپنی تہذیب کے پورے رچاؤ میں زندہ رہنے کی کوشش میں ہے، جب کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے شہروں کی تہذیبی نبضیں ڈوب چکی ہیں۔ ۔ ۔ !!

جناب طالب خوندمیری معتمد عمومی زندہ دلانِ حیدرآباد نے طنز و مزاح کے ممتاز شاعر ناظم انصاری صاحب کی اچانک رحلت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ ناظم انصاری صاحب کے ساتھ متعدد کل ہند مشاعروں میں شرکت کا انھیں موقع مل چکا ہے۔ وہ خلوص کا پیکر تھے۔ مزاحیہ شاعری کو ان کے انتقال سے سخت نقصان پہنچا۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے!!

وسف یکتا

کنجم انڈو

(تلگو واسیوں کی نذر)

اَیا کھانا بنا ریں کنیم انڈو
اماں گانا گا ریں کنیم انڈو
اَنا بڑے وزیر بنے جب سے
چھوٹے ناچ ریں گا ریں کنجم انڈو
اُنوں نکو بولے بھی لوگاں
پھولاں دیتے جا ریں کنجم انڈو
نکلے جب سے شراب خانے سے
ماموں کلٹیاں کھا ریں کنجم انڈو
بڑے لوگاں بھی اب وٹامن آر (R)
ڈرتے ڈرتے کھا ریں کنجم انڈو
غزلاں سننے تیری یکتا گارو
لوگاں آتے جا ریں کنجم انڈو

لاغر نرملی

غزل

ڈوب کیوں مرتے نہیں تالاب میں
ہیں جو بیوی کی بدولت جاب میں
قرض لے کر جو پلاتا ہے یہاں
ہے پسندیدہ وہی احباب میں
انڈین ہم، والُف ہے انگلینڈ کی
ٹاٹ کا پیوند ہے کمخواب میں
قاضی کے گھر یوں ہی میں سویا نہیں
جانتا تھا آؤ گے تم خواب میں
کر رہی ہے آج میری ماں کا رول
تھی جو ہیروئن مری تبیتاب میں
تھیلا بھر غزلیں ہماری بہہ گئیں
لُٹ گئے ہم حالیہ سیلاب میں
ڈسکو حلوہ کھائیے لاغر میاں
پھر سے قوت آئے گی اعصاب میں

محمد حفیظ الدین فردوس
کورٹلہ کریمنگر

غزل

باوا تو ہے کلکٹر کس بات کی کمی ہے
کھاؤں گا خوب ڈٹ کر کس بات کی کمی ہے
گر جیل بھی گیا تو ہو جاؤں گا رہا میں
سسرا ہے میرا لیڈر کس بات کی کمی ہے
نمبر ہو تین تیرہ یا ہو کہ نو اٹھارہ
بکتے ہیں سارے نمبر کس بات کی کمی ہے
کھانے کو مرغیاں ہیں پینے کو ہے برانڈی
ہوں دیش کا منسٹر کس بات کی کمی ہے
ریفریجیریٹر، ٹی وی، موٹر و ٹیپ ریکارڈر
بیٹا ہے اُن کا باہر کس بات کی کمی ہے
گھی، دودھ اور دہی سے دھوتے ہیں ہاتھ ہر دم
چکنا ہے اُن کا فادر کس بات کی کمی ہے
چمچوں کا ہے زمانہ چمچوں کی ہے یہ دنیا
اندر ہو یا ہو باہر کس بات کی کمی ہے
فردوس کی غزل کا ہر شعر ہے زبردست
ہے ٹاپ کا یہ شاعر کس بات کی کمی ہے

بابو۔ آر۔ کے
اچل پور (مہاراشٹر)

تالی سے ابنِ آدم کا رشتہ کتنا قدیم ہے، اس کی نہ تو کوئی تاریخ ہے اور نہ ہی اس پر کوئی تحقیق کی گئی لیکن یہ گمان قریب از ممکنات میں سے ہے کہ جب عرشِ بریں پر حضرت آدم، طاغوتی سازشوں میں پھنس کر شجرِ ممنوعہ کے قریب ہوئے ہوں گے اور احکاماتِ خداوندی کو یکسر فراموش کر دیا ہوگا تب اپنی بے پناہ کامیابی کے اظہار میں ابلیس ملعون نے اسوقت مارے خوشی کے پہلی تالی بجائی ہوگی یا پھر جب اللہ رب العزت نے عالمِ غیض و غضب میں حضرتِ آدمؑ اور بی بی حواؑ کو عتابِ الٰہی کا طوق پہنا کر، روئے زمین کی بے کراں وسعتوں میں جدا کر کے پھینک دیا ہوگا اور پھر . . . . . یہ دونوں زمین کے چٹیل میدانوں، پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندروں کی گہرائیوں کو ایک دوسرے کی قربت کیلئے قدم قدم پہ جھیل گئے ہوں گے اور ایک طویل عرصے بعد جب قادرِ مطلق نے انہیں پھر یکجا کیا ہوگا، تب شاید انتہائے مسرت کے باعث کائنات کی پہلی تالی کی گونج حضرت آدمؑ کے ہاتھوں سے پھوٹ کر فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر گئی ہوگی۔ ویسے یہ گمان سرے سے غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بہرکیف اس حقیقت سے انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ تالی روئے زمین پر عموماً اور ہندوستانی سماج پر خصوصاً اپنی گہری چھاپ رکھتی ہے یا دوسرے الفاظ میں تالی ہندوستانی سماج کا اٹوٹ انگ ہے۔ یوں تو اٹوٹ کا استعمال سوائے کشمیر کے کسی دوسرے معاملے سے میل نہیں کھاتا۔ کیونکہ اٹوٹ کی انگشتا کو مسئلہ کشمیر نے ویسی ہی جلا بخشی ہے جیسی کہ مرحومہ اندرا گاندھی نے کانگریس آئی کو چاندنی رات نے تاج محل کو یا تاج محل نے دلوں کو۔

الغرض تالی اور ہندوستانی سماج عرصۂ دراز سے لازم و ملزوم رہے ہیں۔ ہم بھارتیوں کے شعبۂ حیات کے ہر گوشے میں یہ نمایاں اور آشکارا ہے۔ ماں کی گود میں روتے بلکتے بچے کو بہلانے کیلئے تالی۔ نیتاؤں کے بھاشنوں میں تالی — سیاسی ایوانوں میں تالی۔ قوالی، مجروں میں تالی۔ مداری کے تماشوں میں تالی۔ نامردی کے مظاہروں میں تالی، حتیٰ کہ بھگوان کی آرتی میں تالی۔ تالی، تالی گویا آج سماج میں تالی کی حیثیت مسلم اور ناقابلِ رد ٹھہری

لی چونکہ تال سے بنی ہے اور تال سے سنگیت کا واسطہ ازلی و ابدی
ہے اور ساتھ ہی سنگیت کی لے تال میں مسحور ہو جاتا یا تالی کے سحر
میں کھو جانا حضرتِ انسان کا وصفِ خاص رہا ہے اور انسانی فطرت کا
حصہ بھی۔

بچہ لڑکپن میں ریں ریں کسی شئے کے لئے کرکے اپنا جی ہلکان
کرنے لگے تو ماں بچے کا مطلوبہ شئے سے دھیان ہٹانے کے لئے
ایک خاص لے کے ساتھ تالیاں بجاتی ہے اور اُسے بے وقوف بنائے
رکھتی ہے اور پھر یہ پوزیشن آتی ہے کہ بچہ خوش ہو کر نہ صرف یہ کہ خود
بھی تالیاں بجاتا ہے بلکہ ساتھ ہی کہتا بھی جاتا ہے۔ "تاتا تھیئی
ماموں کی بکری، دودھ دوہنے بکری" اب بچے کے والدین خوش و
خرم۔ ویسے خوشی کی قدریں اور جواز دونوں کے مختلف ہوتے ہیں۔ ماموں
کی بکری والے فقرے پہ ماں اس لئے خوش کہ جو بھی ہو میرے لعل نے
اپنے دودھیا منہ سے چچا، تایا نہ کہہ کر ماموں کی مالا جاپی، گویا ددھیال
کو یاد نہ کرکے ننھیال کو نہال کردیا اور اسی فقرے پہ باپ کے دل
میں لڈو یوں پھوٹ رہے ہیں کہ ہونہار پوت نے واقعی کمال کر دکھایا
اہلِ سسرال کی طنابیں دھنگر برادری میں تنوادیں یعنی دھنگر برادری
کو رسوا کرکے رکھ دیا اور حقِ پسری ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا
نہ رکھی۔

ہمارے ملک میں تالی کی سیاسی حیثیت ایک الگ ہی
انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ کتنے ہی جلسوں میں معصوم عوام نیتاؤں
کی لچھے دار باتوں اور جھوٹے وعدوں پہ اپنی تالیوں کی مہر ثبت کر
انہیں کامیابی سے ہمکنار کردیتے ہیں اور یہ تالیاں ہر ایرے غیرے
پُرجوش مقرر یا قابل نیتا کا جھوٹا تصور خواہ مخواہ دے ڈالتی
ہیں۔ تقریر اچھی ہو یا بری یا سرے سے یہ تقریر کی تعریف سے
بہتر ہی کیوں نہ کرے لیکن تالیوں کی گونج جلسے میں گونجے گی ضرور
ہے یہ تالیاں فطری نوعیت کی ہوں یا پیسوں کے برتے پہ بجوائی
گئی ہوں۔ آج کتنے ہی نیتاؤں اور منتریوں کا راج سنگھاسن تالیوں
کی تڑ تڑ پہ قائم ہے۔ آج سیاست کے بازار میں کتنے ہی کھوٹے
سکے ان ہی تالیوں کے بل پر سونے کے مول تل رہے ہیں۔

تالی بجتی ہے اور بجوائی بھی جاتی ہے اور محاوروں میں
اس کا استعمال گاہے بہ گاہے ہوتا آیا ہے۔ جیسے ہیجڑوں کی طرح
تالیاں بجانا۔ یا ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی وغیرہ وغیرہ اس
ضمن میں تالی کے محتاج و مشکور، مداری، نیتا اور قوال، طوائف
یا بھگوان کے بھگت ہی نہیں رہے ہیں بلکہ خواجہ سراؤں کے لئے تو
یہ عرصہ سے ایک ہمہ گیر وسیلہ رہی ہے۔ یہ ان کی معاون بھی ہے
ان کا آرگن بھی اور کشکول بھی۔ تالی کو ایک خاص ادائے دلبری
کے ساتھ سر کو ہولے سے خفیف سی جنبش دے کر اٹھلاتے ہوئے
اگر بجایا جائے تو پلک جھپکتے میں دو صنفوں کے بین بین والی
تیسری صنف کا پرچم ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ یعنی دنیا کی کسی بھی
مہذب یا غیر مہذب زبان میں اتنی وسعت ہے ہی نہیں جو نامردی
کا موثر اظہار اتنے اچھے پیرائے میں کسی لفظ کے ذریعے کروا دے۔
نامردی کا واضح اور بھرپور اظہار و اعلان سوائے تالی کے قطعی ممکن
اور ممکن نہیں۔ نیز تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس محاورہ کا بھی
ایک الگ ہی لطف ہے۔ دو قوموں یا ملکوں کے نبرد آزما ہونے
کے ساتھ ہی حکمراں جماعت اور حزبِ مخالف کی سیاسی جھڑپوں
تک حتیٰ کہ ساس بہو کی گھریلو چپقلش تک اس محاورہ کا استعمال
ایک عام بات رہی ہے۔ ویسے ساس بہو کا جھگڑا ان دنوں جیسے
قومیایا ہوا ہے اور ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سنجے گاندھی
کی ناگہانی موت نے جہاں ملک کے روشن مستقبل کو تاریک کیا
وہیں ساس بہو کے قدیم جھگڑا لو رشتے کو خوب تقویت پہنچائی
اس سے ہوا یہ کہ اس روایتی رشتے کے تخریبی پہلوؤں کی نمائش
گھر کے ساتھ ساتھ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ایوانوں میں دیکھی
سنی اور "بجتی" گئی نیز اس سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ
اسی کروڑ کے وسیع ملک کو بہ آسانی من چاہے طریقے سے نندوایا
جاسکتا ہے لیکن ایک بہو کو گھر کی چار دیواری میں نندوانا ایک
ساس کی دسترس میں بالکل نہیں، خواہ ساس وزیرِ اعظم ہی
کیوں نہ ہو۔

تو صاحب واضح یہ ہوا کہ تالی صرف ہاتھوں سے یا

سوں سے ہی نہیں بجتی اور بجوائی جاتی بلکہ یہ دو ملکوں یا
بوں کے باہم ٹکراؤ سے بجتی ہے۔ نظریات کے ٹکراؤ اور
سولوں کے اختلافات سے بجتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج
یوس و امریکہ دو مختلف محاذوں پر تباہ کاریاں نہ ڈھا رہے
دتے۔ اپوزیشن و حکمراں جماعتیں سیاسی نشستوں کے لئے
تے بلی کی طرح ایک دوسرے کو کاٹ بھونک رہے نہ ہوتے۔

خیر جس طرح تالی کا ماخذ تال ہے اسی طرح تالی کی ارتقائی
رتخریبی شکل تھپیڑ ہے۔ یہ بڑی قاتل اور ستمگر رہی ہے۔ اس کا
ا دوست کو دوست کا بیری، بیٹے کو باپ کا دشمن اور عاشق کو
ر بازار ذلیل و خوار تو شاگرد کو استاد پہ تک ورغلا دیتا ہے
ا زمانہ اس کی گونج گھر، گلی، کوچے اور تھانے سے نکل کر اسمبلی
پارلیمنٹ تک بہ ہو پہنچ گئی ہے۔ اس کی بازگشت ہر جگہ، ہر موقع
قیامت خیز رہی ہے۔

سرِ راہ کسی قاتل حسینہ کے کافر شباب کے باعث
عمر یار سے چھیڑ ، والی کیفیت، نامراد عاشق کے
لئے ناگزیر ہو تب حنائی ہاتھوں اور چیچک زدہ پچکے گالوں
ا وصال بالجبر تھپیڑ کو جنم دے گا اور اس کا ردعمل میاں مجنوں
د سڑک سے کھینچ تھانے لے جائے گا اور پھر تھپیڑوں، لاتوں
ر گھونسوں کا لامتناہی سلسلہ خوب بہار دکھائے گا۔ عاشقِ
صادق کے جسم اطہر پہ نت نئے گل بوٹے اُبھر آئیں گے۔

گھر کی چہار دیواری میں اس کی گونج ازدواجی زندگی
کا شیرازہ بکھیر، طلاق کی تفاتنی، میاں بیوی کے بیچ تان دیتی
ہے۔ تالی۔ تالی اور تھپیڑ کا رشتہ سیدھا اور بالکل قریب کا ہے
ازدواجی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ ناگہانی یا سوچے سمجھے طور پہ
ن کا عمل دیکھنے میں آیا ہے۔ بعض حالتوں میں بیوی کے چہرے
بر نمک میں تخفیف یا ہانڈی میں نمک کی بہتات بھی اس کا
باعث رہی ہے اور کبھی کبھی تو ترکاری میں مرچ کی تیزی، شوہر
کی تند مزاجی کو چیلنج کر کے میاں بیوی کو دسترخوان پہ
دست و گریباں والی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے اور پھر یہ
دونوں چیٹ ٹھکنی کی تال دبیلن پول پاٹ کی سنگت پہ
گالی کوسوں کا بے ہنگم کورس (لیکن آج کے کسی بھی ڈسکو
بیٹ گیت سے کہیں بہتر) گا کر ایک دوسرے کو خوب گاتے بجاتے
ہیں۔ اس وقت گھر میں موجود بچوں کی پوری ایک بٹالین اس
طرفہ تماشہ سے محظوظ ہو کر تالیاں بجاتی ہے۔ اور ساتھ
ہی پاس پڑوس کے لوگ بند کھڑکی دروازوں کو حق ہمسائیگی
کے نام پہ ٹھوک پیٹ کر انہیں شہید کر دیتے ہیں۔ الغرض
ایک اچھا بھلا گھر اس ہنگامی کیفیت کے باعث ریاستی اسمبلی
کے کسی اجلاس کی زیراکس (XEROX) کاپی
محسوس ہوتا ہے۔

--

-۰- -۰- -۰-

-۰- -۰- -۰-

مجتبیٰ حسین

شاذ کی یادیں

۱۸ اگست کو اتوار کی چھٹی تھی سہ پہر کا وقت تھا میں اتواری قیلولہ کے لیے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ "ملاپ" سے سخی حسن صدیقی نے رکتے سہمتے کہا "آپ آرام تو نہیں کر رہے تھے آپ کو ایک بری خبر سنانی ہے ابھی پی ٹی آئی سے اطلاع آئی ہے کہ شاذ تمکنت کا انتقال ہو گیا"۔

میں نے سخی کو کوئی جواب نہیں دیا اور فون کا ریسیور رکھ دیا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی قطب مینار کی دو اوپری منزلیں جو میری کھڑکی سے صاف نظر آتی ہیں تیز بارش کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ میں نے برسات میں ان دونوں منزلوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ دکھائی نہ دیں۔ کھڑکی کے روزمرہ منظر میں سے اچانک قطب مینار کے غائب ہو جانے سے مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی میں نے سوچا آج یہ قطب مینار کو اچانک کیا ہو گیا۔ اچھا بھلا یہیں تو تھا اب دکھائی نہیں دیتا۔ کہاں گیا ہوگا! اور ہاں سخی نے کیا کہا تھا شاذ کا انتقال ہو گیا۔ تو کیا وہ اب تک زندہ تھا؟ چلئے شاذ کے بارے میں بعد میں سوچتے ہیں پہلے قطب مینار کا تو فیصلہ ہو جائے مجھے اس کی زیادہ فکر ہے یہ تو میری کھڑکی کے منظر کا لازمی جز ہے۔ یوں بھی سماجی تعلقات کے منظر نامہ میں شاذ میرے لیے ایسا تو نہیں تھا کہ ادھر کمرے کی کھڑکی کھلی اور وہ ادھر نظر آگیا۔ یہ ضرور ہے کہ سال میں دو تین بار اس سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں اتنے میں بارش کا زور تھما تو قطب مینار کی دونوں منزلیں مجھے صاف نظر آنے لگیں قطب مینار کی بازیافت پر میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ پھر سوچا اچھا تو میاں شاذ تمکنت چل بسے مجھے اس سے یہی امید تھی۔

ٹھیک ایک مہینہ پہلے یہی اٹھارہ تاریخ تھی اور وقت بھی یہی جب میں حیدرآباد میں شاذ سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ میں اس سال کے شروع میں ۸ر فروری کو بھی اس سے ملا تھا کئی دن بے ہوش رہنے اور موت سے بھرپور جنگ کرنے کے بعد وہ تھکا ماندہ بستر پر پڑا تھا۔ نقاہت اور کمزوری اس کے روئیں روئیں سے عیاں تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس بار میں نے گھر پر آواز لگائی تو شاذ خود باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔ کہنے لگا "ارے مجو میاں تم"! کب آئے کسی نے بتایا تھا کہ تم حیدرآباد آرہے ہو"۔ ہم ڈرائنگ روم میں گئے تو دیکھا کہ بستر پر کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔ کچھ رسالے کچھ کتابیں سرہانے پڑی ہیں۔

میں نے کہا یار شاذ تم نے پھر لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ اب تک جو لکھا ہے اس پر کون عمل کر رہا ہے جو تم پھر لکھنا چاہتے ہو"۔

عادت کے مطابق اس نے ایک کمزور سا قہقہہ لگایا اور کہا اپنے اگلے مجموعۂ کلام کو ترتیب دے رہا ہوں اس بار بہت خوبصورت چھاپنے کا ارادہ ہے اور ہاں ادبی ٹرسٹ سے مخدوم محی الدین پر مقالہ کی اشاعت کی بات بھی چل رہی ہے۔"

میں نے کہا "یار خدا کے لیے مجھ سے شعر و ادب کی بات نہ کرو۔ پہلے تو یہ بتاؤ تمہاری صحت کیسی ہے؟ بولا ٹھیک ہی ہوں۔ تمہیں کیسے لگ رہا ہوں تم چھ مہینے پہلے مجھے دیکھ گئے تھے کچھ فرق تو ہے نا؟"

میں نے کہا "ہاں پہلے سے بہتر دکھائی دیتے ہو۔" بولا۔ کھانے پینے میں سخت پرہیز کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اگر تم نے ابتداہی میں شعر و ادب ادیبوں اور شاعروں کی صحبت سے پرہیز کیا ہوتا تو اس وقت کھانے پینے میں پرہیز کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

میں کوئی گھنٹہ بھر شاذ کے ساتھ رہا۔ اس نے مایوسی، اداسی، موت وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی بلکہ مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اگست میں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے دہلی آنے کا منصوبہ بنا رہا ہے میں نے بھی اسے دہلی آنے سے منع نہیں کیا یہ نہیں کہا کہ اسے اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ بعض باتیں صرف اس لیے کہی جاتی ہیں کہ ان پر عمل نہ کیا جائے۔

شاذ کو اب یاد کرنے بیٹھا ہوں تو کم و بیش تیس برس کا عرصہ میرے سامنے پھیلا ہوا ہے دوستی کا، بے تعلقی کا، قربت کا اور دوری کا شاذ مجھ سے عمر میں دو تین برس بڑا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ہم دونوں کا کبھی ساتھ نہیں رہا کیوں کہ شاذ نے زیادہ تر ایوننگ کالجس میں ہی تعلیم حاصل کی۔ شاذ سے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے آس پاس حیدرآباد کے مرحوم اورینٹ ہوٹل میں ملاقات ہوئی تھی۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول کا وہ سب سے زرین دور تھا۔ مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی اور سلیمان اریب بقید حیات تھے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی پوری ایک نسل ابھر رہی تھی بلکہ ابھر چکی تھی شاعروں میں عزیز قیسی۔ وحید اختر، شاذ تمکنت قاضی سلیم، مغنی تبسم، سکندر توفیق، انور معظم اور راشد آذر اور ادیبوں میں اقبال متین، جیلانی بانو، عوض سعید، عاتق شاہ، آمنہ ابوالحسن، دلدار رطیف، اکرام جاوید، ابراہیم شفیق وغیرہ نمایاں تھے ان میں سے اکثر کی شامیں اسی اورینٹ ہوٹل میں گزرتی تھیں ادیبوں اور شاعروں کی ٹولی الگ جمتی تھی۔ یونیورسٹی کے چند بے فکرے اور کھلنڈرے نوجوانوں کی بیٹھک الگ جمتی تھی میرا تعلق اسی موخرالذکر ٹولی سے تھا۔ اس وقت تک ادب سے میرا براہ راست کوئی سلسلہ پیدا نہیں ہوا تھا سارا وقت شور شرابے، خوش گپیوں اور لطیفہ بازی میں بسر ہوتا تھا۔ شاذ سے میرے مراسم کی بنیاد پہلے پہل یہیں پڑی یہ اور بات ہے کہ ان مراسم کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔ شاذ بنیادی طور پر خود پسند، خود بین و خود آرا ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ، متین اور بردبار نوجوان تھا۔ ملتا سب سے تھا مگر جسے دوستی کہتے ہیں وہ صرف چند لوگوں سے کرتا تھا اسے شہرت بھی بہت جلد مل گئی تھی اور وہ ہر دم اپنی شخصیت کو اس شہرت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا وہ نہایت خوش لباس تھا۔ اپنی چال ڈھال، بات چیت، وضع قطع ایسی رکھتا تھا کہ کسی کو یہ تعارف کرانے کی حاجت ہی پیش نہ آتی تھی کہ وہ شاعر ہے۔ ایسے سنجیدہ اور متین آدمی کی محفل میں ہم جیسوں کا کیسے گذر ہوسکتا تھا یوں بھی وہ اپنے اور ہم لوگوں کی محفل کے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ قائم رکھنے کی دانستہ جتن کرتا تھا۔ جب ہماری ٹیبل سے بلند بانگ قہقہے بلند ہوتے تھے تو شاذ کے چہرے پر ایک عجیب سی ناگواری جھلکنے لگتی تھی۔ اس نے ابتداء میں کبھی بھی مجھے قابل اعتناء نہیں سمجھا ہمیشہ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کی مگر اورینٹ ہوٹل میں کبھی کبھی کوئی ایسا موقع بھی آ جاتا تھا جب شاذ کو مجبوراً ہماری ٹیبل پر آ بیٹھنا پڑتا تھا یہ لمحے اس کے لیے سخت آزمائش کے ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل کی یاد اب مجھے آ رہی ہے، شاذ کو کسی نے کھینچ کے ایک مشاعرے میں

شرکت کے لیے بذریعۂ طیارہ آنے کی دعوت دی گئی تھی اور منتظمین نے طیارہ کا ٹکٹ بھی روانہ کر دیا تھا مجھے دن میں کسی دوست نے اس کی اطلاع دیدی تھی شام میں اورینٹ ہوٹل میں اپنے بے فکرے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دور سے شاذ اپنے ہاتھ میں پلین کا ٹکٹ پکڑے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے فوراً اپنے دوستوں کو پابند کیا کہ اگر خدانخواستہ شاذ ہماری ٹیبل پر آ جائے تو کشمیر کے مشاعرہ اور پلین کے ٹکٹ کی بات کوئی نہیں کرے گا۔ شاذ نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاعروں اور ادیبوں کی ٹولی کا کوئی فرد اسے مل جائے وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک ادا کے ساتھ چلتا ہوا اپنے ہاتھ میں ٹکٹ کو لہراتا ہوا ہماری میز کی طرف چلا آیا۔ پہلے تو اس نے بیچوں بیچ پلین کے ٹکٹ کو رکھا اور ہم لوگوں کا حال پوچھنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ پلین کے ٹکٹ کو دو ایک بار اٹھا کر پھر ٹیبل پر رکھا مگر کسی نے ٹکٹ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ جب ہوٹل کا بیرا پانی کے گلاس ٹیبل پر رکھنے لگا تو شاذ نے بیرے کو ٹوکتے ہوئے کہا "میاں ذرا احتیاط سے پانی رکھنا یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے"۔ ہم لوگ تب بھی خاموش رہے۔ دوسری بار جب بیرا چائے کی پیالیاں ٹیبل پر رکھنے لگا تو شاذ نے پھر ایکبار اُسے ٹوکا "میاں چائے کی پیالیاں ذرا احتیاط سے رکھنا یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے"۔ ہمارے منہ تب بھی بند رہے مگر اسی اثناء میں برابر کے ٹیبل پر سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر گوسوامی نے جو اپنے پرزور قہقہے کے لیے بدنام بھی تھے کسی بات پر زوردار قہقہہ لگایا تو میں نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا "گوسوامی صاحب! ہمارا کچھ تو خیال کیجیے ذرا احتیاط سے قہقہہ لگائیے یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ اُڑ گیا تو!

میرے اس جملے کو سنتے ہی شاذ نے پلین کا ٹکٹ اُٹھایا اور کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا تم لوگ صرف مسخرے ہو بات کرنے کی تک تمیز نہیں رکھتے۔ تم لوگوں کی محفل میں کسی شریف آدمی کو نہیں آنا چاہیئے"۔ یہ کہہ کر شاذ غصہ سے چلا گیا۔

اور یوں میرے اور شاذ کے درمیان کچھ عرصہ کے لیے ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس تناؤ سے شاذ کا تو کچھ نہیں بگڑتا تھا البتہ میں ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے دوست کی صحبت سے محروم ہو گیا۔ وہ زمانہ شاذ کی شاعری کے شباب کا زمانہ بھی تھا اور اس کے شخصی شباب کا بھی۔ سلیمان اریب کے رسالہ "صبا" کے دفتر میں شاعروں، ادیبوں کی محفلیں جمتیں بحثیں ہوتیں ہنگامے ہوتے۔ معاصرانہ چشمکیں چلتیں۔ پھبتیاں کسی جاتیں۔ ادب میں شاعروں کے مقام کا تعین کیا جاتا یہ اور بات ہے کہ دن میں کسی کو کسی مقام پر بٹھا دیا جاتا تو رات کی محفلوں میں اسے وہاں سے "ضرورت شعری" کے تحت اچانک اٹھا بھی دیا جاتا اور اس کی جگہ کسی اور کو بٹھا دیا جاتا۔ ادب میں مقام کے معاملہ میں وحید اختر اور شاذ تمکنت میں ہمیشہ اٹھک بیٹھک جاری رہتی۔ دونوں میں خوب ٹھنتی۔ سلیمان اریب بیچ بچاؤ کرتے اور انھیں پھر اپنے پروں میں سمیٹ لیتے حالاں کہ وحید اختر اور شاذ تمکنت دونوں کے مزاج اور اسلوب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شاذ اور وحید اختر دونوں ہی ہندو پاک کے سارے معیاری رسالوں میں چھپتے تھے اور انھیں برصغیر میں یکساں مقبولیت حاصل ہو گئی تھی لیکن شاعروں میں شاذ اپنی مخصوص رومانیت" احساس کی نرمی اور ملائمت اور اپنے لہجے کے اچھوتے آہنگ کی وجہ سے بے پناہ داد وصول کرتا تھا۔ شاذ اپنے دوستوں کے انتخاب کے معاملے میں نہایت سخت تھا۔ افسانہ نگار عوض سعید اس کا دوست بھی تھا اور مداح بھی۔ ہمدم بھی تھا اور ہمراز بھی۔ دونوں کی اس گہری دوستی کے بارے میں ایک مرتبہ میں نے شاذ سے کہا تھا "تم دونوں کی اٹوٹ دوستی کا راز یہ ہے کہ عوض سعید کو تمہاری شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور تمہیں عوض سعید کے افسانے سمجھ میں نہیں آتے۔ جس دن تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ لوگے اس دن سے تم دونوں کی دوستی ختم ہو جائے گی"

شاذ سے ابتدائی تناؤ کے بعد میرے اس سے دوستانہ مراسم اسی وقت استوار ہوئے جب میں نے ۱۹۶۲ء میں
ح نگاری شروع کی۔ ابتدا میں اس نے میرے بارے میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ میری مزاح نگاری کا
زاح گوئی کا عادی بنتا چلا گیا۔ وہ مجھے پیار سے "مجو میاں" پکارتا تھا۔ میں اکثر شاذ سے کہتا "شاذ مجھ سے ملنے سے پہلے تم
س مزاح کی کمی تھی ماشاء اللہ اب تم میں حس مزاح کی زیادتی نظر آنے لگی ہے"۔ اس پر شاذ کہتا "مجو میاں" یہ حس مزاح
ے لیے ہے تمہارے پیشے کی لاج رکھنا مقصود ہے ورنہ کوئی اور میرے ساتھ اس طرح مذاق تو کر کے دیکھ لے"۔

شاذ کے ساتھ کیسے کیسے عملی مذاق نہ کئے اور اس نے کس کشادہ دلی کے ساتھ اس مذاق کی پذیرائی نہ کی۔ اب یاد کرتا
ہوں تو آنکھیں اشکبار ہونے لگی ہیں۔ چار برس پہلے کی بات ہے دہلی کی جامع مسجد کے علاقے میں ہم رات کا کھانا کھانے جا رہے
کچھ احباب بھی ساتھ تھے آگے آگے کچھ مزدور سر پہ پٹرومکس اٹھائے کسی تقریب سے واپس ہو رہے تھے میں احباب
ہوں سے چل کر پٹرومکس اٹھائے ہوئے ایک مزدور کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا بھئی تمہارا کیا نام ہے؟ مزدور نے
بادجی! میرا نام عبدالرحمٰن ہے"۔

میں نے کہا "بھئی ذرا رک جاؤ۔ وہ صاحب جن کی بڑی بڑی زلفیں ہیں اور جو تمہارے پیچھے آ رہے ہیں تمہارا نام جاننا
چاہتے ہیں"۔

مزدور سر پہ پٹرومکس اٹھائے رک گیا جب شاذ سے اس کا سامنا ہوا تو اس نے کہا "باؤجی! میرا نام عبدالرحمٰن ہے"۔
شاذ نے کہا۔ "اچھا تو تمہارا نام عبدالرحمٰن ہے بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ یہ بتاؤ چاہتے کیا ہو؟" "لو سنو! باؤجی! میں
سے کیا چاہوں گا"۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "ان باؤجی نے بتایا تھا کہ آپ میرا نام جاننا چاہتے ہیں"۔
شاذ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف گھما کر پوچھا "اے مجو میاں" میں نے کب ان کا نام جاننا چاہا تھا۔ میں نے کہا "یار شاذ!
تمہاری مشکل آسان کر رہا ہوں اور تم میری طرف حیرت سے دیکھے جا رہے ہو پوچھ لو ان کا نام ورنہ بعد میں نہایت کرب کے ساتھ شعر
...ہے

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا ؎ ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اس رات وہ اتنا ہنسا کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بہت دنوں بعد شاذ نے مجھے بتایا کہ اب وہ یہ غزل کسی مشاعرے
میں پڑھتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے یوں بھی اس شخص کا نام تو مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے۔ عبدالرحمٰن۔ عبدالرحمٰن۔ ہائے عبدالرحمٰن"۔
میں نے کہا شاذ! یہ تم نے بڑی زیادتی کی اتنی اچھی غزل مشاعرہ میں نہیں پڑھتے نام اگر معلوم ہو گیا ہے تو نام نہ پوچھو۔ اس کا نام
چھوڑ، پتہ ہی پوچھ لو۔ تمہاری معلومات میں تو اضافہ ہونا ہی چاہیئے"۔ شاذ کا پھر ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔
یہ بھی چار سال پہلے کی بات ہے ۳۱ر دسمبر کی تاریخ تھی اور میں اسی دن حیدرآباد پہنچا تھا نئے سال کی آمد میں ابھی چھ سات گھنٹے
تھے۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے شاذ کو فون ملایا۔ جب اس نے "ہیلو" کہا تو اچانک مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے اپنی آواز کو بدل کر پنجابی
میں کہا "شاذ جی ہوں گے جی؟"

نے کہا "بول رہا ہوں"۔
میں نے کہا "نمستے شاذ جی! میں بی بی سی اردو سے بول رہا ہوں۔ اوشا کمپنی کا مینیجنگ ڈائرکٹر۔ آپ کا چھوٹا سا مداح ہوں جی۔

آیا ہوں، دہلی سے آیا ہوں آپ کو شنکر شاد کے مشاعروں میں کئی بار سنا ہے۔ جی۔ آپ کے ساتھ آج کی شام گزارنا چاہتا ہوں"۔ شام کا کیا پروگرام ہے جی آپ کا؟"

شاذ نے کہا۔ اروڑہ صاحب! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے!

میں نے نقلی اروڑہ کے لہجے میں کہا۔" شاذ جی! یہ کیا آپ ذرہ نوازی کی بات کرتے ہیں۔ شام میں ملئے زیادہ نوازی بھی کروں گا آپ میرے بڑے پسندیدہ شاعر ہیں"۔

شاذ نے ہنس کر کہا" اروڑہ صاحب یہ تو بتایئے کہ آپ کہاں رکے ہیں ویسے تو آج شام میں ایک دوست نے نئے سال کی تقریب میں بلا رکھا ہے مگر آپ دہلی سے آئے ہیں آپ کا حق زیادہ ہے"۔

میں نے کہا" شام میں سات بجے رٹز ہوٹل کے لاونج میں آجایئے۔ میں وہیں آپ کو ملوں گا یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

کوئی دو گھنٹوں بعد میں نے اپنی اصلی آواز میں شاذ کو فون کیا۔ وہ بیحد خوش ہوا پوچھنے لگا تم کب دہلی سے آئے"؟

میں نے کہا آج ہی آیا ہوں ویسے آج تو نئے سال کی رات ہے۔ تمہارا نیا سال کہاں طلوع ہو رہا ہے؟"

بولا" یار دہلی سے میرا ایک دوست پی سی اروڑہ آیا ہوا ہے اوشا کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر ہے رٹز ہوٹل میں ٹھہرا ہے اس کے ہاں جانا ہے مگر تم آگئے ہو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اکیلا چلا جاؤں۔ تم ٹھیک ۷ بجے مجھے یہ فخر ہے کہ دکن کے اس البیلے شاعر نے جس کی انا اور خودداری اکثر ہمالیہ سے باتیں کرتی تھی، مجھے ہمیشہ عزیز رکھا۔ دہلی آتے ہی وہ مجھے فون کر دیتا تھا" مجو میاں" ہم آگئے ہیں۔ فوراً چلے آؤ"۔

دو سال پہلے وہ شنکر شاد کے مشاعرے میں آیا تھا، مشاعرہ تو ہو گیا لیکن شاذ دہلی سے جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایک عجیب سی بے کیفی۔ بے دلی اس کے سارے وجود پہ طاری تھی۔ میں ہر روز ٹرین میں اس کے واپس جانے کا ریزرویشن کروا دیتا تھا جسے وہ شام میں کینسل کروا دیتا تھا۔ چار دنوں تک یہی ہوتا رہا پانچویں دن میں نے ہنس کر شاذ سے کہا۔ کب تک میرے مولا آخر کب تک؟ ایک دکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ شاذ نے کہا" مجو میاں! اس کے بعد تو جانا ہی پڑے گا۔ اور وہ اس دن حیدر آباد چلا گیا۔ شاذ کو میں نے اسی مشاعرہ میں آخری بار سنا تھا۔

اس کے بعد والے سال وہ دہلی آیا تو میں امریکہ میں تھا شاذ جب بھی دہلی کے کسی مشاعرہ میں آتا تو میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا اس لیے نہیں کہ شاذ میری کمزوری تھا بلکہ اس لیے کہ جب شاذ کسی ترنم اور ڈرامہ بازی کے بغیر دونوں ہاتھوں سے مشاعرہ لوٹنے لگتا تھا تو میرے تصور میں چار مینار کے مینار کچھ اور اونچے ہو جاتے تھے عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارت کچھ اور بھی پرشکوہ نظر آنے لگتی تھی۔ نوبت پہاڑ ہمالیہ کی طرح اونچا دکھائی دینے لگتا تھا۔ دکن دیس کی سانولی سلونی شاموں کا حسن کچھ اور بھی نکھر آتا تھا۔ اب شاذ نہیں ہے تو ان شاموں میں کون رنگ بھرے گا۔

وہ ایک ایسا سادہ لوح رومانی شاعر تھا جس نے جب دیکھا کہ دنیا اس کی رومانیت کی سطح تک اٹھ کر جی نہیں پا رہی ہے تو وہ چپ چاپ دنیا ہی کو چھوڑ کر چلا گیا شاذ جیسا طرحدار شاعر اب دکن دیس کو کہاں ملے گا جس نے اپنے سوائے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اپنی انا کی حفاظت کے لیے وہ بڑے سے بڑے آدمی سے ٹکر لے لیتا تھا اور اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ چاہنے والے کی محبت کے آگے آپ کچھ قربان کر دیتا تھا۔ آنکھوں کے ایک ڈاکٹر شاذ کے مداح تھے میں نے ایک دن ان ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی کہ ڈاکٹر

صاحب شاذ کی بینائی بہت خراب ہو چکی ہے آپ ٹھیک سے اس کا علاج نہیں کرتے۔ ذرا دیکھیے نا! ارمغ دکن میں شاذ کو اب اپنے سوائے کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا" اس وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شاذ بھی ہنس پڑا تھا۔ اب شاذ نہیں ہے تو احساس ہوتا ہے شاذ کی نہیں بلکہ ہماری بینائی خراب ہو گئی ہے۔ مخدوم کے بعد ارمغ دکن میں شاذ سچ مچ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب شاعری کی بساط الٹ چکی ہے یقیناً وہ ہمارے آگے مشعل سی لیے چلتا تھا۔ ہم نے اُس کا نام بھی جانا اس سے اُس کا کلام بھی سُنا مگر یہ نہیں پوچھا کہ بھیا اپنے دل میں کونسا غم چھپائے پھرتے ہو رٹز ہوٹل کے لاونج میں آ جاؤ میں بھی وہیں آ جاؤں گا۔ پھر ہم ہوں گے، ہمارا نیا سال ہوگا اور ہمارا پی سی اروڑہ ہوگا۔ تو پھر پروگرام پکا ہے نا؟"

میں نے کہا "یار! میں تو پی سی اروڑہ سے واقف نہیں ہوں۔ یوں بھی وہ تمہارا مداح ہے اُس نے تمہیں بتایا ہے مجھے تو نہیں بتایا پتہ نہیں کس ٹائپ کا آدمی ہے؟"

" شاذ نے ہنستے ہوئے کہا "کس ٹائپ کا آدمی ہے اس کا اندازہ اسی سے لگا لو کہ جب میں نے رسماً اس سے کہا کہ آپ کی ذرہ نوازی ہے تو کہا شام میں آ جائیں تو آپ کی زیادہ نوازی بھی کروں گا۔ ایسے آدمی سے کیا تکلف۔ مجو میاں اسی بات پر آ جاؤ آج کی شام رٹز ہوٹل پر"۔ میں نے وعدہ کر لیا اور شام میں جان بوجھ کر آدھا گھنٹہ دیر سے رٹز ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ میاں شاذ نہایت نفیس سوٹ پہنے۔ ہونٹوں پر پان کی سُرخی جمائے اپنے بال بکھرائے بیٹھے ہیں۔

میں نے کہا "مجھے دیر تو نہیں ہوئی"۔ شاذ نے کہا "نہیں تو دیر نہیں ہوئی البتہ اس چغد پی سی اروڑہ کا کہیں پتہ نہیں چل رہا ہے میں نے کاونٹر پر بھی پوچھا۔ معلوم ہوا یہاں کوئی پی سی اروڑہ نہیں ہے ایک بی۔ پی اروڑہ ضرور ہے۔ میں نے اس سے بات کی وہ مجھ کو جاننا تو بہت دور کی بات ہے اوشا کیتی کو تک نہیں جانتا۔

میں نے کہا "شاذ تمہیں کئی بار سمجھایا کہ اپنے مداحوں پر اندھا اعتماد نہ کرو۔ تم نہیں مانتے اب نئے سال کا کیا ہوگا؟"

شاذ نے کہا "تم فکر نہ کرو۔ اپنے راشد آذر کے ہاں چلتے ہیں۔ اس نے مجھے آج کی شام بُلایا ہے تم بھی چلو"۔

مگر میں نے پہلے ہی اپنے ایک دوست کو کہہ دیا تھا کہ شام میں شاذ کو لیکر نظام کلب پر آؤں گا۔ ہم نے نئے سال کی وہ رات نظام کلب میں گزاری۔ شاذ بڑی دیر تک پی۔ سی اروڑہ کو کوستا رہا مگر جب نئے سال کی آمد کا اعلان ہوا تو شاذ زمانہ کو کوس رہا تھا۔ اس رات میں نے پہلی بار شاذ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اس کے دل میں نہ جانے یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ حیدرآباد نے اس کی قدر نہیں کی۔ مجھ سے کہنے لگا "مجو میاں یہ تم نے اچھا کیا کہ دہلی چلے گئے۔ اس شہر میں اب کیا رکھا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار شاذ کو دہیں دلاسہ دیا تھا کیوں کہ شاذ کسی کے سامنے اپنے دکھ کا اظہار نہیں کرتا تھا اسے ایک مدت تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس شام کا پی۔ سی اروڑہ میں ہی تھا وہ میری باتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا تھا۔ جب شاذ نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مجھ سے کہا "میں اپنے اس انتخاب کا نام "ورق انتخاب" رکھنا چاہتا ہوں۔ اس نام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"

میں نے کہا "شاذ" تمہارے کلام کے انتخاب کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ تمہارے اچھے کلام کا اگر کڑا انتخاب کیا جائے تو یہ ایک ہی ورق میں آ جائے گا۔ پھر چھپائی کا خرچہ بھی کم آئے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں ایک ورق کی خاطر ساری کتاب چھاپ لیتے ہیں"۔

شاذ نے میرے تبصرہ پر جو قہقہہ لگایا تھا وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ کچھ اتا پتا اس غم کا بھی دیتے جاؤ
یا ربنی اور گناہ ساغر تمنا [illegible] تو جناب سے گئے گا مگر اب تو لوٹنے کا وقت بھی نکل چکا

راز سنتوکھ سری (چنڈی گڑھ)

میرے والدِ ماجد قبلہ دنیا جہاں سے نرالے ہیں۔ وہ عقل کے دھنی اور سیاست کے متوالے ہیں۔ اپنے خیالات و نظریات کے اعتبار سے وہ بلاشبہ سورما اور جیالے ہیں!

میری پیدائش کا سانحہ اُن کے لئے ازبس مایوس کن تھا۔ اکثر باپوں کے برخلاف انہیں بیٹے سے زیادہ بیٹی کی تمنا تھی۔ ادھر میں تن و توش کے لحاظ سے کاغذی پہلوان نکلا۔ چنانچہ دو سال کی عمر تک میں اپنی ہستی کا احساس محض اپنے ہاتھوں کی وساطت سے کرا سکتا تھا۔ جھٹ پٹ پروان چڑھنے اور بلوان بننے کے طریقے اور وسیلے اُن دنوں ابھی سائنس دانوں اور ڈاکٹروں نے نہیں سمجھائے تھے۔ میں سوکھے کے مارے اشتہاری بچے سے (جیسا کہ آپ یوں گا والے خاندانی حکیموں کے اشتہاروں پر اکثر دیکھتے ہیں) ہو بہو ملتا جلتا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر مجھے والد صاحب کی ساتھ ہمدردی تھی۔

میں نے بولنا اور باتیں کرنا سیکھا (اور یہ امر بھی اُن کے لئے حد درجہ حیرت انگیز ثابت ہوا) اور مزید برآں پوری رغبت کے ساتھ کھانا پینے لگا تو مجھے "بیٹو راجہ" کا خطاب ملا۔

"تیری عقل اور سوجھ بوجھ کو دیکھتے ہوئے وہ دوسری جماعت سے ہی تیری چھٹی کر دیں گے۔" اسکول میں داخلہ ملنے پر تبصرہ کیا۔

لیکن ہوا یہ کہ دسویں جماعت پاس کرنے پر ہی اسکول والوں نے مجھے چھٹی دی اور وہ بھی سونے کا ایک تمغہ عنایت کر کے۔

"اب تیرے لئے دنیا بھر کی تعلیم کے دروازے کھل گئے ہیں" والد صاحب نے آہ بھر کر کہا۔ "مجھے حیرت تو اس بات پہ ہے کہ جہاں تجھ ایسا پھسڈی پہلے نمبر پر رہا۔ وہاں تیرے دوسرے ساتھیوں کی تعلیمی قابلیت کا کیا حال ہوگا؟ ..... اور ہاں اس میڈل کا کیا کرو گے؟ میری مانو تو اسے اپنے سینے پر آویزاں کر لو اور قلی بھرتی ہو جاؤ۔"

کالج ہمارے گاؤں سے ذرا فاصلے پر تھا۔ ذاتی دوڑ دھوپ اور تگ و دو کے بعد مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

"احمق اور عقل سے محروم لوگ ہمیشہ خوش نصیب ہوتے ہیں۔" والدِ مکرم نے یہ اطلاع ملنے پر فرمایا۔

تعلیم مکمل ہونے پر کالج سے فراغت پائی تو تحقیقی کام کرنے کی غرض سے ہمارے گاؤں سے دور دراز ایک یونیورسٹی میں مجھے ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کرکے بھیج دیا گیا۔ "واہ! یہ توقع بھی نہیں خوب ملا یا"۔ والد نے مجھے وداع کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "آخر ارباب بست و کشاد تمہیں وہاں کس مقصد کے تحت بھیج رہے ہیں؟"

"مزید اعلیٰ تعلیم اور وسیع سوجھ بوجھ کے حصول کی خاطر"۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہیں کہیں بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر تیری جگہ میں ہوتا تو وہاں جانے سے پہلے ضرور معلوم کر لیتا کہ انہیں "قلیوں" کی ضرورت تو نہیں"۔ لیکن وہاں یونیورسٹی میں بہرکیف عمرانیات کے شعبے میں تحقیقی کام کرنے والوں کی ضرورت تھی۔

میں نے جلد ہی تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس پر والد ماجد نے مجھے تار دیا۔ "سخت حیرت کا مقام ہے کہ تم یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی آنکھوں میں خاک جھونکنے میں بھی کامیاب ہو گئے میں اب بھی تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ باز آجاؤ۔ یوں ہی رائیگاں کوششیں کرنے سے کیا حاصل!! —— تیرے خیر خواہ تیرے پیارے والد!"

اس کے فوراً بعد جب ایک نئے تحقیقی مرکز کے صدر کے طور پر مجھے تعینات کیا گیا تو والد ماجد نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے فرمایا:

"واہ! میرے شاہ خرچ بیٹے! معلوم ہوتا ہے کہ میری طرح تیری ارباب یونیورسٹی کے ساتھ نہیں بنی۔ آخرکار تم کچھ نہ کچھ کمانے کے قابل ہو ہی گئے۔"

"جی، دو وقت کی روٹی کے پیسے نکل ہی آئیں گے"۔ میں نے انکساری کے ساتھ جواب دیا اور نہایت احترام کے ساتھ سونے کے اسٹڈز کا ایک جوڑا ان کی نذر کیا۔

"ہوں! تو اس طرح تمہاری معمولی تنخواہ کے روپے خرچ ہوتے ہیں"۔ انہوں نے اپنے کرتے کے کفوں میں سونے کے اسٹڈ نصب کرتے ہوئے لمبی "ہوں" کی۔

یوں وقت گزرنے لگا۔ میرے لئے اپنے دل میں انتہا محبت رکھتے ہوئے بھی والد محترم کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں عام لوگوں کی مانند بہ عزت نارمل زندگی گزار رہا ہوں اور اپنے فرائض بخوبی سرانجام دے رہا ہوں گا۔

"ڈپلومیسی اور ہیرا پھیری میں تمہارا جواب نہیں"۔ ہر بار نئے اعلیٰ عہدے پر میرے پروموشن کے وقت وہ فرماتے۔

جب مجھے اس شعبے کا صدر مقرر کیا گیا جہاں والد ماجد اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کر چکے تھے تو مجھے عملہ کے جملہ اراکین نے بتایا کہ والد محترم کو عمر بھر مجھ پر کیسا ناز رہا تھا۔ میں انھیں اپنے موجودہ دفتر میں تشریف فرمائی کی زحمت دیئے بغیر نہ رہ سکا "واہ میرے بیٹے! تجھ ایسے قابل ایڈمنسٹریٹر کی موجودگی میں ہم اپنے منصوبے کی تکمیل میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ تم بلاشبہ کوئی نیا گل کھلاؤ گے!" انہوں نے طنز کیا۔ پھر دروازے کو اندر سے اچھی طرح بند کرکے مجھ پر اپنے انداز میں یوں آفرین بھیجنے لگے۔

"میرے دل کے سرور اور میری آنکھوں کے نور! اس سے پہلے کہ وہ تیری شعبدہ بازیوں سے مکمل طور پر واقف ہو جائیں یہ ایک بات غور سے سن اور پلّے باندھ لے۔ کوٹ فتوحی ریلوے اسٹیشن پر قلیوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر قسمت تیرا ساتھ دے تو سلکشن بورڈ کی نظروں میں جچ جائے اور چن لیا جائے تو بلا تامل جوائن کر لیجیو۔ ایک تو مستقل نوکری ہاتھ آجائے گی اور دوسرے ماشاء اللہ! یہ کام بھی تو تجھے خوب فٹ دے گا۔!"

ابھی ابھی قومی سائنس کونسل نے مجھے اپنا رکن بنانا منظور کر لیا ہے اور میں کانفرنس ہال میں بیٹھا یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ خدا جانے ابا کی والا کا رد عمل کیا ہوگا!

▬ ▬ ـ٥ـ ـ٥ـ ـ٥ـ

ممتاز مہدی (حیدرآباد)

خواب

خواب کیا ہے؟ انسانی زندگی کی نشوونما میں اس کی کیا اہمیت ہے اور آیا صدر حیوانات یعنی اشرف العجائبات میرا مطلب ہے اشرف المخلوقات کے علاوہ سارے حیوانات بھی اس خواب سے حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں؟ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا ہے۔ البتہ ہم نے کئی بار خواب آور گولیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے جن کے استعمال سے آدمی خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اگر زیادہ مقدار میں خواب دیکھنے کی کوشش کرے تو بجائے زیادہ خواب کے خود خواب ہو جاتا ہے۔ لبقول شخصے اس خواب کا کوئی انت نہیں اور اس خواب سے پہلے سرزد شدہ تمام حرکات کا قیامت کے دن حساب کتاب ہوتا ہے۔

کہتے ہیں بعض عاشقوں کے لیے یہ بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے خوابوں کی دنیا میں وہ محل بناتے بناتے ایک دن لمبا خواب دیکھنے کا خیال کر بیٹھتے ہیں لیکن ہماری نیت ایسی نہیں تھی ہم تو ایک چھوٹا سا خواب دیکھنے کے لیے ایک دو گولیاں میڈیکل شاپ پر کھڑے کھڑے کھا چکے تھے، مالک میڈیکل شاپ نے نہایت مستعدی اور چستی سے ایک گلاس پانی بھی سربراہ کیا تھا۔ ہم نے گولیاں کھالیں تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہم نے جو شاپ سے نکل کر اپنی سیکل سنبھال لی تو وہ ٹک ٹکی باندھے ہمارے نقش پا کو دیکھ رہے تھے ایسے جیسے سانپ کو بغیر حملہ کئے جاتے ہوئے دیکھتے ہوں۔ ہم نے اطمینان سے سیکل پر سواری کا پوز دیا اور آگے بڑھنے لگے ایسا لگا جیسے سیکل ہم نہیں بلکہ کوئی اور شخصیت چلا رہی ہے چوں کہ نہ پیروں پر بار پڑ رہا تھا اور نہ ہاتھوں پر اور آہستہ آہستہ ہمیں یوں معلوم ہونے لگا جیسے ہم نرم نرم بستر میں دھنستے جا رہے ہیں، والدہ نرم نرم گدا اوڑھا رہی ہیں والد صاحب سرہانے بیٹھے کوئی سائنسی لکچر دے رہے ہیں، والدہ کی زبان بند ہے جب وہ اس کو کھولنے کی کوشش کرتی ہیں تو والد صاحب یہ کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں کہ "تم چپ رہو! تمہیں سائنسی معلومات نہیں ہیں" ہم نے آنکھیں گھما کے دیکھا گھر کے ایک کردار کان ہاتھ باندھے کھڑے والد صاحب کا لکچر خاموشی سے سن رہے ہیں ہم نے دیکھا ایک بہن صاحبہ کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہیں۔ دو گھنٹے بعد ہمارے دوست تشریف لائے انہوں نے بتایا "میاں نئے پل پر تم سیکل چلاتے چلاتے گر پڑے، واہ بھئی! خواب آور گولیاں کھانے کی کیا سوجھی تھی ساری دنیا کو پریشان کر دیا تم نے۔ بھلا ہوا کہ ہم نے دیکھ لیا" کچھ دیر بعد ہمیں معاملہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ ہم نے خواب دیکھنا چاہا تھا،

ہیں کیا پتہ تھا کہ فوری خواب آنے لگیں گے۔ یوں بھی ہمیں بچپن ہی سے خواب کی کافی رغبت ہے اور اللہ کے فضل سے ہر رات کوئی کئی خواب دیکھتے ہیں۔ بہت زیادہ تعداد میں خواب دیکھنے کے لیے ہم یہ کرتے ہیں کہ گھڑی سرہانے رکھتے ہیں اور ہر دو گھنٹے کے بعد الارم کا انتظام کر دیتے ہیں یعنی جب بھی اٹھتے ہیں دو گھنٹے بعد اس کو چیخنے چلانے کے لیے کہہ دیتے ہیں اس طرح وہ کئی بار اٹھاتی اور ہم کئی بار اٹھ اٹھ کر سوتے ہیں۔ اس طرح ایک رات میں ہزار داستان مکمل کر لیتے ہیں لیکن اس کے برعکس سنا ہے مست نیند سونے والوں کو بہت کم خواب آتے ہیں اور کچی نیند سونے والوں کو زیادہ۔ بے فکر تنومند لوگ مست سوتے ہیں اور ہمارے جیسے پریشان حال بھلا کیا خاک سوتے بھی ہیں ـــ ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوئی کہ آدمی کچی نیند میں خواب دیکھتے ہیں یا پکی نیند میں۔

ایک اور سائنسی پائینٹ نوٹ کریں وہ یہ کہ آدمی رنگین خواب بھی دیکھتا ہے۔ اس وقت ہمیں سخت تشویش ہوئی تھی جب ہم نے زندگی کا سب سے پہلا رنگا رنگ خواب دیکھا تھا۔ ہماری سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو ایک ڈاکٹر سے رجوع ہوئے تو اس نے کہا گھبرائیے نہیں نوجوان حضرات کے ساتھ کبھی کبھی ایسا حادثہ پیش آتا ہے"۔ لیکن ایک سائنسی میگزین کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلا کہ جدید سائنس داں رنگین خواب کے بارے میں اس نظریئے پر پہنچے ہیں کہ ٹکنی کلر خواب وہ حضرات دیکھتے ہیں جو رنگوں سے دور رہتے ہیں۔ ایک چیٹ پٹے دوست کی محفل میں ہم نے رنگین خواب کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ہم بہت بڑھ چڑھ کر نغمہ زن تھے کہ ایک محترم جب اس موضوع سے بیزار ہو گئے تو سر جھکائے ہوئے ہی کہا "رنگین خواب میں نے بھی دیکھا ہے" ہم چونک گئے چوں کہ اس وقت تک ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا بھر میں ہم واحد ہیں جس نے رنگین خواب دیکھا ہے۔ ہم نے جوں ہی ان کا یہ نامعقول جواب سنا تو ڈھیر سارے سوال کر دیئے، ہم ان خوابوں کے ماہر تھے اس لیے ہم نے پوچھا کتنے رنگوں والا خواب تھا اور کونسی قسم کا خواب تھا یعنی ایسٹمین کلر، ٹکنی کلر، وایڈ کلر، گیواکلر یا میٹرو کلر ـــ ان سوالوں سے وہ پریشان تو ہوئے لیکن خاموش رہے تب ہم نے انھیں پر زور تردید کرنے کے لیے مجبور کیا۔ لیکن دوستوں نے کہا بھی ہو سکتا ہے انہوں نے بھی ایسا خواب دیکھا ہو"۔ ہم نے چونکہ بہت سے رنگین خواب دیکھے تھے ایک اور سوال کیا "یہ تو بتاؤ" 35 MM تھا یا 70MM" اُنہوں نے کہا "سینما اسکوپ" ہم نے کہا "چلو اس معاملہ میں آپ کو شکست ہو گئی" ہم نے کہا "ہم نے تو 70MM کلر خواب دیکھے ہیں"۔

بسا اوقات خواب عجیب گل کھلاتے ہیں ایسے خواب جو آپ کو بعض وقت شرمندہ کر دیتے ہیں، ان خوابوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ آپ لب پر نہیں لا سکتے اور بعض ایسے سین نمودار ہوتے ہیں جو عملی زندگی میں آپ کے دماغ کے کسی کونے میں بھی نہیں رہے ہوں گے۔ جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو تشویشناک حالت میں دیکھ کر دوست کی تشویش کی وجہ جاننی چاہی تو دوست نے اپنی پریشانی کی کیفیت یوں بیان کی "کیا بتاؤں یار ہماری بیگم صاحبہ کی پریشانی ہے، میں نے خواب میں انہیں آزادی کے ساتھ ہوٹلوں میں گھومتے اور عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا" دوست نے کہا "شکر بجا لایئے صاحب یہ تو خواب کی بات ہے حقیقت نہیں" انہوں نے جواب دیا "بھائی صاحب یہ تو سوچو میرے خواب میں ہی وہ اتنا کچھ کر گزر رہی ہے، اپنے خواب میں کیا نہیں کرتی ہو گی"۔ ان صاحب کو تو چھوڑیئے خود ہماری مثال لیجیے کہ ہم نے اپنے محلے کی معزز بوڑھی خواتین کو خواب میں تاش کھیلتے اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے سٹہ بازوں کی محفل جمائے دیکھا ہے اس خواب نے ہمیں ایسے گدگدایا کہ تین دن تک قہقہے لگاتے رہے۔ آخر جب ہم سے رہا نہ گیا تو ایک معزز بوڑھیا کے سامنے ہم نے کہا "کہیئے بڑی بی آپ میرے خواب میں کیوں آئی تھیں؟" یہ سنتے ہی انہوں نے آگ بگولہ ہو کر کہا "بیٹا! رمضان کا مہینہ ہم روزے نماز عبادت سخاوت میں لگے ہیں اور تو ایسی باتیں کرتا ہے۔ آج ہی سے روزہ نماز شروع کر دے ورنہ دیکھ تیرے دیدے پھوٹ جائیں گے"۔ دیدے پھوٹنے کی بات پر ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ایک ٹیچر صاحب نے بتایا تھا کہ

اندھے بھی خواب دیکھتے ہیں۔ اس دن سے آج تک تشویش رہی کہ بھلا اندھے خواب کیوں کر دیکھتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں چوں کہ انہوں نے دیکھا بھالا تو کچھ نہیں ہے شاید چیونٹی کو خواب میں دیکھ کر ہاتھی کہتے ہوں گے اور ہاتھی کو دیکھ کر انسان خیال کرتے ہوں گے اور نہیں معلوم چمن زار اور ریگ زار میں بھی تمیز کر پاتے ہوں گے۔ رنگین خواب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے بارہا چاہا کہ اس تعلق سے اندھوں سے ملاقات کر کے کچھ معلومات حاصل کریں لیکن آج تک جرأت نہیں ہوئی۔

عام طور پر لوگ من گھڑت خواب افسانوں کی طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں یہ تک نہیں دیکھتے کہ کس پر کس بات کا کتنا اثر پڑتا ہے، ہمارے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ مبالغہ کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد آپ یقین کریں کہ دل کے خواب بیان نہیں کریں گے بلکہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو کچھ دیکھا ہے اتنا ہی کہیں گے۔ ایسا نہیں کہ برسوں پرانی دشمنی کو آناً فاناً میں یہ کہہ کر ختم کر دیں کہ خواب میں بزرگوں نے یہی ہدایت دی تھی ـــ خواب بعض اوقات حیران کن آتے ہیں دہلا دیتے ہیں لیکن آپ ہوش سنبھال کر اطمینان کا سانس لے کر دیکھ سکیں تو خواب اس قدر خوش کر دیتے ہیں کہ آپ جاگ کر بھی دُنیا و ما فیہا سے بے فکر ہو جائیں گے اور فرمانے لگیں گے ؎

رات نے کیا کیا خواب دکھائے رنگ بھرے سو جال بچھائے
آنکھیں کھلیں تو سپنے ٹوٹے رہ گئے غم کے کالے سائے

▲▼

حفیظ الحکیم پروانہ
(مالیگاؤں)

ہم تو اس کرکٹ کے ہاتھوں مر چلے ....

کرکٹ سرد ممالک میں کھیلا جانے والا انگریزوں کا کھیل ہے۔ اور کچھ ان ہی کے مزاج سے میل بھی کھاتا ہے۔ لیکن اب ہر کوئی اسی بخار میں مُبتلا ہو گیا ہے ہم بھی اس میں ہمیشہ فضول ٹانگ اڑائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ کھیل ہمارے اس گرم ملک میں بڑے زور و شور سے کھیلا جاتا ہے۔ خواہ بارش ہو یا گرمی، کرکٹ شائقین کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ محلے کے گلی کوچوں کو بچے کھیل کا میدان بناتے، اودھم مچاتے ہیں جیسے وہ گلیاں نہ ہوئیں کوئی اسٹیڈیم ہوا۔ بولنگ ہو رہی ہے۔ گواسکر اور عمران خان بننے کی لاحاصل کوشش میں مکانوں کے شیشے توڑے جا رہے ہیں۔ محلے میں وہ ہنگامہ اور طوفانِ بدتمیزی برپا ہے کہ الاماں۔ کرکٹ نہ ہوا، وبالِ جان ہوا۔

جنابِ من بچے تو بچے، بڑے اور سفید ریش لوگوں کا یہ حال ہے کہ اجتماعی کامنٹری سننے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جان نہ پہچان، کرکٹ کی ابجد سے ناواقف، سوالات پر سوالات کئے جا رہے ہیں۔ بعض حضرات تو اس قدر ستم ظریف واقع ہوئے ہیں کہ ریڈیو پر کھلاڑیوں کو ہوٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوکوں اور چھکوں پر، چھکوں کی طرح تالیاں، جیسے وہ صرف کرکٹ کا منظر سننے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہوں اور کوئی دوسرا کام نہیں۔

"اور بھی کام ہیں زمانے میں کرکٹ کے سوا"

کرکٹ کا سیزن کیا آیا، جدھر دیکھئے ہر کوئی اس کا روگی، جسے دیکھئے، جدھر نظر دوڑائیے، کرکٹ روگی ملیں گے۔ جس آفس میں جائیے فائلوں کا انبار لگا ہے اور صاحب ہیں کہ کامنٹری سُن رہے ہیں۔ کام ٹھپ، اب تو حکومت سے یہی گذارش کر دی

پڑے گی کہ کرکٹ مقابلے کے دنوں میں پورے ملک میں چھٹی دے دی جائے تاکہ لوگ اطمینان سے کھلاڑیوں کو بھاگتا دوڑتا دیکھ سکیں۔
یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ گیارہ بھاگ دوڑ کرنے والے گیارہ لاکھ کو بے وقوف بنائیں اور وہ بے وقوف بھی ان کو بھاگتا دوڑتا دیکھیں
جیسے بے وقوف بنانا لیڈروں کا کام ہے اور بے وقوف بننا عوام کا فرض ہے۔ جب بھی حکومت کو کسی محاذ پر اپنی ناکامی چھپانی ہوتی ہے
وہ فوراً کرکٹ مقابلے کا انتظام کرواتی ہے تاکہ عوام کی آنکھیں نہ کھلیں اور اُن کو گھاس کھانے کی عقل تک نہ آئے۔

یہ کہاں کی دانائی ہے کہ غریب ملک میں اس قدر مہنگا کھیل کھیلا جائے۔ کیا امریکہ جیسے مہذب اور مالدار ملک میں اس کھیل کو کھیلا جاتا ہے؟ نہیں، کیونکہ وہاں کے لیڈر عوام کی جیب پر ڈاکہ، سرکاری خزانے پر بار اور اپنے عوام کو نکمّا نہیں بنانا چاہتے۔ یہ ہندوستانی عوام اور حکومت ہے جو اس کھیل کی پذیرائی کرتی ہے۔ حکومت کرکٹ کھلاڑیوں کو نوازتی ہے۔ پریس والے خصوصی کرکٹ نمبر اور کھلاڑیوں کی تصاویر کو صفحۂ اول کی زینت بناتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک سائنٹسٹ، اُس کے کارناموں اور تصویر کو پریس والے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ نہ ہی حکومت اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے عزائم کو اپنے سینے میں دفن کئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

اسی پر اکتفا نہیں بلکہ کرکٹ کے طفیل ہم نے کیا کیا مناظر نہ دیکھے۔ جہاں کرکٹ شروع شرپسند حضرات موجود، جو آئے دن ہار جیت کو بہانہ بنا کر فساد کی فضا تیار کرتے ہیں۔ ہندوستانی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ غربت سے نیچے کی زندگی گذار رہا ہے اور دوسری طرف کرکٹ شائقین جیت پر ہزاروں روپیوں کے گولے داغ دیتے ہیں اور کبھی ہار پر ان ہی جیتنے ہوئے کھلاڑیوں کی چپلوں، گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے تواضع کرتے ہیں۔

آج کل کپل، گواسکر اور عمران خان زیادہ پیدا ہو رہے ہیں اور گاندھی، نہرو، جناح و آزاد نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔
اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ نئی پود محسنینِ قوم کو بھولتی جا رہی ہے اور کپل، گواسکر و عمران خان کے دوڑنے بھاگنے کے کارناموں کو ازبر یاد کئے ہوئے ہے۔ کاش گواسکر اگر اپنا ایک اٹھا یہ چھکڑے ہوئے عوام کی طرف سے سوئے ہوئے ایوان پر لگاتے تو یہ ان کا بہتر کارنامہ ہوتا۔ ہمارے لیڈر خوابِ خرگوش سے جاگ پڑتے اور عوامی خدمت کے لئے عملی طور سے متوجہ ہو جاتے۔

حکومت کھیل کود کے نام پر لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا رہی ہے اور ادھر دیہاتوں میں لوگوں کو پینے کو پانی نہیں مل رہا ہے۔ کھیلوں کے مقابلوں سے عوام میں آرام طلبی پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن حکومت کو اس سے کیا اور اس کی کیا پرواہ۔ زیادہ کرکٹ کے مقابلوں کو بڑھاوا دے رہی ہے، کھلاڑیوں کو نواز رہی ہے۔ جس سے عوام پر بے جا ٹیکسوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور بیچارے غریب ہندوستانی عوام کا معیارِ زندگی صرف کرکٹ کے ان آٹھ، دس کھلاڑیوں کے سوائے پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہ بات اب تاریخ کا حصہ ہو چکی ہے کہ ہندوستان کا ہر معاملے میں دیوالیہ نکالنے والے صرف دو تھے، ایک لیڈر، دوسرے فلم ایکٹر، لیڈروں نے عوام کو سبز باغ دکھائے، انہیں وعدوں پر بہلایا۔ فلم ایکٹروں نے عوام کے اخلاق بگاڑنے اور اپنی تقلید کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب ان میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا، وہ ہیں کرکٹر، انھوں نے عوام کو بے کار، نکمّا اور آرام طلب بنا دیا۔ جدھر دیکھو بس کرکٹ ہی کرکٹ اور کرکٹ کی باتیں۔ لوگوں نے اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ہندوستانی ٹیم ویسٹ انڈیز سے کیوں ہاری؟ پاکستانی جیت کی کیا وجوہات ہیں؟ دنیا کا تیز بالر کون ہے؟ کھلاڑیوں کی سوانح و تصاویر اور ہار جیت کے گوشوارے جمع کرنے میں وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ جیسے ان ہی سب باتوں پر ان

ا روزی روٹی کا انحصار ہے۔ دین دنیا کی بھلائی ہے۔ کبھی کھیل کے آؤٹ ہونے پر واویلا مچ جاتا ہے تو کبھی گواسکر کے
ل بی ڈبلیو ہونے پر توڑ پھوڑ ہو جاتی ہے۔ لیکن آسام کی دہشت، پنجاب کے شعلے، افغانستان میں روس کی درندگی،
ماشیل کی ہٹ دھرمی اور ہمارے ملک میں فرقہ واریت کے ننگے ناچ پر کسی کی زبان تک نہیں کھلتی، حیف صد حیف!!
بہر حال کرکٹ ہند و پاک کے عوام کے خون میں اس تیزی سے سرایت کر گیا ہے کہ اب یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ
ا برصغیر کے عوام کو نکما، ناکارہ اور کھلونے دے کر بہلانے کی عالمی سازش نہ ہو؟

■ "چمچہ نامہ" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ہمارے سماج کے پروردہ ان افراد کی چمچہ گردیوں کے متعلق ایک شاعر کے شدید ردِ عمل
طنزیہ اظہار ہے جو چاپلوسی اور خوشامد کو ایک مستقل پیشے کی حیثیت سے اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ لفظ چمچہ اپنے موجودہ معنوں
ں کب سے مستعمل ہوا اور عام بول چال میں اس کا چلن کیوں کر ہوا۔ کیا بمبیا اردو کے بہت سے لفظوں مثلاً لفڑا، بوم مارنا، مسکہ
رنا یا مکھن لگانا وغیرہ کی طرح چمچہ کو پاپولر کرنے کا سہرا ہماری فلموں کے سر ہے۔ کسی حد تک یہ صحیح ہے لیکن ابھی حال ہی میں
مچے کی تاریخی حیثیت کا بھی پتہ چلا ہے۔ جواہر لال یونیورسٹی کے پروفیسر کے۔ تیشا دری نے چمچے کی تاریخ پر ایک ریسرچ پیپر شائع
یا ہے جس پر خشونت سنگھ نے ہفتہ دار "سنڈے" (۶ر نومبر ۸۳ء) میں اپنے مخصوص انداز میں ایک بڑا دلچسپ نوٹ لکھا ہے۔
روفیسر شیشادری نے موجودہ چمچے کا رشتہ چمچے کی شکل کے اس shoe-horn سے جوڑا ہے جس کی مدد سے اردلی اپنے
قاؤں کو جوتے پہناتے تھے۔ پروفیسر موصوف نے چھان بین کے بعد مشہور اشتراکی مفکر فریڈرک اینگلز کے مکاتیب میں اس لفظ
سراغ لگایا ہے۔ اینگلز کی اطلاع کے مطابق اپنے دورِ حکومت میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ ایک بار جرمنی کے شہر کولون کے سرکاری
ورے پر تشریف لے گئیں۔ شہر کے میئر نے ملکہ کے مرتبہ کے شایانِ شان بطورِ خاص اپنی دختر نیک اختر کو ملکہ کی خدمت پر مامور
یا۔ میئر کی دختر نے ملکۂ معظمہ کے حضور میں چائے کی پیالی لے کر شرف باریابی حاصل کیا۔ ملکہ نے بڑے تکبرانہ انداز میں پیالی سے
لب چمچہ چائے لے کر چکھی لی اور پھر میئر کی لڑکی کی طرف سے منھ پھیر کر اپنی پیٹھ اس کی طرف کر دی۔ اینگلز رقم طراز ہے۔ "بیچاری
ڑکی لرزہ بر اندام، حیرت زدہ کھڑی رہی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہاں کھڑی رہے یا وہاں سے چلی جائے۔ چلو ٹھیک ہی ہوا!
دولت والے بورژوا لوگ چالاک اور سلطانوں اور سلطاناؤں کے بھاری صرف چمچے ہیں اور ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ اس کے
ستحق تھے" اس طرح چمچہ چاپلوسی، خوشامد اور تملق کا ہم معنی لفظ بن گیا۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی نے چمچہ کو اسی معنی میں
ستعمال کیا ہے۔ . . . . "

"چمچہ نامہ"
از: ضیاء الرحمٰن اعظمی
علی حماد عباسی کے مقدمہ کا اقتباس

عابدہ محبوب
(حیدرآباد)

"دھجیاں" *

"طلب"

ایک بزرگ حیدرآبادی خاتون ، پاکستان میں اپنے قیام کے دوران گوشت و ترکاری خریدنے بازار گئیں۔ گوشت کی دوکان پر جاکر خاتون نے قصاب سے کہا۔

"دو کیلو گوشت دیدو ! بغیر ہڈی کا !"

قصاب نے خاتون کو جواب دیا۔

"معاف کرنا خالہ ! ہمارے ہاں بغیر ہڈی کے کوئی بکرا نہیں ہوتا۔

"تھوڑی سی"

آسمانِ ادب پر طلوع ہوتی ہوئی ایک ادیبہ سے کسی نے پوچھا۔

"ایک کتاب لکھنے کے بعد آپ کا دل چاہتا ہوگا کہ میں بھی بڑے ادیب کی طرح کتابیں لکھتی جاؤں اور میری شہرت ساری دنیا میں پھیل جائے !"

ادیبہ نے جواب دیا۔ "میری ایسی قسمت کہاں کہ بڑی ادیبہ بن سکوں ! ہاں اتنی شہرت ضرور چاہتی ہوں جتنی ایک کتاب لکھنے والوں کو ملتی ہے۔ بس تھوڑی سی ! جیسے غالب اور پطرس کو ملی !"

"شکایت"

کڑی دھوپ تھی اور سڑک سنسان پڑی تھی۔ ایک خالی ٹکسی کے پیچھے دو کتے بھونکتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "آخر یہ کتے خالی ٹکسی کے پیچھے بھونکتے ہوئے کیوں جارہے ہیں ؟"

ایک صاحب نے جواب دیا۔

"ٹکسی والے نے بٹھانے سے انکار کردیا ہوگا !"

"دل کے خریدار"

کسی ہائی اسکول کے ایک لیب اسسٹنٹ Lab. Asst کی ملاقات بازار میں، ان کے قریبی حیدرآبادی دوست سے برسوں بعد ہوئی۔ سلام علیک ، خیر خیریت اور گلے شکوے کے بعد حیدرآبادی دوست نے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ ! اس وقت جا کہاں رہے تھے ؟

---

* "دھجیاں" 'شگوفہ' جون ۱۹۸۵ء کے سلسلے کی دوسری کڑی۔

لیب اسسٹنٹ نے جواب دیا۔
" دل خرید نے جا رہا تھا ! "

"ایرکنڈیشنڈ شرٹ"

ایک صاحب نے آفس وقت پر جانے کی جلدی میں ایک ایسا شرٹ پہن لیا جس کا سیون جگہ جگہ سے ادھڑ گیا تھا۔ بیوی سے رہا نہ گیا، بولیں۔

" یا تو دوسرا شرٹ پہن لیجئے یا پھر اتار کر دے دیجئے منٹ میں سی دوں گی ! "

صاحب بولے " اب سینے کیلئے وقت کہاں ہے ؟ پھر دیکھتی نہیں ہو کہ کس قدر گرمی پڑ رہی ہے۔ اس لئے تو میں نے ایرکنڈیشنڈ شرٹ پہنا ہے ! "

"شیطان"

" امی آپ نے کہا تھا کہ رمضان میں اللہ میاں شیطان کو بند کر دیتے ہیں تاکہ وہ نیک بندوں کو نہ بہکائے۔ "
" ہاں بیٹا ! کہا تو تھا، کیوں ؟ "
" پھر اللہ میاں نے ابا جان کو قید کیوں نہیں کیا ؟ وہ مجھے بہکا رہے ہیں کہ گرمی بہت ہے، روزہ مت رکھو ! "

"محنتی"

دو دوست اکٹھا بیٹھے امتحان کی اسٹڈی کر رہے تھے گرمی کی شدت کے ساتھ ساتھ مچھر بھی پریشان کر رہے تھے۔ ایک دوست نے کتاب چھوڑ کر مچھروں کو مارنا شروع کیا۔ بار بار پٹاپٹ... پٹاپٹ کی آوازیں سن کر دوسرا دوست اکتا گیا اور بولا۔

" تم اسٹڈی کر رہے ہو یا مچھر مار رہے ہو ؟ "
مچھر مارنے والے دوست نے جواب دیا۔
" تم سے بہتر ہوں کہ کچھ تو کر رہا ہوں ! "

"آدھی شادی"

ایک صاحبہ راہِ للہ شادی کے پیامات لگانے کا کام کیا کرتی تھیں۔ ان کے لگائے ہوئے رشتوں کے لوگ کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ سارے محلے میں ان صاحبہ کی بڑی عزت اور قدر تھی۔

ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ہی محلے کے ایک شریف لڑکے کا پیام ایک ٹیچر کی لڑکی کے لئے دیا۔ ٹیچر نے بعد دریافت یہ کہہ کر پیام لوٹا دیا کہ لڑکے کی پہلے دو شادیاں ہو کر ٹوٹ چکی ہیں۔"

یہ بات سن کر وہ صاحبہ حیران رہ گئیں، بولیں "یقیناً اس کے کسی دشمن نے یہ خبر اڑائی ہے۔ میں اسے بچپن سے دیکھ رہی ہوں، دو شادیاں تو دور کی بات ہے۔ اس بے چارے کی آدھی شادی بھی نہیں ہوئی ! "

"فرق کا سبب"

دو ہم خیال اور ہم مذاق دوستوں نے ایک ہی ناول پڑھی۔ مگر ناول کے بارے میں دونوں کی آراء میں کافی فرق تھا۔ پہلا دوست ناول کو "بہترین" اور دوسرا دوست "بکواس" قرار دے رہا تھا۔ دونوں کی بحث و تکرار سن کر تیسرے دوست نے پہلے دوست سے پوچھا۔

" ناول تم کو کہاں ملی تھی ؟ " پہلے دوست نے تعجب سے کہا۔ " کہاں ملتی یار ! میں نے بک اسٹال سے خرید کر پڑھی ہے۔ " تب تیسرے دوست نے دوسرے دوست کو مخاطب کر کے پوچھا " ناول تم کو کہاں ملی تھی ؟ " دوسرے دوست نے اطمینان سے جواب دیا " وہ تو میں ایک رشتہ دار کے گھر سے [illegible] اٹھا لایا تھا۔ "

تابندہ اور پائندہ مشعل

بمقام [illegible]، تامل ناڈو ایکسپریس سے ان کی لاش رات کو تقریباً ۱۱ بجے ناگپور لائی گئی اور دو گھنٹے بعد ہی نصف شب کو مسلم قبرستان مومن پورہ (ناگپور) میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ ان کے ہزاروں چاہنے والے، دوست واحباب اور رشتے دار جنازے میں شریک تھے۔

صادق کی یہ دعا ہے کہ ہر شام، ہر سحر   برسائے نور آسماں تیری مزار پر

ناظم انصاری گذشتہ پندرہ سال میں کل ہند مشاعروں کی وجہ سے طنز وظرافت کی دنیا میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کے طول وعرض میں ہونے والے تقریباً ہر عظیم الشان کل ہند مشاعرہ میں عزت سے بلائے جاتے، جہاں وہ اپنے مزاحیہ کلام سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیتے۔ انھیں خدا نے مترنم آواز کی انمول دولت عطا کی تھی۔ لہٰذا اپنے ترنم اور کلام کے دائمی نقوش سامعین پر چھوڑ آتے۔ پھر ان کی شخصیت بھی انتہائی پرخلوص، سادہ اور معصوم تھی۔ ان تمام اوصاف کے باعث شعر وشاعری سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً سبھی افراد ان کے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔

ناظم انصاری ایک آسودہ حال خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کا آبائی وطن بازار رسیا (ضلع جون پور) ہے، جہاں سے ان کے جد امجد شیخ دھنی معاشی پریشانیوں سے مجبور ہو کر ۱۸۸۰ء میں وسط ہند کی طرف چلے آئے اور کامٹی (ضلع ناگپور) میں سکونت اختیار کی۔ ناظم کے والد کا نام عبدالرحیم تھا جو اپنے والد کے ہمراہ ۹ سال کی عمر میں کامٹی آئے تھے۔ لیکن جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے ناگپور میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے آبائی پیشے رخت سازی کو اپنی معاش کا ذریعہ بنایا۔ موصوف صوم وصلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ ان کا زیادہ وقت ذکر واذکار میں گزرتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا۔ صوفی منش تھے حضرت شاہ محمد سلیمان (پھلواری شریف) کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو ۱۰۵ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ انتقال کے وقت ان کے چار بیٹے بقید حیات تھے۔ محمد حنیف، محمد نظام الدین (ناظم)، محمد جمال الدین (جملا) اور محمد علیم الدین۔

محمد حنیف اپنے والد کی طرح احکام شریعت کے پابند ہیں۔ انھیں ۱۹۷۶ء میں حج کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آبائی پیشے سے انحراف کر کے بہت ہی چھوٹے پیمانے پر کتب فروشی کا کاروبار شروع کیا جو بفضلہٖ تعالیٰ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا اب ایک عالی شان کتب خانے میں تبدیل ہو چکا ہے اور وسط ہند میں "حنیف بک ڈپو" کے نام سے مشہور ومقبول ہے۔ ناگپور کے عالم ٹریڈرس اور فاطمی آرٹ پرنٹرس بھی ان کی ملکیت ہے۔

محمد جمال الدین جملا انصاری بھی ہزل گوئی سے مزاولت رکھتے ہیں۔ اور محمد علیم الدین بلاسپور میں سرکاری ملازم ہیں۔

ناظم انصاری ۲ر جنوری ۱۹۴۹ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خاندانی روایت کے مطابق پہلے قرآن شریف کا ناظرہ ختم کیا۔ پھر مومن پورہ اردو پرائمری اسکول میں داخل کئے گئے۔ لیکن چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا، اس لئے کہ ان کے بڑے بھائی محمد حنیف صاحب نے انھیں کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ آگے چل کر انھوں نے جواہر نائٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے کر پرائیوٹ طور سے میٹرک کے امتحان میں شریک ہو سکیں، مگر گھریلو اور کاروباری ذمے داریوں کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے اور اس حقیقت کا خود ناظم انصاری کو بھی ہمیشہ اعتراف رہا ہے کہ ان کی تربیت اور مالی خوشحالی میں ان کے بڑے بھائی کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ موصوف نے ان کے لئے ۱۹۵۵ء میں آکولہ میں ایک بک ڈپو قائم کیا تھا۔ لیکن ان کے والد کی علالت کے باعث چند سال کے قلیل عرصے میں انھوں نے وہ بک ڈپو بند کر دیا۔ اس کے بعد ناگپور میں ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دوکان کھول کر دی۔ لیکن بدقسمتی

سے اس میں انھیں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں ایک پرنٹنگ پریس جاری کروایا، جو اب تک قائم ہے۔ یہی پریس ان کے معاش کا مستقل سہارا تھا۔

ناظم انصاری اگرچہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے لیکن وہ میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت کا میں نے بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا ہے اور انھیں ہر حال میں ایک مخلص، رحمدل، نیک اور خدا ترس انسان پایا ہے۔ کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر ان کا دل ہمیشہ بھر آتا تھا۔ وہ دوسروں کے غم کو اپنے اندر جذب کر لینے کی اکثر کوشش کیا کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے مکان کا نام "پناہ گاہ" رکھ دیا تھا۔ وہ ٹاٹا نگر میں شاعر کے علاوہ ایک اچھے سوشیل ورکر، فٹ بال کے کامیاب کھلاڑی اور خوش الحان مؤذن کی حیثیت سے بھی کافی مشہور تھے۔

ان کی ازدواجی زندگی بھی بہت صاف ستھری تھی۔ ان کی اہلیہ عائشہ بانو ایک نیک بخت خاتون ہے۔ ایک لڑکی تکمیلہ بانو اور چھ لڑکے ہیں۔ افتخار محمود انصاری، فضل احمد نظمی انصاری، مظہر علیم انصاری، مظفر نعیم انصاری، اصغر کلیم انصاری اور عادل اختر انصاری۔

ناظم انصاری کو بچپن ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ بکڈپو میں ہمیشہ رہنے کی وجہ سے ان کو ادبی کتابوں کے مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ اسی سے ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ پھر ان کا کتب خانہ بھی اس وقت شعراء کا مرکز تھا۔ وہاں ہر وقت شاعروں کا مجمع رہتا۔ جن کے درمیان شعر و شاعری کے تذکرے ہوا کرتے۔ اس ماحول نے بھی ان پر گہرے اثرات ڈالے اور وہ شعر گوئی پر آمادہ ہوئے۔

ناظم انصاری نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن آگے چل کر انھوں نے غزل سے اپنا منہ پھیر کر طنز و ظرافت کا راستہ اختیار کیا۔ جو انھیں اس قدر راس آیا کہ آخر عمر تک اسی پر گامزن رہے، اگرچہ ان کے مزاج اور شخصیت سے یہ روش کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کوشش کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ان کے مزاح میں ایک باوقار اور پرلطف انداز موجود ہے طنز و مزاح کو انہوں نے تفکر و تامل کے آداب سکھائے ہیں اور لوگوں کو ہنسانے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں ان کی مزاح نگاری صرف قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کرتی بلکہ بہت کچھ سوچنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔

ان کے کلام کا مجموعہ "گوبھی کے پھول" ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکا ہے اس میں ۹۲ غزلیں اور ۷ مزاحیہ نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب پر انھیں بہار اسٹیٹ اردو اکیڈمی سے ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام بھی مل چکا ہے۔

"گوبھی کے پھول" کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ اس کا نصف سے زائد حصہ عشقیہ خیالات سے پر ہے۔ وہ جگہ جگہ اپنے محبوب سے اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اور کہیں وصل کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا ہونا لازمی تھا، اس لئے کہ ان کی شاعری کی ابتدا، غزل گوئی سے ہوئی تھی اور ان کا شعری ذوق اسی لطیف صنف کی آغوش میں پروان چڑھا تھا، لہٰذا حسن و عشق کے تذکرے سے اجتناب کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے عشقیہ مضامین کو طنز و ظرافت کے پیرایے میں کثرت سے نظم کیا ہے اور کبھی اپنا اور کبھی اپنے محبوب کا مذاق بنا کر دوسروں کو ہنسانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ چند شعر دیکھئے:

دیوانہ میں ہوں تیرا، ترے باپ کا نہیں		یہ دے رہا ہے تو ٹوپے مجھے کس کا جان من

دیوانے ترے بھٹکے تبلیغ میں جم کر
اب آ کے لب بام کھڑا کس کے لئے ہے

یہ اور بات ہے، ملّا دکھائی دیتا ہوں		خدا کے فضل سے عاشق مزاج ہوں میں بھی

ناظم انصاری نے دوسروں کو ہنسانے کیلئے نہ صرف خود کا مذاق اُڑایا ہے بلکہ ایسے نازک مرحلوں سے بھی گذرے ہیں جہاں ان کی اپنی بیوی بھی مذاق کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ کہتے ہیں :

کشتی کے بادبان مجھے یاد آ گئے
بیگم تمہاری نو گزی شلوار دیکھ کر

یا یہ شعر :

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

ان کے مجموعۂ کلام میں ایک نظم "اَئی کی بہو" بھی شامل ہے۔ اس پوری نظم میں یہی جذبات و تاثرات ملتے ہیں۔ لیکن جب ناظم انصاری حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے، تو قابو سے باہر ہو جاتے اور مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے ان تیز نشتروں سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں جو بے رحمی کے ساتھ ہر چیز کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ موجودہ فیشن پر ان کی تنقید کا نمونہ دیکھئے :

تنگ تہذیب میں داخل تھا کبھی اے ناظم
آج فیشن میں گِنا جاتا ہے عُریاں ہونا

یہ جامہ زیبی تمہاری ارے معاذ اللہ تمہارا جسم تو "کلیئر" دکھائی دیتا ہے

موجودہ دور کی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ کم و بیش ہر اداروں میں "گھپلے بازی" عام ہے۔ ناظم انصاری نے اس بُرائی میں خود کو ملوث کر کے، دیکھئے کتنا لطیف طنز کیا ہے۔

سند ملی ہے مجھے جب سے گھپلے بازی کی
کئی اداروں کے منتظمی مری تلاش میں ہیں
بنا ہوں قومی ادارے کا جب سے میں خازن
رئیس باپ کا بیٹا دکھائی دیتا ہوں

اس طرح یہ شعر بھی حقائق کی کتنی صحیح عکاسی کر رہا ہے۔ ملک میں اس طرح کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں

کسی یوجنا میں ناظم ترا گھر بھی بن ہی جاتا
تو اگر نہ ہوتا شاعر، کوئی ٹھیکیدار ہوتا

اور یہ شعر موجودہ معاشی بدحالی کی کتنی پُر درد تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ہماری آنکھیں اکثر و بیشتر ایسے المناک منظر کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔

محتاج ہے کفن کو بھی مرنے کے بعد وہ
دن رات زندگی میں کمانے کے باوجود

ابھی ناظم انصاری کی شاعری کا نقطۂ عروج تھا اور ابھی وہ فکری لحاظ سے ارتقاء پذیر تھے کہ موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ اور وہ ابدی سکون کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

-٥- -٥- -٥-

انتخاب کلام ـــــ ناظم انصاری

*

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

کھائی تھی میں نے جینے کی جن کیلئے قسم
وہ کر گئے وفات ارے باپ کیا کروں

سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی کہ پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں

ہر روز روزِ عید ہے بیگم کے واسطے
ہر شب، شبِ برات ارے باپ کیا کروں

بالغ ہوا ہوں صوفی و مُلّا کی گینگ میں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی رات ارے باپ کیا کروں

اس نے یہ کہہ کے ملنے سے انکار کر دیا
ناظم ہے واہیات ارے باپ کیا کروں

-۲- -۲- -۲-

وہ زمانہ طفلی کا یاد کر، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
میں کبھی تھا تیرا بھی ماسٹر، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ چُرا کے مرغی پڑوس کی، وہ اُڑانا دعوتیں ٹھاٹ سے
تجھے یاد ہے میرے پارٹنر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرا عشق اوٹ پٹانگ تھا، تیرا حُسن تھا بڑا معتبر
ہوا جھگڑا بس اسی بات پر، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرے دل پہ عشق کا دورہ جب کبھی جم کے پڑتا تھا ہمنشیں
تو ہی بن کے آتا تھا ڈاکٹر، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تری بزمِ ناز میں بجتا تھا، کبھی ڈنکا جس کے کمال کا
یہ وہی ہے ناظمِ باہنر، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

*

میں حیران، و بیکل وغیرہ وغیرہ
وہ شوخ اور چنچل وغیرہ وغیرہ

خدا جانے کیا ہم کو سمجھے ہوئے ہیں
ترے باپ، انکل وغیرہ وغیرہ

شبِ ہجر اکثر مرے کام آئے
یہ مچھر، یہ کھٹمل، وغیرہ وغیرہ

کہاں شیخ صاحب دبا کر بغل میں
یہ ساغر، یہ بوتل، وغیرہ وغیرہ

رُخِ یار ہے آج کیوں سادہ سادہ
نہ مِسّی نہ کاجل، وغیرہ وغیرہ

ہمیں سر جھکانے سے مطلب ہے ناظم
ہو چپل کہ سینڈل وغیرہ وغیرہ

-۲- -۲- -۲-

وقت بے وقت بلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
اس بڑھاپے میں ستاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

میں تو ملنے کے لئے آیا تھا تم سے، اور تم
اپنے ڈیڈی سے ملاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

بام پہ آتے ہو میرے ہی لئے سچ ہے مگر
سب کو دیدار کراتے ہو یہ کیا کرتے ہو

میرے اظہارِ محبت پہ ارے باپ رے باپ
دانت میں انگلی دباتے ہو یہ کیا کرتے ہو

تم بھی اُس شوخ سے ملنے کے لیے اے ناظم
"ایڑیاں" روز کھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

-۲- -۲- -۲-

ہجر کی رات بڑی ہو مجھے منظور نہیں
اور ساون کی جھڑی ہو مجھے منظور نہیں
وقت دیدار تیرے اور مرے بیچو بیچ
کوئی دیوار کھڑی ہو مجھے منظور نہیں
میرے دشمن بھی کریں جم کے نظارا تیرا
تو لبِ بام کھڑی ہو مجھے منظور نہیں
کوچۂ یار کا جس وقت لگاؤں چکر
دھوپ اس وقت کڑی ہو مجھے منظور نہیں
اب وہ کہتے ہیں مرے ناظمؔ دیوانہ کے
پاؤں میں بیڑی پڑی ہو مجھے منظور نہیں

-o- -o- -o-

مشاعروں پہ وہ چھا جاتے ہیں گھٹا کی طرح
غزل سناتے ہیں گا گا کے جو لتا کی طرح
پکڑ لیا جو پولس نے تو شیخ جی بولے
شراب پی ہے یہ سچ ہے مگر دوا کی طرح
پُروف اپنی وفاؤں کا اور کیا دیں ہم
کہ گالیاں بھی تری سنتے ہیں دعا کی طرح
تمہارے باپ سے رہتے ہیں وہ بھی خوف زدہ
جو ڈیل ڈول سے لگتے ہیں سورما کی طرح
نہ آنا جھانسے میں ناظمؔ کے ہے بہت چالو
وہ ٹھاٹ باٹ سے لگتا ہے پارسا کی طرح

-o- -o- -o-

لول، پازیب، پیچھم، یا کہ جھمکا لے گی
اب کے تنخواہ پہ، اے مائی ڈیر کیا لے گی
شوخیٔ حسن پہ، اے عشق نہ جانا ورنہ
دل تو دل ہے تری جاگیر بھی اٹھا لے گی
وصل لکھ دیتے جو نسخے میں تو بہتر ہوتا
ویسے جی وقت بہت آپ کی پُڑیا لے گی

*

اہل دل، اہل وفا، اہل نظر تیرے بعد
سب کے سب روئیں گے پکڑے ہوئے سر تیرے بعد
لنچ دے گا نہ کوئی دے گا ڈنر تیرے بعد
گول کر دیں گے مجھے صاحبِ زر تیرے بعد
تیرا آرڈر ہو تو سنیاس بھی لے سکتا ہوں
میں نہ دیکھوں گا مگر غیر کا گھر تیرے بعد
کون تنخواہ کے دن میرا کرے گا سواگت
اور میں کس پہ جماؤں گا کلر تیرے بعد
لیڈری اپنی کھپا لوں گا کہیں بھی لیکن
شاعری کس کو سناؤں گا ڈیر تیرے بعد
تیرے ناظمؔ میں جو کس بل ہے ترے دم سے ہے
بیٹھ جائے گی بیچارے کی کمر تیرے بعد

-o- -o- -o-

لیکے اٹھیں گے نہ تلوار پٹا میرے بعد
بھول بیٹھیں گے وہ سب ظلم و جفا میرے بعد
کیوں بھگانے پہ تلے ہو مجھے اتنی جلدی
آنے والا ہے کوئی اور بھی کیا میرے بعد
ان دنوں زور ہے تبلیغی جماعت کا بہت
کوئی پوچھے گا نہ تجھ کو بخدا میرے بعد
اس بڑھاپے میں ہے کیوں ترکِ تعلق پہ بضد
عشق فرمائیں گے کیا تیرے چچا میرے بعد
ہاں میں ہاں اُن کی ملایا جو کرے اے ناظمؔ!
اُن کو ایسا کوئی نہ ملے گا چمچا میرے بعد

-o- -o- -o-

بد ان کے ہاتھ میں پیپر دکھائی دیتا ہے
یہ خاکسار کا لیٹر دکھائی دیتا ہے
ہزار تم کرو تعریف پھر بھی مولنا
تمہارا چھوکرا لوفر دکھائی دیتا ہے
یہ جامہ زیبی تمہاری، ارے معاذ اللہ
تمہارا جسم تو کلینر دکھائی دیتا ہے
ملے گا "پدم شری" کا خطاب ناظم کو
یہ "اے گریڈ" کا جوکر دکھائی دیتا ہے

٭ ٭ ٭

چل کہیں بھاگ چلیں

اے مرے خوابوں کی ملکہ، اے مری جانِ غزل
چل کہیں بھاگ چلیں

شہر میں کرفیو نافذ ہے بہت اچھا ہے
گولڈن چانس ہے سناٹا ہی سناٹا ہے
بائی گاڈ اپنے لیے یہ تو ہوا ہے سگنل
چل کہیں بھاگ چلیں

خون کے پیاسے نظر آتے ہیں تیرے بھیا
موڈ بھی بگڑا ہوا ہے ترے باواجی کا
ہاتھ میں لاٹھی لیے پھرتے ہیں ترے انکل
چل کہیں بھاگ چلیں

نیری قسم کے ہوتے ہیں یہ پنڈت مُلّا
عشق فرمانے نہ دیں گے ہمیں کُھلّم کُھلّا
جب تلک ہم ہیں یہاں کرتے رہیں گے دھاندلی
چل کہیں بھاگ چلیں

قرب ہو سکتا ہے حاصل بڑی آسانی سے
مشورہ کرنا ہے جُمّن سے نہ رمضانی سے
مان لے کہنا مرا آج ہی پاؤں پیدل
چل کہیں بھاگ چلیں

اِلتجا

کب یہ کہتا ہوں کہ کُرسیِ صدارت دیجیے
صرف دو شعر سُنانے کی اجازت دیجیے

سینکڑوں میل کی دوری پہ ہے میرا گاؤں
چل کے آیا ہوں بہ مشکل یہاں پاؤں پاؤں
دھوپ ہی دھوپ ملی ہے ذرا کر دو چھاؤں
جیب خالی ہے مری پھر بھی نہ اُجرت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

ٹھیک سے ملتا نہیں وقت پہ کھانا پھر بھی
سر چھپانے کو نہیں کوئی ٹھکانا پھر بھی
قابلِ رحم ہے میرا یہاں آنا پھر بھی
بائی گاڈ آپ مجھے کوئی خِلعت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

اوپننگ چاہیں تو مجھ سے بھی کرا سکتے ہیں
شاعروں کے لیے ماحول بنا سکتے ہیں
میرے جیسے کو باآسانی کھپا سکتے ہیں
دیجیے شوق سے ناچیز کو دعوت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

فلمی دھن میں بھی غزل اپنی سنا سکتا ہوں
اور قوالوں کے لہجے میں بھی گا سکتا ہوں
ایک ہی تان میں اس چھت کو اُڑا سکتا ہوں
اس کلاکار کو اِک موقع تو حضرت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

اے "ڈویژن" کے نظر آتے ہیں فنکار یہاں
ایک سے ایک سنائیں گے جو اشعار یہاں
کچھ تو کر دیجیے ناظم کا بھی پرچار یہاں
ہُوٹ ہو جاؤں گا اس کی نہ ضمانت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

دیسے کے خط.....

—— (مُراسلے) ——

* یہ جانکاہ اطلاع آپ تک پہنچاتے ہوئے دل بیٹھا جا رہا ہے کہ برادرم ناظم انصاری ناگپوری نے جو کہ دہلی مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ۲۴ر اگست ۸۵ء کو واپس ہوتے وقت جھانسی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ٹرین میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ جہاں سے ان کا جسدِ خاکی ۲۵ر اگست ۸۵ء کو ذریعہ ٹرین ناگپور لایا گیا اور اسی شب ۱۲ بجے انہیں مومن پورہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۴ سال تھی۔ اپنے پیچھے اہلیہ، چھ بچے اور ایک بچی چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے دیوان کا نام "کوبھی کے پھول" ہے۔

ماہنامہ شگوفہ کے خریدار، ناظم انصاری کے معتقدین و اہلِ ادب سے درخواست فرما دیں کہ ان کی مغفرت کی دعا فرمائیں

محمد حنیف۔ ناگپور
(برادرِ کلاں ناظم انصاری)

* گرامی قدر جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔ مزاحیہ ادب کا ترجمان "شگوفہ" بابت ماہ اگست ۸۵ء موصول ہوا۔ رسالہ ارسال کرنے نیز اس میں کلام بھی شاملِ اشاعت کرنے کیلئے شکریہ قبول فرمائیے۔

رسالے کا مواد پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ شگوفے میں پھکڑپن اور ابتذال کے کانٹے نہیں بلکہ اعلیٰ معیاری ادبی تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے۔ خدا کرے کہ آپ اور آپ کے احباب یوں ہی اُردو کے مزاحیہ ادب کے فروغ کے سلسلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہیں

نیاز سواتی
ایبٹ آباد۔ پاکستان

* پچھلے ہفتے سے مزاح نمبر زیرِ مطالعہ ہے اور آج ختم کر دیا۔ سب سے پہلے مہمان مدیر جناب یوسف ناظم اور میزبان مدیر یعنی آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عصری مزاح سے متعلق جو معلومات فراہم کیں اس کے ایک ایک مضمون سے آپ کی محنت اور آپ کا خلوص جھلکتا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن کا مضمون بے حد مختصر، یکطرفہ اور مزاح نگاروں کے لئے حوصلہ شکن ہے، جب کہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون مدلل مفصل اور اپنی تازگی لئے ہوئے ہے۔ یہ انہیں کا دم خم ہے کہ اتنا طویل اور مبسوط مضمون مزاح کے لئے لکھا۔ اچھا ہوتا آپ اردو مزاح پر ایک دو اور تنقیدی مضامین شامل کرتے تاکہ اُردو طنز و مزاح کا بھرپور احاطہ ہوتا۔

عصرِ حاضر کے معتبر اُردو مزاح نگاروں کے حصہ میں کم از کم دو مضامین بھرتی کے ہیں۔ بہتر ہوتا آپ اس انتخاب میں غیر جانبداری سے کام لیتے۔

دو ایک ضمنی چیزوں کے ماسوا ہندوستانی مزاح نمبر اس صنف پر ایک ایسا تاریخی دستاویز ہے جو ناقدین، محققین، شارحین مزاح کے لئے بائیبل کا کام دے سکتا ہے۔ ایک بار پھر ہر دو حضرات کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

رؤف خوشتر۔ بیدر

* محترم و مشفق جناب مصطفیٰ صاحب!

جولائی کا شمارہ ملا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ چٹپٹے ذوق کی سیرابی کے لئے مشکور ہوں۔ سارے ہی مقالے و غزلیں خوب سے خوب تر رہے۔ خصوصاً حیدر بیابانی اور جہانگیر انس کے مضامین مزہ دے گئے۔

بابو۔ آر۔ کے
اچل پور۔ مہاراشٹرا

* شگوفہ کا خصوصی شمارہ "ہندوستانی مزاح نمبر" ملا۔ کافی جاندار اور دل آویز ہے۔ نمبر کے تمام مشمولات بے حد پسند آئے۔ مبارکباد قبول کریں۔

مجیب الرحمٰن بزمی
رانچی۔ بہار

* *

No. 15822/68
Vol. 18 Copy 9
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H/HD 6
September 1985 Phone : 557716

شگوفہ
OCTOBER 1985
Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد (۱۸) ○ اکتوبر ۱۹۸۵ء ○ شمارہ (۱۰)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

○

★ قیمت فی پرچہ : چار روپے
★ زرِ سالانہ : ۳۵ روپے
★ بیرونِ ہند سے : ۱۲۵ روپے

○

★ کتابت : محمد عبدالرؤف
★ طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چار کمان، حیدرآباد :

○ خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ ہیلز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
○ فون آفس : ۵۵۷۶۱۶، رہائش : ۵۲۱۳۳۴

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مرا شہر لوگاں سوں ..... (شہر حیدرآباد)

اٹھاون، پچپن اور تیس تینتیس ——— عابد معز ——— ۷

قاضی جی دبلے (رپورتاژ)

ایک سفر ہیومراولمپکس کے لیے ——— عطاءالحق قاسمی ۲۸

مالِ مفت (انشائیے)

چشم مستعار ——— رؤف خوشتر ۱۱

ادب نواز مرغیاں ——— صغیر احمد سندیلوی ۱۵

زلف سے ہم زلف تک ——— جاوید لطیفی ۲۱

میں بیوی اور وہ ——— جہانگیر انس ۲۵

تاریخ رشوت ستانی ——— کاشی ناتھ ۳۲

سندیلہ کے لڈو ——— غافل انصاری ۳۷

حق تو یہ ہے کہ . . . (ترجمہ)

ریہرسل ——— اوم پرکاش آدتیہ / بانو سرتاج ۴۰

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

زبان ——— سلیم آغا قزلباش ۴۷

افسانچے

دھجیاں ——— عابدہ محبوب ——— ۵۱

بیکلانا ہے سخن ——— حافظ عاشق عزگازی ۵۲

بال کی کھال (تبصرہ)

قطب مینار ——— محبوب راہی ——— ۵۵

پھُوَرن (منظومات)

زیڈ زبیری ۱۴ نسیم سحر ۱۲ پاگل عادل آبادی ۲۰
اقبال ہاشمی ۲۴ رونق لال ۲۲ لقب عمران ——— ۲۹
کمال الدین ——— ۳۱ بانغ بہاری ۳۶ ——— ۳۶

دے کے خط . . . مراسلے ——— ۵۷

ماہنامہ شگوفہ کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر ——————— یوسف ناظم

○ ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں۔

گنگادھر گاڈگل (مراٹھی)، کل کی (ٹامل)، ولوز بھٹ اور کرشن بہاری لال مہتا (گجراتی)، فتور آنند (اُڑیا)، راوی کوتڑل راؤ (تلگو) بیچی (کنڑا)، ایپا پانی کر (ملیالم) نارائن گنگو پادھیائے (بنگلہ)، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری)، شرن لیدن شرما (راجستھانی) شرد جوشی (ہندی)، رتی لال شاہین (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم۔!

○ ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ۔

وے دیش ٹھاکر (ہندی)، ہمانیش گوسوامی (بنگالی) عزیز تمنائی (ٹامل) این وی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ (تلگو) شیام سندر مصرا (اُڑیا)، ڈاکٹر سکینا جوہری (گجراتی) حمید الماس (کنڑی) ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی) ڈاکٹر اعجاز علی مدد (مرہٹی) پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم) کرت یابانی (سندھی) ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی) ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی) اور بشیر عارف (کشمیری)

○ اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ :۔ ظ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم

○ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ :۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، عمیق حنفی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مناظر عاشق ہرگانوی اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء ○ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم احمد جمال پاشاہ، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پروفیسر بدیع اللہ مہدی کے مضامین اور خود نوشت سوانح ○ ڈاکٹر عبدالمغنی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیے گئے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے انٹرویو مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی ○ تخلیق کاروں کی تصویریں اور دوسری کئی دلچسپیاں!

○ خوبصورت دورنگی سرورق ——— سعادت علی خاں

○ ضخامت : ۳۸٦ صفحات ○ قیمت : ۵۰ روپے

○ سالانہ خریداروں سے ۲۰ روپے ۵ روپے ناداری لے کر پرچہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوایا جائے گا۔

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

اٹھاون، پچپن اور تیس تینتیس

ہندسوں اور صفر کی ایجاد کے بعد سے انسان علم رمل میں الجھا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر کو اعداد کے ذریعہ کبھی سلجھاتا تو کبھی الجھاتا ہے۔ ہم میٹرک میں بارہ مرتبہ اس لیے فیل ہوئے کہ ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل جفت عدد نکلتا تھا۔ تیرھویں مرتبہ ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل طاق عدد تھا لیکن تیرھویں مرتبہ امتحان لکھنے کی پاداش میں فیل ہوئے چودھویں مرتبہ ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل طاق عدد نکلتا تھا اسی لیے رعایتی نشانات سے پاس ہوئے۔ ہمارے ایک ساتھی صرف اسی بس میں سفر کرتے ہیں جس کے نمبر کا حاصل طاق عدد نکلتا ہے۔ ان کی دانست میں اس طرح سے وہ حادثات سے بچ رہتے ہیں۔ علم رمل میں گرفتاری اور پریشانی کی یہ دو انفرادی مثالیں ہیں۔ ہمارے شہر میں پچھلے تین سال سے ملازمین سرکار اجتماعی طور پر ہندسوں کے چکر کا شکار ہوئے ہیں۔

ایک دن قانون نافذ ہوا جس کی رو سے ملازمین کی وظیفہ پر سبکدوشی کی عمر جفت عدد اٹھاون سال سے طاق عدد پچپن سال کردی گئی۔ کہا گیا کہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو ختم کرنے کی سمت ایک اہم قدم ہے۔ آناً فاناً زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ لینے والے ملازمین کو ریٹائر کر دیا گیا۔ کم عمر ملازمین کو ترقی کا موقع ملا وہ خوش ہوئے نوجوانوں کو سبز باغ دکھلائے گئے۔ نوجوان خواب سجانے لگے کہ اب انھیں نوکری اور عہدے چھوکری ملے گی۔ یہ تاثر بھی ملا کہ پچپن سال کے بعد لوگ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں جولانی باقی نہیں رہتی۔ کام کرنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔ دفاتر کی بہتر کارکردگی کے لیے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ ایک طرح سے GENERATION GAP کو گہرا کیا گیا۔ نوجوان اپنے بزرگوں کو شاندار مستقبل کی راہ میں حائل سمجھے لگے اور جناب و حضرات ریٹائر ہونے اُنھیں کچھ سجھائی نہ دیتا۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ایک دوست کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا تھا "آپ ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں، زندگی سے سنیاس نہیں لیا ہے!"

انسانی عمر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ زندگی کی شروعات بچپن سے ہوتی ہے۔ جوانی کی ابتداء کی طرح نشانیاں ہوتی ہیں لیکن پتہ نہیں چلتا کہ بڑھاپا کب آتا ہے۔ بعض اشخاص کے نزدیک بڑھاپا

ایک احساس ہے۔ جب آپ محسوس کریں تب سے آپ بوڑھے ہو گئے۔ ایسے لوگ موت تک جوان رہتے ہیں۔ بعض طبعی نشانیوں کو بوڑھاپے کی آمد سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بال سفید ہونا، بال گرنے لگنا، چہرے پر جھریاں نمودار ہونا، کمزوری وغیرہ۔ نزلہ زکام سے جوانی میں بال گرنے اور سفید ہونے لگتے ہیں۔ تفکرات کی بدولت وقت سے پہلے چہرے پر جھریاں نمودار ہوتی ہیں اور کمزور تو جناب ہم بچپن سے ہیں۔ ان امور کو دیکھتے ہوئے ہماری دانست میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بوڑھاپا شروع ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی مصروفیت نہیں رہتی، کہیں آنا اور نہ کہیں جانا رہتا ہے، اپنے آپ کو تر و تازہ بنا کر رکھنے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ کمر خود بخود جھک جاتی ہے۔ اعضاء جواب دینے لگتے ہیں۔ طبیعت عبادت کی طرف مائل ہوتی ہے صبح سے شام تک گھر پر پڑے پڑے خبریں سننا، اخبار پڑھنا اور اپنے جیسے دوسرے ریٹائرڈ اصحاب سے بحث و مباحثہ کرنا گھر کے وہ کام کاج بھی انجام دینے پڑتے ہیں جو دوران ملازمت مصروفیت کی وجہ سے نظر انداز کر دیئے جاتے تھے۔ راشن لانا پڑتا ہے، کرنٹ اور نل کا بل داخل کرنا پڑتا ہے، بچوں کو اسکول لے جانا اور لانا پڑتا ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے بوڑھاپا اور ریٹائرمنٹ کھوٹے سکے کے دو رُخ ہیں۔ اب جب قانون کی مدد سے ملازمین کو اٹھاون کے بجائے پچپن سال کی عمر میں سبکدوش کر دیا گیا ہے تو گویا بوڑھاپا تین سال قبل عود کر آیا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہوا۔ زندگی کی نعمتوں سے محروم کر کے بڑھاپے کی رحمتوں سے آشنا کیا گیا۔ بوڑھاپے اور غلطیوں کا اعتراف کرنے کے لیے ہمت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چند ایک ملازمین سے یہ ظلم برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے ریٹائر ہوتے ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔

ملازمین کی زندگی محدود آمدنی اور وسائل کے چوکھٹے میں سوچ سمجھ کر پلاننگ کے ساتھ دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی کہ اس فیصلہ سے زندگی جیسے ٹھہر گئی۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا مکان کے اقساط باندھنا ہے، ٹی وی کی بھی چند قسطیں واجب الادا ہیں۔ بچوں کی فیس دینی ہے۔ وظیفہ سے یہ رقم ادا کرنے کے بعد کھانے کے لیے ہوا باقی رہے گی۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہم ملازمت کی دھاک پر جملہ ضروریاتِ زندگی ماہانہ آسان اقساط پر خریدا کرتے ہیں۔ ویسے ایک ملازم کی زندگی خود اقساط میں گزرتی ہے۔ مہنگائی الاونس قسطوں میں بڑھتا ہے۔ سالانہ قسط وار تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے ریٹائرمنٹ کے وقت حاصل ہونے والی رقم کو ملازم قسط وار جمع کرواتا ہے۔ ملازم اپنی زندگی میں صرف قرض یکمشت حاصل کرتا ہے جسے وہ قسط وار ادا کرتا ہے۔ ملازمت میں تجارت کی طرح دن دوگنی رات چوگنی ترقی کا امکان نہیں رہتا۔ اب اس فیصلہ سے تمام مسائل یکمشت گلے پر آن پڑے ہیں قرض خواہ پہلی تاریخ کا خیال کیے بغیر گھر کے چکر کاٹنے لگے۔!

سرکاری ملازمین کو چند فائدے حاصل ہیں۔ جنھیں ملازمین اس فیصلہ کے تحت مقررہ مدت سے تین سال قبل ہی محروم ہو گئے گزیٹیڈ ملازمین کی دستخط کا دم خم تین سال پہلے ختم ہوا۔ سرکاری ملازمین کی ضمانت مسلمہ ہے ضمانت دینے کے حق سے بھی ملازمین تین سال پہلے محروم ہوئے سماج میں سرکاری ملازم کی حیثیت سے جو اثر و رسوخ تھا وہ بھی تین سال قبل زائل ہوا۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جن کی لڑکی کا رشتہ والد کے قبل از قبل ریٹائر ہونے پر توڑ دیا گیا۔ دولہا والوں کو خوف تھا کہ ریٹائرڈ ملازم اس آن اور شان سے شادی نہ کر سکے گا اور نہ ہی داماد کی خاطر خواہ میزبانی کر سکے گا۔

وظیفہ کی عمر میں کمی کی وجہ سے کئی آسامیاں خالی ہوئیں۔ کچھ لوگوں کو ترقی ملی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک صاحب

نے اپنی ترقی کی خوشی میں دعوت کی ہر کسی سے خوشی خوشی کہتے "عمر تمام کلرکی کرتا رہا۔ ناظر اعلیٰ بننے کا ارمان لیے شاید ریٹائر ہو جاتا۔ بھلا ہو اس فیصلہ کا جس نے ترقی کی راہیں کھول دیں" نوجوان پر اُمید تھے کہ انھیں ملازمت ملے گی وہ دفاتر کے چکر کاٹنے لگے۔ دفاتر میں کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ آیا رام اور گیا رام کہاوت صادق آنے لگی۔ کام کاج سے زائد جانے والوں کی وداعی پارٹیاں اور آنے والوں کے تہنیتی جلسے منعقد ہونے لگے۔ جس ملازم کو دیکھئے وہ اپنی عمر اور وظیفہ کی کامیاب لیے آئندہ کی پلاننگ کے لیے اعداد و شمار جمع کرتا نظر آتا۔ ایسے وقت ہم ایک دفتر گئے۔ وہاں صرف چپراسی موجود تھا اس نے بتلایا بڑے صاحب پچپن پر ریٹائر ہوئے۔ چھوٹے صاحب کا ترقی ملنے کے بعد تبادلہ ہوا۔ بڑے بابو تین ماہ بعد پچپن سال کے ہوں گے وہ وظیفہ کی کارروائی کے لیے گئے ہیں۔ چھوٹے بابو خالی آسامی پر اپنے سالے کے لیے کوشش کر رہے ہیں کچھ کام نہ ہونے کی وجہ سے ٹائپسٹ صاحب مارننگ شو دیکھنے گئے ہیں۔ چوں کہ میں دفتر کھولتا اور بند کرتا ہوں اس لیے موجود ہوں۔

ملازمین ابھی اس فیصلہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور بُری خبر عام ہونے لگی۔ کہ جس ملازم نے تیس یا تینتیس سال خدمت کی ہے اُسے بھی لازمی طور پر سبکدوش کر دیا جائے گا۔ ملازمین پھر سے علم رمل کا شکار ہوتے نظر آئے۔ جو ملازمین اٹھاون پچپن کی مار سے بچ رہے وہ تیس تینتیس کی چکر میں آ رہے تھے۔ ایسا محسوس ہونے لگا تیس تینتیس کے اعداد تابوت کی آخری کیل ثابت ہوں گے۔ دفاتر کے بہترے ملازمین ریٹائر ہو جائیں گے۔ چند نوجوان ملازمین بچ رہیں گے جن کی عمریں دفتر سے غائب ہو کر فلمیں دیکھنے اور عشق بگھارنے کی ہوں گی لیکن خدا کا فضل رہا کہ ایسا کوئی قانون بن نہیں پایا!

پچپن سال کی عمر پر سبکدوش کر دیئے جانے والے ملازمین کے وظیفہ کی کارروائیاں مختلف دفاتر کی چکر لگا رہی تھیں ترقی حاصل کرنے والے ملازمین خوشیاں منا رہے تھے اور بے روزگاروں کی جھولیاں بھری بھی نہ تھیں کہ اعداد و شمار میں تغیر آیا وظیفہ پر سبکدوشی کی عمر پچپن سال سے پھر اٹھاون سال کر دی گئی۔ اکثر ملازمین کو واپس خدمت پر لے لیا گیا۔ دفاتر میں افراتفری مچی۔ چند مہینے وظیفہ یاب زندگی گزارنے کے بعد پھر سے وہ ملازمین اپنی جگہ واپس ہوئے جہاں کوئی اور ترقی یا تبادلہ ہو کر آیا تھا۔ ایک کرسی کے دو حقدار ہوئے ایک میان میں دو تلواروں کی کیفیت ہو گئی۔ وظیفہ سے واپس ملازم جو لکھتا دوسرا اسے نفی کرتا۔ ماتحت پریشان کس کا حکم بجا لائیں۔ اس وقت مضحکہ خیز صورتحال صرف دفاتر ہی میں نہیں ہمارے شہر کی سیاست کی بھی تھی۔ کرسی ایک تھی اور دعویدار دو!

سبکدوش ملازمین میں سے چند ایسے بھی تھے جو رجوع بکار ہونے کے احکام کے باوجود رجوع نہیں ہوئے۔ مختلف وجوہات تھیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا "جب میں ریٹائر ہوا، میرے ساتھی مجھ سے پہلی مرتبہ ہمدردی سے پیش آئے ہر کسی نے [illegible] سر دیا بڑھ چڑھ کر چندہ اس لیے دیا کہ میری مدد ہو سکے۔ جمع شدہ چندے سے شاندار پارٹی اور قیمتی تحفہ دیا گیا۔ اب میں رجوع ہو کر خود شرمندہ اور دوسروں کو پژمُردہ کرنا نہیں چاہتا۔ ایک اور صاحب نے کہا "ریٹائر ہونے کے بعد میں نے ترکاری کی دکان کھولی ہے۔ تنخواہ سے زائد آمدنی ہو جاتی ہے"۔ اٹھاون سے پچپن اور پھر پچپن سے اٹھاون کے درمیان کچھ ایسے ملازمین بھی تھے جنھیں پچپن پر سبکدوش

ر لنے کے بعد پھر سے ملازمت پر بحال نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ سوچتے کاش ہم کچھ ماہ پہلے یا بعد پیدا ہوئے ہوتے لیکن یہ بات ایسی تھی جس پر ان کا کنٹرول نہیں۔ اسی لیے ان لوگوں نے انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھیں انصاف ملا۔ انھیں بھی واپس لینے یا پھر اس مدت کی تنخواہ ادا کرنے کا حکم صادر ہوا۔ ملازمین کے نصیب جاگے۔ حکم عدالت لاٹری سے کم نہ تھا۔ یقین آیا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

پیالی میں طوفان جو پچپن، اٹھاون اور تیس تینتیس کی وجہ سے اٹھا تھا اب ختم ہو چکا ہے۔ لوگ صدمے اٹھائے، پریشان ہوئے اور آخر میں اطمینان کا سانس لیا۔ ہم نے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کو ایسے پیشے سے وابستہ کریں گے جس میں عمر کی قید نہ ہو۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہمیں دو میدان ایسے نظر آئے جہاں عمر کی قید نہیں ہے۔ ایک اداکاری اور دوسرا سیاست۔ اداکاری آپ بچپن سے کر سکتے ہیں۔ جوانی میں بوڑھاپے اور بوڑھاپے میں جوانی کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ اداکار اگر مرد ہو تو پھر کیا کہنا۔ محبوبہ کا رول ادا کرنے والی اداکارہ ماں کا رول بھی ادا کرتی ہے۔ ساٹھ سال کا ہیرو سولہ سالہ لڑکے کی اداکاری کرتا اور داد پاتا ہے۔ "بڑھاپے میں جوانی" کے باوجود اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میں دم خم باقی نہیں ہے ڈھول کی تھاپ پر ناچ نہیں سکتے تو سیاست میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جہاں انگلیوں پر دوسروں کو نچا سکتے ہیں۔ سیاست سے ویسے تو عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ وابستہ رہتے ہیں لیکن آج اس میں نئے خون کی شدید ضرورت ہے۔ اسی لیے ہم نے اپنے لڑکے کو جو کنڈرگارٹن میں پڑھتا ہے تاکید کی ہے کہ وہ کلاس کا مانیٹر بنے اور ہر ڈرامہ میں حصہ لے — تاکہ اس کا مستقبل درخشاں ہو۔!!

رؤف خوشتر
(بیدر)

پیشِ مستعار

ماہرِ معاشیات، بسا اوقات، اشرف المخلوقات کو صاحبِ وسائل و صاحبِ مسائل میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کی ایک عام پہچان یہ بتلاتے ہیں کہ اول الذکر مرض اور آخر الذکر قرض میں جکڑے رہتے ہیں۔

ہمارا شمار چوں کہ متوسط طبقہ سے ہے۔ اس لیے ہماری زندگی قرض و مرض دونوں سے عبارت ہے۔ اب تنہائی ہو یا توانائی ہر چیز مستعار ہے۔ زر سے لے کر بلت سبھی قلت کے شکار ہیں۔ لوگ نہ جانے کیا کیا مانگ کر گزر بسر کرتے ہیں۔

ہم اب تک شعر و ادب میں مانگے کا اُجالا، چاند کا ہالا جیسی اصطلاحیں سنتے آئے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ ایسے بھی دن دیکھنے نصیب ہوں گے ٹھہریئے ساری مصیبت تو اسی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اب آپ سے چشم پوشی اچھی نہیں لگتی۔ ہوا یوں کہ ہر روز ابنِ صفی کے ناول پڑھنے اور ہر جمعہ پابندی سے نئی فلم دیکھنے پر ہماری جیب سے پہلے آنکھوں نے جواب دیا اور آنکھیں ہماری آپ کی گلیوں کی طرح ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

یوم الدولہ نے کہا

"اب آئی بینک کھل گئے ہیں۔ جہاں آپ بے نور رنگ کی آنکھوں کے بدلے پُر نور آنکھیں لگوا سکتے ہیں۔ یعنی "اوہ لے گئے بازار سے گر ٹوٹ گئیں" والا معاملہ ہے۔ اب آپ زر سے نظر خرید سکتے ہیں۔

ہم نے کہا

"اندھے کے لیے بندے کو بہت دور کی سوجھی، مجھے تو تمہاری باتوں میں اُمید کی کرن نظر آرہی ہے چلو چلتے ہیں"۔

الغرض ہم یوم الدولہ کی معیت میں لڑکھڑاتے ہوئے آئی بینک کی طرف چل پڑے معیت میں ہمارے قدم ڈگمگاتے زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔ خیر آئی بینک پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو ٹٹول ٹٹول کر مصافحہ کرنے میں بالآخر کامیاب ہوئے کہ جھٹ انہوں نے ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہاتھ دینے میں ماہر ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ لے اصل مقصد پوچھا۔

"اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ مانگے کا اُجالا چاہتا ہوں۔ ماں باپ یوں ہی چاند سا بیٹا نہیں کہتے تھے۔ چاند بھی تو

روشنی کے لیے محتاجِ خورشید ہے۔ مجھے چشمِ ستارہ بھی ادھار چاہیئے۔"
ڈاکٹر گویا ہوئے۔
"باتوں سے لگتا ہے کہ آپ صرف آنکھوں کے اندھے ہیں۔ ورنہ لوگوں کی آنکھوں پر نقل کا پردہ پڑ گیا ہے۔
بوم الدولہ ٹپک پڑے
"اماں ڈاکٹر صاحب عقل پر پردہ پڑنے کی بات تو سُنی تھی یہ نقل کا پردہ کیا جلوہ دکھارہا ہے کچھ تو بتلائیے؟"
"اب دیکھیے کہ اپنی اپنی خاصی آنکھیں بدلنا چاہتے ہیں۔ شاید دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر اوب گئے ہیں۔ اور اب دوسروں کی آنکھوں سے کائنات کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔
"یوں بھی دوسروں کے سجن اور نین اچھے لگتے ہیں" بوم الدولہ نے پٹاخہ چھوڑا۔
"اب ہم دوسروں کی نظر سے اپنا نقطۂ نظر بدل رہے ہیں۔ اسم بمسمیٰ چشم انسان ہر بات کو بدلنا چاہتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔
بوم الدولہ نے لقمہ دیا۔
"لیکن اِن کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے آنکھیں نہیں بدل رہے ہیں۔"
خیر یہ بتلائیے کہ آپ کو کس قسم کی آنکھیں چاہیئے۔"
"کس قسم کا سے آپ کا کیا مطلب ہے" ہم نے مجسم سوال ہو کر پوچھا۔
ڈاکٹر بولے
"دیکھیے ہمارے پاس ہر قسم کی آنکھیں ملتی ہیں۔ مثلاً پتھرائی ہوئی۔ شرماتی ہوئی۔ گھبرائی، آنسو بھرآئی، یا بولتی، ڈولتی، تولتی نشہ گھولتی، سارے راز کھولتی یا پھر کترانے والی، ٹکرانے والی، شرمانے والی، شعلہ برسانے والی وغیرہ وغیرہ۔ ان ساری آنکھوں کی حرکات وصفات کے اعتبار سے دام الگ الگ ہیں۔
بوم الدولہ نے پوچھا
"کس قسم کی آنکھوں کی مانگ زیادہ ہے؟"
"طالب چشم، طوطا چشم صفت یا کترانے والی آنکھوں کی پیوندکاری چاہتے ہیں۔ اس لیے مانگ کے حساب سے میں نے ان کے دام زیادہ لگائے ہیں۔
"اور سب سے کم دام کس قسم کی آنکھوں کے ہیں" ہم نے پوچھا۔
"سب سے کم دام شرماتے والی باحیا آنکھوں کے ہیں۔ آپ کو راز کی بات بتلاؤں تاکہ آپ کی تیسری آنکھ تو کھل جائے۔ پچھلے دنوں وزیر موصوف تشریف لائے تھے۔ وہ ہر احساس سے عاری اور نیند سے بھاری آنکھیں مانگ رہے تھے۔ وزیر بننے کے بعد ان کی اور یجنل آنکھیں یعنی عطیۂ چشم باری انھیں پریشان کر رہی تھیں یعنی ووٹروں کو پہچان رہی تھیں۔ یہی نہیں بقول عزیز غریبوں اور بے بسوں کے حال پر آنسو بہاتی تھیں۔ اب ایسی بے وفا اور غیر سیاسی آنکھیں اُن کے کس کام کی؟ ہمارے یہاں سے آنکھیں بدلوا کر اب وہ مزے میں ہیں۔ وہ نہ ووٹروں کو پہچانتی ہیں نہ آنسو بہاتی ہیں، بلکہ عام کو بہکاتی ہیں ــــ"

"کن آنکھوں کی پیوند کاری کی گئی" بوم الدولہ پھر بولے۔

"میں نے ان کو ایک مشہور و مرحوم اداکار کی آنکھیں لگوائیں جو پل پل اپنا جذبہ بدلتی تھیں۔"

خیر صاحب یہ ہوئیں بڑوں کی بڑی بڑی آنکھیں برامطلب ہے باتیں۔ اب لوگ نہ جانے کیوں دوسروں کے دکھ درد میں رونے والی آنکھوں کے لیے نہیں پوچھتے؟

"کیا آپ آئی بینک میں شاعروں اور ادیبوں کی آنکھیں رکھتے ہیں؟"

"ارے نہیں صاحب میں فنکاروں کی آنکھیں آئی بینک میں نہیں رکھتا۔ اُن آنکھوں کی کوئی مانگ نہیں کوئی خریدار نہیں۔ کیوں کہ اُن آنکھوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ "سارے جہاں کا درد ہماری نظر میں ہے" عام آدمی اتنے آنسو کہاں سے لائے جو ایسی حساس آنکھیں لگوائے۔

مختلف پیشوں اور طبقوں سے وابستہ افراد آنکھوں کے انتخاب میں بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم جیسے جہاں دیدہ جو قیامت کی نظر رکھتے ہیں ان کی پسند کو تاڑ جاتے ہیں اور وہ آنکھوں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" کہکر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

مثلاً سوشیل ورکر چوروں کی، چور سادھوؤں کی، سادھو انشورنس ایجنٹوں کی، ایجنٹ اداکاروں کی اور اداکار وزیروں کی آنکھیں لگوانا چاہتے ہیں تاکہ دوسروں کو اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرلیں جسے وہ بھی اُلّو ہی کہتے ہیں۔

اب تو صاحب لوگوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے۔ نوجوان والدین سے، بیویاں شوہروں سے، طلباء اساتذہ سے ماتحتین حکام سے ٹکرانے والی آنکھیں مانگتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے اتنی بصیرت افروز باتیں سُن کر ہمارے دل پر آنکھوں کی طرح اندھیرا چھا گیا۔

ہم بوم الدولہ کا ہاتھ تھامے نکل پڑے۔ ڈاکٹر صاحب نے نامراد جانے کی وجہ پوچھی۔

ہم نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، ایسے مانگے کا اُجالا کس کام کا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ ہماری آنکھیں بے نور و رنگ رہیں۔ تاکہ اس بے حس دنیا کو نہ دیکھ سکیں۔ بندہ اندھا ہی رہے گا۔"

□□

بیتاب زبیری

ڈاکٹر عابد معز کے نام — ایک خط

ڈاکٹر صاحب! عرض اتنی ہے
سردی اتنی ہے، دھوپ جتنی ہے
کچھ نزلہ حرارہ ہو گیا ہے
ہلکا سا بخار ہو گیا ہے
جس نے یہ عجیب دل لگی کی
"جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی"
نکلی ہے نتیجتاً یہ صورت
دو روز سے بند ہے "ضرورت"

—○—

مرض آلود ہے فضا، اتنی
پھر گئی آتے آتے یاد اس کی
اتنی کمزوری ہے کہ اٹھ اٹھ کر
آہِ زیرِ لبی کے کاندھے پر
ہاتھ رکھ کر، کھڑا رہا شب بھر
نہیں لیٹا اٹھا رہا شب بھر
آپ پوچھیں گے ضعف میں اتنے
کس طرح رات بھر کھڑے کے کھڑے
تم رہے ہو، تو میں یہ عرض کروں
خیر! بہتر یہی ہے چپ سادھوں

—○—

نتھنوں سے رواں ہیں دجلہ و نیل
فرمائیں علاج میں جو تعجیل
بندے کو سکون و چین مل جائے
آرام کی ایک رین مل جائے

نسیم سحر
(جدہ)

غزل

مُہرے سے اپنے جب میں سبکدوش ہو گیا
احباب کی لغت میں فراموش ہو گیا
ظرف اس قدر تھا شیخ کا، کل میکدے میں وہ
داخل ابھی ہوا تھا کہ مدہوش ہو گیا
سنجیدگی کا جس نے لبادہ پہن لیا
گویا وہ زندگی میں کفن پوش ہو گیا
واعظ کے لیکچروں کا ہوا یہ اثر کہ میں
پہلے سے بھی زیادہ بلا نوش ہو گیا
کمزوریٔ نظر نے لطیفہ عجب کیا
جا کر رقیب سے میں ہم آغوش ہو گیا
مجنوں، جو سر میں خاک بکھیرے پھرا بہت
لیلیٰ سے لفٹ ملتے ہی خوش پوش ہو گیا
دفتر میں دبدبہ تھا بہت باس کا۔ مگر
یہ شیر گھر میں گھستے ہی خرگوش ہو گیا
دل کیا انھیں دیا کہ وہ سر پہ ہی چڑھ گئے
بس عشق کرتے کرتے میں پاپوش ہو گیا
اپنے کفن کو پھاڑ کے بھی بولتا تھا قیس
اک میں کہ زندگی ہی میں خاموش ہو گیا

صغیر احمد سحر سندیلوی

ادب نواز مُرغیاں

جس طرح قاضی کے گھر کے چوہے اور مولوی کے گھر کے بچے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں اسی طرح ادیب کے گھر کی مُرغیاں بھی اول درجہ کی ادب نواز ہوتی ہیں مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف اس وقت ہوا جب میرے مکان کے قریب ایک ادیب رہائش پذیر ہوئے حسنِ اتفاق سے وہ ادیب بھی تھے اور مرغی پالنے کے شوقین بھی۔ اب یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ادیب زیادہ تھے یا مرغی پالنے کے شوقین شکل وصورت کے اعتبار سے ادیب زیادہ معلوم ہوتے تھے لیکن عادات اطوار کے لحاظ سے کسی مرغی خانے کے منیجر لگتے تھے۔ خیر مجھے اس سے کیا کہ وہ ادیب ہیں یا مرغی خانے کے منیجر لیکن میں ان کے ادب اور مرغیوں سے تنگ ضرور تھا اب یہ دوسری بات ہے کہ میں ان کے ادب سے اس قدر پریشان نہ تھا جتنا ان کی مُرغیوں سے۔ چوں کہ یہ مُرغیاں ایک ادیب کے گھر کی تھیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ ادب نواز تھیں اور چوں کہ یہ مرغیاں ادب نوازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں اس لیے حضرت ادیب کو عزیز از جان تھیں گویا ادب اور مرغیاں لازم و ملزوم تھیں۔ مجھے اس مرغی نواز ادیب نے بتایا کہ مرغیوں ہی سے ادب پیدا ہوتا ہے مرغیوں اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے بہت سے دل کش اور دل میں اتر جانے والے محاورے انھیں مرغیوں کی بدولت ادب میں داخل ہوئے جیسے گھر کی مرغی دال برابر، دو ملاّؤں میں مرغی حرام، مرغے کی ایک ٹانگ، مرغی چور اور انگریزی میں بھی ہین پکڈ HEN - PECKED جیسے محاورے وغیرہ اور استعارے کے طور پر بھی چھوٹے مکانوں کو مرغی کا ڈربہ، کثرتِ اولاد کو مرغی کے بچے کہا جاتا ہے سُنا ہے کہ اردو کے ایک بڑے شاعر علامہ اقبال کو مرغیوں سے اس قدر عشق تھا کہ انھوں نے اپنے پہلے دیوان کا نام ہی بانگِ درا رکھا ہے یہ مرغیاں جتنی ادب نواز ہوتی ہیں بلیاں اتنی ہی ادب بیزار یہاں تک کہ وہ مرغیوں کی جانی دشمن ہوتی ہیں ادب نوازی اور ادب بیزاری کے ان دو فریقوں کی وجہ سے میرا مکان خصوصیت سے ایران وعراق کی جنگ کا میدان بنا رہتا ہے اور صرف میرے مکان ہی پر کیا موقوف ہے سارے کا سارا محلہ نہ ختم ہونے والی اس جنگ سے پریشان رہتا ہے۔!

ایک روز میں پڑوسی ادیب کے مکان کی طرف سے گزر رہا تھا وہ اپنی مرغیوں کو دانا ڈال رہے تھے اور زبان سے نہایت خوش الحانی کے ساتھ بہ صد ترنم تی تی ! تی تی کہے جا رہے تھے۔

"بھائی صاحب! کیا آپ اپنی مرغیوں کو علم العروض کا درس دے رہے ہیں" میں نے ازراہِ مذاق ان سے کہا۔

ارے یار! مرغیوں سے علم عروض کا کیا تعلق؟ شاعر جنھیں عروض پر پورا دسترس ہونا چاہیئے اس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے آج کل رسالوں میں مطبوعہ غزلیں اور نظمیں دیکھ لیجئے بیشتر اشعار ناموزوں ملیں گے انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

"آج کل کی جدید اور ترقی پسند شاعری میں اس لاحاصل فن کی کوئی ضرورت بھی تو باقی نہیں رہی موجودہ عہد کی "نثری نظم" کی ایجاد نے اتنے مشکل فن کو کس خوبی سے آسان بنا دیا۔۔۔"

وہ قطع کلام کرتے ہوئے ٹپ سے بول پڑے۔

"میں اس نثری نظم کو ڈسکو صنف سخن کہتا ہوں۔ اس ڈسکو شاعری نے تو ادب کا ستیاناس مار دیا یہ ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمایئے اور قربان جایئے اس نثری نظم کے اصطلاحی نام پر۔ میں کہتا ہوں نثری نظم کیا بلا ہوتی ہے جب یہ نہ نظم ہے نہ نثر تو پھر آخر یہ ہے کیا بلا؟ اس سے اچھا تھا کہ اس صنف سخن کا نام تیتر بیٹر رکھ دیتے سچ ہے جب دنیا کی کوئی چیز بھی ملاوٹ کے سخت قانون کے باوجود ملاوٹ سے محفوظ نہیں تو پھر ادب ملاوٹ سے کیوں پاک رہے"؟

وہ علم عروض پر تقریر جھاڑتے ہوئے ذرا سا سانس لینے کے لیے رُکے ہی تھے کہ میں نے کہا۔

"بھائی صاحب میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ ایک ادیب کے گھر کی مرغیاں علم عروض سے بے بہرہ نہیں ہونی چاہیئے"۔

وہ میری بات کاٹ کر جھٹ سے بولے

"ایک ادیب کے گھر کی مرغیاں ہونے کی حیثیت سے انھیں جتنا عروض جاننا چاہیئے وہ خوب جانتی ہیں اور اتنی اہلیت رکھتی ہیں کہ اگر کوئی دیوان یا رسالے میں کوئی شعر ناموزوں نظر آجائے تو وہ ایک ذمہ دار نقاد کی حیثیت سے اس کی بکّا بوٹی کرکے رکھ دیتی ہیں دیکھتے نہیں انھوں نے اس دیوان کی کیا درگت بنا ڈالی"

انھوں نے ایک کتاب جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھے دکھا کر کہا۔

"یہ آپ کا دیوان ہے کیا؟" میں نے اس کتاب کی حالت زار پر مرثیہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں! میرا دیوان ہوتا تو کوئی بات ہی نہ ہوتی یہ تو میرے استاد کا دیوان ہے۔ جو میں کل ان سے مانگ لایا تھا۔ اب ان مرغیوں کو کیا کہوں جہاں کوئی نئی کتاب لے آؤں یہ مجھ سے پہلے مطالعہ کے لیے اچک لے جاتی ہیں افسوس ہے ان مرغیوں نے میرے استاد پر بھی رحم نہیں کھایا۔ دراصل تنقید نگار کا قلم اور مرغیوں کی چونچ رکتی ہی نہیں۔ اب بتایئے میں استاد محترم کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" وہ تقریباً رو دینے کے انداز میں بولے۔

"اس میں افسوس کی کیا بات ہے میرا تو خیال تھا کہ اس دیوان پر اپنی ذی علم مرغیوں سے لگے ہاتھوں تبصرہ بھی کرا دیتے تو کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی"۔ میں نے انھیں رائے دی۔

"غضب کر دیا آپ نے بھی جب کتاب پر سرسری نظر ڈالنے میں تو اس کی یہ حالت بن گئی کہ وہ کتاب کم اور چیل گھونسلا زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ تبصرہ کرنے میں تو کتاب کی صورت ہی بگڑ جاتی" وہ تڑپ کر بولے۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کتاب کی اہمیت تو بڑھ جاتی" میں نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔

لیکن یہاں تو سوال یہ ہے کہ یہ بات میں استاد محترم کو کیسے سمجھاؤں گا وہ خود تو میری تخلیقات میں وہ قطع برید کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ لیکن استاد محترم کے کلام پر میں خود تو قلم لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا کیوں کہ سوئے ادب ہے لیکن میں

اپنی مرغیوں کو کیا کہوں کہ انھوں نے استاد محترم کے دیوان کی شان میں جو گستاخی فرمائی ہے اسے میری غیور طبیعت کب گوارا کر سکتی ہے اب انھیں یہ دیوان واپس کرنا مصلحت کے خلاف ہے" انھوں نے سعادت مندانہ انداز میں کہا "اچھا چھوڑیئے اس کتاب کو اور بتایئے کوئی نئی تخلیق ہوئی؟" میں نے موضوع بحث تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔

"میں آج کل "ادب میں مرغیوں کی اہمیت" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہا ہوں یہ موضوع بالکل اچھوتا ہے آج تک اس پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ سوچتا ہوں میں اس موضوع پر پی۔ ایچ ڈی کیوں نہ کرلوں کیوں کہ یہ مقالہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہوگا اور اردو ادب میں اس سے ایک بیش بہا اضافہ ہوگا" انھوں نے مجھے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

"بے شک! بے شک!! آپ کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا حق بھی پہنچتا ہے" میں نے داد دی

"آیئے میں آپ کو اپنے مقالے کی SYNOPSIS دکھاؤں" انھوں نے اپنا بیٹھکا کھولتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب اس وقت ذرا عجلت میں ہوں کبھی فرصت میں دیکھوں گا" میں نے ہڑبڑا کر کہا حالانکہ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سائنا پس دیکھ کر کیا کروں سائنا پس تو مجسم آپ کی ذات ہے۔

"آپ ایسی بھی کیا عجلت کہ کوئی کسی سے دو باتیں بھی نہ کر سکے آخر پڑوسی کا بھی تو کچھ حق ہوتا ہے"

انھوں نے دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے صاحب پڑوسی کا پورا پورا حق ہے لیکن اس وقت . . . . میرا جملہ ناتمام رہ گیا

"ارے چھوڑیئے ایک پیالی چائے پی لیجئے اس میں کتنا وقت لگتا ہے"

انھوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا انھوں نے ڈرائنگ روم سے اپنے ملازم گھسیٹے کو آواز دے کر کہا "بیگم صاحبہ سے کہو چائے اور اُبلے ہوئے انڈے بھجوائیں"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور میں ابھی ان کے ڈرائنگ روم کا جائزہ ہی لے رہا کہ انھوں نے ایک فائل اُٹھاتے ہوئے سکوت توڑا۔

"دیکھئے یہ ہے میرا شاہکار مقالہ یہ اپنی دلچسپی کے لحاظ سے ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا"

"اس میں شک ہی کیا ہے ایک تو آپ جیسے محقق کا قلم دوسرے اتنا انوکھا موضوع!" میں نے گویا ان کی ہاں میں ہاں ملادی

"اس مقالے میں پورے بارہ باب ہیں" انھوں نے فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

اس مقالے کو تفصیل سے سنانے کا نہ آپ کے پاس وقت ہے نہ موقع اس لیے آپ صرف عنوانات پر غور فرمایئے میں آپ کو اپنے مقالے کا مختصر خاکہ بتا رہا ہوں۔

پہلا باب:۔ مرغیوں کا ادبی کردار۔

دوسرا باب:۔ ادب سے مرغیوں کا رشتہ

تیسرا باب:۔ مرغیوں کی ادب نوازی پر اجمالی نظر۔

چوتھا باب:۔ ادب اور مرغیاں تاریخ کے آئینہ خانے میں۔

پانچواں باب:۔ عالمی ادب میں مرغیوں کی خدمات کا تفصیلی جائزہ۔

چھٹا باب :- اردو ادب میں مرغیوں کی خدمات کا صلہ۔
ساتواں باب :- مرغیاں اور اردو محاورہ سازی۔
آٹھواں باب :- اردو شاعری میں مرغ پرستی کا عنصر۔
نواں باب :- غالب اور مومن کی مرغ پروری کا تقابلی جائزہ۔
دسواں باب :- مرغیوں کی ادب نوازی کا دوسرے پرندوں درندوں اور چرندوں سے ادبی موازنہ
گیارھواں باب :- اردو ادب میں مرغیوں کی اہمیت۔
بارھواں باب :- مرغیوں کے علوم و فنون پر احسانات

اتنے میں ملازم چائے لے آیا۔
"لیجئے چائے پیجئے" انھوں نے مقالے سے توجہ ہٹا کر مجھ سے کہا۔
"آپ کے مقالے کا یہ مختصر خاکہ دیکھ کر میں آپ کی علمی تحقیق کا قائل ہوگیا" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
"کٹ کٹ کٹوں! کٹ کٹ کٹوں!! کٹ کٹ کٹوں!!!" میرے پشت سے آواز آئی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
"ارے صاحب میری بھوری چیل نے انڈا دے دیا گھسیٹے ابے او گھسیٹے بیگم صاحبہ کو مبارکباد دے دو ان کی بھوری چیل نے انڈا دے دیا" وہ خوشی سے اچھل پڑے اور لپک کر الماری کھول کر انڈا تلاش کرنے لگے
"یہ کتابوں کی الماری ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"جی ہاں! جی ہاں!! یہ کمبخت اپنی نانی کی طرح کتابوں کی الماری میں گھسی رہتی تھی میں جبھی سمجھ گیا تھا کہ اس کے انڈا دینے کے اب دن آگئے۔ آخر اپنی نانی کی اصلی نواسی ہے نا۔ اس کی نانی کے ادبی ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ کتابوں کی الماری ہی میں انڈا دیتی تھی بلکہ ایک مرتبہ اس نے اسی الماری میں بچے نکالنے کا بھی اہم فریضہ انجام دیا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ کتابوں کی الماری کے ادبی ماحول میں بچے نکالنے سے ان کے ذہن و افکار پر ادبیت کا عنصر غالب رہے گا بچپن کے خام اذہان پر جو اثرات مرتب ہو جاتے ہیں وہ تا عمر قائم رہتے ہیں یہ بھوری چیل اسی کی نسل سے ہے جبھی تو اس نے اپنی نسلی وضعداری کا لحاظ کرتے ہوئے کتابوں کی اسی الماری میں پہلا انڈا دیا جس میں اس کی نانی نے دیا تھا۔ ماحول کا بچوں پر بڑا اثر پڑتا ہے صاحب! ہمارے گھر کی بکریاں تک بڑی ادب پرست واقع ہوئی ہیں اب وہ مرغیوں کی طرح سے کتابوں کی الماری میں بچے تو نہیں جن سکتیں اور نہ ہی ان کی طرح الماریوں میں بیٹھ کر جانفشانی سے حاصل کی ہوئی قیمتی کتابوں کا عرق ریزی سے مطالعہ کر سکتی ہیں لیکن وہ برابر اسی تاک میں رہتی ہیں کہ کب میری نظر چوکے اور کب وہ الماری یا میز پر رکھی ہوئی نئی کتابیں منہ میں دبا کر بھاگ کھڑی ہوں اور پھر کسی گوشے میں کھڑے ہو کر بڑے سکون سے اس کا مطالعہ کریں" انھوں نے فلاسفی بگھارنا شروع کر دیا۔
"لیکن بھائی صاحب ایک بات ضرور ہے کہ یہ مرغیاں اور بکریاں کم از کم ایک ادیب کے گھر پیدا ہوتے اور پرورش پانے کی لاج تو رکھ لیتی ہیں لیکن ادیب کے خود اپنے بچے ادبی مشغلہ اختیار کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں اور وہ انجینئر ڈاکٹر بننے کو علم و فضل پر ترجیح دیتے ہیں خود ادیب بھی اپنے بچوں کو شاعر یا ادیب بنانے سے پرہیز کرتے ہیں"۔
میری اس بات سے وہ قدرے ملول ہوئے پھر کچھ توقف کے بعد چہک کر بولے۔

"بھائی دراصل یہ بچوں کے مستقبل کا معاملہ ہے ادب کے مستقبل پر بچوں کے مستقبل کو قربان کرنا دانش مندی کا کام نہیں۔ ادب کی خدمت سے خاص کر اردو ادب کی خدمت سے ان کے روٹی کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جس کی ان کو زندگی میں ضرورت ہوتی ہے مرغیوں کی یہ ساری ضرورتیں تو ہم جیسے لوگ پوری کر دیتے ہیں انھیں اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی!" یہ بات وہ بڑے فلسفیانہ لہجہ میں کہہ کر کچھ رنجیدہ سے ہوگئے۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں ڈال کر پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے ان سے رخصت چاہی۔

"میں نے آپ کا بہت وقت لیا جس کے لیے شکریہ! اچھا! خدا حافظ" وہ بھوری پیل کا انڈا ہاتھ میں لے کر زنان خانے میں بیگم صاحبہ کے پاس چلے گئے!!

جاوید لطیفی

زُلف سے ہم زُلف تک

اگر زُلفِ زن نہ ہوتی تو شاعروں کی ایک نمایاں رومانی سوچ عالم وجود میں نہ آتی۔ زلفِ عنبریں، زلفِ دوتا، زلفِ مشکبو اور ناگن جیسے الفاظ کے علاوہ زلف سے متعلق اشارات و محاکات بھی مزہ نہ دیتے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اور . . . "کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک"

اور ایسے ہی رنگ کے متعدد اشعار سننے کو بھی کہاں ملتے۔ زلف و کاکُل کی داستانیں کہاں رقم ہوتیں، کاکُل جو ہزاروں عورتوں میں کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے اور زلف کی ننھی بہن ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اُستادانِ سخن کی دلچسپ لیکن ادبی نوک جھونک میں زلف کے تعلق سے ایک مصرعہ عالم وجود میں آیا اور اس تعلق کے جائز یا ناجائز ہونے کا قضیہ کھڑا ہونے سے پہلے ہی اس پر برجستگی کے ساتھ دوسرا مصرعہ پہنچایا گیا۔ اپنے وقت کے مشہور نابینا شاعر جرأت نے مصرعہ کہا۔

"اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی"

وان کے ہم عصر انشاء اللہ خاں نے برجستہ کہا۔

"اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی"

شاید [illegible] انسان کے [illegible] ہوتی تو ظاہر ہے کہ [illegible] لفوں سے بھی چھٹی مل جاتی،
وہ ہم زلف اچھے ہوتے یا بُرے، مثالی ہوتے یا غیر مثالی لیکن تقاضائے فطرت، بقائے نسل اور ماں باپ کی مرضی کے [illegible] ہے۔ پھر بھی [illegible] ایسے لوگ [illegible] کے گلے میں نہ زلف کا پھندا ہوتا ہے اور نہ کرکے اطراف ہم زلفوں کا چکر بلکہ ان کا خود [illegible] ایسے لوگ اپنی زندگی کی گاڑی کسی طرح چلاتے ہیں . . . کچھ عرصہ پہلے میں نے ایسے دو [illegible] کی بابت چند [illegible] جن میں ایک بیچلر اور دوسرے شادی شدہ تھے۔ شادی شدہ [illegible] کر [illegible] کہہ رہے تھے۔

" . . . [illegible] شادی کر [illegible] کے [illegible] آخر کب تک ایسا چلے گا اور پھر

شاعر نے آپ ہی کے لیے کہا بھی ہے کہ ؎

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی ؎ کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

یہ سن کر ان کے مجرد دوست نے ذرا زیادہ ہی بے تکلف ہو کر فرمایا:

"... چھوڑو یار، چھوڑو، ہمارے ابا حضور نے بھی اسی طرح دن گزار دیئے ..."

اور ایسے لوگوں کو غمِ دوراں میں مبتلا اور غمِ جاناں سے آزاد و بے نیاز دیکھ کر ایک طرف رشک آتا ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں کی بہ ظاہر بے فکر زندگی صرف تماشائی ہو اور وہ زلفِ گرہ گیر کے اسیر نہ بن کر شاید پچھتا رہے ہوں، پر اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ....

مشاہدہ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے اور دوسروں کے آس پاس ہم زلفوں کی بھیڑ ہی دیکھی ہے اس لیے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ وہ شخص آخر کیسا ہوگا کہ جس کا کوئی ہم زلف نہ ہو، ملے تو پوچھیں کہ بھیا بغیر ہم زلف تمہاری کس طرح بسر ہو رہی ہے۔

جیسے جیسے زمانہ گزر رہا ہے دنیا روحانی اقدار سے محروم ہوتی جا رہی ہے انسان کی انسان سے رفاقت و محبت میں نمایاں کمی محسوس ہو رہی ہے اور یہ بات بہت قریبی رشتوں میں تک دیکھی جا سکتی ہے ہم زلفی کا رشتہ تو ذرا دور کا ہوتا ہے۔ آپس کے میل ملاپ کے لیے کئی باتیں آڑے آ جاتی ہیں، کچھ تو فاصلے، کچھ مالی مشکلات اور کچھ شدید مصروفیات، اب ادھر یا ادھر کی زلف بیمار ہے اور بہن سے ملنا چاہتی ہے یا ادھر ادھر کا کوئی ہم زلف بسترِ علالت پر ہے یا کوئی شادی بیاہ موت میت کا سلسلہ ہے تو مجبوراً وقت نکالنا پڑتا ہے تاہم یہ بھی ہو رہا ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا اور مجبوری حالات کے تحت صبر و شکر ادا کر کے بیٹھ گئے۔

ہم نے زلفوں اور ہم زلفوں کی مڈبھیڑ کا ایک دل چسپ مشاہدہ بھی کیا ہے یہ ہم زلف آپس میں ہم زلف تو ہیں لیکن ہم مذہب نہیں، ان کی زلفیں یعنی بیویاں طوائف تھیں، عشقِ خانہ خراب کی چکر میں دونوں کی شادی خانہ آبادی ہو گئی، ایک ہندو کے گھر ہندو بن کر مل گئی دوسری مسلمان کے گھر آباد ہو گئی اور اس طرح دونوں طوائف بہنیں والف کے نفرے میں آکر بچھڑ گئیں اب وقت جب کبھی زلفوں اور ہم زلفوں کو آپس میں ملاتا ہے تو منظر بڑا ہی دیدنی سبق آموز اور اثر انگیز ہوتا ہے۔ ... دو بہنیں آپس میں بغلگیر ہوتی ہیں اور دو انسان گلے ملتے ہیں۔ ... اگر یہ ہم زلفی کا چکر نہ ہوتا تو پھر اس بات میں جمی ہوئی قلعی کا رنگ کیسے جلتا!

دو ہم زلفوں کی زندگی متضاد طریقوں سے گزر رہی تھی ایک گھر میں میاں بیوی کے جھگڑے فساد ہوتے رہتے تھے اور دوسرے گھر میں امن و سکون کا راج تھا۔ ایک دن فساد زدہ گھر کے میاں بیوی پُر امن گھر گئے۔ موقع پاکر تنہائی میں فسادی نے اپنے پُر امن ہم زلف سے پوچھا

"بھائی صاحب یہ بات اخباروں میں بھی چھپ چکی ہے کہ آپ میاں بیوی کبھی بھی لڑتے جھگڑتے نہیں نہایت چین و سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ .. آخر اس کا راز کیا ہے ۔؟"

یہ سن کر پُر امن ہم زلف نے شفقت سے مسکرا کر فرمایا۔

"برادر! ہم میاں بیوی کی زندگی امن سے بسر ہونے کا راز صرف یہ ہے کہ ہم دونوں نے آپس میں معاہدہ کر رکھا ہے ہم دونوں اس معاہدے پر بلا چوں و چرا عمل کرتے رہتے ہیں اس لیے کوئی بھی جھگڑا ہونے سے پہلے ہی نمٹا دیا جاتا ہے۔"

"معاہدہ کیسا معاہدہ؟ آخر ہمیں بھی تو معلوم ہو ۔"

فسادی ہم زلف نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بات کوئی لمبی چوڑی نہیں بالکل مختصر ہے۔ معاہدہ یہ ہے کہ چھ مہینے تک ہماری بیوی جو چاہے گی کرے گی ہم اس کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور بعد کے چھ مہینے جو ہماری بیوی چاہے گی ہم کریں گے چلو جھگڑا ختم۔۔"

ایک بار ایک پڑھے لکھے مگر بذلہ سنج نے تقریباً ناخواندہ اپنے ہم زلف کا تعارف کسی سے کراتے ہوئے کہا۔

"ان سے ملئے ۔ ۔ ۔ یہ ہیں ہمارے ہم زلف جناب ۔ ۔ ۔"

اتنا سنتے ہی ان کے ہم زلف نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔

"معاف کرنا صاحب مذاق کرنا ان کی عادت ہے ان کا ہم زلف ہوگا کوئی اُلّو کا پٹھا ۔ میں تو ان کا ساڈھو ہوں سا ۔"

اور ایسا کہتے ہوئے اُن کی گھبراہٹ اس لیے بھی واجبی تھی کہ ان کے پڑھے لکھے بذلہ سنج ہم زلف نے تفریح کی خاطر شادی کے بعد ان کے دماغ میں یہ بات بٹھادی تھی کہ چونکہ بیوی کا دامن خوشی کے ساتھ شوہر سے باندھا جاتا ہے اس لیے فصیح اردو میں بیوی کو خوش دامن کہتے ہیں ۔ یہ بات ذہن نشین کرکے جب ایک دن اُنہوں نے فصاحت بگھارتے ہوئے اپنی اہلیہ محترمہ کو یوں مخاطب کیا۔

"ذرا ادھر تو آؤ میری پیاری خوشدامن ۔ ۔ ۔ ۔"

تو شرمندگی کے ساتھ ساتھ اُن کو یہ انکشاف برداشت کرنا پڑا کہ خوشدامن بیوی کو نہیں ساس کو کہتے ہیں۔

اس سائنسی دور میں جہاں جنس تک تبدیل ہو رہی ہے اور فیشن نے وہ انقلاب برپا کیا ہے کہ عورت و مرد میں تمیز مشکل ہوگئی ہے تو یہ لفظ ہم زلف بھی ممکن ہے ایسی منزل پر ہو کہ مٹ ہی جائے یا اپنا کوئی دوسرا نام وضع کر لے ۔ عورت کی زلف کی مناسبت سے ہی ہم زلف کا لفظ بنا ہے اب اگر عورت کی زلف ہی باقی نہ ہو تو اس سے متعلق کوئی نام کیا باقی رہے گا۔ ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔

لڑکی نے کہا "ڈیئر کل جب میں بازار سے گزر رہی تھی تو تم نے مجھے دیکھ کر نظریں کیوں چرالیں۔ ہلو تک نہیں کہا؟"

لڑکے نے کہا "اس لیے کہ تمہارے ڈیڈی تمہارے ساتھ تھے ۔"

لڑکی نے ہنس کر کہا "نہیں نہیں، وہ تو میری ممی تھیں ممی ۔"

آج کل خواتین کی زلفیں کئی اسباب سے غائب ہو رہی ہیں۔ ایک تو فیشن، دوسرے مذہب کی خاطر یعنی بعض کٹر قدامت پسند مذہبی گھرانوں میں عورت بیوہ ہو جائے تو یا منتوں میں ہیں دیتا ہے۔ منتوں اور خوشنودی کے لیے اور تیسرے پیٹ کی خاطر۔ مالی حالات میں زلفوں کی مانگ بڑھ رہی ہے اور خواتین زلف تراش کر لڑکوں کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔

موجودہ سائنسی دور نے کئی اصطلاحیں اور محاورے غلط کر دیئے ہیں ۔ دلی دور است، چراغ تلے اندھیرا، اور نیکی کر دریا میں ڈال وغیرہ۔

ہوائی سفر نے دلی کو قریب کر دیا ہے، بجلی نے چراغ تلے اندھیرا دور کر دیا ہے اور زمانے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی اور بے ایمانی نے نیکی کر دریا میں ڈال کے محاورے کو نیکی کر ... میں ڈھب میں تبدیل کر دیا ہے۔

غزل ـ اقبال ہاشمی

ادھر مرغیوں کا خیال آگیا
ادھر میرے منہ میں خلال آگیا

تمہاری نگاہوں میں ہم دیکھ کر
ہرے راکٹوں پر جلال آگیا

قویٰ مضمحل ہو گئے تو مجھے
خیال حرام و حلال آگیا

تمہاری مفصل خرافات پر
مجھے مختصر سا جلال آگیا

حکومت بدلنے کی بس دیر تھی
کئی خالی جیبوں میں مال آگیا

نئے تعلقوں کی جھلک دیکھ کر
سبھی مسخروں پر زوال آگیا

الکشن کے وعدوں کی تکمیل میں
محاصل سے بھرپور سال آگیا

ادھر میں نے کروٹ بھی لی ہاشمی
ادھر سر عدو کا سوال آگیا

روشن لال روشن بنارسی

"پیروڈی"

ڈاکٹر کا جو بل ادا نہ ہوا
"درد منت کش دوا نہ ہوا"

پیش آتے ہیں لوگ عزت سے
"میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا"

میرا کالر تو چھوڑیئے صاحب
"اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا"

کتنی لذت تھی بھوک میں کہ غریب
"گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا"

مستحق آپ تھے پٹائی کے
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

شیروانی نہ آسکی دھل کر
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

جیب سے کچھ نہ کچھ گیا روشن
"بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا"

لقب عراقی (اچل پور)

دل میں ہو کھوٹ تو حقدار کی ایسی تیسی
ہم اگر خوش ہیں تو سنسار کی ایسی تیسی

جانِ من کر لے دبے معذرے مجھ سے
پیٹ بھرا ہیں ترے پیار کی ایسی تیسی

لکھ پتی بننے کے سامان کریں ہم پیدا
آؤ بیوپار کریں کردار کی ایسی تیسی

ہم تو لے جائینگے کشتی کو سلامت اس پار
اس کی کیا ہستی ہے منجدھار کی ایسی تیسی

اک طوائف سے کہا میں نے چلو ساتھ مرے
گھر بسانا ہے تو بازار کی ایسی تیسی

ایک ہو جاؤ محبانِ وطن بہر خدا
تاکہ ہم کر سکیں غدار کی ایسی تیسی

جیت سکتی نہیں وہ فتح زمانہ میں کبھی
کر سپاہی کہیں سردار کی ایسی تیسی

دل میں میرے بھی دھڑکتا ہے [illegible]
[illegible] کی ایسی تیسی

مارکٹ جاتا ہوں میں لینے ٹماٹر اور کیک
اب تمہارے [illegible] خریدار کی ایسی تیسی

دوست کو کھانے پہ بلوا کے حضور والا
آپ نے کر دی ہے اتوار کی ایسی تیسی

اس کے گھر جیسے لقب جانا ہے [illegible]
[illegible] کی ایسی تیسی

یعنی شوہر اور بیوی کا نقش واضح ہوتا ہے اور "وہ" غیر واضح ہوتا ہے۔ وہ کے وجود سے آپ تو ناواقف ہوتے ہی ہیں لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کی خالق یعنی بیوی بھی واقف نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے وہ کے نامعلوم وجود پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ازدواجی زندگی کا یہ وہ خیالی نقطہ ہے جو تمام بیویوں کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشہ میں موجود رہتا ہے۔ دنیا میں آج تک وہ بیوی پیدا نہیں ہوئی جس کے وجود پر وہ کا پُر اسرار یا نامعلوم بوجھ نہ لدا ہو۔

ایک دن مسٹر "ج" میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ وہ کھیل میں اس طرح منہمک ہوئے کہ وقت کا پرندہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کھیل چلتا رہا وقت گزرتا رہا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد اچانک انھیں گھر کی یاد آئی اور جیسے ہی وہ گھر جانے کے لیے کھڑے ہوئے انھیں اپنی بیوی آندھی طوفان کی طرح آتی ہوئی نظر آئی۔ بیوی کو دیکھتے ہی ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ الماری کے پیچھے سانس روکے کھڑے ہو گئے۔ ان کی بیوی کو شیرنی کی طرح کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر مجھے بھی وحشت ہونے لگی۔ محترمہ نے جاسوسانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد مجھ سے سخت لہجے میں پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

شوہر کے لیے بیوی کا یہ انداز تخاطب میرے لیے غیر متوقع تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر الماری کی طرف اٹھ گئی۔

محترمہ نے پہلے ہی کی طرح سخت لہجے میں کہا "ارے میں الماری کے پیچھے چھپے اس نکھٹو سے بعد میں سمجھ لوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟"

میں نے حیرت سے کہا "وہ کون؟ یہاں تو ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں ہے"۔

محترمہ نے مجھے پھٹکارتے ہوئے کہا "تم سب مرد ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا دروازہ جھانکنا تمہاری فطرت ہے"۔

راز کھل جانے کے طفیل مسٹر "ج" الماری کے پیچھے سے نکل آئے۔ اپنی صفائی پیش کرنی چاہی لیکن بیوی کے تیور دیکھ کر بھیگی بلی بن گئے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ مسٹر "ج" کو مشق نشانہ بنا کر میں آپ بیتی سنا رہا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری آپ بیتی مسٹر "ج" سے الگ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر شوہروں کی آپ بیتی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جو حال عین کا ہے وہی غین کا ہے۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔

میری بیوی بھی دوسروں سے الگ نہیں۔ اگر دوسروں کی بیویاں وہ کے معاملے میں سیر ہیں تو وہ کیلوگرام ہے۔ صبح دفتر جانے کے لیے تیاری کرتے دیکھ کر اس کی تیوری پر بل آجاتے ہیں۔ "پھر تو جیسے آپ کو کام نیا ہے۔ ہاں، ہاں جلد جائیے وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ دفتر تو اس سے ملنے کا ایک بہانہ ہے"۔

شام کو دفتر سے آنے میں معمولی تاخیر ہوئی تو "وہ مل گئی ہوگی ورنہ آدھی رات کو آنے کی کیا وجہ ہے؟"

"ارے یہ بھی کوئی ساڑی ہے وہ کہہ دے تو ساڑیوں کی تمام دکانیں ایک ہو جائیں، میرے لیے تو کبھی اچھی ساڑی ملتی ہی نہیں" "مجھے کیوں فلم دکھانے لگے۔ فلم اور سیر و تفریح پر تو اس کا حق ہے۔ میں تو گھر کی ملازمہ ہوں؟"

غرضیکہ اس کی ہر بات کا خاتمہ "وہ" پر ہوتا ہے۔ ایک دن موڈ فریش دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا "سچ بتاؤ یہ "وہ" آخر ہے کون؟ کبھی تم نے اسے دیکھا ہے؟"

بولی "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ "وہ" کون ہے تو اس کا منہ نہیں نوچ لیتی۔ بدمعاش صرف خواب میں ہی نظر آتی ہے، کبھی حقیقی رُوپ میں آئے تو ایسا سبق پڑھاؤں گی کہ دن میں تارے نظر آجائیں گے"۔

میں نے پوچھا "وہ بدرونہ سہی خواب میں تو تم نے اسے دیکھا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

بولی "مجھ سے زیادہ کیا خاک خوبصورت ہے سیاہ رو"۔

میں نے کہا "وہ سیاہ رو جب تم سے زیادہ خوبصورت نہیں تو میں تمہارے بجائے اُسے کیوں اہمیت دینے لگا۔ کبھی تم نے اس نقطے پر غور کیا ہے"۔

نسوانی ہٹ دھرمی برقرار رکھتی ہوئی بولی "یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں کہ آپ اسی کے پیچھے دیوانہ ہیں"۔

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "وہ دراصل تمہارا ایک وہم ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ بھی تمہارا ہی دوسرا روپ ہو ورنہ تمہارے بجائے میں اس کا دیوانہ کیوں ہوتا؟"

تنک کر بولی "مکھن مت لگائیے میں سب سمجھتی ہوں، دل لگی دیوار سے تو پری کیا کرے"۔

"وہ" کا وجود نامعلوم سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بیوی کے منہ سے بار بار "وہ" کی تکرار سن کر شوہر کے دل میں ایک لطیف چبھن ہونے لگتا ہے۔ بیوی سے زیادہ "وہ" پر پیار آنے لگتا ہے اور کیوں نہ آئے جبکہ "وہ" ہی وہ مقناطیس ہے جو شوہر و بیوی کو زیادہ سے زیادہ قریب کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جن کی زندگی میں "شوہر، بیوی اور وہ" کا مثلث قائم نہیں ہوتا ان کے گھر میں رونق ہوتی ہے نہ ازدواجی زندگی میں رنگ و کیف۔ ان کی ازدواجی زندگی بغیر نمک مرچ کے سالن کی ہوتی ہے!!

■■

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

مسافتیں

ایک سفر، سومرا و پلکس کے لئے

(عطاء الحق قاسمی کے رپورتاژ کی یہ قسط ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے بروقت شائع نہ ہو سکی تھی۔
اب معذرت قارئین سے ہے!)

اب میں نے سوچا کہ حکومتی پارٹی (تیلگو دیشم) کے سیکرٹری جنرل مسٹر اوپندر سے جو درحقیقت اس پارٹی کے فکری رہنما ہیں وقت لیا جائے اس میں کامیابی ہوئی چنانچہ ان سے اگلے روز صبح دس بجے کا وقت طے ہوا مگر وقت مقررہ پہ وہ اپنے بتائے ہوئے ٹیلی فون نمبروں میں سے کسی پر بھی دستیاب نہیں ہوئے۔ پھر میں نے موجودہ "نظامِ دکن" (صرف نسلی طور پر) سے انٹرویو کی کوشش کی پتہ چلا کہ موصوف ملک سے باہر رہتے ہیں بھارت کے تہلکہ مچا دینے والے کرکٹر اظہر الدین سے ملنے کا ارادہ کیا مگر اسی دوران روزنامہ "سیاست" کی ایک خبر پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ ان کے مکان پر شائقین چوبیس گھنٹے دھاوا بولے رکھتے ہیں جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا اور میں نے دل میں مان لیا کہ کوئی اخباری "سکوپ" میرے مقدر میں نہیں تو میں نے حیدرآبادی [illegible] کی طرف سے دی گئی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی مجھا اس دوران بستر پہ دراز ہو چکے تھے اور انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں غالباً نیم خوابیدگی کے عالم میں تھے دوستوں کی عطا کردہ کتابوں کے ڈھیر میں سے جو کتاب "ترہ اندازی" میرے ہاتھ لگی وہ محمد برہان حسین کی تھی اور اس کا نام "چند کلیاں نشاط کی" تھا۔ محمد برہان حسین [illegible] "شگوفہ" سے وابستہ ہیں ان کے ایک مضمون "اور آنا لندن سے ماہر ٹریفک کا" نے بہت مزا دیا اس کا ایک حصہ آپ بھی [illegible]

"اس نے کہا [illegible] آپ کا شہر [illegible] حصہ ہے ندی کے دو طرف۔ ایک پرانا شہر دوسرا کم پرانا شہر"
ہم اس کم پرانے "[illegible]" پہ [illegible] پڑے۔ ہم نے کہا آپ کا مطلب پرانا اور نیا شہر ہے!
وہ بولا "[illegible] ہم اس کو نیا [illegible] کہہ سکتا۔ آپ کے پرانے شہر کی ٹریفک قابل دید ہے اور کم پرانے شہر کی ٹریفک قابل دید
ہم نے کہا ارے یار تم تو [illegible] کا استعمال اس قدر احتیاط سے کر رہے ہو جیسے وصیت لکھ رہے ہو۔
اس نے کہا بھئی ایک بات تو بتا دو یہ سنے گاندھی کو نیلی [illegible] کی کیا سوجھی۔ وہ بیسنٹ تو یہاں کی [illegible] سکتا تھا ہر حال میں [illegible] کے سلسلے میں چند [illegible] پیش کرتا ہوں پہلی تجویز یہ ہے کہ آپ شہر کو ڈبل اسٹوری بنا دیجئے آپ کا [illegible]

سینما، ریلیں، زمین کے نیچے کر دیجئے اور سڑکیں اُوپر۔

ہم نے کہا نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہاں سیمنٹ اصلی نہیں ملتا اور نقلی سیمنٹ بھی کنٹریکٹر کم ڈالتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین کے نیچے جو بھی جائے گا وہ اوپر کبھی نہیں آئے گا۔

وہ بولا اوکے آپ رکشے بند کر دیجئے کیوں کہ یہ سڑک کے بڑے حصے کو بڑی دیر تک گھیرے رکھتے ہیں!

ہم نے کہا یہ بھی نہیں ہو سکتا اس شہر میں ہر گھنٹہ میں ایک درجن بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے آدھے رکشے چلاتے اور آدھے اس پر سواری کرتے ہیں۔

اس نے کہا آؤ! تو آپ کم از کم سائیکلیں بند کر دیجئے۔

ہم نے کہا اسے بھائی سائیکلیں بند ہوئیں تو یہاں تلنگانہ ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گی۔

وہ بولا اچھا تو پھر آپ اسپیڈ بریکر ختم کر دیجئے۔ اس سے ٹریفک کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے کہا ہر اسپیڈ بریکر ایک میموریل ہے۔

میموریل!؟ وہ کیسے؟

ارے صاحب جس طرح انگریز لوگ جنگ میں مرنے والوں کے میموریل بناتے ہیں نا، اسی طرح یہاں ٹریفک کے حادثہ میں جب کوئی مرتا ہے تو میونسپل کارپوریشن والے اس کی یاد میں اسپیڈ بریکر بنا دیتے ہیں۔

وہ غصہ سے بولا پھر یہاں کی ٹریفک پولیس کیا کرتی ہے ہم نے کہا وہ صرف پرسنل ٹیکس وصول کرتی ہے۔

اس نے پوچھا پرسنل ٹیکس کسے کہتے ہیں؟

وہ رقم جو سرکاری خزانے میں داخل نہیں کی جاتی۔

اس نے کہا واہ اگر میرا کوئی مشورہ قبول نہیں کرنا تھا تو پھر مجھے اس گرم ملک میں بلانے کی کیا ضرورت تھی!

ہم نے کہا صرف اسی لیے کہ ہمارا ٹریفک پولیس کے سالانہ بجٹ میں رقم بچ گئی تھی اور سال ختم ہو رہا تھا اب آئندہ سال اگلا بجٹ میں پھر تم سے اپنی مسائل پر مشورہ کرنے لندن آؤں گا گڈ بائی خوش رہو اور ویٹ کرو!

وہ بولا اوکے ضرور آؤ، مگر واپس ضرور جانا!

اس دوران عزیز صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے میں نے انہیں اس مضمون کے چند حصے سنائے سن کر کہنے لگے اس میں "پرانا شہر اور کم پرانا شہر" والی بات خصوصاً بہت خوب ہے۔

میں نے کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں اور [illegible] اس نقرے نے ایک اور حوالے سے بھی [illegible]

پوچھنے لگے وہ کیا؟

میں نے کہا شہروں کے سلسلے میں تو یہ بات اگر دیکھا جائے تو بعض اوقات لطف لینے کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے مگر شاعری کے سلسلے میں یہ بات [illegible] ہے۔

بولے "وہ کس طرح؟"

میں نے کہا [illegible] طرح کہ نئی شاعری اور پرانی شاعری کوئی چیز نہیں بلکہ اس کی جگہ پرانی شاعری اور کم پرانی شاعری کے

"زیادہ موزوں ہیں کیوں کہ جسے ہم نئی شاعری کہتے ہیں وہ بھی دراصل پرانی شاعری کی ری کنڈیشنڈ شکل ہے؟ دیا میری اس بات کو ٹی ایس ایلیٹ نے ذرا مشکل لفظوں میں بیان کیا ہے اور یوں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میری بات پرانی اور ٹی ایلیٹ کی کم پرانی ہے!

اتنے میں دروازے پر "ناک" ہوا اور پھر مسیح انجم بیگ احساس اور ذہانت بیگ ہمارے سامنے کھڑے تھے تھوڑی دیر بعد مجتبیٰ حسین بھی آ گئے۔ مجتبیٰ حسین دوران گفتگو بھی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں اور پھر یہاں تو پیر و مرشد ضمیر صاحب بھی موجود تھے یک نہ شد دو شد! مجتبیٰ حسین نے ایک دلچسپ بات سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ دنوں لندن گئے تو ایک محفل میں ان کی ملاقات ایک معروف صحافی بشیر ریاض سے ہوئی بشیر ریاض کے ساتھ خالصتان موومنٹ کے لیڈر ایک سردار جی بیٹھے تھے یہ سردار جی کہہ رہے تھے کہ خالصتان بن کر رہے گا اور پھر ہم خالصتان اور پاکستان کو ملا کر ایک ملک بنا دیں گے یہ سن کر بشیر ریاض نے کہا "سردار جی آپ اس ملک کا نام کیا رکھیں گے؟" سردار جی نے برجستہ کہا: "پاکستان"۔

اردو ہال میں اردو طنز و مزاح پر سمپوزیم کا وقت قریب تھا اور یہ دوست اب چلنے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم جلدی جلدی تیار ہو کر دروازے کی طرف جانے لگے تو فون کی گھنٹی بجی میں دروازے سے لوٹا۔ دوسری طرف ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو تھیں۔ ارے میں تو اس ساری گہما گہمی میں بھول ہی گیا تھا کہ ہم جیلانی بانو کے شہر میں ہیں انہوں نے ہمیں پرسوں رات کے کھانے پر بلایا تھا اسی روز جناب عابد علی خان کے ہاں ہم لنچ پر مدعو تھے میں ٹیلی فون سن کر واپس جانے لگا تو محمد عسکری کا فون آیا کہ حسن الدین احمد صاحب نے ہم پاکستانی مہمانوں کو اگلے روز عشائیے پر مدعو کیا ہے لہٰذا ہم اس ضمن میں کسی سے وعدہ نہ کریں اس کے ساتھ ہی حسن الدین احمد صاحب کا فون بھی آیا اور ان کی نرم گفتاری کا مزا ٹیلی فون پر ہی آ گیا میں ایک دفعہ پھر دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس دفعہ دوسری طرف سردار گمبھیر سنگھ تھے جو حیدرآباد کے ممتاز صنعت کار ہیں اور پنجابی تنظیم کے کنوینر ہیں انہوں نے اصرار کیا کہ آج رات کو اردو سیشن سے جلدی اٹھ کر ضمیر صاحب اور آپ ہمارے پنجابی سیشن میں آئیں گے اس کے بعد آپ کے اعزاز میں نظام کلب میں عشائیہ ہے دروازے تک پہنچتے پہنچتے ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج رہی تھی مگر اس بار مجتبیٰ حسین نے میرا بازو پکڑا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

رشید احمد صدیقی اردو طنز و مزاح میں "آورد" اور پطرس "آمد" کے اسکولوں کے بانی ہیں:-

ہم حمایت نگر میں واقع اردو ہال میں داخل ہوئے تو تقریباً پانچ سو لوگ خشک مقالے سننے کے لیے تیار بیٹھے تھے گویا حیدرآباد والے سنجیدہ ہونا بھی جانتے ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس محفل کی صدارت کے لیے غالباً آج ہی دہلی سے حیدرآباد پہنچے تھے۔ جناب حسن عسکری کو یہاں مہمان خصوصی بنایا گیا اور ہمیں ڈائس پر ان کے ساتھ بٹھا دیا گیا عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے روح رواں نریندر لوتھر اس اجلاس میں بھی موجود تھے وہ پتہ نہیں کن متوازی اجلاسوں کو بھگتا کر یہاں پہنچے تھے مجھے شک گزرا کہ اس شخص کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں ایک مقالہ پروفیسر سلیمان اطہر نے اردو کی مزاحیہ نظم کے حوالے سے پڑھا اور یہ خاصا پروفیسروں والا مقالہ تھا دوسرا طویل مقالہ جناب ظ۔ انصاری کا تھا اگرچہ بعد میں بحث کے دوران ایک شریک محفل نے کہا کہ اس مقالے کے صرف وہی حصے

اپنے تھے۔ جو مزاح نگاروں کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل تھے مگر میرے نزدیک غالباً ایسا نہیں تھا یہ مقالہ اچھا تھا البتہ ڈاکٹر انصاری نے گھپلا یہ کیا کہ اپنے پسندیدہ مزاح نگاروں کی خوب تحسین کرکے اور معاشرے کے تضادات پر ان کی طنز اجاگر کرکے آخر میں یہ کہا کہ ان کے ہاں "کومٹ منٹ" کی کمی ہے جس کے باعث ان کے فن میں کچھ کسر رہ گئی ہے مقالے میں موجود اس تضاد پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے خوب لتے لئے ہم نے آج تک ڈاکٹر صاحب کی صرف شیریں بیانی دیکھی تھی اس روز ہم نے شیرینی اور تلخی کی "تماک ٹیل" بھی چکھی۔ ویسے اس محفل میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو کے دو بڑے مزاح نگاروں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے حوالے سے ایک کمال کی بات کہی جو "کوٹیشن" کے زمرے میں آتی ہے انہوں نے کہا رشید احمد صدیقی اردو مزاح میں "آورد" اور پطرس "آمد" کے اسکولوں کے بانی ہیں!

اس محفل میں سید ضمیر جعفری نے بھی مختصراً خطاب کیا اور اس خوبصورت محفل کے انعقاد پر منتظمین کو مبارک باد دی ان کے علاوہ سامعین میں سے یوسف ناظم، حامد حسین، عزیز قیسی، عاتق شاہ اور ڈاکٹر انور معظم نے یہاں پڑھے جانے والے مقالوں کے حوالے سے مختلف سوالات اٹھائے۔ ایک ہندو مزاح نگار دی دی پدمنا محض یہ کہنے کے لیے اسٹیج پر آئے کہ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دینے والوں کے دعوے بے بنیاد ہیں سامعین نے پرجوش تالیاں بجا کر ان کی تائید کی۔

اور اب مہمانوں پر مشتمل یہ قافلہ لنچ کے لیے ایک "نامعلوم" منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ ▬ ▬

واہ واہی

(حضرت رضا نقوی واہی سے معذرت کے ساتھ)

کمال الدین

ایسی کنڈی تھی لگائی تو نے
تیرا دروازہ تو واہی نہ ہوا
تو مجھے ماہ کہا کرتا ہے
کیا کروں پھر بھی تو ماہی نہ ہوا

(قطعہ)

شکریہ حضرت واہی کہ کمال
صید کوتاہ نگاہی نہ ہوا

(واہی پر قطعہ)

میں بھی کہہ سکتا ہوں جب ایسے شعر
وائے بر حال کہ واہی نہ ہوا!
آپ نے ایسی پھنسائی کنڈی
کہ [illegible] شعر تو واہی نہ ہوا

کاشی ناتھ، ایڈوکیٹ (حیدرآباد)

گھوس پوران

یعنی

تاریخ رشوت ستانی

گھوس یعنی رشوت ستانی ایک فن ہے، ایسا ہی فن جیسا کہ جنگ، اور انسانی زندگی پر اس فن کا ایسا ہی اثر رہا ہے
جیسا کہ جنگ کا. ہر ایک فن کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے. مورخوں نے فن جنگ کی تاریخ لکھی ہے اور کئی مورخوں نے لکھی
ہے. لیکن تعجب ہے کہ جنگ کی ہم پلہ اہم، فن رشوت ستانی کی تاریخ لکھنے کی کسی کو نہ سوجھی. آخر جنگ کی طرح رشوت
کے ذریعہ بھی تو دشمن کو قابو میں کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں ہتھیار، ہتھیار ڈال دیتے ہیں وہاں رشوت
کام کر جاتی ہے اور بڑے سے بڑا دشمن قابو میں کیا جاتا ہے. دراصل رشوت ہمارے سماج کا ایسا ہی جز ہے
جیسا کہ جنگ. جنگ میں انسان بہادری دکھاتا ہے تو رشوت میں چالاکی. جنگ میں انسان تلوار کے بل پر دوسرے انسان
کو زیر کرتا ہے تو رشوت میں خوشامد اور دولت کے ذریعہ جنگ اور رشوت دونوں انسان کی خود غرضی کی پیداوار ہیں
اور دونوں بھی زہریلے و مہلک. بلکہ رشوت، جنگ سے بھی زیادہ زہریلی و مہلک ہوتی ہے، کیوں کہ جنگ اکثر دس
۔ یا پندرہ بیس سال میں کبھی انسانوں پر نازل ہوتی ہے جبکہ رشوت ہر روز اور چوبیس گھنٹے برسرکار رہتی ہے
۔ا یسے جنگ سے ہونے والا نقصان عارضی ہوتا ہے، جبکہ رشوت اپنا مستقل اثر سماج پر چھوڑتی ہے. ایک بات
یہ ہے کہ جنگ اکثر انسانی ضمیر کو جھنجوڑتی اور جگاتی ہے، جبکہ رشوت میں انسانی ضمیر سونے اور بیہوش ہونے لگتا ہے اور
کبھی کبھی تو مردہ ہو جاتا ہے. تعجب ہے کہ انسانی زندگی کو تباہی کی طرف لے جانے والی جنگ کی تاریخ تو کئی مورخوں
نے لکھی لیکن انسان کی زندگی کے ساتھ اس کی روح کو بھی غارت گری کی طرف لے جانے والی رشوت ستانی کی تاریخ پر
روشنی ڈالنے کی بات کسی مورخ کو نہ سوجھی۔

کسی زمانے میں جنگ ویسی نہیں ہوتی تھی جیسی کہ آج ہوتی ہے۔ مہابھارت کے زمانے میں جنگ کے قواعد کچھ
تھے، سکندر و بابر کے زمانے میں کچھ اور، تو آج کے زمانے میں کچھ اور ہیں. مہابھارت کے زمانے میں جنگ کے فریقین
جنگ کے وقت ایک میدان میں آمنے سامنے جمع ہو جاتے تھے اور باضابطہ شنکھ یا بگل بجا کر جنگ شروع کی جاتی

تھی۔ سپاہی صرف سپاہی پر حملہ کرتے تھے اور حملہ کے وقت دشمن کے ہاتھ میں ہتھیار ہونا بھی ضروری تھا۔ نہتے پر حملہ کرنا ممنوع تھا اور سورج غروب ہوتے ہی جنگ بند کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے جنگ کے آداب میں زوال آنا شروع ہوا اور آج یہ حال ہے کہ جنگ میں سپاہی اور شہری سب برابر ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جبکہ لاکھوں معصوم انسان سوتے رہتے ہیں تو دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہیں اور اس میں سپاہی، شہری، بچے، عورتیں اور بوڑھے اور خواتین وغیرہ سب ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رشوت ستانی کا بھی شروع میں کوئی نہ کوئی روپ ضرور رہا ہوگا جو وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے آج کا روپ دھارن کر گیا۔

لہٰذا رشوت ستانی جیسے اہم موضوع کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی ہم کوشش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ مستقبل میں کوئی ہم سے زیادہ قابل و عالم شخص اس موضوع پر ریسرچ کرے گا اور ایک ضخیم کتاب لکھے گا۔

پرانے زمانے میں راجہ مہاراجہ بادشاہ اور نواب ہوا کرتے تھے۔ ان کے خزانوں میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی بڑی سے بڑی چیز ان کے لیے تحفہ یا نذرانہ کی شکل میں پیش کی جاتی تھی جسے قبول کرنے کے لیے وہ محض اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے تھے اور اس کے بعد وہ نہایت خاموشی و ادب کے ساتھ ان کی ملکیت بن جاتی تھی۔ اس طرح مادی چیزوں کی انہیں چنداں کمی نہیں تھی۔ اگر کمی تھی تو صرف بڑائی کی جسے پیدا کرنے کے لیے ان کے دربار میں خوشامدی اور جی حضوریوں کی بھرمار رہتی تھی۔ ایک سے ایک مشاق خوشامدی و جی حضور یے ہوا کرتے تھے اور اس فن میں جو ماہر ہوتا تھا اس کی چاندی ہوتی اور دربار میں اس کی طوطی بولتی تھی۔ رفتہ رفتہ خوشامد ایک فن بن گیا اور ایسے فن کاروں کی باضابطہ ملازمت ہوتی تھی، بلکہ انہیں جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں۔ قصہ کوتاہ اس زمانے میں جس کسی کو اپنا کام نکالنا ہوتا تو وہ ذرا سی خوشامد کر دیتا اور اپنا کام بڑی آسانی سے نکال لیتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس راجہ یا نواب کو ذہنی رشوت دی جاتی تھی۔ اس کو آپ روحانی رشوت بھی کہہ سکتے ہیں، جس سے راشی کی روح تھوڑی دیر کے لیے آسمانوں کی سیر کرنے لگ جاتی تھی اور وہ آپ پر مہربان ہو جاتا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ خوشامد سے خدا بھی خوش ہو جاتا ہے۔

زمانہ قدیم میں جبکہ انسانی سماج آقا اور غلام اور حاکم و محکوم کے طبقوں میں منقسم ہوا تو اس زمانے سے لے کر راجہ مہاراجہ، شہنشاہ اور جاگیرداروں کے دور تک تلوار کے بعد خوشامد یعنی روحانی رشوت دنیا میں ترقی کرنے یا اپنا الو سیدھا کرنے کا آسان ذریعہ تھا۔ جہاں دیکھا کہ فریق اپنے سے کمزور ہے تو فوراً تلوار نکال لی، اور جہاں اس کو اپنے سے طاقتور پایا تو جھک کر سلام اور دست بوسی کیا اور تعریف کے پل باندھنا شروع کر دیا۔ اس میں خرچ بھی کچھ نہیں ہوتا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا۔ ایک آدمی بے وقت ہے لیکن آپ نے خوشامد سے اس کو سقراط بنا دیا، وہ بزدل ہے لیکن آپ نے اس کو سکندر بنا دیا، وہ کنجوس بلکہ مکھی چوس ہے اور آپ نے اس کو دان ویر کرن بنا دیا۔ پھر جب آپ نے اس کی اتنی مزد بلت پوری کر دیں تو کیا وہ آپ کی ایک ضرورت پوری نہیں کرے گا؟

لیکن جناب زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ جاگیرداری کا زوال شروع ہوا۔ اب نہ وہ راجہ رہے اور نہ وہ نواب بلکہ وہ بھی ضرورت مندوں میں شامل ہو گئے۔ لہٰذا رشوت کا طریقہ بھی بدلنے لگا۔ خوشامد حالانکہ اب بھی فن کا درجہ رکھتی تھی، لیکن اب اس کی قدر و قیمت گرنے لگی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو اہل غرض کی

جانب سے خوشامد کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی پیش کی جانے لگی جو اس خوشامد کو زیادہ موثر بنائے مثلاً خوشامد کی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ گرم گرم چائے۔ اب جناب اِدھر گرم گرم چائے طبیعت کو گرما رہی ہے تو اُدھر خوشامد کی میٹھی میٹھی باتیں جی کو بھرما رہی ہیں۔ حاصل قریب قریب وہی ہوتا ہے جو اصلی اور خاندانی راجے نوابوں کی خالص خوشامد میں ہوتا تھا مطلب یہ کہ رشوت ستانی کی تاریخ میں ایک ایسا دور آیا جبکہ وہ محض ذہنی یا روحانی رشوت نہ ہوکر کچھ ٹھوس بنتی گئی اور اس نے مادیت کا رُخ اختیار کرلیا۔ لہٰذا اب راشی کو خوشامد کے ساتھ کچھ ٹھوس چیزیں بھی پیش کی جانے لگیں، مثلاً آم کے ٹوکرے، ریشمی کپڑے اور چھوٹے موٹے زیور وغیرہ۔

اب دورِ جاگیرداری میں مزید زوال آیا اور سرمایہ داری نے سر اٹھانا شروع کیا۔ لہٰذا اب رہے سہے راجہ و نواب بھی ختم ہوگئے اور صرف راشی رہ گئے۔ اس لیے رشوت نے مزید ٹھوس روپ اختیار کرلیا۔ اب خوشامد ایک رسمی چیز ہوگئی اور روپے پیسے کی بات بے شرمی سے کی جانے لگی۔

سرمایہ داری میں ہر ایک چیز کی قیمت مقرر ہے۔ گھربار، زمین جائیداد کے علاوہ آپ کے جذبات اور سماج میں آپ کے مقام کا ناپ تول بھی پیسے سے کیا جاتا ہے۔ شاہی اور جاگیرداری کے دور میں کسی کی بے عزتی پر خون کے دریا بہہ جاتے تھے اور سلطنتیں تباہ ہوجاتی تھیں۔ لیکن سرمایہ داری کی بات نرالی ہے۔ کسی نے آپ کی بے عزتی کی یا بدنام کیا تو مقدمہ دائر کیجیے اور آپ کی عزت کو جو "نقصان" ہوا ہے اس کا معاوضہ دس ہزار بیس ہزار یا ایک لاکھ روپیہ تک مل جائے گا۔ انگلینڈ، جو سرمایہ داری کی جنم بھومی ہے، وہاں تو آڈلٹری (زنا) کے لیے بھی معاوضہ ادا کرنے کا رواج ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ سرمایہ داری میں سب کچھ پیسہ ہے اور سب کچھ بزنس۔ اور جب یہ بات ہے تو کسی ضرورت مند کا کام نکالنا بھی ایک بزنس ہے۔ لہٰذا آپ کا کوئی کام بنانے کے لیے خوشامد وغیرہ کے پرانے طریقے یعنی خالص یا ڈالڈا قسم کی خوشامد کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ شدھ چربی بازار میں آگئی ہے۔ اب تو بزنس کی بات کیجیے۔ "اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے"۔ بات صاف ہے کہ فلاں کام کے نکلنے پر آپ کو اتنا فائدہ ہونے کا امکان ہے، لیکن سرکاری طور پر وہ کام ذرا بے ضابطہ یا مشکل ہے۔ لہٰذا راشی افسر کو اس فائدے میں سے کچھ آفر کیجیے اور آپ کا کام بن جائے گا۔ خوشامد کرنے اور گڑگڑانے کی کیا ضرورت؟ سب پیسے کا کھیل ہے۔ اس لیے پیسے سے کھیلو اور ٹھاٹ کرو ۔۔۔!

آپ کہیں گے کہ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے یہاں یہ کیسے ممکن ہے؟ عوام گلا پکڑ دیں گے اور راشی کو بیٹھنے نہ دیں گے یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اب اس کو کیا کیجیے کہ ہماری جمہوریت بھی سرمایہ داری کے زیر سایہ ہی کام کرتی ہے۔ سرمایہ داری میں سب کچھ بزنس ہے تو لازمی طور پر اس کی سیاست بھی بزنس ہے۔ وہ زمانہ لدگیا جبکہ سیاسی لیڈر وطن پرستی، انسانیت یا کسی اونچے آدرش کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ لاٹھی گولی کھاتے تھے اور جیل جاتے تھے اور فرصت پڑنے پر الیکشن بھی لڑتے تھے۔ اور اپنے کردار و قربانی کے بل پر الیکشن جیتتے تھے۔ لیکن اب ان کا زمانہ ختم ہوگیا۔ یہ سرمایہ داری کا زمانہ ہے، اور اس کے تحت ہونے والے الیکشن میں کردار کی نہیں بلکہ پیسے کی ضرورت ہے۔ پیسہ خرچ کرو اور الیکشن لڑو چاہے تم آپ انگوٹھا چھاپ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بڑی سیاسی پارٹی کا ٹکٹ مزید وزن رکھتا

لیکن اس کے ساتھ اگر پیسے کا وزن نہ ہو تو وہ بھی بیکار ہے۔ اس جمہوریت میں اب تو ہر ایک الیکشن کا بازار بھاؤ بھی مقرر ہے۔ مثلاً ایم. ایل. اے کے لیے تین تا پانچ لاکھ اور ایم. پی. کے لیے دس تا پندرہ لاکھ کے اخراجات ضروری ہیں۔ ان حالات میں کسی غریب یا عام آدمی کا الیکشن میں حصہ لینے یا جمہوریت کا فائدہ اٹھانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا چاہے وہ کتنا ہی باکردار کیوں نہ ہو۔ یہ تو صرف دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا زمرہ ہے اور وہ الیکشن کو بھی ایک بزنس سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے اس میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ جیتے تو فائدہ ورنہ نقصان۔ اور جب کوئی شخص الیکشن جیت کر عوامی اداروں میں یعنی اسمبلی یا پارلیمنٹ میں پہنچتا ہے تو اس کو سب سے پہلی فکر یہ ہوتی ہے کہ اس نے الیکشن میں جو بھاری رقم خرچ کی تھی اس کو مع منافع کس طرح حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص عوامی نمائندہ بنتے ہی لوٹ تو چھاپ نہیں سکتا۔ اب وہ بھاری رقم کس طرح حاصل کرے؟ اس کا ایک ہی راستہ ہے رشوت ستانی یہ ایک قدرتی بات ہے۔ اس لیے سرمایہ داری کے تحت کام کرنے والی جمہوریت صرف رشوت پر ہی چلتی ہے بلکہ وہ رشوت کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ یہی بات ہے کہ آئے دن لیڈروں اور وزیروں پر کرپشن اور رشوت ستانی کے چارجس لگائے جاتے ہیں ان پر کمیشن بٹھا کر جانچ بھی کروائی جاتی ہے اور کبھی کبھی وہ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر جو واقعہ ہوا ہے اس کا تعلق ہمارے آندھرا پردیش سے ہے۔ یہاں گزشتہ سال ایک وزیر رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور چیف منسٹر نے اس کو وزارت سے برطرف کر دیا اس کے علاوہ بمبئی میں اس وقت ایک سابقہ چیف منسٹر پر مقدمہ چل رہا ہے۔ لیکن ایسے لوگ اپنا کام مہارت اور ہوشیاری سے نہ کرنے کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں۔ ورنہ ہر ایک کو وہی کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ بزنس ہی ایسا ہے۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ اب ایسی جمہوریت میں عوام کس راشی کا گلا پکڑیں گے اور کیا کریں گے!؟

اس طرح فن رشوت ستانی جو خوشامد سے شروع ہوئی تھی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ادوار میں ترقی کرتے کرتے اب زندگی کے ہر ایک شعبہ میں پھیل گئی ہے۔ سماج کا سارا ڈھانچہ اور حکومت کا ایک ایک پرزہ اس میں سنا ہوا ہے۔ ان حالات میں اگر آپ کو زندہ رہنا ہے تو اس کھیل کے قواعد کے مطابق ہی کام کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر آپ کو ایک سڑک یا بلڈنگ یا پل بنانے کا کنٹریکٹ حاصل کرنا ہے' یا نوکری یا ترقی حاصل کرنی ہے یا اپنے لڑکے کو کالج میں سیٹ دلوانی ہے۔ اگر شاہی یا جاگیرداری کا زمانہ ہوتا تو راجہ صاحب کو کچھ فرشی سلام یا ڈنڈوت کرنے پر شاید آپ کا کام بن جاتا۔ لیکن یہ سرمایہ داری کا زمانہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ جمہوریت بھی ہے' چپراسی سے لیکر حاکم اعلیٰ' لیڈر اور منسٹر تک پیسے کی سانس لے رہے ہیں' کیوں کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس کو اپنے مقام تک پہنچنے میں کتنا روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ لہذا آپ کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ آپ کی کارروائی مختلف چھوٹے بڑے حکام کے پاس (اور اکثر لیڈروں کی معرفت) سے ہوکر بڑے صاحب یا منسٹر تک پہنچے گی۔ ان میں ہر ایک کی الگ طبیعت و پوزیشن ہے اور یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کس کو کتنے فرشی سلام یا ڈنڈوت کرنے پر آپ کا کام بنے گا اور اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ بزنس کی بات کیجئے یعنی اپنے کام میں ہونے والے نفع کا تخمینہ نکالئے اور اس میں سے متعلقہ حکام اور لیڈر وغیرہ کی پوزیشن، طبیعت اور ذمہ داری (یعنی قیمت) کے لحاظ سے تناسب طے کیجئے۔ ہاتھ بڑھائیے اور لیجئے آپ کا کام بن جائے گا۔

اب آپ نے یہ تمام رقومات ادا کرنے کے بعد بچی کھچی گنجائش میں سے اپنا حصہ نکال کر اس کنٹریکٹ کو مکمل کیا اور وہ کام بگڑ گیا، یعنی تعمیر ناقص ہوئی۔ سڑک بلڈنگ اور پُل کی تعمیر میں آپ نے سمنٹ کے بجائے چونا اور مٹی بھر دیا اور چند ہی دنوں میں وہ سڑک پھوٹنے لگی، عمارت زمین پر آرہی اور پُل بیٹھ گیا تو اس میں قصور صرف آپ کا ہی نہیں بلکہ اس سسٹم کا ہے جس میں آپ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں اس میں سانس لینے کی ہوا تک میں سرمایہ داری یعنی چور بازاری ہے۔ ایسے میں اگر کوئی آپ پر الزام لگائے یا ضمیر ملامت کرے تو سمجھا دیجیے کہ یہ تمام سرمایہ داری اور رشوت کا چکّر ہے اور آج تو وہ اپنے جوبن پر ہے یعنی سماج دستکار کے ایک ایک پرزے پر رشوت کا زنگ بھرا ہوا ہے۔ ایسے میں، میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ خدا مجھے معاف کرے۔ آمین!!

باز غ بہاری (کلکتہ)

هزل

ہماری والدہ آخر بنیں گی دادی ماں کب تک
ہمارے گھر میں بھی دی جائیگی بیگم اذاں کب تک

ہے کس میں اتنی ہمت جا کے یہ مُلّاؤں سے پوچھے
کہ سارے گاؤں میں بیوہ رہیں گی مرغیاں کب تک

تمہیں میری قسم آنکھوں سے آنسو پونچھ لو بیگم
خدا جانے ابھی زندہ رہے گی میری ماں کب تک

شریف انسان ہی ڈرتے ہیں پولیس سے اور بیوی سے
سمجھ میں آئے گا یہ آپ کو راز نہاں کب تک

اگر وہسکی نہیں تو فکر کیا! تاڑی ہی پی لیں گے
یہاں بیکار بیٹھے ماریں گے ہم مکھیاں کب تک

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو
تمہیں اغیار پہناتے رہیں گے ٹوپیاں کب تک

میاں باز غ بہاری اس طرح مسجد میں جا جا کر
چراؤ گے نمازی بھائیوں کی جوتیاں کب تک

غافل انصاری (سندیلوی)

سندیلہ کے لڈو

سندیلہ ضلع ہردوئی کا تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے یہ دہی ہردوئی ہے جسے سنسکرت زبان میں ہری دروہی یعنی خدا کا دشمن کہا جاتا ہے اور بھگت پرہلاد و ہولیکا کی داستان جہاں سے وابستہ ہے۔ یہ الفاظ دیگر ہولی کا مشہور تیوہار ہردوئی ہی کی دین ہے۔ اس طرح ہولی اور سندیلہ کا ایک رشتہ خاص نکلتا ہے۔ سندیلہ ہردوئی سے اتنی ہی دور ہے جتنی دور سندیلہ سے لکھنؤ۔ سندیلہ نے سلام سندیلوی اور وجاہت علی سندیلوی ہی پیدا نہیں کئے، اس قصبہ کی شہرت کا مدار ان ادبی ہستیوں سے زیادہ لڈوؤں پر ہے۔ سندیلہ کے لڈوؤں نے صدیوں کئے کھائے جانے کی چاہ پیدا کی ہے۔ خود راقم السطور بچپن سے عین عالم جوانی تک ان کی لذت کے چٹخارے بغیر کھائے لیتا رہا ہے۔ جب عمر کی تیسری دہائی میں سندیلہ کا قرب نصیب ہوا تو ان کی مزید محرومی سوہان روح نظر آنے لگی۔ اگر معاملہ صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا تو جبر و اکراہ سے شاید طبیعت پر قابو پا یا بھی جاتا مگر جہاں ایک جہانگرد کے ساتھ بیوی بچوں کی للک بھی ہو وہاں طبیعت پر کیا بس چلتا۔ چندہی روز میں سندیلہ کا سفر درپیش آیا۔ بیگم نے عین روانگی کے وقت اپنی حسین فرمائش اس پرزہ پر درج کرادی جو کاموں کی فہرست کے سلسلے میں رکھ لیا گیا تھا۔ اب اگر سارے کام بھولے جاسکیں تو لڈوؤں کے نہ لانے کی وجہ جواز نکل سکتی تھی۔ بچوں کو جب اس شہرت یافتہ مٹھائی کی بھنک لگی تو ان کی توتلی فرمائشوں نے مجبوری کے درجۂ حرارت میں اور شدت پیدا کر دی۔

سندیلہ سے واپسی پر جب لڈوؤں کی ہانڈی کا بھاؤ دریافت کیا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس لیے نہیں کہ جیب خالی ہونے کے سبب محرومی کا خطرہ پیدا ہوتا بلکہ تحیر کی وجہ اس کے برعکس تھی۔ خاص بات صرف اتنی سی تھی کہ روز افزوں بڑھتی مہنگائی کے اثر سے سندیلہ کے لڈو اب تک محفوظ تھے۔ مہنگائی کی تیز و تند ہوائیں لڈوؤں کے نرخ کو چھوئے بغیر نکل گئی تھیں۔ پتہ لگانے پر پتہ چلا کہ پچھلی نصف صدی سے سندیلہ کے لڈوؤں کے بھاؤ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جب کہ سالانہ بجٹوں میں لگنے والے ٹیکسوں کی وجہ سے مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ شاید دنیا کا یہی واحد شے تھی جس کی بلندی کو مہنگائی چھونے سے قاصر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لڈوؤں کے نرخ میں اضافہ کا خیال ان لوگوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ ایک روپیہ کی ایک ہانڈی جو پچاس برس پہلے بک رہی تھی آج بھی اسی بھاؤ

بیچی جاری تھی۔ سندیلہ کے لڈوؤں کی ہانڈی آپ لکھنؤ، اناؤ، کانپور میں خریدیں چاہے شاہ آباد، شاہجہاں پور، بریلی میں، ہر جگہ نرخ وہی جو سندیلہ خاص میں ہے۔ لگتا ہے جیسے نہ چنگی والے اس کی چنگی چارج کرتے ہیں، نہ ریل بس ٹیکسی ٹیمپو والے اس کا کرایہ لیتے ہیں۔ گویا یہ لڈو آفات ناگہانی اور بلائے جہانی سے محفوظ ہیں۔ اس ترقی یافتہ زمانہ میں رکھ رکھاؤ، بناؤ سنگھار، فیشن اور ذوق شوق میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں سندیلہ کے لڈوؤں پر ان کا اثر کبھی نہیں پڑ سکا۔ تیسری اہم بات یہ نظر آئی کہ ہانڈی وہی مٹی کی اور منہ پر وہی لال پیلے کاغذ کی پٹی کا ڈھکن، گردن میں سُتلی کی جھول۔ لڈو بیچنے والے ایک ہاتھ میں پانچ سات ہانڈیاں لٹکائے سندیلہ کے لڈو سندیلہ کے لڈو کی صدائیں بلند کرتے ریل یا بس کی کھڑکیوں کے پاس آ آ کر مسافروں کو متوجہ کرتے ہیں۔

جہاں تک ہانڈی کی ساخت و پرداخت کا سوال ہے، سنتے ہیں اس کی شکل بھی ہو بہو وہی ہے جو نصف صدی قبل تھی۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق بندر رفتہ رفتہ انسان بن گیا۔ یہ اور بات ہے کہ آج کے بندر کی دُم گھستی ہی نہیں۔ بلکہ انسان کے اندر بندر والی عادات و خصلت پائی جانے لگی۔ سندیلہ کے لڈوؤں کی ہانڈی شکل و شباہت میں بالکل پہلے والی ہی ہے۔ کسی فلاسفر نے اس کے جمود کی تھیوری وضع نہیں کی۔ لڈوؤں کی جاذبیت نے ہانڈی کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر رہی ہے۔ گیہوں کا سائز مرغی کے انڈے سے گھٹ کر کہاں سے کہاں پہنچا۔ دنیا کا ہر فرد اس سے واقف ہے، یہی صورت ہانڈی کے ساتھ رہی وہ اپنی سابقہ شکل پر برقرار رہتے ہوئے سائز میں سکڑتی رہی۔ سائنس والے چاہے کتنا ہی کہتے رہیں کہ چیزیں گرمی سے پھیلتی اور سردی سے سکڑتی ہیں، ہانڈی پر ان کی یہ بات صادق نہیں آتی۔ ہانڈی کے نام سے مٹی کے ایک ایسے برتن کا نقشہ ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے جس میں ڈھائی تین کلو دال پکائی جا سکتی ہے یا چار پانچ لیٹر دودھ گرم کیا جا سکتا ہے۔ نرمت اور افلاس کے دور میں ہانڈی امور خانہ داری کی ایک اہم علامت بنی ہوئی تھی۔ المونیم کے فروغ نے اس کی قدر و قیمت کم کر دی اور فی زمانہ ہنڈالیم، اسٹیل کے آجانے سے تقریباً اس کا سماجی بائیکاٹ ہو گیا۔ پریشر کوکر نے اپنی سابقہ اشیاء کی مٹی پلید کر دی۔ ہانڈی کو اب موہن جوداڑو ہڑپا کی تہذیب سندھ اور محکمہ آثار قدیمہ کی چیز سمجھا جانے لگا ہے۔

سکڑتے سکڑتے سندیلہ کے لڈو کی ہانڈی کا سائز اب ایک آبخورے کے برابر آگیا۔ جیومیٹری کا اصول ہے کہ اگر کسی مثلث کی آمنے سامنے کی سطریں برابر ہوں تو ان کے زاویے بھی برابر ہوں گے اس لیے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر ہانڈی کا سائز گھٹتا ہے تو اس کے اندر کی شے بھی اسی مقدار اور تناسب سے گھٹتی رہی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پچاس گرام کا لڈو اب جامن کے برابر آگیا۔ پچاس سال پہلے بطخ کے انڈے کے برابر سولہ لڈوؤں کی قیمت ایک روپیہ ہوا کرتی تھی اب جامن کے سائز کے سولہ لڈو وہی ایک روپیہ میں ملنے لگے۔ پہلے لڈو خالص دیسی گھی میں بنتے تھے، پھر ان کی جگہ ڈالڈا نے لے لی اور اب ریپ سیڈ آئل کا نمبر آگیا۔ کھویا کی مقدار گھٹتے گھٹتے بالکل ہی کھو کر رہ گئی۔ اس زمانہ میں جب زہر بھی خالص نہیں ملتا تو لڈو کہاں تک مخلص رہ سکتے تھے۔

لڈوؤں کی شکل و صورت میں جو برائے نام تبدیلی ہوئی ہے اس سے ان کی شہرت متاثر نہیں ہوئی۔ دیسی گھی اور بیسن سے بننے والے لڈو، اب چاولوں کی لائی اور گڑ کے توسل سے بننے لگے۔ گڑ کی چاشنی نے گھی کی قلت اور مہنگائی کو چھپا لیا۔ چاول کی لائی کے سولہ لڈو ایک آبخورے کے اندر دیکھ کر دریا کا کوزے میں سما جانا یاد آگیا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد سولہ

سے گھٹ کر پانچ تک اتر آئی۔ ایک طرح سے فیملی پلاننگ کا اثر لڈوؤں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کیا تعجب کچھ دنوں بعد دو یا تین بس، یا ہم دو کے لیے لڈو دو کا نعرہ یا پھر دو کے لیے دو، دو یعنی کل چار کی تعداد میں سمٹ آئیں۔ لڈوؤں کے بنانے والے نیوجت پریوار کی اہمیت کو خوب جانتے ہیں۔ دو ماں باپ اور تین بچوں کی مجموعی تعداد پانچ ہوتی ہے شاید اسی لیے آبخورے میں پانچ لڈو نظر آتے ہیں۔

یوں تو سندیلہ کے لڈو سندیلہ کے آس پاس سو کلو میٹر کے قطر میں بکتے ہیں لیکن ان کی جو آن بان شان خاص سندیلہ میں ہے وہ کہیں اور نہیں ہے۔ جوں ہی کوئی بس سڑک پر آکر رکی کہ چہار جانب سے اس کی کھڑکیوں پر حملے ہونے شروع ہو گئے۔ جس طرح شہد کی مکھیاں متحد ہو کر حملہ آور ہوتی ہیں اسی طرح لڈو بیچنے والے بس کو چھاپ لیتے ہیں اور دس بارہ منٹ یا جتنی دیر بس ڈرائیور چائے پانی سے فراغت پاتے ہیں، ان کے شور و غل سے مسافروں کے کان پکتے ہیں۔ "سندیلہ کے لڈو، سندیلہ کے لڈو" کی کرخت آوازوں میں دوسرے ہاکروں کی آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہیں۔ بس کی ہر کھڑکی میں کسی نہ کسی "سندیلہ کے لڈو" والے کا ہاتھ اٹھا رہتا ہے۔ مسافر خواہ خاموش ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔

اگر سندیلہ کے لڈوؤں کی افادیت اور اہمیت کو مختصراً بیان کرنا مقصود ہو تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انھیں کھائے سو پچھتائے نہ کھائے سو پچھتائے۔ نہ کھانے والے کو حسرت رہ جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ سندیلہ سے گزر کر بھی ایک مشہور مٹھائی کی شیرینی کے ذائقہ سے محروم رہ گیا اور کھانے والا اپنے پیسے کے فضول برباد ہونے کے غم میں پچھتاتا ہے۔ صدیوں کے شہرت یافتہ سندیلہ کے لڈو اب لڈو رہ بھی گئے ہیں یا نہیں، یہ کہنا ذرا مشکل ہے!!

اُوم پرکاش آدتیہ (مراٹھی)

ترجمہ: بانو سرتاج

ریہرسل

کردار:

ایک بیمار عورت	پروفیسر پانڈورنگ
ویدپرمانند	ایک بچہ
کسان	بچے کے ماں، باپ وغیرہ
اسکول ماسٹر	

(ویدپرمانند کا کمرہ۔ ویدجی ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میز پر قلم، دوات اور کاغذ بے ترتیبی سے پھیلے ہیں۔ ایک لمبی شیشی رکھی ہے، جس کے لیبل پر موٹے حروف میں "امر بھاسکر چورن" لکھا ہے۔ دائیں طرف ایک بنچ ہے۔ پرمانند ایک موٹی، پرانی کتاب پڑھنے میں مشغول ہیں۔ عمر لگ بھگ پچاس برس، آنکھوں پر چشمہ، لمبی داڑھی، جھبری دار مونچھیں ہیں)

(ایک ادھیڑ عمر کی ماڈرن لباس سے سجی عورت آتی ہے اور بنچ پر بیٹھ جاتی ہے)

عورت: میں بیمار ہوں ویدجی

پرمانند: بیمار ہو تبھی تو یہاں آئیں، ورنہ کیوں آتیں؟ بیماری کا تفصیل سے بیان کیجیے۔

عورت: میرا دل دھڑکتا ہے (پہلے چھاتی کے دائیں طرف ہاتھ رکھتی ہے۔ پھر سنبھل کر بائیں طرف ہاتھ رکھتی ہے۔

پرمانند۔ اس عمر میں آثار اچھے نہیں ہیں۔ ہارٹ فیل ہوسکتا ہے

عورت: ہمیشہ گھبراہٹ محسوس کرتی ہوں۔

پرمانند: یہی تو موت کی نشانی ہے۔

عورت: (اور زیادہ گھبرا کر) نیند بہت کم آتی ہے

پرمانند۔ (کتاب بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے) آپ کا بچنا مشکل ہے بہن جی.............. نبض دکھائیے۔

عورت: (ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے) مجھے بچا لیجیے ویدجی۔
میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔

پرمانند: (نبض تھامتے ہوئے) مرنا تو کوئی بھی نہیں
چاہتا۔ لیکن پرمانند اپنے مریضوں کو اکثر مرتے دیکھا
ہے۔ آپ کو سپنے بھی آتے ہیں؟

عورت: جی، کبھی کبھی۔

پرمانند: سپنے میں بھوت بھی دکھائی دیتے ہوں گے؟

عورت: (گھبرا کر سر ہلاتے ہوئے) بھوت تو کبھی نہیں۔

. . . .

پرمانند: (نبض چھوڑ کر) آج دکھائی دیں گے۔ دھیان
سے دیکھیے گا۔

عورت: آپ میرا کچھ علاج کیجیے ویدجی۔

پرمانند: دل کے اندرونی حصے پر چندن کا لیپ کیجیے۔

عورت: (حیرت سے) اندرونی حصے پر۔

پرمانند: (شیشی اٹھا کر عورت کے ہاتھ پر چورن انڈیلتے
ہوئے) جی ایسا ہو سکے تو کیجیے۔ اس طرح
سے کھائیے کہ پیٹ میں نہ جا کر سیدھا دل میں
جائے۔

عورت: کھانے پر پرہیز کا ہے ویدجی۔

پرمانند: پرہیز ہی اصلی علاج ہے۔ آپ پندرہ دن تک
کھانا مت کھائیے۔

عورت: پندرہ دن تک؟

پرمانند: ہاں۔ اور دس دن تک پانی مت پیجیے۔

عورت: ویدجی ...... پانی ......

پرمانند: میرا مطلب ہے ٹھنڈا پانی مت پیجیے۔ ابال کر
پیجیے۔

(ایک کسان دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

عورت: ویدجی، پھر کب آؤں آپ کی پناہ میں؟

پرمانند: کبھی بھی آیئے۔ ویسے پرمانند کے پاس جو ایک
بار آ گیا ہے وہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔

(عورت سہمی ہوئی بناوٹی ہنسی ہنس کر جاتی ہے)

کسان: (دروازے سے ہی ہاتھ جوڑ کر پرمانند کی طرف
آتے ہوئے) رام رام ویدجی۔

پرمانند: (غور سے کسان کو دیکھتے ہوئے) رام رام آؤ
بھائی۔ تم تو بیمار دکھائی دیتے ہو۔

کسان: (بنچ پر بیٹھتے ہوئے) میں نہیں، میری گائے
بیمار ہے۔ دس دن سے نہ چارہ کھاتی ہے
نہ دودھ دیتی ہے۔

پرمانند: تم بیمار ہو یا تمہاری گائے۔ میرے لیے ایک
ہی بات ہے۔ لاؤ نبض دکھاؤ۔

کسان: جی! نبض میں دکھاؤں؟

پرمانند: اور کون دکھائے گا؟ گائے تمہاری بیمار ہے
یا کسی اور کی؟ (نبض دیکھتے ہوئے)
گائے کی حالت تو بہت پریشان کن ہے بھائی
اسے فوراً چارا کھلاؤ ورنہ مرے بغیر نہیں رہے گی۔

کسان: ویدجی۔ یہی تو روگ ہے کہ وہ چارہ نہیں کھاتی

پرمانند: اچھا سوچ کر گائے کو اسی کا دودھ پلاؤ۔

کسان: وہ دودھ نہیں دیتی ویدجی۔

پرمانند: تم پلاؤ گے تو ضرور ہی دودھ دینے لگے گی۔
(شیشی اٹھا کر) یہ امرت رس کر لے جاؤ۔

گرم پانی کے ساتھ کھالینا۔

کسان : جی میں کھاؤں یا گائے کو کھلاؤں ؟

پرمانند : (چورن کسان کے ہاتھ پر ڈالتے ہوئے) تم بھی کھالینا گائے کو بھی کھلا دینا۔ دونوں کو فائدہ ہوگا۔

(تیزی سے ہانپتے ہوئے ایک اسکول ماسٹر کا داخلہ۔ عمر پینتالیس سال کے قریب، کرتہ پائجامہ، جواہر کٹ، پاؤں میں معمولی چپل۔ کئی دنوں سے شیو نہیں ہوئی۔

اسکول ماسٹر : ویدجی۔ جلدی چلیے۔ میرا لڑکا بیہوش ہوگیا ہے (کسان رام رام کرکے جاتا ہے)

پرمانند : آپ کا لڑکا کتنا بڑا ہے عمر میں

اسکول ماسٹر : جی کافی بڑا ہے۔

پرمانند : آپ سے چھوٹا ہی ہوگا۔

اسکول ماسٹر : جی .... میرا تو لڑکا ہی ہے۔

پرمانند : نہیں۔ کئی بیٹے اپنے باپ سے بھی بڑے ہوجاتے ہیں۔ آپ کیا کام کرتے ہیں ؟

اسکول ماسٹر : جی کام تو کچھ نہیں کرتا۔ اسکول ماسٹر ہوں۔

پرمانند : میں بھی پہلے اسکول ماسٹر تھا۔ میرے پڑھائے ہوئے بچے جانوروں سے بھی زیادہ سمجھدار ہوتے تھے

اسکول ماسٹر : ویدجی۔ جلدی چلیے۔ یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میرا لڑکا ....

پرمانند : (اٹھتے ہوئے) چلیے ..... چلیے۔ یہ امر بھاسکر چورن کی شیشی اٹھا لیجیے۔ (اسکول ماسٹر شیشی اٹھاتا ہے۔ دونوں کا جانا۔)

(دوسرا منظر)

پروفیسر پانڈو رنگ کا کمرہ۔ پانڈو رنگ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میز کے ایک کونے پر کچھ کتابیں اوپر نیچے رکھی ہیں۔ وہ دیوار پر نظر گڑائے کچھ سوچ رہے ہیں۔ عمر بیالیس سال داڑھی فرنچ کٹ۔ مونچھیں صاف۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا کالا چشمہ۔ کالا سوٹ کالی ٹائی پہنے ہیں)

(وہی عورت آکر سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عورت : میں بیمار ہوں پروفیسر صاحب۔

پروفیسر : آپ کو وہم ہوگیا ہے۔ آپ بیمار نہیں ہیں۔

عورت : میرا دل دھڑکتا ہے۔

پروفیسر : دل تو میرا بھی دھڑکتا ہے۔ اس میں نئی بات کیا ہے ؟ دل کا کام ہی ہے دھڑکنا۔

عورت : گھبراہٹ بہت رہتی ہے۔

پروفیسر : یہ آپ کے دل کی کمزوری ہے، بیماری نہیں۔

عورت : یہ کمزوری کیسے دور ہوسکتی ہے۔

پروفیسر : ہمت سے۔ ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ آپ سیدھی ہوکر بیٹھیے۔

(عورت سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے)

پروفیسر : آنکھیں بند کرلیجیے

(عورت آنکھیں بند کرلیتی ہے)

پروفیسر : اب آپ کہاں ہیں ؟

عورت : آپ کی دوکان میں۔

پروفیسر : نا..... آپ خطرناک جنگل میں ہیں۔ میری دکان

نہیں۔

عورت: (...) یہ تو آپ کی دوکان ہے۔

پروفیسر: (...) محسوس کیجیے کہ آپ جنگل میں ہیں۔ ہیں نا آپ جنگل میں؟

عورت: (کانپ کر) جی ...... جی ...... ہوں ......

پروفیسر: (پہلے دھیمی پھر رفتہ رفتہ تیز آواز میں) بھیانک جنگل ...... اندھیرا ...... ہاتھیوں کی چنگھاڑ ...... شیروں کی دھاڑ اور پھر ...... سناٹا ......

عورت: جی ...... جی پروفیسر صاحب ......

پروفیسر: شیر آپ کو دیکھ کر دھاڑتا ہوا، چھلانگ لگا کر آپ کی طرف بڑھ رہا ہے ...... اس کی آنکھیں آگ کی طرح دہک رہی ہیں ...... ناخن کٹار کی طرح ...... دانت بجلی کی طرح ......

عورت: (گھبرا کر رو دینے کی کیفیت میں) جی ...... جی ...... جی ......

پروفیسر: گھبرائیے نہیں۔ آنکھیں نہ کھولیے ...... آپ شیر سے لڑیں۔ میں آپ کو جتاؤں گا ...... لڑیئے۔ لڑیئے ...... آپ لڑ رہی ہیں نا ......؟

عورت: (گھبرائی ہوئی آواز میں) جی لڑ رہی ہوں۔

پروفیسر: (ہوا میں گھونسے چلاتے ہوئے) اب اسے گھونسے سے مار دیجیے۔ اس کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کے دانت توڑ دیجیے۔ جلدی کیجیے۔

(چند لمحے رک کر) ابھی مارا یا نہیں؟

عورت: (پھولی سانس سے) جی مار دیا۔

(آنکھیں کھول کر گھبرائی نظر سے ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ دروازے پر کسان ابھی ابھی آکر کھڑا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر اچھل پڑتی ہے۔ جیسے شیر دکھائی دے گیا ہو)

پروفیسر: اسی طرح آپ طوفانی سمندر میں کود پڑیے، ناقابل عبور پہاڑوں پر چڑھیے ...... چمبل کی گھاٹی میں ڈاکوؤں کا سامنا کیجیے۔ آپ کا دل لوہے کی طرح مضبوط ہو جائے گا۔

عورت: پانڈورنگ جی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہیں بیٹھے بیٹھے میرا دل دھڑکنا بند نہ کر دے۔ میں چلتی ہوں، نمستے۔

(جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر، تیزی سے جاتی ہے)

پروفیسر: (ایک ہی سانس میں) راستے بھر آنکھیں موند کر محسوس کرتی جائیے کہ آپ رانی لکشمی بائی کی طرح لڑائی کے میدان میں تلوار چلاتی ہوئی بڑھ رہی ہیں۔

کسان: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) رام رام پروفیسر جی

پروفیسر: ایک بات پہلے ہی دھیان سے سن لو۔

کسان: (نزدیک آکر) کیا پروفیسر جی؟

پروفیسر: تمہیں کسی طرح کی کوئی بیماری نہیں ہے۔

کسان: میں تو آج تک آپ کی دعا سے کبھی بیمار رہا ہی نہیں۔ پچھلے دس دنوں سے میری گائے بیمار ہے۔

پروفیسر: گائے بیمار ہے تو تم کس لیے آئے ہو؟ گائے کا علاج کیا تمہیں دیکھ کر کروں؟

کسان: جی وہ نہ چارا کھاتی ہے۔ نہ دودھ دیتی ہے۔

پروفیسر: گائے کا چہرہ دیکھے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کل اس کا
چہرہ دکھاؤ ہم فیس ریڈنگ face reading
کرکے بیماری بتائیں گے۔

کسان: پروفیسر جی۔ چہرہ کیسے لایا جا سکتا ہے؟ گائے کو ہی
لے آؤں گا۔

پروفیسر: (غصے سے) گائے کو لے آؤگے؟ یہ دوکان ہے یا گؤ
شالہ۔ گائے کا ایک فوٹو کھنچوا کر لے آنا۔ جاؤ۔ میرا
وقت برباد مت کرو۔

(سترہ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی کا داخلہ)

لڑکی: پروفیسر صاحب۔ چلیے ...... جلدی چلئے میرا
بھائی بے ہوش ہو گیا ہے۔

پروفیسر: کس طرح؟

لڑکی: ایک گھنٹے سے نہ بولتا ہے نہ ہلتا ڈلتا ہے۔

پروفیسر: یہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔

لڑکی: کچھ لوگ کہتے ہیں مرگی ہے۔

پروفیسر: بالکل نہیں۔ مرگی ان کو ہے جو ایسا کہتے ہیں۔

لڑکی: ایک ڈاکٹر نے ڈپتھیریا بتایا ہے۔

پروفیسر: ایسے ڈاکٹر کو بلایا ہی کیوں آپ نے؟

لڑکی: جلدی چلیے ڈاکٹر جی۔ میرا دل کانپ رہا ہے۔

پروفیسر: یہ آپ کے دل کی کمزوری کا ہے ڈپتھیریا نہیں۔

لڑکی: ڈپتھیریا مجھ کو نہیں، میرے بھائی کو ہے۔ آپ
جلدی چلیے۔

پروفیسر: (چھڑی اٹھاتے ہوئے) چلیے چلیے، گھبرائیے مت

لڑکی: آپ کا بیگ؟

پروفیسر: میرے دماغ میں ہے۔

(دونوں جاتے ہیں)

(تیسرا منظر)

(اسکول ماسٹر کا مکان۔ ایک بارہ برس کا لڑکا پلنگ
پر بے ہوش پڑا ہے۔ سرہانے کی طرف وید پرمانند
جی بیٹھے ہیں۔ پائنتی کی طرف لڑکے کا پتا یعنی
اسکول ماسٹر۔ لڑکے کی ماں وید جی کے قریب
فکرمند اور پریشان کھڑی ہے)

ماں: وید جی۔ میرے لڑکے کو بچائیے نہیں تو میں مر جاؤں گی۔

پرمانند: بے فکر رہیے۔ جب تک میں دوا نند یہاں
کوئی نہیں مر سکتا۔

ماں: وید جی۔ کسی طرح اسے ہوش میں لائیے۔ یہ میرا
اکلوتا بیٹا ہے۔

پرمانند: میں بھی اپنے چھوٹے بھائیوں کے پیدا ہونے سے
قبل اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، لیکن اتنی بری طرح کبھی
بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

پتا: اسے کیا ہو گیا ہے وید جی؟

پرمانند: یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔

ماں: یہ ٹھیک ہو جائے گا نا وید جی

پرمانند: ٹھیک تو ہو جائے گا مگر ہوش میں نہیں آئے گا۔

ماں: (سسکی لیتے ہوئے) وید جی ....!

پتا: ایسا نہ کہیے وید جی ...... ہم آپ کی شرن میں
ہیں۔

(پروفیسر پانڈورنگ اور لڑکی کا داخلہ)

لڑکی: وید جی بھی بیٹھے ہیں۔ پروفیسر صاحب۔ پتا جی مجھ
سے پہلے ہی وید جی کو بلا لائے۔

پروفیسر: (آگے بڑھ کر وید پرمانند کی طرف دیکھتے
ہوئے) کون؟ وید پرمانند ایم اے (کمالت)
کا سگا بھائی!

پرمانند: اور تمہارا [illegible] پروفیسر [illegible] ......
تم ذات (مزاح) - بیت (صفرا) - [illegible]
ساتھ ہی کیوں چلے آتے ہو؟

پروفیسر: اس لیے کہ تم مریض کی نبض پکڑ کر اس کی جان نہ لے لو

(پانڈورنگ دوسری طرف لڑکے کے سرہانے بیٹھتے ہیں)

پتا: اس کی ڈیڑھ گھنٹے سے یہی حالت ہے پروفیسر جی۔

پروفیسر: مجھے اس کا چہرہ دیکھنے دیجیے۔

پرمانند: چہرہ دیکھ کر اس کی تصویر بناؤ گے؟

پروفیسر: خاموش رہیے آپ۔ مجھے سوچنے دیجیے۔

پرمانند: چپ رہیے گا۔ وہ جو بے ہوش ہے میں چپ نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس کا علاج کرنا ہے۔

پتا جی: جلدی کیجیے ویدجی۔

ماں: ویدجی۔۔۔۔۔ اسے ایسی جڑی بوٹی سنگھائیے کہ یہ ابھی کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگے۔

پرمانند: گھر میں دیسی گھی ہے؟

ماں: گائے کا ہے ویدجی۔

پرمانند: کسی کا بھی ہو۔۔۔۔۔ گھی ہونا چاہیئے۔

پروفیسر: گھی کا کیا کیجیے گا؟

پرمانند: پروفیسر پانڈورنگ کی کھوپڑی پہ مالش کروں گا جس سے اس کا دماغ ٹھیک کام کرے گا۔

پروفیسر: دیکھیے۔ آپ کے لڑکے کو کوئی بیماری نہیں ہے آپ پرمانند جی کی باتوں میں نہ آئیے۔

پرمانند: ان کی باتوں میں آئیے جس سے یہ اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اسے ڈبل بے ہوش کر دیں۔

پروفیسر: کون کہتا ہے کہ یہ بے ہوش ہے؟

پرمانند: سنیے۔۔۔۔۔

ماں: ڈاکٹر جی۔۔۔۔۔ یہ بے ہوش نہیں ہے تو پھر بولتا کیوں نہیں؟

پروفیسر: اسے آپ تنہائی میں رکھیے۔

پتا: جی؟؟

پروفیسر: اور اس سے کہیے کہ یہ محسوس کرے کہ یہ بے ہوش نہیں ہے۔

پرمانند: اور اس لڑکے سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ جب تک ہوش میں نہ آجائے تب تک پروفیسر کی باتوں پہ دھیان نہ دے۔

ماں: ویدجی۔۔۔۔۔ ڈاکٹر جی۔۔۔۔۔ میرے بچے کا خیال کیجیے۔ اسے کچھ دوا دارو دیجیے۔

پرمانند: یہ لیجیے امرت بھاسکر چورن۔ ہوش میں آنے پر گرم پانی کے ساتھ کھلا دیجیے۔

پتا: (چڑ کر) پہلے اسے ہوش میں لانے کی دوا دیجیے۔

پروفیسر: اسے ایسی کہانیاں سنائیے جن میں بے ہوش لوگوں کے ہوش میں آنے کا بیان ہو۔

ماں: ماں یہ بے ہوش ہے اور آپ لوگوں کو کہانیوں کی سوجھ رہی ہے

پروفیسر: یہ بے ہوش نہیں ہے۔

پرمانند: تو کیا ہے؟

پروفیسر: اسے وہم ہو گیا ہے کہ یہ بے ہوش ہے۔ دراصل یہ ہوش میں ہی ہے۔

ماں: آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر جی۔ ان باتوں سے تو آپ ہمیں بھی بے ہوش کر دیں گے۔

پروفیسر: اسی کو اعصابی مرض کہتے ہیں۔ آپ سب اس سے کہیے کہ یہ ہوش میں ہے۔

پرمانند: تمہارا سر ہوش میں ہے۔ یہ تو خوب بے ہوش ہے۔

پروفیسر: میں کہتا ہوں یہ ہوش میں ہے۔

پرمانند: اس کی نبض بتا رہی ہے کہ یہ بے ہوش ہے۔

پروفیسر: اس کا چہرہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہوش میں ہے۔

پتا: ویدجی۔۔۔۔۔ آپ لڑیے مت۔

ماں: میرے بچے کا خیال کیجیے۔

پرمانند: یہ بے ہوش ہے اس کا بچنا مشکل ہے۔

پروفیسر: یہ ہوش میں ہے اس کا مرنا مشکل ہے۔

پرمانند۔ میں اسے امرجاسکر چیلن دوں گا۔ یہ بے ہوش
پروفیسر: بے ہوش تم ہو، یہ نہیں۔
پرمانند: ہوش میں تم ہو، یہ نہیں
پروفیسر: اسے اعصابی مرض ہے۔
پرمانند: اسے مرگی ہے۔
ماں: ہائے رام۔ یہ روگ پر روگ بڑھائے جا رہے ہیں۔
(اچانک لڑکا چادر پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ سب چونک پڑتے ہیں)
لڑکا: مرگی . . . ہے ویدجی کو اور اعصابی مرض ہے پروفیسر پانڈورنگ کو۔ میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ نہ مجھے کوئی وہم ہے نہ کچھ محسوس کرنے کی ضرورت۔
پتا: (حیرت سے) رمیش!
ماں: (دوڑ کر بیٹے کو گود میں لیتی ہوئی) میرا لال! تجھے کیا ہوگیا تھا میرے لاڈلے!
رمیش: کچھ نہیں ماں۔ اسکول میں پرسوں ایک ناٹک ہونے جا رہا ہے۔ مجھے اس میں دو گھنٹے کی بے ہوشی کی اداکاری کرنی ہے۔ اسی کی ریہرسل کر رہا تھا۔
ماں: (رمیش کی پیٹھ پر ہلکا ہاتھ مار کر) ارے! آگ لگے تیری ریہرسل کو۔ تو بیس تیس منٹ اور ایسے ہی رہتا ہے تو میری ریہرسل ہو جاتی چل تیرے لیے حلوہ بناتی ہوں۔ تو صبح گمان کے گھر سے لوٹ کر آیا ہے۔

(لڑکا اپنی ماں کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے ان کے پیچھے لڑکے کا پتا اور بہن بھی چلتے ہیں ویدجی اور پروفیسر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا کندھا پکڑے ہوئے ان کی طرف حیرت سے دیکھتے ہیں)

پروفیسر: میں نے کہا تھا نا کہ یہ لڑکا ہوش میں ہے۔
پرمانند: (اسی طرف دیکھتے ہوئے) میں نے بھی بچپن میں ایک بار بے ہوشی کی ریہرسل کی تھی مگر اس طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔
(شیشی ہاتھ سے گرتی ہے۔ پرمانند لڑکھڑا کر گرتے ہیں۔ پانڈورنگ انہیں کمر میں ہاتھ ڈال کر سنبھالتے ہیں۔)
پروفیسر: (اٹھتے ہوئے) آپ گر نہیں رہے ہیں ویدجی...
. . . . . . آپ گر نہیں رہے ہیں . . . . .
آپ محسوس کیجیے کہ آپ گر نہیں رہے ہیں محسوس کیجیے . . . . محسوس کیجیے . . . . . . کیجیے
. . . . کیجیے
(پردہ گرتا ہے)

شگوفہ کا منفرد و ضخیم

ڈرامہ نمبر

قیمت: ۲۵ روپے

سلیم آغا قزلباش
(پاکستان)

زبان

زبان دانتوں کے مستعد چوبداروں کی کڑی حفاظت میں ایک لاابالی ملکہ کی طرح رہتی ہے مگر یہ زمانے کے رنگ ڈھنگ سے بھی بخوبی آشنا ہے. شروع شروع میں اس کا دائرہ کار فقط جسم کو اشیائے خورد و نوش کی کڑواہٹ یا مٹھاس سے باخبر رکھنے تک محدود تھا تاکہ وہ کہیں غلطی سے کوئی زہریلی چیز نہ کھا مرے' پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جسم کے اندر بسنے والے کی خواہشوں کی تکمیل میں دیکھتے ہی دیکھتے ہر ذائقے کو چکھنے لگی. مانا کہ یہ "اندر والے" کے معمولی اشارہ پر زبان دانی کا مظاہرہ بیچ چورا ہے کرسکتی ہے' مگر اس سب کے باوجود اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے. منہ کی پٹاری میں یہ کسی ناگن کی طرح پھنکارتی ہے' سو سو بل کھاتی ہے' اس کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگ سکتا' البتہ یہ کرم فرمائی پر مائل ہو جائے تو خود اپنے ہی زہر کا تریاق بن کر حیاتِ نو کا پروانہ بھی ہاتھوں میں تھما دیتی ہے' مجھے بعض اوقات یقین ہی نہیں آتا کہ انسان نے ایک تڑپتی مچلتی ہستی کو کیوں کر اپنے کھلے ذہن میں گھیر رکھا ہے' شاید ہونٹوں کے بند بھی زبان کی تلملاہٹ ہی کو روکنے کے لیے باندھے گئے تھے لیکن یہ نوکِ زبان سے چند لمحوں میں ہی انھیں موم کر لیتی ہے اور وہ فی الفور اس کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں. یوں بھی اگر یہ منہ میں زیادہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہے تو اس کا دم رُکنے لگتا ہے' لہٰذا یہ ہر آن بولتی ہے' ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے' راز و نیاز کی باتیں کرتی ہے اور پیار محبت کی پینگ کے ہلارے لیتی ہے' بلکہ یہ تو نازک سے نازک ذائقے کی تلخی ترشی اور شیرینی کو یوں جان جاتی ہے جیسے کوئی ماہر مرافِ سونے کی ڈلی میں کھوٹ کی معمولی سی آمیزش کو بھی چٹکیوں میں پہچان لیتا ہے. ایک مرتبہ میں زبان کی بدمزگی کا علاج کروانے اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر صاحب نے میری شکایت سنتے ہی کہا "ذرا اپنی زبان تو دکھائیے" اور پھر زبان کو ملاحظہ کرتے ہی ارشاد فرمایا "میٹھی چیزوں کا استعمال ذرا کم کیا کریں". میں جو اس سے پہلے زبان کو جسم کا محض ایک "باتونی" عضو سمجھتا آیا تھا' یک بیک اس کی خاموش زبانی کا قائل ہو گیا اور شاید پہلی بار مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ یہ جسم کے اندر کی بھی ہمراز ہے اور جب اس کے جی میں آئے جسم کے رازِ نہاں کو نوکِ زبان پر لا کر طشت از بام کرسکتی ہے' چنانچہ میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ زبان کو حتی المقدور منہ میں بند ہی رکھنا چاہیے

موجودہ دور کے ہر شریف آدمی کے پاس تین زبانیں (لغوی اعتبار سے) ہر وقت موجود ہیں یعنی دکھانے والی' دھمکانے والی اور کھا پی کر مکر جانے والی' مگر ظاہری ساخت کے اعتبار سے سب زبانیں "ایک زبان" ہیں فرق صرف ان کے طریقِ استعمال کا ہے اور اسی باعث سے زبان دان اور بے زبان کا فرق بھی عیاں ہو جاتا ہے' ورنہ خوبصورت ریپر میں لپٹا لپٹایا کسی چیز کے کھرا کھوٹا

ے کی قلعی کیونکر کھل سکتی ہے؟ بعض زبانیں قینچی کی طرح ہر وقت کُتر کُتر چلتی رہتی ہیں اور پل بھر میں سب کچھ کاٹ ڈالتی ہیں۔ اس قسم
زبانیں دم لیکر بات کرنے کے انداز کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ ایسی نوع کی زبانیں بیویوں کو بکثرت الاٹ ہوئی ہیں۔ دوسری بڑی تعداد
زبانوں کی ہے جو ہاں میں ہاں ملانے ہی میں اپنی عافیت دیکھتی ہیں۔ یہ صرف شوہروں کے نصیب میں لکھی گئی ہیں، پھر کچھ زبانیں بڑی
مزاج ہوتی ہیں، چاہے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑیں مگر یہ اُف تک نہیں کرتیں، ایسی زبانیں اللہ کے خاص خاص
وں کو ہی عطا ہوتی ہیں اور اگر کبھی یہ رضائے الٰہی سے مائل بہ حرکت ہو جائیں تو وقت کی زمام ان کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے اور
لا بات تسبیح کے دانوں کی طرح ان کی انگلیوں میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زبان شیطان کی آنت ہوتی ہے لیکن
ن کو من مانیاں کرنے کا سودا ہوتا ہے بلکہ یہ خونخوار درندے کی سی خو بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کو پٹہ ڈالنے کے لیے سارے
ن قاعدے گھڑے گئے ہیں مگر یہ پھر بھی غرّاتی رہتی ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی خاص بھید یہ اپنے اندر چھپا لے تو راج کرنے والی
ن ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں بیچارے جسم کی تو گویا شامت ہی آ جاتی ہے، اکثر اوقات یہ جسم کی حالت پر رحم
ر راز اگل دیتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ جسم کی ایک نہیں سنتی اور خود کو مرتے دَم تک بتیس دانتوں میں بند رکھتی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ
ن کنکٹ" سے مشابہ ہے مگر عملی طور پر ساری ہلچل، جنگ و جدال اور جوتم پیزار اسی آفت کی پرکالہ کے نت نئے لچھنوں اور
فعل کا شاخسانہ ہے۔ یہ بیک وقت کئی قسموں کی میٹھی میٹھی اور کڑوی بولیاں بولتی ہے لیکن اب بولیوں کا لُب لباب فقط یہ ہے کہ اسکے زیادہ سے زیادہ
نخرے اُٹھائے جائیں۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ دہن کے چند مربع انچ بالا خانے میں بیٹھنے والی اس مغنیہ کے لیے صدہا اقسام
الوانِ نعمت کیا ماکولات کیا مشروبات، شب و روز باورچی خانوں، کارخانوں، بھٹیوں اور تنوروں میں سینکڑوں ہاتھوں کی مدد
ے تیار کیے جاتے ہیں تاکہ سستے داموں زیادہ سے زیادہ لذتِ کام و دہن اس زبان دراز مخلوق کو مہیا کی جا سکے۔ اس لحاظ سے
ن مجھے مغلِ اعظم سے کسی طور کم مرتبہ نظر نہیں آتی جسے سیاہ و سفید پر مکمل اختیار حاصل تھا اور جس کی خوشنودی کی ہر کسی کو ضرورت

سُننے میں آیا ہے کہ روح جسم کے زندان میں اسیر ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو پھر روح کی گرمی کو محسوس کرنے کے لیے زبان
مقیاس الحرارت کو بروئے کار لائے بغیر چارہ نہیں۔ گنگ زبان دراصل کسی نقص کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اظہار کی شدت کا غیر معمولی
ہار ہے، جس سے اس کا پورا سرکٹ خراب ہو جاتا ہے اور یہ گراموفون کی سوئی کی طرح ایک جگہ پر اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ
ن جو لکنت کا مظاہرہ کرتی ہے درحقیقت شخصیت کی احتیاط پسندی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے! ایسی زبان کے مالک و مختار ہر بات
ے سوچ بچار کے بعد منہ سے نکالتے ہیں اور تکلم کے ہر صیغے کو مناسب "وقفوں" اور "فل سٹاپوں" میں انجام دینے کے قائل ہیں
، وہ جو ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں، افادیت پسندی کے سچے پیروکار مانے جاتے ہیں، جبکہ وہ لوگ جو فر فر بولتے
زندگی میں کسی اصول ضابطے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انجام کار زبان کی باگ ڈور پر اختیار نہ ہونے کے سبب منہ کی کھاتے ہیں اور
ایک دن ذہنی توازن کھو کر پاگل خانے کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک زبان پھولوں کی چھڑی ایسی بھی ہوتی ہے،
یہ گل باری پر آتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ ٹوکروں کے حساب سے گل و لالہ جھڑ رہے ہیں، اس زبان کے پروردہ جیتے جی اپنی من
مرادیں پا لیتے ہیں، البتہ ایک زبان ایسے گنوں والی بھی ہے جو کسی وقت بھی خاردار جھاڑی میں تبدیل ہو سکتی ہے اور کوئی چاہے
سے ہزار دامن بچا کر گزرے یہ اس سے اُلجھ پڑتی ہے اور بالآخر اس کا کوئی نہ کوئی بخیہ ادھیڑ کر ہی دم لیتی ہے۔ ایسا مزاج رکھنے
ا زبان کا چلن روز افزوں ہے، جس کے نتیجے میں دامن کے چاک کو گریباں کے چاک میں منتقل کرنے کے وافر مواقع پیدا ہونے لگے

ہیں، پھر ایک زبان ایسی بھی ہے جو دوسروں کو قائل کرنے کے لیے ہٹ دھرمی سے کام لیتی ہے اور اکثر نازک موقعوں پر اپنے مادی لہجے میں باعث نکالی دے کر معترض کی ہر معقول بات کو فرش کر دیتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو "کھری کھری" میں ایسی کھری سناتی ہے کہ سامعین کی طبیعتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ میں نے اس سے زیادہ ناعجیب بات آج تک نہیں سنی کہ جسم کے گھاؤ تو مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے گھاؤ کبھی نہیں بھرتے۔ حالانکہ جسم پر لگے گھاؤں کی مناسب طبی دیکھ بھال نہ کی جائے تو ان کے بگڑ جانے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے اصل میں زبان کی کارکردگی کا سارا دارومدار اس کی حاضر جوابی میں ہے۔ وہ صاحبان جن کی زبان اور خیالات میں تال میل برقرار رہتا ہے اکثر و بیشتر مناقشے کی بازی جیت جاتے ہیں اور اللہ کے وہ نیک بندے جن کے خیالاتِ زریں کی رسد زبان کی احتیاج سے میل نہیں کھاتی عموماً بھری محفل میں اپنی سبکی کروا کر اٹھتے ہیں البتہ گھر پہنچ کر انہیں وہ تمام جوابات دھڑا دھڑ یاد آنے لگتے ہیں جن کا عین موقع پر کال پڑ گیا تھا۔ لہٰذا زبان کی ورزش اور صفائی وصلائی کا کام انتہائی ضروری ہے تاکہ اس کی صحت اور پھرتی میں کسی طرح کی نہ آنے پائے۔ ایسی زبان جو غضب ناک حالت میں کف اڑاتی ہے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی، اس قسم کی زبان آداب دشنام طرازی سے نابلد ہوتی ہے بھلا محض کف اڑانے کا فائدہ! یہ تو ناتجربہ کاروں کا وطیرہ ہے۔ منجھا ہوا بدکلام تو اپنی زبان میں ایسی تہ دار گھمبیرتا اور کھنک پیدا کرتا ہے کہ حزبِ مخالف سات پشتوں تک لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔

غالب نے کہا تھا ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں　　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اس شعر کا مفہوم فقط یہ ہے کہ مرزا صاحب مہذب طریقے سے محبوب کے حضور احتجاج کرنے کا درس دینا چاہتے تھے۔ غالب کا یہ مہذب احتجاج سر آنکھوں پر لیکن میرے خیال میں مرزا صاحب محبوب کی چہکتی بولتی زبان کو پنجرے میں بند کرنے کا گر نہیں جانتے تھے ورنہ وہ معذرتی پیرایہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ یہ معاملہ صرف غالب کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام سخن ورانِ اردو زبان اپنے اپنے محبوب کے آگے جس بے زبانی اور بے سرو سامانی کا رونا روتے آئے ہیں وہ محض ان کی عاقبت نااندیشی کا نتیجہ ہے، اگر وہ محبوب سے اجازت طلب کیے بغیر زبان کے جوہر دکھا کر اسے شرمسار کرنے کی زحمت فرماتے تو پھر شاید محبوب بھی بے چوں و چرا ان سے غیر مشروط ناطہ جوڑنے پر راضی ہو ہی جاتا۔ صاف بات تو یہ ہے کہ حالات کی گرمی سردی، تلخی و شیرینی بلاواسطہ زبان کے "دوتارے" پر اثر انداز ہوتی ہے گویا ہر شخص کی زبان کے استعمال سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمانے نے اس کی زندگی پر کون سا رنگ کتنی مقدار میں چڑھایا ہے، لہٰذا دوسروں کی اصلیت کو جاننا از بس ضروری ہو تو پھر ان کی زبان کے استعمال پر کڑی نظر رکھیے۔ خاموشی کی بھی اپنی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے۔ لیکن اسے کوئی قسمت والا ہی جان سکتا ہے اور جو کوئی ایک مرتبہ اس کو پڑھنا سیکھ جائے اس پر گویا چھپے بھید دل کی حقیقت آشکار ہونے لگتی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے سلوک کی تمام منزلوں سے باحفاظت گزر جاتا ہے مگر وہ گروہ "بے زبان" جو دعائیں دینے کی عادت میں مبتلا ہے نئی نسل تیزی سے غائب ہو رہی ہے اور وہ وقت شاید زیادہ دور نہیں جب ایسی زبان کو قومی عجائب گھر میں بڑے دھڑلے کی ایک اچھی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا جائے گا۔ اور تو اور خون کے رشتوں کی ساری جان اسی گوشت پوست کے لوتھڑے میں بند ہے اس لیے زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے رابطوں میں گہری دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ایک معین مدت کے لیے آپسی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یقین کیجیے! زبان تو ایک ایسا گورکھ دھندا ہے کہ جس کی جڑوں کو کھود نکالنے کے جنون میں کئی ماہرینِ لسانیات اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر اس گرگٹ مزاج پر کوئی مستقل قسم کی روک ٹوک نہ لگا سکے ہر چند کو سو پچاس میل کی مسافت طے کر کے

بلکہ اس کے لب و لہجے کے تیور کچھ کچھ بدلنے لگتے ہیں لیکن اس کی "اوقات" میں رتی بھر فرق نمودار نہیں ہوتا، اس لحاظ سے یہ اپنی ہٹ کی پکی ثابت ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ چند صدیاں بتانے کے بعد زبان ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے، اسی طرح تاریخ کے نشیب و فراز بھی اکا دکا رکاوٹ ہم تک پہنچے ہیں، مانا کہ اس نے اس سلسلے میں گفتار کے بے شمار جوہر دکھائے ہیں مگر اس سے حقائق میں سدھار پیدا نہیں ہو سکا۔ اس دور میں ہر کوئی زبان کی کمائی کھا رہا ہے امیر غریب، شریف بدمعاش سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان کے جھول پر چی کھول کر اعتراضات وارد کر رہے ہیں لیکن زبان کے اصلی منتہا کو سمجھنے سے ہر کوئی قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ ان سب کی زبانیں اب اپنے اپنے تالو سے چپکنے لگی ہیں۔

موسمی تغیرات براہِ راست کسی زبان کی زرخیزی اور بنجر پن کا موجب بنتے ہیں۔ چنانچہ ایسے علاقے جہاں کے باسی خشک سالی اور مفلوک الحالی کا سامنا اکثر کرتے ہیں، ان کی زبان بھی سنگلاخ اور بدحال ہو جاتی ہے، جبکہ ایسے جغرافیائی ماحول میں بسنے والے جہاں پر ہر سو پہاڑی چشمے پھوٹ رہے ہوں، ندی نالے چھل چھل گیت گا رہے ہوں، وہاں کی زبان میں بھی لڑکپن کی ساری اچھل کود رچ بس جاتی ہے۔ اسی طرح دریاؤں کے علاقے میں رہنے والوں کی زبان میں دریا کی روانی اور فصلوں کی لہلہاہٹ کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ اس کے مقابلے میں ساحل سمندر پر آباد لوگوں کی زبان میں جوش و خروش اور طنطنہ پایا جاتا ہے، البتہ کبھی کبھی اُن کی زبان میں نمکینی کی ماترا بڑھ جاتی ہے۔

پرندوں میں طوطے یا افریقی مینا کی زبان، انسانی زبان کی تقلید میں چند شبد تو بول سکتی ہے مگر یہ بول بھی اُسے عموماً رٹائے جاتے ہیں، اس کے پیچھے مفہوم عنقا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھے انسانوں کا جم غفیر بھی ایسے ہی طوطوں اور میناؤں کا جھنڈ نظر آتا ہے جس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے، وہ محض کسی دوسرے کی تیار کردہ لفظیات پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے بیسویں صدی میں سیاسی زبان کا بول بالا ہے اور گونگے کی ماں کی طرح محض سیاست دان ہی اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل قوتِ گویائی صرف انسان کے نصیب میں نہیں لکھی گئی ہے، دوسرے تمام پرندوں اور درندوں کو بھی زبان کی اس نعمت سے نوازا گیا ہے۔ البتہ ان سب کی زبانیں ارتقا کی ابتدائی منازل سے آگے کا فاصلہ طے نہ کر سکیں، وہ اس لیے کہ انہیں پیچیدہ ذہنی اور نفسیاتی مسائل درپیش نہیں تھے۔ ان کی زبان محض چند جائز مطالبوں تک محدود ہے۔ انہیں اگر پورا کیا جاتا رہے تو وہ چہچہانا، ممیانا اور دھاڑنا غیر مشروط طور پر بند کر دیں گے۔ اس کے مقابلے میں حیوانِ ناطق کے مطالبات بنیادی مطالبات سے کہیں زیادہ ہیں اور بالفرض اُسے شداد کی تعمیر کردہ جنت جتنی سہولیات میسر آ جائیں تو بھی وہ "ہل من مزید" کا تقاضا جاری رکھے گا، جس کی وجہ سے اس کی زبان میں آئے دن بے شمار لفظوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ پھر یہ کہ زبان کی ایک حیثیت ٹکسال کی بھی ہے کہ وہ دن رات لفظوں کے سکے گھڑنے پر مامور ہے۔ سو اگر زبان کو کھلی چھٹی مل جائے تو جگہ جگہ لفظوں کے انبار قطب کی لاٹھ ایسے مناظر دکھانے لگ جائیں۔ شاید زبان کی اسی کارکردگی سے گھبرا کر بعض لوگ لفظوں کے ہجوم میں ایک لمبی چپ سادھ کر دل ہی دل میں "اکو حرف تیرے درکار" کا ورد کرتے رہتے ہیں اور یوں وہ اُن منازل کو چھوتے ہیں کامیاب ہوئے ہیں جہاں آج کے دور کا باسی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اشاروں کنایوں کی زبان کو اپنا کر ان لاکھوں ملین الفاظ کی "لوڈ شیڈنگ" کرے جو ہر لمحہ زبان کی ٹکسال سے چمکتے دمکتے سکوں کی صورت باہر لڑھکتے چلے آ رہے ہیں اور جن کے چراغوں کو اگر بروقت گل نہ کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ دنیا "افراطِ لفظ" کا شکار ہو جائے!!

عابدہ محبوبؔ (حیدرآباد)

"دھجیاں"

مسالہ:— ایک بزرگ صاحب میک اپ کا سامان خرید رہے تھے۔ ان کے ایک حیدرآبادی دوست نے مذاقاً پوچھا:— "یہ سامان کیا اپنے لیے خرید رہے ہو؟"
بولے نہیں یار! بیگم کے لیے خرید رہا ہوں"۔
دوست نے حیرت سے پوچھا "اس عمر میں؟"
ہنس کر بولے "پرانی عمارت کو داغ دوزی کی ضرورت زیادہ ہی ہوتی ہے"! پھر ایکدم پوچھ بیٹھے "تم بھابی کے لیے نہیں لوگے؟"—
حیدرآبادی دوست نے اطمینان سے جواب دیا
"نہیں! تمہاری بھابی اس مسالے کی بنی ہوئی ہیں جس سے ہمارا "چارمینار" تعمیر ہوا تھا!"

بزرگ ہستی:— ایک حیدرآبادی خاتون اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ پاکستانی خواتین لباس، میاچنگ میک اپ اور بالوں کے اسٹائل میں ایک سلیقہ منفرد رکھتی ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ معمر خواتین بھی اپنے سفید بالوں کو کالا کرتی ہیں اور "بنی ٹھنی" رہتی ہیں۔
جب انھوں نے بھی بالوں کو کالا کر کے اور میک اپ کر کے پراسرار کیا جانے لگا تو وہ بولیں "ارے بھئی! شادی کا گھر ہے۔ اس موقع پر دولہا دولہن کو دعائیں دینے کے لیے کوئی بزرگ ہستی تو بھی رہنے دو"۔

ماہر فن:— پاکستان کے کسی بڑے صنعت کار نے اپنی کمپنی کے لیے غیر ملک سے ایک ماہر فن کو بلوایا تاکہ وہ کمپنی کے ملازمین اور عہدے داروں کو کام کے تعلق سے پوری معلومات دے اور ان میں مہارت بھی پیدا کرے۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد صنعت کار نے ماہر فن سے پوچھا۔

"آپ کو ہمارا ملک کیسا لگا؟ ہم لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"
ماہرِ فن نے جواب دیا "آپ کا ملک اچھا لگا! اور ہاں آپ لوگ گدھوں سے کام لینا خوب جانتے ہیں!"
صنعت کار نے جواب دیا "جی ہاں... جی ہاں... جبھی تو ہم نے آپ کو یہاں بلوایا ہے!"

۴۔ "مقابلہ": — ایک حیدرآبادی خاتون پاکستان گئیں تو بہت سے رشتے داروں نے فرمائش کر کے بگھارے بیگن اور مرچ کا سالن پکوایا اور خوب مزے لے لے کر کھایا۔ ایک پاکستانی خاتون نے چھیڑنے کو کہا۔
"حیدرآبادی خواتین کو آتا ہی کیا ہے؟ بس بیگن ہی پکانا جانتی ہیں!"
حیدرآبادی خاتون کب چوکنے والی تھیں۔ بولیں۔
"پاکستانی خواتین کو تو بیگن بھی ڈھنگ سے پکانا نہیں آتا!"

۵۔ غلطی: — ایک صاحب کا سات سالہ لڑکا بے حد شریر و نٹ کھٹ تھا۔ ایک بار ان کے دوست ملاقات کے آئے۔ لڑکا شرارتیں کرتا رہا۔ والد ٹوکتے رہے منع کرتے رہے مگر اچھل کود برابر جاری رہی۔ دوست پہلے تو ضبط سے کام لیتے رہے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اُٹھ کر لڑکے کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ لڑکا روتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ یکایک دوست کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بولے
"معاف کرنا! میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا!"
صاحب بولے "تم نے بہت اچھا کیا! مگر وہ تھپڑ مجھے مارا ہوتا تو بہتر تھا!"
کیوں کہ یہ آفت "میری غلطی کا نتیجہ ہے!"

۶۔ "گدھا": — ایک دس سالہ لڑکا کتابوں کا وزنی بیگ پیٹھ پر اُٹھائے اسکول جا رہا تھا۔ اس کی سُرخ آنکھیں دیکھ کر ایک راہ گیر نے سوچا کہ زبردستی اسکول بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہو اس نے لڑکے کی دلجوئی کے لیے کہا
"بڑا پیارا لڑکا ہے۔ اسکول جا رہا ہے! کیا نام ہے آپ کا؟"
لڑکا بولا "میرا نام گدھا ہے!"
خلافِ اُمید جواب سن کر راہ گیر حیران رہ گیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا لڑکا بولا۔
"دیکھتے نہیں ہو کتابیں پیٹھ پر لاد کر لے جا رہا ہوں!"

۷۔ واپسی: — ایک خانگی کمپنی میں ملازم ایک صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی کیلئے چار دن کی چھٹی لی۔ چار دن بعد بھی ملازمت پر نہ آئے تو انکے گھر دریافت کیا گیا۔ پتہ چلا کہ وہ لڑکی کو وداع کرنے اسکے سسرال تک ساتھ گئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اسکے بعد دوسرا ہفتہ ختم ہوگیا۔ پھر تیسرا ہفتہ شروع ہوگیا مگر موصوف کا پتہ نہ تھا۔ آخر کمپنی کے منیجر غصہ آگیا۔ بولے "لگتا ہے جناب تو اُسکے عقیقے کی دعوت نوش فرما کر ہی واپس تشریف لائیں گے؟"

(* نمبر ۶ نمبرے کاموں کے لیے کراچی کے بعض علاقوں میں گدھا گاڑی استعمال کی جاتی ہے)

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

پیکرانِ بے سخن

عصمت چغتائی سری نگر میں مظہر امام کے گھر مہمان ہوئیں۔ ایک دن مظہر امام نے عصمت چغتائی سے پوچھا "منٹو نے آپ کے خاکے میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ تم نے عصمت سے شادی کیوں نہیں کی۔ مان لیجئے، منٹو سے آپ کی شادی ہو جاتی تو آپ کی ادبی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑتا۔ آپ نے کبھی اس سوال پر غور کیا ہے"؟

عصمت چغتائی نے جواب دیا "یا تو میں لکھنا چھوڑ دیتی یا منٹو قبل از وقت مر جاتا"۔

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر مظفر اقبال، پروفیسر شاداب رضی اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ بات فراق گورکھپوری کی حاضر جوابی پر آئی تو ڈاکٹر مظفر اقبال نے کہا "ایک صاحب کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ وہ فراق کے پاس بیٹھے اپنی سیر و تفریح کی داستان سنا رہے تھے۔ جب وہ ایک تیرتھ استھان کے بارے میں بتانے لگے کہ "میں نے وہاں مندروں کی سیر کی اور بہت سارے بندر ......"

تو فراق نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ہاں، مندروں میں زیادہ تر بندر ہی جاتے ہیں"۔

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر لطف الرحمن، ڈاکٹر رئیس الرحمن اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ آرہ کے ایک مشاعرہ میں نوح ناروی نے آرہ پر شعر پڑھنا شروع کیا ؎

نارے سے چلے نوح تو آرے پہنچے
آرے سے چلے نوح تو نارے پہنچے

سامعین میں سے ایک آواز ابھری "چندا ماما دور کے، آئے بارے پہنچے، ندیا کنارے آئے" دوسری آواز ذرا زوردار تھی "جی نہیں، شٹل ٹرین ہے"۔

ڈاکٹر مظفر اقبال نے ایک محفل میں سنایا "ایک بار تیمور لنگ کے پاس ایک اندھی عورت گئی جس کا نام دولت تھا۔ تیمور لنگ نے کہا "دولت اور اندھی"!

عورت نے برجستہ جواب دیا "اگر اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس کیوں آتی"؟

مبصر :۔ ڈاکٹر محبوب راہی

بال کی کھال (تبصرہ)

الف سے قطب مینار

مصنف :۔ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی۔
صفحات :۔ ۱۲۸، قیمت :۔ دس روپے
رابطہ :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵ اور شاہین
۲۔ جاوید عزیزی۔ پھولوں والی گلی۔ آکولہ (مہاراشٹر)

"الف سے قطب مینار" بادی النظر میں کسی جدید علامتی نظم یا تجریدی افسانے کا عنوان لگتا ہے جبکہ یہ درحقیقت ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کی تازہ ترین تصنیف کا منفرد، اچھوتا اور کسی حد تک مضحکہ خیز نام۔ مناسبت اور برجستگی کے اعتبار سے اس کتاب کا نام ایسا ہی ہونا ضروری تھا کہ یہ طنز و مزاح پاروں۔ خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت میں فخرالدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی کی مالی اعانت شامل ہے۔

شیخ رحمٰن اکولوی (ڈاکٹر کہا دم چھلا تو ابھی ابھی لگا ہے) نے سات برس قبل مٹی اور افسانوں کے ایک مجموعے "لمس شعور" کے ذریعے بحیثیت افسانہ نگار اپنے آپ کو متعارف کروایا تھا۔ مگر افسانے کے مستقبل کی کوئی گارنٹی نہیں اور مستقبل منڈھے چڑھنے والی نہیں غالباً یہی سوچ کر شیخ رحمٰن نے اس سے دامن جھٹک کر مزاح نگاری سے وابستہ ہو گئے اور تابڑتوڑ اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا ایک باوقار مجموعہ "بلا عنوان" منظر عام پر لاکر اچھے اچھوں میں اپنی مزاح نگاری کی ساکھ قائم کر لی۔ بیشتر صف اول کے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ لکھنے والوں نے رحمٰن صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے روشن ادبی مستقبل کی پیش گوئیاں کیں جن میں خواجہ احمد عباس، فلا انصاری، فکر تونسوی۔ یوسف ناظم۔ ڈاکٹر مظفر حنفی۔ مجتبیٰ حسین۔ شفیقہ فرحت اور خواجہ عبدالغفور جیسے نامور اور مستند لوگ شامل ہیں جو نہ تو غالب کے طرفداروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی سودے بازی میں انھیں آج تک ملوث پایا گیا ہے۔ رحمٰن اکولوی کے فن پر ان حضرات کی آراء سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ طنز و مزاح نگاروں کے خاندان میں شیخ رحمٰن اکولوی کی پیدائش کنہیا لال کپور کا خلا پر کرنے کے لیے ہوئی ہے
(خواجہ احمد عباس)

۲۔ اردو شاعری میں "شیخ" پر طنز و تعریض کے جتنے تیر چل چکے ہیں سب کا حساب برابر کرنے کی صلاحیت ہے اکولوی شیخ میں" (فلا۔ انصاری)

۳۔ "شیخ رحمٰن اکولوی رہتے تو ایسے شہر میں ہیں جس کے نام کا کوئی نقطہ نہیں لیکن یہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پیدا کر لیتے ہیں۔" (یوسف ناظم)

۴۔ "قاری چاہے آپ کے مضمون کا ایک سطر چھوڑ کے دوسری پڑھنے لگے تو ہنسنے سے نہیں بچ سکتا۔" (فکر تونسوی)

۵۔ "مزاح کی شائستگی، زبان کا تخلیقی استعمال، اشارے کی تیزی، اپنا مذاق اڑانے کا ظرف اور کسی بھی مزاحیہ صورت حال کو ایک قابل یقین خوبصورت مبالغے کے ساتھ بیان کرنے کا اعتماد ان کی مزاح نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔" (مجتبیٰ حسین)

۶۔ ان کی طنز لطیف ہوتی ہے۔ انھیں پڑھنے والا بے ساختہ اپنے اندر گدگدی سی محسوس کرتا ہے اور زیر لب مسکراتے

کے ساتھ کچھ محسوس کر بھی رہ جائے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

ویلنٹ ادب کے ان صاحب نظر معتبر مستند اور معتقد حضرات کی ان ٹھوس اور مدلل آراء کے بعد اب میرے لیے کیا رہ جاتا ہے کہنے کو لہٰذا میں اپنی جانب سے کسی قسم کی حاشیہ آرائی نہ کرتے ہوئے کتاب کا مختصر تعارف پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

زیر تبصرہ کتاب شیخ رحمن اکولوی کے تخلیق کردہ چاودھا کے۔ ایک انشائیہ اور مالیخی، دس مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں بالخصوص پر دے "الف سے قطب مینار" یوسف ناظم صاحب (خاکہ) آم (انشائیہ) سوال اور اسپتال میری نظر میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ چند جملے پیش خدمت ہیں۔

"قطب مینار کی دوسری منزل ہی سے طبیعت تصوف کی طرف مائل ہونے لگتی ہے"۔ (الف سے قطب مینار)

"احتیاط پسندی و کفایت شعاری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سر اور کنگھے کو اس طرح دور رکھتے ہیں جیسے وہ ایک دوسرے سے الرجک ہوں"
(یوسف ناظم صاحب)

"تخمی آم ہاضم ہوتا ہے۔ مریضوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے کہ بار بار غذا میسر نہ ہونے کی وجہ سے معدے کی تیزابیت بڑھ سکتی ہے"۔ (آم)

"انٹرویور عام طور پر وہی سوالات اُمیدواروں سے پوچھتا ہے جن کے جوابات سے وہ خود نابلد ہوتا ہے۔" (سوال)

"سرکاری اسپتال میں مریض کے بچنے کے امکانات کم ہوتے ہیں تو خانگی اسپتال میں مرض کے ختم ہونے کے" (اسپتال)

کتاب کا دلکش اور دیدہ زیب سرورق حسب معمول مشہور آرٹسٹ شکیل اعجاز نے بنایا ہے جو کہ رحمن صاحب کے لیے گھر کی مرغی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظ۔ انصاری اور ابراہیم بسمل کے پیش لفظ اور تعارف نیز فلیپ پر مجتبیٰ حسین کی رائے شامل ہے۔ دیدہ زیب کتابت اور بے داغ روشن طباعت سے سجے سجائے اس بیش بہا مجموعے کی قیمت دس روپے کوڑیوں کے مول کے مصداق ہے۔ اس اعتبار سے اس ہوشربا گرانی میں اسے خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جاسکتی ہے اور ساتھ ہی یہ پیشین گوئی بھی کہ "الف سے قطب مینار" یقیناً شیخ رحمن اکولوی کی ادبی قامت کو کچھ اور بلند (قطب مینار سے سوا) کرنے کا موجب ہوگا! (ڈاکٹر محبوب راہی)

دسے کے خط .....

(مراسلے)

مکرمی، السلام علیکم!

ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مضامین اور منظومات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں اور انہیں بلا شبہ معیاری کہا جا سکتا ہے۔

ادارے میں یوسف ناظم صاحب کی شمولیت سے آپ کا رسالہ مزید جاندار ہو جائے گا۔ آپ کی طرح مجھے بھی اس کا یقین ہے۔

جوہر سیمابی کے بعد ناظم انصاری کی موت طنز و مزاح کے لیے ایک زبردست المیہ ہے۔ یہ دو خالی جگہیں مشکل سے پُر ہو سکیں گی۔

ظفر جگدلپوری

محترم مصطفیٰ کمال صاحب! تسلیم

"ہندوستانی مزاح نمبر" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ نمبر میں بیشتر تنقید نگاروں نے مایوس کیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے خوب ہے۔ البتہ قیمت عام قاری کی قوتِ خرید سے کہیں زیادہ ہے۔ آئندہ سے اس جانب دھیان دینے کی ضرورت ہے اردو قارئین کی جیب ابھی اتنی وزنی نہیں ہے۔

اردو میں بہت سارے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ظریف شاعروں کا صرف اور صرف ایک تذکرہ "تذکرۂ خندۂ گل" ہی دیکھنے کو ملا ہے وہ بھی کوئی خاص نہیں ہے "شگوفہ" نے یادگار نمبر نکالے ہیں۔ اگر آپ بقید حیات مزاحیہ شاعروں اور ادیبوں کے خود نوشت حالات پر مشتمل شگوفہ کا ایک خصوصی شمارہ نکال دیں تو بڑا کام ہوگا۔

ظفر کمال، پٹنہ

"شگوفہ" ... اور دلکش خصوصی شمارہ "ہندوستانی مزاح ..." مل گیا تھا۔ بے حد شکریہ قبول فرمائیے! آپ کی ... اس ... دوڑ دھوپ اور خلوص کی داد دیتا ہوں ...!

راز سنتو کھسری

جناب مصطفیٰ کمال صاحب! السلام علیکم!

کل "شگوفہ" ملا۔ مجتبیٰ صاحب کا مضمون بہت خوب ہے۔ سفرنامہ دلچسپ ہے۔ اور ناظم صاحب کے لیے جو صفحات مخصوص کئے گئے ہیں انھیں پڑھ کر انتقال کا افسوس اور شکنت ہوا ...!

شکیل اعجاز (اکولہ)

محترم کمال صاحب! سلام مسنون

حضرت ناظم انصاری کے انتقال کی خبر ملی مرحوم میری ہمت افزائی فرماتے رہتے تھے ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں ان کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے اللہ ان کو غریقِ جنّت کرے آمین۔

پاگل عادل آبادی

برادرم مصطفیٰ کمال صاحب۔ آداب و نیاز

شگوفہ کا شمارہ ستمبر ۸۸ء موصول ہوا۔ ناظم چچا سے متعلق مضمون اور انتخاب کلام شائع کرنے پر میں اور اہلِ خاندان آپ کے بے حد مشکور ہیں۔

اصغر جمیل، ناگپور

مکرمی و محترمی جناب کمال صاحب۔ سلام مسنون۔

شگوفہ میں جناب وجاہت علی صاحب کا مضمون "موسم تیغ و تبر آیا ہے پھر" نظر نواز ہوا۔ بے حد پسند آیا یہ مختصر فکر انگیز مضمون اپنے موضوع کی افادیت کے لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون اردو ادب میں طنز یہ و مزاح نگاری پر ان کی عمیق نظر اور وسیع مطالعہ کا مظہر ہے۔ انھوں نے طنز و مزاح کے فن پر بھی جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ داد و ستائش ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستانی مزاح نمبر پر ان کا بے باکانہ اور مخلصانہ تبصرہ بھی ہے۔ اور انہوں نے ... ایک اچھے اور غیر جانبدار ... کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا حق ادا کیا ہے۔

صغیر احمد سندیلوی۔

"میری زندگی ہی میرا پیغام ہے"

صداقت
عدم تشدد
امن
محبت
رواداری
بے خوفی
مساوات
سادگی
سودیشی

گاندھی جی کے لئے یہ صرف لکھے ہوئے الفاظ یا علامتیں نہیں تھیں۔ یہ ان کے ہر عمل، ہر قدم کی کسوٹی تھی، انہیں خوبیوں نے ان کی زندگی کو انسانی قدروں کا بہترین نمونہ بنا دیا، ان کے ہر قول کو ایک پیغام کی حیثیت دے دی۔

ایک پیغام، جو ہمارے لئے ہمیشہ مشعل راہ ہے

R. No. 15823/68
SHUGOOFA Hyderabad-1
Vol. 18 Copy 10
October 1985 Phone : 557716

دن بھر کی خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں کی خرابی کو دور کرتا ہے

مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دہن یعنی منھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

سپلائر کردہ:

کارخانہ زندہ طلسمات۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳

NOVEMBER

Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

جلد (۱۸) ★ نومبر ۱۹۸۵ء ★ شمارہ (۱۱)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

○ قیمت فی پرچہ ۴ روپے ○ زرِ سالانہ ۳۵ روپے
○ بیرونی چندے ۱۲۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱، بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون: آفس: ۵۵۰۷۱۶ ، ۵۵۰۷۱۶ رہائش: ۵۲۱۰۶۴

○ کتابت: محمد عبدالرؤف خوشنویس
○ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چار کمان، حیدرآباد

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

طرب خود کلامی ـــ یوسف ناظم ـــ ۷
سردی ـــ رؤف خوشتر ـــ ۱۱
فلورا فونٹین سے فور لمٹیڈ تک ـــ شاہنواز اشر ـــ ۱۹
ٹوٹی پیالی ـــ شفیع شیخ ـــ ۳۱
سڑک چھاپ مجنوں ـــ حفیظ مارش ـــ ۳۵
ایک تاجر کا خط ـــ منظور وقار ـــ ۳۷
ہم بھی ایڈیٹر بن گئے ـــ سیفی سرونجی ـــ ۳۹

افسانچے

دھجیاں ـــ عابدہ محبوب ـــ ۲۷

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

پتنگ ـــ اکبر حمید ـــ ۱۵

پیچ وخم کا پیچ وخم

سوال نامہ اور جواب الجواب ـــ موسیٰ کلیم برق آشیانوی ـــ ۴۳

نہیں آتی تو یاد ان کی .... (یادِ رفتگاں)

انتخاب کلام سرور ڈنڈا ـــ ۵۱ تا ۵۸

چورن (منظومات)

زہر زہریری ۱۰ سمیع جلیل ۱۴ نسیم سحر ۱۴
اسمٰعیل ظریف ۱۸ صابر بہاری ۱۸ چکر ۲۵
حیدر بیابانی ۲۵ جگلوا ۲۶ ۔۔۔ ۳۰
ظہیر الدین ظہیر ۳۰ شیون ۳۰

دیے کے خط ..... (مراسلے) ۴۸
پھر ملیں گے اگر ..... (ادارہ) ۴۹

یوسف ناظم

طربِ خود کلامی

یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ہمارے دوست متین الدین افسانہ نگار بن جائیں گے۔ ہمارے دوستوں میں صرف متین الدین ہی ایک پڑھے لکھے آدمی تھے اور اِن سے ہمیں بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ خود اپنے اور ہمارے ساتھ ایسا ناروا سلوک کریں گے۔ اصل میں زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلے کئی سالوں سے ہم دیکھ رہے تھے کہ متین الدین کے عادات و اطوار کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور افسانہ نگاری سے اُن کی دل چسپی بڑھتی جارہی ہے۔ افسانہ نگاری پر جو بھی اور جہاں بھی کوئی بیٹھک یا سیمی نار یا سیمپوزیم ہوتا وہ وہاں ضرور پہنچ جاتے۔ سیمی نار اور سیمپوزیم میں فرق کیا ہوتا ہے یہ انھیں تو خیر چھوڑ یئے خود ہمیں بھی نہیں معلوم۔ رسالوں، اخباروں میں پڑھنے کے لائق کئی چیزیں ہوتیں۔ دوسری چیزیں تو ہوتی ہی ہیں لیکن خود اشتہارات خوبصورت خواتین سے پُر اور دل چسپ مضامین سے لبریز، تعداد میں اتنے ہوتے کہ کسی اور چیز کے پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لیکن متین الدین صرف کہانیاں پڑھتے۔ کچھ نہیں تو محض کہانیاں ہی۔ کہانیوں کے پلاٹ ذہن نشین کرتے۔ ان میں اگر پلاٹ نہیں ہوتا تو ان کے چند فقرے ہی یاد کر لیتے اور شعر کی طرح انھیں گنگناتے۔ "اندر ہی اندر" انھوں نے دور دور کے شہروں میں رہنے والے افسانہ نگاروں سے خط و کتابت اور مقامی کہانی کاروں سے ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ تاہم ہم یہ نہیں سمجھے تھے کہ وہ ہمیں اس قسم کا دھوکہ دیں گے اور خود افسانہ نگاری شروع کر دیں گے۔

غلطی اصل میں ہم سے ہوئی۔ جب انہوں نے ہماری نظروں کے سامنے افسانے سے متعلق لٹریچر (اسے لٹریچر ہی تو کہیں گے) پڑھنا شروع کیا اور تنقیدی مضامین پڑھنے لگے تو ان کے دوست کی حیثیت سے ہمیں چاہئے تھا کہ ہم ان کی دستگیری کرتے۔ انھیں ٹوکتے۔ روکتے۔ انہی تنقیدی مضامین نے متین الدین کو گمراہ کیا۔ دوسری غلطی جسے غلطی نہیں کہا جا سکتا ہم سے یہ ہوئی کہ ہم کوئی سال بھر کے لیے ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ اتنے عرصے کے لیے ہمیں باہر نہیں رہنا چاہیے تھا ہمیں تو کوئی سفر نامہ بھی نہیں لکھنا تھا کیونکہ اتنا جھوٹ ہم لکھ نہیں سکتے۔

بس ہمارا یہی باہر رہنا ظلم ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ ہماری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر متین الدین

افسانہ نگار بن جائیں۔ وہ کچھ اور بن جاتے ہمیں شکایت نہ ہوتی۔ جب ہم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے عزیز دوست
ملک کے مانے ہوئے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے لگے ہیں اور اب آدمیوں میں ان کی واپسی کا امکان نہیں ہے۔
ان کا قلمی نام ہمیں سنجیدہ متین بتایا گیا۔ یہ بھی کچھ کم صدمہ نہیں تھا لیکن سچ پوچھئے تو یہ نام ہمارے جی کو لگا۔ ایک تو اس
میں صوتی آہنگ ہے۔ دوسرے اس کا ترجمہ آسان ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان دو چھوٹے چھوٹے لفظوں میں قند
مکرر کا جو لطف ہے وہ بے پناہ ہے۔ ان سے فوری طور پر ملاقات کا امکان نہ تھا کیوں کہ جب ہم باہر سے لوٹے تو وہ افسانہ
نگاری کی کسی ورک شاپ میں کام کرنے کے لیے شہر سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس قسم کی ورک شاپوں میں سُنا ہے
اوور ٹائم بھی بہت ہوتا ہے۔

کئی دن بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ان میں صرف معنوی تبدیلی ہی نہیں آئی ہے
بلکہ ایک ظہوری تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے یعنی یہ کہ وہ چشمہ بھی لگانے لگے ہیں۔ چشمے کی کیفیت پوچھی تو سنجیدہ متین نے
بتایا کہ موجودہ زمانہ میں ایک افسانہ نگار کے لیے زیرو نمبر کا چشمہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ یقیناً ہوتا ہوگا۔ اور نمبر بھی
اس کا زیرو ہی ہوتا ہوگا۔ کیوں کہ یہی نمبر افسانے کے نمبر سے ملتا جلتا نمبر ہے۔ جلسے میں افسانہ پڑھتے وقت یہ چشمہ آنکھوں
سے ہٹا کر سر پر چڑھا لیا جاتا ہے تاکہ سر چشمہ معلوم ہو۔ ہم نے کہا، متین الدین! چشمے کی بات تو ہم سمجھ گئے لیکن اپنی
افسانہ نگاری کی وجوہات اور اغراض و مقاصد بتاؤ۔ متین الدین ایک مشاق افسانہ نگار کی طرح پہلو بدل کر اس طرح
بیٹھ گئے جیسے کسی رسالے کے نامہ نگار کو انٹرویو دے رہے ہوں۔ ہم نے کہا تمیز سے شریف آدمی کی طرح بیٹھو اور
صاف صاف بتاؤ کہ تمہارا یہ حال ہوا کیسے؟ متین الدین نے جب دیکھا کہ ہم پر اُن کے ملک کے مانے ہوئے افسانہ نگار
بن جانے کا کوئی رُعب نہیں پڑا ہے اور ہم اُن کے تاریخی بیان نہ لیں تو لیجیے بلکہ یوں سمجھئے لپیا ہوئے اور کرسی پر از سرِ نو
سلیقے سے بیٹھتے ہوئے بولے۔ بتاتا ہوں تم سے کیا پردہ ہے لیکن خدا کے لیے کہیں مجھے کوٹ نہ کرنا۔ باہر میری بڑی شہرت
ہے۔ مسکرانے کو تو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پُرانی دوستی کے مدِ نظر ہم مسکرائے اور متین الدین کو ہم نے اطمینان دلایا کہ ہم
انھیں کہیں بھی کوٹ نہیں کریں گے کیوں کہ ہماری حالت ابھی اتنی بگڑی نہیں ہے اور یہ کہ وہ بے فکری سے اپنی داستانِ
حیات یعنی سالِ گزشتہ کی داستان پیش کریں۔

متین الدین نے کہا کہ میں حسبِ معمول اپنا پسندیدہ لٹریچر پڑھ رہا تھا کہ ایک بڑے نقاد کا مضمون ہاتھ
لگ گیا۔ اس مضمون میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ افسانہ ادب کی کوئی اعلیٰ صنف نہیں ہے بلکہ ایک معمولی صنف ہے۔
بس یہی قول میری افسانہ نگاری کا سنگِ بنیاد ہے۔ میں نے سوچا جب یہ کوئی اعلیٰ صنف نہیں ہے تو اس میں آسانی
سے جوہر دکھائے جا سکتے ہیں بلکہ اس صنف میں جوہر غیر ضروری چیز ہے۔ میں نے فوراً کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کچھ
دوستوں کو سنائیں۔ تم کو ظاہر ہے نہیں سنائیں۔ جن کو بھی سُنائیں انھوں نے منٹوں میں تعریفوں کے پل تعمیر کر دیئے
اور میں ہر پل پر سے گزرتا گیا۔ میں تو اس عظیم تنقید نگار کا ممنونِ احسان ہوں جس کی تحریر نے مجھے اس
صنفِ ادب کی طرف مائل کیا اور ساتھ ہی تمہارا بھی کہ جب میں افسانہ نگار بننے کی پرورش پا رہا تھا تم یہاں نہیں تھے۔
ہم نے پوچھا متین الدین تم اپنی کہانیوں کا پلاٹ کہاں سے چُراتے ہو۔ بولے کہانیوں کا یہی تو ایک مسئلہ

تھا۔ جب یہ مشہور ہو گیا کہ پلاٹ چرائے جاتے ہیں تو کہانی لکھنے والوں نے سرے سے پلاٹ کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ اب کہانی میں پلاٹ ہوتا ہی نہیں ہے تو چرائے جانے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ تو ایک لحاظ سے ترقی ہوئی۔ کردار بھی بلند ہوا۔ سنجیدہ متین بولے لیکن بغیر پلاٹ کی کہانی لکھنا بے مشکل۔ کوشش یہ کرنی پڑتی ہے کہ اس میں کہیں پلاٹ نہ آ جائے۔ بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے اور پھونک پھونک کر قلم اٹھانا پڑتا ہے۔
اسی لیے ایک تنقید نگار نے حال حال میں کہا ہے کہ کہانی ہوا میں جنم لیتی ہے ہم نے پوچھا کیا موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ اگر کہانی جنم لے لے تو اسے ہوا اور دھوپ سے کیسے بچایا جائے۔ سنجیدہ متین نے یہ سن کر اپنا زیرو نمبر کا چشمہ پہن لیا۔ کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ چشمہ بھی پہننے کی چیز ہے۔ یقیناً ہو گی کیوں کہ پہننے کی جو چیزیں تھیں وہ تو اب پہنی نہیں جا رہی ہیں۔ اور بولے ہمارے تعلقات پرانے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم افسانہ نگاروں کو اس نظر سے دیکھو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مانا کہ ایک صاحب نظر نے افسانے کو ادب کی ادنیٰ صنف بتایا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ کہانی لکھنے والے افراد صاحب مرتبہ نہیں ہوتے۔ ہمارے دل پر ایک گھونسا لگا۔ متین الدین ہم پر بگڑ بھی سکتے ہیں اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا لیکن ہم نے سوچا اگر آج ہم ان کے غصے سے ڈر گئے تو عمر بھر کے لیے ہمیں ان کے مقابلے میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے رہنا ہوگا اور ہم سے نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں معلوم ہے اس میں کیا تکالیف ہوتی ہیں۔ دوستوں کا آپس میں ہمسر اور ہم چشم ہونا ضروری ہے ہم چشم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں۔ آنکھیں ہی نہیں ملا سکتے ہوں تو پھر بات کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس سے تو فون پر بات کرنا اچھا ہے۔ دوستوں کے ہم چشم ہو جانے کی بات ہم نے کسی رسالے کے اقوالِ زرین کے کالم میں پڑھی تھی۔
یہ تمام باتیں ہمارے ذہن میں تھیں اس لیے ہم نے اپنے "تازہ بہ تازہ" افسانہ نگار سے کہا، سنجیدہ متین تمہیں کس بات پہ غصہ آیا پتہ نہیں لیکن چلو کچھ تو آیا تمہیں۔ بہتوں کو تو اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی ہم نے تمہاری کوئی کہانی پڑھی نہیں ہے اسی لیے ہم تمہاری قابلیت کے قائل ہیں۔ متین الدین تھوڑا پگھلے۔ اپنا قیمتی چشمہ از سر نو اتارا اسے احتیاط سے میز پر رکھا اتنی احتیاط تو لوگ نمبر کے چشموں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ کرسی پر از سر نو ایک شریف آدمی کی طرح بیٹھے اور بولے سچ پوچھو تو یہ بات ہمارے گلے سے اتری نہیں کہ افسانہ ادب کی ایک معمولی صنف ہے۔ اگر افسانہ معمولی صنف ہے تو تم ہی سوچو تنقید کو ہم کس نمبر پر رکھیں گے۔ متین الدین مانا کہ ہمارے دوست ہیں لیکن وہ اتنی سمجھ داری کی بات کریں گے ہمیں اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ انہی متین الدین سے ایک مرتبہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ نثری نظم، صنفی تبدیلی کے ناکام آپریشن کا دوسرا نام ہے تو متین الدین اس شخص سے دست و گریباں ہونے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ متین الدین اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے دست و گریباں ہونے کے عادی ہیں۔ اس دن انہوں نے کئی تنقید نگاروں کے کچھ صحیح اور کچھ غلط حوالے دے کر اس شخص کو زیر کیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زیر و زبر کیا تھا۔ آج ان کی زبان سے تنقید کے بارے میں ان کی یہ رائے سن کر ہمیں خوشی ہوئی جب بھی کوئی شخص کسی کے بارے میں ایسی ویسی بات کہتا ہے ہم مزید خوش ہوتے ہیں۔ ہم تو انھیں گلے لگانے والے تھے لیکن اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنا زیرو نمبر کا چشمہ پھر پہن لیا تھا اور ایسی حالت میں گلے ملنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ بہرحال ہم نے اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر کہا۔ متین الدین تم اتنے پڑھے لکھے ہو تم خود تنقید نگار کیوں نہیں بن جاتے۔ متین الدین ہنسے۔ رُک کے پھر ہنسے اور بولے ابھی نہیں۔ جو کچھ میں نے پڑھا ہے ابھی پوری طرح بھولا کہاں ہوں۔

زیچ زمہریری (حیدرآباد)

نکالو، گھما کر تخیل کا ڈنڈا　　ردیفوں کی ٹوپی سے مضموں کا انڈا
کرے لاکھ مجبور کوئی نہ پینا　　کبھی گرم چائے یہ فالودہ ٹھنڈا
سناؤ گے تم بھی جو ٹی وی پہ غزلیں　　تمہیں بھی خطوط آئیں گے از بھٹنڈا
چلے تھے نیویارک کی سمت ہم بھی　　مگر راستے میں پڑا شالی بنڈہ
نہیں مانتا کوئی تم کو تو اے زیچ　　کرو پیر غالب کا تعویذ گنڈا

اُچھالا کرو خوب لوگوں کی پگڑی
اور اونچا کرو نام کا اپنے جھنڈا

غزلیں — مجیب الرحمن بزمی

آسماں سے بات کرتی ہے گرانی آج کل
کوڑیوں کے مول بکتی ہے جوانی آج کل

ملک و ملت کی نگہبانی کا دعویٰ جھوٹ ہے
شیوۂ لیڈر ہے اب جادو بیانی آج کل

اللہ اللہ کیا زمانہ آگیا ہے دوستو
ہے زن و شو میں عجب سی بدگمانی آج کل

دودھ، گھی، مکھن، دہی کا ہو گیا ہے میل میل
شہر میں عنقا ہوا پینے کا پانی آج کل

ہر جگہ مطلب پرستی، جعل سازی اور فریب
آدمیت ہوگئی جیسے کہانی آج کل

اُن کی گدرائی جوانی دیکھ کر بزمی میاں
آگئی اشعار میں میرے روانی آج کل

لیڈروں سے سیکھئے اب چل کے غم کھانے کا فن
اُن کے گرگوں کو ہے آتا ووٹ دلوانے کا فن

مسجدوں میں جب نمازی سر بسجدہ ہوں تو پھر
سیکھ لو گے خود بہ خود جوتا چرالانے کا فن

جعل سازی، گھوس خوری اور کچھ مکر و فریب
اس زمانے میں یہی سب ہے چمک جانے کا فن

مکتبِ بغض و حسد میں کامرانی کے لیے
کام دیتا ہے سدا حق سے مکر جانے کا فن

ہے نشاں فراٹے کا یارو تو کہیں صوبے کی چھاپ
ہو گیا ہے سہل کتنا ووٹ دلوانے کا فن

اہلیت بیکار ہے اب امتحانوں کے لیے
سورس اور رشوت ہے بزمی پاس کروانے کا فن

رؤف خوشتر (بیدر)

س... س... سردی

سالِ رواں کے بادلوں اور حالِ نساں کے قائدوں میں ایک واضح فرق یہ رہا ہے کہ اول الذکر گرجتے اور برستے رہے اور آخر الذکر گرجتے ہی رہے۔ بادل اتنا برسے اتنا برسے کہ کسان اور عام انسان کہہ اٹھے۔ ع

برکھا رانی ذرا تھم کے برسو

لیکن برکھا رانی موجودہ گرانی کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہر ایک کے حواس اور حوصلوں پر چھائی ہوئی ہر منصوبے پر پانی پھیرتی چلی گئی۔ کہاں تو وہ دن تھے کہ وہ اٹھلاتی بل کھاتی بادلوں کی ڈولی پر سوار نہ جانے کس دیش چلی جاتی اور ہم دو بوند کو ترس جاتے اور کہاں تو یہ دن کہ اب اس کا قیام مستقل ہماری انگنا رہا۔ یوں تو ہم اب تک گنگناتے تھے

بادل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم
سَو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا

لیکن جب اس بادل نے چرا پونجی چھوڑ اپنی پونجی ساری ہمارے علاقہ پر نچھاور کردی تو سیلاب کی صورتِ حال ہوگئی۔ حلقہ کے وزیر عزت مآب جب لوپ آب اور تربتر مسائل کا جائزہ لینے پہنچے تو لوگوں نے گھیراؤ کر کے ان پر سوالات کی ایسی بارش کردی کہ انہوں نے بھیگتے بھیگتے دعا مانگی ع

لپٹ جاتے ہیں یہ بارش کے ڈر سے
الٰہی وہ گھٹا دو دن ہی برسے

مگر گھٹا جب مخلص اور بے ریا عوام کی نہیں سنتی تو پھر وزیروں کی کیوں سننے لگی۔ لہٰذا وہ برسی اور جم کے برسی اور جل تھل جل تھل سے اپنے علاقے کا مسئلہ حل کردیا۔

ستم بالائے ستم کہ وہ جاتے جاتے اپنی ایک چنچل سکھی کو ہم پر مسلط کر گئی۔ جس کی آمد پر امیر غریب سبھی ہاتھ باندھے استقبال کرتے ہیں۔

اور ہم کھٹ جنجال بھر بغلیں بجایا کرتے ہیں، سردی کی آمد آمد پر دانت بجانا شروع کردیئے۔ طاقِ نسیاں میں رکھے ہوئے میلے دان سے تلاش کر کے اپنی اکلوتی شادی (تا دمِ تحریر) پر ملا ہوا

اکلوتا کوٹ (تاوم لوٹ) نکالا۔ تجربے کے طور پر اسے کُتّے کے روبرو رکھ چھوڑا۔ کتّا بےہوش ہوگیا۔ اب ہم نے فوراً جنت الفردوس کی پوری شیشی کوٹ پر اُنڈیل دی۔ کیڑے مکوڑے اور مکڑیاں (جن کے لیے اب تک کوٹ جنت الفردوس تھا) طوعاً و کرہاً باہر نکلنے لگیں۔ اُن کے اجتماعی تخلیہ کے بعد ہم نے آنکھ اور ناک بند کرکے کوٹ کو جھٹک جھٹک کر زیبِ تن کرنا چاہا تو وہ زیبِ سینہ ہو کر رہ گیا۔ ہم نے بیگم سے کہا۔

"بیگم کیوں نہ اس کوٹ نما بستے کو مکان کے اوپر بجوکا کے طور پر لٹکا دیا جائے تاکہ اسے دیکھ کر اور ڈر سے کوّے نہ آئیں اور ہم مہمانوں سے بچ جائیں۔ بیگم نے اپنے میکے سے لائے ہوئے کوٹ کو بڑی محبت اور شفقت سے دیکھا پھر گویا ہوئیں۔

"آپ ایک نیا کوٹ سلوا لیجیے۔"

ہم نے جواب دیا

"نئے کوٹ کے لیے ایک اور شادی کرلینی ہوگی۔"

سوت کے خیال کو موت کا خیال تصوّر کرکے بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے اعلان کردیا کہ آج ہی لال اِملی اون والا سویٹر خریدا جائے گا۔ ہم نے کہا لال اِملی ہو یا ہری اِملی ہمیں تو سویٹر سے مطلب ہے۔ مگر بیگم لال اِملی سویٹر خریدنے پر مُصر رہیں۔ مالیات اور خریدی کا شعبہ بیگم کے ذمّہ ہے۔ وہ ایک ماہرِ معاشیات اور اشیا فہم ہیں۔ چنانچہ وہ جوتے اور چپل باٹا کمپنی کے تیل صابن ٹاٹا کمپنی کا کھانے پکانے اور پنکھے کی مشین بجاج کمپنی کی خریدتی ہیں اور اِس سلسلہ میں اُن کا نعرہ یوں ہوتا ہے۔

ٹاٹا ورنہ گھاٹا

بجاج ورنہ احتجاج

لال اِملی ورنہ مال نقلی

ہاں تو ہم لال اِملی والے سویٹر کی گرمی سے ابھی محظوظ ہونے والے تھے کہ پڑوسی بوم الدولہ کی کرخت آواز نے ہمارے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑا دی۔ وہ آئے اور ہمت کرکے کوٹ سمیت ہم سے لپٹ گئے۔

بوم الدولہ:۔ اماں کچھ روپیہ ہوں تو دے دو۔

ہم:۔ اب پیسے کہاں۔ اور پھر آپ نے پچھلے روپے بھی تو واپس نہیں کئے۔

بوم الدولہ:۔ میاں میں تمہیں پہلے چیک دے چکا ہوں۔

ہم:۔ حق تو یہ ہے کہ چیک ادا نہ ہوا۔ سو لوٹ نہیں کوٹ ہے۔ اسے لے جاؤ اور اسے نپولین کا کوٹ بتا کر روپے بنا لو۔

بوم الدولہ:۔ برخوردار یہ کوٹ تو طوفانِ نوح سے بچا کر لایا معلوم ہوتا ہے۔ سو میں بھی تو شادی شدہ ہوں اور اس لیے میرے پاس بھی ایک عدد تمہارے کوٹ سے بھدّا بدبودار اور پھٹا ہوا کوٹ موجود ہے۔ اور تمہاری بیگم سے بھی . . . . خیر جانے دو۔

ہم نے سردی دور کرنے کے لیے گرم گرم چائے پیش کردی اور وہ "جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم پی کر کیا کریں گے؟" کہتے

ہوئے غول کے گھونٹ کے ساتھ چائے کے گھونٹ پیتے رہے اور کہنے لگے۔ "میاں ایک سرد ہوا کا جھونکا مختلف افراد کو چھوتا ہے تو مختلف تاثرات پیدا کرتا ہے۔ جب یہ غریب کو چھوتا ہے تو وہ ایک گرم آہ لے کر گرم گرم آنسوؤں سے سردی دور کرتا ہے جب یہ جھونکا کسی جوان بیوہ کو چھوتا ہے تو وہ حسرت و یاس کی چادر اوڑھے سو جاتی ہے۔ اور عمر گزشتہ کے دنوں کی گرمی یاد کر کے سردی دور کرتی ہے۔ امیروں کے پاس جب یخ بستہ ہوائیں صدائیں دیتی ہیں تو یہ اپنے آتش دان روشن کرتے ہیں۔ اور نوٹوں سے سگار اور پائپ سلگا لیتے ہیں۔ اور ہم متوسط طبقے کے لوگ جنہیں سماج ردّی کا غذوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ردّی کا غذات ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو ان کا غذات سمیت نذرِ آتش کر کے وقتی طور پر سہی حرارت پیدا کر لیتے ہیں اور اس طرح سرد دنوں اور راتوں کو ٹال دیتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتے ہم نے سرد مہری سے کام لیا اور اس طرح ان کی گرمیٔ گفتار سے بچ گئے۔ وہ چلے گئے اور ہم بیگم کے ساتھ سوئیٹر خریدنے نکل پڑے۔ موسم کے طفیل ناموافق و نامتفق جوڑے بھی قریب قریب چل رہے تھے ہم نے بھی ہاتھ باندھے چلنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ اس کا سبب بیگم نہیں تھیں ع

اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا

اور تو اور ہمارے پہلوان اور باکسر دوست ظلِّ سبحانی بھی اپنی بیگم کے ساتھ ہاتھ باندھے چل رہے تھے ہم نے اس دن سے انہیں ظلِّ زنانی کہنا شروع کر دیا۔ مرد تو سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے تھے اور خواتین گفتگو کے ساتھ سردی کا دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ سوئیٹر کی دوکان پر بھیڑ تھی۔ سوئیٹر والا گرما گرم تحریروں مثلاً I LOVE YOU' I AM YOUNG والے سوئیٹر تھما رہا تھا لیکن بیگم نے انہیں پسند نہیں کیا کہ اس میں ہم واقعی نوجوان نظر آئیں گے اور صنفِ نازک کو ایک آنکھ سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔ جو انھیں منظور نہیں تھا۔ بالآخر ایک سفید بے داغ سوئیٹر پسند کیا گیا اور ہمیں پہنایا گیا اور اس طرح ہمیں مسٹر کلین بنایا گیا۔ اب ہم سردی کے لیے سینہ سپر اور سینہ سوئیٹر ہو گئے۔

کہتے ہیں سکندر جب ملک فتح کر کے واپس ہوا اور اپنے اتالیق ارسطو کی خدمت میں حاضر ہوا اور مال و دولت نذر کرنا چاہا تو ارسطو نے کہا کہ مجھے تمہاری دولت نہیں چاہیئے مجھے خدا کی وہ نعمت و دولت حاصل کرنے دو جو مجھے یہاں بیٹھے بیٹھے بغیر ایک قطرہ خون بہائے مل رہی ہے۔ تم ذرا میرے سامنے سے ہٹ جاؤ اور مجھے سردیوں کی اس صبح میں سورج کی دھوپ سے استفادہ کرنے دو۔ ارسطو کے اس جواب سے کڑاکے کی سردی میں بھی سکندر پسینہ پسینہ ہو گیا۔

ہاں تو صاحبو! آپ بھی ذرا ہٹ جائیے اور مجھے سردی کی اس صبح بیش بہا شمسی دولت سے فیض یاب ہونے کا موقع دیجئے۔ کیوں کہ مجھے لگ رہی ہے۔

س... س... سردی۔

معاون قلم کاروں سے التماس

تخلیقات صاف اور خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھی جائیں — اور آخر میں اپنا پتہ ضرور درج کریں!

(ادارہ)

نسیم سحر

غزل

بابو نہیں آئے، یہاں افسر نہیں آیا
کرکٹ کی خوشی میں کوئی دفتر نہیں آیا

بیگم نے جو غصّے میں طلب کرلیا ان کو
شوہر تو چلا آیا ہے، نوکر نہیں آیا

جو اپنے مفادات سے آگے کی بھی سوچے
ایسا تو کوئی مردِ قلندر نہیں آیا

اک روز میں ٹپ دینا اُسے بھول گیا تھا
ٹیبل پہ مری پھر کبھی ویٹر نہیں آیا

حوروں کے تعاقب میں رہا خواب میں شاید
مسجد میں جو وہ صبح کو اکثر نہیں آیا

مدّت سے نسیم اُن میں ہوئی دشمنی ایسی
مُلّا جہاں آیا وہاں مسٹر نہیں آیا

رشید عبدالسمیع جلیل

لڑکیاں

حور کہلاتی ہیں جنّت کی خیالی لڑکیاں
جب گزر جائیں جہاں سے بھولی بھالی لڑکیاں

قدرتِ حق سے عطا ہوگی ہمیں نقدی وہاں
خلد میں ہوں گی اگر یہ پرس والی لڑکیاں

پھول پیکر، پھل بدن، پتّہ جبیں، شبنم جمال
ہر شجر ہے اک گلستاں ڈالی ڈالی لڑکیاں

راجدھانی اکسپرس سے تیز چلتی ہے زباں
کام کرتے وقت لگتی ہیں ٹرالی لڑکیاں

روز ہوگا اک دھماکہ جب بیاہی جائیں گی
چُلبُلی، منہ پھٹ، پٹاخہ، لااُبالی لڑکیاں

ٹینک بنڈ، تھیٹر، نمائش، باغِ عامّ، اسٹاف روم
ہر جگہ رہتی ہیں مصروفِ جگالی لڑکیاں

عاشقِ یک طرفہ اظہارِ محبت سے بچیں
ورنہ سختی سے کریں گی گوشمالی لڑکیاں

ہر جواں دھڑکن کو ہے جنسِ مخالف کی کشش
اس کشش کو جذب کرتی ہیں مثالی لڑکیاں

رشتۂ حوّا و آدم جانے کیا ہو جائے گا
ٹسٹ ٹیوبوں سے جو نکلیں گی نرالی لڑکیاں

دودھ، پتّی اور شکر جتنی چاہیں ڈالیے
زندگی اک کیتلی ہے چائے کی پیالی لڑکیاں

عشق فرماتی ہیں فلمسٹار کی تصویر سے
شاعروں سے شعر لکھواتی ہیں جالی لڑکیاں

تاپتے رہتے ہیں بس اسٹانڈ پر جب ہم جلیل
تُو بُدبُدا کر جانے کیا دیتی ہیں گالی لڑکیاں

اکبر حمیدی (پاکستان)

پتنگ

پتنگ تو میری زندگی ہے۔

اگر کوئی پوچھے کہ اس کاغذی پیرہن سے میرا تعلق کب سے ہے تو شاید میں ٹھیک طور پر بتا نہ سکوں۔ بس یوں سمجھئے جب میں نے ہوش سنبھالا اس کی دوڑ میرے ہاتھ میں تھی۔ پہلے پہلے تو اس قدر وابستگی کا مجھے احساس بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے اس کا احساس ہونے لگا، آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا شوق کتنا نازک ہے! بانس کی نرم اور لچکدار تیلی جو اس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، کمان کی طرح بل کھائی ہوئی بانس کی ایک اور نرم و نازک تیلی جس کے کنارے پھونک سے اُڑ جانے والے کاغذ میں لپٹے ہوئے۔ یہ اس کی کُل کائنات ہے۔

سب سے پہلے میں اسے ڈور سے باندھتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں کہ دونوں حصے متوازن ہیں یا نہیں۔ کیوں کہ پتنگ اگر خود متوازن نہ ہو تو ہوا میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتی۔ اگر اس کے دونوں حصے متوازن ہیں۔ ہوا مناسب ہے ڈور مضبوط ہے۔ پتنگ باز پتنگ بازی کی کم سے کم ابتدائی باتیں جانتا ہے تب تو پتنگ ہوا میں اُڑنے لگے گی ورنہ سیدھی زمین پر آ رہے گی۔

پتنگ کئی شکلوں اور کئی رنگوں میں ہے۔ اس کی شکلوں اور رنگوں سے پتنگ بازوں کی پسند و ناپسند۔ حیثیت اور مزاج کا پتہ چلتا ہے پتنگ بازی کی دنیا میں چار بڑی طاقتیں ہیں۔ پتنگ، ڈور، ہوا اور پتنگ باز۔ پتنگ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ڈور کو حاصل ہے۔ اچھی مضبوط تیز اور کاٹ دار ڈور حاصل کرنے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی جاتی ہے۔ کیوں کہ جب کہیں پیچ پڑتا ہے تو اچھی ڈور ہی کام آتی ہے لیکن جب دل شوق سے بھرا ہو اور اچھی ڈور تک رسائی ممکن نہ ہو تو پیوند لگی ہوئی ڈوروں سے بھی منچلے پیچ لڑانے سے باز نہیں رہتے۔ پتنگ کو تو کٹنا ہی ہوتا ہے لیکن جی داری کی ایک مثال تو قائم ہو جاتی ہے اور اگر ایسے میں کہیں مخالف کی پتنگ کٹ جائے تو وہ دھمالیں پڑتی ہیں کہ فضائیں تاپ تاپ اٹھتی ہیں۔

پتنگ بازی میں ہوا کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہوا مناسب ہو تو پتنگوں کے رقص دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ اگر ہوا تیز اور شریر ہو تو پتنگوں کے گھونگھٹ کھل کھل جاتے ہیں۔ ایسے میں پتنگ اس شرمیلی لڑکی کی

طرح دکھائی دیتی ہے جیسے اوباشوں کے جھمگھٹ میں سے گزرنا پڑ رہا ہو۔ ہوا کے تیز جھونکے آنچلوں کو لہراتے بھی ہیں اور الٹتے بھی ہیں۔

ہوا تیز ہو تو وہ اپنے ہی رُخ پر اُڑاتی ہے۔ نرم و سُبک ہوا تو ایک نعمت ہے جو اپنی سمت پر زیادہ زور نہیں دیتی۔ شوریدہ سر ہوائیں فضا کے امن و سکون کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں۔ ایسے میں کسی اور سمت کا تصور کرنا بھی محال دکھائی دیتا ہے۔ یوں ہر روشن دن جب ہوا ایک ادائے دلبری کے ساتھ فضا میں محوِ خرام ہو پتنگوں کے لیے مبارک ہے تاہم بہار کا موسم کچھ اور ہی لطف رکھتا ہے۔ نہ گرمی نہ سردی۔ یا یوں سمجھئے جتنی گرمی اتنی ہی سردی! توازن ـــــ بلکہ حسن توازن۔ زمین سبز بلکہ سرسبز ـــ آسمان نیلا۔ بلکہ نیلا شفاف۔ شریانوں میں تازہ خون کی گردش۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ موسم تو بنایا ہی پتنگ بازی کے لیے ہے گیا ہے۔ پھر سارا سال بھی آپ پتنگ اڑاتے رہیں مگر جو لطف اس موسم میں ملے گا وہ پھر نصیب نہیں ہوگا اس موسم کے معرکے سارا سال یاد آتے رہتے ہیں۔ کہانیاں اسی موسم میں بنتی ہیں۔ افسانے انہی دنوں میں جنم لیتے ہیں۔

پتنگ باز کی حیثیت سب سے آخری ہے جسے پتنگ اُڑانے کا شوق تو ہوتا ہے مگر جو شاید ہی کبھی اپنے رُخ پر پتنگ کو اڑا سکے۔ میں بھی انہی پر شوق پتنگ اڑانے والوں میں شامل ہوں۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ میری پتنگ سورج سے آنکھ لڑائے۔ آدھے آسمان جا کر ناچے۔ ہواؤں سے اٹھکیلیاں کرے۔ اس کے شرلاٹوں سے زمین آسمان گونجیں۔ پیچ پر پیچ کاٹے۔ فضاؤں میں راج کرے ـــ مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

درختوں پر اٹکی ہوئی۔ گاٹیوں کی زد میں آ کر گلی کے لڑکوں میں پُرپُر بٹتیں، بالنوں کا شکار ہوتیں، ہواؤں کے زور سے پھٹ کر اکھڑے خیمے کی طرح زمین بوس ہوتی پتنگیں کہاں دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر یہ سب ایسے پتنگ بازی کا حصہ ہیں۔ ایک اچھا پتنگ باز ان کے بارے میں سوچ سوچ کر دل میلا نہیں کرتا ـــــ خواب ٹوٹتے بھی تو رہتے ہیں لیکن کیا خواب دیکھنے بند کر دیئے جائیں؟ یہ کیسے ممکن ہے!!

پتنگ میری زندگی ہے! میری ذات ہے! میں خود ہوں! پتنگ پتنگ کرتے کرتے میں خود بھی پتنگ بن چکا ہوں۔ پتنگ کے روپ میں میں خود زمین سے بلند ہوتا ہوں۔ میں خود اپنے ہاتھ سے ڈور کھینچتا ہوں۔ چھتوں پر لہراتا ہوں آنگنوں میں اترتا ہوں۔ آسمانوں کو چومتا ہوں۔ ہواؤں سے لپٹتا ہوں۔ پتنگ کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں خود ڈور کی رسی پر چلتا ہوا نیلے آکاش میں رقص کرنے لگا ہوں۔ اس وقت میں بلندی سے اپنے آپ کو نیچے کھڑے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ اپنے آپ پر ہنس سکتا ہوں۔ اپنے آپ کو اپنا غیر جان سکتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے پتنگ ایک چاندگاڑی کی طرح خلائی اسٹیشن پر کھڑی ہے ـــ اور میں ایک خلا نورد کی طرح اس میں سے باہر نکل کر کسی دوسری سرزمین پر چل پھر رہا ہوں۔ یہی تو وہ لمحے ہیں جب میں پتنگ سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہوں۔

انسان کے ذہنی ارتقا کو اگر پتنگ بازی سے تشبیہ دی جائے تو میرا خیال ہے یہ تشبیہ بہت موزوں ہوگی آخر انسان نے کیا کیا ہے؟ یہی تو کیا ہے کہ اپنے ذہن کی پرواز کو وسعت دیتا چلا گیا ہے جس طرح پتنگ باز پتنگ کو ڈور دیتا چلا جاتا ہے ـــ اور وہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے ارتقائے ذہنی کو پتنگ بازی سے

بڑی مماثلت ہے۔ جس طرح پتنگ بازی کے لیے اچھا موسم، صاف شفاف فضا، مناسب ہوا، اچھی ڈور جیسی چیزیں مطلوب ہیں، ارتقائے ذہنی کے لیے بھی کچھ ایسا ہی ماحول موزوں ہے۔

وہ تو درمیان سے کچھ لیٹرے گاٹیاں مار دیتے ہیں ورنہ پتنگ آج سے صدیوں آگے ہوتی۔ جس طرح پتنگ بازی کی ایک تاریخ ہے اسی طرح گاہٹی مارنے کی بھی ایک تاریخ ہے۔ کچھ لوگوں نے گاہٹی مار کر بھی پتنگیں حاصل کی ہیں اور پھر پتنگ بازی کی تاریخ میں اپنا نام بحیثیت ایک پتنگ باز کے لکھوایا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ پتنگ پتنگ باز کے اشاروں پر ناچتی ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اونچی ہوائیں جاکر تو جیسے اس کی ایک اپنی منفرد شخصیت ابھر آتی ہے فرینکنسٹن کی طرح یہ بھی باغی ہو جاتی ہے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوکر آگے ہی آگے اور بلند سے بلند تر ہونا چاہتی ہے۔ میرے ہاتھوں سے ڈور کھنچتی چلی جاتی ہے ۔۔۔ میں روکنا چاہتا ہوں ۔۔۔ مگر یہ کہاں رکتی ہے ۔۔۔ میں بے بس ہوکر ڈور پر ڈور دیئے جاتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے اگر ذرا بھی ڈور کو روکا تو میرا ہاتھ کاٹ دے گی۔ پلٹ کر پیچھے زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو ڈور ختم ہوتی جارہی ہے ۔۔۔ میں کیا کروں اس چھنال کی آنکھیں سیری نہیں ہوتیں۔ لحظہ بلحظہ ڈور میرے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہے ۔۔۔ نکلتی جارہی ہے!

خدایا! میں کیا کروں ۔۔۔ اگر ڈور روکتا ہوں تو میرا ہاتھ کٹتا ہے ۔۔۔ اور اگر پھر بھی روکتا ہوں ۔۔۔ تو پتنگ کٹتی ہے!!!

▭▭

قطعات ـــ اسمٰعیل ظریف

ویسے یہ بات میں نے کسی سے کہی نہیں — کچھ لوگ کہہ رہے ہیں غزل آپ کی نہیں
بکواسیت کا نام ظرافت نہیں ظریف — جو دل کو گدگدا نہ سکے شاعری نہیں

اُن کے کوچہ سے گزر ہو تو غزل کہہ لیجئے — یا کوئی پیشِ نظر ہو تو غزل کہہ لیجئے
ایک محبوب کی چاہت سے بھلا کیا ہوگا — دل میں محبوب نگر ہو تو غزل کہہ لیجئے

کسی دن ایٹمی ٹکّر سے ڈبّہ گل نہ ہو جائے — اگر مر جائیں سب انساں تو شیطانوں کا کیا ہوگا
وہ میڈم کو بھی لیکر چاند پر اب جانیوالے ہیں — نہ ہوگی چاندنی راتیں تو ارمانوں کا کیا ہوگا

سنتّر میں گو دماغ ہمارا نہیں مگر — دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم
جاڑوں کی رُت میں بارہا یوں بھی ہوا ظریف — انگریزی پانچ بن کے گزارے ہیں رات ہم

غزلیات ـــ صابرہ بہاری (رانچی)

جو تن پوشی کا مقصد ہے کہاں معلوم ہوتا ہے — یہاں بھی فیشنِ نو میں عیاں معلوم ہوتا ہے
ادھر بیگم کا غُل ہے اور اُدھر بچّوں کا ہنگامہ — مجھے اپنا ہی گھر مچھلی دوکاں معلوم ہوتا ہے
جو آئے ہیں تو آئے ہیں نہیں ہے فکر جانے کی — عجب ڈھب کا یہ میرا میہماں معلوم ہوتا ہے
اگر مسجد میں دیکھو تو نظر آتا ہے مریل سا — مگر میخانے میں زاہد جواں معلوم ہوتا ہے
چڑھا ہے رنگ حیّت کا غزل پر اس طرح یارو — کہ ہر اک شعر اس کا چیستاں معلوم ہوتا ہے
مری اس طنز گوئی کا صلہ اتنا ملا مجھ کو — کہ میرا یار مجھ سے بدگماں معلوم ہوتا ہے
ہمیں گھیرے ہوئے ہے ہر طرف سے دیکھئے ظالم — کمربستہ ستم پر آسماں معلوم ہوتا ہے

بہ باطن مفلسی نے گھیر رکھا ہے اسے پیارے
مگر صابر بظاہر شادماں معلوم ہوتا ہے

ہے آدمی غرض کا پسر کیسا مذاق ہے — کہتا ہے اک گدھے کو پدر کیا مذاق ہے
اے جانِ انقلاب کوئی دل لگی ہے یہ — دختر بھی مگ رہی ہے پسر کیا مذاق ہے
کتیا بھی تیرے میکے کی لگتی ہے خوبرو — بیگم یہ تیرے باپ کا گھر کیا مذاق ہے

ہم نے تو بزمِ عیش سجائی ہے کل تو
صابرہ بھی آ رہے ہیں ادھر کیا مذاق ہے

شاہنواز اکبر (دبئی)

فلورا فونٹین سے فورٹ لمیٹڈ تک

اس روز افراتفری میں فلورا فاؤنٹین کے بس اسٹاپ پر پہنچے تو دیکھا مسافروں کی اتنی لمبی قطار کھڑی تھی جتنی شیطان کی آنت. چوں کہ شیطان کا عضو بن کر دوزخ میں جلنا ہمارا منشا ہرگز نہ تھا لہٰذا ہم نے چالاکی سے کام لیا. سیٹی بجاتے بس اسٹاپ کے آس پاس منڈلاتے رہے پھر جیسے ہی خالی بس آکر رکی اور خلق خدا نے بس پر ہلہ بول دیا ہم بھی ریلے میں بہہ کر بس کے اندر پہنچے. بس کے اندر کنڈکٹر کھڑا خالی نشستوں کے درمیان نظریں دوڑا رہا تھا تاکہ جانے والوں کی نشانیاں محفوظ کر لے.

نجانے کب کیسے کم بخت نے ہمیں بغیر قطار کے داخل ہوتا دیکھ لیا تھا لہٰذا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا مگر "ہم کہاں رکتے تھے عرش و فرش کی آواز سے" جمہوریت پسندانہ کی طرح دھکا دے کر پرے ہٹایا اور ڈرائیور کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے ساتھ ہی اس جالی کو بھی مضبوطی سے پکڑ لیا جو ڈرائیور اور مسافروں کے درمیان حائل ہوتی ہے لیکن اس ناہنجار نے بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑا. سر پہ پہنچ کر دہاڑا.

"چلو اٹھو نیچے اترو. ورنہ بس آگے نہیں جائے گی. اٹھو."

ہم اڑ گئے کہ اب اپنی مرضی سے اٹھیں گے یا ملک الموت سے"

"تم اترتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں اتروں گا"

"نہیں اترو گے" اس نے دیدے نکالے.

"کبھی نہیں"

"ٹھیک ہے میں اور ڈرائیور اتر جاتے ہیں" اس نے آخری حربہ استعمال کیا.

مسافروں میں سے ایک بڈھا اپنی اکڑ کر چیخے لگا.

"جانے دو بابا. سامنے کو سب کا ٹائم کھوٹا کرتا ہے؟ اترو جی"

پھر تو جیسے [illegible] کا منظر نظر آیا. [illegible] کس کس نے کیا کیا کہا آپ

پوچھیں تو اچھا ہے۔

اسی درمیان ہم نے ایک بار پھر چالاکی سے کام لیا۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے ہم نے جو ایک روپے کا سکّہ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اُسے کنڈکٹر کی جیب میں ڈال دیا۔ کنڈکٹر کو آنکھ ماری اور کولگیٹ والی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاکر کہا۔ "ہماری طرف سے چائے پی لو" ڈرائیور جو بیٹ کر تماشہ دیکھ رہا تھا اس نے ہمیں کنڈکٹر کی جیب میں سکّہ ڈالتے دیکھ لیا۔ اس نے جھٹ بس اسٹارٹ کر دی۔

ڈرائیور کی طرف ہم پیٹھ کر کے دانستہ بیٹھے تھے اس کے کئی فوائد ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ بس میں تشریف فرما ساری خواتین کی شکلیں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آج تک کوئی جیب کترا ہم پر دست شفقت نہیں پھیر سکا ورنہ بمبئی جیسے شہروں میں بسوں کے سفر اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں جیب نہ کٹے تو سر پھٹے گا۔ وہ یوں کہ آپ نے کسی مبتدی جیب کترے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس کے ساتھ اتحاد کی بہترین مثال پیش کرتے ہوئے آپ کی ایسی تواضع کریں گے کہ یا تو آپ بس کے سفر سے توبہ کرلیں گے یا مسافروں میں سے جیب کترے کو برآمد کرنا بھول جائیں گے۔

ہاں تو بس کے ذریعہ جب فلورا فاؤنٹین سے براہ دی۔ٹی اور محمد علی روڈ ہوتے ہوئے اور راستوں میں کھڑے ان گنت ٹریفک کانسٹبلوں کی سلامیاں وصول کرتے کرتے ہم بھنڈی بازار کے چوراہے تک پہنچے تو اچانک ہی ہماری بس ایک زوردار اور چند معمولی جھٹکوں کے بعد رک گئی اور پھر اُس نے کسی اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ تب کنڈکٹر نے حالاتِ مذکورہ کا بہانہ بنا کر اپنی زہریلی آواز میں ہم سبھوں کو دفع ہو جانے کا مشورہ دیا۔

ہم بس سے نیچے اتر آئے اور قریبی بس اسٹاپ کی طرف کوچ کیا۔ بس اسٹاپ پر وہ بھیڑ تھی کہ خدا کی پناہ۔ ہم بھی اس مجمع میں شامل ہو گئے۔ قریب آدھے گھنٹے بعد بی فور لمٹیڈ (4 Ltd) تشریف لے آئیں اسی طرح لدی پھندی تھیں جیسے عورتیں شاپنگ سے لوٹتے وقت ہوتی ہیں۔ ستم اس پر یہ ہوا کہ رُک کر ہمارا حال احوال تک نہ پوچھا کہ اب سڑک کیوں کھڑے ہو؟ کس کا انتظار ہے اب کون آئے گا؟ چنانچہ وہ منہ پھیر کر گزر گئی۔

ہم غبار کے بجائے کالا بھجنگ دھواں دیکھتے رہے ہم اس وقت تک چونکے جب قریب سے ایک پولس کانسٹبل گزرا ہم نے کہا "السلام علیکم"

"وعلیکم السلام" پولس کانسٹبل بھی منہ توڑ جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔

ہم نے فلورا فاؤنٹین سے بھنڈی بازار کے چوراہے تک ٹریفک کانسٹبلوں کے سلام وصول کئے دراصل پہلے ہم سلام کرتے تھے جس کے جواب میں پولس کانسٹبل وعلیکم سلام کہتے۔ (سلام میں پہل کرنا ہماری پرانی عادت ہے)

ہاں تو بھنڈی بازار پر فور لمٹیڈ (4. LTD) کے انتظار میں مسکین صورت بنائے کھڑے تھے۔ علامہ نجانے کہاں سے نازل ہو گئے اور ہمیں دیکھتے ہی "اخاہ۔ تم" کہہ کر ہم سے لپٹ گئے۔

ہم نے ایک ہاتھ ان کی گردن پر لپیٹ کر گرم جوشی کا ثبوت دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی وہ جیب دبوچ لی جس میں پیسے رکھے تھے۔ احتیاطاً اپنی ٹانگ بھی اُن کے پیروں کے بیچ پھنسا دی تاکہ علامہ اگر دست درازی کریں تو دھوبی پاٹ دیں۔ علامہ شاید ہماری حکمت عملی بھانپ گئے اس لیے جھٹ علیحدہ ہو گئے اور کرید کرید کر ہمارے دیگر احوال پوچھنے لگے۔ ہم انھیں جواب دیتے رہے بار بار گردن گھما کر بائیں طرف کی طرف دیکھتے کہ بس آرہی ہو تو میاں چھوٹے مگر ہر بار ہمیں ناکامی کا

سامنا کرنا پڑا بس تو نظر نہ آئی البتہ ماڈرن پوسٹ آفس والی بلڈنگ کے سر کا تاج بنا ہوا فلم "بھاگو بھوت آیا" کا پوسٹر ضرور نظر آگیا۔ علامہ کی آمد سے قبل بھی ہماری نظر اس پوسٹر پر پڑی تھی لیکن ہم نے اُسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

علامہ سے نمٹنا کوئی کھیل نہیں دو چار درجن چالاکیاں بیک وقت استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہم علامہ کے ہر پینترے سے واقف ہیں۔ علامہ ہی کے ایک ہم نام شاعر نے بالکل سچ کہا تھا کہ

"دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے"

اس روز بھی علامہ نے علیک سلیک اور حال احوال کے بعد پہلی چال یوں چلی تھی۔

"آؤ میاں۔ چائے پی لیتے ہیں"

"شکریہ۔ میں ذرا جلدی میں ہوں"

"رفع حاجت یہاں بھی ہو سکتی ہے"۔

"جی" ہمارے دیدے نکل آئے۔

"ہمارا مطلب ہے میونسپلٹی نے لوگوں کی سہولت کے لیے سڑک کے اس طرف ٹائیلیٹ (TOILET) کا انتظام کیا ہے۔ بس صفائی والے کو نذرانہ دینا پڑتا ہے۔ چار آنے فی کس۔ فی حاجت"

ہم کیا جواب دیتے کیوں کہ کسی فرضی بیماری کا تذکرہ بھی کر دیتے تو علامہ اُس بیماری کی تاریخ، جغرافیہ اور نسلِ انسانی پر اس موذی مرض کے مہلک اثرات بیان کرنے کے بعد آیورویدک دوائیں خریدنے پر مجبور کر دیتے ہم چونکہ اپنا چہلم کروانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہٰذا چار و ناچار چائے پینے کی حامی بھر لی۔ پھر سڑک عبور کر کے وزیر ہوٹل پہنچنے تک علامہ ہمیں کامل یقین دلاتے رہے کہ بزرگوں کی ہدایات پر عمل کرنا فرضِ اولین ہے۔ وزیر ہوٹل کی کرسی پر براجمان ہوتے وقت انھوں نے ہماری فرمانبرداری سے متاثر ہو کر بشارت دی کہ بہت جلد ہمارے حالات بدلنے والے ہیں۔ ہم اچھی خاصی خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ علامہ کی بشارت سُن کر پہلے تو ہم نے جیب میں پڑے ہوئے پچاس ساٹھ روپے کی فاتحہ پڑھ لی پھر اپنی خوشحالی کا جنازہ اُٹھنے کا منظر ہماری آنکھوں کے آگے آگیا۔ دنیا اور اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ہماری غفلت کا فائدہ اٹھا کر علامہ نے بیرے کو چار پلیٹ سیخ کباب۔ نان اور چائے کا آرڈر دے ڈالا۔

"جناب میں صرف چائے پیئوں گا" ہم نے گھبرا کر کہا۔

"ضرور پیو" انہوں نے شفقت سے بھرپور نصیحت کی "البتہ پہلے کچھ کھا لو۔ خالی پیٹ شیطان کا اپارٹمنٹ ہوتا ہے"۔

"مگر میرے پیٹ میں گنجائش نہیں ہے" ہم نے جھلا کر کہا۔

"میاں کھانا شروع کردو۔ گنجائش نکل آئے گی"۔

دیٹر سیخ کباب اور نان لے آیا۔ علامہ نے تین پلیٹیں خود سمیٹ لیں اور ایک پلیٹ ہماری طرف کھسکائی پھر اللہ کا نام لے کر نعمتِ خداوندی پر ٹوٹ پڑے۔ چار و ناچار ہم بھی چھوٹے چھوٹے لقمے زہر مار کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو پلیٹیں انھوں نے صاف کردیں اور تیسری کی بسم اللہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

یہاں کے سیخ کباب کی خوبی یہی ہے کہ کھاتے جاؤ بھلے ہی پیٹ بھر جائے۔ اشتہا نہیں بھرے گی۔

انھوں نے تیسری پلیٹ ختم کی۔ فراغت دو گلاس پانی کے چڑھا گئے اور شڑاپ شڑاپ چائے پی کر ہماری جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اُچک لی پھر ایک گہرا کش کھینچ کر کہنے لگے۔

" کم بخت کے ہاتھ میں خدا نے وہ اعجاز دیا ہے کہ بس کھانے پینے کا شوق تو کافی پرانا ہے دہلی کی جامع مسجد سے لیکر حیدرآباد کے چار مینار تک ہر ہوٹل، بھٹیار خانے ہر ڈھابئے اور ہر گاڑی پر کھایا پیا مگر یہاں کی بات کہاں اور ہے۔"

ہم چائے کی چسکیاں بھر رہے تھے اچانک ہی دو حضرات جو شاید علامہ سے چھپنے کی کوشش میں تھے انھیں نظر آ گئے بس پھر کیا تھا علامہ لپک کر پہنچے اور انھیں کھینچ کر ہماری میز پر لے آئے وہ خدا کے بندے منع کرتے رہے مگر علامہ نے بعد اصرار ویٹر کو بلا کر چار پلیٹ کباب اور چائے کا آرڈر دے ہی دیا۔" اِن سے ملو میاں" علامہ ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے مسکین جلالی صاحب! ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ بڑے فیاض، رحم دل اور غریب پرور ہیں۔ مارکیٹ میں مرغیاں حلال کرتے ہیں اور فاضل اوقات میں شعر و شاعری وہ بھی اِس غضب کی کہ کیا کہوں ابھی پرسوں ہی چور بازار کا مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔"

ہم نے اخلاقاً ہاتھ ملایا مسکرا کر اپنا اسم شریف دوہرایا تب تک علامہ دوسرے کی جانب متوجہ کر چکے تھے۔

" یہ شریف بھائی ہیں۔ شاعری کے شوقین، قوالی کے دلدادہ اور مجرے کے دیوانے۔ سارا فارس روڈ اِن کو جانتا ہے۔"

مجبوراً ہم نے ان سے بھی مصافحہ کیا پھر علامہ ہماری تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

پُرانے واقف کار ہیں بڑی محبت اور عقیدت ہے ہم سے۔ اب یہی دیکھ لو ہم 'ناں ناں' کرتے رہے مگر اس بچے نے یہیں نہ چھوڑا۔ زبردستی یہاں لاکر سیخ کباب کھلائے بڑا احترام کرتا ہے ہمارا کبھی ہاتھ تنگ ہو جائے تو یہ فوراً اپنا ہاتھ بڑھا کر پچیس پچاس جیب میں ڈال دے گا۔ منع کروں تو کہتا ہے آپ کی خدمت کر کے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے اور آپ کی دعاؤں سے تو اللہ غیب سے مدد کرے گا۔"

ہمارا خون کھول اُٹھا ایسا سفید جھوٹ اور وہ بھی ہمارے ہی منہ پر محبت اور عقیدت تو کُجا ہم علامہ سے اسی طرح دور بھاگتے ہیں جیسے لاحول ولاقوۃ سے شیطان کہیں کون سے پیسے جیب میں کاٹ رہے تھے جو ہم زبردستی علامہ کی جیب میں ڈال دیتے۔ پھر بھلا ہم نے کبھی زبردستی اُن کی جیب میں پیسے نہیں ڈالے ہاں انھوں نے ضرور زبردستی نکال لیے تھے۔ اندر ہی اندر ہمارا خون کھول رہا تھا۔ اُدھر علامہ کے منحوس منہ سے ہماری تعریف سُن کر اُن دونوں حضرات کی آنکھوں میں بھی وہی چمک عود آئی جو شکار کو دیکھ کر شیر کی آنکھوں میں آ جاتی ہے۔ اسی وقت ویٹر نے کباب لاکر ٹیبل پر رکھے علامہ نے دو پلیٹیں اُن دونوں میں تقسیم کیں۔ پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔

"میرا خیال ہے تمہیں حاجت نہیں ہوگی پچھلی پلیٹ ہی تم نے آدھی چھوڑ دی تھی کیوں؟" انھوں نے تائید طلب نظروں سے ہمیں دیکھا۔" جی ہاں۔ جی ہاں" ہم نے اُن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے علامہ جیسے کثیر الاحباب اور عاشق کباب کی صحبت نے ادھ موا کر دیا تھا پھر علامہ سمیت ان کے احباب کبابوں پر ٹوٹ پڑے اور ہم پانی کے گلاس پر۔

جیسا کہ عادت تھی علامہ کبابوں کے ختم ہونے تک خاموش رہے۔ حسب عادت کبابوں سے فارغ ہو کر سگریٹ

سے رجوع کیا اور دھواں اُگلتے ہوئے بولے۔
"کیوں شریف بھائی اور کباب منگواؤں آپ کے لیے؟"
"جی نہیں شکریہ" انھوں نے منع کیا۔
"جلالی صاحب آپ لیں گے؟"
"شکریہ۔ اب حاجت نہیں؟"

ہماری جان میں جان آئی دل ہی دل میں ورد کرنے لگے" جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" دونوں حضرات کے انکار پر علامہ نے کھسیا کر سگریٹ بجھائی پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں میاں۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"آپ کا خون پینا چاہتا ہوں" ہم نے دل ہی دل میں سوچا مگر از راہِ مروت مسکرا کر کہا۔" بس اب اجازت دیجیے"

"اماں ٹھہرو۔ جانے کی ایسی بھی جلدی کیا ہے۔ چلے جانا۔ کچھ اپنی سناؤ۔ کچھ ہماری سنو۔

علامہ کے اس فیاضانہ پیشکش کی تائید ان دونوں حضرات نے بھی کی۔ اب جمہوریت پسند انسان ہونے کے ناطے اکثریت کی حماقت کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سو ہم نے ہتھیار ڈال دیے مطلب یہ کہ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس واپس ٹیبل پر رکھ کر اپنی پشت کرسی پر ٹیک دی۔

علامہ کی عادت ہے لوگوں پر خصوصًا نوعمروں پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اکثر ایسے سوالات کرتے ہیں کہ مقابل لاجواب ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی وغیرہ وغیرہ!

اس روز بھی ہمارے ساتھ اپنے مصاحبوں پر بیک وقت دھونس جمانے کی غرض سے کہا" میاں تم نئی نسل کے لوگ ذرا سا پڑھ لکھ کر سرسری سی تعلیم حاصل کر کے خود کو بہت قابل سمجھتے ہو۔ جب کہ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ ہماری تعلیم پختہ ہوا کرتی تھی۔ ہم علم کو سیکھے سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے۔ تین تین چار چار سال ہم نے ایک ہی کلاس میں گزارے مگر اُستاد کی منت سماجت اور ماں باپ کے جوتوں لاتوں کے باوجود اس وقت تک پاس ہونے کی حامی نہ بھری جب تک جو پڑھا تھا ہماری سمجھ میں نہ آگیا؟"

ہم چوکنے ہو گئے۔ مطلب چاروں کونوں کو چیلا لیا کہ کہیں سے کم نہ پڑیں۔ علامہ سگریٹ کا کش لینے کی غرض سے چپ ہوئے تو ہم نے بے خبری میں دھاوا بول دیا۔" اچھا اچھا تو آپ پڑھے لکھے بھی ہیں؟ کہاں تک تعلیم حاصل کی تھی آپ نے؟" "میاں علم کو پیمانے پر پرکھا جائے تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ علم تو ایک سمندر ہے بیکراں سمندر۔ کچھ بی۔ اے ایم۔ اے کر کے خود کو سقراط مت سمجھو۔ ہمیں دیکھو آج بھی کوئی عالم فاضل جب بات کرتا ہے تو ہم اس کا ہر فقرہ ہر پینترا خاموشی سے گرہ میں باندھ لیتے ہیں اور پھر کہار داڑھ کے باغیچے میں بیٹھ کر اس گرہ کو کھولتے ہیں تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے آخر ایسا کیا کہا جو ہمیں پہلے سے معلوم نہ تھا" علامہ پھر گردن اکڑا کر سگریٹ کا کش لینے لگے۔

"پھر بھی جب آپ نے مدرسے کو ٹاٹا بائی بائی کیا اس وقت آپ کس درجے میں تھے" ہم نے اصرار کیا۔
علامہ جلال میں آگئے" اتنا علم ہمیں صرف اسکول سے نہیں ملا۔ برسوں تک صبح و شام کے اخبارات

جاتے ہیں۔ دہلی کے رسالوں کو کھنگالا ہے۔ بک اسٹالوں پر اپنی عمر عزیز ضائع کی۔ مشاعروں اور قوالیوں میں نیند قربان کی ہے۔ فلموں گانوں پر سر دھنا ہے۔ پلے ہاؤس کے سینما گھروں میں تاریخی فلموں کو بار بار دیکھا ہے وہ بھی اگلی صفوں میں بیٹھ کر۔ مغل شہنشاہوں سے لے کر سکندر اعظم۔ جھانسی کی رانی۔ شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں تک "ہر کس و ناکس کو بڑے قریب سے معائنہ کیا ہے سمجھے! ایسے علم سے کیا اب ہوا تب جاکر دنیا نے علامہ کے نام سے نوازا۔" اُن کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ مسکین جلالی صاحب نے جلدی سے ویٹر کو بلایا اور آئسکریم لانے کا آرڈر دیا۔ پھر ہمارے کان کے پاس منہ لاکر منمنائے۔

"علامہ گرم ہو گئے ہیں ٹھنڈے ہو جائیں گے؟"

ہم کیا جواب دیتے کیوں کہ ہم تو ویسے ہی سرد ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ماحول کی گرمی کو کم کرنے کے لیے مسکین صاحب نے چار آئسکریم کا آرڈر دیا تھا۔ ہم سوچنے لگے خواہ مخواہ علامہ سے اُلجھ پڑے پہلے ہی کھسک لیتے تو کم از کم آئسکریم کے پیسے ہی بچ جاتے۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ آئسکریم کے آنے اور کھانے تک میز پر خاموشی طاری رہی۔ پھر جیسے ہی ہم آئسکریم سے فارغ ہوئے علامہ ہم پر پل پڑے۔

"میاں تمہیں اپنی تعلیم پر بڑا ناز ہے ذرا بتاؤ تو سہی" اگر ایک کتّا ہو تو ہم اُسے کتا کہتے ہیں اگر بہت سے ہوں گے تو کیا کہیں گے؟ "کتّے کہتے" ہم نے آسان سا جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ کتّا ادبی زبان میں کیا کہلاتا ہے"؟

"سگ" ہم نے جھٹ جواب دیا۔ "سگ کی جمع کو کیا کہو گے" علامہ نے اپنی دانست میں ہمیں پھانس لیا تھا مگر ہم نے اُن کی اُمیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے فوراً کہا۔

"سگ کی جمع کو سگے کہتے ہیں"

علامہ اینڈ کمپنی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے بعد مسکین نامی موالی اور شریف گرامی شیطان تو جھٹ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر شکریہ ادا کئے دفع ہو گئے مگر علامہ نے حسب سابق ہماری سگریٹ کی ڈبیا سے آخری سگریٹ کھینچ کر جلائی بلکہ گہرا کش لیا پھر خالی ڈبیا کو زور سے زمین پر پٹخ کر پیروں کی پوری قوت سے مسل ڈالا۔

اگر اُن کا بس چلتا تو مندرجہ بالا سلوک وہ ہمارے ساتھ بھی کرتے مگر ابھی انہیں ہمارے ذریعہ ہوٹل کا بل ادا کروانے کے بعد باقی بچے پیسے اپنی بیمار ماں کے علاج کے لیے بٹورنے تھے۔ اس لیے چپ چاپ سگریٹ کے کش لینے لگے۔

(اس واقعہ کے بعد پتہ چلا کہ علامہ کی والدہ کا انتقال سات سال قبل ہو چکا تھا۔ واضح ہو کہ علامہ سے ہماری شناسائی دو سال سے قائم ہے اور ہم دس مرتبہ" ذکر بوڑھی ماں کا اور بیان علامہ کا" سُن سُن کر کنگال ہو چکے ہیں)

غزل ۔ جگر + کیف بھوپالی ۔ جگر نظام آبادی

میرے بچوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

اے خدا دشمن کی بھی قسمت میں لکھ
دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

شام غم ہم لیتے لیتے تھک گئے
کروٹیں، بے تابیاں، انگڑائیاں

اُن کے ساتھ آئی ہیں اکثر گھر مرے
وحشتیں، گھبراہٹیں، پرچھائیاں

آج کل کے دور میں اک خواب ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

جاتے جاتے سب چُرا کر لے گئے
حکمتیں، آگاہیاں، دانائیاں

ہر جواں بینکر کی قسمت میں ہیں یہ
خوبیاں، زیبائیاں، رعنائیاں

کرتے کرتے تھک گئے آخر میں ہم
اُلجھنیں، فکریں، قیاس آرائیاں

تم بھلے آؤ نہ آؤ، آئیں گی
بولیاں، بڑھتی قرتیں، بُرائیاں

کس کے کام آئیں؟ ہمارے آئیں گی
نیکیاں، قربانیاں، سچائیاں

رات دن کی دوست ہیں جگر مری
لغزشیں، ناکامیاں، پسپائیاں

دُعائے جدید

حیدر بیابانی

یارب! ہمیں الو کی دانائی عطا فرما
طوطے کی ذرا چشم ہرجائی عطا فرما

مچھلی کے شکاری سا تو صبر عطا کر دے
بیوی کے نشانے کو ہر بار خطا کر دے

عینک کے بغیر ہم کو اب چشم بصیرت دے
کہنے کی بھی عادت دے پٹنے کی بھی طاقت دے

سنتا ہے سبھی کی تو ہے تیری یہی خوبی
بھٹکے ہے سگِ لیلیٰ دے کو چۂ محبوبی

وہ ربطِ محبت دے کہ فون بھی شرمائے
دل ان کا وہاں دھڑکے آوازیں یہاں آئے

راکٹ سے بھی آگے ہو رفتار خیالوں کی
اک ماسٹر چابی دے ہر قسم کے تالوں کی

بجلی کے ہنڈے سا روشن ہو دماغ اپنا
بند آنکھوں سے ڈھونڈیں تو مل جائے سراغ اپنا

سہرۂ نو

حیدر بیابانی

چھتیس برس گزرے جب عمر عزیزی کے
تب جا کے کہیں ان کو شادی کا خیال آیا
بیوی ہو بھلا کیسی سسرال کہاں پر ہو
اب اتنے گئے زنگ آلودہ بھیجے میں خیال آیا

★

مدت سے سر میرا پھولوں کو ترستا تھا
اب اس پہ چنبیلی کے پھولوں کی نمائش ہے
سہرے کے تعلق سے یہ راز کھلا ہم پر
چیچک زدہ چہرہ کو ڈھک لینے کی سازش ہے

★

جن کانوں میں گونجے تھے تنہائی کے سر بے سول
ان کانوں میں شادی کی شہنائیاں بجتی ہیں
طے ہو گئے جس دن سے تاریخ دن اور ساعت
اس دن سے خیالوں میں کیا محفلیں سجتی ہیں

جلوا انصاری ناگپوری

تضمین بر غزل

برادرم محترم حضرتِ ناظم انصاری مرحوم

ایسی ہے میری ذات ارے باپ کیا کروں
بنتی نہیں ہے بات ارے باپ کیا کروں
قسمت ہے واہیات ارے باپ کیا کروں
بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

آفاتِ حسن و عشق میں ایسا گیا ہوں گھر
ہوش و حواس سارے ہوئے ہیں تتر بتر
شاید اسی عمل کی رہی ہو گی منتظر
سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی اُٹھا کے پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں

ملتے تھے روز ڈیوڑھی پہ دن رات جس سے ہم
جس کے پتا بھی کرنے لگے تھے سوا گیتم
اس سے زیادہ کس پہ ہوا ہوگا یہ ستم
کھائی تھی ہم نے جینے کی جن کے لیے قسم
وہ کر گئی وفات ارے باپ کیا کروں

اپنے سدھائی پن ہی میں ایمان سے چھلنے
مل جائیں کیوں نہ خاک میں سب میرے حوصلے
کرکٹ کا ناگ چاہے کسی روز بھی ڈسے
ہر روز روزِ عید ہے بیگم کے واسطے
ہر شب شبِ برات ارے باپ کیا کروں

بچپن گزارا اہلِ محلہ کی گینگ میں
جھونکا گیا ہوں میں کبھی مُلّا کی گینگ میں
اب تو بُرا پھنسا ہوں بتسوائی گینگ میں
بالغ ہوا ہوں صوفیو ملا کی گینگ میں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی رات ارے باپ کیا کروں

بزمِ وفا سے ہائے تڑی پار کر دیا
کچھ سوچنے سمجھنے سے لاچار کر دیا
ایسی جلوا طنز کی بوچھار کر دیا
اس نے یہ کہہ کے ملنے سے انکار کر دیا
ناظم ہے واہیات ارے باپ کیا کروں

عابدہ محبوب (حیدرآباد)

"دھجیاں"

"ہائے میرا دل":- ایس ایس سی کے سالانہ امتحان کے سائنس کے پرچے میں ایک سوال تھا "دل کی ساخت اتار کر اس کے مختلف حصوں کی نشاندہی کیجئے؟" امتحان ہال کی نگران کار خاتون نے ایک امیدوار کو اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جب وہ دل کی ساخت اتارنے میں نقل مار رہا تھا۔ نگران کار خاتون نے دل کی ساخت کی شکل کا کاغذ اپنے قبضے میں لے لیا تو امیدوار بے چین ہو کر گڑگڑاتے لگا "میڈم! پلیز! میرا دل . . . . پلیز میڈم . . . میرا دل مجھے واپس دے دیجئے نا . . . ."

"اجازت"

ایس ایس سی کے سالانہ امتحان میں ایک امیدوار زبان اول کے پرچے میں نقل مارنے میں مصروف تھا۔ امتحان ہال کے نگران کار نے اس کو پکڑ لیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔

" بڑے افسوس کی بات ہے! آپ مادری زبان کے پرچے میں نقل کر رہے ہیں" امیدوار شرمندہ ہوگیا "سوری سر! مجھ سے غلطی ہوگئی! مگر کل زبان دوم کا پرچہ ہے کیا میں اس پرچے میں نقل کر سکتا ہوں؟"

"آپ کی تعریف"

ایس ایس سی کے سالانہ امتحان میں کوئی پرچہ مشکل سا آگیا۔ ایک ہال کے سارے امیدوار قلم ہاتھ میں لیے ایک دوسرے کی صورت تک رہے تھے۔ ہال میں تین نگران کار تھے۔ ان میں سے ایک نگران کار کے دل میں امیدواروں سے ہمدردی ابھر آئی۔ وہ سوالات کا پرچہ پڑھ کر امیدواروں کو اس کے تعلق سے کچھ کچھ اشارات دینے لگے۔ وہ دوسرے سوال پر ہی آئے تھے کہ ایک ساتھی نگراں کار بول پڑے "یہ کیا کر رہے ہیں آپ! آپ کو موقع و محل کا کچھ اندازہ بھی ہے؟ آپ ٹیچر ہیں یا . . . ."

ہمدرد نگراں کار نے بات کاٹ کر برجستہ جواب دیا۔

"میں ٹیچر نہیں ہوں! بلکہ چیٹر (CHEATER) ہوں!"

"بورڈ کا امتحان"

ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان میں حساب کا پرچہ ننھے منے اُمیدواروں کو بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ ایک امتحان ہال میں ایک ہمدرد نگران کار بھی موجود تھے۔ ان سے ننھے منوں کی پریشانی اور رونا دھونا دیکھا نہ گیا۔ ازراہ ہمدردی انھوں نے ایک سوال بورڈ پر حل کرنا شروع ہی کیا تھا کہ اتفاقاً متعلقہ آفس سے فلائینگ اسکواڈ آگیا۔ موصوف کو برسر موقع پکڑ لیا اور غصے سے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے آپ کی؟ یہ کلاس روم ہے یا بورڈ کا امتحان؟ (سرکاری امتحان!)

ہمدرد نگران کار نے برجستہ جواب دیا "جی! یہ بورڈ کا امتحان ہے! اسی لیے تو میں بورڈ پر کام کر رہا تھا"!

"مشورہ"

ایس ایس سی کے سالانہ امتحان میں اُمیدوار، نگران کار کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ نگران کار اصولی اور سخت تھے اس لیے امیدواروں کو نقل کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا! آخر ایک اُمیدوار نے ایک نیا حربہ استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ ہر بار نگران کار سے امتحانی سوالات کے پرچے سے ایک نہ ایک سوال کا جواب پوچھ رہا تھا۔ اِدھر نگران کار نے بھی شاید قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ہر سوال کے جواب میں یہ ہی کہہ دیتے تھے کہ

"مجھے نہیں معلوم بابا . . . . آپ کو جو یاد ہو لکھ دیں!"

امیدوار نے بھی ہمت نہ ہاری۔ ایک بار پھر پوچھا۔

"سر! بھارت میں چاول سب سے زیادہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟"

نگران کار نے وہی مخصوص جواب دیا۔ امیدوار نے حیرانی سے کہا۔

"سر! آپ کو تو کچھ بھی نہیں آتا! آپ ہمارے ساتھ امتحان کیوں نہیں دے دیتے!"

"یادگار دِن"

ایک صاحب کی شادی پندرہ اگست کو مقرر ہوئی۔ وہ اپنی شادی کا رقعہ لے کر دوست کے پاس گئے۔ دوست نے رقعہ پڑھ کر کہا۔

"تمہیں کوئی اور دن نہ ملا تھا شادی کے لیے؟"

"اس سے اچھا دن اور کیا ہو سکتا ہے! میری شادی ایک یادگار دن ہو رہی ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں بھی اہم اور یادگار ہے!"

دوست نے جواب دیا "یہ دن ہندوستان کی تاریخ میں واقعی ایک اہم اور یادگار دن ہے کیوں کہ اسی دن ہم نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی۔ مگر تم تو اسی دن غلامی میں جارہے ہو!"

"ترجیح"

ایک شادی شدہ شخص کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گیا۔ دونوں نے شادی کرلینے کا فیصلہ کرلیا۔ اِدھر وہ شخص اپنی بیوی کو سمجھا بجھا کر راضی کروانا چاہتا تھا مگر بیوی کسی صورت "سوت" کو برداشت کرنے تیار نہ تھی۔ آخر شوہر کو غصّہ آگیا۔ بولا۔

"تم اپنی ضد نہیں چھوڑوگی تو میں بھی کچھ کھا کر حرام موت مرجاؤں گا!"

بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے بیوہ بننا منظور ہے!"

"نقاہت"

اردو کانفرنس میں ایک مہمان پروفیسر کا نام تقریر کے لیے پکارا گیا۔ موصوف نے مائیک پر آکر کہا۔ "کل سے میری طبیعت ناساز ہے۔ بڑی نقاہت ہے۔ چکر بھی محسوس ہورہا ہے! اس لیے زیادہ نہ بول سکوں گا۔ مختصراً عرض ہے کہ۔۔۔" اب پروفیسر صاحب نے اپنے مختصر کو اتنا طویل کیا کہ پون گھنٹے کے بعد اپنی تقریر ختم کی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب اپنے دوست سے بولے۔

"جناب کی نقاہت کا یہ حال ہے تو صحت کا کیا حال ہوگا!"

غزلیں

جھاپڑ ناگپوری

بولو خبیث سے نہ تو شیطان سے کہو — لفڑے کے جتنے کام ہیں انسان سے کہو
میں ہوں غریب اور گرانی کا دور ہے — ٹپکے نہ روز روز یہ مہمان سے کہو
سکریٹری ہیں قومی ادارے کے جب آپ — کتنا غبن کیا ہے یہ ایمان سے کہو
دو بات کرکے تم سے میں گھر لوٹ جاؤں گا — روکے نہ گیٹ پر مجھے دربان سے کہو
ہر وقت ناک سکوڑی لی اور منہ پھلا — کب تم نے ہنس کے بات کی ایمان سے کہو

جھاپڑ سے شر کسی کو لگانا نہ بھول کر
ہر ایک گھر جوائی سے شریمان سے کہو

○

ظہیر الدین ظہیر (رنگیم پوری)

حسین رخسار پر ان کے جو تھوڑا منٹ ہو جائے — تو پھر کیا ہے جہاں میں حسن پرمانٹ ہو جائے
مزا تو جب ہے سروس کا جہانِ علم و دانش میں — کہ بیوی ہیڈ ہو آفس کی میاں سرونٹ ہو جائے
بتائیں ہم تمہیں پوشاک کیوں تبدیل ہوتی ہے — تمنا ہے یہ ہر اک کی کہ لیڈی جنٹ ہو جائے
مریض حسن بھی یا رب نہ جانے کیا قیامت ہے — جو دیکھے ڈاکٹر اس کو تو خود پیشنٹ ہو جائے

اشاروں سے وہ تنہائی میں مل کر بات کرتے ہیں
نہ ظاہر راز ہو اور بات بھی پیٹنٹ ہو جائے

○

تین شعر

مشیم رضا شیلون

سالی نے کی ہے مجھ سے لڑائی تمام رات
جورو نے کی ہے میری پٹائی تمام رات

سوکھی چپاتی سامنے لاکر مرے وہ خود
کھاتی رہی ہے یوں ہی ملائی تمام رات

بیوی چڑیل ہے تو سسر کیا خبیث ہے
دولن کے ڈر سے شمع جلائی تمام رات

شفیع شیخ

ٹوٹی پیالی

اِنتخابات کا اعلان ہو چکا تھا اور بستی کے سبھی سربرآوردہ لوگ میرے گھر جمع تھے۔

"آپ کچھ بھی کہیں لیکن اس بار آپ کو الیکشن میں کھڑا ہونا ہی پڑے گا۔" کلو نائی نے اپنی زیرہ سی آنکھیں اِدھر اُدھر گھما کر حاضرین سے تائید چاہی۔

"دیکھئے حضرات، الیکشن میں کھڑا ہونا کوئی معمولی بات نہیں، اور جو شخص زندگی کے ہر موڑ پر قطاروں میں کھڑے کھڑے تھک چکا ہو اس میں الیکشن میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہ جاتی۔" میں نے اپنا پنڈ چھڑانا چاہا۔

"نہیں، ہم نے پانچ سال پہلے آپ کی بات مان لی تھی لیکن اس بار ہم آپ کی ایک نہ سنیں گے۔" منشی کریم الدین نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ منشی صاحب پڑوس کی واشنگ کمپنی میں کپڑے لکھنے پر ملازم تھے۔

"دیکھئے منشی جی، سیاست کوئی واشنگ کمپنی نہیں ہے کہ دلوں کا میل صاف کر سکے، یہاں تو اچھے خاصے آدمی کا کردار میلا کچیلا ہو کر باہر نکلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس بار انتخابات آزادانہ ہو رہے ہیں اس لیے آزاد امیدواروں کے جیتنے کے بہت امکانات ہیں۔" یوسف خاں بی۔ اے۔ (آنرز) نے ایک نئے پہلو پر روشنی ڈالی، یوسف خاں دن میں میونسپل کارپوریشن کے ایک اسکول میں معاون اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور شام میں ایک مقامی روزنامہ میں مترجم کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے تھے۔

"ہرگز نہیں، ہم رولنگ پارٹی کو ٹکٹ حاصل کریں گے۔" نثار تیلی نے دخل اندازی کی۔ یوسف خاں اور نثار تیلی کا ایک بار تیل کم تولنے پر جھگڑا ہو چکا تھا۔ "یوسف خاں تم کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی ٹاپک کے آس پاس راؤنڈ مارتے رہتے ہو۔" نثار تیلی کو انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا خبط تھا۔

"کیا کہا؟" یوسف خان سے یہ غیر پارلیمانی اندازِ تخاطب برداشت نہ ہو سکا۔ "تمہاری یہ مجال کہ تم مجھے کولہو کا بیل کہو، یو ایڈیٹ۔"

اس پر نثار تیلی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ قریب رکھی ہوئی چائے کی پیالی یوسف خان کی سمت روانہ کر دی، پیالی یوسف خاں

کے قریب بیٹھے ہوئے چمن چاچا کے سر سے ٹکرائی اور فرش پر گر کر چور چور ہوگئی۔ وہ تو بھلا ہو چمن چاچا کی پگڑی کا جس نے خندہ پیشانی سے یہ صدمہ سہہ لیا۔ البتہ اڑتالیس روپے درجن کے حساب سے کل ہی خریدی گئی چھ پیالیوں میں سے ایک پیالی کے نقصان نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں شدید غصّہ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"بھائیو!" اچانک منشی کریم الدین نے کھڑے ہوکر کہنا شروع کیا۔ منشی کریم الدین ہم میں سب سے زیادہ معمر شخص تھے۔ ہم سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

"یہ صحیح ہے کہ اسمبلی میں بھی اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور پیپر ویٹ ایک دوسرے پر پھینکے جاتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم ایک مہذب اور ترقی یافتہ اسمبلی کی تشکیل چاہتے ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہو ہمیں ایسی حرکتوں سے باز رہنا ہوگا جن کے خلاف ہم اپنا نمائندہ کھڑا کرنے جا رہے ہیں۔"

اتنا کہہ کر منشی صاحب بیٹھ گئے اور لوگوں کو دس منٹ کا وقت دیا گیا کہ وہ اپنے اختلافات دور کرلیں، اس دوران یوسف خان بی، اے (آنرز) نے احتجاجاً واک آوٹ کردیا کیوں کہ کوئی ان کی بات سننے اور سمجھنے پر رضامند نہیں تھا۔ کلونائی کی بیوی نے اپنے شوہر کو بلوا بھیجا کیوں کہ وہ اپنے چھ بیٹوں میں ہونے والے دنگے پر قابو پانے میں بُری طرح ناکام رہی تھی۔

اسی دوران بشیرا آگیا جو میونسپلٹی میں جاروب کش تھا۔ حاضرین نے ایک اچٹتی سی نظر نعم البدل پر ڈالی اور گفتگو کا آغاز کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ سیاست میں حصّہ لینے سے کیوں ہچکچاتے ہیں دیکھئے پڑھے لکھے لوگوں اور شرفاء کے اسی رویے نے آج ہماری ملک گیر سیاست کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔" منشی کریم الدین فرصت کے اوقات میں افسانے بھی لکھتے تھے، اس لیے ان کی تقریر بھی بڑی افسانوی ہوتی تھی۔

"سیاسی اُفق پر دور دور تک نظر ڈالئے، مجال ہے جو کوئی معقول آدمی دکھائی پڑ جائے"۔

میرا جی چاہا کہ ان سے کہہ دوں کہ اسی وجہ سے "اُفق کے اس پار" جانے کی خواہش جنم لیتی ہے لیکن ادباً چپ رہا۔ میری خاموشی نے اہلِ محفل کو مزید ناصبور بنا دیا تھا۔ آخر بشیرا سے نہ رہا گیا، اس نے ایک نہایت بنیادی سوال کیا۔ آخر آپ کے انکار کی کیا وجہ ہے؟"

میں نے ٹوٹی ہوئی پیالی کے ٹکڑے ایک کونے میں رکھے، چشمہ درست کیا اور مسکرا کر کہا۔

"تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے" اس انکار کی کئی وجہیں ہیں۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینا ہوگا"

شیام راؤ بانسود سے آب پاشی کے محکمہ میں لوئر ڈویژن کلرک تھا۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی شاید وہی جانتا تھا کہ سرکاری نوکری کو تیاگ دینے میں کتنی آسائشوں کی قربانی شامل ہوتی ہے۔

"لیکن آپ کو اسمبلی ممبر بننے پر بھتہ تو ملے گا۔"

شرف الدین درزی نے یہ جملہ اتنی ہی تیزی سے ادا کیا جتنی تیزی سے اس کی قینچی کپڑا کاٹتی تھی۔

"ضرور ملے گا۔ اگر میں الیکشن جیت گیا لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ میں الیکشن جیت جاؤں گا۔ آزاد اُمیدواروں کا حشر آپ لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے"۔

جی میں آیا کہ "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" والی مثل استعمال کرڈالوں تاکہ میری بات مدلل ہوجائے لیکن پھر احساس ہوا کہ اس کوشش میں شخصیت مذلل ہوجائے گی۔

اچانک آہٹ ہوئی اور نثار تیلی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شاید اپنے دو تین بیٹوں کو بُری طرح پیٹ کر لوٹا تھا کیونکہ اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی ہتھیلیاں بھی سُرخ تھیں۔ لوگوں نے اسے راستہ دیا۔

"ہاں تو آپ اب تک کھڑے نہ رہنے کی ضد کر رہے ہیں"۔ نثار تیلی کی آگ اگلتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بھی اپنا سرکش بیٹا سمجھنے پر تلا ہوا ہے۔

میں نے اپنے موقف میں نرمی کی۔

"دیکھئے نثار بھائی، بات بالکل سیدھی سی ہے، اگر میں الیکشن ہار گیا تو نوکری اور اسمبلی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور اگر جیت بھی گیا تو ایم ایل اے کے بھتے میں میرا گزارا نہیں ہوسکتا۔ میرے بوڑھے ماں باپ وطن میں موجود میری بیوی، چھ بچے، مکان کی گاہے بگاہے مرمت، دوا دارو، کپڑا لتا، میں خیر سے دو ہزار روپے کما لیتا ہوں اور ٹیوشن ملا کر تین ہزار تک ہوجاتے ہیں"۔

نثار تیلی نے ایک سرد آہ بھری۔

میاں بہت بھولے ہو۔ اگر خدانخواستہ ہار بھی گئے تو فکر کس بات کی ہے فل ٹائم سوشیل ورکر بن جانا، یا ٹریڈ یونین میں گھس جانا، دونوں لائنیں اچھی ہیں۔

"نثار بھائی، یہ سب میرے بس کا نہیں ہے"۔ میں نے بیچارگی سے کہا۔

"لیکن آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ آپ ہار جائیں گے"؟ عقب سے شرف الدین درزی کی قینچی چلی۔

"لیکن جیتنے کے بعد بھی میں اپنا گھر نہیں چلا سکتا، مجھے اپنے ٹیوشن چھوڑنے ہوں گے، میرا خرچ کیسے چلے گا"؟

"لیکن بابو جی ہم نے تو سنا ہے کہ نیتا چناؤ جیتنے کے بعد بڑی ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں، موٹروں میں گھومتے ہیں"۔ جمن چاچا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ "دیکھئے میری زندگی کے پینتالیس سال عزت و آبرو کے ساتھ گزر چکے ہیں، میں نے ۲۵ سال سرکاری نوکری کرنے کے باوجود آج تک رشوت نہیں لی، اور . . . "؟

"کیا کہا ؟ آپ رشوت نہیں لیتے !" بشیرا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ صدمہ اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دے گا۔

"جی ہاں، اور میں نہیں چاہتا کہ عمر کے اس حصّے میں رشوت کے سمندر میں کود پڑوں"۔

حاضرین پر سکتہ سا طاری تھا۔ پُرانے ٹیبل فین کی روں روں نے فضا کو اور بوجھل بنا دیا تھا۔

اچانک بشیرا ایک کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چلو بھائی، ہم بھی کہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کوئی ایسا شخص ڈھونڈیں جو ملک و قوم کی لٹیا ڈوبانا ... دیکھنا ہو"۔ ایک ایک کر کے سارے لوگ رخصت ہوگئے، صرف منشی کریم الدین رہ گئے جو سر جھکائے اپنی عینک سے ... صاف

حفیظ حارث (دار پونہ کامٹی)

سڑک چھاپ مجنوں

ہمارے ملک میں سڑک چھاپ مجنوں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یوں تو یہ ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن لڑکیوں کے اسکول، زنانہ کالج، زنانہ اسپتال اور سٹی بس اسٹاپ کے قرب وجوار میں بکثرت پائے جاتے ہیں! سینما کے قریب بھی ان کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔

سڑک چھاپ مجنوں کی کمر لچکدار، چال طرحدار اور زلف جھاڑی دار ہوتی ہے انھیں مونچھیں رکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں مونچھیں مردانگی کی نشانی ہیں۔ مونچھوں کے بے شمار کٹوں میں سے انھیں گھوڑے کی نعل کٹ مونچھیں زیادہ پسند ہیں۔ اس لیے یہ اکثر گھوڑے کی نعل کٹ مونچھوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ بھڑکدار رنگوں والے پھولدار لباس زیب تن کرنا یہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ گلے میں ریشمی رومال باندھتے ہیں کمر میں چوڑا بلیٹ، ہونٹوں میں سگریٹ دبائے رہتے ہیں، آنکھوں پر بڑے فریم والے چشمے لگاتے اور پیروں میں اونچی ایڑی کے جوتے یا چپلیں ڈالے رہتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے عام طور پر دبلے پتلے اور منحنی ہوتے ہیں۔ ان کے سر بڑے اور دھڑ چھوٹے ہوتے ہیں — کچھ سڑک چھاپ مجنوں جنگلی بھینسوں کی طرح اچھے خاصے موٹے تازے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے "تندرست و توانا" سڑک چھاپ مجنوں بہت ہی کم تعداد میں پائے جاتے ہیں — اکثریت لاغروں کی ہی ہوتی ہے۔

سڑک چھاپ مجنوں کو سیٹیاں بجانے کا ہنر بہت ہی اچھا آتا ہے۔ یہ بیک وقت کئی انداز سے سیٹیاں بجا سکتے ہیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے ہونٹ آپ ہی آپ سکڑ کر مل جاتے ہیں۔ اور ان سے سیٹیوں کی سی آواز نکلنے لگتی ہے —! لڑکیوں کو یہ نہ صرف آنکھیں پھاڑ کے دیکھتے ہیں بلکہ انھیں دیکھ کر آنکھ مارنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ آنکھ مارنے کے فن کے تمام رموز سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ یہ اس راز سے بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ دائیں آنکھ کب ماری جائے اور بائیں آنکھ کس وقت کے لیے بچا کر رکھی جائے — یہ آنکھوں کے اشارے بھی خوب پہچانتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے اشارے بھی خوب کرتے ہیں۔ یہ آنکھوں کی زبان بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کو سمجھانے کی بھی اپنی طرف سے یہ پوری کوشش کرتے ہیں۔

جب کوئی لڑکی ان کے قریب سے گزرتی ہے تو یہ آپ ہی آپ اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ اس میں ان کے ارادے کو قطعی دخل نہیں ہوتا ہے۔ لڑکی کا پیچھا کرتے وقت اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے مندرجہ بالا "فنون" کا استعمال بے خوف و خطر شروع کر دیتے ہیں۔ لڑکی اگر شرمیلی اور بہت ہی سیدھی سادی رہی تو چپ چاپ آگے بڑھ جاتی ہے لیکن ذرا سی بھی تیز طرار اور خونخوار رہی تو اپنی اونچی ایڑی کی سینڈلیں اتار کر ان پر باز کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے۔ لیکن سڑک چھاپ مجنوں اس قسم کی صورتِ حال سے مطلق نہیں گھبراتے۔ کیوں کہ ان کا سر ناریل کے خول کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ چپلیں ٹوٹ جاتی ہیں لیکن ان کے سر کا ایک بھی بال بیکا نہیں ہوتا۔ اس قسم کی صورتِ حال ہر سڑک چھاپ مجنوں کی زندگی میں ایک بار نہیں کئی بار آتی ہے۔ اس لیے وہ پہلے ہی سے ان سے نمٹنے کے لیے اپنے سر کو کافی مضبوط بنائے رکھتا ہے۔

سڑک چھاپ مجنوں ہمیشہ اور ہر معاملے میں کسی نہ کسی بڑے فلمی ہیرو کی نقل کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، ہنسنے رونے، لڑنے جھگڑنے، چیخنے چلانے، غرض ان کی ہر ہر ادا اور ہر ہر انداز پر ہندوستانی فلمی ہیروز کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ دیوانگی کی حد تک "فلم زدہ" ہوتے ہیں ـــــ!

ہر سڑک چھاپ مجنوں کو کم از کم ڈھائی تین درجن اخلاق سوز اور بے ہودے فلمی نغمے زبانی یاد رہتے ہیں ـــــ مثلاً "رک جا او جانے والی رک جا" "یا نا جناب نے پکارا نہیں۔ کیا میرا ساتھ بھی گوارا نہیں" "ایک چیز مانگتے ہیں ہم تم سے پہلی بار" "دیکھا اور دیکھا جب سے تمہیں دیکھا" "ہم تم اک کمرے میں بند ہوں" "تیرا پیچھا نہ چھوڑوں گا او سونیے" "مرے انگنے میں ـــــ" وغیرہ وغیرہ۔

ہر سڑک چھاپ مجنوں کو اپنے شہر کے تمام زنانہ اسکولوں اور کالجوں کے پتے ہی نہیں بلکہ ان اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں کے درجنوں نام اور پتے بھی زبانی یاد رہتے ہیں۔

سڑک چھاپ مجنوں روایتی مجنوں کی طرح صرف ایک ہی لیلیٰ پر قناعت نہیں کرتے۔ یہ ہر لڑکی کو اپنی لیلیٰ تصور کرتے ہوئے اُن کے تمام حقوق اپنے نام محفوظ کر ڈالنے کے چکر میں ان کی گلیوں کے چکر لگایا کرتے ہیں۔ ویسے تو صرف لڑکی چھیڑنا ہی ان کا نصب العین ہوتا ہے لیکن بعض سیاسی پارٹیاں اپنے جلسے جلوسوں میں تعداد بڑھانے کے لیے بھی ان کا استعمال کر لیتی ہیں۔ اگر چہ سیاست ان کا میدان نہیں ہے لیکن یہ محض اس لیے ان پارٹیوں کا آفر قبول کر لیتے ہیں کہ آج کل سیاسی جلسوں میں خواتین کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اس لیے انھیں یہاں بھی "چھیڑ چھاڑ" کے مواقع نصیب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔

جس طرح شرم و حیا لڑکیوں کا زیور ہے اسی طرح بے شرمی اور بے حیائی سڑک چھاپ مجنوں کی پوشاک ہے۔ اور یہ ہمہ وقت اپنی اسی پوشاک میں نظر آتے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے ان کے شر سے محفوظ رہنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ جب کوئی سڑک چھاپ مجنوں کسی لڑکی پر اپنا "فن" آزما رہا ہو اور اُسے اپنی لیلیٰ بنانے پر تُل گیا ہو تو وہ فوراً شور مچا کر مجمع اکٹھا کر لے۔ مجمع دیکھ کر وہ فوراً سر پر پیر رکھ کر بھاگ جائے گا۔ کیونکہ مجمع میں گھِر جانے کے بعد نہ تو اس کا سر ہی محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ پیر سلامت! اسلئے سر پر پیر رکھ کے بھاگ جانے میں ہی اسے اپنی عافیت نظر آتی ہے۔ لڑکیاں خاص طور سے یہ نکتہ نوٹ کر لیں۔ انشاء اللہ وہ سڑک چھاپ مجنوؤں کے شر سے ہمہ وقت محفوظ رہیں گی ـــ !!!

منظور وقار (گلبرگہ شریف)

ایک تاجر کا خط ایڈیٹر کے نام

جناب ایڈیٹر ..... روزنامہ "دھماکہ"

آداب!

میں آپ کے مقبول عام اخبار "دھماکہ" کے لیے ایک اشتہار روانہ کر رہا ہوں اُمید ہے آپ اپنے اخبار کے کسی گوشے میں اس اشتہار کو ضرور جگہ دیں گے۔ ویسے بھی ہماری "ڈنڈی مار مکھن سپلائنگ کمپنی" اشتہارات کے سہارے ہی ٹکی ہوئی ہے۔ ہماری ہی کمپنی کیا۔ . . . آج کل ہر بڑی کمپنی کا مال اشتہارات کے بل بوتے پر ہی بک جاتا ہے۔ ہم نے تو گھٹیا سے گھٹیا مال کو اشتہارات کی چمک دمک میں اس تیزی سے بکتا ہوا دیکھا ہے جس تیزی کے ساتھ اس دور کے انسانوں کا ضمیر بک رہا ہے۔ ملک میں اشتہار بازی کی ہوا آندھی طوفان کی طرح چل رہی ہے۔ اس لیے ہم بھی ہوا کا رُخ دیکھ کر فوراً اشتہارات کی جانب اس طرح مائل ہوئے جس طرح ہندوستانی سیٹھ ساہوکار (کاروبار میں) گھاٹا نظر آتے ہی سیاست کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ (کاش ہم بھی سیاست کی جانب مائل ہوتے تو آج اپنے گھٹیا مکھن کو شہرت دینے کے لیے آپ جیسے ایڈیٹروں کو مکھن لگانے کے بجائے چیف منسٹر یا ہوم منسٹر بن کر اپنے دفتر سے راست آرڈر جاری کرتے) خیر آپ اس اشتہار کو اپنے اخبار میں اس امید پر شائع کیجیے کہ ہمارا مکھن بھی آپ کے اخبار کی طرح عام آدمیوں میں مقبول اور خاص آدمیوں میں مشکوک ہو جائے۔ اگر ہمارا مال اس اشتہار کے بعد واقعی بکنے لگے گا تو آپ کا بل (ہم منٹوں میں) ادا کر دیں گے ورنہ . . . . جانے دیجیے بڑا سوچنا بہت بُری بات ہے خط کے ساتھ اشتہار کی ایک عدد کاپی لگی ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ اگر آپ اشتہار میں مزید کچھ دل چسپ، پُرکشش اور سنسنی خیز لفظوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے۔ آپ کو ہماری طرف سے پوری اجازت ہے۔

اشتہار

خواتین و حضرات! ہم آپ کی خدمت میں وہ چیز پیش کر رہے ہیں جس کا آپ لوگوں کو برسوں سے انتظار تھا۔ آپ کے بدن ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ آپ کے گال پچکے ہوئے ہیں۔ آپ کی آنکھیں جنسی اور جاسوسی ناولیں لکھنے والے ادیبوں کی طرح

اندر تک دھنس گئی ہیں۔ آپ کا جسم ہندوستانی جمہوریت کی طرح دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ تو حضرات! آپ لوگوں نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کی جسمانی حالت اس قدر کیسے بگڑ گئی۔ ان تمام بیماریوں اور کمزوریوں کی آخر وجہ کیا ہے . . . ؟ اگر آپ نہیں جانتے تو آیئے ہم بتا دیتے ہیں۔ آپ کے بدن کی کمزوری کی اصل وجہ ہے آپ کی غذا میں چکناہٹ کی کمی۔ آپ کی غذا اصلی مکھن سے محروم ہے۔ گھٹیا قسم کا تیل اور وناسپتی گھی کے استعمال کی وجہ سے آپ دائمی کھانسی اور دائمی بیماریوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کے خون میں چکناہٹ کی کمی آگئی ہے۔ اس لیے آپ کا بدن املی کے درخت کی سوکھی ہوئی شاخوں کی طرح سکڑ کر تن گیا ہے۔ اور آپ مرنے کے قابل ہیں اور نہ جینے کے قابل۔ غذا میں اصلی مکھن نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ملک کے کروڑوں انسانوں کا شمار زندوں میں ہوتا ہے اور نہ مردوں میں۔ (یقین نہ ہو تو آپ کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے وہ یونہی گر جائے گا) ! ہاں جنھیں اچھی غذا اور اصلی مکھن میسر ہے۔ ایسے لوگوں کے جسم دن بدن تر و تازہ ہوتے جا رہے ہیں۔ بھرے بھرے گال اور موٹی توند تو صرف منتریوں اور ٹھیکیداروں کی قسمت میں ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں کی غذا میں اصلی مکھن ہوتا ہے۔ جب کہ عام ہندوستانیوں کی غذا میں اصلی مکھن تو کجا صاف پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس لیے اکثر ہندوستانیوں کی حالت قبر سے نکلے ہوئے مُردے کی طرح ہوگئی ہے۔ اس لیے آپ فوراً ہماری کمپنی کا مکھن خرید کر اپنی غذاؤں کو جاندار اور مزے دار بنایئے۔ پھر دیکھئے آپ دیکھتے ہی دیکھتے کس طرح شاندار جسم کے مالک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارا چیلنج ہے اگر ہمارے مکھن کے استعمال کے بعد آپ کا مریل جسم پھیل کر سانڈ کی طرح مست اور مست نہ ہوا تو ہم اپنی "ڈنڈی مار مکھن کمپنی" کو خود اپنے ہاتھ سے آگ لگا کر انشورنس کمپنی سے اپنے مال کا دوگنا دام وصول کریں گے۔ ہم اس بات کا پورا یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا مکھن استعمال کرنے کے بعد آپ کے پچکے ہوئے گال سرخ ٹماٹر کی طرح تمتمانے لگیں گے۔ آپ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگے گا (یہاں تک کہ ایک دن اچانک خاموش ہو کر ہی دم لے گا) آپ کے تر و تازہ جسم اور پھولی ہوئی توند کو دیکھ کر شہر کے لوگ آپ کی عزت کرنے لگیں گے۔ شہر کا ہر سیاسی اور ادبی جلسہ آپ کی صدارت میں ہونے لگے گا۔ الکشن میں اگر آپ قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو فوراً برسرِ اقتدار پارٹی کا ٹکٹ مل جائے گا۔ ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہمارے مکھن کے ذریعہ لوگوں کو آپ وہ "دگا" سکیں گے جسے "مسکہ لگانا" کہتے ہیں۔ اس لیے آپ فوراً آج ہی اپنے شہر کے کسی بھی دیوالیہ مار کرانہ مرچنٹ پر جا کر کم از کم ایک من کے مکھن کا ٹن ضرور خریدیئے۔ ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

فقط

طوطارام سیتارام سرکو !
مالک : ڈنڈی مار مکھن کمپنی !
ضلع بھیک چندنگر ۔ !

سیفی سرونجی
(سرونج ایم پی)

ہم بھی ایڈیٹر بن گئے

بچپن سے ہی ہمیں حسین اور سہانے خواب دیکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ سچ پوچھئے تو خواب ہی ہماری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ بچپن میں جب کسی لڑکے سے ہماری لڑائی ہوتی اور ہم پٹ کر روتے ہوئے گھر آتے تو اس سے یہ کہہ کر ضرور آتے کہ سالے دیکھ لوں گا تجھے! اور واقعی ہم گھر آکر ضرور دیکھ لیتے۔ آنکھ بند ہوتے ہی ہم دیکھتے کہ وہ لڑکا اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ہم پر ٹوٹ پڑا ہے لیکن ہم تنہا ان سب کو اتنا مارتے کہ سب بھاگتے نظر آتے اور وہ لڑکا ہم سے رو رو کر معافی مانگنے لگتا۔ اور ہم کہتے سالے اس وقت بڑا اکڑ رہا تھا۔ اب کیا ہوا تجھے؟ صبح ہوتے ہی ہم خوش خوش اٹھتے اور جیسے ہی ہماری نظر اس لڑکے پر پڑتی تو کانپ اٹھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پھر مارنے لگے۔ ویسے بھی ہمارا لڑائی میں کوئی ریکارڈ اچھا نہیں ہے جس سے بھی لڑے ہیں اسی سے پٹے ہیں۔

غرض یہ کہ یہ خوابوں کا سلسلہ چلتا رہتا اور ہم کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام ضرور دیتے رہتے۔ جیسے جیسے ہم میں شعور آتا گیا خواب اتنے ہی حسین اور سہانے ہوتے گئے۔ ایک بار ہمارے شہر میں ایک مشاعرہ ہوا وہاں دیکھا کہ ایک شاعر صاحب اپنی ترنم خیز آواز میں غزل کا جادو جگا رہے ہیں اور سینکڑوں لوگ واہ واہ کے نعرہ لگا رہے ہیں اور بہت سی حسین خوبصورت لڑکیاں ان کے آٹو گراف لے رہی ہیں تو ہمیں بڑا عجیب لگا۔ اور شاعر صاحب پر رشک آنے لگا۔ ایک رات تو ہمیں نیند ہی نہ آئی دوسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا ہال ہے اور چاروں طرف حسین پری جمال لڑکیاں ہمیں اپنی آنکھوں میں بسانے بیٹھی ہوئی ہیں اور ہم ڈائس پر کھڑے ہوئے غزل کا جادو جگا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف گھر والے کھڑے ہوئے ہیں اور ہمارے والد محترم ڈاکٹر صاحب سے کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب میرے بچے کو بچا لیجئے پتہ نہیں اسے کچھ دنوں سے کیا ہو گیا ہے؟ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بکتا ہے۔ کہیں جنات وغیرہ تو . . . . کچھ کیجئے ڈاکٹر صاحب — غرض کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے منفرد علاج سے کافی پیسہ کما لیا۔ لیکن ہمارے خواب دیکھنے کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔

گانا سیکھنے کے لیے ہم نت نئی حرکتیں کرتے رہے اور اپنے طور پر بہرحال ہم ــ کوشش کر کے مسلسل ریاض کرتے رہے پھر ہم نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی لیکن جب پہلی بار ایک مقامی مشاعرے میں غزل پڑھی تو عجیب عجیب

نظر دا) سے لوگوں نے استقبال کیا کسی نے کہا کہ اچھی غزل لکھوا کر لایا ہے کسی نے کہا کیا بکواس غزل ہے ایک شاعر صاحب نے تو چلا کر کہا۔ میاں! غزل تو بہت اچھی لکھوائی بس دو ایک مصرعہ بحر سے خارج تھے وہ تو چلتا ہے!

پھر ہم نے پہلی بار ایک رسالے کو غزل بھیجی تو ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ غزل واپس آگئی۔ آپ کی غزل ملی شکریہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی غزل چند مجبوریوں کے باعث ہم شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں بڑا غصہ آیا اور ہمت کر کے ایک دوسرے پرچہ کو غزل روانہ کردی یہاں ہمیں کچھ امید نظر آئی لکھا تھا آپ کی غزل ملی شکریہ اگر آپ زرِ سالانہ پندرہ روپے روانہ کردیں تو آپ کی غزل شائع کرنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ ہم نے خط پڑھ کر فوراً پندرہ روپے روانہ کردیئے۔ پھر کیا تھا دوسرے ہی ماہ ہماری غزل چھپ کر آگئی اور ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اور اس طرح چھپنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بس آج پندرہ سال ہوگئے ہمارے چھپنے کا سلسلہ زیادہ تیز ہوا تو لوگ کہنے لگے "وہ تو جاہل ہے وہ کیا جانے شاعری کیا ہوتی ہے"۔ اب تو ہمیں بڑا غصہ آیا۔ اور غصہ میں آکر پہلے ادیب اور پھر ادیب ماہر اور کامل کے بعد ایم اے کے امتحانات کامیاب کرلیئے آج کل پی ایچ ڈی کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک دن ہم نے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ فلم "نکاح" دیکھی۔ صاحب فلم کے ہیرو راج ببر کو ایڈیٹر کے روپ میں سلمی آغا سے عشق لڑاتے ہوئے دیکھا تو بس اسی دن سے ایڈیٹر بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ ہاں ایک بات ضرور بتادیں ہم جب بھی کوئی خواب دیکھتے ہیں تو اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں فلم نکاح دیکھنے کے بعد تو بس ذہن پر ہر وقت ایڈیٹر بننے کی دھن سوار تھی۔ ایک دن ہم مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی کے سیکریٹری جناب فضل تابش صاحب کے گھر بیٹھے ہوئے تھے جہاں بہت سی بڑی بڑی شخصیتیں بھی رونق افروز تھیں۔ وقار ناظمی، پروفیسر مختار شمیم، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر حیدر عباس رضوی وغیرہ موضوع تھا اردو کے ادبی رسائل فضل تابش صاحب نے کہا۔ یار! ہندوستان سے اس وقت انتساب نام کا رسالہ کوئی نہیں نکلتا اگر میں رسالہ نکالوں گا تو اسی نام سے نکالوں گا۔ بس یہ باتیں سن کر ہم وہاں سے فوراً کھسک لیئے اور خدا کا نام لیکر کچھ دوستوں اور کچھ ادھر ادھر سے قرض لے کر پہلی بار ۲۵ جون ۱۹۸۳ء کو سرونج سے ماہنامہ انتساب نکال لیا اور اس طرح ہم بھی ایڈیٹر بن گئے ہم ایڈیٹر کیا بنے کہ سارے شہر کے شعرا اور ادیب ہم سے ناراض ہوگئے جیسے ہم نے کوئی بہت گناہِ عظیم کرلیا ہو۔ کسی نے کہا یہ کوئی رسالہ ہے جس کا کوئی معیار ہی نہیں اور جن کا ہم نے کلام چھاپا تھا وہ کہہ رہے تھے اس سے بڑا معیاری پرچہ ہندوستان سے نہیں نکلتا۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ابھی ہم نے اس عذاب سے چھٹکارا بھی نہ پایا تھا کہ جن حضرات سے ہم نے قرض لیا تھا وہ نہ صرف رقم کا مطالبہ کرنے لگے بلکہ دھمکیاں بھی دینے لگے۔ بڑی مشکل سے ہم نے ادھر سے ادھر کرنے والا فن سیکھا اور کچھ نئے دوستوں سے قرض لیکر پرانے دوستوں کے حوالے کردیا اس فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ایک سال تک پرچہ نکال لیا۔ اور جدھر سے گزرتے لوگ ایڈیٹر صاحب ایڈیٹر صاحب کہہ کر پکارتے۔ لیکن افسوس کہ فلم نکاح کی طرح کسی سلمی آغا نے آج تک ہمیں ایڈیٹر صاحب کہہ کر نہیں پکارا۔ خیر جب رقم کا مطالبہ کرنے والوں کا زور زیادہ بڑھا تو ہم بہت پریشان ہوئے لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور تمام اہل ذوق حضرات اور دوستوں کو جمع کیا اور کہا بھائیو! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی رقم ضائع نہ ہو اس لیے اس بار ایسا دھانسو پرچہ نکالنا چاہتے ہیں کہ دنیا حیران رہ جائے اور آپکی

رقم بھی نکل آئے اس لیے آپ حضرات تھوڑا تعاون اور کریں تمام دوستوں نے تو ہماری رائے کا مذاق اڑایا لیکن دو شخصیتیں یہی تھیں جنھیں ہماری رائے پسند آئی اور ایک ہزار روپے عنایت کئے۔ ہم فوراً بھوپال روانہ ہوگئے اور کاتب صاحب سے گزارش کی کہ بھائی بڑی بار ہم پرچہ بڑا دھانسو نکالنا چاہتے ہیں اس لیے آپ جلد از جلد ہمارا کام ٹھیک طور پر کردیں۔ کاتب صاحب نے کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ٹھیک ہے آپ دو سو روپے پیشگی جمع کر دیجئے اور ایک ہفتہ بعد تشریف لائیے ہم نے سوچا اگر سرونج گئے اور پھر واپس آئے تو بلا وجہ سو دو سو روپے خرچ ہو جائیں گے اس لئے کیوں ایک ہفتہ بھوپال میں ہی رہیں یہ سوچ کر ایک ہفتہ کے لیے رک گئے جیسے ہی ہفتہ پورا ہوا کاتب صاحب کے پاس پہنچے تو حیران رہ گئے کاتب صاحب نے فرمایا ابھی آپ کا کام تو ابھی نہیں ہوا دراصل میری طبیعت خراب ہوگئی تھی کاتب صاحب کی طبیعت خراب تھی یہ تو ہمیں پتہ نہیں تھا لیکن یہ بات سن کر ہماری طبیعت ضرور خراب ہوگئی اور ایک [illegible] ملنے کا [illegible] کر ہم سرونج آگئے اب جیب میں صرف پانچ سو روپے بچے تھے۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر بھوپال پہنچے تو سب سے پہلے کاتب صاحب کے پاس گئے فرمایا آئیے آئیے آپ ہی کا کام شروع کرنے والا تھا شروع کرنے کا [illegible] سن کر ہمارے غصّہ کی انتہا نہ رہی لیکن ہم خاموش رہے ویسے بھی ہمارے غصّے سے دو سو روپے ڈوب جانے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اور ہم نے بڑے ادب سے کہا حضور آپکی مہربانی اور احسان ہوگا اگر آپ دو دن میں لکھ دیں۔ کاتب صاحب بڑی مشکل سے دو دن کا وعدہ لے کر آگئے اور تیسرے دن خدا خدا کر کے کاتب صاحب سے فارغ ہوکر بھاگے بھاگے پریس پہنچے تو پریس والے سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے ایک پرزہ خراب ہوگیا ہے اور درست ہونے میں کم از کم پندرہ دن لگ جائیں گے اب تو ہمارے ہوش ٹھکانے آگئے اور جو کچھ ہمت تھی وہ بھی ہار چکے تھے۔ ہم نے کتابت شدہ کاپیاں پریس والوں کو دیں لیکن ابھی بھوپال میں سات دن ہی گزرے تھے کہ گھر والوں کا تار پہنچ گیا فوراً گھر چلے آؤ یا [illegible] سے جاؤ بڑے احساس اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح ہم ناکام سرونج واپس آگئے ہمارا پرچہ اب بھی پریس [illegible] اگر ہم سے کوئی یہ پوچھتا ہے کہ میاں دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام کون سا ہے تو ہم بلا خوف کہدیتے ہیں [illegible] ادبی رسالہ نکالنا۔

تعریف کی بات [illegible] ہے کہ ہم نے خواب دیکھنا ابھی تک نہیں چھوڑا ہاں اتنی تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ پہلے خواب رات میں دیکھتے تھے [illegible] کرنے لگے ہیں!!

شانتی رنجن بھٹا چاریہ پر تحقیق

:— میں اردو کے نامور بنگالی ادیب شری شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیلئے کام کر رہا ہوں۔ اردو کے اہلِ قلم [illegible] سے گزارش ہے کہ ان کے پاس شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے ادبی خطوط یا موصوف کے سلسلے میں ایسی کوئی بات جس [illegible] شخصیت کے کسی گوشہ پر روشنی پڑتی ہو تو راقم الحروف کو آگاہ کریں۔ تمام مواد شکریہ کے ساتھ شامل مقالہ کیا جائے گا

(عبد الغفار محشر۔ ۳ سید صالح لین، کلکتہ ۳۰)

"ایک لا چار تو رسی"
صحیح راستے پر
آپ کا عزم صمیم کے ساتھ
اکیلے ہی گامزن رہنا
آپ کا حوصلہ اور آپ کی رہنمائی
محروم اور مایوس لوگوں کے لئے
آپ کی فکر مندی
ہندوستان اور ہندوستانیوں
کے لئے آپ کی محبت
ہر جگہ کے بنی نوع انسان کے لئے
آپ کی جدوجہد
اسے ہم آج اور ہر روز
یاد کرتے ہیں۔
ہم جانتے ہیں کہ آپ کو
یاد رکھنے کا صحیح طریقہ ہے
اپنے اتحاد کو قائم رکھنا
آپ کی شان کے شایان یادگار ہے
امن و آشتی بنائے رکھنا

موسیٰ کلیم برق آشیانوی

ہندوستانی مزاح نمبر کا

سوال نامہ اور جواب الجواب

ہندوستانی مزاح نمبر میں شامل پہلے سوال میں ہندوستان میں طنز و مزاح کی رفتار کو صرف رشید احمد صدیقی اور پطرس کے ناموں تک محدود کر دیا گیا حالانکہ یہ دونوں ہی "دور ساز" نہیں تھے۔ طنز و مزاح کے اصل "عہد ساز" تو شوکت تھانوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، تمکین کاظمی وغیرہ تھے۔ اس صف میں رشید احمد صدیقی اور "پطرس" بعد میں شامل ہوئے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس جیسے اعلیٰ "پایہ" کے مزاح نگار اب تک پیدا نہیں ہوئے۔ ہر تحریر اور تقریر میں یہ دو نام شامل کئے جاتے ہیں لیکن ان کے مضامین کے حوالوں کے ساتھ گفتگو نہیں کی جاتی پطرس کے ایک مضمون کا کہیں ذکر آبھی جاتا ہے تو وہ ہے "بائیسکل" بعد میں جس کا نام بدل کر "مرزا کی یادیں" رکھ دیا گیا۔ پطرس کا یہ پہلا مضمون تھا جو غالباً ۱۹۲۳ء کے آس پاس نیرنگ خیال میں شائع ہوا تھا۔

پطرس کے بارے میں پروفیسر محمد حسن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اتنے بڑے عالم اور مرد دانا صرف چند شوخ مضامین پر قناعت کر گئے۔ اتنا بڑا نام کمانے والے وہ تنہا اہلِ قلم ہیں۔ اُن کی شخصیت بڑی نہ ہوتی تو اتنے "تھوڑے سے کلام" پر اتنا بڑا "نام" نہ پاتے۔"

پطرس کی مختصر سی کتاب پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب میں جملہ گیارہ مضامین ہیں بقول کسے اِن میں سے بھی تین ترجمے ہیں۔ صرف آٹھ مضامین بلا شرکت غیرے مصنف کے ہیں۔ پطرس نے اپنی کتاب میں کسی مضمون کے ساتھ یہ نہ لکھا کہ فلاں مضمون کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے۔ تاہم دو مضامین پر ترجموں کا گمان ہوتا ہے جس کا یقین کے درجے تک پہنچنا بھی بعید از قیاس نہیں۔ یہ دو مضامین ہیں۔

۱. انجام بخیر ۲. میبل اور میں

انجام بخیر ایک "ڈرامہ" معلوم ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک تقریباً سنجیدہ ہے اور انجام "حزنیہ" ہے ۔۔۔

دوسرا مضمون "میبل اور میں" بھی غالباً ترجمہ ہی ہے۔ اس مضمون میں کہیں کہیں کچھ شگفتہ جملے ملتے ہیں لیکن پورا مضمون کسی مزاحیہ مضمون کی تعریف میں نہیں آتا۔ اور جب ترجمہ ہی ہے تو اس کی داد کے مستحق پطرس نہیں بلکہ دیگر زبان کا مصنف ہے۔

ایک اور مضمون "گونگی جورو" جو پطرس کی زیر نظر کتاب میں شامل نہیں ہے لیکن ماہ نامہ "ہیچ پنچ" علی گڈھ بابتہ ماہ جون ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ہے جس کو اناطول فرانس نے مشہور فرانسیسی مصنف "رابیلے" سے اخذ کیا ہے۔ مگر اردو ترجمہ میں "گونگی جورو" ایک بھونڈا سا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

"مضامین پطرس" کے باقی "مضامین"، ان سے دو تو ہاسٹل کے موضوع پر ہی لکھے گئے ہیں ایک "ہاسٹل میں پڑھنا" دوسرا "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" یہ دو مضامین بالکل عامیانہ انداز کے ہیں۔ "کتے" پطرس کا ایسا مضمون ہے جس میں کتوں کے نفسیاتی مطالعہ کا فقدان اور مشاہدے کی کمی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ کتوں کے تعلق سے مرزا عظیم بیگ چغتائی کے "ملفوظات حاجی" میں جو گہرا نفسیاتی مطالعہ اور عمیق مشاہدہ نظر آتا ہے اس کو مارک ٹوین کے (GO TO ANTS) کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے جو مارک ٹوین نے چیونٹیوں کی نفسیات اور ان کی حرکات کا عمیق مشاہدہ کر کے لکھا ہے۔ چغتائی کے ملفوظات حاجی کے مقابلے میں پطرس کا مضمون "کتے" کوئی مقام نہیں پاتا۔ علاوہ ازیں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "مولوی صاحب کی ڈائری کے چند اوراق" میں کتوں پر جو مضمون ملتا ہے وہ ندرتِ خیال، زبان کی شگفتگی، کرداروں کے دلچسپ نام اور انداز بیان کی دلکشی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ جس کے مقابلے میں پطرس کا مضمون "کتے" ایک معمولی درجہ کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں "خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں" (یعنی کتے نیک افراد نہیں ہوتے) پھر لکھتے ہیں "آپ نے "خدا ترس" کتا بھی دیکھا ہوگا" ان دو جملوں میں جو تضاد ہے وہ غور طلب ہے یہ بھی لکھتے ہیں کہ "کم بخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی" بھونکتے "ہیں اور موٹر کار کے سامنے آجاتے ہیں"۔ حالاں کہ دو تین روز کی عمر میں کتے کے پلّے بھونکنا تو کجا چلنے اور آواز نکالنے کے قابل بھی نہیں ہوتے چہ جائیکہ پطرس کی کار کے سامنے آجائیں۔

دیگر مضامین "میں ایک میاں ہوں" "مرید پور کا پیر" "سینما کا عشق" اور لاہور کا جغرافیہ اتنے عامیانہ مضامین ہیں کہ نئے لکھنے والوں کے ایسے مضامین تو ماہ نامہ شگوفہ میں آئے دن چھپتے ہیں۔

مضمون "اردو کی آخری کتاب" لکھنے کا وہ زمانہ نہیں تھا جب کہ اردو زبان کے ساری دنیا میں چرچے تھے۔ اردو کی ترقی کے ایسے دور میں جب کہ اردو زبان اپنے عروج پر تھی "اردو کی آخری کتاب" کا تصور ایک بے وقت کی راگنی تھی۔ اس کے مقابلے میں ابن انشا نے جس دور میں "اردو کی آخری کتاب" لکھی وہ بروقت صحیح نبض پر ہاتھ رکھنے کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلے میں مرزا ادیب ایبٹ آبادی نے "اردو کی پہلی کتاب" لکھی جو اسماعیل میرٹھی کی درسی کتاب کی اچھی پیروڈی ہے وہ اس دور کے اعتبار سے صحیح وقت پر لکھی گئی تھی۔ جس کا ایک مضمون "پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں"۔ اس دور کے سیاسی حالات بالخصوص فرقہ وارانہ تنازعات کی ابتداء پر طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ پطرس اپنا مضمون "کھانا خود بخود پک رہا ہے" اس جملے سے شروع کرتے ہیں۔ "دیکھنا بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے"۔ عنوان اور پہلے ہی جملے میں جو تضاد ہے وہ غور طلب ہے۔ ایک مضمون ہے "دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے"۔

پطرس کے بارے میں اتنی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی کہ اکثر تقریروں اور تحریروں میں پطرس کو "آسمانی مخلوق" بتایا جاتا ہے اور ان کے ہم عصروں کو ان کے مقابل "حشرات الارض" میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ

پطرس کے بارے میں رشید احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں: "پطرس صاحب اچھی اردو اب بھی لکھتے ہیں۔ اور یقین ہے کہ "سر" بننے یا "جیل جانے" کے بعد وہ "صحیح اردو" بھی لکھنے لگیں گے۔ (طنزیات و مضحکات)۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی شگفتہ اور معیاری زبان کا مقابلہ پطرس نہیں کر پاتے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا شاہکار ان کا مضمون "الشذری" ہے۔ "پھر ٹیلیفون دیکھا جائے گا" وغیرہ ایسے شگفتہ مضامین ہیں کہ پطرس کے پاس اس کے مقابلے کا کوئی مضمون نہیں ملتا۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں بھی دبی زبان سے کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ رشید صاحب زیادہ تر علی گڑھ کالج کے محور پر گھومتے رہے اور اکثر "کالج کے لڑکے" (لونڈے) اُن کی تحریروں کا ہدف بنے رہے۔ اُن کے مضمون "یکہ" پر عظیم بیگ چغتائی کا مضمون "یکہ" طنز و مزاح کے اعتبار سے سبقت لے جاتا ہے۔ "ادھر کا کھیت" ایک سپاٹ مضمون ہے جس میں کہیں ایک آدھ جملہ مزاح کی تعریف میں آجاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا کارنامہ "طنز و مزاح" پر ان کی تنقیدی کتاب "طنزیات و مضحکات" ہے۔ مجھے اس بات سے اختلاف ہے کہ اُن کے بعد پھر اُن کے درجے کا کوئی مضمون نگار پیدا نہیں ہوا۔

یہاں ملّا رموزی کی "گلابی اردو" کا ذکر ضروری ہے جس کا انداز اور جملوں کی ساخت ایسی اختراع ہے جو اُن پر شروع ہوئی اور اُن پر ہی ختم ہو گئی۔ اگر بعد میں کوئی وہ انداز اختیار کرتا تو سوائے بھونڈی نقالی کے اور کچھ نہ ہوتا اسی لیے کسی اور نے ایسی جرأت بھی نہیں کی۔ آزادی کے بعد اردو کشمکش سے دوچار ہے۔ بقول موسیٰ کلیم۔

خبر نہیں ہے کہ انجام کشمکش کیا ہے
مٹا رہا ہے فلک اور ابھر رہا ہوں میں

اردو کے اس موقف کا اثر ادب پر بھی پڑا۔ ان حالات کے باوجود رشید احمد صدیقی، پطرس اور اُن سے بہتر اُن کے مابعد دور میں اردو میں طنز و مزاح منزل بہ منزل ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ ماہنامہ "شگوفہ" نے کئی نئے لکھنے والوں کو روشناس کرایا ہے۔

میری رائے میں ہندوستان میں طنز و مزاح "رو بہ کمال" ہے۔ مصطفٰے کمال کا "شگوفہ" اس دعوے کی بہترین مثال ہے کہ "کمال" طنز و مزاح کو رو بہ کمال رکھنے میں پچیس سال سے اپنی پوری توانیاں صرف کرتے ہوئے خود بھی رو بہ کمال ہیں۔ "عالمی جشن مزاح" کی مثال اردو دنیا نے نہ ماضی میں پیش کی ہے اور نہ مستقبل میں کسی سے توقع ہے حتیٰ کہ "ہندوستانی طنز و مزاح نمبر" جیسا کوئی شمارہ کبھی ماہنامے نے آج تک نہیں نکالا۔

بہرحال مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی اور پطرس وغیرہ کے بعد بھارت چند کھنہ، وجاہت علی سندیلوی، کنہیا لال کپور، غلام احمد فرقت کاکوروی، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے طنز و مزاح کی آبرو کو برقرار رکھتے ہوئے اس فن کو رو بہ کمال رکھا ہے بلکہ تونسوی نے کالم نویس کی حیثیت سے بھی اور مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اردو میں طنز و مزاح کو مالا مال کر دیا اور کر رہے ہیں۔

شفیقہ فرحت نے بھوپال سے طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصے میں ایک باکمال طنز و مزاح نگار تسلیم کر لی گئیں۔ نریندر لوتھر کا اپنا انداز ہے جو مغربی کلاسک کے وسیع مطالعہ کا غماز ہے۔ چونکہ ابھی سرکاری اعلیٰ خدمت پر فائز ہیں اس لیے بقول کسے اُن کا مزاح معصوم یعنی (INNOCENT HUMOUR) ہے۔ اور جب یہ زنجیریں

کٹ جائیں گی اور میری طرح (PENSIONER) ہو جائیں گے تو اُن کا مزاح (SINFUL HUMOUR) ہو جائے گا اور وہ پوری طرح کھل کر اُن موضوعات پر بھی قلم اُٹھائیں گے جن کو وہ ابھی شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔

بھارت چند کھنہؔ صاحب برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اکثر معصوم یعنی (INNOCENT HUMOUR) لکھا ہے البتہ پائنچے اٹھا کر احتیاط کے ساتھ (SINFUL HUMOUR) کے میدان میں بھی اکثر قدم رکھتے ہیں۔

موجودہ دور کے اچھے لکھنے والوں میں مسیح انجمؔ، پرویز یداللہ مہدی، رشید الدین، بانو سرتاج، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور ڈاکٹر عابد معز وغیرہ طنز و مزاح کی آبرو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں مسیح انجمؔ، پرویز یداللہ مہدی، رشید الدین سینیر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ مختصر یہ کہ مکمل دلائل کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں طنز و مزاح روبہ کمال ہے۔

جہاں تک پاکستان کے مزاح نگاروں کا تعلق ہے میں اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر یہ مان لیتا ہوں کہ پاکستان میں اس دور کے سب سے اعلیٰ درجے کے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں لیکن اس رائے کے اظہار میں کوئی تکلف سے کام نہیں لیتا کہ ایک تو یہ وہ اکثر دقیق الفاظ طویل جملے اور غیر معروف تلمیحات استعمال کرتے ہیں دوسرے ایک سے لو تک ہندسوں کو اور انگریزی و اردو کے حروفِ تہجی کو (A) سے لے کر (Z) تک اور (الف) سے لے کر یائے معروف و مجہول تک تشبیہات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خصوصاً عورت کے "حلیے" کو ناگوار حد تک بگاڑ دیتے ہیں جس پر مرد تو ہنس دیتے ہیں لیکن عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ "ہائے اللہ تو نے ہمیں ایسا کیوں بنایا کہ مشتاق صاحب ہمیں آنسو رلا رہے ہیں۔ قدرت کی جانب سے انسانی مخلوق میں پائے جانے والے عیوب کا کثرت سے مذاق اڑانا مزاح نہیں دل آزاری کی تعریف میں آ جاتا ہے۔

لکھتے ہیں کہ "گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے"۔ گھوڑے کی لات کو عورت کی ذات سے تشبیہ دینا دل آزاری کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی تحریروں کے دقیق ہونے کا "مضمون" بارے آلو کا..." میں خود ہی ایک جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ "فلسفہ اور اشعار کی بھرمار سے وعظ اور درس پر ہمیں اپنی نثر کا گمان ہونے لگا۔" اسی مضمون میں بات آلو کی تھی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد پر پورے ایک پیراگراف میں نہایت توہین آمیز جملے لکھے ہیں۔ مثلاً "ابوالکلام آخری اہلِ قلم تھا جس نے اردو کو عربی رسم الخط میں لکھا "کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے"۔ "لاحول ولا قوۃ۔ اس بزرگ کی تمام کردہ و ناکردہ خطائیں ہمیں صرف اس لیے معاف کر دینی چاہئیں کہ ہماری طرح وہ بھی چائے کے رسیا تھے۔" مولانا ابوالکلام سے کوئی شخصی بغض و عناد ہو تو وہ ذاتی مسئلہ ہو سکتا ہے جس کا "آلو" کے مضمون میں اُن کی توہین کرنا درست نہیں۔ وہ ایک مسلمہ مفسر القرآن تھے۔ اور بھی کئی شخصیتوں کا جا و بے جا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ بات آدابِ طنز و مزاح کے مغایر ہے۔ مثلاً مولانا وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق کو بھی نہیں بخشا گیا۔

بات کہیں کی بھی ہو یوسفی صاحب گھوم پھر کر تقریباً ہر مضمون میں "کراچی" یا "لاہور" ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ یہی بات ابن انشا کی کتاب "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" میں بھی پائی جاتی ہے۔

ان حقائق کے باوجود مشتاق احمد یوسفی صاحب اس دور میں ہند و پاک کے سب سے اعلیٰ اور لاثانی مزاح نگار ہیں۔ پھر بھی اگر رشید احمد صدیقی زندہ ہوتے تو "صحیح اردو" کے بارے میں نہ معلوم کیا فرماتے۔

کرنل محمد خاں صاحب نے اپنی "سوانح ملازمت" کو طنز و مزاح کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھال لیا ہے۔ لیکن ہے ایک ہی موضوع۔ ان کی تحریروں میں ابہام نظر نہیں آتا۔ بہت صاف اور واضح طرز بیان ہے۔ دیگر مضامین بھی بہت جاندار ہیں اور اُن کے دورِ حاضر کے ایک اچھے مزاح نگار ہونے کی دلیل ہے۔

پاکستان میں اردو سرکاری زبان ہے۔ اس طرح حکومت اور عوام کا تعاون زبان کے فروغ میں اور طنز و مزاح میں ممد و معاون ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں اردو زبان اپنی زندگی اور موت سے برسرِ پیکار ہے۔ پاکستان میں اگر نئے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ البتہ ہندوستان میں مزاح نگاروں کا پیدا ہونا حیرت انگیز ضرور ہے۔ اب ایک اہم سوال یہ ہے کہ آیا مزاح نگاری اور انشائیہ نگاری میں کیا تعلق ہے؟ میرا خیال ہے کہ انشائیہ نگاری کو سنجیدہ ادب میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور مزاح نگاری میں بھی۔ سنجیدہ ادب میں انشائیہ کی بہترین مثال سرسید احمد خاں کا مضمون " بحث و تکرار" ہے۔ اور بھی کئی موضوعات پر سنجیدگی سے لکھا گیا ہے جو انشائیہ نگاری کی تعریف میں آتے ہیں۔ جیسے "وقت سرمایہ ہے" "وطن کی خدمت" "بزرگوں کا ادب" "بہادری" "تعلیم کی اہمیت" "سچائی" فرمانبرداری وغیرہ۔ لیکن ایک مزاح نگار ان ہی موضوعات پر مزاحیہ انداز میں لکھتا ہے تو وہ مزاحیہ انشاء نگاری بن جاتی ہے۔ انشائیہ نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قصہ گوئی کا انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں زیادہ تر آفاقیت ہوتی ہے مطلب یہ کہ وہ کسی ملک یا خطہ تک محصور ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اس نوعیت کے کئی مضامین ملتے ہیں۔ مثلاً "رونا" "سونا" "جھگڑا" "بھولنا" "بیمار اور تیمارداری" "مانگنا" وغیرہ۔ یہ تمام مزاحیہ مضامین ہیں لیکن انشائیہ نگاری کی تعریف میں بھی آتے ہیں۔! انشائیہ نگاری میں مزاح کو سلیقے سے برتا جائے تو وہ اعلیٰ درجے کی مزاح نگاری ہوگی چنانچہ مشتاق احمد یوسفی نے انشائیہ نگاری میں مزاح کو نہایت ہی سلیقے سے برتا ہے اس لیے وہ ہند و پاک کے صفِ اول کے مزاح نگار بن گئے۔ اور طنز و مزاح کے معیار کے سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ طنز و مزاح کو دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک صنف کا درجہ ملنا چاہیئے۔ اور اگر آپ مصر ہیں کہ "اردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کو معیار کے حساب سے کس نمبر پر رکھیں گے؟" تو میں اس کو نمبر ا (ایک) پر رکھوں گا کیوں کہ یہ اتنی مشکل ترین صنفِ ادب ہے کہ اس میں قدم رکھ کر کامیاب ہو جانا ہی بڑی بات ہے:

ایک خاص بات مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تخلیقی فن کاروں میں سے کسی نے یہ نازیبا بات کہہ دی کہ " بگڑا ہوا ادیب نقاد بن جاتا ہے" ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کہہ دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ کئی اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں جنھیں "بگڑے ہوئے ادیب" کہنا گستاخی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ چند اعلیٰ درجے کے نقاد تخلیقی فن میں دخل نہیں رکھتے لیکن ان کے بلند پایہ نقاد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ البتہ نقاد تخلیقی فن میں دخل رکھتے ہوں تو اُن کا درجہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے جس کی ایک مثال جناب وحید اختر ہیں!

وے کے خط .. (مراسلے)

برادرِ معظم کمال صاحب!

آپ کا موقر اور اپنی طرز کا ایک ہی منفرد ماہنامہ "شگوفہ" باقاعدہ مل رہا ہے جس کے لیے بہت ہی شکرگزار ہوں۔ تازہ ترین شمارہ بابت اکتوبر ۸۵ء چند روز پیشتر موصول ہوا۔ اس امر کے لیے مکرر شکریہ قبول فرمائیے!

"شگوفہ" کے ہر شمارہ میں آپ بلند پایہ مزاحیہ تخلیقات نثری و شعری جمع کر کے شائع کرتے رہیں۔ جو آپ کی دقتِ نظر اور حسنِ اخلاق و پاکیزہ ذوقِ ادب کا کمال ہے۔ اردو طنزیہ و مزاحیہ ادب کی بے لوث خدمت کے سلسلے میں آپ کی یہ مساعیٔ جمیلہ قابلِ داد تو ہیں ہی لائقِ رشک بھی ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ کے قلم کو مزید توانائی اور جذبۂ خدمتِ ادب کو استحکام و دوام حاصل ہو تاکہ آپ اس کارِ نیک میں ہمیشہ مشغول و منہمک رہیں۔

محترمی یوسف ناظم صاحب اور دیگر احباب کی خدمت میں آداب معروض کر دیجئے!

بہ صد خلوص و احترام سراپا نیاز

راز سنتوکھسری

(چندی گڑھ)

جناب مصطفیٰ کمال! تسلیم

شگوفہ سے دو مشہور ہستیوں کے انتقال کی خبر ملی جناب شاذ تمکنت جنکی کمی اردو ادب ہمیشہ محسوس کرتا رہے گا۔ خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے اور اُن کے عزیزوں کو برداشت کی قوت عطا کرے۔ شاذ۔ شاذ ہی تھے۔

دوسری شخصیت ناظم انصاری ہیں جو میرے اچھے دوست بھی تھے۔ اُن کے ساتھ ان گنت مشاعروں میں ساتھ رہا بلکہ اکثر ہم لوگ ایک ساتھ ٹھہرتے تھے۔ مرحوم نماز کے بھی پابند تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور اُن کے اہل و عیال کو صبر جمیل عطا کرے۔ طالب خوندمیری کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اُن دونوں شخصیتوں کے خاکوں کو "شگوفہ" کے اوراق پر زینت بخشی۔

کمتر مقرب حسین (رتلام)

محترمی سید مصطفیٰ کمال صاحب! تسلیمات۔

اکتوبر ۸۵ء کے شمارے میں رؤف خوشتر۔ جہانگیر انس سلیم آغا قزلباش کی نثری تخلیقات مزہ دے گئیں مناظر عاشق صاحب اور محترمہ عابدہ محبوب کے نمک پارے بھی لذیذ لگے۔

عطاء الحق قاسمی صاحب کو ہیومر او لمپکس میں کھیلنے دیجئے۔ لگتا ہے وہ ناٹ آؤٹ ہی رہیں گے!

(ڈاکٹر) شیخ رحمن اکولوی

ستمبر کا شمارہ "زماں بُک ایجنسی" سے دستیاب ہوا۔ اداریہ اور جناب مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون "شاذ کی یادیں" معلوماتی اور دل کو چھوتے ہیں۔ ناظم انصاری مرحوم پر مضمون اور انتخاب کلام بھی ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں

ایک سفر ہیومر او لمپکس کے لیے بہت خوب ہے اُمید ہے ادارہ شگوفہ اس کو آگے چل کر کتابی شکل ضرور دے گا۔ شعری حصّہ بھی کافی پسند آیا۔

بزمی، رانچی

حضرت شاذ تمکنت کی بے وقت جُدائی سے دُنیائے اَدب میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں، اور اب حضرت ناظم انصاری صاحب نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔ طنز و مزاح کی دُنیا کو ضیا بخشنے والوں کی ویسے ہی کمی ہے ان کی تعداد کو انگلیوں پر گِنا جا سکتا ہے ایسے میں ناظم انصاری کا انتقال طنز و مزاح کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے ان کی کمی ہر وقت کھٹکتی رہے گی۔

مغموم

اَن پڑھ بھونگیری

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ...

▫ اس مہینے دکنی کے ممتاز شاعر سرور ڈنڈا مرحوم کی برسی کے موقع پر ڈنڈا میموریل سوسائٹی کی جانب سے حیدرآباد میں یادگار تقاریب کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ ان تقاریب میں پاکستان سے جناب خواجہ حمیدالدین شاہد اور دکنی شاعر اعجاز حسین کھٹا کی شرکت متوقع ہے۔ شاہد صاحب ایک عرصہ کے بعد حیدرآباد تشریف لارہے ہیں۔ دکنی زبان، دکنی تہذیب اور بحیثیت مجموعی دکن دیس موصوف کو "جو تیج پیارا لگے" ہے۔ اس والہانہ عشق کا نتیجہ ہے کہ شاہد صاحب نے کراچی میں حیدرآباد کی طرح "ایوانِ اردو" تعمیر کیا، لائبریری قائم کی جس میں خاص طور سے حیدرآباد سے متعلق لٹریچر یکجا کیا گیا، نیز بڑی پابندی کے ساتھ ایک ماہنامہ "سب رس" شائع کررہے ہیں۔ خرابیٔ صحت کے باوجود موصوف کا طویل مسافت طے کرکے حیدرآباد آنا خود اس بات کا "شاہد" ہے کہ حیدرآباد کے سفر اور اہلِ حیدرآباد سے ملاقات کے لئے وہ کتنے بے چین ہیں۔ ہم حمیدالدین شاہد صاحب کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے قیام سے حیدرآباد کی علمی و ادبی محفلوں میں رونق رہے گی۔

سرور ڈنڈا یادگار تقاریب میں جناب اعجاز حسین کھٹا بھی شرکت کررہے ہیں۔ کھٹا نے آزادی سے قبل نذیر دہقانی اور علی صائب میاں کے ساتھ بھولی بسری دکنی بولی کا احیاء کیا اور عصری دکنی لب و لہجہ کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ آزادی کے بعد سرور ڈنڈا نے اسی روایت کو سینہ سے لگا کر بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ ڈنڈا عوامی مسائل کو ان ہی کی زبان میں پیش کرتے تھے سنانے کا انداز بھی منفرد تھا جس کا نتیجہ یہہ نکلا کہ جس مشاعرہ میں ڈنڈا کلام سناتے سامعین کسی اور کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ "سنجیدہ شعراء" کے ایک طبقہ نے اس صورت حال سے بیزار ہوکر یہہ شرط لگادی تھی کہ ڈنڈا کو مشاعروں میں مدعو نہ کیا جائے لیکن یہ شرط چلنے والی نہیں تھی۔ پھر اس قدر ترمیم کرلی گئی کہ ڈنڈا آخر میں کلام سنایا کریں۔ ڈنڈا کی شاعری "بن بریک" شاعری تھی، "نو فل سٹاپ نہ کاما"۔ دکنی سے ناواقف حضرات کے لئے تو یہ چیستاں سے کم نہ تھی۔ لیکن ان کے ہاں دکنی کے استعمال میں ایک توازن، لہجے میں ٹھہراؤ طنز اور موضوعات میں تنوع تھا۔ مصلحتوں سے بالاتر ہوکر انھوں نے سریلی، البیلی، چٹکیلی و نکیلی، شاعری کے ذریعہ عوام کا دل جیت لیا۔ ڈنڈا کے بعد سلیمان خطیب نے دکنی شاعری کو نئے مزاج سے روشناس کرایا۔ دکنی میں شاعری کے اس سلسلے کو گلی نلگنڈوی، حمایت اللہ اور اشرف خوندمیری نے جاری رکھا۔ زیر نظر شمارہ میں ڈنڈا کے کلام کا انتخاب شریک کرکے ہم یادگار تقاریب کے موقع پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

* ایک خوش پوش جوڑا جا رہا تھا۔ غلطی سے ایک آدمی کا پاؤں خاتون کے غرارے پر جا پڑا۔ وہ عورت ایک دم گھومی اور دھاڑی۔ بے وقوف، گدھے کیا اندھے ہو؟ پھر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی اور بولی۔ معاف کیجئے میں سمجھی تھی میرے خاوند کا پاؤں میرے غرارے پر پڑا ہے......

* ماہر نفسیات سے ایک صاحب نے عرض کیا "سب سے بڑی مصیبت میرے خواب ہیں ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھتا ہوں، لڑکیوں کا اسکول۔ لڑکیاں ادھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی ہیں کچھ کھیلنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور کچھ کینٹین پر جا کر کھانے پینے میں۔ پھر اچانک اسکول کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

ماہر نفسیات نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم چاہتے ہو کہ میں اپنے علاج سے تمہیں یہ خواب دیکھنے سے روک دوں"۔ —— "جی نہیں" جواب دیا گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ اسکول کی گھنٹی بجنا بند کردیں۔" ——

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	صنف	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپیے
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	"	مضامین	۷ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
تکلف برطرف	"	"	۱۴ "
قطع کلام	"	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سُنی سُنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
گوئیم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبارۂ حاضر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چتا پچھ	مسیح انجم	"	۱۲ "
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲ "

ہوا جب گلاں سے کری تجّے چاٹیاں
جلے دیکھ کو سارے کانٹیاں بھراٹیاں

منجے کاٹنے کو منجے گھسانے کو
اتوں بھیج رئیں پھر سے چھٹیاں چاٹیاں

مرے گھر کے کچھن بگڑ تیچ جا رئیں
بغاوت لوٹی گئیں تو اسے لو اسیاں

یہ ہوندی حکومت کے ہونے سے کرم سے
نہ دالچ و تت پو نہ خشکہ چپاتیاں

مرے دوستاں کے خیالاں میں اب تو
اُچک رئیں ٹھیدک رئیں ہتوڑے درانتیاں

مرے غم میں اتوں صبوں شام اب تو
پتھراں پیٹ رئیں ہور کھا رئیں گلاشیاں

رفتارِ زمانہ نے کیا کیا نہ بنا ڈالا
مجبور کو جینے کے سو رنگ سکھا ڈالا

نیلان کے برقعے میں آئے تھے چمن میں وہ
پردہ بھی کیا گل سے پردہ بھی اٹھا ڈالا

فیشن کے بازوں میں جب آیا وہ صنم اپنا
سرتاپا حسیں دیکھنے زلفوں کو کٹا ڈالا

پہلی ہی ملاقاتیں کچھ ایسی گراں گزریں
شاپنگ کے دھندوں نے سر پر اگھا ڈالا

صحرا سے لیلیٰ مجنوں سڑکوں پہ چلے آئے
معیارِ محبت کو فلموں نے گھٹا ڈالا

محفل میں ان کے بازو بیٹھے تھے ہم اکڑ کر
دزدیدہ اک نظر نے دل اپنا بٹھا ڈالا

سیمنٹ کی سڑک پو پیلاں کا لے دوست چلانا مشکل ہے
ہور جیب سے ملی ہے آزادی اس کا نبھانا مشکل ہے

دھرتی پو رہنا مشکل ہے ہور اس میں سمانا مشکل ہے
دنیا میں رہ کو دنیا سے اب انگ چھڑانا مشکل ہے

ایمان کے باتاں ڈل ڈل کو بہروں کو سنانا مشکل ہے
الّا پنڈت ہور ملّاؤں کو انسان بنانا مشکل ہے

پولس کے ہندستاناں شرفا پو قیامت ڈھاتے ہیں
موٹر تو مزے سے چلتی ہے سیکل کا چلانا مشکل ہے

کیا للہ سے پرش جس کو ملتے اک بار اتوں آ لوٹے تھے
دنیا کو تو ہم بھول جا ئینگے پن تیرا بھلانا مشکل ہے

جب دل میں آیا دنیا میں کچھ نام کمانا — ہم سیکھ لیئیں آنکھوں سے کاجل کا چرانا
بھاگاں میں ان کے لکھا ہے ملی وشیجر — بھاگاں میں اپنے لکھا ہے بس بھیجا پرانا
جو رستے پو پہنچے جو سیاست کے تو بولے — ہندا ہوں مائی باپ مجھے رستہ بتانا
تعریف سیاست کی بس اتنی ہے یارو — جس کو بھی ملیا موقع اسے ڈھول جمانا
کیا ہم پو گزر گئی ارے باشا نکو پوچھو — پاپڑ کے تاؤ بیل دیا ہم کو زمانہ

جو اچھی بری جانتے نئیں چپکے اکثر تیئں
ایسوں کو فقط شام صبوں ڈھنڈا بجانا

انوں ہوندی صورت پو چھپگے جما کو — مرا دل مسل رئیں مٹکتے مٹکتے
جو بھی تم کو چاہا گیا گھاٹ لو اُن — مری جاں! بچیوں میں سٹکتے سٹکتے
نہ مرنے میں شامل نہ جینے میں شامل — کئی سال گزرئیں لٹکتے لٹکتے
مرے غم میں صندل چراغاں کرائیں — لگیوں جب ٹھکانے بھٹکتے بھٹکتے
انوں اماّ بھیسوں کے باڑوں میں آ کو — مری جان لے رئیں کھٹکتے کھٹکتے

یوں اچ عمر کٹ گئی ناڈھنڈے حضت کی
زمانے سما گردا جھٹکے جھٹکے

ایم سستو ناؤ، گتو

(کیا دیکھتا ہے، مار د)

بھاگاں ہمارے رُس گیئں — چوراں بھی گھر میں گھس گیئں
کیوں جی گیئں نکھٹو — ایم سستو ناؤ، گتو!
گاڑی چلانے ہارے — اب صبوں ہو گئی نا رے
اڑیل ہے تیرا ٹٹو — ایم سستو ناؤ، گتو!
یہ اُجلی ٹوپی ہارے — ستا ہی جھاڑو تارے
سب امریکا کے پٹھو — ایم سستو ناؤ، گتو!
غلّے سما بھاؤ تمتو — کیا پیاز، اِملی، لہسن!
ہے بنیا بچہ جمٹو — ایم سستو ناؤ، گتو!
رستے پو ان کو لانے — ہور لیڈراں بھی ملانے
ڈنڈے کو پکڑ گھٹو — ایم سستو ناؤ، گتو!

کتنا سُندر شُندر نام ۔۔۔ جتنا بھلے باغِ عام ۔۔۔ دو دلوں کا ہے مقام

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے اسٹیشن نام پلّی ۔۔۔ یاں کا گھرا گھرا کولی ۔۔۔ عمل کھیلے آنکھ مچولی

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، بھیّا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے شکّر کا سرمایہ ۔۔۔ پھر یہ گاندھی بھون کہلایا ۔۔۔ اس پو نیتاؤں کا سایہ

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، بھیّا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے معلوماتِ عامہ ۔۔۔ یاں کا عملہ ہے ہنگامہ ۔۔۔ کھیلے آپس میں ڈراما، جتنا لمبے لاما

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے نمائش میدان ۔۔۔ لپّا ڈپّی کا استھان ۔۔۔ بیچ کے چنا بھائی جان

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، بھیّا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے مارکٹ معظم جاہی ۔۔۔ اس کی گھڑی ہے ملنے شاہی ۔۔۔ اس پو ہر دم غشی ہے چھائی

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، لالہ ہو جانا فٹ پاتھ پر

عثمان گنج کی سرحد آئی ۔۔۔ اللہ صاحب کی دہائی ۔۔۔ یاں ہے ساہوکار شاہی

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، باشا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ عثمانیہ دواخانہ ۔۔۔ اچھا خاصا پاگل خانہ ۔۔۔ یاں کا عملہ ہے مستانہ

لالہ ہو جانا فٹ پاتھ پر، راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ آصفیہ کتب خانہ ۔۔۔ علم و فن کا ہے خزانہ ۔۔۔ فیض اٹھائے ہے زمانہ

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، باشا ہو جانا فٹ پاتھ پر

سُنیوں بڑوں کی نشانی ۔۔۔ موسیٰ ندی ہے دیوانی ۔۔۔ مَرکی نالوں کی ہے نانی

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے دفترِ انصاف ۔۔۔ یاں کی ترازو ہوگئی صاف ۔۔۔ مل گئی ملزموں کی ناف

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، لالہ ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے میونسپل دفتر ۔۔۔ یاں کے افسر ہیں اندر ۔۔۔ رشوت کھاتے ہیں خشک و تر

باشا ہو جانا فٹ پاتھ پر، بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر

آئی پرانی حویلی ۔۔۔ سر سے پاؤں تک دنگیلی ۔۔۔ بوجھے ماضی کی پہیلی

راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر، باشا ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ ہے دفترِ پولیس ۔۔۔ یاں کے قانوناں بے حس ۔۔۔ یاں کے دھندے چار سو بیس

بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر، لالہ ہو جانا فٹ پاتھ پر

شاہ پور دہلی سے پہاڑی ۔۔۔ میری چل ہے گھوڑا گاڑی ۔۔۔ بالو ہو جانا فٹ پاتھ پر

Postal Regd. No. H/HD
SHUGOOFA Hyderabad-1
ol. 1L Copy 11
November 1985 Phone : 55771

23 DEC 1985
DECEMBER 1985
Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ ؛ منظور احمد ؛ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ ؛ نریندر لوتھر
یوسف ناظم ؛ مجتبیٰ حسین

جنرل منیجر
مسیح جلیل

منیجر اعزازی
(بمبئی) ۔ نیاز حسن فیضی

جلد [۱۸] ★ ڈسمبر ۱۹۸۵ء ★ شمارہ [۱۲]

سالانہ ۴۰ روپے
بیرونِ ہند سے ۱۲۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ
شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ط

فی شمارہ
۴ روپے

کتابت : محمد عبدالرؤف
طباعت : وشنو پریس چھتہ بازار برائے نیشنل پریس

فون آفس : ۵۵،۷،۱۲ فون نمائش : ۵۲۱۶۴

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

لا دمہ بیرانِ مجبی ــــ بانو سرتاج ــــ ۷
دھوتی کی تعریف میں ــــ علی حماد عباسی ــــ ۱۱
بہت پچھتائے شادی کر کے ــــ فرید سحر ــــ ۱۵
نکھ سے نکھار تک ــــ سلطان جمہوری ــــ ۲۱
جب میں خدا سے ملوں گی ــــ نور العین علی ــــ ۳۳
برنارڈ شاہ ــــ ممتاز مہدی ــــ ۳۷

دخل در نا معقولات (فیچر و ڈرامہ)

تخلص بھوپالی ــــ ڈاکٹر سید حامد حسین ــــ ۲۷
بُرقعہ ــــ اظہر افسر ــــ ۴۱

مرا شہر لوگاں... (شہر حیدرآباد)

فٹ پاتھ ــــ ڈاکٹر عابد معز ــــ ۴۵

رمنی مزاح

دھجیاں ــــ عابدہ محجوب ــــ ۵۷

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

دستر خوان ــــ ڈاکٹر وزیر آغا ــــ ۴۹

(حسبِ حکم منظومات)

سید جلیل ۱۴ — بجلی گھو لسلوی ۱۴
قمر الزماں ۲۰ — سراج نرملی ۲۰
ضیا الرحمٰن ۲۵ — برقی ۲۵
صابر بہاری ۲۶ — اطہر سندیلوی ۲۶
سرتاج ۴۰ — اقبال ہاشمی ۴۰
پاگل ۴۴ — بدنی ۴۴

ماہنامہ شگوفہ کا آئندہ شمارہ

ہوگا

- ہند و پاک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی نثری و شعری تخلیقات
- کارٹون، ○ لطیفے
اور
- تصاویر
- سہ رنگی خوب صورت سرورق
- ضخامت : ۱۱۲ صفحے
- قیمت : چھے روپے

◉ ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر قبل از قبل بک کرالیں۔

بانو سرتاج (مہاراشٹر)

ملازمہ بیرن بھی

ہماری ملازمۂ خاص کا ہم اُس سے کہیں زیادہ دھیان رکھتے ہیں جتنا وہ ہمارا رکھتی ہے۔ کیوں کہ بقول اُس کے "مالکن ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں، ملازمہ ہزار رکھو ایک ٹکتی ہے"۔ شاید کسی حد تک اُس کا قول درست بھی ہے۔ مگر آپ ملازمۂ خاص سے قطعی یہ مطلب نہ لیں کہ ہمارے یہاں ملازموں کی پوری فوج ہے۔ ۔ ۔ یہ بڑے ارمانوں کی ہماری اکلوتی ملازمہ ہے۔ خاص وہ اس لیے ہے کہ اس کے بغیر ہماری زندگی بے مدعا رہ جاتی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کا وہی مقام ہے جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ اگر ایک دن وہ کام پر نہ آئے تو نہ صرف باورچی خانے کا بلکہ تمام گھر کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ ۔ ۔ ہماری یادداشت یکلخت جواب دے جاتی ہے۔ ہمیں چنے کی دال کا ڈبّہ ملتا ہے نہ کالی مرچ کا پاؤڈر دستیاب ہوتا ہے۔ نل کے جانے سے پہلے پانی بھرنے کی سُدھ رہتی ہے نہ دودھ کو گیس پر رکھ کر اتارنے کا خیال آتا ہے۔ ۔ ۔ اسی لیے ہم نے اپنی ملازمہ سے کہہ رکھا ہے کہ ہر صورت ہر حالت میں اپنے درشن ضرور دے۔ اُس کی طبیعت ناساز ہوگی تو ہم باورچی خانے میں پلنگ کا انتظام کردیں گے۔ وہ بستر پر دراز ہوکر ہی سہی مگر دودھ گرم کرنے سے سبزی بگھارنے تک میں ڈائرکشن دیتی رہے۔

آج سے قریب چودہ برس پہلے کی بات ہے ہمیں پیا کے دیس رخصت کرتے وقت امّی میاں نے جہاں ہمیں شوہر کی، سسرالی رشتہ داروں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کی عزت کرنے، اُن سے مِل جُل کر رہنے کی تاکید کی تھی وہاں یہ اہم نکتہ بھی گوش گزار کیا تھا کہ بیٹی اپنی ملازمہ کی قدر کرنا۔ ۔ ۔ اُس سے اخلاق و محبت سے پیش آنا، اپنی آواز اس کی آواز سے اونچی نہ ہونے دینا۔ ۔ ۔ اُسے شکایت کا موقع نہ دینا وغیرہ وغیرہ ـــــ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر لوگوں کے معاملے میں چاہے ہم نے امّی جان کی نصیحت پر عمل نہ کیا ہو۔ ۔ ۔ اپنی ملازمہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ہم جلد ہی اس کی ملازمت کی دس سالہ تقریب منانے جارہے ہیں۔ ۔ ۔ ہماری ایک سہیلی کے مدعو کرنے پر ہم اُن کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی ملازمہ کی سلور جوبلی منارہی ہے۔ ہم نے بلاوجہ اشتیاق سے پوچھا کیا اس کی ملازمہ کو اس کے یہاں کام کرتے ہوئے ۲۵ برس ہوگئے۔ وہ بولی نہیں یہ ہماری پچیسویں ملازمہ ہے۔ یہ تو یوں ہی برسبیل تذکرہ ہم نے بتادیا۔ آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہماری دسویں ملازمہ ہے۔ ۔ ۔ بلکہ حقیقتاً اسے ہمارے یہاں کام کرتے ہوئے دس سال ہوگئے ہیں۔ ۔ ۔

اب سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ شادی کے چودہ سالوں میں سے چار سال کیا ہم نے بغیر ملازمہ کے گزارے؟ جی ہاں۔ جواب سو فیصدی اثبات میں ہے۔ ابتداء میں ہم نے ملازمہ رکھنے سے گریز کیا تھا۔ شوہر نامدار ہر طرح کے کھانے اور ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے عادی ہو گئے تب کہا "اب ایک ملازمہ کا فوری انتظام کیجئے"۔

شوہر نامدار نے چند لمحے سوچا پھر کہا "اتنی جلدی ملازمہ تو نہ ملے گی۔ ایسا کرتے ہیں گاؤں سے آپا کو بلا لیتے ہیں"۔

ہم نے چونک کر حیرت سے کہا۔۔ "آپا یعنی نند محترمہ کی ایسی قدر افزائی؟"

شوہر نامدار جھینپ کر بولے۔۔ "آپا ہمارے خاندان کی پرانی ملازمہ ہیں۔ دیکھی بھالی سوچی سمجھی تیں خود گھر سنبھال لیں گی"۔

آپا تشریف لائیں۔۔۔ مقابلہ تو جسم ناتواں نے خوب کیا مگر ضعیفی سے لاچار تھیں۔ ایک دن بولیں۔۔۔ "میرے بیٹے کو کوئی کام دلا دیں تو بیٹا اور بہو یہاں آ جائیں۔ بہو گھر کا کام کر دیا کرے گی۔ مجھ سے نہیں ہوتا"۔

آپا کے بیٹے کو گلاس فیکٹری میں نوکری دلوا دی۔ اس طرح اُن کی بہو یعنی ہماری ملازمۂ خاص ہماری زندگی میں دخیل ہو گئی۔

اس کا نام بیرن تھا۔ فلمی ہستیوں کے نام پر بچوں کے نام رکھنے کی وبا کافی پرانی ہے مگر بیرن اپنی نوعیت کا ایک ہی نام تھا۔ جن دنوں بیرن کی پیدائش ہوئی۔۔ شاید اُن دنوں "بیرن نیند نہ آئے۔۔۔ مرلی بیرن بھئی۔۔۔ بیرن سے دل لاگا۔۔۔ بیرن برکھا بہار۔۔۔" وغیرہ فلمی گیت زوروں میں چل رہے ہوں گے۔ ہم نے قیاس لگایا کہ اس حساب سے بیرن کے بھائی بہنوں کے نام ظالما۔۔۔ راجا۔۔۔ ظالما۔۔۔ رانی۔۔۔ پیاری ایسے کچھ ہونے چاہئیں۔۔۔ تفتیش کرنے پر سخت مایوسی ہوئی! بیرن اپنے والدین کی اکیلی اولاد تھی۔

خیر تو بیرن ہماری بیرن بن گئی یعنی کچھ اس حد تک ہماری زندگی میں دخیل ہو گئی کہ ہمارا بس چلتا تو اسے بیمار ہونے دیتے نہ کہیں شادی بیاہ، موت غمی میں جانے دیتے۔ ہماری اس کمزوری کا فائدہ وہ خوب اٹھاتی۔ کسی دن اطلاع دیتی۔ "بیگم! میں تین دن کے لیے اپنے نندوئی کی بھتیجی کی شادی میں جا رہی ہوں"۔

"تین دن کے لیے کیوں؟ جس روز شادی ہو بس اس روز جانا۔" ہم گھبرا کر کہتے۔۔۔ "ارے ہاں بیرن تو اس روز وہ زرد پھولوں والی ساڑی مانگ رہی تھی نا۔۔۔ لے لے۔۔۔ شادی میں پہن لینا۔"

وہ تین روز کا پروگرام ایک دن کا کر دیتی۔

کبھی سبزی کاٹتے ہوئے کنکھیوں سے ہمیں دیکھ کر کہتی "سوچ رہی ہوں گاؤں جا کر بڑی بیگم (ہماری خوش دامن) سے مدد مانگوں۔ ببوا کو اچھے اسکول میں داخل کرانا ہے۔ ڈریس۔۔۔ جوتے وغیرہ خریدنے پڑیں گے"۔

"کتنے دن لگیں گے؟" ہم ڈوبتے دل سے پوچھتے۔

"ہفتہ تو لگے گا ہی۔ برسوں بعد جاؤں گی تو سب سے ملنا ملانا ہوگا"۔

ہم دل پر پتھر رکھ کر اُس کی وہ مدد کر دیتے جس کی وہ بڑی بیگم سے خواہاں ہوتی اور اس طرح اُسے گاؤں جانے سے روک لیتے۔

بیرن دن بھر گھر کے اندر کے کام نمٹا کر آتی۔ سودا سلف لانے کے لیے لازم ملازم تھا۔ ایک بار اُس

کے منانے پر ہم نے ہیرن کو بازار بھیجا۔ صبح دس بجے کی نکلی ہیرن شام چار بجے لوٹی۔ ۔ ۔ آتے ہی نہایت اطمینان سے تخت پر پسر کر بولی۔ "پورا کام نپٹا آئی بیگم"۔

ہم نے کہا "ٹھیک تو ہے۔ کھیت تیار کرنے، سبزی بونے، اگانے۔ توڑنے میں دیر تو لگنی ہی تھی"۔

ہماری بات کا کوئی نوٹس لیے بغیر وہ شروع ہو گئی۔ "پوچھو نہ بیگم۔ کیا کیا کام کر آئی ہوں۔ سبزی مارکٹ کے قریب ہی زنانہ اسپتال ہے۔ لائن میں لگ کر سانس کے لیے دوا لے لی۔ اُس کا کلیجہ بہت دھڑ دھڑ کرتا ہے۔ بہت دن سے کہہ رہی تھی دوا لانے کو۔ مگر بیگم عجیب بات ہے میں گھر جاتی ہوں تبھی ساس کا کلیجہ دھڑ دھڑ کرتا ہے۔ میں یہاں آ کے گھر کام پر آتی ہوں تو ذرا نہیں دھڑکتا۔ ہاں تو خیر دوا لے کر نکلی تو اپنی خالہ مل گئیں سوچا دو منٹ رک کر خیریت پوچھ لوں۔ گھنٹہ بھر بعد آگے چلی تو زیتوں ممانی کو آنگن میں سویاں بناتے دیکھا۔ مشین پھیرتے پھیرتے ہاتھ دکھنے کو آ گئے تھے اس لیے ان کی مدد کر دی۔ پھر لگے ہاتھ رمضان کی دلہن کو دیکھنے چلی گئی۔ ناک نقشہ اچھا ہے مگر کالی بہت ہے۔ ۔ ایکدم اُلٹا توا۔ رمضان کی ماں جہیز کی لالچ میں آ گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر جہیز کی ایک ایک چیز دکھائی۔ ۵ کلو اور ۱۰ کلو کے دو بھگونے ہیں بیگم"۔

ہیرن کا نانکہ ادھر ہی کا تھا۔ ملاقاتوں کی تفصیل پتہ نہیں کہاں تک جاتی کہ ہم نے ٹوک دیا۔ "تو تمہیں سبزی خریدنا کا وقت نہیں ملا"؟

"ملا کیوں نہیں بیگم۔ اس میں بھی کوئی وقت لگتا ہے۔ پانچ منٹ میں سبزی خرید لی۔ البتہ ستو بھونے جا رہی تھی کی کوشش سے مولا کی ہوئے کچلی گئی تھی تو اُس مری کی بھینگی لوٹی دھم سے آ کر تھیلی پہ بیٹھ گئی۔ سارے ٹماٹر پچکا دیئے نشلی نے"!

"ہائیں! یہ کیا بول رہی ہو؟ ذرا سنبھل کر بولو" ہم نے کہا تو ہیرن تنگ آ کر بولی۔ "شرافت سے کیوں بولوں؟ لوٹی کی آنکھیں تھیں یا بٹن۔ ذرا چادر اٹھا کر دیکھ نہیں لینا تھا کہ نیچے گدا ہے یا سبزی کی تھیلی"۔

"اچھا۔ اچھا" ہم نے تنگ آ کر کہا۔ "۱۰ روپے لے گئی تھیں۔ حساب دو"۔

"۲ روپے کے ٹماٹر۔ ایک روپے کے بھنڈے۔ ڈیڑھ روپے کی بھنڈی۔ آٹھ آنے کے بیگن"۔ ۵ روپے ہوئے۔ ہم نے حساب لگایا۔

"ایک روپے کی میں نے مستی لے لی۔ وہ ہمارے گاؤں کا شیر خاں مل گیا تھا۔ زبردستی پکڑا گیا۔ تنخواہ میں سے ایک روپیہ کاٹ لینا"۔ ہیرن شان سے بولی۔ پھر تھیلی میں سے ایک پڑیا نکال کر ہماری طرف بڑھاتی ہوئی بولی "پچاس پیسے کا آپ کے لیے پان لائی"۔

"میں پان نہیں کھاتی"۔ ہم نے ترشروئی سے کہا۔

"اُف وہ! کمال ہے۔ آپ پان نہیں کھاتیں۔ بڑی بیگم تو خوب کھاتی ہیں"۔ اُس نے حیرت سے کہا۔

"اچھا تو میں ہی کھا لیتی ہوں"۔

پان منہ میں رکھ کر بولی "ہاں تو کتنے ہوئے"؟

"ساڑھے چھ۔ تمہیں ساڑھے تین روپے واپس کرو"۔

"ایک روپیہ اسی کا پچھلا باقی تھا وہ دیا"۔

"پھر کیسا باقی تھا۔ تمہیں کتنی بار کہا کہ ادھار نہ دیا کرو"۔

"تھا . . . باقی تھا۔ آپ کو کیا یاد رہتا ہے۔ چار ماہ پہلے میں ایک مرتبہ سبزی لانے گئی تھی۔ تب کی بات ہے"

"اچھا لاؤ۔ بقیہ ڈھائی روپے واپس لاؤ۔"

"ابھی تو سودا لیا ہے۔ سنئے۔ جھڑتی جائیے۔ ۱۵ پیسے کا سنبھار۔ ۳۵ پیسے کی مرچ ۲۵ پیسے کا کریا پاک کا پتہ۔ ۱۰ پیسے شاہ بابا کے مزار پر کے لنگڑے فقیر کو دیئے۔ سوا روپیہ کا رکشہ کیا۔"

"رکشہ کیوں؟ اتنا ذرا سا سودا اٹھانے کے لیے تمہیں رکشہ کی ضرورت پڑتی ہے؟"

"نہ . . . سامان کے لیے نہیں۔ میرے پیروں کا گٹھیا آج زیادہ درد دے رہا ہے۔ چل کر آتی تو شام کا کھانا نہ بنا پاتی۔ میں نہ بنا پاتی تو آپ کو بنانا پڑتا۔ آپ کو بنانا پڑتا تو صاحب مجھ پر ناراض ہوتے۔"

ختم کرو۔ ہم نے اکتا کر کہا۔ "بقیہ چکر پیسے واپس کرو۔"

ہی ہی ہی . . . ہیرن ہمارے سبھی نکلے دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی بولی۔ "راستے میں میرا ببوا مل گیا تھا۔ دودھ کی قلفی کے لیے ضد کرنے لگا۔ میں نے سوچا آپ اتنی پیسے والی ہیں۔ تھوڑے سے پیسے کیا واپس لیں گی۔ ببوا کو بھی معلوم تھا کہ اماں بڑی بیگم کے گھر کام کرتی ہے نہیں تو کیا اسے میری اوقات نہیں معلوم۔ میں نے دلا دی اسے دودھ کی قلفی۔"

ہیرن کی قینچی جیسی زبان اور بہانہ بازی کے تجربوں سے ہم نے اس روز دو سبق سیکھے۔ ایک تو یہ کہ اس سے وہ کام نہ کراؤں جو معاہدے میں نہیں تھے۔ دوسرے اس سے بحث نہ کرو۔ بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "جاؤ شام کے کھانے کی تیاری کرو۔ میں نے ہاتھ جوڑے تم سے۔"

وہ اٹھتی ہوئی بولی "اسی لیے تو کہتی ہوں زیادہ باتیں نہ کیا کریں۔ میرا سر بھی دکھ گیا۔ اب کھانا بننے میں دیر لگے تو نہ کہیے گا۔"

ہم زیرِ لب بڑبڑا کر رہ گئے۔

علی حماد عباسی
(اعظم گڑھ)

دھوتی کی تعریف میں

تعریف اس خدا کی . . . . . .

ابھی ہم اتنا ہی لکھ پائے تھے کہ ہمارے ایک کرم فرما کمرے میں داخل ہوئے اور چھوٹتے ہی سوال کر بیٹھے کہ کیا اب تم بھی اس جماعت میں شامل ہوگئے ہو جو صرف آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی باتیں کر کے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا کرتی ہے۔ ہم نے گردن نفی میں ہلائی تو انھوں نے سوال کیا "تو پھر یہ تعریف اس خدا کی . . . . لکھنا چہ معنی دارد؟"

شاید انھیں اس کا علم نہیں تھا کہ ہماری زبان کا ایک عظیم افسانہ نگار اپنا ہر افسانہ ۸۶ سے شروع کرتا تھا۔ ہم نے اپنے مضمون کا آغاز خدا کی تعریف سے کر کے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔

پھر ہمارے کرم فرما ذرا تعجب سے بولے کہ تمہیں دھوتی کی تعریف میں مضمون لکھنے کی کیوں سوجھی۔ شیروانی کی تعریف میں کچھ کیوں نہیں لکھتے جو لباس کا لباس ہے اور جسم کے عیب چھپانے کا ایک بڑا ہی آسان اور آزمایا ہوا نسخہ بھی۔ اوپر شیروانی ہو تو اندر کی پریشانی اندر ہی رہتی ہے۔ اور تو اور تمہیں آج کے مقبول خاص و عام لباس یعنی پتلون پر خیال آرائی کا خیال کیوں نہیں آیا جس کو پہن کر بوڑھا جوان ہونے کا دعوے دار بن جاتا ہے اور جوان اسمارٹ اور اپ ٹو ڈیٹ نظر آتا ہے۔ اور ہاں! اُتر پردیش کی راجدھانی سے منسوب اس جاذب نظر پوشاک کو تم نے کیوں قابل اعتنا نہیں سمجھا جو اگر باریک کپڑے کا ہو اور گرمیوں میں زیب تن کیا جائے تو جسم کے لیے ایک چلتے پھرتے کولر کا کام دیتا ہے اور اگر دبیز کپڑے کا ہو تو جاذب نظر ہونے کے علاوہ جاذب پسینا بھی ہوتا ہے۔

جی میں آیا کہ ہم اپنے کرم فرما سے کہہ دیں کہ جانیے نہیں بتاتے کہ شیروانی وغیرہ پر لکھنا ہمیں کیوں پسند نہیں۔ ہم تو لکھنے لکھانے کے معاملے میں اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ شخص جو ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھا ہے، کہیں جا کر یہ بات نہ پھیلا دے کہ ان کے دوستوں میں ایک ایسا نامعقول آدمی بھی ہے جو آن کی ناک کے ٹھیک نیچے رہتے ہوئے بھی ان کے پسندیدہ لباس کو ناپسند کرتا ہے اور صرف انھیں چڑانے کے لیے دھوتی کی تعریف میں قلم گھس گھس کر نہ صرف کاغذ اور روشنائی بلکہ اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کرتا ہے، ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنی "دھوتی پسندی" کے پیچھے اس ذہنی اُلجھن سے انھیں آگاہ کر دیں جس کا تعلق اچھے بچپن کی ایک پوری نہ ہونے والی خواہش سے ہے۔

ہوا یہ تھا کہ بچپن میں ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے۔ بڑے ہی خوش مزاج شریف اور ملنسار آدمی تھے

والد صاحب سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ لالہ جی ہمیشہ دھوتی پہنتے تھے۔ دھوتی پہننے کی ان کی اسٹا
ایسے روپ انوپ دکھاتی کہ ہم تو کیا بڑے بڑے اُن کو دیکھتے رہ جاتے۔ کبھی وہ دھوتی کو اپنے جسم کے گرد اس ط
لپیٹ لیتے گویا وہ دھوتی نہ ہو کوئی ڈھیلا ڈھالا انگرکھا ہو۔ کبھی کبھی اور خاص کر گرمیوں کے موسم میں وہ دھوتی کو
سے اٹھا کر اپنی کمر کے چاروں طرف اس طرح سمیٹ لیتے کہ جیسے وہ دھوتی نہ ہو کم کسا ہوا لنگوٹ ہو۔ کڑی دھوپ
کہیں جاتے تو دھوتی کو سر پر تان لیتے، تولیئے یا چادر کی طرح۔ ایک دن تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ ہمار
یہاں صبح صبح تشریف لائے تو ان کے ہاتھوں میں سفید پھولوں کا ایک گل دستہ تھا۔ قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ا
نے دھوتی کے ایک چھور کو اس خوبصورتی سے لپیٹ اور موڑ کر پکڑ رکھا تھا کہ اس پر تازہ سفید پھولوں سے سجے ہو
گلدستے کا گمان ہوا۔ لالہ جی کے دھوتی پہننے کے اس دل لبھانے والے نت نئے انداز پر ہم یوں فدا ہوئے او
کہ ہماری والدہ کو بازار سے بچکانی سائز کی ایک دھوتی ہمارے لیے منگوانی ہی پڑی۔

خیر دھوتی آنے کو تو آگئی لیکن سوال یہ اٹھا کہ پہنا کیسے جائے؟۔ دھوتی پہننے کی ابتدائی کوشش میں ہم پ
راز کھلا کہ دھوتی دوسرے لباسوں کی طرح پہنی نہیں جاتی بلکہ باندھی جاتی ہے۔ ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ اور لباسوں
طرح دھوتی بھی ایک سِلا سلایا، بنا بنایا لباس ہے جس کو ہم جب بھی چاہیں گے کُرتے پاجامے کی طرح پہن لیں گے۔ لم
معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا، اُلٹا تھا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو ہمیں والد صاحب کے چپراسی کو اپنا گرو مان کر اس سے دھ
باندھنا سیکھنا پڑا لیکن ہمارے گرو جی نے پہلے ہی دن ہمیں یہ صاف صاف بتا دیا کہ دھوتی باندھنے کی کریا (عمل) گیا
ہی کلا ہے اور وہ بھی نقل کی کلا۔ (کہیں ہمارے تب کے گرو جی موجودہ تعلیمی نظام کے پیش رو تو نہیں تھے جس میں گ
(علم) کم اور امتحان میں نقل زیادہ اہم ہوتی جا رہی ہے!) نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہمارا دھوتی باندھنے کا گیان ادھورا ر
گیا۔ ہم جب بھی دھوتی باندھتے ہماری کمر کے گرد لپٹا ہوا دھوتی کا پھینٹا ڈھیلا پڑ جاتا۔ ہم اس کو کسنے کی کوشش کر
تو وہ اتنا کس جاتا کہ ہمیں اپنی کمر شکنجے میں جکڑی ہوئی محسوس ہوتی۔ اور جب کبھی بندھی ہوئی دھوتی کو ہم اِدھر اُدھر
اپنی کمر پر ایڈجسٹ کرتے تو نجانے کیوں اور کیسے اس کا پچھوٹا سامنے آ جاتا یا بالعکس اگوٹا یعنی اگلا حصہ پچھوٹے کی جگہ
آ جاتا۔ بے بس اور لاچار ہم پچھوٹے کو اس کی مقررہ (FIXED) جگہ پر ٹھونس کر دبا دیتے لیکن موقع پا کر وہ وہاں سے
بھاگتا اور جدھر جدھر ہم جاتے ہمارے پیچھے پیچھے جھاڑو دینے لگتا گویا ہماری ادھوری ہنرمندی پر جھاڑو پھیر رہا ہو۔
تو ایسا بھی ہوتا کہ ہمیں کچھ پتا بھی نہیں چلتا اور دھوتی کا پچھوٹا اپنی آزادی کا اعلان کر دیتا اور اس کی دیکھا دیکھی دھوتی۔
دوسرے حصے بھی ہماری بے سلیقگی کا ماتم کرتے ہوئے ہمارے پیروں پر آ گرتے۔ ہم اپنی بے بسی پر روتے پیٹتے
جاتے۔ اپنے آپ پر رونا آ جاتا۔ اس حالت میں ہمیں دیکھ کر کہ ہم سامنے اپنے برتھ ڈے سوٹ میں کھڑے ہیں اور ہمارا ا
پیروں پر ہے ہمارے چچا جان ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے اور بڑی مشکل سے اپنی بے قابو ہنسی کو روکتے۔

دھوتی ایک نہایت ہی کار آمد اور مفید پہناوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ملٹی پرپز
ہے۔ دھوتی ہے تو اصل میں ایک پوشاک لیکن اگر جی چاہے تو اس کو چادر کی طرح بچھا کر سو رہیئے یا سو کر اوڑھ
ضرورت پڑے تو دھوتی کو دروازے یا کھڑکی کے پردے کی طرح استعمال کیجیے۔ سفر پر جانا ہو اور گھر میں
بستا ہو تو دھوتی سے یہ مشکل حل کی جا سکتی ہے۔ دُہرا کر کے لپیٹیے تو دھوتی [illegible] جائے گی اور اگر سر پر با

دھوتی کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ دنیا کا واحد اَن ٹیلرڈ (UNTAILORED) ڈریس ہے یعنی اس کی ڈیزائن، تراش خراش اور فِٹنگ FITTING کسی درزی کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں انسان کی شخصیت کا ایک فی صد وہ خود ہوتا ہے اور بقیہ ۹۹ فی صد اس کا لباس ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے انسان کو ٹیلرمیڈ کہا جاتا ہے۔ دھوتی پہننے والا کسی صورت میں اپنی شخصیت کے بناؤ سجاؤ اور کشش کے لیے کسی درزی کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ دھوتی ہمارے ملک میں صدیوں سے استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس دوران لباس سازی کی تاریخ میں کیا کیا انقلابات نہیں آئے۔ فیشن نے کیا کیا کروٹیں نہیں بدلیں۔ لیکن نہیں بدلی تو دھوتی۔ یہ جیسی پراچین کال میں تھی ویسی آج بھی ہے۔ درزی تو نئی ڈیزائنوں کے چکر میں لباس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قمیص کو لیجئے۔ درزیوں کی جدت پسندی نے قمیص کو شرٹ کا نام دے کر اس کو بش شرٹ، ہوائی شرٹ، ٹی شرٹ، سفاری شرٹ، ڈِسکو شرٹ ... اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔ لیکن دھوتی کی ڈیزائن میں ہوشیار سے ہوشیار، مہنگے سے مہنگا درزی بھی کہیں سے کوئی ترمیم اضافہ یا ردّوبدل نہیں کر سکا۔

دھوتی چاہے بنگالی اسٹائل میں پہنی جائے، یا جنوبی ہند کی اسٹائل میں، یا اُتر بھارت میں پہنی جائے یا مہاراشٹرا، گجرات یا کرناٹک میں یا چاہے کہیں بھی اس کے روپ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ رہتی ہے دھوتی ہی۔

دھوتی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دھوتی پہننے والے کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جب کہ دھوتی کے علاوہ دوسرے لباس میں کسی کو دیکھ کر پہچاننے میں خاصی دقّت ہوتی ہے۔ اوروں کی تو نہیں ہم اپنی کہتے ہیں کہ ہمیں کسی پتلون پوش کو دیکھ کر پہچاننے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ہم پتلون والے دفتر کے بابو کو اس کا افسر سمجھ لیتے ہیں۔ اسٹوڈنٹ کو پروفیسر، ٹھیلے والے کو ٹیکسی ڈرائیور۔ لیکن ہمارے لیے کسی دھوتی والے کو پہچاننے کا معاملہ ہمیشہ اس کے برعکس رہا ہے۔ ہم نے کسی دھوتی پوش کو دیکھا اور ادھر ہم نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ ہو نہ ہو اپنی عظیم بھارتی جنتا کا کوئی فرد ہوگا۔ غریبی کی لکیر کا فقیر۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر وہ اپنی غریب جنتا کا کوئی نمائندہ ہوگا جو جنتا کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کی ضرورت اور منصوبوں پر اسمبلی میں دھواں دھار تقریر کرتا ہوگا۔

دھوتی بے شک جنتا کا لباس ہے لیکن اس کو ایک بار اپنانے کے بعد کوئی بھی شخص دھوتی سے غفلت نہیں برت سکتا، لاپرواہی نہیں کر سکتا کیوں کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، دوڑتے بھاگتے، سفر میں، گھر میں دھوتی باندھنے والے کو سخت احتیاط اور چوکسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی طرف سے ذرا سی بے احتیاطی اور بے خبری دھوتی کو انتقام لینے پر آمادہ کر دے گی ۔۔۔!!

غزل

رشید عبدالسمیع جلیل
(حیدرآباد)

سر پر اک آسماں ہے ظرافت کا دوستو　　　منظر زمیں پہ کوئی قیامت کا دوستو
وحشت ہے دن تمام تمازت ہے رات بھر　　　موسم گزر گیا ہے ظرافت کا دوستو
کرفیو کی چھٹیاں بھی کلنیڈر میں چل پڑیں　　　اک سلسلہ ہے یہ بھی ثقافت کا دوستو
خونِ رگِ امیر میں برپا ہے اک فساد　　　پارہ چڑھا ہوا ہے قیادت کا دوستو
تعبیر پہلے ڈھونڈیئے پھر دیکھیے اسے　　　ورنہ برا ہے خواب وزارت کا دوستو
دنگا، فساد، خون خرابہ، کشیدگی　　　ہے نقش نقش اب یہ سیاست کا دوستو
پردہ جب اٹھ گیا تو پس پردہ کیا رہا　　　یہ دیکھنا ہے کام حماقت کا دوستو
سو سو جتن کے بعد بھی آخر وہی ہوا　　　ملتا نہیں ہے وقت فراغت کا دوستو
طنز و مزاح پھول کی پتی کی دھار ہے　　　ہے کاٹ میں بھی لطف نزاکت کا دوستو

بخشے ہیں جب سے قافیے بخت جلیل کو
خالی ہے تب سے بابِ عنایت کا دوستو

○

ہزل

بجلی گھونسلاوی
(رائے پور)

ہو گئے وہ بھی اب ہزل والے　　　کل جو مقبول تھے غزل والے
جھونپڑے میں گزر بسر ہے مدام　　　خواب کیا دیکھتے محل والے
رونقِ ملک تھے وہی افراد　　　جن کو کہتے تھے دل بدل والے
قدر و قیمت کنوئیں کی جاتی رہی　　　لوگ جب سے ہوئے ہیں نل والے
سامنے ہے دکانِ حلوائی　　　پوری ترکاری اور حلوا لے
چائے مکھن اور ٹوسٹ کے ہمراہ　　　ایک انڈا بھی گھی میں تلوا لے
تیس دن سے ہے اپنا مرغا گول　　　کھا رہے ہوں گے اغل بغل والے

گھونسلے پر چلا نہ بس بجلی
شاعری میں ہی دال گلوا لے

فرید سحر (حیدرآباد)

بہت پچھتائے شادی کرکے

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ شادی ایک ایسا قلعہ ہے جس میں باہر والا اندر جانا چاہتا ہے اور جو اندر ہے وہ باہر آنا چاہتا ہے۔ یہ بات خواہ کسی نے کہی ہو لیکن آج ہمیں بالکل سچ دکھائی دیتی ہے۔ کاش یہ بات ہمیں اس وقت بھی سچ معلوم ہوتی جب ہم شادی کا خطرناک منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ یوں شادی کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟ ہمارے وطن عزیز میں تو ہر نوجوان کو شادی کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ بھلے ہی وہ پڑھا لکھا نہ ہو وہ کچھ کماتا دھماتا نہ ہو، اور خواہ اس کے کردار مشتبہ ہی سہی! اور تو اور ہمارے ہاں ایک بدکردار نوجوان کی شادی محض اس خیال سے کردی جاتی ہے کہ شادی کے بعد وہ سدھر جائے گا یا اس کی بیوی اُسے راہِ راست پر لائے گی! لیکن یقین مانیے ہمارا معاملہ اُس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ اس طوق کو ہم نے اپنی خوشی سے گلے کا ہار بنایا۔ اپنی خوشی سے ہم نے حامی بھرلی اور آج تک بھگت رہے ہیں!

شادی سے قبل ہم نے خوب ریسرچ کی معلومات حاصل کیں اور تجربہ کار لوگوں کے زریں خیالات سے آگہی حاصل کی۔ ہم نے ان سے بھی مشورہ کیا جو ڈبل گریجویٹ تھے یعنی جنھوں نے دو شادیاں کیں تھیں اور ہم نے اُن کی بھی رائے لی تھی جو درمیان میں ہی "رن آؤٹ" ہو گئے تھے۔ یا "رن آؤٹ" کردیئے گئے تھے یعنی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنی بیگم سے چھٹکارا پا چکے تھے۔ کسی بندے نے بھولے سے بھی ہمیں یہ مشورہ نہیں دیا کہ ہم یہ جوکھم مول نہ لیں۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا "اپنی اپنی قسمت ہے برخوردار!" لیکن ایک شخص نے ہمیں علیحدگی میں خبردار کیا "کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو۔ کیوں اس دلدل میں پھنسنا چاہتے ہو! اکیلے رہوگے تو عیش کروگے ورنہ پچھتاؤگے"!! اب آپ سے کیا کہیں جناب! وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے اپنے بہنوئی تھے جن پر ہم نے سوچا کہ یہ بہنوئی لوگ بس مذاق کرنا ہی جانتے ہیں کیوں کہ خود تو ہماری بہن سے شادی رچائے پچھلے بیس سال سے عیش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اکیلے ہی اس جہان سے کوچ کر جائیں! لہٰذا ہم نے بہنوئی کے مشورہ کو نظر انداز کردیا۔ جب لوگوں کی اکثریت نے شادی کے بعد کے حالات کا رشتہ قسمت سے جوڑ دیا تو ہم نے بھی سوچا کہ اپنی تقدیر پر بھروسہ کیا جائے اور شادی کر لی جائے۔ لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے شادی کے متعلق بات کرنے کی جرأت ہم میں نہ تھی۔ چنانچہ ایک عرصہ تک شادی کی خواہش دل میں لئے تڑپتے رہے بلکہ ہم نے شاعری کا سہارا لیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے جذبات کو شاعری کے ذریعہ

پیش کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا لیا۔

پھر یوں ہوا کہ ہمارے بہی خواہوں کو جیسے اچانک ہماری تنہائی بُری طرح کھٹکنے لگی۔ چنانچہ ایک دن والدہ محترمہ نے فرمایا کہ وہ ہمارے لیے ایک جیون ساتھی اور خود اپنے لیے ایک چاندسی بہو لانے کا ارادہ کر چکی ہیں۔ ہم نے روایتی مشرقی تہذیب کا لحاظ رکھتے ہوئے یوں ہی انکار کر دیا۔ والدہ صاحبہ ٹھہریں پچھلے زمانے کی۔ آبدیدہ ہو کر بولیں "بھلا تم اپنی ماں کی مانوگے تو پھر کس کی سنوگے"؟ نہ جانے ہمارے ہاں ماؤں کو اپنی اولاد کا سہرہ دیکھنے کی اس قدر خواہش کیوں رہا کرتی ہوگی؟ بھلا کنواروں کو کیسا خبر کہ شادی کے پھول کیا رنگ کھلاتے ہیں۔ بیوی زندگی بھر گلے کا ہار بن جاتی ہے اور سہرا پریشانیوں کا سہرا۔ ماں کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر ہم فوری پسیج گئے اور یوں گویا ہوئے "امی جان آپ کیوں ناراض ہوتی ہیں؟ اگر آپ کے لیے دو بہوؤں کا تجربہ ناکافی ہے تو ٹھیک ہے تیسری کو بھی لا کر دیکھ لیجئے"! والدہ صاحبہ نے فرمایا "بیٹے ایسا نہ کہو۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس کے علاوہ صرف بہوؤں کو الزام دینا کوئی مناسب بات نہیں۔ اور اس طرح انھوں نے شادی کے لیے ہمیں خواہی نخواہی جکڑ دیا۔

سب سے پہلے ہماری اسم نویسی تیار کی گئی۔ اسم نویسی کیا تھی پھر بیچ اور زیادہ جھوٹ کا پلندہ۔ ہمارے بہی خواہوں نے نہایت خوبصورتی سے ہماری عمر عزیز میں صرف پانچ برس کی کمی کر دی۔ ہماری ماہانہ آمدنی میں صرف دو ہزار روپے کا اضافہ کر دیا اور نہ صرف یہی ہوا بلکہ ہمیں مفت میں ایک معقول جائداد کا مالک بھی بنا دیا۔ پھر بی مشاطہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بی مشاطہ نے ہم سے پوچھا "میاں آپ کو کیسی لڑکی چاہیے اور آپ کے کیا کیا مطالبات ہیں"۔ ہم نے کہا "بی مشاطہ۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ آج کل شریف لڑکوں کی کس قدر قلت ہے؟ پڑھے لکھے، شریف، باکردار، نیک، برسرکار اور خصوصاً ہم جیسے کنوارے لڑکے کہاں ملتے ہیں؟ اب رہا ہماری پسند کا سوال — ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ لڑکی ماہ پارہ ہو، سولہ سے زیادہ نہ پندرہ سے کم اور کم از کم انٹرمیڈیٹ کامیاب ہو۔ ویسے لین دین کے مطالبہ کو یوں تو ہم ناپسند کرتے ہیں مگر ایسے گھر ضرور ڈھونڈتے ہیں جہاں بن مانگے ہی اس قدر ملے کہ زمانہ مثال دے۔ اس کے علاوہ مزید ایک مطالبہ ہم نے یہ بھی دہرایا کہ لڑکی کو اردو شعر و ادب سے دلچسپی بھی ہو"! بی مشاطہ بولیں "ٹھیک ہے میاں سب آپ کو ضرور ملے گا۔ لیکن لڑکی کو شعر و ادب سے دلچسپی؟ یہ مطالبہ ذرا غیر واجبی ہے۔ کیوں کہ آج کل جہاں دیکھو انگریزی تعلیم کا بول بالا ہے۔ ایسے میں اردو شعر و ادب کا شوق بھلا کس لڑکی کو ہوگا؟ پھر ذرا رک کر بولیں "ارے ہاں میاں یاد آیا۔ ایک شاعر صاحب ہیں۔ ان کی لڑکی کو شعر و ادب سے . . . !! بس بس بی مشاطہ۔ ہم نے تقریباً چیخ کر بی مشاطہ کی بات اڑا لی۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں اگر ہماری یہ شرط پوری نہ ہو۔ لیکن خدا کے واسطے ہمارا رشتہ وہاں نہ جوڑنا جہاں سے ہمیں اور چیزوں کے علاوہ کچھ نظمیں، کچھ غزلیں اور کچھ قصیدے بھی جہیز میں ملیں!!

ایک ہفتہ کے اندر اندر بی مشاطہ ایک پیام لے آئیں۔ لڑکی اچھی، خاندانی، خوبصورت، تعلیم یافتہ اور لین دین بھی ہماری حسب منشا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی باور کرایا گیا کہ لڑکی کو نہ صرف شعر و ادب سے دلچسپی ہے بلکہ وہ خود بھی اچھے خاصے شعر کہہ لیتی ہے۔ بس کیا تھا جناب یہ سنتے ہی ہم ایل۔ بی۔ ڈبلیو آؤٹ ہو گئے۔ کیوں کہ اردو شعر و ادب ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہمیں محسوس ہوا جیسے ہمیں اپنا آئیڈیل مل گیا ہو۔ گھر والوں نے بھی ایک ہی نظر میں لڑکی کو پسند کر لیا۔ شادی سے متعلق ساری باتیں نہایت خوش اسلوبی سے اور پُر خلوص انداز میں طے ہو گئیں۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ہم نے سہرا باندھا، دولہا بنے اور دلہن کو گھر لے آئے۔ دلہن کی آمد سے جیسے سارے گھر کی بہار آگئی۔ گھر آتے

ہی چند دنوں کے اندر ہی ہماری بیگم نے سب کا دل لوٹ لیا۔ گھر والوں کے علاوہ اڑوس پڑوس میں بھی ہماری بیگم نے اپنا سکہ جما لیا۔ کسی نے حسن کی تعریف کی۔ کسی نے کام کاج کی اور کسی نے شیریں کلامی کی۔ جب سب لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تو ہم کہاں پیچھے رہنے والے؟ ہم نے بھی اپنی بیگم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اُن کے دامن کو محبت کے پھولوں سے بھر دیا۔ ایک ایک کرکے پانچ جمعگیاں ختم ہوئیں اور بیگم نے اپنا پہلا پاؤں باہر نکالا۔ بیگم کی پہلی فرمائش ہمیں آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ کہنے لگیں "اب عید آگئی ہے اور آپ کے گھر یہ میری پہلی عید ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کوئی ایسی ویسی ساڑی اٹھا لائیں اور ہمارے لوگوں میں میری ہنسی ہو جائے۔ اس لیے میں خود آپ کے ساتھ چل کر اچھی سے اچھی اور بھاری ساڑی خریدوں گی۔ اور ہاں آپ بھی اپنے لیے کوئی ایسے ویسے کپڑے نہ لینا۔ وہ بھی میں ہی پسند کروں گی ۔۔۔ آپ کے لیے!! ہم نے سمجھانے کی کوشش کی" لیکن بیگم ابھی تو شادی کے ڈھیر سارے نئے اور اعلیٰ اقسام کے کپڑے ہم نے استعمال ہی نہیں کئے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ عید کے لیے نئے کپڑے بازار سے ہی خرید کر پہنے جائیں؟ بولیں "واہ ۔۔۔ یہ بھی خوب رہی۔ میں اپنے لوگوں میں انھیں کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر جاؤں؟ نا بابا نا! مجھ سے تو ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ مجھے وہاں آپ کی بھی تو PRESTIGE کا خیال رکھنا پڑتا ہے"۔ پھر نافود نخروں کے انداز میں آنکھ میں آنسو لاکر بولیں" آپ تو میرے سرتاج ہیں اور آپ ہی میرے سب کچھ اگر میں اپنے سرتاج ہی سے کچھ نہ مانگوں تو پھر کس سے مانگوں؟" اور یہیں آکر ہم بآسانی "کیچ آؤٹ" ہو گئے۔ ہم نے کہا" ٹھیک ہے بیگم تمہاری پہلی فرمائش منظور"۔۔۔ اس طرح شادی کے بعد یہ ہماری شکست تھی۔

دوسری الجھن کے لیے ہمیں زیادہ دیر تک انتظار کرنا نہیں پڑا۔ کیوں کہ چند ہی دنوں بعد بیگم کے اچانک اُلٹیاں شروع ہوگئیں۔ اُلٹیوں کے ساتھ کھٹائی کی خواہش ہوئی اور ہماری ساری جرأتیں کھٹائی میں پڑ گئیں۔ والدہ نے دیکھا تو باغ باغ ہوگئیں۔ وہ بہت مسرور تھیں اور اپنی بہو کے وارے نیارے کر رہی تھیں۔" بہو ایسا نہ کرو۔ بہو ویسا نہ کرو۔ اور بہو آرام کرو۔" ان کی ہدایتوں نے بیگم کو ہم سے دور کر دیا کیوں کہ وہ سچ مچ آرام کرنے لگیں اور ایسا ویسا کرنے سے احتراز کر گئیں۔۔۔ والدہ صاحبہ نے ہم سے کہا" بیٹے بہو کا خاص خیال رکھنا۔ اچھی غذائیں اور پھل میوے فراہم کرنا۔ کیوں کہ دوا دارو سے زیادہ یہی پھل میوے ہی سب سے بڑا ٹانک ہے۔ اور چونکہ بہو کا یہ پہلا کیس CASE ہے اس لیے بہت زیادہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہے"۔ ہم نے کہا" امی جان آپ کی بات سر آنکھوں پر" لیکن یہ پہلی اور پہلے کا چکر آخر کب تک چلتا رہے گا؟ شادی آئی تو آپ نے فرمایا" بیٹے یہ تمہاری پہلی شادی ہے اس لیے دل کھول کر خرچ کرو۔ عید آئی تو بیگم نے کہا یہ پہلی عید ہے اس لیے اچھے اور بھاری کپڑے چاہئیں اور اب یہ اُلٹیاں ہو رہی ہیں تو آپ فرما رہی ہیں کہ یہ پہلی اُلٹیاں ہیں اس لیے بہو کا خاص خیال رکھو ۔۔۔ اللہ جانے یہ پہلے اور پہلی کا چکر ہمیں کہاں پہنچا کر دم لے گا؟ والدہ بولیں" کیوں دل چھوٹا کرتے ہو بیٹے؟" کبھی کبھی یہ پہلے اور پہلی کا چکر فائدہ بخش بھی ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ یہ بہو کا پہلا کیس ہے اور پہلے کیس کو بہو کے والدین ہی DEAL کرتے ہیں"۔ اب ہمارے خوش ہونے کی باری تھی۔ سو ہم پھولے نہ سمائے اور ہم بیگم کے لیے کچھ زیادہ ہی چیزیں خرید لائیں۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے ہمیں شادی کے پہلے سال کا خوبصورت کیلنڈر تحفہ میں ملا اور ہماری خوشیاں بام عروج پر پہنچ گئیں۔

منا گھر آیا اور گھر میں بہار آگئی۔ لیکن بہار کب کیلی آتی تھی جو اب آتی؟ اس کے پیچھے خزاں کا پہرہ بھی تو ہوتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بچوں کی طبیعت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز منا ہمیں پریشان کرتا

اور ہم ڈاکٹر کے ہاں دوڑے دوڑے جاتے۔ اس بھاگ دوڑ نے ہمیں ڈاکٹروں کی منت سماجت کا عادی بنادیا۔ ادھر بیگم کے ناز و نخرے بھی بڑھ گئے۔ بیٹے کی محبت نے انھیں ایسا اندھا کیا کہ وہ نند، بھاوج، ساس اور خود ہمیں بھی بھول بیٹھیں۔ والدہ صاحبہ بھی اصل سے سود پیارا کے مصداق منے کی دیوانی ہوگئیں۔ ان حالات نے سب کے دلوں میں آہستہ آہستہ بیگم سے دوری کا احساس پیدا کیا۔ اور یہی احساس بیگم کے لیے گھٹن کا باعث بنا۔ ہم نے جب دیکھا کہ ہمارا داخلی محاذ کمزور ہوتا جارہا ہے تو ہم نے سوچا کیوں نہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی جائے۔ تاکہ کسی خارجی حملہ سے قبل ہی ہم مضبوط رہیں مستحکم رہیں۔

شادی سے قبل ہم نے ایک خواب یہ بھی دیکھا تھا کہ ہمارا کنبہ مختصر ہو اور ایک خوشحال زندگی کے ہم مالک ہوں۔ لیکن صاحب داد دینی پڑے گی ہماری بیگم کی تخلیقی صلاحیتوں کی کہ تیسرے ہی سال محترمہ نے اپنی "ہیٹ ٹرک" مکمل کرلی۔ اور چوتھے سال کے ختم ہوتے ہوتے ہمارے کھاتے میں ایک کیلنڈر اور تین جنتریاں جمع ہوگئیں۔ ہمارے کھاتے کا یہ تناسب ہمیں نہایت بھونڈا محسوس ہوا اور کیلنڈر کا اضافہ تو بالکل ایسے لگا جیسے سرو کے درخت پر شکر کدو کی بیل۔ پر کرتے کیا۔ چپ چاپ اس تناسب کو بھی ہم نے سہہ لیا۔ لیکن احتیاط کے طور پر ہم نے گھر سے دور اپنا تبادلہ کرالیا۔ کیوں کہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں بیگم کو "ڈبل ہیٹ ٹرک" کی دھن سوار نہ ہوجائے۔ مگر افسوس کہ وہاں بھی ہمیں چین نہ ملا۔ گھر، منا اور بیگم کی یاد نے ہمیں تڑپا دیا اور ہم دوبارہ گھر کی طرف لوٹ آئے۔ ہماری بیگم کو بحث مباحثہ میں ملکہ حاصل ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر بحث کے لیے وہ آمادہ ہوجاتی ہیں۔ اور نتیجہ میں تختۂ مشق ہم ہی بنتے ہیں۔ ایک دن ہماری جو شامت آئی تو ہم نے ان سے غزل کی فرمائش کی۔ وہ بولیں "مجھے غزل وزل سے کوئی دلچسپی نہیں۔" ہم نے تعجب سے کہا "لیکن بی مشاطہ نے تو کہا تھا کہ تمہیں نہ صرف شعر و ادب سے دلچسپی ہے بلکہ تم خود بھی اچھے خاصے شعر کہہ لیتی ہو۔" بیگم بولیں "یقیناً کہا ہوگا" اور پھر شروع ہوگئیں "خدا غارت کرے بی مشاطہ کو ــــ جھوٹی کہیں کی۔ ہمیں بھی کیا کیا "سبز باغ" دکھائے۔ کہتی تھیں لڑکا خوبصورت ہے۔ شریف ہے۔ کم عمر ہے اور لڑکے کے نام پر ایک مکان بھی ہے ــــ" "کہاں ہے جی آپ کا مکان؟ کہاں ہے آپ کی خوبصورتی؟ اور آپ کی عمر؟ اگر جھوٹ نہ بولوں تو مجھ سے دوگنی عمر کے ہیں آپ"! ہم نے کہا "ارے ارے بیگم یہ کیا غضب کرتی ہو۔ ہم نے تو صرف ایک غزل کی فرمائش کی تھی اور تم نے سارا دیوان سناڈالا"! بولیں "اور نہیں تو کیا؟ شریف گھرانے کی لڑکی کو لاکر اس طرح ستانا اور دق کرنا آپ لوگوں کی عادت بن گئی ہے" اور پھر دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ بیگم نے گھر سر پر اٹھالیا اور ہم نے منہ کی کھائی۔ پھر ہمیشہ کی طرح ہم گھر سے باہر نکل آئے سکون کی تلاش میں۔ لیکن افسوس کہ باہر آتے ہی منا نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا اور اس کی تائید میں ہم سے سوال جواب کرنے لگا۔ شادی کے بعد یہ ایک خطرناک موڑ تھا کہ ہماری کمسن اولاد بھی ہم سے بغاوت پر آمادہ تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شادی کی کسی بارات کو دیکھتے ہی ہمارے منہ سے بے ساختہ یہ دعا نکل جاتی ہے "اے مالک دولہے کے حال پہ رحم فرما ــــ اس دولہے کو اپنے حفظ و امان میں لے لے اور شادی کے بعد کے عذابوں سے محفوظ فرما۔"

مثل مشہور ہے ساری دنیا ایک طرف تو بیوی کا بھائی ایک طرف! ہماری بیوی کے قسمت سے ایک ہی بھائی ہے۔ چنانچہ بیگم کے سالے [illegible]

واجب الواجب۔ ورنہ بیگم تو یہی کہتی ہیں کہ "میرا ایک ہی بھائی ہے اور آپ اُس کو بھی سیدھی نظر سے نہیں دیکھتے" کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی بیگم کی نظر میں منایت کے لیے ہمیں اُس اکلوتے سالے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شادی سے قبل ہم گویا بے تاج کے بادشاہ تھے شہر کے خوبرو ہمیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور آج ہم بیگم کی خاطر اپنے اکلوتے سالے کو! شادی سے پہلے ایک الگ دنیا آباد تھی۔ ہمارے قدردانوں کی کوئی کمی نہ تھی پڑوسی بھی ہماری خوب خاطر مدارات کرتے۔ آج یہاں تو کل وہاں ہماری دعوتیں ہوتیں۔ مگر افسوس کہ کم بخت شادی کیا ہوئی کہ ہمارے سارے قدردان اچانک غائب ہو گئے جو لوگ ہمیں پہلے خوش اخلاق، ملنسار اور ذہین کہتے تھے وہی آج ہمیں خودغرض، مغرور اور خردماغ مشہور کرتے ہیں۔ صرف پانچ برس کے اندر اندر ہم ایک سنجیدہ فکرات الذین کر رہ گئے۔ ہماری سنجیدہ صحبت دیکھ کر اور تو اور فلاسفر حضرات تک نہایت اہم امور پر مشورے کے لیے ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ گویا ہم بھی گویئے، کماونٹ اور بیرسٹر بیلارسل کی صحت کے متلاشی ہیں۔ ہم جو کبھی قہقہوں کے سوداگر مشہور تھے آج ایک معمولی سی مسکراہٹ کے لیے گھنٹوں ریہرسل کرتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں اپنے بہنوئی کا مشورہ یاد آتا ہے "اکیلے رہو گے تو عیش کرو گے ورنہ پچھتاؤ گے" لیکن میرے عزیز نوجوانو! سچ تو یہ ہے کہ شادی ایک جوا ہے کہ جو قسمت والا ہے وہ جیت گیا اور جو بدنصیب ہے وہ ہار گیا۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے "بہت پچھتائے شادی کر کے" پچھ

اے غمِ دل کیا کروں

قمرالزماں قمر
(رانچی)

[حضرت مجاز کی روح سے معذرت کے ساتھ]

پھر ہمارے ملک میں اپنے گرانی آئی ہے — مرد و زن کی شکل پر اک مردنی سی چھائی ہے
آسماں کو چھو کے بھی قیمت نہ سر جھکائی ہے — ہر طرف کہرام ہے "مہنگائی ہے مہنگائی ہے"

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف ہے نفسی نفسی حشر کا ہے انتظار — دال، چاول، سبزیوں کے دام سے آف رے ابھار
ہر بشر بے چین ہے ہر فرد میں ہے انتشار — ہر طرف اک لوٹ ہے اور ہر طرف ہے خلفشار

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جیب خالی ہو گئی آیا نہ معدہ میں اچھال — ہے تردد اور پریشانی کے چکر میں خیال
زندگی بے کیف ہے جینا ہوا امرِ محال — ہے عروج آسماں تک اس گرانی کا جلال

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

کس طرح پورا کیا جائے گا بچوں کا سوال — کس طرح بیگم کو دوں گا لا کے ساڑی لال لال
مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا ہے بہرحال — ذہن ہے فکر و مسائل کے مزاروں کی مثال

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ان سوالوں کا ہے میرے پاس چپ رہنا جواب — دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہہ کے "ہے قسمت خراب"
دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے یہ مہنگائی جناب — دور سے پانی نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دوست اور مہماں کی کیسے کس طرح خاطر کروں — گھر میں شکر تک نہیں کہ چائے بھی حاضر کروں
اپنی مجبوری قمر کس کس سے میں ظاہر کروں — ملک کو ناپاکیوں سے کس طرح طاہر کروں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سراج نرلی

ڈش ٹی وی کے جی سنٹر ہو گئی بہتر یارو! — دیکھو خادم کو ذرا وہٹ تو دیکھ کر یارو!
گھر جب ہوتی ہے مجھ پر وہ تو ستمگر یارو — اور جب پیار جتاتی ہے تو [illegible] یارو
جب سے رہنے لگا [illegible] لب پر یارو — مجھ پہ آنے لگے ہر سمت سے پتھر یارو
کیوں بھلا مجھ کو ابھی تک [illegible] — بس یہی سوچتا رہتا ہوں میں اکثر یارو!
بس ابھی جیت کے دنگل میں [illegible] لگا — تم میں سے کوئی بھی دے دو مجھے بستر یارو
گھر میں کھانے کو تو کنکیاں بھی نہیں ہیں لیکن — خود کو کہتا ہے سراج ایکس منسٹر یارو!

سلطان جمہوری

(بنگلور)

نگہ سے نگاہ تک

راجو حجام اپنے فن میں بڑا ماہر ہے۔ ہر قسم کی تراش خراش خوب جانتا ہے اور سرکش گھوڑے جیسی زُلف رکھنے کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے فیشن پر بہت جلد قابو پالینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کی دکان پر بچے، جوان اور بوڑھوں کی ایک بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔

مُجھے اس کا کام اتنا پسند ہے کہ اپنے وطن سے طویل غیر حاضری پر بھی اپنی حجامت کو اسی لیے ملتوی رکھتا ہوں کہ جب گھر جاؤں گا تو راجو سے حجامت کرالوں گا۔ اس التواء کا اثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجھے جیل سے بھاگا ہوا قیدی سمجھنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ راجو کے علاوہ کوئی اور حجام میری نگاہ میں نہیں جچتا۔

مگر اس دفعہ جب ایک لمبے سفر کے بعد عید کی چھٹیاں منانے اسٹیشن سے اُتر کر راجو کی دُکان پہ پہنچا تو دیکھا دکان بند پڑی ہے۔ مجھے برقی جھٹکا محسوس ہوا۔ کہیں راجو گزر تو نہیں گیا ـــــ؟ پھر میری حجامت کون کرے گا؟ کون مجھے زمانہ کے مطابق قبول صورت بنائے گا؟ کون مجھے میری مرضی سے فلسفی، جوگی یا ہپی کے سانچے میں ڈھالے گا؟ کون . . . . . ! اچانک میری نظر اوپر لٹکے ہوئے بورڈ پر پڑ گئی۔ لکھا تھا "بڑے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ اب سے ہر ہندو یا مسلم تہوار کے موقع پر دو چار روز قبل سے دُکان بند رہے گی اور ہمارا کاروبار عین تہوار کے دن سے شروع ہوگا . . . !"

اس کا مطلب تمہارا راجو زندہ ہے . . . اور مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ اس وقت اگر کوئی مجھ سے کچھ مانگتا تو دے دیتا۔ آدمی جب غم یا خوشی کی سرحد پار کر جاتا ہے تو وضعداری کو طاق پر رکھ دیتا ہے۔ میں بھی اسی ہیئت میں گھر کی جانب چل پڑا۔ ڈیوڑھی پر میرے سوٹ کیس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور سے ہاتھوں ہاتھ لے لیا گیا۔ یہ چونکہ بہت وزنی تھا اسی لیے فوراً اندازہ لگالیا گیا کہ اس میں بہت ساری توقعات منتقل ہیں اور اسے فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ میرا ایک سرسری جائزہ لے کر بکس کھولا گیا اور چھان بین ہونے لگی۔

ادھر جب میں منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو دیکھا پائے اور شیشے کے ساتھ ایک طرف میری

لائی ہوئی بے حد قیمتی ساڑی بھی سوالیہ انداز میں رکھی ہوئی ہے۔ میرے سوال کرنے سے پیشتر ہی کہا گیا "ساڑی تو ویسے کوئی خاص نہیں، مگر اس میں گل بوٹے بنا دیئے جائیں تو جاذب نظر ہو جائے گی!" میں نے اقتصادی تحمل سے غور کیا اور کہا عید کے دو دن رہ گئے ہیں اور اب کوئی زری والا تیار نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے عید کے بعد ہی ٹھیک رہے گا۔ کہا گیا "عید کے دن ہی کے لیے تو لوگ یہ سب اہتمام کرتے ہیں... خیر! پچھلی عید کی ساری میں یہ عید گزار لی جائے گی.....!"

ہر چند بات بڑی نرمی سے کہی گئی تھی، مگر میری عاقبت اندیشی نے مجھے اکسایا کہ اسی بڑھتے ہوئے بال اور داڑھی کے ساتھ بازار جاؤ اور کسی زری والے کو راضی کرو! میں نے خاموشی سے ساری اٹھالی اور بازار چلا گیا۔ گھنٹوں کی تلاش وہ جستجو کے بعد ایک زری والے کو منہ مانگے دام پر راضی تو کرلیا، پر جب اڈوانس دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ پرس تو گھر ہی بھول آیا ہوں۔ میں مخمصے میں پڑ گیا کہ اس پر فاتحہ پڑھ ڈالوں یا گھر جاکر ایک کوشش کر دیکھوں۔ چھٹی حس سے نتیجہ ہر حال میں معلوم تھا۔ اس پر جتنا بھی واویلا کرتا، کم تھا، کیونکہ ابھی مجھے پاجامہ اور قمیص بنوانی تھی۔ بنیائن، موزے اور رومال خریدنے تھے، سفیو کرنی اور حجامت بنوانی تھی! مرتا کیا نہ کرتا، قرض لینے پر مجبور ہوگیا۔ ایک ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست کے آگے منہ کھولا تو کہنے لگا قرض محبت کی قینچی ہے۔ قرض تو نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر چاہو تو میں اپنی مرحومہ و مغفورہ خس کم جہاں پاک کی یادگار قینچی دے سکتا ہوں۔ میں نے کہا تم قسمت والے ہو کہ جیتے جی رنڈوے ہوگئے!

دیگر تمام مسلم دوستوں نے کہا چوں کہ اُن کے یہاں بھی عید ہے، اس لیے قرض نہیں دے سکتے۔ آخر مایوس ہوکر ایک ہندو دوست سے رجوع کیا۔ اُس نے فی الفور میری مدد کردی، جس سے میں بہت متاثر ہوا اور کہا آخر یہ رنگا رنگ دھرم اور مذہب یک رنگ کیوں نہیں ہو جاتا۔ اِس پر اُس ہندو دوست نے کہا کہ خدا بڑی حکمت والا ہے۔ اگر ایک مذہب ہو جائے تو عید بھی ایک ہی دن ہوگی، پھر تم کس سے قرض مانگنے جاؤگے ــــ؟

گھر آکر اپنی چھٹی حس کی آزمائش کی تو وہ سو فیصدی صحیح نکلی۔ ہزاروں اخراجات گنا کر یہ ثابت کر دیا گیا کہ پرس کے دو ہزار بھی ناکافی ہیں اور سیویاں، دودھ، مسالے، وغیرہ کے پیسے اس حساب سے دیئے گئے کہ اس میں کچھ کٹوتی اور خرد برد کرکے سگریٹ، چائے، پان تک کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی تھی۔

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا ویسے ویسے میری بے چینی بڑھ رہی تھی، کیوں کہ عید کی تیاریوں میں اپنی تیاری ایک بھی نہ ہو پائی تھی۔ نہ وقت تھا اور نہ پیسے۔ آخر اپنی قیمتی گھڑی گروی رکھ دی اور کپڑے خرید کر تمام جانے پہچانے درزیوں کے پاس مارا مارا پھرا۔ مگر عید کیا ہوئی، ہنگامۂ قیامت ہوگیا، ایک نفسی نفسی کا عالم تھا، کوئی کسی کو پھوٹے منہ پوچھتا نہیں تھا۔ یہی بات عید کے دن دوسرا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ ایسے ہی اس طرح بغلگیر ہوتے ہیں جیسے ایک جان دو قالب! لا محالہ ایک تھرڈ کلاس درزی کو فرسٹ کلاس اُجرت دے کر کپڑے سلوانے پڑے اور جب گھر لوٹ رہا تھا تو رات کے دو بج رہے تھے اور اُس وقت تک تمام درزیوں اور دھوبیوں کی ورد و فریاد کے باوجود چاند نظر آجانے کی خبر آچکی تھی!

بازار سے آکر بستر پر جو گرا تو بے ہوش ہی رہا۔ البتہ صبح عید کی نماز [illegible] بے ہوش ہو جایا

کرتا تھا۔ اور اسی نیم بیہوشی کے عالم میں چند الفاظ (نماز، عید، غسل) دھندلاتے ہوئے کھوپڑی کے گوشوں میں لمحہ بھر کے لیے اِدھر مچاتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میں سمندر میں ڈبکیاں لگا رہا ہوں۔ کبھی گہرائی میں اور کبھی سطح آب پر۔ پھر محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ کیا غسل نہیں کرنا ہے؟ کیا نماز کو نہیں جانا ہے؟ نماز! ... اوہ! نماز! اچھا! آج عید ہے ---! پھر میں اُچھل کر سیدھے غسل خانے میں پہنچ گیا۔ وہیں سے وقت پوچھا تو جواب ملا آپ کی گھڑی کہاں ہے؟

اب میں پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ کہا گھڑی مرمت کو دی ہے۔ پڑوسن سے وقت پوچھو۔ معلوم ہوا صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اب تو پورا غسل ناممکن تھا۔ خیر خدا تو دل کی طہارت کو دیکھتا ہے۔ جو وہ ایک منٹ بچا کر بجلا وہ پاجامے کے ازار بند کی نذر ہو گیا۔ مجبوراً اسے تہہ بند کی طرح باندھتے ہوئے قمیص پہنی اور بٹن لگاتا ہوا کاندھے پر تولیہ ڈالے دوڑ پڑا۔

نماز تو مل گئی مگر مجھے شک ہے کہ میری نماز ہوئی ہو گی۔ پتہ نہیں یہ عید، بقر عید کی نماز عام نماز دل سے مختلف کیوں ہوتی ہے۔ ایسی افراتفری دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی کھڑا ہے کوئی رکوع میں اور کوئی سجدے میں گر رہا ہے۔ اکثر کن انکھیوں سے دیکھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ میری حالت کچھ مختلف نہیں تھی۔ پہلی رکعت کی ناشس غلطی کے بعد میں چوکنا ہو گیا تھا۔ مگر دوسری رکعت کی بھول پر میرے پسینے آ گئے اور دُعا کے بعد دائیں بائیں دیکھے بغیر جلدی سے اُٹھ گیا۔

واپسی پر دیکھا کہ راجو کی دُکان پر ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ مجھے بھی حجامت اور داڑھی کا خیال آ گیا۔ کسی نہ کسی صورت سے راجو تک پہنچ گیا۔ اس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا یہ اصول تم نے کب سے بنا لیا ہے کہ تہوار کے موقعوں پر ایک دو روز دکان بند رکھو گے اور عین تہوار کے دن چالو کر دو گے؟ قینچی کی کھچ کھچ کے درمیان مسکراتے ہوئے اُس نے جواب دیا کہ صاحب! ایسے موقعوں پر حجامت تو گھر پر ہی ہو جاتی ہے۔ تہوار کے دن تو ہم صرف فائنل ٹچ دیتے ہیں اور اس کی اچھی ٹپ اور تہواری بھی مل جاتی ہے!

پھر میں نے اپنا مُدعا ظاہر کیا۔ اُس نے کہا لائن میں آ جائیے، بنا دوں گا۔ یہ لوگ پہلے آئے ہیں، پہلے ان کا کام ختم ہو جائے۔ میں نے لائن پر جو نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ میرا نمبر آتے آتے حشر ہو جائے گا۔ میں نے کہا "راجو میں تمہارا پرانا گاہک ہوں۔ دُنیا کا کونہ کونہ گھوما پھرا ہوں، مگر حجامت بنوانے ہمیشہ یہیں آیا!"

مگر اُس نے کہا صاحب! بے لائن بناؤں گا تو یہ ہجوم میری حجامت کر دے گا! زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ اب تو عمل سے پہلے ہی نیت معلوم ہو جاتی ہے! مجھے افسوس ہے!

جمہوری طرز پر لاحول پڑھتے ہوئے میں فٹ پاتھ کے ایک حجام کے سامنے جا بیٹھا جو چھتری کھولے اینٹ پر بیٹھا تھا۔ چھتری اس نے مجھے تھما دی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اقبال کا یہ مصرع

"بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

گنگنا رہا تھا کہ جمہوری نظام کی خامیاں گن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کب انسان اندر اور باہر کی ضروریات سے ہوگا، کب تک انسان کو اپنے پیر کے لیے چمار اور اپنے سر کے لیے حجام کے پاس جانا ہوگا؟ اور ... کیا ہم خدا بخشی کے لیے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں ---؟

چھوڑو ان باتوں میں کیا رکھا ہے . . . ! آخر کا جملہ آواز کے ساتھ نکل گیا اور میرے حجام نے کہا "ہاں بابو! بس ایک منٹ اور۔

مگر نہ جانے شدید غصّہ میں اُس وقت کیوں کر مجھ پر ضبط و تحمل کا غلبہ ہوگیا۔ شاید اس لیے کہ اگر میں حجام کو لاکھ جوتے بھی مارتا تو وہ میرے گھٹے ہوئے سر اور کلین شیو گال پر ایک بال بھی فطری طور پر چپکا نہیں سکتا تھا۔ کم بخت نے سرے ہی سے سر اور گال کا صفایا کر دیا تھا۔ میری روہانسی سرزنش پر اتنا ہی کہا "بابو! فٹ پاتھ پر تو ایسی ہی حجامت ہوئی ہے! آپ کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے جب کچھ نہ کہا تو میں سمجھا سب صاف کرانے آئے ہیں!

مجھے نیوٹن یاد آگیا جو اپنے کتے ڈائمنڈ سے کہہ رہا تھا "ڈائمنڈ! ڈائمنڈ! تم نہیں جانتے تم نے کیا کردیا ہے!" خیر جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب سوال درپیش تھا کہ کیا منہ لیکر گھر جایا جائے۔ ساری دنیا بے حقیقت معلوم ہو رہی تھی۔ کیا ہی اچھے وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا چھوڑ جنگل کی راہ لی ہے! میں یہ دُنیا چھوڑ سکتا تھا اور نہ . . . . ! کاش مایا موہ زندگی سے بیزار سپاہی کی طرح میدانِ جنگ جاتی اور جہنم رسید ہو جاتی ــــ !!

خوش قسمتی سے راہ داری میں کوئی نظر نہیں آیا اور میں چپکے سے اپنے کمرے میں گھس کر بستر پر دراز ہوگیا۔ بازو کے کمرے سے بہت سی نسوانی آوازیں آرہی تھیں "شام ہونے کو ہے، اب تک تمہارے وہ نہیں آئے؟" "مدت بعد وطن کو لوٹے ہیں۔ عید کا دن ہے۔ راستے میں دوست احباب مل گئے ہوں گے!" اور یہ کیا! کیا وہ کسی کے مرید ہوگئے ہیں ــــ اتنی لمبی زلفیں اور اتنی بڑی داڑھیاں . . . . . !!"

یہ سنتے سنتے میری آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے کب تک سوتا رہا۔ پھر اچانک ایک فلک شگاف چیخ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میرے سر پہ نرم گرم ہتھیلیاں پھرنے لگیں۔ تمام واقعات چشم زدن میں یاد آگئے۔ دنیا اندھیر ہوگئی۔ نہایت بے نیازی سے میں نے ان نازک ہتھیلیوں کو پرے ہٹایا اور اُٹھ کر گوتم بدھ کے پوز میں بیٹھ گیا

"ہائے! یہ کیا کرلیا آپ نے! کیا اچھی صورت تھی! کیا اچھی صورت تھی!"

میں نے اک شانِ بے نیازی سے غالب کا شعر پڑھا ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

اس کا مطلب پوچھا گیا تو میں نے کہا وہی سمجھ سکتا ہے جو نگہ اور نگاہ کے فرق کو سمجھتا ہو۔ سوال ہوا آخر فرق کیا ہے؟ میں نے کہا وہی فرق ہے جو ہیر کٹنگ اور حجامت میں ہے!!
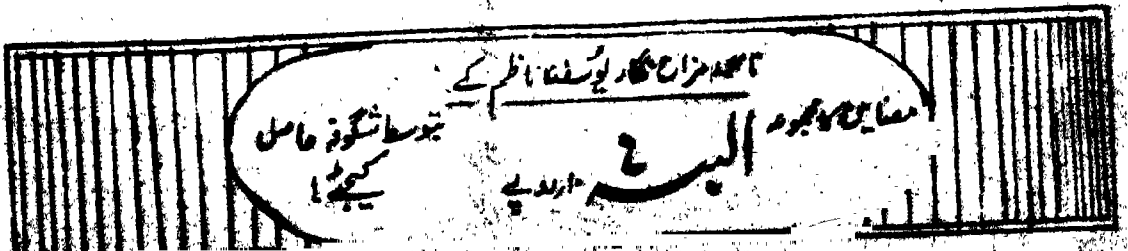
چمچے کی فریاد

ضیاء الرحمٰن اعظمی (اعظم گڑھ)

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ
وہ دفتری بہاریں وہ عیشِ بے کرانہ

آنتوں میں رات دن وہ گنجینۂ "لذائذ"
دفتر میں سال بھر وہ راحت بھرا خزانہ

سرمستیاں کہاں وہ ہائے نیاز کی اب
حاکم کے گھر میں آنا، حاکم کے گھر میں جانا

دفتر میں اب کہاں وہ پہلی سی عیش دستی
معدہ میں اب کہاں وہ پہلا سا آبِ دانہ

حاکم کا قربِ رنگیں جب سے جدا ہوا ہے
نے عشرتِ سحر ہے، نہ لذتِ شبانہ

جب سے الگ ہوئی ہیں چمچہ گری کی رسمیں
آرے سے چل رہے ہیں غم سے مرے نفس میں

جس ساعتِ حزیں سے آقا کا گھر چھٹا ہے
شام و سحر نے اپنا ہر کیف کھو دیا ہے

بے رنگ ہو گئے ہیں قلب و جگر کے نقشے
رخسارِ زندگی کا غازہ اتر گیا ہے

کام و دہن کی نگری ویران ہو گئی ہے
اب ماسوائے کدو معدہ میں کیا دھرا ہے

غم ہائے بیکراں سے بچے بلک رہے ہیں
بیوی کے دل میں گویا خنجر اتر گیا ہے

اک "معرکہ" کی صورت رہتی ہے گھر میں ہر دم
ہمسایہ سارا ہم کو کھڑکی سے دیکھتا ہے

بربادیوں سے ہائے مالک ہمیں بچا لے
دہلیزِ عالیہ سے "پابندیاں" اٹھا لے

خرافات کا ضامن

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

صورت سے تو وہ ملک کا معمار لگے ہے
سیرت ہے مگر ایسی کہ غدار لگے ہے

ملک پہ منسٹر سے بکا کرتا ہے اک بل
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے یہ ہر پل

صوبائی تعصب کی وبا عام کرے ہے
بھارت کو بدیسوں میں بھی بدنام کرے ہے

یہ ذہن کا ہلکا ہے بہت جسم کا بھاری
عیار ہے مکار ہے لگتا ہے مداری

سیلاب کی یورش ہو کہ سوکھے کا زمانہ
گاتا ہے دکھاوے کی یہ خدمت کا ترانہ

گرداب گرانی میں ہے ملت کا سفینا
فاقے پہ ہو فاقہ تو روا کہ ہر کا پینا

ہر ہاتھ کو اب کام ملے دیتا ہے نعرہ
سالانہ بجٹ میں یہ دکھاتا ہے خسارہ

تخریب کا منصوبہ بتاتا ہے صبح و شام
دولت کے لئے راز وطن کر دیتا ہے نیلام

کرسی و وزارت کا طلب گار بہت ہے
دل بدلو کہا کرتا ہے مکار بہت ہے

ہے بھیس میں انسان کے حیوان سراسر
کرتوت میں شیطان ہے شیطان سراسر

ہر طرزِ عمل اس کا مفادات کا ضامن
موجودہ سیاست میں خرافات کا ضامن

صابر بہاری کراچی

منظوم لطیفہ

واقعہ اک آدمی کا عرض کرتا ہوں جناب — عقلمندی میں نہیں رکھتے تھے جو اپنا جواب
ایک دن اک چور انکے گھر میں جب داخل ہوا — کم نصیبی سے رنگے ہاتھوں ہی وہ پکڑا گیا
عقل کے ٹھیکیدار نے پکڑی کلائی زور سے — اور لے کر چور کو وہ جانب تھانہ چلے
راستے میں چور بے چارہ ٹھٹھک کر رہ گیا — آپ نے اس سے ٹھٹھکنے کا جو پوچھا ماجرا
چور نے سہمے ہوئے انداز میں ان سے کہا — بندہ پرور آپ سے اتنی ہے میری التجا
جوتے اپنے چھوڑ آیا ہوں میں گھر میں آپکے — لے کے آتا ہوں ابھی جوتے جو مہلت دیجئے

سن کے عاقل نے کیا آزاد اس کو قید سے
اور لا حاصل وہ اس کا راستہ تکتے رہے

بعد مدت چور پھر عاقل کے گھر میں جب گھسا — دام میں اگلی بار بھی قسمت کا مارا پھنس گیا
عقلمند اسکو پکڑ کر کوتوالی لے چلا — راستے میں پھر عمل کر رہ گیا وہ باخطا
عقل والے نے سبب پوچھا تو اس نے یہ کہا — اعلیٰحضرت آپ کے گھر چھٹ گیا مفلر مرا
بس ذرا سی دیر میں آتا ہوں لے کے اسکو ساتھ — مہربانی کیجیے اور چھوڑ دیجیے میرا ہاتھ
سنتے ہی غصے میں بولے چور سے او نابکار — میں کوئی ناداں نہیں جو تجھکو چھوڑوں اب کی بار

میں تجھے جانے نہ دونگا اس جگہ سے اپنے گھر
لے کے آتا ہوں میں خود مفلر ترا اس جا ٹھہر

○

غلام سکین ادیب سندیلوی

غزل

وصل کی شب صرف ان سے گفتگو کرتے رہے — صبح تک صد حیف خون آرزو کرتے رہے
کوئی کیسے یاد رکھے تجھ کو اے پردہ نشیں — حسن کی شہرت تری ہم چارسو کرتے رہے
لوگ پیرس اور لندن کی ہوا کھاتے رہے — ہم طواف خطۂ گوپامئو کرتے رہے
انڈین تھے انڈین ہی ہر جگہ کہلائے ہم — عمر بھر ٹائی مگر زیب گلو کرتے رہے
بچ گئے رحمت سے چیلے امتحاں کے روز بھی — چوری چوری ہر کوئسچن حل گرو کرتے رہے
کیا سبب ہے دیدی جو جھک جائے دماغ — مستقل ہر لنگ ہم مغز کدو کرتے رہے
سند تو سب میکدے میں مات بھر پھر آ گئے — شیخ جی مسجد میں یکی ناز وضو کرتے رہے

○

ڈاکٹر سید حامد حسین

(بھوپال)

تخلص بھوپالی

[ایڈیو فیچر]

نسوانی آواز :- خالہ خالہ۔ دیکھو وہ تمہارا بیٹا ننھے کب سے تمہیں بلائے جا رہا ہے۔

خالہ :- جھاڑو پھری ایک جان اور سو لونچنے والے۔ کیوں رے کیا ہے ؟

راوی :- پہچان گئے ہوں گے نا آپ ؟ یہ ہیں خالہ۔ تخلص بھوپالی کی پاندان والی خالہ۔ اس وقت یہ اپنے نواسے کے عقیقے کی دوڑ بھاگ میں لگی ہیں۔ آیئے دیکھیں یہ کیا گل کھلاتی ہیں ؟

ننھے :- اماں نام کیا رکھا جائے گا لڑکے کا ؟

خالہ :- وہ لڑکے کا باپ اور غفور دادا کیا مر گئے ان سے پوچھ کیا نام رکھیں۔

ننھے :- اماں غفور دادا تو کہہ رہے ہیں کہ محمود خاں رکھ دو

خالہ :- اے چل ہٹ۔ غفور دادا کی تو بڑھاپے میں عقل ماری گئی ہے۔ [illegible] کا گنوار ہو گر نام تو ڈھنگ کا رکھے جیتا۔ کل کو لڑکا جوان ہوگا تو کیا کہہ کر میرے بالا پے کو محمود خاں۔ [illegible] خاں بنے تھے نام رکھنے کے لیے۔

ننھے :- اچھا اماں آپ ہی کا بتا دو ڈھنگ کا۔ وہ غفور دادا پھری [illegible] سوار ہیں۔

خالہ :- اے خدا آخر ایک گھنٹہ پہلے سے بے چارے بے منہ کے جانور پہ سوار ہونے کی کیا بھاگن مچی تھی۔ جب ہی تو میں کہوں یہ بکرا کیوں بھیں بھیں کر رہا ہے۔ ارے وہ ہمارے نگوڑے ہمارے داماد کو بھی تو بلاؤ۔ وہ کہاں مر گئے عین وقت پہ۔

ننھے :- (سرگوشی میں) ارے اماں چپ رہو۔ وہ بھی یہیں کھڑے ہیں پاس میں۔

خالہ :- اچھا ہاں بھیا دلدار تم لڑکے کے باپ ہو تم بھی تو کچھ نام بتاؤ۔

ننھے :- اماں غفور دادا کہہ رہے ہیں جب باپ کا نام دلدار خاں ہے تو لڑکے کا نام جگردار خاں رکھ دو۔ یکجا اللہ ہو گئے دونوں نام۔

خالہ :- کہیں جھاڑو مارا جگر، کلیجی، بھیپھڑا بھی کوئی نام ہوتا ہے۔ نام کیا ہوا آگ لگے قصائی کی دکان ہو گئی...

راوی :- تو یہ ہیں پاندان والی خالہ۔ بھلے ہی عمر گریز دراز ہے۔ [illegible] کی [illegible] مگر ماشاء اللہ دماغ روشن ہے۔ وضع کی پکی اور مروت کی پتلی۔ بات بات پر تنک جانا مزاج میں ہے۔ زبان میں بھوپال چادر کا چٹخارہ کبھی چھپکا اور کبھی تیکھا۔

بانٹی :۔ خالہ کا یہ کردار تخلص بھوپالی کی خلاقانہ فنکاری کا شاہکار ہے جو دوسرے مزاحیہ کرداروں سے کئی لحاظ سے مختلف و ممتاز ہے۔ خالہ میں نہ تو امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کی مجہولیت ہے، نہ نذیر احمد کے ظاہر دار بیگ کی طرح لیسی کی جھٹ، بناوٹ اور نہ شکسپیر کے عقلمند مسخروں کی طرح حکمت و فراست کے ساتھ چھیڑ چھاڑ۔ خالہ کا کردار اگر ایک طرف دھیرے دھیرے ماضی کے دھندلکوں میں سمٹتے سماج کا ایک عکس ہے تو دوسری طرف وہ عہد حاضر کی سیاسی و سماجی کشمکش میں پھنسی عوامی زندگی کا ایک نقش بھی ہے اور پھر تخلص صاحب نے اسے اپنی مزاح نگاری کا بھی وسیلہ بنایا ہے۔ دیکھئے خالہ اپنی شادی کے بعد ساڑی پہن کر سینما میں گھومنے کا بیان کس طرح کر رہی ہیں۔

خالہ :— ایک تو میاں کھا کھا کے برقعہ اُتروا دیا اور اوپر سے ایک ریشمی ساڑی پہنوا دی۔ اے میری حالت دیکھنے کی تھی۔ اللہ توبہ ہے میری۔ ساڑی پہننے کو تو پہن لی مگر پاؤں کہیں رکھتی تھی جاتا کہیں تھا۔ ہر دم یہ خیال کہ یہ ساڑھی کھلی اور میں مادر زاد ننگی ہوئی۔ بغیر رومالی کا لباس، اللہ بچائے۔ ذرا ہوا زور سے چلتی تو بس پھر اُڑ اُڑ کے گھٹنوں تک آجاتی تھی اور میں جھٹ سے ننگی ٹانگوں کو چھپانے کے لیے دوہری ہو ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اللہ لے توبہ۔ ساڑھی کو نیچے کر رہی تھی کہ ایک اندھا موا بے شرم مجھ سے جا ٹکرایا۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی، نہیں تو چاروں خانے گر جاتی۔

راوی :— اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ خالہ اپنے بیٹے مظفر کے لیے دُلہن کی تلاش میں ہیں نصیبن ایک پیغام لائی ہے۔

خالہ :۔ اچھا بائی اور بھی تو کچھ بتا۔ ناک نقشہ، رنگ روپ؟

نصیبن :— نہ گوری، نہ کالی۔

خالہ :— اچھا قد؟

نصیبن :— نہ ٹھگنی، نہ بانس کی طرح لمبی۔

خالہ :— لکھی پڑھی کتنی ہے اچھا۔

نصیبن :۔ نہ جاہل ہے بالکل، نہ لکھی پڑھی ہے۔

خالہ :— اوئی بٹیا۔ تو پھر نگوڑ ماری ہے کیا۔ جاہل بھی نہیں، لکھی پڑھی بھی نہیں۔ اللہ رحم کرے۔ بجھ بے نصیبن

نصیبن :— تو یہ ہے خالہ میرے منہ سے غلطی میں نکل گیا تھا خوب لکھی پڑھی ہے۔

خالہ :— صاف بتا بائی۔ اتنی پڑھی لکھی تو ہے کہ نئے پرانے پیسوں کا حساب لگا لیتی ہے۔

نصیبن :— ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اللہ رکھے حساب کتاب میں فرسٹ رکھی ہے۔

خالہ :— اچھا پہناوا کیا ہے اس کا۔

نصیبن :— بس یہی دوپٹہ، تنگ پائنچوں کا پاجامہ، گھٹنوں تک کا ترکی کرتا اور دوپٹہ تو ایسا اوڑھتی ہے سر پے کہ صبح سے شام تک پاس بیٹھے رہو مگر مجال کیا کہ ایک بال تو نظر آجائے گا سر کا۔

خالہ :۔ اے تو کیا گنجی کبوتری ہے آگ لگی۔

نصیبن :— لو بھوئی اتنا شرم کے مارے سر ڈھانکے رہے تو گنجی ہو گئی۔ ارے خالہ تم سے جیتنا مشکل ہے۔ چت بھی میری پٹ بھی میری۔

خالہ :۔ نہیں نصیبن یہ بات نہیں۔ شادی ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے۔ شروع میں خوب ٹھونک بجا کے دیکھ لینا چاہیئے۔ خیر روزہ نماز بھی جانتی ہے یا اللہ رسول کے نام پے کوری ہے۔

نصیبن :— بس خالہ دن ہے اور رات ہے جانماز پے اوندھی پڑی رہتی ہے بڑی نمازن ہے۔

خالہ :— پھر گھر کا کام کون کرتا ہوگا نصیبن۔ جب دن رات روزہ نماز میں رہتی ہے تو کھانا پکانا تو شاید ہی جانتی ہو۔

نصیبن :— یہ مت کہو خالہ کھانا تو سو آدمیوں کا چٹکی بجاتے پکا دیتی ہے۔ کبھی جا کے اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤ تو انگلیاں چاٹ لوگی۔

خالہ : ۔ اچھا نانات کیا ہے لڑکی کے باپ کی۔
نسیبن : ۔ ذات کا نہ پوچھو۔ ایسی ذات کا ہونا مشکل ہے لڑکی کے پردادا اللہ بخشے واجد علی شاہ کے باورچی خانے کے مہتمم تھے۔
خالہ : ۔ بس باقی معلوم ہوگئی ذات بھی۔ بھٹیارن ہے لڑکی۔ نا بیوی۔ میں نے کہنیوں سے ہاتھ جوڑے ایسے رشتے سے۔ اپنے خاندان میں کھوٹ نہیں لگوانے کی ۔
نسیبن : ۔ خالہ دو ڈھتے دو ڈھتے اب تو پیر بھی پٹیا پڑ رہ گئے۔ تم نے تو سال بھر سے وہ مراق پھیلایا ہے کہ اللہ تو یہ حسن لڑکی کی بات لے کے آؤ بس سنا اور کوئی نہ کوئی عیب نکالا لڑکی میں، بغیر دیکھے ہی۔ حد ہے تم سے بھی تمہیں

خالہ ـــــ
راوی : ۔ جی ہاں حد ہی ہے خالہ سے۔ لیکن خالہ کو صرف کٹ حجتی ہی نہیں آتی۔ انھیں بھلے برے کی اور حق ناحق کی بھی تمیز ہے۔ وہ نند بھاوج کے جھگڑے میں بے وجہ کی تکرار پر اپنی بچی کو بھی ڈانٹ سکتی ہیں۔ مزار پرستی کی بھی اپنے انداز میں مخالفت کرسکتی ہیں۔ اور فیشن پرستی کی بھی۔ وہ جہاں کھانے پینے کے سامان میں ملاوٹ پر کھل کر چوٹ کرتی ہیں وہیں سیاست میں بدعنوانیوں پر بھرپور طنز کرتی ہیں۔ سنئے فسادات پر خالہ کس انداز سے تبصرہ کر رہی ہیں۔
خالہ : ۔ یہ تو بیوی غنڈوں کو شہ ملتی ہے تب لڑتے ہیں۔ ہندو مسلمان بے چارے بے فضول کو بدنام ہیں۔ کس کے پاس لڑنے کی فرصت ہے کہ اپنا کام دھام چھوڑ بس ہر کسی بات کا جھگڑا بنانے کے لڑتا پھرے۔ انسان کیا جانور ہوگئے نرے بھانڈ پھرے۔ اس سے تو وہ کانجی ہاؤس کے جانور عمدہ جیسیں سالوں ذاتوں کے بے منہ جانور بند رہتے ہیں مگر مجال تو ہے کہ کسی کے کوئی سینگ تو مار دیں۔ ہم تو بیوی جانوروں سے بھی گئے بیتے ہیں۔

راوی : ۔ پاندان والی خالہ "بھوپال پنچ" کی پیداوار ہیں۔ تخلص صاحب نے یہ ہفت روزہ جنوری ۱۹۶۰ء میں نکالا تھا۔ جو تقریباً پورے تین سال نومبر ۱۹۶۲ء تک چلا۔ اس اخبار میں جہاں تخلص صاحب نے عصری مسائل اور موضوعات پر تیکھے تبصرے اور لطیف پیرائے میں مضامین شائع کیے ہیں وہیں انہوں نے پاندان والی خالہ، غفور دادا، بفاتی، شبراتی تھے اور زینب جیسے دلچسپ اور نمائندہ کرداروں سے متعارف کرایا ہے اور ان کے وسیلے سے بھوپال کی سماجی و تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقش گری کی ہے۔ آیئے غفور دادا سے بھی ملتے چلیں۔ دادا اپنے کرایہ دار شبراتی سے ایک گز کپڑا بازار سے منگوا رہے ہیں۔
دادا : ۔ ہاں بیٹا یہ لے ایک روپیہ لے کر ذرا مضبوط دیکھ کے لانا۔ آج کل کلف چڑھے لٹھے آ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ دھونے میں ململ کی طرح نکل آتا ہے۔ اندھیر مچی ہے خاں، انسان بھوکوں مر رہا ہے۔ ان مل والوں کو کلف کے لیے چاول کہاں سے مل جاتے ہیں یار؟ رام پرشاد بزاز کے یہاں سے لانا۔ دیکھی ہے نا دوکان؟
شبراتی : ۔ ہاں ہاں دادا۔
دادا : ۔ ہاں وہی جو بیچ چوک میں علی بھائی لنگڑے نداف فروش کی دوکان کے سامنے ہے۔ یہ علی بھائی بھی خاں اندھا دھند نفع لیتا ہے۔ بس ایک رات جڑی بوٹی لینے جنگل گیا تو ایک ریچھ جھوم گیا سالے سے۔ ٹانگ چبا ڈالی۔ بہت علاج کیا۔ مگر آخر کو ٹانگ کٹوانا پڑی۔ ارے خاں اپنے پاس آجاتا شبراتی۔ تو وہ ایک جوڑ جڑی دیتا کہ مدمقابل پچھے میں ایسا معلوم ہوتا کہ ٹانگ ٹوٹی ہی نہیں جیسے۔
شبراتی : ۔ دادا مجھے جانا ہے جلدی روپیہ نکالو۔
دادا : ۔ ہاں تو بس اس کی دو چھنکی دوکان میں ایک پسا سا میلی کچیلی پگڑی باندھے بیٹھا ہوگا۔ [illegible]

اللہ نے دیا ہے۔ مگر سال کے سال پگڑی دُھلواتا ہے۔ روز شام کو دُکان بند کر کے دو آنے کی بچی کچی سستی سبزی خرید کر گھر لے جاتا ہے۔ لیں جُڑتا ہے خاں پیسہ۔ یہ اپن میاں بھائیوں کی طرح تھوڑی ہیں جو کھایا پیا اور پیچھے ہاتھ پونچھے اور چل میرے بھائی جو دے گا تن کو وہی دے گا کفن بھی

شبراتی :- دادا روپیہ دے دو، ورنہ آج مزدوری بھی جائے گی۔

دادا :- ارے یار شبراتی، سمجھ تو لے بیٹا ذرا۔ بس دیکھ اسی سامنے والی سڑک سے نکل جانا۔ جلدی پہنچ جائے گا۔ وہ کوتوالی کے پاس سے۔ پہلے تو خاں اس بلڈنگ میں بڑا اسپتال تھا۔ ڈاکٹر سہراب جی بڑا مانا ہوا ڈاکٹر تھا۔ کتنا ہی بڑا مرض ہو بس دو خوراک میں غائب۔

راوی :- چھوڑیئے دادا کو تو یہیں۔ وہ تو بات کو ایسا طول دیتے ہیں کہ سُننے والے کا قدا ہی ملالگ۔ گپ چھوڑنے میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں۔ سنیے تو ایٹم بم کے بارے میں یہ کیا ہانک رہے ہیں۔

دادا :- ارے خاں جاؤ میاں۔ امریکہ والا کا ذکر کیا بنائے ایٹم بم۔ شاہجہاں بیگم کے زمانے میں جماّ خاں آتش باز تھا۔ سرکار کی سالگرہ پر ہر سال ایک ایٹم بم بنا کے اس لال پریڈ کے میدان میں چھوڑا کرتا تھا۔ بڑے بڑے طرم باز خاں کانوں میں روئی کے پھنّے گھسیڑ کے اور سارنی پہ کنٹوپ چڑھا کے بم کی آواز سنا کرتے تھے۔ چرند پرند بھٹا بھٹ گر پڑتے تھے۔ تالاب کی مچھلیں قسم پیدا کرنے والے کی اوپر آجاتی تھیں۔ ایک مرتبہ لاٹ صاحب کی خوشی میں جماّ استاد نے ایسا کرا بم بنا کے چھوڑا تھا کہ لاٹ صاحب غش کھا کے کرسی سے نیچے جا پڑے تھے اور جب ہوش آیا اور آسمان کی طرف [illegible] سے انگریزی میں لکھا ہوا تھا "لاٹ صاحب مبارک"۔ انھیں قدموں لاٹ صاحب کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے اور جماّ استاد کو گود میں اُٹھا لیا تھا۔ یا وہ ایک مرتبہ کوئی مسلمان بادشاہ آیا تو جماّ خاں نے ایسا اسلامی بم بنایا تھا کہ پورے آسمان پر نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، میرے مولا بلا لو مدینے مجھے اور جان بیٹا خلافت پہ دے دو لکھا ہوا تھا۔ رات بھر لوگوں نے پڑھا تھا۔

راوی :- تخلص صاحب نے خضر دادا اور پاندان والی خالہ کی طرح افسانوی کرداروں کو ہی تخلیق نہیں کیا انہوں نے جیتے جاگتے کرداروں کے بھی بڑے حسین اور پُرلطف خاکے تیار کیے ہیں جو بعد میں "پوسٹ مارٹم رپورٹ" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ آپ بھی تخلص صاحب کی پورٹریٹ گیلری کی ذرا سیر کیجیے۔ یہ ہیں حضرت شعری بھوپالی۔

راوی :- شعری محفل میں رونق بنے رہتے ہیں۔ ہنس ہنس کر کلام سُناتے ہیں اور ناف سے اوپر کے تمام اعضا کو متحرک کرتے ہوئے مصرعۂ اولیٰ پورا اور مصرعۂ ثانی کو تصنیف سے زیادہ پڑھ کر ایک دم بریک لگا دیتے ہیں اور خاموش ہو کر سامعین کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ سامعین بھی مطلب سمجھ کر فی الفور علمِ قیافہ کی مدد سے شعر پورا کر دیتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے شعری دوسرے شعر پر۔

راوی :- آئیے اب بھوپال کی معروف شخصیت مجتبیٰ خاں صاحب سے ملیں۔

راوی :- مجتبیٰ خاں سادہ غذائی انسان ہیں۔ بکری کا گوشت، بالائی، سبزی، دال اُن کی دل پسند غذائیں ہیں۔ موصوف کو کبھی کھانا کھاتے پکڑ لو تو دیکھتے ہی ایسے سوال کرنے لگتے ہیں کہ جس میں دعوتِ طعام کم اور رنج بیشتر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کیوں خاں کھانا تو کھا کر آئے ہو گے۔ آج تم نے کتنے [illegible] ذرا کھانا کی [illegible] بات کرتا [illegible] کے آئی ہیں [illegible]

مزید گھومیں گے لیکن کھانا کھانے سے متعلق کوئی بات نہیں لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے برکت دے رکھی ہے۔

راوی :۔ اب چلتے چلتے نادم سیتاپوری سے بھی تعارف حاصل کر لیجئے۔

راوی :۔ گھر پر رہ کر زندگی گزارنے کو مجلسی آداب کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس زندگی سے بیزاری کی حد تک دلچسپی ہے۔ گھر میں کم اور باہر زیادہ۔ گھر میں آئے کرسی پر بیٹھے۔ نصف اکڑوں بیٹھ کر اس قدر مودب لگتے ہیں کہ جیسے کلام پاک کا قلمی نسخہ تحریر فرما رہے ہیں۔ گھر میں نہایت گشدگی کی حالت میں رہتے ہیں۔ بارہا چور مکان کو سونا سمجھ کر آئے اور فی الوقت آپ کو دیکھ کر بغیر معذرت کئے الٹے پاؤں بھاگ گئے ہیں۔

راوی :۔ یہ بات نہیں ہے کہ تخلص صاحب کی مہارت صرف کرداروں کو پہچاننے اور اُن کے گڑھنے میں ہے۔ اُنھوں نے کئی طنزیہ مضامین اور دلچسپ انشائیے بھی تحریر کئے ہیں جن میں سے چند اُن کے مجموعے "شیطان جاگ اُٹھا" میں شامل ہیں۔ خود مضمون "شیطان جاگ اٹھا" میں خدا کے حضور شیطان کی اس درخواست کی تلخی کو محسوس کئے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

راوی :۔ اے خدا اس سے پہلے کہ انسان مجھے گمراہ کردے مجھے جلد سے جلد جنت میں بلالے کیونکہ دو لاکھ سال پہلے انسان کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا تھا۔ لیکن اب آج وہ نہیں جس کو سجدہ نہ کرنے کا میں نے عزم کیا تھا۔

راوی :۔ اور یہ ملاحظہ فرمائیے ایک حاجی صاحب کس طرح کسی میونسپل بورڈ کا اپنا نقش سلیمانی پیش کر رہے ہیں

راوی :۔ دس سال تک ڈاکٹر صاحب گھر گھر پانی میں گھوما رہا ہوں۔ پھر دس سال تک بیابان جنگل میں شعبوں کی شاخوں پر آنکھ لٹکا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے عمر بھر

پولس والوں نے خودکشی کے جرم میں عدالت مجاز سے تین تین ماہ کی سزا دلوائی تھی۔ یہ دیکھئے جیل کا ڈسچارج سرٹیفکیٹ۔ یہی نہیں بلکہ پورے چالیس سال بغیر نمک مرچ کا کھانا کھایا۔ ایک نیک بخت بیوی بھی اللہ نے دی تھی۔ مگر صاحب آخر عورت ذات تھی کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی۔ بالآخر ایک دن میری شب و روز کی مصروفیات کی تاب نہ لاکر اپنے گھر جا کر بیٹھ گئی اور طلاق حاصل کرلی۔ یہ دیکھئے دارالقضا کا سرٹیفکیٹ گمشدگی۔

راوی :۔ اپنے مضامین میں تخلص صاحب نے طنزیہ اور مزاحیہ تاثر حاصل کرنے کی غرض سے رنگا رنگ اسالیب کا استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ ایک خط میں جو کسی حاجی کو لکھا گیا ہے، یوں مخاطب ہیں :۔

راوی :۔ میں نے اپنے ایک ایڈیٹر دوست کو پابند کردیا ہے کہ وہ بندرگاہ پر پہنچ کر تمہاری سال سنبھال کر لے۔ یوں تم بھی بمقام جدہ جہاز پر سوار ہوتے وقت آیتہ الکرسی اور دیگر مجرب وظیفے برائے دفعیہ کسٹمی بلیات پڑھتے ہوئے آنا۔ انشاء اللہ ان تبرکات کی برکت سے کسٹم والوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جائیں گے۔ ویسے اللہ اپنے نیک بندوں کی حفاظت پر چوبیس گھنٹے مامور رہتا ہے۔ البتہ ریل میں بیٹھنے کے بعد پھر کسی وظیفے وظیفے کی چنداں ضرورت نہیں۔ صرف گرہ کٹوں اور ریل کے چوروں کا خیال رکھنا کیونکہ اُن کے خیال میں اگر کسی حاجی کے تبرکات ہاتھ چڑھ جائیں تو سال بھر تک خیر و برکت رہتی ہے۔

راوی :۔ عبدالاحد خاں تخلص کے اجداد تلوار چلاتے تھے۔ لیکن جب تلوار چلانا متروک ہوا تو ان کے والد نے گولی چلانے کا شریف اجداد پیشہ یعنی پولس کے محکمے میں ملازمت کرلی۔ عبدالاحد خاں نے کچھ عرصہ فوج میں بھرتی ہوکر گولی چلانے کی مشق کی لیکن عمر عزیز کے چالیس سال گنوانے کے بعد انھیں یہ عرفان ہوا کہ انھیں

قلم چلانا چاہیئے۔ پھر جو قلم سنبھالا تو آخر عمر تک نہ چھوڑا۔ وہ خود بتاتے ہیں۔

راوی:۔ میں ۱۹۱۸ء میں نازل ہوا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ تعلیم میں سیاست کا شغل بھی کیا۔ نواب بھوپال کے خلاف تحریک چلائی۔ تعلیم چھوٹی۔ پھر ملٹری میں ایک بڑے عہدے پر فائز رہا۔ اب ٹماٹر پیس کر ممالک غیر کو ایکسپورٹ اور موٹر کے پرزے امپورٹ کرتا ہوں۔

راوی:۔ ۱۹۷۷ء میں جب تخلص صاحب کا انتقال ہوا اس وقت اُن کی چھ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جن میں تین حصے پاندان والی خالہ کے تھے۔ پھر "غفور میاں"، "پوسٹ مارٹم رپورٹ" اور "شیطان جاگ اُٹھا"۔ ان کی ایک سیاسی ڈکشنری بعض رسائل میں بالاقساط چھپ رہی تھی وہ مکمل نہ ہو سکی۔

راوی:۔ تخلص صاحب کا امتیاز اُن کی مزاح نگاری ہے۔ لیکن اُن کی تحریرات اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کا کام بھی کرتی ہیں۔ پاندان والی خالہ اور غفور دادا، ننھے اور شبراتی، زینت اور بقاتی اپنے زمانے کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور ان کا محاورہ ان کی رسمیں اور ان کے اطوار، ان کے شوق اور اُن کی دلچسپیاں، اُن کے دکھ اور اُن کے اندیشے سب سمٹ آئے ہیں۔ آیئے چلتے چلتے خالہ کے پردے کا قصہ اور سن لیں۔

خالہ:۔ تو کہا ہم نے کئے ہیں پردے۔ وہ اللہ بخشے اس آرزو میں ہی مر گئے کہ مجھے ٹھیک طرح سے دیکھ لیں۔ ہاتھ بھر کا گھونگھٹ سینے پر پڑا رہتا تھا چوبیس گھنٹے دو اولادیں بھی اللہ نے دے دی تھیں۔ مگر مجال کیا جو نظروں سے نظریں مل جائیں۔ ہزاروں ہی مرتبہ اس پیٹنا پٹے پر دے پے گالیں کھائیں۔ ایسے تیسے بھی سنا۔ مگر یہ شرم ایسے گلے لگی تھی کہ ہالی گلوچ کھا رہے ہیں مگر کمبخت کے آگے بے پردا نہیں توڑا کبھی۔ ہمارے ماں باپ نے تو شروع سے ہی پردہ کرا دیا تھا۔ اب وہ دیکھو قصہ بتاؤں شادی سے پہلے کا۔ میری جب شادی کی بات اسی ننھے کے باوا سے چل رہی تھی تو ایک دن اُن کا کتا گھر میں گھس آیا۔ اب سب نے چیخنا شروع کیا کہ دولہا کا کتا دلہن کو دیکھنے آیا ہے۔ بس بیوی حق دق رہ گئی سن کے۔ اب جو نظر اُٹھائی تو واقعی موا بڑا مجھے گھور رہے جار ہا تھا یار۔ بس ایسی شرم لگی کہ جھٹ سے منہ پھیر کے بیٹھ گئی اور پسینے میں نہا گئی۔

فرہنگ آصفیہ کا نیا ایڈیشن

نورالعین علی (بمبئی)

جب میں خدا سے ملوں گی...؟

جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہی سنتی آئی ہوں کہ ایک دن خدا کے پاس جانا ہے۔ خدا کو منہ دکھانا ہے۔ بڑا سخت حساب دینا ہوگا۔ چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوگی اُس دن۔

اس عمر مختصر کا کافی لمبا عرصہ اسی سوچ و بچار میں گزر گیا۔ خوف اور دہشت کے مارے بُرا حال تھا کہ اچانک ایک شعر یاد آگیا جس کی رو سے ہر ایک کو کچھ کہنے سننے کا موقع دیا جاتا ہے ؎

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت
مرے کریم بتا دے حساب کر کے مجھے

پتہ نہیں شاعر صاحب داورِ محشر کو حساب کا ایک سوال دے کر صاف چھوٹ گئے۔ یا اپنے اعمال نامہ پر پچھتاتے رہے۔

اسی طرح خدا سے ملنے کا آنکھوں دیکھا حال کئی صاحبان نے بیان فرمایا۔ لیکن اُن میں سب سے زیادہ بااطلاع اطلاعات غالب کے ذریعہ مجھے ملیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ خدا سے ملے تو پہلے تو انہوں نے وہاں کے طریق کار ہی کو غلط ٹھیرایا اور اعتراض کیا کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جب ان کا یہ اعتراض قابل قبول نہیں سمجھا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر حساب دینے سے انکار کیا کہ ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس پر بھی شنوائی نہ ہوئی تو مجبوراً حساب دے دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ فرمائش بھی کر دی کہ ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب نے خدا سے اپنے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد پائی یا نہیں اس کی کوئی اطلاع تادمِ تحریر میرے پاس نہیں پہنچی۔

لیکن اکبر الٰہ آبادی کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے وہ بڑا دل خوش کن ہے۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ

بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

اس خبر کو سن کر میری خوشی کی انتہا نہیں ہے۔ کیوں کہ میرا نامۂ اعمال تو راجیہ بھاشا یعنی مراٹھی میں ہوگا مجھے بھی یقیناً فی الفور نجات مل جائے گی۔

اب جب کہ مجھے حساب کتاب، چیکنگ، آڈٹ وغیرہ کے خدشات سے چھٹکارا مل گیا ہے تو کیوں نہ میں ہی خدا سے کچھ باتیں پوچھوں۔ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد تو خیر مجھے نہیں لینی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اور کچھ باتیں ہیں جن کی داد خدا ہی سے لینی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا سوال نامہ تیار کرلیا ہے۔

جب میں خدا سے ملوں گی تو سب سے پہلی بات تو یہ پوچھوں گی کہ مجھے اتنی خوبصورت ماں کی بیٹی بنا کر کیوں پیدا کیا۔ اگر اسی ماں کی بیٹی بنانا تھا تو ذرا اس لائق صورت شکل بھی دے دیتا۔

میں بچپن میں جب اماں کے ساتھ کسی محفل میں جاتی تو لازمی طور پر خاندان کی کوئی بڑی بوڑھی اماں سے پوچھتیں "اے دلہن۔ تمہاری تو تین لڑکیاں ہیں نا۔۔۔! ایک کو کہاں چھوڑ آئیں؟" اماں بیچاری شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف اشارہ کرکے کہتیں "یہ کیا بیٹھی ہے"۔ بزرگ خاتون حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا کرتیں ان میں سے کوئی تو یہ تک کہہ دیتیں "اے بی یہ تو تمہاری نہ لگے ہے"۔

اب آپ ہی بتائیے ہے نا اللہ میاں سے پوچھنے کی بات!

اور سنیئے۔ زندگی کا وہ دور جو "جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن" کہلاتا ہے اور جس زمانے میں میری ساری سہیلیاں رنگ برنگے سپنے بننے میں لگی رہتی تھیں، میں آدھی آدھی رات تک کتابوں پر جھکی، آنے والے امتحان میں اچھے نمبر لینے اور کلاس میں فرسٹ آنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ آخر وہ دن آگیا کہ "دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے" یعنی یکے بعد دیگرے کئی ڈگریاں مجھے مل گئیں۔ ان ڈگریوں کے بدلے آنکھوں پر یہ موٹا سا چشمہ اور سر میں سفید بال ملے۔ پھر بھی میں خوش تھی کہ اب میں بھی کچھ ہوں۔ کم سے کم میرے پڑھے لکھے ہونے کا رعب تو لوگوں پر پڑیگا۔

اس خیال میں مگن زندگی کے کچھ ہی دن چین سے گزار پائی تھی کہ پھر ایک شاک سا لگا۔ ہوا یوں کہ ہمارے شہر میں ایک اچھی سی انگلش فلم لگی۔ ہم تینوں بہنوں نے پروگرام بنایا کہ فلم دیکھی جائے۔ میری دونوں بہنیں تو شام کے ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکلیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر شان سے تھیٹر پہنچ گئیں۔ میں دن بھر کوڑھ مغز شاگردوں سے دماغ پچی کرنے کے بعد شام کو ساڑھے پانچ بجے تھکی ہاری کالج سے نکلی۔ دیر تک آٹو رکشا کا انتظار کیا۔ بس میں لوگوں کے دھکے کھاتی اور کچھ راستہ پیدل چل کر گرتی پڑتی تھیٹر پہنچی۔ بڑی بہن نے دور ہی سے ہانک لگائی "کہاں رہ گئیں تھیں؟ ہم تو سمجھے تم نہیں آرہی ہو اس لیے ہم صرف اپنے ٹکٹ لیے ہیں۔ اب تم جاکر اپنا ٹکٹ لے آؤ"۔ خیر صاحب جلتی بھنتی ٹکٹ کی کھڑکی پر پہنچی۔ ایک ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ دینے والے کلرک نے کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے دیکھا اور بولا "بائی انگلش کھیل ہے تم کو نئی سمجھیں گا۔ کائے کو پیسہ کھوٹا کرتا ہے۔ بازو کے تھیٹر میں جاؤ۔ اچھا کھیل ہے تمہارے لائک۔ ستی انسویا"۔

اب اگر میں گھر آکر اپنی ڈگریاں پھاڑنے کو تیار ہوگئی تو لوگ مجھے کریک کیوں کہتے ہیں۔ میں خدا سے ضرور پوچھوں گی۔

اور پھر ایک دن یہ بھی ہوا کہ صبح نو بارہ کی چرچ گیٹ جانے والی فاسٹ لوکل پکڑنے جب میں باندرہ کے پلیٹ فارم نمبر پانچ پر پہنچی تو بے تحاشا رش تھا۔ میں نے سوچا کہ اس طوفان بے تمیزی میں اگر چشمہ گر کر ٹوٹ گیا تو میں تو محتاج ہو جاؤں گی۔ اس لیے ٹرین آنے سے پہلے چشمہ اتار کر پرس میں رکھ لیا۔ ٹرین آئی۔ میں عورتوں کو ٹھیلتی دھکیلتی، خود ان کے دھکے کھاتی ٹرین میں چڑھ ہی گئی ــــ ابھی اطمینان سے کھڑی بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک عورت نے پوچھا "کیا بجا ہے؟" یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ یہ موٹا سا چشمہ میری ڈگریوں کی دین ہے اور بغیر چشمے کے میں اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی ــــ چنانچہ میں نے اپنا گھڑی والا ہاتھ اس عورت کے سامنے کر دیا اور کہا کہ "تم خود ٹائم دیکھ لو" اس نے ٹائم دیکھا یا نہیں یہ تو خدا ہی جانے ــــ میں نے تو بس اتنا سُنا کہ وہ اپنے پاس کھڑی دوسری عورت سے کہہ رہی تھی "پڑھے لکھوں کا کمال دیکھا تم نے ان لوگوں کو ٹائم دیکھنا تک نہیں آتا وہ بھی ہاتھ پر سونے کی گھڑی باندھے پھرتے ہیں"۔ اب اگر میں نے اپنی سونے کی گھڑی اتار کر اس عورت کے منہ پر دے ماری تو اس میں میرا کیا قصور ہے!

میں ضرور اللہ میاں سے پوچھوں گی۔

اور سنیئے۔ ہمارے شہر میں جب تعلیم بالغاں کی مہم شروع ہوئی تو دور دور سے سوشل ورکرس آئے ہوئے تھے۔ اس دن میں نہ جانے کس خیال میں گم، آس پاس کی دنیا سے بے نیاز، سہج سہج چلی جا رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی ــــ "بہن جی! ذرا بات سنیئے" میں نے ٹھٹھک کر مڑ کر دیکھا۔ ایک بہت ہی چالاک و چوبند خاتون تیز تیز قدم رکھتی میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ نزدیک آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگیں "دیکھئے بہن جی ہم لوگ دلی سے آئے ہیں۔ جگہ جگہ گھوم کر بڑی عمر کے بے پڑھے لکھے لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں۔ آپ بھی ہماری کلاس میں آیا کیجئے۔ ہم تین دن میں آپ کو اپنا نام لکھنا سکھا دیں گے اور پندرہ دن میں آپ آسان سی کتاب اچھی طرح پڑھنے لگیں گی"۔

غصے کی آگ میرے تلوؤں سے لگی اور سر تک پہنچی۔ میں ان خاتون کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ گھر آ کر دیوار پر سے اپنی فریم میں لگی ہوئی ڈگریاں اتار اتار کر زمین پر پٹخ دیں اور بیٹھ کر اس دن کا انتظار کرنے لگی جب میں خدا سے ملوں گی اور پوچھوں گی کہ آخر یہ سب میرے ہی ساتھ کیوں ہوتا ہے۔ دنیا میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ لیکن سب نے مجھ سے ہی دشمنی پر کمر باندھ لی ہے۔

جب میں کسی فنکشن یا شادی بیاہ کی تقریب میں شریک ہونے جاتی ہوں تو وہاں ساری کرسیاں پہلے ہی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ میں مجبوراً ایک کونے میں کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی اپنے آپ کو کوستی رہ جاتی ہوں کہ آئی ہی کیوں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ کرسی آخری قطار میں ملتی ہے کولڈ ڈرنک کی بوتلیں یا آئس کریم کی پلیٹیں وہاں اس وقت پہنچتی ہیں جب بانٹنے والا میرے بائیں بازو والے کو دینے لگتا ہے۔ میری باری آنے سے پہلے وہ دوسری بار ٹرے لینا یا آئس کریم کی پلیٹیں لینے چلا جاتا ہے اور جب دوبارہ لے کر آتا ہے تو مجھے چھوڑ کر میرے دائیں بازو والے سے بانٹنا شروع کرتا ہے اور میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ . . . کہ . . . مجھے بھی دیجئے یہ سب کچھ تو اب میں بس خدا ہی سے کہوں گی۔

سنتا ہے کہ آدمی اگر دنیا کا اچھا بُرا ہر طرح کے تجربات حاصل کرنا چاہے تو اسے زیادہ سے زیادہ

سفر کرنا چاہیے۔ میں نے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ وہاں بھی جی ہی ملا۔

جب سے میں سفر کے قابل ہوئی ہمیشہ تھرڈ ہی میں سفر کیا۔ جب تھرڈ کلاس کی عزت بڑھا کر اسے سیکنڈ کا نام دیا گیا تو ہم جیسوں نے بھی سیکنڈ میں سفر کرتے وقت اپنے آپ کو باعزت سمجھنا شروع کر دیا۔ پھر ایک بار ایسا ہوا کہ کسی سرکاری کام سے دوسرے شہر جانا پڑا۔ سرکار نے بڑی مہربانی کر کے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جانے آنے کا فرسٹ کلاس کا کرایہ ملے گا۔ میں نے خوشی خوشی بستر باندھا اور صبح ہی صبح اسٹیشن پہنچ گئی۔ قلی نے سامان اٹھایا اور تیز تیز قدم بڑھاتا چلا۔ میں نے اس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش میں ہانپنا شروع کیا اور پھولے ہوئے سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے قلی سے کہا "ٹکٹ لینا ہے" — وہ سیکنڈ کلاس کی کھڑکی طرف بڑھا۔ میں نے بڑی بے نیازی سے کہا کہ "بھئی سیکنڈ کا نہیں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لینا ہے" قلی چلتے چلتے رک گیا۔ پیچھے مڑ کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا "کاہے کو کھالی پیلی پیسہ کھراب کرتا ہے۔ سیکنڈ کا ٹکٹ لیو۔ بیٹھ ہم دلادیں گا۔ دو روپے جاستی دے دینا۔"

قلی کی بات کو ان سنی کرتی، دل ہی دل میں کھولتی فرسٹ کلاس کی کھڑکی تک گئی۔ ٹکٹ لیا اور جا کر فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں بیٹھ گئی۔ تین اشخاص پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ان تینوں نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ کچھ بولے نہیں۔ ایک دو اسٹیشن گزر گئے۔ ٹکٹ چیکر آیا — سب سے پہلے مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تاریخ پڑھی۔ اپنا چارٹ پڑھا۔ مجھ سے میرا نام پوچھا — پھر عجیب بے یقینی سے مجھے دیکھتا ہوا باقی کے تین اشخاص کا ٹکٹ چیک کیے بغیر واپس چلا گیا — اب میں ریلوے ڈپارٹمنٹ کے سارے ورکرس کو گردن زدنی قرار دوں تو آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

سفر سے جلی بھنی قلیوں اور ٹکٹ چیکروں کو کوستی کاٹتی گھر پہنچی تو گھر والوں نے صلاح دی کہ تم ذرا اسٹائل میں رہا کرو۔ بالوں میں خضاب لگاؤ۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ ذرا سا میک اپ کرو جو دنیا کا قاعدہ ہے۔ تب خود بخود لوگ تم پر اعتماد کریں گے۔ تمہاری عزت کریں گے۔ میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے یہ بھی کر کے دیکھ لوں۔ کئی دن کی غیر حاضری کے بعد آج کالج جانا ہے۔ لاؤ ان کے مشورے کو مان ہی لوں۔

اپنی ایک اچھی سی ساڑی نکال کر باندھی۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ لپ اسٹک ذرا ڈارک کلر کی سلیکٹ کی۔ آج کل کا فیشن ہی ہے۔ اونچی ایڑی کا سینڈل پہن کر جب میں کالج جانے کے لیے نکلی تو گھر کے سب لوگ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے۔ شاباش شاباش کالج پہنچی — جاتے ہی برآمدے میں ایک ساتھی پروفیسر ملے۔ چلتے چلتے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گئے۔ ان کی اس تحیر آمیز حیرت کو نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ جب لیڈیز کامن روم کے سامنے سے گزری تو میرے کانوں میں آواز آئی — "ارے آج تو میڈم نے بھی حسین بننے کی ناکام کوشش کی ہے۔" تو میرا دل چاہا کہ . . . . کہ . . . . اب جانے دیجیے۔ کیا کیا بتاؤں آپ کو۔ اب ان سب باتوں کا فیصلہ اسی وقت ہوگا جب میں قلم اٹھاؤں گی!!

▬▭

ممتاز مہدی (حیدرآباد)

برنارڈ شا

برناڈ شا نے کہا تھا "سب سے اچھا مذہب اسلام ہے سب سے بُری قوم مسلمان" ہم نے ہر پہلو سے اس مقولہ کا جائزہ لینے کی کوشش کی، نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اسلام اور مسلمان دونوں سے دور ہو کر برناڈ شا کے قریب ہوتے چلے گئے اور اپنے چال چلن کو برناڈ شا کے طور طریق پر ڈھالنے کی فکر کرنے لگے۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال تھا کہ چال چلنے کا انداز کیسا ہو کیوں کہ برناڈ شا کی چال کا ہمیں علم نہ تھا پھر ہم نے سوچا کہ اسلام کیسی چال چلنے کی تعلیم دیتا ہے؟ چلن کا خاکہ تو ذہن میں تھا ہی لیکن چال کا اندازہ قائم نہ ہو سکا۔ لہٰذا ہم نے مسجد کا رخ کیا جمعہ کا دن ہے کڑی دھوپ دوپہر کا سماں۔ ایک ایسے نکڑ پر کھڑے ہو گئے جہاں سے تمام مصلیان کی واپسی ممکن تھی قافلہ چھوٹا تو ہم نے دیکھا کہ ہر ایک کی چال ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک درمیانہ عمر کے صاحب اونچی اور چوڑی گھیرے والی لنگی چوڑے چھاتہ والے کرتے میں ملبوس اندر بنیان ندارد کہ پھولا ہوا سینہ سب کو نظر آسکے۔ سر پر گول آکلس کی جیکھاں لگی ٹوپی اوڑھے بڑی متانت سے ہماری طرف آرہے ہیں، چال ان کی ایسی کہ لیس گیئی رستم زماں ہیں۔ ایک دوسرے عمر رسیدہ صاحب پر نظر گئی ان کا حلیہ قطعاً برناڈ شا جیسا تھا چال چلتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ دونوں پاؤں سینہ اور پیٹ جو ہو کر بھی نہ ہونے کے برابر تھا ان اپنے جسم کے [illegible] پھینک پھینک کر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اب تیسری چال کا جائزہ لینا مناسب نہ سمجھا اور مسجد سے سیدھے گھر کا رخ کیا گھر پہنچنے تک ہم مسلمان اور برناڈ شا کے درمیان لٹک رہے تھے اور جب گھر پہنچ کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ گھر کے باہر وہ شور و پکار، گالی گلوچ، نعرہ اور آوازیں [illegible] باہر نکلے تب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور چاروں طرف ہلکی ہلکی موسیقی والی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور [illegible] اپنے [illegible] اور [illegible] وغیرہ کو جھٹکتے مخالف سمتوں کو جا رہے تھے اور ہر دو مخالف سمت میں ایک ایک مجمع ان کے ساتھ جا رہا تھا اور درمیان میں کچھ "غیر جانبدار" بھی کھڑے تھے اور ان سب کے سروں پر ٹوپیاں تھیں [illegible] ایک بچے [illegible] کی جو صورت سے بہت ہی [illegible] تھا سر پر ٹوپی موجود تھی لیکن ہاتھ میں سگریٹ دبائے ہوئے تھا [illegible] اور پوچھا "بھائی صاحب یہ کیا شور تھا؟" انہوں نے کسی انجانے کی تان کو زور سے یاد کیا [illegible]

ان کی طرف متوجہ اور وہ ہم سے مخاطب تھے کہ "وہ لاآ کے بیچ میں مرغی حرام ہو گئی اور وہ تمہارے گھر کے سامنے پڑی ہے جاؤ اور اپنی دھوبن کو دے دو" حرام مرغی ہمارے ہاتھ میں تھی اور قدم دھوبن کے گھر کی طرف بڑھنے لگے ہم نے سوچا اس تیزی سے بدلنے والے اعتقادات کی دنیا میں کہیں ہماری دھوبن مسلمان نہ ہو گئی ہو ورنہ وہ مرغی ہم سے چھین ہمارے سر پہ دے مارے گی یا گھر میں قید کر کے اسی مرغی سے ہماری ضیافت کر دے گی۔

ہم نے برنارڈ شا کی غذا کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ گوشت، انڈا وغیرہ نہیں کھاتے تھے ہمارا حال یہ تھا کہ ہر نوالہ میں گوشت لازمی تھا لیکن برنارڈ شا کے طور پر عمل کرتے ہوئے ہم نے گوشت انڈا وغیرہ سے پرہیز شروع کر دیا لیکن ہفتہ بھر میں بارہ پونڈ وزن گھٹ گیا آنکھیں اندر چلی گئیں بلکہ اتنی کمزور ہوئیں کہ ان کو فارن ایڈ یعنی بیرونی امداد کی ضرورت پیش آئی۔ آج کل لوگوں کی آنکھیں اتنی زیادہ خراب ہو رہی ہیں کہ عینک کے دکاندار بڑھی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے بہت کم خوش مذاقی کا اظہار کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے ایسے چشمے کو زیب چشم کیا کہ دھنسی ہوئی آنکھیں اور بھی دھنس گئیں۔ چہرے پر ڈاڑھی چھوڑ دی کہ برنارڈ شا کے بھی ڈاڑھی تھی کہیں ہم نے پڑھا تھا کہ برنارڈ شا بد صورت تھے اور چیچک رو۔ خود کو کامیاب ڈرامہ نگار ثابت کرتے ہوئے انہوں نے اپنا میک اپ اس ڈھنگ سے کیا کہ اپنا عیب چھپا گئے لیکن ان کی نقالی میں ہم اور بھی بدشکل ہو گئے کہ ہماری ڈاڑھی کان کے قریب گھنی تو اس کے نیچے ندارد تھوڑی کی مختلف جگہوں پر ایسی بکھری ہوئی جیسے ہمارے ذہن میں منتشر خیالات۔ ہم نے سوچا کہ یہ نقالی نقاہت کے راستہ کہیں ہمیں لے نہ ڈوبے۔ ہم نے ڈاڑھی صاف کر دی گوشت اور انڈا بھی کھانا شروع کر دیا۔ جسم تو اپنی اصلی حالت میں آ گیا لیکن عینک ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے چپک گئی۔

یہ بات ہم نے دریائے حیرت میں غوطہ لگاتے سنی کہ برنارڈ شا نے اپنی ماں کی موت پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور جلوس جنازہ میں اپنی ماں کو برا بھلا کہا تھا اور ناچتے گاتے جلوس میں شرکت کی تھی۔ وجوہات کا علم ضرور تھا لیکن ہم نے اپنی ماں کو جب یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا تھا "ہو سکتا ہے اس کی ماں کافر رہی ہو" کافر کا پہلو بھی عجیب ہوتا ہے کہ ظالم یکسر جنت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ نہ جانے "کافر حسیناؤں" کا کیا حشر ہونے والا ہے؟

ہم خدا کی ذات کو پھیلاتے جائیں تو دنیا میں بہت ہی کم کافر ملیں گے اور خدا کو مختصر کرتے ہوئے طبقہ بلکہ دل کے ایک غار میں جگہ دے دیجیے تو صرف ایک محدود طبقہ یا چند انسان ہی جنت کے دعویدار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے انسان کی فطرت اور نفسیات کے مطالعہ کے بعد ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ "ماننے پر آئیں تو کھڈ کو بھی خدا بنا دیں اور نہ مسیح کو صلیب پر لٹکا دیں" جب ہماری ماں نے اس دنیا کو لبیک کہا تو ہمیں برنارڈ شا پر بے حد تعجب ہوا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ ماں کے جلوس جنازہ میں ناچ رہے تھے وجہ تو خود ہماری ماں نے اپنی زندگی میں بتا دی تھی!

ہم نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ انتقال کے بعد ہمارا امتحان لینے قبر میں منکر اور نکیر آتے ہیں برنارڈ شا کی وصیت کفن دفن دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مذہب اسلام کو بہترین مذہب قرار دیا ہے تو وہ جانتے ہوں گے کہ قبر میں سب سے پہلے منکر نکیر چلے آتے ہیں اس لیے انہوں نے گھبرا کر بعد مرگ پیرو آتش ہونے کی وصیت کی تھی کہ نہ قبر میں اتارے جائیں اور نہ کوئی ان کا امتحان لے سکے لیکن ہم نے اس مرحلہ کو یا مردی سے حل کرنے کا

تہیہ کر رکھا ہے اور بفضل ربی چال چلن، طور طریق پر گہری نظر رکھی ہے اور اپنی قبر آپ کھود رکھی ہے کیونکہ برنارڈشا جیسی وصیت چھوڑنا حمیت کے خلاف تصور کرتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے برنارڈشا زندہ سلامت گیس کے گولے کی طرح آسمان کی طرف لپک رہے ہیں اور ہم اپنے ہاتھ سے چھوٹتے ہوئے اس گولے کو منہ بسورتے کسی معصوم بچے کی طرح دیکھ رہے ہوں۔

ماہنامہ **شگوفہ** کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر — یوسف ناظم

○ **ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگار:**

گنگا دھر گاڈگل (مراٹھی) کل کی (ٹامل) ولوذ بھٹ اور لگن بہاری لال مہتا (گجراتی) فتورآنند (اڑیا) راوی کونڈل راؤ (تلگو) بیچی (کنڑا) ایپا پانی کر (ملیالم) نارائن گنگو پادھیائے (بنگلہ) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (کشمیری) شرن لیدن شرما (راجستھانی) شرد جوشی (ہندی) رتی لال شاہین (ہندی) کی تخلیقات کے تراجم!

○ **ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ:**

دے ویش ٹھاکر (ہندی) ہمانیش گوسوامی (بنگالی) عزیز تمنائی (ٹامل) این وی گوپال سوامی، ڈاکٹر بھکتہ وتسل ریڈی (تلگو) شیام سندر مصرا (اڑیا) ڈاکٹر سکنیا جوہری (گجراتی) حمید الماس (کنڑی) ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی (پنجابی) ڈاکٹر اعجاز مدنی (مراٹھی) پروفیسر ایپا پانی کر (ملیالم) کرت بابانی (سندھی) ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (میتھلی) ڈاکٹر سید حامد حسین (انگریزی) اور بشر ماند (کشمیری)

○ **اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ: ظ. انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یوسف ناظم:**

○ عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ:

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خان، شمیم حنفی، کرامت علی کرامت، مجیبی حنفی ابن فرید، پروفیسر عبد المغنی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مناظر عاشق ہرگانوی اور ملک کے دوسرے نامور نقادوں کی آراء!

○ اردو کے بارہ نامور مزاح نگاروں:

فکر تونسوی، مجاہد چنگیزی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر، وجاہت علی سندیلوی، رشید قریشی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پرویز ید اللہ مہدی کے مضامین اور خود نوشت سوانح!

○ ڈاکٹر عبد المغنی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے لیے گئے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے انٹرویو ○ مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی ○ تخلیق کاروں کی تصویریں اور دوسری کارآمد چیزیں!

★ خوبصورت دو رنگی سرورق، سعادت علیخاں ★ ضخامت: ۳۸۶ صفحات۔

★ قیمت: ۵ روپے ★ سالانہ خریداروں سے ۲۵ روپے [بشمول رجسٹرڈ پوسٹ]

سرپٹ حیدرآبادی

بات کی ہیں تین قسمیں نام چوتھی کا ہے لات

بات ہے، دیروز کی، امروز کی، فردا کی بات
بات کی ہیں تین قسمیں، نام چوتھی کا ہے لات

گتھی سلجھائی ہوئی، ناحق الجھ جاتی ہے بات
گفتگو میں ٹانگ اڑاتے ہیں جہاں بھی ذاتیات

دیکھتے ہیں بزم میں سب لوگ حیرت سے مجھے
جب بیاں کرتا ہوں میں کچھ اپنے ذاتی تجربات

جیتے جی کوئی کرے کیوں جنت و دوزخ کی فکر
بعد کی ہے فکر، پہلی فکر ہے فکر حیات

آئے ہیں وہ تو رقیب روسیاہ بھی ساتھ ہے
اس سے تو بہتر یہی تھا وہ نہ کرتے التفات

موڑ کر منہ پر ہمارے سے مقابل آؤ خود
نوجواں بنکر لڑو پیش آئیں جب بھی مشکلات

اس کا کیا انجام ہوگا، ہم بتا سکتے نہیں
جو گڑھے کو سمجھ کر پیتا ہے آب حیات

میکدے میں آتے ہی، خود ہو گئے اتنا طفیل
شیخ کرنے آئے تھے تبلیغ ترک مسکرات

فاش ہو جاتے ہیں سب اس وقت وحدت کے رموز
کوئی کاتا، جب بھی کرتا ہے کسی کا فی کلیات

کیسے کم بختے بُرے، اگر ہم نہ اچھے بن سکے
عمر ساری کٹ گئی، بیکار، مہمل، واہیات

جتنے تھے ساتھی ہمارے، رفتہ رفتہ چل بسے
رہ گئے ہیں صرف اک ہم، باقیات الصالحات

ڈھیر غزلوں کا میری، جو کل فقط دیوان تھا
ڈھیر اب وہ بڑھتے بڑھتے بن گیا ہے کلیات

رخ کو فرزیں، فیل کو پیدل سمجھ لیتے ہیں ہم
جیتنے کی دھن میں سرپٹ ہم تو کھا جاتے ہیں مات

بے تکے پن سے کبھی دوڑاتے ہیں گر اسکو ہم
خود ہمارا گھوڑا سرپٹ مارتا ہے ہم کو لات

اقبال ہاشمی

غزل

بھولے بھالوں کو کیسے سمجھائیں کتنا پیچیدہ کام ہوتا ہے
کتنے چکر چلانے پڑتے ہیں تب کہیں جا کے نام ہوتا ہے

میری نظروں میں بھینس کی عزت اس لیے ہے کہ دودھ دیتی ہے
اس کے مسکے میں وہ کرامات ہے جس سے بادل بھی رام ہوتا ہے

شعر کہنے سے کچھ نہیں ہوتا لوگ پھر بھی نہ تم کو مانیں گے
لوگ شاعر اسے سمجھتے ہیں جس کے ہاتھوں میں جام ہوتا ہے

سوچتا تھا میں اک زمانے سے عقدہ لیکن کبھی نہ کھل پایا
آئینے نے دکھا دیا کیسے مینڈکی کو زکام ہوتا ہے

ہاشمی شاعری چمک جائے گر یہ نسخہ سمجھ آ جائے
اونچی کرسی جسے ملی ہے اونچا اسکا مقام ہوتا ہے

مردوں سے زیادہ عورت ہے۔

خسرو: اچھا۔

پڑوسن: ہو۔ تھیٹر چھُٹ کے باہر نکلے دیکھا لوگاں ہیں۔ ہم لوگاں ذرا اگے، ابھی دیر سے ٹکٹ کئے وہ جھگڑے ہے پوچھ نکو۔ عورتوں کی لائن الگ ہے بھی تو ایسا گریں ایک پہ ایک۔ بس دم جانا باقی رہا۔

خسرو: تو کل دیکھنا تھا۔

پڑوسن: آئی پھر موقع نکلتا صائب، وہ کیسا کی چلے گئے بچوں کو بھی لیکے آتیں عورتاں، کائیکو لانا۔ نئیں صائب مگر لاتیں۔ وہ چیخ پکار، دھوم ہے، پھر عورتوں کا اڈھلا الگ ابا بابا کاناں بہرے ہوگئے۔

خسرو: پھر ٹکٹ ملایا نہیں

پڑوسن: آئی ملا نا صائب، واں عورتاں بھی بلیک کررہے تھے، یہ نئی بات دیکھی میں، مگر گنتے دو عورتاں، پکڑ لئے پولس والے، بہت گھمایاں کرے عورتاں کو نئیں چھوڑے۔

خسرو: تم کو ٹکٹ ملا یا نئیں؟

پڑوسن: (سر ہلاکے) ہاں ملا نا، مگر جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کے گئے تک ڈانگ لول کے کھیل شروع ہوگیا تھا۔ کھیل ختم ہوئی سمجھو ہم لوگاں اندر گئے۔ مگر واہ بہت اچھا کھیل ہے، نصیحت کے تو لئے باتاں ہیں، سمجھنا مگر لوگاں اچھا بنایا۔ چلیگا بھی خوب۔

خسرو: بہت تعریف ہورہی ہے۔

پڑوسن: ہاں ہے کھیل دیکھا۔ پھر رقص بھی کیا لے رہا، دیکھتیں صائب کھیلاں بھی۔

خسرو: اب کیا کھیل دیکھیں گے، بہت دیکھ چکے۔ ایک زمانہ تھا، صبح ۱ اسمتہ کرکے نکل جاتے تھے گھر سے تو سکنڈ شو دیکھ کر لوٹتے تھے۔ واہ کیا زمانہ تھا۔ اور اب ویسے کھیل بھی کہاں تیار ہورہے ہیں۔

پڑوسن: کائیکو اچھے بن رہیں

خسرو: بس وہی جنگل کے مناظر، ڈاکوؤں کا گھوڑے دوڑانا، کلب میں ڈانس، موٹروں کی ریس، آخر میں مار دھاڑ۔

پڑوسن: ہو ڈھشم ڈھشم

خسرو: پھر ختم

پڑوسن: آپ کے زمانے میں بھی تھی صائب ڈھشم ڈھشم

خسرو: جی جان ہاں ہمارے زمانے میں (سانس لیتا ہے) دو تین قسم کے فلم بنتے تھے، بعض فلم کمپنیاں بہت سنجیدہ سوچ کے فلم بناتی تھیں۔

پڑوسن: ہو۔

خسرو: ہاں، بعض تفریح کے لیے عمدہ اور پاکیزہ لطف کے افسانے لیے ہوئے بناتی تھیں، ایک دو کمپنیاں گھوڑ دوڑ چوروں ڈاکوؤں پستولوں اور طمنچوں کے بھی کھیل بناتی تھیں۔

پڑوسن: ہو صائب بابا ہمارے ایک کھیل طوفانی طمنچہ اور ہنٹر والی کا بہت ذکر کرتے تھے، بہت اچھے تھے کتے یہ کھیلاں۔

نواب: (بائیں جانب سے نواب آتا ہے) ارے باپ رے، ابا جان یہیں کھڑے ہیں۔ ادھو کیا ہے بی جانی ہاں کیا ہورہا ہے۔

پڑوسن: ادھو آپ بھی آگئے نواب صاحب۔

نواب: ہاں

خسرو: برخوردار تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، باہر رہو میں ابھی آتا ہوں۔ (دائیں جانب چلا جاتا ہے)

نواب: جی بہت اچھا میں یہیں ہوں۔

پڑوسن: آپ کائیکو آئے تھے نواب صاحب [?]۔

نواب: کہاں۔

پڑوسن : دہی سینما میں۔
نواب : اے آہستہ بولو آہستہ
پڑوسن : کوئی نئیں سن را، کون ہے بول کے، ہو کا ئیکو آئے تھے نواب صاحب۔
نواب : سارے لوگ کیوں آتے ہیں سینما میں۔
پڑوسن : پکچر دیکھنے آتیں، اچھا اچھا پکچر دیکھنے آتے تھے آپ، پھر دیکھے آپ۔
نواب : ہاں ہاں کیوں نہیں دیکھنے کی کیا وجہ ہوتی۔
پڑوسن : نیں بہت رش تھا۔ کتا رش تھا نیں، یں پکارو ں گی بولی ستی۔ پھر کیا سمجھتیں کی بول کے نئیں پکاری، اچھا کری نئیں۔
نواب : ہاں اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔
پڑوسن : اچھا بنایا نیں، بہت اچھا بنایا، سب نصیحت کے باتاں ہے دیکھو آپ، اگر سمجھے تو۔ وہ تا دراں بی کی ریس ہوگئی۔
نواب : کیوں کیا ہوگیا۔
پڑوسن : میں بولی دوں نکو لے چلو تکو لے چلو، چھ بچوں کو لے کے چلی تین بچوں کو تو روک دیا گیٹ والا۔ ٹکٹ لیو بولا۔
نواب ! اچھا۔
پڑوسن : ہو۔ کیا کیا دھن پٹیاں کری، منیجر کنے گئی، کون کی اس کی پہچانت کے ہے کہتے ان کے پاس گئی مگر کچھ نہیں ہوا۔ پہلے ہم کبھی نئیں لیئے بول۔ کچھ نئیں ہوا۔ تین بچوں کا ٹکٹ لینا پڑا۔
خسرو : (آتے ہوئے) کس کے تین بچے بھئی۔
پڑوسن : دہی تاماساں لیکے ساب۔ چھ بچوں کو لے کے چلا سینما کو مدنہار بچوں کی ابے ہے تو یہ کرلی ہر جگہ سمیت۔ وہ اچھا کھا سکتے۔ وہ اچھا پا سکتے، اتے آتے بچوں کا بھی ٹکٹ لے دیں آج کل۔
خسرو : ہاں وہ تو لیتے ہیں۔
پڑوسن : سبھی بی بچے بہت ہونا آفت ہے۔ اچھے ہیں وہ لوگاں جن کے صرف ایک یا دو بچے ہے،
خسرو : ہاں برخوردار، تم بتاؤ کہاں سے آر ہے ہو، بڑی دیر سے غائب ہو۔
نواب : جی میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا سنیئے آپ تو خوش ہو جائیں گے۔
خسرو : فرمایئے تاکہ میں خوش ہوسکوں۔
نواب : جی میں احباب سے اور ساری بستی کے لوگوں سے کہنے گیا تھا کہ فیملی پلاننگ کے سلسلے میں کل شام ہمارے محلے میں ایک بہت بڑا جلسہ ہے۔ پکچر بھی بتائیں گے۔
پڑوسن : جمن کنے نیں نواب صاحب۔ ہو صاحب میں بھی سنی۔
نواب : اور یہ کہ آپ کی اور مجھ حقیر کی تقریریں بھی ہوں گی۔
پڑوسن : ہم لوگاں بی آریں صاحب۔
خسرو : بہت اچھی بات ہے، واقعی تم نے مجھے خوش کردیا۔ مگر صرف تقریریں کرنے اور سننے سے کچھ نہیں ہوتا عمل بھی ہونا چاہیئے۔
نواب : جی ہاں ابا جان۔
خسرو : اپنے آپ پر ہی غور کرلو۔
پڑوسن : (ہنستی ہے) آنکھوں پہ بر تھے صاحب
خسرو : کیا سچ۔

(پردہ گرتا ہے)

پاگل عادل آبادی

غزل

نرس کیوں آئی تھی کیا بات ہے لفڑا کیا ہے
کیسی گڑبڑ ہے بتاؤ یہ گھٹالا کیا ہے

پوچھتے پوچھتے پیدل ہی وہ پہنچے آخر
کوچۂ یار کا رکشے کا کرایہ کیا ہے

کھچڑی کھاتا ہے نہ چٹنی ہے نہ پاپڑ نہ اچار
کل یہ مرغی ہے تو پھر آج کا انڈا کیا ہے

ہاں فقط میرے مقابل کوئی خرگوش رہے
میں بھی کنگ کانگ ہوں تو نے مجھے سمجھا کیا ہے

صاف تالو ہے مری میرے بڑا گھر کے جیسی
میں نہیں جانتا جھاڑو کا یہ کٹا کیا ہے

آم امرود کا انجیر کا ہوتا ہے میاں
کوئی بتلائے کہ چوں چوں کا مربہ کیا ہے

اینکریمنٹ بھی تنخواہ میں شامل ہے اِدھر
اور اُدھر گود میں بیوی کے وہ بچہ کیا ہے

لڑکی والوں نے تو کچھ اور نہ پوچھے حالات
خوش ہوئے جان کے یارو میری تنخوا کیا ہے

آپ پاگل کے کہے پر نہ کریں یوں تنقید
دیکھئے لوگوں میں اِس شخص کا رتبہ کیا ہے

○

روحِ غالب سے معذرت کیساتھ

"پیروڈی"

کبھی لالی کبھی ناخون پالش
"کہاں تک اے نگاہِ ناز کیا کیا"
دکھاتا ہے یہ جا کر اس سے پوچھ
"ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"
ہے اس کے سر پہ پاپوشوں کی بارش
"شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا"
نہ ہو جینا تو لطفِ مرگ کیسا؟
"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟"
بڑی بھونڈی ہے غالب تیری بات
"[illegible] کیا [illegible] کیا ادا کیا؟"
تمہاری جیب خالی ہے تو روشن
"تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟"

روشن لال روشن

دو شعر

نہ مولوی ہیں نہ لیڈر نہ ہم ہیں ٹھیکے دار
تمہارے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں پیروڈیوں کے لائق اب
"کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں"

○

کے جنگل میں پھنس جاتی ہے حکام بے بس رہ جاتے ہیں۔ مقامی حضرات منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے چند لمحوں میں رکی ہوئی ٹریفک کو چلایا کرتے ہیں۔

سڑکوں کی تعمیر کے ساتھ سڑکوں پر سڑک کی مزید تہیں بچھائی جا رہی ہیں۔ اس عمل سے ہمارے شہر کی سڑکیں دن بدن منزل طے کرتی جا رہی ہیں سڑک کی اونچائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے آس پاس کے گھر اور دکان سڑک سے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔ مضبوط اور قوی ہونے کے باوجود سڑکوں کا عجیب رویہ ہے۔ کمزور پر ظلم کرتی اور طاقتور سے ڈرتی ہیں۔ سواریوں سے مقابلہ پر وہ جلد ہی ٹوٹ جاتی ہیں جب کہ کبھی سڑک پر راہ گیر گر جائے تو اسے بخشتی نہیں ہیں بیچارہ ٹوٹ پھوٹ بلکہ انتقال کر جاتا ہے۔

سڑکوں کی تقسیم سے کئی فٹ پاتھ وجود میں آئے ہیں۔ اصل سے بڑھ کر سود کے مصداق راستوں پر فٹ پاتھ زائد اور سڑکیں کم ہو گئیں۔ تو کچھ حد تک بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوا، چند لوگوں کو رہائش کے لیے جگہ ملی، ولیمی طب کو فروغ حاصل ہوا، سستی دکانیں اور ہوٹلیں کھل گئیں، تفریح و طبع کا سامان مہیا ہوا اور ایسی ہی کئی سہولتیں ہم حیدرآبادی کا شہریوں کو نئے فٹ پاتھوں کی بدولت حاصل ہوئیں۔

مضمون لکھتے وقت ہماری بیوی نے ٹوکا "کیا لکھ رہے ہو؟" ہم نے جواب دیتے ہوئے پوچھا فٹ پاتھ پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ کیا تم فٹ پاتھ کی تعریف کر سکتی ہو؟" جواب ملا "کیوں نہیں۔ فٹ پاتھ وہ بازار ہے جہاں اشیاء لگژری شوروم کے خرچہ اور دیگر ٹیکسس سستے دام مل جاتی ہیں"۔ لیکن فٹ پاتھ تو چلنے کے لیے ہوتے ہیں" بیوی نے فلسفیانہ انداز میں کہا "جی ہاں۔ فٹ پاتھ پیدل چلنے کے لیے وہاں ہوتے ہیں جہاں کوئی پیدل نہیں چلتا ہر کوئی فراٹے بھرتے کار میں چلا جاتا ہے اور جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں وہاں فٹ پاتھ، بازار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ واقعی ہمارے شہر کا ہر فٹ پاتھ ایک بازار ہے۔ ہر شئے فٹ پاتھ پر مل جاتی ہے بلکہ بعض اشیاء صرف فٹ پاتھ ہی ملتی ہیں ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ فٹ پاتھ پر خرید و فروخت کرنا ایک آرٹ ہے جبکہ سجی سجائی دکانوں میں خریداری بے وقوفی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ جو کچھ شئے دکان والا دے، لینا پڑتا ہے جو دام دام وہ بتلائے ادا کرنا پڑتا ہے۔ فٹ پاتھ کے بازار میں اشیاء کو پرکھ کر بھاؤ تاؤ کرکے خریدنا پڑتا ہے۔ فٹ پاتھ کے بازار کا ارتقائی عمل دلچسپ ہوتا ہے۔ تاجر اپنی اشیاء بستہ اور ہاتھ میں لیے چلتے پھرتے بیوپار کرتے ہیں۔ تھک کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں بستہ کی اشیاء چادر پاٹ پر جمع کی جاتی ہیں۔ ایک سائبان بنایا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ چلتی پھرتی دکان پکی دکان بن جاتی ہے۔ روزدار کا روبار ہونے لگتا ہے۔ ایک عرصہ بعد خیال آتا ہے کہ یہ تو فٹ پاتھ ہے لوگوں کے لیے چلنے پھرنے کی جگہ۔ پھر سے فٹ پاتھ بنانے کی خاطر دکان کو ڈھا دیا گیا ہے۔ فٹ پاتھ کے دکانوں کو ایک طرح سے سہولت حاصل ہے۔ جب چاہے وہ دکان برخاست کر سکتے ہیں یا کبھی بھی اس کی دکان برخاست کی جا سکتی ہیں۔

سماج کا ایک زمرہ جنھیں "فٹ پاتھیے" کہا جاتا ہے فٹ پاتھ پر رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ چھوٹا سا گھر ٹین کا چھت در ماٹ کی دیواریں نہ ڈرائنگ روم اور نہ ہی بیڈ روم ہر کام کے لیے صرف ایک کمرہ۔ دل چاہا گھر کو سر پر اٹھایا اور نقل مقام کیا۔ ہمارے شہر کی تخریب اور تعمیر سے جو نئے فٹ پاتھ بنے ہیں ان سے رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوا ہے ورنہ پھیلتی ہوئی آبادی اور سکڑتے ہوئے وسائل سے شہر میں رہائش ایک مسئلہ ہے۔

مویشی جو آزادانہ سڑکوں پر بیٹھا کرتے ہیں ان کے لیے فٹ پاتھ کی شکل میں اسٹیج بن گئے ہیں۔ فٹ پاتھ پر

بیٹھ کر آرام سے وہ جگالی کر سکتی ہیں۔ ایک دوسرے سے جھگڑ سکتی اور دست و گریباں ہو سکتی ہیں۔

فٹ پاتھ پر ہوٹلیں بھی ہوتی ہیں۔ ہر پکوان سستے دام فٹ پاتھ پر مل جاتا ہے۔ بعض کھانے کی اشیاء کو جب تک فٹ پاتھ پر کھڑے نہ کھائیں، طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ کباب روٹی، مسالہ مرچی، پانی پوری، پاؤ بھاجی، گھنٹے کا رس وغیرہ وغیرہ۔ ان پکوان کے خیال ہی سے منہ بھر آنے لگتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگوں کا معدہ ان پکوانوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان ڈشش کے علاوہ فٹ پاتھ پر شکم سیر ہو کر کھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ناشتہ کے لیے وقت گنوانا زیادتی ہے۔ چلتے پھرتے ناشتہ کرنا چاہیئے۔ اسے ناشتہ کے لیے فٹ پاتھ سے بڑھ کر کوئی اور مقام نہیں ہو سکتا۔

فٹ پاتھ سیر و تفریح کے مواقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے شہر میں مخصوص تماشے جنھیں اسٹیج نہیں کیا جا سکتا وہ فٹ پاتھ پر بتلائے جاتے ہیں "سانپوں کا کھیل" "بندریا کا ناچ" "ریچھ کی ہوشیاری" "جادوگر کا تماشہ" اور ایسے ہی ہمہ اقسام کے تماشے فٹ پاتھ پر ہر دن بتلائے جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر کھیل کے میدان کے اطراف بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ہم نے ایک مرتبہ اپنی پاکٹ گنوا کر فٹ پاتھ پر سانپوں کا کھیل دیکھا تھا۔ کھیل تماشوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر دیگر فنون لطیفہ کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ کوئی آرٹسٹ صاحب اپنے فن کا مظاہرہ فٹ پاتھ پر کرتے اور داد کے ساتھ اجرت بھی پاتے ہیں۔ چلیے صاحب نئے فٹ پاتھ وجود میں آنے سے آرٹ اور کلچر کو بھی فروغ ملے گا۔

ہمارے ایک دوست نے ایک مرتبہ ہم سے کہا "ہمارے پاس جنسی تعلیم سڑکوں پر دی جاتی ہے"۔ ہم ان سے الجھ پڑے "یہ نہیں ہو سکتا" وہ ہمیں کھینچ کر ایک فٹ پاتھ پر لے گئے جہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بھیڑ کو چیر کر ہم اندر گئے تو دیکھا فٹ پاتھ پر دواخانہ بچھا ہے۔ مختلف جڑی بوٹیاں بکھری پڑی ہیں شیشوں میں مربے رکھے ہیں۔ ایک طرف حکیم صاحب مختلف تصاویر کے ذریعہ جنسی تعلیم کے ساتھ دواؤں کا سیل کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نے مزید کئی فٹ پاتھوں پر مختلف دواخانے لگے دیکھے۔ جڑی بوٹی، جانوروں کی کھالیں، مختلف تیل اور ہمہ اقسام کے معاجین۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ دیسی طب کے فروغ میں فٹ پاتھ اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ہمارے شہر میں اکثر گھر ایسے ہیں جہاں کھلی جگہ نہیں ہے۔ ایسے مکانوں کے مکین فٹ پاتھ کو صحن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گائے، بھینس، بکریاں اور مرغیوں کو پالتے ہیں۔ کپڑے سکھاتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہیں۔ بڑے لوگ خوش گپیاں کرتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ اپنے گھر کے سامنے کے فٹ پاتھ کی حصار بندی کی جاتی ہے اور پھر فٹ پاتھ باضابطہ گھر کا صحن بن جاتا ہے۔ ہم اپنے دوست سے واقف ہیں۔ صاحب موصوف کے شاندار گھر میں صرف دو کمرے ان کے اپنے ہیں۔ بقیہ حصہ کسی زمانہ میں فٹ پاتھ ہوا کرتا تھا۔

چھٹی کے دن فٹ پاتھ پر اسپیشل پروگرام رہتا ہے۔ فٹ پاتھ پر نت نئی دکانیں لگتی ہیں کھیل تماشے بتلائے جاتے ہیں۔ ہم چھٹی کے دن تفریح کے لیے فٹ پاتھ کی سیر کرنے جاتے ہیں۔ دو کانوں سے بچ کر چلنے اور راہ گیروں سے ٹکرا کر سنبھلنے کے لیے جو ورزش ہوتی ہے وہ ہمیں کھیل کود کا مزا دیتی ہے کم خرچ بالا نشین قسم کا لنچ کسی بھی فٹ پاتھ کے ہوٹل پر ہو جاتا ہے۔ وقت گزاری کے لیے پچھلی ٹپانے الگ مل جاتے ہیں۔ مختلف تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ طبیعت خوش ہوئی تو کچھ دے دیا ورنہ لعنت و ملامت کرتے آگے بڑھ گئے تفریح کی تفریح

مکانوں پر چھائے تاڑ کیا سستے دام کچھ مل گیا تو خرید لیا۔ تھک گئے تو کسی جھاڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ بیمار ہیں کسی دواخانے سے رجوع ہوئے مستقبل کے لیے نجومی کو ہاتھ دکھایا اور اگر پریشان ہیں تو فٹ پاتھ پر روحانی علاج کسی بابا سے دعا کے لیے کہا۔ شام ہوئی تو تھکے ماندے گھر لوٹ آئے۔

ہمارے نزدیک فٹ پاتھ ہمارے غریب ملک کی شہری زندگی کا نمائندہ مقام ہے کسی کو ہمارے ملک کی صحیح تصویر دیکھنی ہو تو اسے گاؤں کی سیر کے ساتھ شہر کے فٹ پاتھوں کی تفریح بھی کرنی چاہیے۔ ہمارے شہر کے حکام قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے شہر میں مزید نمائندہ مقام تعمیر کیے ہیں !!

روزنامہ رہنمائے دکن کے ہفتہ وار مزاحیہ کالم

رہنما و رہرو

کا انتخاب شائع ہو چکا ہے

جس کے مصنف جناب محمد برہان حسین

اور

مرتب جناب محمد منظور احمد ایم۔ اے (عثمانیہ) ہیں۔

قیمت: ۵ روپے

ملنے کے پتے:

۱۔ ماہنامہ "شگوفہ" ۲۱ ہیڈ کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱
۲۔ دفتر روزنامہ رہنمائے دکن۔ افضل گنج۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش
۳۔ الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد ۲۔ آندھرا پردیش
۴۔ حیدر بک ڈپو۔ گلزار حوض۔ حیدرآباد۔
۵۔ رائل فوٹو اسٹوڈیو۔ نامپلی۔ حیدرآباد۔ ۱
۶۔ یوسف بک اسٹال۔ اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔
۷۔ پبلیشر۔ جناب محمد مناف حسین صدیقی
مکان نمبر: ۸-۲۰۸-۱۷، نیا ملک پیٹھ۔ حیدرآباد۔
۸۔ مصنف، محمد برہان حسین، اسسٹنٹ رجسٹرار۔ ۔ ۔ ۔ جیمنا نرسری۔ حیدرآباد ۹ آندھرا پردیش

ڈاکٹر وزیر آغا

دسترخوان

ایک زمانہ تھا کہ اہل وطن فرش پر دسترخوان بچھاتے، آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھانا کھاتے۔ پھر جو زمانہ بدلا تو ان کے پیچھے کرسیاں اور سامنے میز بچھ گئی جس پر کھانا چن دیا جاتا۔ پہلے وہ سر جوڑ کر کھاتے تھے اب سروں کے درمیان فاصلہ نمودار ہوا اور رو برو بیٹھا ہوا شخص مدِ مقابل نظر آنے لگا۔ مگر زمانہ کبھی ایک حالت میں قیام نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک بار جو اس نے کروٹ لی تو سب سے پہلے پلیٹ کو ہتھیلی پر سجا کر اور سرو قد کھڑے ہو کر طعام سے ہمکلام ہونے کی روایت قائم ہوئی۔ پھر ٹہل ٹہل کر اس پر طبع آزمائی ہونے لگی، انسان اور جنگل کی مخلوق میں جو ایک واضح فرق پیدا ہو گیا تھا کہ انسان ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا جب کہ جنگلی مخلوق چراگاہوں میں چرتی پھرتی تھی اور پرندے دانے دنکے کی تلاش میں پورے کھیت کو تختۂ مشق بناتے تھے اب باقی نہ رہا اور صدیوں کے بچھڑے ہوئے سلسلے جا ملے۔ چنانچہ اگر ایک بار پھر اپنے عزیزوں سے آملے اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا ہماری تہذیب کا گراف نیچے سے اوپر کی طرف گیا ہے تو میں کہوں گا کہ بے شک ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے کیوں کہ ہم نے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کی روایت کو ترک کر کے کھڑے ہو کر اور پھر چل پھر کر کھانا کھانے کے دطیرے کو اپنا لیا ہے جو چرنے یا دانہ دنکا چگنے ہی کا ایک جدید روپ ہے۔ کسی بھی قوم کے اوپر جانے یا نیچے آنے کا منظر دیکھنا مقصود ہو تو یہ نہ دیکھئے کہ اس کے تحت تسلط میں کتنے علاقے اور خزانے آئے یا چلے گئے۔ فقط یہ دیکھئے کہ اس نے طعام اور شرکاء طعام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

بچپن کی بات ہے۔ ہمارے گاؤں میں ہر سال کپڑا اینچنے والے جولاہوں کی ایک ٹولی وارد ہوئی تھی۔ یہ لوگ سارا دن گاؤں گاؤں پھر کر ادھار پر کپڑا بیچنے کے بعد شام کو مسجد کے حجرے میں جمع ہوتے اور پھر ماحضر تناول فرمانے وہ زمین پر کپڑا بچھا کر دائرے کے انداز میں بیٹھ جاتے۔ درمیان میں شوربے سے بھری ہوئی ایک پرات بحرالکاہل کا منظر دکھاتی جس میں بڑے گوشت کی بوٹیاں جھوٹے جزیروں کی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ ان بوٹیوں کو احتیاط سے نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر دیتے اور شوربے میں روٹیوں کے ٹکڑے جھونک کر ان کا ملیدہ سا بنا لیتے تھے جب ملیدہ تیار ہو جاتا تو شرکاء طعام بوری دیانت داری کے ساتھ آپس میں بوٹیاں تقسیم کرتے اور پھر اللہ پاک کا نام لے کر کھانے کا آغاز کر دیتے۔ وہ کھانا ایک دوسرے کی طرف جھک کر کھاتے مگر لقمے توڑنے کے بے تکان ایسے تھے

ان کے کھانا کھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ میں ہر شام حجرے کے دروازے میں آکھڑا ہوتا، انھیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ وہ بھی مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے اور کبھی کبھی برادرانہ اخوت میں لتھڑا ہوا ایک آدھ لقمہ یا گوشت کا ٹکڑا میری طرف بھی بڑھا دیتے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان پٹھانوں کی پیشکش کو اگر کوئی مسترد کر دے تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ اس لیے میں باولِ نخواستہ ان کے عطا کردہ لقمۂ تر کو حلق میں دبا کر آہستہ آہستہ جگالی کرتا اور دیر تک انھیں کھانا کھاتے دیکھتا رہتا۔ عجیب منظر ہوتا۔ وہ کھانے کے دوران میں کمال سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے جب ایک شخص لقمہ مرتب کر لیتا تو پہلے اپنے قریبی ساتھیوں کو پیش کرتا اور ادھر سے جزاک اللہ کے الفاظ وصول کرنے کے بعد اسے اپنے منہ میں ڈالتا۔ اخوت، محبت اور بھائی چارے کا ایک ایسا لازوال منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا کہ میں حیرت زدہ ہو کر انہیں بس دیکھتا ہی چلا جاتا اور تب میں دسترخوان پر کھانا کھانے کے اس عمل کا اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل سے موازنہ کرتا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی کیوں کہ ہمارے گھر میں صبح و شام ہانڈی تقسیم کرنے والی بڑی خالہ کے گرد اگرد بچوں کا ایک ہجوم سا جمع ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے جب بڑی خالہ کھانا تقسیم کر رہی ہوتیں تو ہماری حریص آنکھیں ہانڈی میں ڈوئی کے غوطہ لگانے اور پھر وہاں سے برآمد ہو کر ہمارے کسی ساتھی کی رکابی میں اترنے کے عمل کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتیں۔ اگر کسی رکابی میں نسبتاً بڑی بوٹی چلی جاتی تو بس قیامت ہی آ جاتی۔ ایسی صورت میں خالہ کی گرجدار آواز کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم بڑی بوٹی والے کی تکا بوٹی کرنے پر تیار ہو جاتے اور چھینا جھپٹی کی اس روایت کا ایک ننھا سا منظر دکھاتے جو شاید زمانے کے تحت اب عام ہونے لگی تھی۔

اسی زمانے میں کبھی کبھار ایک انگریز افسر بھی والد صاحب سے گھوڑے خریدنے کے لیے آ جاتا۔ والد صاحب اس کے لیے میز کرسی لگواتے، انگریزی کھانا تیار کرواتے اور پھر گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ چونکہ ہم بچوں کو انگریز افسر کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی اور ویسے بھی ہمیں اس سے بہت ڈر لگتا تھا اس لیے ہم اکثر کھڑکی کی جالی کے ساتھ چہرہ لگا کر اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتے اور حیران ہوتے کہ صاحب بہادر کھانا کھا رہا ہے یا آپریشن کر رہا ہے۔ وہ اپنی پلیٹ میں ایک ابلا ہوا آلو لے کر بیٹھ جاتا اور پھر چھریوں اور کانٹوں سے گھنٹوں اس کے پیچھے لگا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔ آلو اس کا دشمن ہے جسے وہ اپنے اسلحے کی مدد سے زیر کرنے میں مصروف ہے۔ وہ جو کھانے کے معاملے میں رواداری، مفاہمت اور لطف اندوزی کا رویہ ہوتا ہے، اس انگریز افسر میں مجھے قطعاً نظر نہ آیا۔ بعد ازاں جب انگریز قوم کی عادات و اطوار سے آگاہی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کو اپنی اس سلطنت کی حفاظت کے لیے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، جنگی مشقیں کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے وہ کھانے کی میز پر بھی اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں۔ سو ان کے لیے کھانا جسم کو برقرار رکھنے کا نہیں بلکہ دشمن کو زیر کرنے کا شاخسانہ ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی روایت ہمارا عزیز ترین ثقافتی ورثہ تھا جس کے ساتھ ہم نے عزیزانِ مصر کا سا سلوک کیا اور اب یہ روایت اول تو کہیں نظر ہی نہیں آتی اور کہیں نظر آ جائے تو ہماری زندگی کے فی الفور خود میں سمٹ جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں دسترخوان پر بیٹھنا ایک تہذیبی اقدام ہے جب کہ کھڑے ہو کر کھانا ایک نیم وحشی عمل ہے۔ ذرا یہی دیکھیے کہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھے ہیں تو داہنی [illegible] یا بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے آپ کے تعلقات [illegible]

ہوجاتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں جیسے چند ساعتوں کے لیے آپ دونوں ایک دوسرے کی خوشیوں، غموں اور بوٹیوں میں شریک ہوگئے ہیں۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے بیٹھا ہوا آپ کا کرم فرما کمال دریادلی اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پلیٹ کا شامی کباب آپ کی رکابی میں رکھ دیتا ہے تو جواب آں غزل کے طور پر آپ بھی اپنی پلیٹ سے مرغ کی ٹانگ نکال کر اُسے پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھانے کے دوران لین دین کی وہ خوشگوار فضا از خود قائم ہوجاتی ہے جو ہماری ہزاروں برس کی تہذیبی یافت کی مظہر ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص آپ کا مدِ مقابل ہے اور اگر آپ نے ذرا بھی آنکھ جھپکی تو وہ پلیٹ پر ہاتھ صاف کر جائے گا۔ دستر خوان کی یہ خوبی ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی اعتماد کی فضا بحال ہوجاتی ہے اور آپ کو اپنا شریکِ طعام حد درجہ معتبر شریف اور نیک نفس دکھائی دینے لگتا ہے۔ دوسری طرف کسی بھی بوفے ضیافت کا تصور کیجئے تو آپ کو نفسا نفسی خودغرضی اور چھینا جھپٹی کی فضا کا احساس ہوگا اور ڈارون کا جہد للبقا کا نظریہ آپ کو بالکل سچا اور برحق نظر آنے لگے گا۔

دستر خوان کی ایک اور خوبی اس کی خود کفالت ہے۔ جب آپ دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی جملہ ضروریات کو بے طلب پورا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ سامنے دستر خوان پر ضرورت کی ہر چیز موجود ہے حتیٰ کہ اچار چٹنی اور پانی کے علاوہ خلال تک مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ دستر خوان پر بیٹھنے کے بعد اگر آپ کسی کو مدد کے لیے بلانے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو میزبان نے حقِ میزبانی ادا نہیں کیا یا مہمان نے اپنے منصب کو نہیں پہچانا ـــ خود کفالت دراصل ہماری ثقافت کا ایک امتیازی وصف ہے اور اس کا ہماری قناعت پسند بلکہ تقدیر پرستی سے بھی ایک گہرا تعلق ہے۔ اپنے دیہات ہی کو لیجئے جو ہماری ثقافت کی صحیح ترین نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ اب تو خیر ان میں پہلی سی بات نہیں رہی ورنہ صدیوں تک انہوں نے نمک اور حملہ آور کے علاوہ شاید ہی کبھی کوئی چیز درآمد کی ہو ـــ دلچسپ بات یہ ہے کہ کسان اپنے لیے خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے جو اس کے جسم کی ساخت اور تعمیر میں حصہ لیتی ہے مگر پھر جب اس کا اپنا بدن زمین کا رزق بن جاتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد زمین اُسے دوبارہ غذا میں منتقل کر کے آئندہ نسلوں کو پیش کر دیتی ہے اور یہ بات انسان تک ہی محدود نہیں۔ دیہات میں تو پرندوں، حیوانوں، پودوں اور انسانوں کی نسلیں سدا ایک دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یک جانی اور ہم مزاجی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انھیں محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں بجائے خود ایک دستر خوان ہے جو کھیتوں کے عین درمیان بچھا دیا گیا ہے جس پر وہ نسل در نسل بیٹھتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ ایک نسل جب کھانے سے فارغ ہوجاتی ہے تو دوسری نسل دستر خوان پر آ بیٹھتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گویا جانے والی نسل آنے والی نسل کے لیے غذا بن کر دستر خوان پر بچھ جاتی ہے مگر آنے والی نسل کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس رغبت سے اپنے ہی بزرگوں کی ہڈیاں چبا رہی ہے۔

دستر خوان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ آپ کو زمین سے قریب کر دیتا ہے جب کہ میز کرسی پر آتے ہی آپ زمین کے لمس سے محروم ہو جاتے ہیں اور جوتے پہننے کا عمل تو آپ کو زمین سے بالکل منقطع ہی کر دیتا ہے۔ زمین ایک زندہ، دھڑکتی اور پھڑکتی ہوئی شئے ہے جس کی تحویل میں ایک پُراسرار قوت بھی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو نہ صرف اس قوت کی موجودگی کا علم تھا بلکہ وہ قدم قدم پر اس کے لمس سے بھی آشنا ہوتے تھے۔ وہ کہتے کہ یہ قوت زیرِ سطح توسوں دائمعل اور مگرون کی صورت میں رواں دواں رہتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی انجانے میں بھی ان میں سے کسی لکیر کو چھو لیتا ہے تو اُسے زمین کی قوت ایک برقی جھٹکے کی طرح محسوس ہوتی ہے جب وہ زمین کے نسوں و
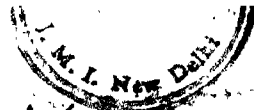
برکات کے حصول کے لیے ان لکیروں اور کھائیوں کی تلاش کرتے اور جس مقام پر یہ لکیریں یا کھائیاں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ملتیں وہیں اپنے پگوڈے یا مندر تعمیر کرتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ مقام دراصل زمین کی پُراسرار قوت کے سرچشمے ہیں۔ مگر پھر یوں ہوا کہ انسان بتدریج زمین سے منقطع ہو کر پہلے چوپاروں پھر سنگھاسنوں پر چڑھ گیا اور زمین سے جو اس کی ماں بھی تھی اور اَن داتا بھی کٹتا اور دور ہٹتا چلا گیا۔ دستر خوان کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زمین کے سینے سے چمٹا دیتا ہے تاکہ وہ براہ راست زمین سے اس کی پُراسرار قوت کو کشید کر سکے۔ دستر خوان دراصل زمین کا لباس ہے اور دستر خوان پر بنی ہوئی توسیعیں، دائرے اور لکیریں زمینی قوت کی گزرگاہوں کے مماثل ہیں۔ چنانچہ آپ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں تو اس کی غذائیت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ میز کرسی پر یا چل پھر کر کھانا کھائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کھانے میں وہ برقی رَو موجود نہیں۔ جو زمین کی شریانوں سے دستر خوان کی توسوں اور پھر وہاں سے انسان کی رگوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔

دستر خوان آپ کو زمین کے لمس ہی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ انگلیوں کے لمس سے بھی متعارف کرتا ہے۔ چھری کانٹے یا چمچے سے کھانا کھانے میں وہ لطف کہاں جو ہاتھ سے کھانے میں ہے۔ اس میں دوہرا لطف ہے ایک تو اس چیز کا لطف جو کھائی جا رہی ہے دوسرے انگلیوں کے لمس کا لطف! ممکن ہے آپ کہیں کہ میز کرسی پر بیٹھ کر یا چل پھر کر بھی تو انگلیوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جی ہاں یہ ممکن تو ہے مگر ایسے ہوتا نہیں۔ وجہ یہ کہ ہاتھ سے کھانا کھانے کے لیے آپ کے جسم کا ایک جگہ ڈھیر ہونا ضروری ہے اور یہ بات دستر خوان کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈائننگ چیئر پر بیٹھنا سرکس کی رسّی پر کھڑا ہونے کے مترادف ہے چنانچہ کرسی سے پھسل جانے کا خطرہ ہر وقت سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ ایسے میں کوئی انگلیوں کے لمس سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہی حال بوفے ضیافت کا ہے۔ وہاں دو مسئلے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کس طرح ہتھیلی پر بیک وقت پلیٹ، چمچہ، روٹی اور نیپکن کو بیلنس کیا جائے یہ ایک خاصا مشکل کام ہے بلکہ اسے آرٹ کہنا چاہیے جو دیسیوں کی سینکڑوں ضیافتوں سے گزرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ٹریفک کا ہے جب آپ بوفے ضیافت کے جملہ مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو ہر قسم کی ٹکروں، دھکوں، اور خلاف ورزیوں سے خود کو اور اپنی رکابی کو بچانا ہوتا ہے ایسے میں اگر آپ انگلیوں کی مدد سے کچھ کھانے کی کوشش کریں بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں کیوں کہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں آپ کو اپنی خوبصورت انگلی بھی ایک مڑا ہوا تدو مع کانٹا ہی نظر آتی ہے۔

دستر خوان لامسہ ہی کو تسکین نہیں دیتا، شامہ، سامعہ اور باصرہ کو بھی سیراب کرتا ہے جب مہمان دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو مختلف کھانوں کی خوشبو آپ واحد میں ان تک جا پہنچتی ہے اور جب پہنچتی ہے تو اس فراوانی کے ساتھ کہ وہ اسے نہ صرف ایک مشروب کی طرح پیتے ہیں بلکہ اس کی مختلف اقسام میں تمیز بھی کر لیتے ہیں مثلاً نان کی سوندھی سوندھی باس، پلاؤ کی گرم خوشبو سے مختلف شے ہے اور متنجن کی تیز مہکار، فرنی کی ٹھنڈی سگند سے ایک جدا مزاج رکھتی ہے ـــــ یہ انکشاف دستر خوان پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بوفے ضیافت میں لوگوں مہمانوں، بیروں اور قناتوں کی ملی جلی خوشبو ایک ایسی بھاری بوجھل شے بن جاتی ہے کہ اسے خوشبو سے ہم رشتہ کرنا بھی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ سامعہ کی تسکین کا پہلو بھی دستر خوان ہی میں ممکن ہے یہاں کھانے والے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ہر کھانے والے کے دہن سے ہڈیوں کے کڑکڑانے اور لقمے کے دانتوں میں پسنے کی آواز ایک تحریں

نغمے کی طرح آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور آپ پر کیف و سرور کی بارش کر دیتی ہے ۔ دستر خوان پر ہی آپ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہر کھانے والے کی زبان، دانت، تالو اور ہونٹ کھانے کے دوران مل جل کر ایک ایسی مخصوص آواز نکالتے ہیں جو نہ صرف دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے بلکہ جس میں کھانے والے کی ساری شخصیت سمائی ہوتی ہے ۔ کسی شخص کے اصل کردار سے آشنا ہونا ہو تو کھانے کے دوران اس کے منہ سے برآمد ہونے والی آوازوں پر کان دھریں کیوں کہ ہر شخص کے اندر کی ساری شرافت یا خباثت اس کے کھانے کی آواز ہی میں مضمر ہوتی ہے ۔

رہا بامزہ کا معاملہ تو اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ۔ دستر خوان پر آرام اور سکون سے بیٹھنا نصیب ہو تو کھانے کو نظر بھر کر دیکھنے کی فرصت بھی ملتی ہے ۔ ورنہ دوسرے موقعوں پر کسی بدبخت کو کبھی معلوم ہوا ہے کہ جس شے پر وہ دندانِ طمع تیز کیے ہوئے ہے وہ دیکھنے میں کیسی ہے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دستر خوان پر پوری دلجمعی سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور بوفے ضیافت میں انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھانا زہر مار کرنے میں وہی فرق ہے جو محبت اور ہوس میں ہے ، خوشبو اور بو میں ہے ، صبح کی چہل قدمی اور سوگ کی دوڑ میں ہے — !!

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کتاب	مصنف	صنف	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ روپے
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	"	مضامین	۷ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
تکلف برطرف	"	"	۱۴ "
قطع کلام	"	"	۱۳ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ملا بن کا عرفی	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	مضامین	۱۲ روپے
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	[illegible]	مجموعۂ کلام	۱۲ "

محمد طارق (مہاراشٹر)

بہت پچھتائے الیکشن میں کھڑے ہوکر

موسم برسات میں ندی، نالوں اور موریوں کے کنارے چھوٹے بڑے مینڈک ٹرانے لگتے ہیں اسی طرح الیکشن کے موسم میں بہت سارے چھوٹے بڑے لیڈر شہروں، گاؤں کی گلی کوچوں اور چوراہوں پر نکل پڑتے ہیں اور اپنی اپنی پوزیشن دکھانے اور بنانے کے لیے ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنا شروع ہوجاتے ہیں۔

اُن دنوں ہم بھی چھوٹے موٹے لیڈر بن گئے تھے۔ نہیں بنا دیئے گئے تھے۔

ہوا تھا یہ کہ ریاستی اسمبلی کے انتخاب کا موسم آیا ہوا تھا۔ کچھ یار دوست جو سیاست میں تھوڑا بہت عمل دخل رکھتے تھے ہمارے پاس آئے اور فرمایا کہ "آپ الیکشن میں کھڑے ہوجایئے اپنے حلقہ سے۔"

ہم سمجھے مذاق کر رہے ہیں، ہمیں ہنسی آگئی۔ ہنسی ضبط کر کے ہم نے کہا "ہم کھڑے ہونے کے لائق نہیں۔ آپ لوگ کھڑے ہو جایئے۔"

"الیکشن میں لائق نالائق نہیں دیکھا جاتا حضور، پوزیشن دیکھی جاتی ہے پوزیشن۔" دوستوں نے پوزیشن لفظ پر زور دے کر اپنے ہاتھوں کی بند مٹھیاں ہمارے سامنے لاکر ایسے انداز سے کہا کہ ہمیں ایسا لگا جیسے ہماری پوزیشن اُن کی بند مٹھیوں میں دبی سکنے لگی ہے۔ ہم اُن کی بند مٹھیوں کو احمق کی طرح تکنے لگے۔

اور وہ کہنے لگے "آپ کے پاس پیسہ بھی ہے، عزت بھی ہے، شہرت بھی ہے، آپ الیکشن میں کھڑے ہونے کے لائق ہیں۔ ہم نے کہا "دیکھئے آپ لوگ بھول کر رہے ہیں، ہماری بنی بنائی عزت مٹی میں مل جائے گی، ہمیں کھڑا مت کیجئے۔"

"نہیں ۔۔۔ ہم تو آپ کو کھڑا کر کے ہی دم لیں گے۔"

"مگر ہمیں بھاشن دینا نہیں آتا۔" ہم نے سچ کہا۔

"ہم دیں گے۔" وہ بھی سچ بولے

"ہم لوگوں سے جھوٹے وعدے نہیں کر سکتے۔" ہم نے حق بات کہی۔

"ہم کریں گے، آپ کی طرف سے" انھوں نے بھی حقیقت بیان کر دی۔

"سبز خواب عوام کو کیسے دکھائیں گے ہم۔" ہم نے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۔

انھوں نے ہماری بے بسی کا سینہ تان کر مذاق اُڑایا اور کہا

"ہم دکھائیں گے ــــ، سب کچھ کریں گے ہم، بس آپ الیکشن میں کھڑے ہو جائیے!"

دوستوں کے بہت اصرار پر ہم نے حامی بھری۔

ــــــ سب سے پہلے ہم رولنگ پارٹی سے ٹکٹ کی بھیک مانگی، ہمیں ٹکٹ نہیں ملا، دوسری پُرانی، نئی پارٹیوں نے بھی ہمیں ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کر سب پارٹیوں کے پاس اُمیدوار زیادہ تھے اور ٹکٹ کم۔ اسی لیے پرانے نیتاؤں میں ٹکٹ تقسیم ہو گئے۔ ہم نوزائیدہ لیڈر تھے اسی لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ہی ہمیں الیکشن میں کھڑا ہونا پڑا۔

ــــ ہمارے حلقۂ انتخاب سے ہمیں چھوڑ کر پانچ اُمیدوار کھڑے تھے جن میں ایک رولنگ پارٹی کے اُمیدوار شری کھوٹے لال جی تھے۔ اُن کا انتخابی نشان سورج تھا اور ہمارا انتخابی نشان چاند!

دوستوں نے ہماری بہت مدد کی۔

جگہ جگہ بھاشن دیئے۔ پوسٹر چپکائے۔ کینوا سنگ کی۔ جنتا کے سامنے ہماری خوب جی کھول کر تعریف کی۔ ہم نے بھی تجوری کھول کر انھیں روپیہ دیا اور انھیں بھاشن کرنے کے عوض اپنے گودام سے راشن بھی بانٹا۔

دوست ہماری دریا دلی سے جو بڑھ کر "سمندر دلی" بن گئی تھی۔ بہت خوش ہوئے۔ اتنے خوش کہ مارے خوشی کے وہ ہمیں بھی سبز خواب دکھانے لگے۔

دوستوں نے مشورہ دیا:

"الیکشن میں جتنا پیسہ لگاؤ گے اتنی اکثریت سے جیت کر آؤ گے اور جیت کر آنے کے بعد اس سے زیادہ کماؤ گے اسی تجوری کھلی رکھو"۔

ہم اپنے دوستوں کی بات پر الیکشن کے دن تک ایمان داری سے عمل پیرا رہے۔

الیکشن کا دن آیا؛

بے چاری دکھوں کی ماری۔ سبز خوابوں میں کھوئی ہوئی، وعدوں کے جنجال میں پھنسی ہوئی جنتا ووٹ دینے کیلئے ٹوٹ پڑی۔ اور ہم جنتا کو جھک جھک کر سلام، ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرتے رہے۔ ویسے پہلے پہل جھک کر سلام کرنے اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنے سے ہماری کمر اور ہاتھوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اب تو ہم سلام اور نمسکار کرنے والی مشین بن گئے تھے۔

جنتا نے ہمارے نمسکار کا ایسا چمتکار دکھایا کہ ہم الیکشن میں منہ کے بل گر پڑے یعنی کے ہماری ضمانت ضبط ہو گئی

ہمیں بہت افسوس ہوا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہا لیکن اب ہمارے پاس آنسو نہیں تھے کیوں کہ ہم نے اپنے سارے آنسوؤں کا خزانہ جنتا کے سامنے ووٹ کی بھیک مانگنے کے لیے بڑی فراخدلی سے لٹا دیا تھا۔ اس لیے مارے افسوس کے ہم نے بھوک ہڑتال ہی کرنا مناسب سمجھا۔ ہمیں بھوک ہڑتال کرتا دیکھ کر ہماری بیوی بڑی خوش ہوئی کہ آج سے زیادہ کھانا نہیں پکانا پڑے گا۔

بیگم صاحبہ نے کھانا کھا کر لمبی ڈکار لی اور ہمارے سامنے ہاتھ نچا نچا کر کہنے لگی۔ بس کھل گئی پول، بڑے کہتے تھے، بڑی عزت ہے۔ بہت شہرت ہے لوگ مجھے بے حد چاہتے ہیں ...

بے اختیار ہمارا جی چاہا کہ بیوی کا منہ نوچ لیں لیکن چوں کہ ہم لیڈر بن گئے تھے اس لیے بیوی کی تلخ و ترش باتیں مسکرا کر برداشت کرلیں اور گھر سے نکل پڑے (ہمیشہ کے لیے نہیں)

راستے میں ایک شخص سے اتفاقاً ہماری نظریں ملیں۔ ہمارے ہاتھ بجائے کیول مشین کی طرح نمسکار کرنے کے لیے اٹھ گئے۔ وہ مسکرایا اور زور سے طنزیہ لہجے میں بولا "الیکشن ہوگیا صاب"۔

"ہاں ــــ! کھوٹے لال جی جن کرا گئے ہیں" ہم نے بھی زور سے کہا۔

یکدم وہ سمجھدار شخص ٹھٹھک گیا۔ فوراً ہمارے قریب آیا اور بولا

"کیا بکتے ہو ــــ، کیوں سورج کا اُمیدوار نہیں آیا ؟!"

مگر ہم بُری طرح چونک پڑے تھے۔ اُس کے جملے نے ہماری شکست کے افسوس کو خوشی میں بدل دیا تھا۔ ابدی خوشی میں۔

ہم مسکرا کر اُس کے سر کو دیکھنے لگے تھے۔ ٹھیک اُس کے سر کے اوپر سورج چمک رہا تھا جو اُس کے سر سے بھی "سوا نیزے" کی دوری پر نظر آرہا تھا۔

عابدہ محبوب (حیدرآباد)

دھجیاں

"سارا قصور"

ایک لڑکا امتحان میں بُری طرح فیل ہوگیا۔ اس کے والد کو غصّہ آگیا۔ انھوں نے اس کی خوب مرمت کی۔ لڑکا روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "ڈیڈی! میرا کوئی قصور نہیں! سارا قصور تو ان کا ہے!"

والد گرج کر بولے "آخر کس کا قصور ہے؟"

لڑکا روتے ہوئے بولا۔

"ڈیڈی! سارا قصور تو ان لڑکوں کا ہے جو امتحان ہال میں میرے آگے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے! میں مجبور تھا۔ کیا کر سکتا تھا؟ ان بے وقوفوں کو تو کچھ آتا ہی نہیں تھا!"

"زحمت"

ایک امتحان ہال میں امتحانی سوالات کا پرچہ لیتے ہی ایک اُمیدوار نے نگران کار سے پرچہ کے سوالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ پوچھنا شروع کردیا۔ نگران کار نے دو چار بار کچھ کچھ سمجھا دیا۔ مگر بار بار پوچھنے پر وہ تنگ آگئے۔ عاجزی سے بولے۔ "بابا! کل سے آپ امتحان دینے کی زحمت نہ کریں۔ میں آپ کی بجائے امتحان دے دوں گا!"

"کامیابی کا راز"

ایک لڑکے نے اپنے پڑھائی چور دوست سے جو میٹرک کے سالانہ امتحان میں فرسٹ کلاس کامیاب ہوا تھا کہا۔

"کامیابی بہت بہت مبارک ہو! بڑی خوشی ہوئی تمہاری کامیابی پر! مگر یار تعجب بھی ہوتا ہے کہ تم نے فرسٹ کلاس کامیابی کیسے حاصل کی؟"

دوست نے فخریہ مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بس! نقل بازی سے"!

"ندرت"

ایس۔ ایس۔ سی کے سالانہ امتحان میں ایک امیدوار اپنی جوابی بیاض پر خاموشی سے لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے لکھنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے اکسٹرا کاغذ طلب کیا۔ نگران کار نے اکسٹرا کاغذ دینے سے قبل جوابی بیاض پر نظر ڈالی۔ امیدوار نے بال بال پن سے سوال لکھا تھا

اور نیلے بال پن سے جواب۔ مگر نگران کار نے جب ذرا غور سے جوابی بیاض کو پڑھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُمیدوار نے ہر سوال کے جواب میں سوال لکھ کر کاغذ بھر دیا تھا!

"اظہارِ ممنونیت"

ایک صاحب ایک ادیبہ سے ان کی کتاب کے بارے میں کہہ رہے تھے "واہ! کیا عمدہ کتاب لکھی ہے آپ نے! جب بھی پڑھتا ہوں لگتا ہے نئی پڑھ رہا ہوں!"

ادیبہ نے پوچھا آپ نے میری کتاب کتنی بار پڑھی؟" وہ صاحب بولے "یہی کوئی چار یا پانچ بار!"

ادیبہ بولیں "میں آپ کے کمزور حافظے کی ممنون ہوں جس نے مجھ ناچیز کو ایک کی بجائے پانچ کتابوں کی ادیبہ بنا دیا!"

"مالِ مفت"

"سُنا ہے پالتو جانوروں کا یوروپی ممالک میں زیادہ خیال رکھا جاتا ہے!"

"وہ کیسے؟"

"کہتے ہیں کہ ایک دولت مند کو اپنا کتا اتنا عزیز تھا کہ اس نے، اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھاری قیمت دے کر ایک لڑکا خریدا!"

"بیوقوفی کی! خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟ انڈیا میں تو اُسے لڑکا مفت مل سکتا تھا!"

"حیرانی"

ایک ہندوستانی صاحب جو تیس سال سے لندن میں مقیم تھے اپنے دوست واحباب سے ملنے انڈیا چلے آئے۔ قیام کے دوران ایک دن وہ اپنے رشتے دار کے ہمراہ گوشت خریدنے مارکٹ گئے۔ ایک دوکان پر دو تین گاہک ایسے آئے جو قصاب سے صرف ہڈی خرید کر لے گئے۔ مہمان نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا ہندوستان میں بغیر گوشت کے بکرے بھی ملتے ہیں؟!"

"کملاہاسن رکھ دیا"

باسی پانی باسی روٹی باسی سالن رکھ دیا
ڈارلنگ نے ناشتے میں ناشکم حسن رکھ دیا

کل میرے کتے نے ڈسکو ڈانس سیکھا دوستو
آج میں نے نام اُس کا "کملاہاسن" رکھ دیا

ساغرؔ شولاپوری

معاون قلم کاروں سے التماس

تخلیقات صاف اور خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھی جائیں۔
اور آخر میں اپنا پتہ ضرور درج کریں!

(ادارہ)

FAROOKY
FAROOKY
TOOTH POWDER.